

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سالنامہ

شگوفہ

سنہ ۱۹۷۸ء

جلد ([illegible]) جنوری ۱۹۷۸ء شمارہ (۱)

ایڈیٹر

سید مصطفیٰ کمال ایم۔اے (عثمانیہ)

مجلسِ ادارت

محمود احمد؛ حمایت اللہ؛ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت: راجندر سنگھ بیدی؛ بھارت چند کھنہ؛ خواجہ عبدالغفور؛ نریندر لوتھر؛ مجتبیٰ حسین

فی پرچہ ۔۔۔ ۳ روپے
سالانہ ۔۔۔ (۲۰) روپے
بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ

ناشر: سعادت علی خاں

طابع و ناشر: اسٹینڈرڈ اکیڈمنٹس، شانتی نگر، حیدرآباد

مقامِ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چادر گھاٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بائنڈنگ: حمیدیہ بک بائنڈنگ درگاہ پرانی حویلی، روبرو عبادت خانہ حسینی، حیدرآباد

شگوفہ ۔ ۳۱۔ حجرہ درگاہ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱


RANCHHODDAS & SONS
INDIA
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

کنھیا لال کپور

۴ زندہ دل سیاستداں

پہلا مجھے لوگوں سے صرف ایک شکایت ہے۔ وہ ہمیشہ میری عمر کے بارے میں غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے میری عمر پچھتر سال ہے۔ کسی کے خیال میں میں نوّے برس کا ہوں۔ اور کسی اور کی رائے میں سو برس کا ہو چکا ہوں۔ حالانکہ اصلیت یہ ہے میری عمر سولہ سال ہے۔

دوسرا حضور! اگر آپ کی عمر صرف سولہ سال ہے تو اس حساب سے ہم تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔

پہلا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دراصل عمر کا پیدائش سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ نیز جب تک سیاستدان پختہ فکر نہ ہو جائے اسے سمجھنا چاہیئے وہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔

تیسرا (پہلے سے) آج کل آپ سیاسی مسائل کی جانب بہت کم توجہ دے رہے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں آپ اس عقیدے کے حامی ہیں۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن

پہلا مجھے سیاسی مسائل میں دلچسپی لینے کے لئے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ میں تو دن رات یہ سوچتا رہتا ہوں اگر آدمی بادام کے چھلکے، اخروٹ کے چھلکے، کیلے کے چھلکے اور سنگترے کے چھلکے کھایا کرے تو نہ صرف تندرست رہ سکتا ہے۔ بلکہ لمبی عمر بھی پا سکتا ہے۔

چوتھا (چونک کر) حضور! آپ کو یہ الہام کب ہوا۔؟

پہلا الہام نہیں ہوا۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا، اس کا نام ہے "قدرتی علاج"۔

چوتھا خیر کیلے اور سنگترے کے چھلکے تو کھائے جا سکتے ہیں لیکن بادام اور اخروٹ کے چھلکے کھانا تو گویا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ ایک تو وہ نہایت بدمزا ہوں گے دوسرے انھیں ہر روز کھا کر طبیعت اوب جائے گی۔

پہلا یہ محض آپ کا وہم ہے۔ دانت ٹوٹیں گے نہیں مضبوط ہو جائیں گے۔ رہی یہ بات آدمی انھیں بہ رغبت نہیں کھا سکتا تو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اسے گھاس کھانا چاہیئے۔

تیسرا گھاس؟ کیا میں نے آپ کو ٹھیک سنا؟
پہلا جی ہاں۔ گھاس۔ دیکھئے گھوڑے اور گدھے گھاس کھاتے ہیں۔ اور کتنے طاقتور ہوتے ہیں۔
دوسرا کیا یہ انکشاف بھی اسی کتاب نے کیا ہے، جس کا نام "قدرتی علاج" ہے؟
پہلا آپ کا قیاس درست ہے اصل میں میں خواہ مخواہ سیاست داں بن گیا۔ مجھے تو قدرتی علاج کا ماہر ہونا چاہئے تھا۔
دوسرا کیا آپ نے قدرتی علاج سے کسی مریض کو ٹھیک بھی کیا ہے؟
پہلا کم از کم دو دوستوں کا علاج کرنے کا مجھے موقع ملا۔ ان میں سے ایک کینسر میں مبتلا تھا، دوسرا تپ دق میں میں نے انھیں یقین دلایا میں انھیں ان امراض سے مرنے نہیں دوں گا۔ جن میں وہ مبتلا ہیں۔
تیسرا تو کیا آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا؟
پہلا جی ہاں۔ میں نے ان دونوں کو مشورہ دیا وہ دس دن فاقہ کریں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور کینسر یا تپ دق کی بجائے فاقہ کشی سے مرے!
چوتھا سبحان اللہ! واہ نہیں دی جاسکتی آپ کے علاج کی!
پہلا (دوسرے سے) آپ نے بھی ایک دفعہ قومی سطح پر صحت کا معیار بہتر بنانے کا پلان تیار کیا تھا۔ اس کا کیا بنا؟
دوسرا جناب سچ تو یہ ہے مجھے بھی آپ کی طرح قومی مسائل پر دھیان دینے کی فرصت نہیں ملی۔ مجھ سے جو سوالات پوچھے جاتے ہیں ان کے جوابات تیار کرنے میں میرا سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔
پہلا آپ مختصر جوابات کیوں نہیں دیتے؟
دوسرا مختصر جواب سے سوال کرنے والے کی تو تسلی ہو جاتی ہے لیکن میری نہیں ہوتی۔
تیسرا وہ کیوں؟
دوسرا بدقسمتی سے میں اس علاقہ سے تعلق رکھتا ہوں، جہاں باتیں بنانے کو آرٹ کا درجہ دیا گیا ہے اور جہاں لوگ باتیں بنانے کے علاوہ صرف ایک دوسرے کو بناتے ہیں۔ اس لئے مجھے مختصر سوال کا طویل جواب دینے میں لطف آتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں مجھ سے سوال کیا گیا۔ ایک ہندوستانی کی اوسط عمر کیا ہے؟ کوئی اور ہوتا تو کہتا پچپن سال یا ساٹھ سال۔ مگر میں نے سوال کرنے والے کو بتایا۔ رامائن کے زمانے میں ایک ہندوستانی کی اوسط عمر تین ہزار سال تھی۔ مہابھارت کے زمانے میں یہ گھٹ کر دو ہزار سال رہ گئی۔ مغلوں کے زمانے میں صرف بتیس سال تھی۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں چھبیس سال رہ گئی۔ کانگریس کے زمانے میں پچپن ہو گئی۔ اور اب ہم کوشش کر رہے ہیں یہ ایک بار پھر تین ہزار سال ہو جائے۔
چوتھا بہت خوب! سوال کرنے والے کو کیا کرارہ جواب دیا آپ نے۔

پہلا (لڑکا) احمق ہے ہی۔ منہ توڑ بھی ہے۔ آئندہ وہ سوچ سمجھ کر سوال کرے گا۔

تیسرا فرض کیجئے۔ آپ سے پوچھا جائے ایک ہندوستانی کی اوسط آمدنی کیا ہے۔ آپ کیا جواب دیں گے؟

دوسرا پہلے تو میں اسے بتاؤں گا۔ ایک انگریز، ایک امریکن ایک فرانسیسی، ایک اطالوی، ایک جرمن کی اوسط آمدنی کیا ہے۔ اس کے بعد اسے مطلع کروں گا کہ ایک امریکن کی آمدنی ایک انگریز سے کیوں زیادہ ہے۔ پھر اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں گا کہ کسی ملک کے باشندے اپنی اوسط آمدنی کس طرح بڑھا سکتے ہیں۔ اور آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ایک ہندوستانی کا اوسط خرچ تو ہے لیکن ابھی تک اس کی اوسط آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے اگر یہ سوال نہ پوچھا جائے تو بہتر ہوگا۔

تیسرا (پہلے سے) حضور! یہ جو آپ آئے دن اعلان کرتے رہتے ہیں کہ آپ [illegible] کو پندرہ ہفتوں میں، بے روزگاری کو تیس ہفتوں میں اور کرپشن (رشوت خوری) کو پچاس ہفتوں میں ختم کر دیں گے، کیا ان میں کچھ صداقت ہے یا دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے؟

پہلا آپ نے نہایت دلچسپ سوال کیا ہے۔ یہ سب اعلانات دوسروں کا اور اپنا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ورنہ ان مسائل کو ہفتوں، مہینوں بلکہ برسوں میں تو کیا صدیوں میں بھی حل نہیں کیا جا سکتا۔ عوام بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں اور دل ہی دل میں سراج لکھنوی کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں۔

وہی لہجہ، وہی تیور، قسم ہے تیرے وعدوں کی
ذرا بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ جھوٹی تسلی ہے

تیسرا اگر یہ بات ہے پھر آپ یہ اعلانات اتنے یقین کے ساتھ کیوں کرتے ہیں؟

پہلا اس لئے کہ ونسٹن چرچل نے ایک کامیاب سیاستداں کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی "وہ عجیب و غریب شخص جو پیشگوئی کرتا ہے۔ فلاں مسئلہ فلاں تاریخ تک حل ہو جائے گا۔ اور جب وہ حل نہیں ہوتا تو دلائل پیش کرتا ہے وہ کیوں حل نہیں ہوا۔"

دوسرا یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ کبھی تو میں انھیں فیض کا یہ مصرع پڑھ کر مطمئن کر دیتا ہوں۔

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔

اور کبھی اُن کی توجہ امیر مینائی کے اس شعر کی طرف مبذول کراتا ہوں۔

عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و فغاں کی
پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

دوسرا (چوتھے سے) کیا آپ نے کبھی کبھی ان مسائل کے متعلق سوچا ہے؟

چوتھا جی نہیں! اتنی فرصت ہی کہاں ہے۔ سارا وقت تو یہ سوچنے میں صرف ہو جاتا ہے، کونسے کمیشن مقرر کروں۔ ابھی کل ہی خیال آیا۔ پچھلے پچاس سال میں جتنے بھونچال آئے ہیں۔ ان کے متعلق ایک کمیشن مقرر کیا جائے کہ یہ سب

کس کی شرارت تھی۔ اس کے بعد ایک اور کمیشن مقرر
کرنے کا ارادہ ہے، جو یہ تحقیق کرے گا۔ آیا شاہ جہاں
قدرتی موت مرا تھا۔ یا اُسے زہر دیا گیا تھا۔ یا اُس
نے خودکشی کی تھی۔ پھر ایک اور کمیشن مقرر کروں گا۔
جو پتہ لگائے گا میں تمام قدیم اور جدید سیاستدانوں
سے کیوں عقلمند ہوں۔

پہلا (تیسرے سے) آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا۔ آپ
قیمتوں کو نیچے لانے کے لئے ایک جامع پلان بنا رہے
ہیں، اس کا کیا بنا؟

تیسرا وہ پلان شروع کیا جا چکا ہے۔ پانچ کمیٹیاں بنائی گئی
ہیں۔ پہلی اس بات کی تحقیق کریں گی، آیا قیمتیں بڑھی
ہیں، یا یہ محض افواہ ہے۔ دوسری اس بات کا فیصلہ
کرے گی۔ کس حد تک بڑھی ہیں۔ تیسری یہ سراغ
لگائے گی۔ کیوں بڑھی ہیں۔ چوتھی یہ تجویز کرے گی
انھیں فوراً بڑھنے سے روکنا چاہیئے۔ اور پانچویں
یہ انکشاف کرے گی، انھیں بڑھنے سے کسی طرح بھی
روکا نہیں جا سکتا۔

پہلا یہ سارا پلان کم از کم کب تک مکمل ہو جائے گا۔

تیسرا کم از کم پندرہ سال میں۔

پہلا خدا کا شکر ہے۔ ہم سب کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں، اور
یہ بیکار رہنے سے کہیں بہتر ہے۔ مجھے یقین ہے۔
ہماری کوششیں ضرور رنگ لائیں گی۔ اور عوام کو
تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر ملک کی باگ ڈور لائق اور
منجھے ہوئے سیاستدانوں کے ہاتھ میں ہو تو پیچیدہ
سے پیچیدہ مسائل چٹکی بجاتے میں حل ہو جاتے ہیں۔

●●

دلاور فگار

لیڈرشپ

ایک بڑھے فلسفی نے کل کہی مجھ سے یہ بات
آ بتاؤں میں تجھے کیا لیڈری کی ہیں صفات
خود نہیں پٹتی مگر اوروں کو پٹواتی ہے یہ
جب کہیں جلسہ ہوا لگوا دیئے دو چار ہات
لیڈری کا حافظہ کمزور ہو جاتا ہے جب
ٹھیک کر دیتے ہیں اس کو ماہرینِ نفسیات
لیڈری جوشِ جنوں میں یوں نکلتی ہے کبھی
جیسے عاشق کا جنازہ جیسے مجنوں کی برات
سوشلسٹک ویوز بھی رکھتی ہے اکثر لیڈری
اور اسلامی بھی ہو سکتے ہیں اس کے نظریات
یہ مسلماں ہو کے بھی کہتی ہے خود کو سوشلسٹ
اشتراکی ہو کے بھی پڑھتی ہے یہ "راہِ نجات"
لیڈری کے مختلف رخ، مختلف ردِ عمل
لیڈری نارِ جہنم لیڈری آبِ حیات
یہ رموزِ مملکت تیری سمجھ میں آئیں کیا؟
یہ سیاست ہے، نہیں ہے فاعلاتن فاعلات
لیڈری کی سینکڑوں قسمیں اصولی طور پر
لیکن ان میں سے بہت مشہور ہیں تین پانچ سات
فی سبیل اللہ، مادر زاد، تنہائی پسند
اشتہاری، انقلابی، مستقل اور اتفاقی
ذیلی و فصلی بھی ہو سکتی ہے اکثر لیڈری
بہرِ تشریح و توضیحات دیکھئے "مخزن اللغات"
عالمِ فانی میں پہلے تک تھیں ایسی ہستیاں
لیڈری نے بخش دی ہیں کیسی کیسی شخصیات

●

رضا نقوی واہیؔ

یہ نظم نامور طنز و مزاح نگار شاعر جناب رضا نقوی واہی کی طویل نظم 'شعرستان' کا تازہ ترین باب ہے۔ شاعروں نے اپنے لئے ایک ہوم لینڈ کی مانگ کی تھی۔ حکومت نے بعد از خرابیٔ بسیار یہ مانگ منظور کرلی اور بحرِ ہند کے ایک غیرآباد جزیرے کو ریاستِ شعرستان کا نام دے کر شاعروں کے حوالے کر دیا۔ اُس جزیرے میں کھانے کے لئے صرف مچھلیاں اور پینے کے لئے محض تاڑ کا رس میسر تھا۔ شعراء دن بھر مچھلیاں پکڑتے اور رات بھر جم کے مشاعرے منعقد کرتے۔ اُنھوں نے اپنی ایک حکومت بھی بنالی تھی۔ ایک اسمبلی بھی تھی، جس کا نام "ایوانِ غزل" تھا۔ ——— ادارہ ———

شعرستان میں مکمل اِنقلاب

شاعرانِ برہم و ناراض شعرستان کے — زیست کی یکسانیت سے جب بہت اُکتا گئے
بحر و وزن و قافیہ کی توڑ پھوڑ آئی نہ راس — شعر گوئی کی مشقت نے کیا جب بدحواس
وقتِ فرصت ریت کے ٹیلوں پہ اکثر بیٹھ کر — سوچتے رہتے تھے اِس زنداں سے ترکیبِ مفر
اِک جہاں دیدہ سخنور جن کی ساری زندگی — باغیانہ اصطلاحیں وضع کرنے میں کٹی
سَربراہانِ ریاست سے جنھیں تھا یہ گِلہ — اُن سے کیوں لیتے نہیں نظم و نسق میں مشورہ
اُن کے اوزان و قواعد اُن کی اِصلاحات کو — شاعری کے مینوَل میں اُن کی ترمیمات کو
آزماتے اور بروئے کار کیوں لاتے نہیں — خود تو یہ ہے محفلوں میں اُن کو پڑھواتے نہیں
شاعروں کی برہمی موصوف کو راس آگئی — خود بخود دندان و لب کے سامنے گھاس آگئی
نورچشمانِ سخن سے کرکے قائم رابطہ — سَربراہوں کے مخالف بن گئے باضابطہ
مملکت میں صنعتِ اشعار سازی کے خلاف — چل پڑی تیزی سے تحریکِ "مکمل انحراف"
پیرِ مردِ شاعری نے ہاتھ میں لی باگ ڈور — ہوگئے شامل ایجی ٹیشن میں سارے کام چور
امن پرور شاعروں کی ضیق میں تھی زندگی — راہ چلتے، بیکل اُتساہی کی ڈاڑھی نوچ لی
چھین کے بیدی کی پگڑی "سَتر" کو ننگا کر دیا — پھاڑ کر مُلّا کا پاجامہ اُٹنگا کر دیا
جب بھی "ایوانِ غزل" میں شعر پڑھتے تھے فراقؔ — دیکھتے ہی سارے لونڈے اُن سے کرتے تھے مذاق
شاعری واہیؔ کے حق میں اِک مصیبت ہوگئی — خود اُنہی کے طنز سے اُن کی حجامت ہوگئی
چھین لیتے اہلِ مچھلی شہر کے ہاتھوں سے جال — جس سے شعرستان میں پیدا ہُوا مچھلی کا کال
کر دیا برپا ایجی ٹیشن نے ہر سُو خلفشار — پھیلتا جاتا تھا ایوانِ غزل میں اِنتشار

بڑھ گئی تخریب کاری جب زِ حدِ اعتدال
آگیا نظم و نسق کے ذمہ داروں کو جلال
اُن کی جانب سے جوابی کاروائی کی گئی — مملکت میں رفعتاً نافذ ایمرجنسی ہوئی

حکمرانوں کے مخالف جو تھے، سب پکڑے گئے
جب گرفتار ایک اک تحریک کا لیڈر ہُوا
حکمراں طبقے نے کی تھی وقت پر یہ پیش رفت
بعد کچھ دن کے مگر اُس کی تھی آسانی بڑھی
جیل میں سڑتا رہا جب تک اپوزیشن کا دَل
شور و غُل ہوتا، نہ کوئی داد یا بیداد تھی
رکھے جاتے جیل میں لیکن وہ آخر تا کُجا
چُھوٹتے ہی قید سے کُل "شاعرانِ انحراف"
ہونے والا تھا جو "ایوانِ غزل" کا اِنتخاب
اتفاقاً اُن کی یہ ترکیب آخر بہہ گئی
"پیر فرتوتِ سخن" نے زندگی میں پہلی بار
یہ کرشمہ تھا مگر دراصل بوگس ووٹ کا
چور دروازے سے یُوں جب سب کا گُڈ وِل مِل گیا
پی کے ہر شاعر نے اِک اِک جُرعۂ "آبِ حیات"
جشن، ایوانِ غزل میں بھی مَنایا قوم نے
شاعرِ اعظم تھے لیکن تغلقِ عصرِ جدید
کیبنٹ میں بھی تھا ہر شاعر اُنہی کا ہم مزاج
جب بھی زیرِ بحث آتی شاعری کی کوئی شِق
ایک اِک مصرع پہ ہوتی تُوتُو مَیں مَیں اس قدر
جب بھی کرنے بیٹھتے تاویل و شرحِ "انقلاب"
خود سمجھ پاتے نہ جب مفہوم اپنی بات کا
اپنی ہی تشریح سے ہوتے نہ تھے وہ مطمئن
مُلک میں تھے لفظ و معنی کے مسائل اور بھی

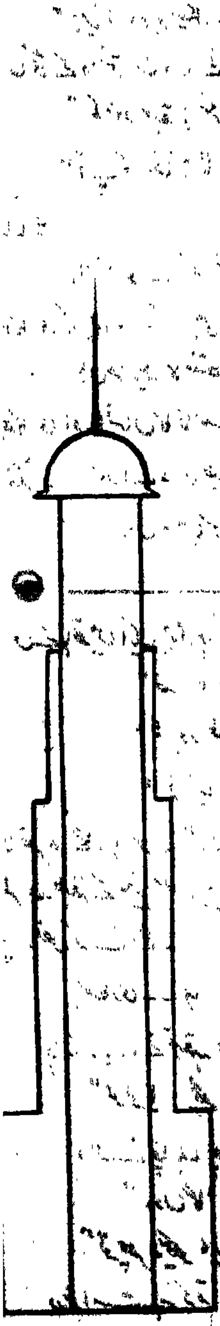
جیلے ادب پکڑے گئے کچھ باادب پکڑے گئے
ایک ہی دِن میں ایجی ٹیشن رفوچکر ہوا
ہوگئی مضبوط شعرستان پر اُس کی گرفت
اور بالآخر نتیجے میں پریشانی بڑھی!
سُونا سُونا سا نظر آتا تھا "ایوانِ غزل"
پھیکی پھیکی بے مزہ ایوان کی رُوداد تھی
رفتہ رفتہ کر دیا سرکار نے سب کو رہا
پھر ہوئے جی جان سے اصلِ حکومت کے خلاف
لَب پہ نعرہ تھا اپوزیشن کے "ٹوٹل انقلاب"
اِس سلوگن کی ہَوا میں ساری جنتا بہہ گئی
انتخابی معرکے میں فتح پائی شاندار
جس میں سارے نونہالانِ سخن کا ہاتھ تھا
حسرتوں کی ناؤ کو طوفاں میں ساحل مِل گیا
خوب جی بھر کے مَنایا مُلک میں یومِ نجات
پیر جی کو شاعرِ اعظم بنایا قوم نے
جن کے قول و فعل میں تھے اختلافات شدید
ذہن کے اجزائے ترکیبی میں تھا سب کے نزاج
کیبنٹ کے لوگ آپس میں نہ ہوتے مُتفق
طائرِ مفہوم اُڑ جاتا قفس کو توڑ کر!
حد تو یہ ہے، شاعرِ اعظم بھی ہوتے لاجواب
اِک نیا چکّر چلاتے شرح و تاویلات کا
آج کے ارشاد کی تردید کرتے اگلے دِن
حل وہ کیا ہوتے، نہ آیا کوئی زیرِ غور بھی!

اِک معمہ بن گیا آخر "مکمل انقلاب"
شاعروں کے حق میں جو ثابت ہُوا ریگِ سراب

ترقی کا کھمبا

★

فکر تونسوی



فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا ایک آدمی بھیک مانگ رہا تھا۔ نجانے اُسے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ فٹ پاتھ بھیک مانگنے کے لئے بھی بنائے جاتے ہیں ۔

ہاں، نجانے اُسے کیسے معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن بہرکیف اس کی معلومات کا کوئی نہ کوئی مخزن ضرور تھا

وہ بظاہر بھکاری لگتا تھا مگر بباطن انسان لگتا تھا۔ ظاہر اور باطن کا یہ فاصلہ اس نے کیسے عبور کیا ؟ — یہ سوال انسانی تاریخ کی صدیوں پہ پھیلا رہا، مگر اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا جواب دینا مناسب بھی نہیں سمجھا گیا۔ شاید جواب دیا جاتا تو نہ تواریخ مرتب ہو سکتیں نہ تہذیب نشوونما پا سکتی

مگر میری ٹریجڈی یہ ہے اگر بھکاری کو انسان کہہ دوں تو ڈرتا ہوں، بھکاری میرے گال پر طمانچہ نہ جڑ دے گا اور کہے گا " تمہیں شرم نہیں آتی مجھے انسان کہتے ہوئے ؟"

بھکاری اور انسان کے درمیان جس نے بھی فاصلہ معلوم کرنے کی کوشش کی اُسے طمانچہ کھانا پڑا — مگر میری دوسری ٹریجڈی یہ بھی ہے کہ تواریخ سے عبرت حاصل نہیں کرتا۔ تواریخ سے طمانچہ کھانا نیا نہیں سمجھا ... چنانچہ اُس کی طرف بڑھا اور پوچھا "جناب کا اسم شریف؟" بھکاری کو بھی جناب اور اسم شریف وغیرہ سے مخاطب کرنا — یہ میری تیسری ٹریجڈی ہے۔ وہ ... بولا "خدا کے نام پر"

... عرض کیا "آپ ... تو ... تمہارا تخلص ہے — اپنا اصلی نام بتاؤ؟"

"کمزور طبقہ؟" ...

"کمزور طبقہ؟ کیا یہ نام تمہارے والدین نے رکھا تھا؟"

"نہیں، وہ پریکٹیکل سائنس نہیں جانتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کے مستقبل کی پیش گوئی کیسے کرسکتے تھے۔ یہ نام تو مجھے سائنس کے دانش مندوں نے دیا ہے۔ کمزور طبقہ!"

"کمزور طبقہ! مگر نام کچھ اجنبی سا لگتا ہے"

"آپ کو لگتا ہوگا۔ مجھے اور مجھ سے بلکہ اب اگر اپنے آپ کو بھکاری نہ کہوں تو اپنے آپ کو ہی اجنبی لگنے لگتا ہوں"

اس کی گفتگو سے مجھے شاک لگا۔ یہ بھکاری سالا تو مفکر بھی ہے۔ ایک بھکاری اگر مفکر بھی ہو تو یہ اس کی بھی ٹریجڈی ہے بھکاری کی بھی، مفکر کی بھی ـــ ٹریجڈیاں فکر تو نسوں سے مخصوص نہیں۔ فٹ پاتھ پر بھی ملتی ہیں۔

میں طمانچے کا منتظر تھا مگر اس نے میرے گال پر مفکر جڑ دیا۔ طمانچے کی یہ نئی قسم، زیادہ تہ ناٹے دار تھی۔ میں جھنا گیا بھکاری اور انسان کا فاصلہ معلوم کرنا اور مشکل ہو گیا اور بھی عبرت ناک ہو گیا، اور بھی کنفیوزڈ ہو گیا۔ بھکاری، انسان، مفکر ـــ اور اب کمزور طبقہ۔ اس ذی روح کو ان گنت ناموں نے گھیر رکھا ہے!

سوال وہیں کا وہیں رہا۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا ـــ

● ـــــــــ اتنے میں وہاں ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ غیر معمولی تھا۔ قد میں بھی غیر معمولی، شکل میں بھی بدن میں بھی اس کے ہاتھ میں ایک چرمی چابک تھا جو اس نے بھکاری پر یوں لہرایا جیسے کال بیل بجاتے ہیں۔ بھکاری نے اٹھا "خدا کے نام پر"

"خدا کا نہیں، اپنا نام بتاؤ"

"کمزور طبقہ!"

"مل گیا، مل گیا" اس نے فرطِ مسرت سے یوں چابک لہرایا جیسے کوئی لیڈر "انقلاب زندہ باد!" کا نعرہ لگا رہا ہو۔ "میں صبح سے تمہاری تلاش میں تھا دوست! مگر مجھے یقین تھا کہ تم ضرور مل جاؤ گے کیونکہ خدا کی مخلوق کمزور طبقہ کے بغیر مکمل نہیں۔ خدا! خدا! راہ خدا یا! کس چیز کی کمی ہے، خواجہ تری گلی میں .... " یہ کہہ کر وہ چابک کی لے پر رقص کرنے لگا۔

بھکاری نے کہا "خدا کے نام پہ مجھے بھیک دے دو!"

چابک باز نے قہقہہ لگایا۔ "تم مجھ سے بھیک مانگتے ہو، میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں"

"بولو! مجھے بھیک دو گے یا . . . "

اس نے چابک پھر لہرایا۔ بھکاری اٹھ گیا۔

"دوں گا" بھکاری گویا ہوا۔

"تو پھر دیکھو، یہ جو تمہارے بغل میں ترقی کا کھمبا ہے اس پہ چڑھ جاؤ۔ میری خواہش ہے، نہیں، خواہش نہیں، درخواست ہے کہ تم میرے سامنے ہی ترقی کر جاؤ"

مگر اس کے لب و لہجہ میں درخواست کے بجائے حکم تھا ـــ بھکاری تھر تھر کانپنے لگا کیونکہ حکم پر تھر تھر کانپنا

کی عاجت ثانیہ تھی۔ اس نے انسان اور بھکاری کا درمیانی فاصلہ تھر تھر کا نپنے میں ہی طے کیا تھا ـــــ اس کے اندر کا ملکہ سو گیا۔ کی آواز تھکن کے لئے لوری بن گئی۔

اس نے گڑگڑا کے جوڑے ہاتھ جوڑے اور کہا "حضور! میری دھوتی مجھے اُدھ ننگا کر کے پھسل کر بدن سے اتر جاتی ہے اور ننگی ہاتھ اگر میں کھمبے پر چڑھا تو خطرہ ہے میرے باقی ماندہ سانس بھی میرے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔"

چابک باز نے اس کے ننگے کندھے پر تھپکی دی (تھپکی جیسے برف کی سِل پر جا پڑی) اور جیسے التجا سی کی۔ "پیارے کم ظرف! تم احمق ہو۔ تم نہیں جانتے کہ تم وہ چیزیں بھی نہیں جانتے، جنہیں تم نہیں جانتے۔"

"مگر میں بھیک مانگنا تو جانتا ہوں۔"

"اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھیک مانگنا مت جانو اور ترقی کے اس کھمبے پر چڑھ جاؤ۔ جونہی تم چڑھ جاؤ گے یہ کھمبا، تمہارے کی بسل ایسے بدن کے لئے اُونی سوٹ بن جائے گا۔ تمہیں جاڑا نہ ستائے اس کے لئے ہم نے یہ ترقی کا کھمبا تمہارے لئے ایجاد کیا ہے۔ شاباش! چڑھ جاؤ اوپر!"

"مگر مجھے تو بھوک لگی ہے مہربان! مجھے پہلے ایک آدھ روکھی سوکھی روٹی عنایت کر دیجئے تاکہ اُسے کھاتے ہی بدن میں اتنی استطاعت آ جائے کہ میں آسانی سے اس کھمبے پر چڑھ جاؤں۔" چابک باز نے ہمدردی سے کہا۔

"افسوس! تم احمق ہو۔"

بھکاری نے کہا "احمق؟ میرے لئے یہ فرسودہ اطلاع ہے۔"

"مگر یہ کھمبا فرسودہ نہیں ہے، نیا ہے۔ تم اس پر چڑھ جاؤ تو معجزہ ہو جائے گا۔ کہ تمہاری بھوک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چڑھ جاؤ ـــ چڑھ جاؤ!"

بھکاری ہچکچایا۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھنے کے لئے سوسائٹی کے کچھ اور شرفا نمودار ہو گئے، کچھ اور چابک، کچھ اور دین، کچھ اور ڈیل ڈول ـــــ ان میں سے ایک بولا۔ "یہ ترقی سے کیوں ہچکچا رہا ہے پاگل ہے۔"

"سوکھی روٹی مانگتا ہے۔"

"اس کا کشکول چھین لو۔"

"تڑا تڑ تڑا تڑ چابک عرض کرو!"

"پھر دیکھیں گے، سالا کیسے ترقی نہیں کرتا۔"

بہت سی آوازیں، بہت سی دھمکیاں، بہت سے ڈیل ڈول ـــ ایک، اکیلا، ان سب میں اجنبی، وہ بھکاری سہم گیا۔ چابک باز نے [illegible] بھکاری کے سر پر لٹکتے ہوئے کہا "تمہیں ٹھیٹھ منتا کا وقفہ دیا جاتا ہے اگر اس دوران تم کھمبے پر نہ چڑھے تو ہم سب کا ہاتھ فیل ہو جائے گا [illegible]"

[illegible]

ہوئی انسانیت ایک دم چنگاری کی طرح بیدار ہوئی۔ اور وہ اس چنگاری کی روشنی میں، اپنی کانپتی ٹانگوں اور لڑکھڑاتی کلائیوں کے ساتھ ترقی کے کھمبے پر مینڈک کی طرح چڑھ گیا۔

● ——— جونہی کمزور طبقے کو کھمبے پر چڑھتے دیکھا۔ نیچے کھڑے ہوئے معززین نے زور و شور سے تالیاں بجائیں جیسے کسی خطاب یافتہ شاعر کے بے وزن شعروں پر داد دی جاتی ہے اور بولے:

"گڈ، ویری گڈ! اور اوپر چڑھ جاؤ"

مینڈک پھدک کر قدرے اوپر چڑھ گیا۔

"ونس مور! ونس مور!"

مینڈک ونس مور ہو گیا۔

اپنی اس کامرانی پر سوسائٹی کے شرفا جو پہلے ہی پھولے ہوئے تھے کچھ اور بھی پھولے نہیں سمائے۔ انھوں نے کمزور طبقے کے نام پر ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ ایک تو ندیل سیٹھ جی نے جو باداموں کے شربت کا ایک قدم ساتھ لائے تھے۔ گلاس بھر بھر کر ہر ایک کو پیش کیا۔

کمزور طبقے نے ان گلاسوں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔

نیچے ایک فلمی کیمرہ مین نے آواز دی۔ "مرحبا! حسرت کی یہ سچویشن لاجواب ہے مگر تم ایک آہ بھی بھرو۔ تاکہ سچویشن مکمل ہو جائے۔"

کمزور طبقے نے آہ بھری

کیمرہ مین نے سچویشن کو سلو لائیٹ میں قید کر لیا۔

ایک شاعر نے جسے اپنی شاعری سے زیادہ اپنے پدم شری بن جانے کا زعم تھا جب دیکھا کہ فلمی کیمرہ مین شوٹنگ کی کوشش کر رہا ہے تو اس کے پدم شری ذہن میں چیونٹیاں رینگ اٹھیں اور وہ ترنم میں کمزور طبقے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اے پسماندگی کے دیوتا! تمہاری حسرت پر شاعر نے بھی ایک مصرع عرض کیا ہے۔ مصرع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

کمزور طبقے نے شعر سنا اور مزید مرجھا گیا۔ شاعر نے کہا:

"واہ! داد دیجئے حضور کمزور طبقہ! ہاتھ بلند کر کے داد دیجئے۔"

"نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میرے ہاتھ ترقی کے کھمبے نے پکڑ رکھے ہیں۔"

"واہ سے!" شاعر کے منہ سے نکلا "زیر قبلہ! اپنی زبان مبارک سے ہی مصرع دہرا دیجئے۔ یہ تیرے لیے ادا ہے کہ ہاں داد مجھی گئی۔"

کمزور طبقے نے کمزور ترین لہجے میں مصرع دہرایا مگر پھر بھی داد کے لیے ہاتھ اٹھا دیا اور کمزور طبقے کے منہ سے کچھ لفظ ادا ہو گئے۔ اس کے منہ سے ایک نحیف و نزار سی چیخ نکلی۔ "حضرات! کیا اب میں نیچے اتر آؤں۔ یہ بستہ ہوا میں مجھ کو دیتے ہیں"

نیچے کھڑے ہوئے حضرات نے اس کی چیخ نہیں سنی کیونکہ ایک تو چیخ خفیف تھی اور دوسرے وہ ترقی کے کھمبے سے فریاد سننے کو نہ کر پاتے تھے۔ وہ تو خوشگوار شگون، پر مسرت آنچل کو دا اور طمانیت بخش شور و غوغا میں معروف تھے۔ ڈھول اور نقارے بجا شروع ہو چکے تھے۔ کئی معززین، دیکھنے کے پیگ ایک دوسرے سے ٹکرانے میں معروف تھے۔ بلکہ کئی ایک تو نظر بچا کر دوسروں کے پیگ پیگوں میں بھی ڈال رہے تھے۔ سالم مرغے نگل رہے تھے۔ غبارے اڑا رہے تھے۔

ایک دم کونے سے نعرہ لگا "محفل رقص و سرود! کہاں ہیں رقاصائیں کہاں ہیں قوال۔ کمزور طبقے کی ترقی کی خوشی میں ناچو، گاؤ، اور ازل ابد کی رعنائیوں کو سُر تال میں لے آؤ"

مگر نعرے کے آخری الفاظ ابھی کمزور طبقے تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ ایک کافر ادا ڈانسر چھنک اٹھی اور کیبرے ڈانس کے ساتھ جھن جھنانے لگی۔

"اس رقص کی کل آمدنی کس کو جائے گی" — "کمزور طبقے کو، کمزور طبقے کو۔"

ڈانس کی لہروں پر ان کا دل بہلنے لگا۔ کمزور طبقے کا دل دہلنے لگا۔

اتنے میں ایک صاحب نے مچھلی کا ایک تلا ہوا ٹکڑا، کمزور طبقے کی طرف اچھال کر کہا "مسٹر کمزور طبقہ! کھاؤ، انقلاب زندہ باد!"

اور دوسرے لمحے میں مچھلی کا ٹکڑا یعنی انقلاب — زندہ باد بلندی سے نیچے گرا۔ اور اس سے پہلے کہ انقلاب زمین کی مٹی میں مل جاتا، صاحب مذکور نے اپنے منہ کے چاروں طبق کھولے اور مچھلی کا وہ ٹکڑا سیدھا ان کے منہ میں جا گرا۔ وہ صاحب سرکس کے کھیل میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

مچھلی اور منہ کی اس جمناسٹک پر لوگوں نے "ہپ ہپ ہُرے" کہا۔ کچھوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لے لیا۔ بلکہ ایک حسین لیڈی نے تو اپنے پالتو کتے کا بوسہ لے لیا۔ اس بوسے کے جواب میں کمزور طبقہ نے ایک اور چیخ ماری۔ اس مرتبہ چیخ قدرے بلند تھی، قدرے دردناک تھی اور جیسے نہ کہہ کر بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ "صاحبان فراست! کیا اب میں نیچے آجاؤں؟"

"نہیں نہیں، ابھی نہیں۔" ایک صاحب چلائے۔

"ابھی اور اوپر چڑھو جاؤ۔ اور اوپر!" ایک اور صاحب نے ہدایت کی۔

"نہیں نہیں۔ اسے حد سے زیادہ نہیں چڑھنا چاہیئے ورنہ اس کا دماغ بگڑ جائے گا۔" ایک اور صاحب نے [illegible] اسے کھمبے کی چوٹی پر بٹھا دینا چاہیئے۔"

"[illegible] کیوں ٹھہرو! ابھی چوٹی پر نہیں، ابھی اسے چوٹی سے پہلے والے پڑاؤ پر بیٹھے رہنا پڑ رہا ہے۔"

"ایسے نہیں کرتے بچے۔" ایک اور صاحب نے منکر بازی کا سا منہ بنا کر کہا "تم مکار ہو، بلکہ غدار ہو، تم نہیں چاہتے کہ کمزور طبقہ اوپر اٹھے۔" اس نے حاضرین کی طرف رجوع کیا "معززین شہر! آپ ہی فرمائیے! اسے اوپر آنا چاہیئے یا نہیں؟"

"ہاں! ہاں! اور اوپر! اور اوپر! اوپر جائے گا تو ہمیں اور بھی زیادہ مزا آئے گا۔"

بیک وقت بہت سی آوازیں ابھریں بلکہ چیخیں مگر کمزور طبقہ کو یہ آوازیں ایک نیزے کی طرح چبھیں وہ خوف اور دہشت کے مارے اور اوپر چڑھنے لگا اور زیادہ کانپنے لگا۔ بھوک اور زیادہ چمکنے لگی۔ دھوتی اور زیادہ پھٹ گئی ۔۔۔ مگر اس کے باوجود وہ اوپر چڑھتا گیا اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے جانا اس کی مجبوری تھی یا خواہش تھی ۔۔۔ اس کے متعلق کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا۔

اتنے میں ایک چم چماتی کار، دائیں کونے سے ابھری۔ اس میں سے ایک خوبرو مرد، اس سے بھی زیادہ خوبرو عورت کے ساتھ باہر نکلا۔ عورت داشتہ تھی یا مرد داشتہ تھا کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس منظر میں ہر چیز واضح ہونے کے باوجود غیر واضح تھی۔ خوبرو مرد نے پائپ کا کش لگاتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے صاحبان!"

"جی جی جی، کمزور طبقہ، ترقی کے کھمبے پر چڑھ رہا ہے۔"

"واہ، واہ! بڑا دلکش ڈرامہ ہے کتنا ٹکٹ لگا رکھا ہے؟"

"فری شو ہے"

اس پر ایک ساہوکار جس کی ٹھوڑی اور گردن کا فاصلہ معدوم ہو چکا تھا۔ بغل میں بہی کھاتہ سنبھالے، آگے بڑھا اور بولا

"آپ کے منہ میں گھی شکر! میں تو کئی مرتبہ مشورہ دے چکا ہوں کہ ٹکٹ ضرور لگایا جائے مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔"

"اے کمینے سرمایہ دار! ترقی کمزور طبقے کی اور تجوری تم بھرنا چاہتے ہو" ایک سماج وادی قسم کا سفید پوش بولا۔

ساہوکار بولا "نہیں، ٹکٹوں کی آمدنی، ویلفیر فنڈ میں جائے گی۔"

مجمع نے تالیاں بجائیں، سماج وادی کو گالیاں دی گئیں جو اس نے وہسکی کے پیگ میں سوڈا واٹر کی طرح ڈال دیں اور پی گیا۔ ساہوکار نے اپنے ملازم کو اشارہ دیا۔ اس نے فوراً بکنگ آفس کا بورڈ لگا دیا اور ساہوکار خود کھڑکی میں بیٹھ کر ٹکٹیں بیچنے لگا۔ پانچ منٹ میں پانچ ہزار روپے کی ٹکٹیں بک گئیں بلکہ کچھ ٹکٹیں بلیک مارکیٹ میں بھی بک گئیں۔ چم چماتی کار والے صاحب نے پچاس ٹکٹیں بلیک میں خریدیں اور اعلان کیا کہ انہیں تماش بینوں میں مفت بانٹ دیا جائے اور اسے ویلفیر فنڈ میں ان کا چندہ سمجھا جائے۔

اس اعلان پر یوں تالیاں پیٹی گئیں جیسے اُن صاحب نے مصرعِ طرح پر کوئی استادانہ گرہ لگائی ہو۔ وہسکی کا ایک ایک پیگ اور پیا گیا۔ کار والے کے گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالے گئے کمزور طبقے نے اپنی سہمی ہوئی چور آنکھوں سے دیکھا اور منمنایا۔

"معززین کرام! یہ بلیک میں ٹکٹیں کیوں بیچی جا رہی ہیں؟"

"شٹ اپ! بے وقوف! یہ تمہاری ترقی کے اعزاز میں بیچی جا رہی ہیں۔ جانتے ہو اس رقم سے تمہارے لیے کیا بنایا جائے گا؟"

"کیا؟"

"کھمبے کی چوٹی پر ایک جھونپڑی!"

ز ور طبقہ نے بغیر آنسوؤں کے رو کر کہا " مجھے جھونپڑی نہیں چاہیئے مجھے بھوک لگی ہے ، کیا کوئی صاحب میری طرف دو چار لقمے
ھینک سکتے ہیں ؟"

معززین نے آپس میں مشورہ کیا اور باتفاق رائے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر لقمے پھینکے گئے تو وہ زمین پر آ گریں گے
ر یہ سائنس کے قوانین سے لاعلمی کا اظہار ہوگا لہٰذا ......

" لہٰذا تم مطمئن رہو ۔ تم اور اوپر چڑھو کیونکہ کھمبے کی چوٹی پہ ڈنر کی کئی میزیں آراستہ ہیں ۔"

" مگر میزیں دکھائی نہیں دے رہیں ۔"

" ہمیں دُوربین سے دکھائی دے رہی ہیں ۔"

کمزور طبقہ کے پاس دُوربین نگاہ نہیں تھی اس لئے یوں لگا جیسے اس نے مزید اوپر چڑھنے سے انکار کر دیا ہے اور
جیسے نیچے کی طرف پھسل رہا ہے ۔

نیچے کے معززین نے اسے پھسلتے دیکھ کر ڈھیلے مارے ۔ اینٹوں کے نشانے لگائے کوئی ایک نے کمان پر تیر چڑھا
چھوڑے تاکہ کمزور طبقہ اُوپر چڑھ جائے وہ نیچے پھسل کر بے وقوفی کر رہا ہے اور وہ اُسے کسی بے وقوفی کا موقع نہیں
ینا چاہتے تھے ۔

کیونکہ انھوں نے بڑی مشکل سے تو اُسے ترقی کرنے کا نادر موقع دیا تھا ۔

ڈھیلوں ، تیروں اور اینٹوں کے مناظر کے فٹافٹ فوٹو لئے گئے ۔ ایک دوسرے کو مبارک بادیں دی گئیں اور پھر اچانک
ں لگا جیسے اب وہ اس تماشے سے پوری طرح لطف اندوز ہو چکے ہیں اور کمزور طبقہ نے چور نگاہوں سے دیکھا کہ معززین آہستہ
ہستہ اپنی کاروں اور سکوٹروں پر سوار ہو کر کھسکتے جا رہے ہیں اور جوں جوں میدان خالی ہو رہا ہے ، کمزور طبقہ کے اطمینان کے
انس بڑھتے جا رہے ہیں اور ... اور ...

... اور وہ پھر آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگا نیچے اتر کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور بڑے اطمینان سے بھیک
مانگنے لگا ۔

راہی + غالب

گھر ہو، کہ گلی ہو، کہ محلہ مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اب تک مرے منہ سے کوئی گالی نہیں نکلی
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
شیونگ کی خاطر نہیں آئینے کی حاجت
بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے
گو آج وہ منسٹر ہیں، مگر کل تھے منسٹر
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے
برقعے میں جو "بی بی" ہے تو اسکرٹ میں "بے بی"
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
پہلے تو "سمن" نکلا تھا، اب آیا ہے "وارنٹ"
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے
پھر مجھ سے سنے شہر کے ہر شخص کا "شجرہ"
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
یہ مشغلہ در اصل تھا مجنوں کا، مگر اب
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
میں فلسفے کا ایم۔ اے ہوں اس واسطے شاید
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
شاعر ہوں، نہانے کا میں عادی نہیں، پھر بھی
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
میں سانولا ہوں، اس کا تو اقرار ہے، لیکن
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
نبض اس نے "ٹٹولی"، تو رکی قلب کی رفتار
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

غالب کو جو اچھا نہیں کہہ سکتے، تو راہی
"غالب کو برا کیوں کہو، اچھا! مرے آگے"

راہی قریشی

دال کی عظمت

ہوئی ہے دال منظورِ نظر جب سے گرانی کی
لڑاتی ہے یہ آنکھ، اللہ اکبر، مرغ و ماہی سے
الٰہی چھن گیا مفلس کے منہ کا یہ نوالہ بھی
کہ اب اس کا تعلق ہو گیا ہے خوانِ شاہی سے

"نصف بہتر"

کہا اہلیہ سے شوہر "خانہ نشیں" بولا
اطاعت کر مری اے نفسِ بے غیرت! میں شوہر ہوں
جواباً منہ چڑا کر اس پری پیکر نے فرمایا
کما کر لاتی ہوں، بیوی نہیں، حضرت میں شوہر ہوں

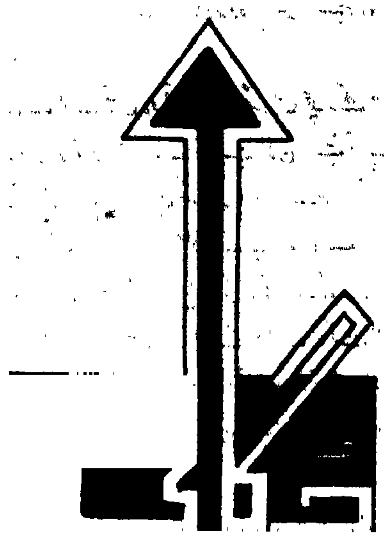
تب اور اب

استاد ڈنڈے مارتے، پوچھا جو میں نے کل
حضرت نے کیوں بدل دیا سختی کو پیار سے
کہنے لگے، ہوا ہوئے دن رعب داب کے
اب ہم ہی بچتے پھرتے ہیں لڑکوں کی مار سے

گرانی

کل گرانی کی [illegible]
فاقہ مستی اور گرانی لازم و ملزوم ہیں
کیا قیامت ہے کہ مردے بھی نہ زد سے بچ سکے
فاتحہ سے والدِ مرحوم اب محروم ہیں

اعجاز وارثی



مجتبیٰ حسین

آدمی اور جانور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جانور جگالی کرتا ہے اور آدمی صرف گالی دیتا ہے ـــــ جگالی کرنے سے جانور کی غذا ہضم ہو جاتی ہے اور گالی دینے سے آدمی کے منہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے مگر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو گالی دے کر مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ جگالی کرنے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ آخر آدمی کو بھی تو جانور سے کچھ نہ کچھ سیکھنا ہی چاہیئے۔

ہمارے ایک دوست ہیں جمال الدین ـــــ ایک دن ان کے گھر پہونچ کر دروازہ جو کھٹکھٹایا تو ان کا نوجوان لڑکا جگالی کرتا ہوا باہر نکل آیا اور ہمارے سامنے کھڑے ہو کر جگالی کے سلسلہ کو طول دینے لگا۔ ہم نے سوچا شاید کھانا کھاتے کھاتے باہر نکل آیا ہے، اس لئے اسے اتنا موقع تو ملنا چاہیئے کہ وہ نوالہ کو حلق سے نیچے اتار لے۔

ہم نوالہ کے نیچے پہونچنے کے انتظار میں کھڑے رہے، اور وہ ہمارے انتظار کو خاطر میں لائے بغیر جگالی کرتا رہا۔ دو چار منٹ کے وقفہ کے بعد ہم نے تنگ آکر کہا ـــــ "برخوردار! کیا تمہارے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہے جو نوالہ کو حلق سے نیچے نہیں اتار پا رہے ہو۔ آخر اس مسلسل جگالی کا کیا مطلب ہے؟" اس نے جگالی کو دوسرے جبڑے میں منتقل کرتے ہوئے کہا: "انکل! میں تو چیونگ گم کھا رہا ہوں۔ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں جگالی کر رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو اس چیونگ گم کو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھ لیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بائیں جبڑے میں سے سفید سی شے نکالی اور اسے ہمارے ہاتھ پر رکھنا چاہا۔ تو ہم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ورنہ ہمیں اپنے ہاتھ کو دھونے میں نہ جانے کتنی محنت کرنا پڑتی۔ جب اس نے دیکھا کہ ہم اس کے تحفہ کو قبول کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں تو اس نے "تحفہ" کو پھر سے اپنے منہ میں رکھ لیا۔

ع　پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!

ہمارا یہ خیال ہے کہ انسان نے اگر جانور سے کچھ سیکھا ہے تو یہی جُگالی کرنا۔ یہ اور بات ہے کہ جانور جگالی کرتے وقت اپنے مُنہ میں کھانے کی کوئی چیز نہیں رکھتا۔ دیکھا جائے تو جانور کی جُگالی بڑی بے غرض اور بے لوث ہوتی ہے۔ یُوں بھی اس جگالی کی نوعیت بڑی فلسفیانہ ہوتی ہے کیونکہ اصل میں وہ کچھ کھاتا نہیں، مگر یُوں لگتا ہے، جیسے وہ کچھ کھا رہا ہے ؎

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!

اس بے غرض اور بے لوث جگالی کے مقابلہ میں آدمی کی جگالی بے لوث نہیں ہوتی۔ آدمی مُنہ میں کچھ رکھے بغیر جانور کی طرح جگالی نہیں کر سکتا۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ آدمی دوسروں کو تو دھوکہ دے سکتا ہے لیکن اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی صلاحیت اُس میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا آدمی جُگالی کرنے کے لئے یا تو اپنے مُنہ میں پان دبائے رکھتا ہے یا چیونگ گم یا کوئی ایسی چیز جو لاکھ کوشش کے باوجود نہ مُنہ سے باہر نکلتی ہے اور نہ ہی حلق کے نیچے جاتی ہے۔

پان کی مدد سے جُگالی کرنے والے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے۔ ہونٹوں پہ پان کی سُرخی جمائے یہ لوگ سارا سارا دن اپنے جبڑوں کو حرکت میں رکھتے ہیں۔ شاید ہی کوئی منٹ ایسا گزرتا ہوگا جس میں ان کے جبڑے حرکت میں نہ رہتے ہوں۔ بعض پان چبانے والے اس فن میں وہ مہارت حاصل کرتے ہیں کہ مُنہ میں پان کو الگ رکھتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والی پیک کو الگ رکھتے ہیں۔ ایک ایک گھنٹہ تک مسلسل جگالی کرنے کے بعد وہ پان کی پیک کو اپنے مُنہ میں سے یُوں نکال پھینکتے ہیں، جیسے ہوٹل والے دُودھ میں سے مکھی!

ہمارے ایک دوست ہیں جو پان کے ذریعہ جُگالی کرنے کے بڑے ماہر ہیں۔ ایک بار ان کی صحت خراب ہوئی تو ہم مزاج پُرسی کرنے کی غرض سے اُن کے ہاں گئے۔ باتوں باتوں میں ہم نے کہا: "بھئی! تم سارا دن ایک ہی جگہ پہ بیٹھے جُگالی کرتے رہتے ہو، تھوڑی سی جسمانی ورزش کیا کرو تو تمہاری صحت ٹھیک رہ سکتی ہے"۔ یہ سُنتے ہی بولے: "قبلہ! جو آدمی پان چباتا ہے، اس کے لئے جسمانی ورزش کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ وہ تو سارا دن جسمانی ورزش کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ اپنے جبڑوں کو ورزش کراتا رہتا ہے"۔

ہم نے کہا: "لیکن جبڑے تو سارا جِسم نہیں ہوتے، ہاتھ پَیر بھی تو ورزش کے طلبگار ہوتے ہیں"۔

بولے: "تم پان چبانے کے بُنیادی اُصولوں سے ناواقف ہو۔ پان چبانے کی ہر بات میں ورزش کا پہلو نکلتا ہے۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ پان چبانے والے کو ہر دس پندرہ منٹ بعد پیک کو اپنے مُنہ سے نکالنے کے لئے اُٹھنا پڑتا ہے، چند قدم چلنا پڑتا ہے اور پھر اپنی جگہ پہ واپس آکر بیٹھنا پڑتا ہے۔ آپ سے کیا چھُپانا کہ اس عمل کے گزرنے کے لئے مجھے دن میں کم از کم ڈیڑھ سو بیٹھکیں لگانی پڑتی ہیں اور پیدل چلنے کا فاصلہ کسی بھی قیمت پر تین میل سے کم نہیں ہوتا ہوگا۔ ہے کوئی گبرو جوان، جو اتنی ورزش کر کے دکھا دے"! یہ کہہ کر وہ اپنی نشست سے اُٹھنے لگے۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہم سے کشتی لڑنے کے لئے اُٹھ رہے ہیں یا پان کی پیک تھوکنے کیلئے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر ہم دُور ہٹنے لگے تو اُنھوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پان کھانے والے کا قہقہہ خالص نہیں ہوتا بلکہ اس میں پان کی پیک کی ملاوٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کا قہقہہ سیدھا ہمارے شرٹ پر اس شان سے آکر گرا کہ ہمیں یُوں لگا جیسے ہمارا شرٹ ایک چمن زار میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہم بڑی دیر تک اُن کے سُرخ سُرخ قہقہہ کو اپنے شرٹ پر کھلکھلاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر اُن کی پوری مزاج پُرسی کئے بغیر ہی وہاں سے واپس چلے آئے۔ پان کھانے کے ماہرین کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیک کو بہت زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اس لئے وہ اسے زمین پہ گرانے کی بجائے لوگوں کے کپڑوں پر گراتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آسکے۔

یہ تو ہوئی پان کے ذریعہ جگالی کرنے والوں کی بات' ـــــ جو عموماً عمر رسیدہ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں میں چیونگ گم چبانے کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ چیونگ گم میں ایک انقلابی صفت یہ ہوتی ہے کہ اسے جتنا کچلا جائے یہ اتنا ہی سر اُٹھاتا ہے۔ شاعر نے شاید اسی قسم کی کسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہوگا ؎ دوب کی طرح سے دَب دَب کے اُبھرنا سیکھا

نوجوان چیونگ گم کی مدد سے ہر دم اپنا مُنہ چلاتے رہتے ہیں۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سُنا ہوگا کہ ایک نوجوان بس میں ایک مسافر کے سامنے بیٹھا لگاتار چیونگ گم چبائے چلا جا رہا تھا۔ جب وہ کافی دیر تک چیونگ گم چباتا رہا تو سامنے بیٹھے ہوئے مسافر نے اُس سے کہا: "برخوردار! تم بڑی [illegible] چلے جا رہے ہو۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ اس طرح تمہارا کچھ کہنا میرے لئے بے سُود ہے کیونکہ میری سماعت [illegible] اور میں کچھ بھی نہیں سُن سکتا۔" اب اُس بیچارے مسافر کو کیا پتہ [illegible] نہیں کہہ رہا تھا بلکہ چیونگ گم چبا رہا تھا۔

ہم نے ایک دن ایک نوجوان سے پوچھا: "بھئی! تمہیں چیونگ گم چبانے سے کیا ملتا ہے؟"

بولا: "چیونگ گم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی بیکاری میں بھی بے حد معروف نظر آتا ہے۔ پھر منہ میں چیونگ گم ہو تو وقت چٹکی بجاتے گزر جاتا ہے۔ بس اسٹاپ پر آپ بس کا انتظار کر رہے ہوں اور منہ میں چیونگ گم ہو تو لگتا ہے' جیسے آپ بس کا انتظار نہیں کر رہے ہیں بلکہ صرف چیونگ گم چبانے کے لئے بس اسٹاپ پر آکر کھڑے ہوگئے ہیں آدمی چیونگ گم چبانے میں اتنا معروف و منہمک ہو جاتا ہے کہ بس اُس کے سامنے سے گزر جاتی ہے لیکن وہ بس میں سوار نہیں ہوتا۔ بیخودی و سرشاری کا وہ عالم ہوتا ہے کہ آدمی دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور اگر آپ واقعی بس کا انتظار کر رہے ہوں اور بڑی دیر تک بس نہ آئے تو آپ احتجاجاً چیونگ گم کی مدد سے اپنے دانتوں کو پیس سکتے ہیں! اس سے دانتوں کو بھی نقصان نہیں پہونچتا اور آپ اپنے غصہ کا بھی اظہار کر سکتے ہیں۔ پھر نوجوانوں میں چیونگ گم چبانے کا رواج اس لئے بھی زیادہ ہے کہ نوجوانی ہر کٹھن کام کو ممکن کر دکھانا چاہتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم چیونگ گم کو چبا کر اُسے بالکلیہ ختم نہیں کر سکتے، لیکن اس کے باوجود ہم ہمت نہیں ہارتے اور لگاتار اس انقلابی جد و جہد میں معروف رہتے ہیں اس طرح کی تربیت آگے چل کر عملی زندگی میں نوجوانوں کے بہت کام آتی ہے۔"

نوجوان چاہے کچھ بھی کہیں' شخصی طور پر ہمارا خیال ہے کہ چیونگ گم چبانا اصل میں کسی معاملہ کو خواہ مخواہ لٹکائے رکھنے کے مترادف ہے۔ انسان کی فطرت کا ایک گوشہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس میں انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ کسی فیصلہ کُن نتیجہ پر نہ پہونچے اور معاملات جوں کے توں لٹکے رہیں۔ آپ کو سماج میں بے شمار ایسے مسائل مل جائیں گے جو چیونگ گم کی طرح محض لٹکے ہوئے ہیں۔ سماج انھیں چبانا چاہتا ہے لیکن یہ مسائل چبائے نہیں جاتے۔ مسائل کی بات چھوڑیئے بعض کردار بھی چیونگ گم کی طرح ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کو یونہی لٹکائے رکھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں مُنہ چلانا ہی سب سے اہم کام ہوتا ہے اور ہاتھ پاؤں چلانے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی!۔

یہ ماننا پڑے گا کہ انسان نے جانوروں سے جگالی کرنا سیکھا۔ لیکن اُس نے یہ نہیں سیکھا کہ جانور کام کے وقت کبھی جگالی نہیں کرتا، وہ تو صرف فرصت کے اوقات میں اس طرف راغب ہوتا ہے۔ ذرا سوچیئے، انسان اگر جانور سے جگالی کرنے کے اوقات بھی سیکھ لے تو کتنی خوشی کی بات نہ ہوگی!!! ▲

طالب خوندمیری

★

سیاسی موڑ

(اُمیدوار اور رائے دہندہ کے بیچ سمجھوتہ!)

—— جناب ساحر لدھیانوی کی نظم "خوبصورت موڑ" کی پیروڈی ——

"چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں"!
نہ مَیں تم سے کوئی اندیشہ رکھوں چالبازی کا
نہ تم دیکھو مجھے پھر "مطلبی انداز" نظروں سے
تمہارے نام سے گالی نہ آئے میرے ہونٹوں پر
نہ ظاہر ہو تمہارے فکر و فن کا راز نظروں سے

تُرپ چالوں سے نیتاؤں کی اب بیزار ہوں مَیں بھی
تمہیں بھی اب تھکن محسوس ہوتی ہے سیاست سے
مجھے بھی اب نہیں ہے شوق کوئی خود فریبی کا
تمہیں بھی کوئی دلچسپی نہیں جنتا کی خدمت سے

تمہیں بھی گو ہوس اُکسا رہی ہے پھر الکشن پر
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ نیتا پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی مجبوریاں ہیں ووٹ دینے کی
تمہارے ساتھ بھی تو کالے کرتُوتوں کے سائے ہیں

یہی موقع ہے تم بھی ترک کر دو اپنی چالاکی
اِدھر مَیں بھی بہلنا چھوڑ دوں رنگین خوابوں سے
بجھا سکتے نہیں تم بھی سمندر، ریگزاروں میں
بجھا سکتا نہیں مَیں پیاس اپنی [illegible] سرابوں سے

قیادت روگ بن جائے تو اُس کو بھولنا بہتر
جو کرسی بوجھ بن جاتی ہے اُس کو توڑنا اچھا
الکشن کامیابی سے اگر لڑنا نہ ہو ممکن
اُسے کوئی سیاسی موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اک بار پھر سے....

مُبادیاتِ عید

یوسف ناظم

عید سے چند دن پہلے ضرور غسل کر لینا چاہیئے۔ عید کے دن سب کو نہانے کا کہاں موقع ملتا ہے۔ اس دن تھوڑا بھی نہا لیا جائے تو سمجھنا چاہیئے گنگا نہا لی۔

ہدایت ہی میں پاجامے میں ازار بند ڈال لینا چاہیئے۔ ازار بند کے بغیر پاجامہ ترقی اور بہبودی کی اس اسکیم کی طرح ہوتا ہے جسے روبہ عمل لایا جائے تو مفادِ عامہ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ یہ ازار بند جسے کمر بند بھی کہا جاتا ہے متحرک ڈائری کا کام دیتا ہے۔ اس میں ضروری باتیں درج کی جاسکتی ہیں کمر بند کی ہر گرہ میں کوئی نہ کوئی مسئلہ بندھا ہوتا ہے۔ کمر بند پاجامے کو اپنے صحیح مقام پر برقرار رکھنے کے علاوہ یادداشت کو بھی برقرار رکھتا ہے لیکن اس میں گنجائش سے زیادہ گرہیں نہیں لگانی چاہئیں۔ یادداشت ساتھ نہ دے سکے گی۔ کمر بند جو کرتے یا شیروانی کے دامن سے آگے نکل جائے تو ناظرین کی بصارت پر گراں گزرتا ہے۔ کمر بند کو اُس سہرے کی طرح اپنی حد میں رہنا چاہیئے جس کا ذکر غالب نے جواں بخت کے سہرے کے پانچویں یا چھٹے شعر میں کیا ہے (حوالے کے لئے ملاحظہ ہو لٹریچر مطبوعہ بدوران غالب صدی)۔

اگر پاجامے کی جگہ یعنی پاجامے کی بجائے پتلون پہننی مقصود ہو (کیونکہ یہی دستورِ زمانہ ہے) تو پتلون کو اچھی طرح سے بند کرنے کا معقول انتظام کر لینا چاہیئے (پہلے سے اس کی جانچ ضروری ہے بعض زِپیں ناقص ہوتی ہیں) اب جو پتلونیں بن رہی ہیں عید کی نماز کے لئے مفید ہیں۔ آج سے دو چار سال پہلے جن پتلونوں کا رواج تھا وہ عرصۂ حیات کی طرح تنگ تھیں ان میں آدمی مشکل ہی سے داخل ہو سکتا تھا۔ وہ پتلونیں نہ صرف صاحبِ پتلون کو تکلیف میں مبتلا کرتی تھیں بلکہ ناظرین کو بھی تشویش پہنچاتی تھیں۔ (کپڑا لیکن اتنا ہی خرچ ہوتا تھا) موجودہ پتلونوں کے اندر ایک ہی نہیں کئی پاجامے پہنے جا سکتے ہیں۔ ان میں آدمی کے پھلنے پھولنے کی کافی گنجائش ہے۔ دنیا کتنی وسیع ہو گئی ہے!

عید کے دن جوتوں پر خواہ وہ نئے ہی کیوں نہ ہوں کریم یا پالش ضرور کروالینی چاہیئے۔ اس سے آدمی کی رفتار رشک ہو جاتی ہے۔ چلنے میں ٹھوکر بھی نہیں لگتی ہے کیونکہ آدمی بار بار جوتوں پر

نظر ڈال لیتا ہے اور جی ہی جی میں خوش ہوتا ہے کہ زندگی کتنی چمکدار ہو گئی ہے۔ جوتا وہی اچھا ہوتا ہے جو چلنے میں بولا کرے۔ اس طرح کے جوتے ٹرانسسٹر کا کام دیتے ہیں۔ بیک گراؤنڈ موسیقی کا لطف آتا ہے۔ کاٹنے والا جوتا بھی دلچسپ ہوتا ہے، گھر واپس آ کر ایک عدد بینڈایڈ لگا لیا جائے تو زیادہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔ جوتے دلانے چاہئیں۔ کچھ جوتے قد بڑا کرنے کے کام آتے ہیں ان جوتوں کی مدد سے آدمی آسانی سے اونٹ پر چڑھ سکتا ہے۔ ٹیلیفون کے تار میں اٹکی ہوئی پتنگیں بھی سہولت سے نکالی جا سکتی ہیں۔ ان جوتوں میں ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ جب آپ یہ جوتے نہ پہنے ہوں تو کوئی بھی آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ دیکھنے والوں کو جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔

"عید کے دن آنکھوں میں سُرمہ ضرور لگانا چاہیئے (سرمہ پہنا بھی جا سکتا ہے) سُرمہ گھر سے باہر جا کر کسی ایسے شخص سے لگوانا چاہیئے جس کے پاس چھڑ دے کے سائز کی سلائی ہو۔ اس سلائی سے سُرمہ لگوایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں میں کوئی چیز لگی ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

دنبالہ سے سُرمے کے دھواں ہیں تری آنکھیں کہہ بیٹھیں نہ کچھ سیف زباں ہیں تری آنکھیں

ماہرین سرمہ سے، سرمہ لگوانے کے بعد بغیر کسی مدد کے راستہ نہیں چلنا چاہیئے۔ خاص طور پر جب سڑک کی ایک سمت سے سڑک کی دوسری سمت میں جانا ہو تو اپنے بچے کی انگلی تھام لینی چاہیئے، ماہرین سُرمہ نہایت ہی کم داموں میں اتنی کثیر مقدار میں سُرمہ آنکھوں میں ڈالتے ہیں کہ بڑی سے بڑی آنکھوں کو تنگیٔ داماں کا گلہ ہونے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ (اسی وجہ سے اکثر لوگ نماز میں جب وقت قیام آتا ہے سجدے میں گر جاتے ہیں۔

دونوں کانوں میں عطر کے پھاہے بھی رکھنے چاہئیں (تکبیر کی آواز سننی ضروری بھی کیا ہے) عطر پہلے سونگھا جاتا تھا اب اسے کانوں سے سننا پڑتا ہے یا ممکن ہے امتدادِ زمانہ سے آدمی کی قوت شامہ کانوں میں منتقل ہو گئی ہو۔ کپڑوں پر بھی عطر لگانے میں کوئی ہرج نہیں۔ کرتے پر عطر کا سُرخ یا زرد گول سا نشان اچھا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نشان جتنا پھیلا ہوا ہوگا آدمی اتنا ہی پھولے پھلے گا۔ شاعر کہتا ہے ع

عطر آنست کہ خود بگوید نہ کہ عطار بگوید (عطر وہ ہوتا ہے جو کہ خود بولے نہ کہ عطار سونگھاتا پھرے)

عید کی نماز میں سب سے اہم حصّہ گلے ملنے کا ہوتا ہے۔ خطبے کے دوران ہی اس واقعے سے دوچار ہونا چاہیئے۔ گلے ملتے وقت سامنے والے شخص کے تن و توش کا جائزہ لے لیا جائے تو گھر واپس ہونے کا امکان رہتا ہے۔ جو لوگ خطبہ سنتے بیکار بیٹھے رہتے ہیں اور اٹھ کر گلے ملنے میں دیر کرتے ہیں، زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

دوست احباب اور رشتہ داروں کو عید نامے بھی بھیجنے ضروری ہیں۔ یہ انگریزی میں چھپے ہوئے ہونے چاہئیں تاکہ صرف دیکھے نہ جائیں پڑھے بھی جائیں ـــ اب بھی کہیں کہیں اُردو میں چھپے ہوئے عید نامے مل جاتے ہیں جن پر معانقے کی تصویر کندہ ہوتی ہے بعض تصویروں میں ایک ہاتھ زنانہ اور ایک ہاتھ مردانہ ہوتا ہے۔

دبا ہوا ہاتھ صاف پہچانا جاتا ہے کہ مرد کا ہے۔ زنانہ ہاتھ سے بالاوستی ٹپکتی دکھائی دیتی ہے۔ چند عید ناموں میں معانقے کے مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں۔ یہ صرف مردانہ مقابلوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ تگ و دو کی جائے تو ایسے عید کارڈ بھی مل جاتے ہیں جن پر بھانجی کی طرف سے ماموں کے نام، بھتیجے کی طرف سے چچا اور تایا ابا کے نام، دیور کی طرف سے بھاوج کے نام بلند

خطوط چھپے رہتے ہیں۔ ان عید ناموں پر جو بھی تحریر ہوتی ہے اُن سے تعلقات خراب ہونے میں کافی مدد ملتی ہے اس لئے ان کے بھیجنے میں کوئی ہرج نہیں۔

عید کے دن میٹنی شو دیکھنے سے بینائی اور صحت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر سینما ہال پر "ہاؤز فل" کی تختی لگی ہو جو ہمیشہ لگی رہتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ٹکٹ مل جائے گا۔

عید کے دن سُنا ہے رُوٹھے ہوئے بھی مَن جاتے ہیں اس لئے ذرا محتاط رہنا چاہیئے ●●

سائنس و ٹیکنالوجی کے دربار میں

شاعر کی درخواست

مقربؔ حسین مقرب

سائنس و ٹیکنالوجی کے دُنیا کے ماہرو
یہ مانتا ہوں تم ہو زمانے میں باکمال
ایٹم بنائے تم نے مزائل بنائے ہیں
تم نے کبھی اکال سے ایسے بچا لیا
یہ بات جانتا ہے زمانے میں ہر بشر
کتنا کٹھن یہ کام بھی کر کے دکھا دیا
اک بات پھر بھی تم سے ابھی تک چھپی رہی
دُنیا کے سارے دیش پریشاں ہیں ان دنوں
اس دُھن میں سب لگے ہیں یہ کوشش ہے صبح و شام
کچھ گولیاں بنائیں بنائی کسی نے لوپ
جو گولیاں بنائیں وہ بیکار ہو گئیں
معلوم یہ ہوا کہ تھا گولی بھی بے اثر!
نس بندی صرف ٹھیک ہی اس کا علاج ہے
نس بندیوں نے ایسے کرشمے دکھائے ہیں
نس بندیوں کی ڈور حماقت سے کٹ گئی
کچھ کامیابیاں ملیں ناکامیوں کے ساتھ
خطرات دل میں ایسے بھی آتے ہیں کیا کہیں
سائنس و ٹیکنالوجی کے دُنیا کے ماہرو
ایسا عمل کرو کہ مصیبت یہ جائے ٹل
ہم چاہتے ہیں اب کوئی ایسی دوا بنے
ایسا نیا کمال بھی کر کے دکھائیے
شادی کے بعد عورتیں بچہ پیا کریں
جب چاہے مارکیٹ میں انڈوں کو بیچ دو

جو بات کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سُنو
جتنے تمہارے کام ہیں اُن کی نہیں مثال
دنیا کو اپنی عقل کے جوہر دکھائے ہیں
بادل بنا کے نقلی ہی پانی گرا دیا
انسان جا چکا ہے کئی بار چاند پر
عورت کو مرد، مرد کو عورت بنا دیا
شاید اِدھر تمہاری نظر ہی نہیں گئی
آبادیوں کے بڑھنے سے حیراں ہیں ان دنوں
کیسے کریں وہ بچوں کے آنے کی روک تھام
کچھ اس سے اور بڑھ گئی بچوں کی دوڑ دھوپ
کھا کھا کے جن کو عورتیں بیمار ہو گئیں
ملتی ہے گھر میں جب نئے [illegible] کی خبر
برہم مگر عوام کا اُس سے مزاج ہے
نس بندیوں کی زد میں کنوارے بھی آئے ہیں
بگڑے جو سب عوام حکومت اُلٹ گئی
نس بندیاں چلی گئیں بدنامیوں کے ساتھ
ایسا نہ ہو کہ ہم نہ کسی کام کے رہیں
ہم چاہتے ہیں اب کوئی ایسا عمل کرو
بچوں کے پیدا ہونے کا سسٹم ہی [illegible]
بچوں کے پیدا ہونے سے [illegible]
لِہٰذا اب کوئی [illegible] بن جائیے
پھر [illegible] بجائے بچوں کے [illegible]
جب چاہو اپنے انڈوں سے بچے نکال لو

ایجاد ڈھائے گی یہ مقربؔ بڑا غضب
سائنس و ٹیکنالوجی کی جے جے کریں گے سب

وجاہت علی سندیلوی

وقت کی بات

سنتے ہیں کہ کسی دانشور کا مقولہ ہے کہ دنیا کی سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ وقت! یہی وقت جو ہر لحظہ ٹک ٹک کرتی گھڑیوں کے ذریعے اُڑتا بھاگتا رہتا ہے۔ ہمارے خیال میں جن صاحب کا یہ مقولہ ہوگا وہ دانشور کم اور لال بجھکڑ زیادہ تھے تب ہی تو انھوں نے ایسی باون تولہ پاؤ رتی کی بات کہ جیم کے پیٹ میں نقطہ ہوتا ہے۔ بلا سوچے سمجھے بے دھڑک کہہ دی تھی ——— لیکن اب یہاں یہ بتانا ضروری ہوگیا کہ لال بجھکڑ کس قماش کا جانور ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے نئے جوتے خریدے۔ اُن کی نمائش کرنے کا بہترین طریقہ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ اُن کو پہن کر نماز پڑھنے کے بہانے مسجد جائے۔ چنانچہ گیا۔ لیکن جب نماز پڑھ کر وہ باہر نکلنے لگا تو اُس نے دیکھا کہ ایک صاحب اُس کے جوتوں میں زبردستی اپنے پیر ٹھونس رہے ہیں تو اُس نے ایک دل دوز نعرۂ مستانہ لگایا جس کو سنتے ہی وہ صاحب ڈگمگیا ہو گئے "ہائے میرے نئے جوتے" جیتے جوتوں کا سابق مالک کسی شکاری کتے کی طرح جھپٹا۔ ابھی پہلی ہی قلانچ لگائی تھی کہ درمیان میں ایک بزرگ آگئے اور انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "چھوڑیئے مجھے میرے نئے جوتے جا رہے ہیں" بزرگ نے کہ جنھیں آپ پہچان گئے ہوں گے کہ لال بجھکڑ تھے، فرمایا "تو فکر کس بات کی، میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ تمہارے جوتے چرانے والا کون ہے؟ میرے ساتھ آؤ!"

مرتا نہ کیا کرتا وہ بیچارہ ساتھ ہو لیا۔ کافی دور تک اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے بعد لال بجھکڑ نے بڑے اہتمام سے اپنی جیب سے پانوں کی ڈبیا نکالی اور اُسے کھول کر اس میں سے ایک گلوری برآمد کر کے منہ میں رکھی۔ پھر اس ڈبیا کو جیب میں واپس ڈال کر دوسری جیب سے ایک چھوٹی ڈبیا نکالی اور اس میں سے کئی چٹکیاں تمباکو نکال کر ہتھیلی پر رکھی پھر اس کو کئی مرتبہ کم و بیش کر کے پھانک لیا۔ پھر تیسری جیب سے ایک بہت ہی چھوٹی ڈبیا برآمد کی۔ اور اس کو بڑی مشکل سے کھولا اور اس میں

سے ذرا سا چونا نکال کر چاٹا۔ منہ چلایا۔ بہت ناپ تول کر پیک تھوکی۔ اس سے کچھ زیادہ تسلی نہ ہوئی تو پھر منہ چلایا، اور پیک کی ایک دوسری پچکاری چھوڑی اور پھر یوں گویا ہوئے "تو پھر بتا ہی دوں کہ تمہارا جوتا کون لے گیا ہے۔"

جوتے کے بیمار نے تقریباً کیا بالکل روتے ہوئے کہا، "ضرور! ضرور!! بتا دیجئے، لیکن جی ہاں ذرا جلدی۔ اتنی دیر میں تو میرا جوتا نخاس میں نیلام بھی ہو چکا ہوگا۔" تھوڑے سے وقفے کے بعد لال بجھکڑ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور تیسری پیک کو باہر تھوکنے کے بجائے اندر نگلتے ہوئے یہ الہامی جواب دیا "تمہارا جوتا لے جانے والا کوئی چور معلوم پڑتا ہے۔" اکنّی پتے کی بات تھی اور پھر سو میں سو ایسی سچی کہ اس کے سننے کے بعد جوتا کھونے والا اپنے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھا۔ غالباً یہ ایک غیر متعلق اور ناقابل ذکر بات ہے کہ کچھ عرصے کے بعد پتا چلا کہ جوتا لے جانے والا لال بجھکڑ کا سالا تھا۔

لیکن یہاں بات تو وقت کی ہو رہی تھی! وقت اگر واقعی اتنا قیمتی ہوتا جتنا کہ اس بیچارے کو بدنام کیا جاتا ہے تو یقیناً سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — دنیا کا سب سے دولت مند ملک ہوتا کیونکہ وقت کی جو افراط اور اسی وجہ سے ناقدری یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے ملک میں ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ یہاں شاید ہی کوئی ایسا بد قسمت ہو جس کو وقت کی کمی کا شکوہ ہو ورنہ ہیں تو جو بھی ملا اس میں سے کسی نے شکایت کی کہ دن کاٹے نہیں کٹتا اور کسی نے فریاد کی کہ رات کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ انتظار، فراق اور فرصت کے ایسے ہی دن کہ جب بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے ہماری شاعری کے ایسے مرغوب موضوعات ہیں کہ جن پر معشوق کی کم سنی رقیب کے پاجی پن اور زاہد کی خفیہ بادہ نوشی کے بعد ہمارے شاعروں نے سب سے زیادہ دیوان سیاہ کئے ہیں۔

ہم ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ ہم وقت کے لئے نہیں بلکہ وقت ہمارے لئے بنا ہے۔ تجمل حسین خاں عیش کے لئے نہیں بلکہ بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے۔ وقت کو ہمارا پابند ہونا چاہئے نہ کہ ہم کو وقت کا۔ ہمارے ایک رشتے کے چچا کے ہم زلف پارلیمنٹری سکریٹری ہو گئے۔ چچا نے انھیں ٹیلیفون سے مبارک باد دی اور کہا کسی روز ہم تم سے ملنے تمہارے دفتر آؤں گا۔ انھوں نے کہیں غلطی سے کہہ دیا کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی آپ کل ۱۱ بجے دن میں تشریف لائیے۔ اس پر چچا آپے سے باہر ہو گئے اور ٹیلیفون کا چونگا ہاتھ سے پھینکتے ہوئے بولے "اللہ اللہ اب یہ دماغ کہ ہماری ملاقات کے لئے تاریخ اور وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ گویا کہ ہم بھی دفتر کے کوئی منشی ہیں کہ گھڑی دیکھ کر صاحب کے پاس جا کر اپنی حاضری لکھائیں۔ لعنت ہزار لعنت اس پارلیمنٹری سکریٹری کے بچے پر۔"

ہمارے انھیں چچا نے ایک دفعہ ہمیں مخصوص اس کام سے دہلی بلوایا تھا کہ وہ ہم کو اپنے ایک ملاقاتی افسر سے ملوا دیں گے۔ اور یقین مانئے گا کہ میرے دہلی کے ایک ہفتہ قیام کے دوران مجھے لے کر ہر روز چچا ان صاحب سے ملانے کے لئے بہت سویرے گھر سے روانہ ہو جاتے لیکن راستے میں ان کو ایسی غیر متوقع مصروفیتیں پیش آجاتیں کہ وہ کبھی ان صاحب تک نہ پہونچ پاتے۔ کبھی شمبھو دیال کے یہاں بیٹھ کر وہ ان کی بھینسوں کی خیریت پوچھنے لگتے۔ کبھی منّے صاحب کے یہاں رک کر وہ ان کے مقدمے کا

حال سننے لگتے۔ کبھی کسی کے منھ کسی دوست کی علالت سن کر اس کے یہاں عیادت کے لئے چلے جاتے۔ کبھی جمنا کی باڑھ دیکھنے لال ڈگی پہونچ جاتے۔ سڑک پر کسی سائیکل اور راہ گیر کی ٹکر ہوجاتی تو یہ پہلے تماشائی۔ پھر گواہ اور پھر مجسٹریٹ بن جاتے۔ سائیکل والا اور راہ گیر اپنے کپڑے جھاڑ کر چلے بھی جاتے لیکن یہ کھڑے پورے حادثے کی پوری تفصیلات اپنے گرد جمع تماشائیوں کو سنایا کرتے۔ دن کا کھانا اور شام کی چائے جہاں موقع ملتا کھا پی لیتے اور آدھی رات کو جب تھکے ہارے وہ مجھے لے کر گھر پہونچتے تو حتمی وعدہ کر لیتے کہ کل سویرے وہ پہلا کام یہ کریں گے کہ مجھے لے جاکر اپنے لنگوٹیا یار سے ملوادیں گے۔ سات دن تک تو میں کسی آوارہ کتے کی طرح چچا کی آوارہ گردی میں شریک رہا لیکن آٹھویں دن با حسرت و یاس استعفیٰ دے کر میں بھاگ نکلا۔ چچا کی رفاقت میں کسی کام کو پورا کرنے کے لئے عمرِ نوح بھی ناکافی ہوتی۔

کانپور میں ہمارے مکان کے قریب ایک صاحب رہا کرتے تھے جن کا بھلا سا نام تھا۔ نام تو اس وقت یاد نہیں آتا البتہ وہ اپنی غیر معمولی بڑی بڑی مونچھوں کی وجہ سے زیادہ تر لوگوں کی زبان پر چھندر بابو کے لقب سے چڑھے ہوئے تھے۔ وقت کے متعلق ان کے کچھ اپنے خودساختہ اصول تھے اور ان پر وہ بڑی شدت سے کاربند رہتے مثلاً اگر وہ کسی تقریب میں دس بجے بلائے جاتے تو وہ بارہ بجے سے پیشتر کبھی نہیں پہونچتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ وقت کی پابندی صرف ابن الوقت اور احساسِ کمتری کا شکار لوگ کرتے ہیں۔ وہ ریلوے اسٹیشن بھی ٹرینوں کے ٹائم ٹیبل میں درج اوقات سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد جایا کرتے اور ان کا کہنا تھا کہ شاید کبھی مشکل ہی سے ان کی کوئی ٹرین چھوٹی ہو۔ ان کے قول کے بموجب انھوں نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ٹرین کو بالکل ٹھیک وقت پر آتے دیکھا تھا اور اس کی شانِ نزول یہ تھی کہ وہ پورے چوبیس گھنٹے لیٹ تھی۔۔

مغرب کے دانشوروں نے تو اب معلوم کیا ہے کہ وقت محض ایک اضافی قیاس ہے اور فی الواقع اس کی کوئی حقیقت نہیں لیکن ہمارے قصبے کے ایک بزرگ نے اس نکتے کو بہت پہلے کھوج نکالا تھا۔ سنا ہے کہ وہ بزرگ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ طوعاً و کرہاً ریلوے اسٹیشن ایک ٹرین پر سفر کرنے کی غرض سے جا رہے تھے۔ ساتھی نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا "ٹرین پانچ بجے چھوٹتی ہے۔ پانچ بجنے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ آئیے ذرا تیز چلیں" بزرگ نے اپنی گھڑی دیکھ کر فرمایا "میری گھڑی میں تو پانچ بج بھی چکے۔ مجھے تو اب ٹرین مل نہیں سکتی۔ تم دوڑ جاؤ تمہاری گھڑی میں ابھی دس منٹ باقی ہیں۔"

وقت کی بے پایاں افراط کا ایک واقعہ میرے ذاتی علم میں ہے۔ قصبے کے دو حضرات جو دو مختلف زمیندار خاندانوں سے تعلق رکھتے کم و بیش چالیس سال تک قریب قریب روزانہ پانچ چھ گھنٹوں کے لئے جمع ہوتے اور اپنے اپنے آباو اجداد کے متعلق من گھڑت معرکے، لطیفے، بہادری اور امارت کے قصے، سخاوت اور دریا دلی کی داستانیں ایک دوسرے کو سنایا کرتے۔ اور لطف یہ تھا کہ وہ دونوں خود بھی جانتے اور سمجھتے کہ وہ لوگ سراسر جھوٹ اور مبالغے سے کام لے رہے ہیں اور ان کی چرب زبانی کا اصلیت سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں۔ کاش کہ وہ

دونوں حضرات کوئی اور دوسرا مفید کام نہ پاکر مرتبے تک پہنچنے کے لئے پیدل ہی سفر پر روانہ ہو جاتے! تب بھی ان کی زندگی اتنی بڑی سعی رائیگاں نہ ثابت ہوتی۔

میں نے اپنی زندگی میں وقت کا واقعی پابند صرف ایک شخص کو دیکھا اور وہ تھے بدرالدین ریٹائرڈ اسٹیشن ماسٹر جن کو ان کے بھتیجوں کی دیکھا دیکھی سارے محلے کے لڑکے لڑکیاں بھورے چچا کہتے۔ ان کی وقت کی پابندی کے متعلق بہت سے واقعے لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔

مشہور تھا کہ ایک دفعہ جب بھورے چچا کسی بڑے اسٹیشن پر تعینات تھے انھوں نے ایک منسٹر کے لئے آدھا منٹ کیا چند سکنڈ کے لئے بھی گاڑی روک دینے سے انکار کر دیا تھا۔ منسٹر صاحب اسٹیشن پر اُترنے والے تھے۔ اور ان کے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر ایک ہجوم بھی موجود تھا۔ ان کا سامان وغیرہ سب اتارا جا چکا تھا۔ صرف وہ خود غسل خانے سے نکلنے کے بعد کپڑے بدل رہے تھے لیکن بھورے چچا نے منسٹر صاحب کے لواحقین کی ضد اور اصرار کے باوجود صحیح وقت پر گاڑی چھوڑ دی۔ منسٹر صاحب اس صورت حال کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ چنانچہ اپنے چڈی دار پائجامے کا صرف ایک پائینچہ پیر میں پہنے ہوئے اور دوسرا ہاتھ میں لئے انھیں اپنے ڈبے سے کچھ اس انداز سے کودنا پڑا تھا کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے۔

ایک بار ان کے کسی دوست نے انھیں آٹھ بجے رات میں کھانے پر بلایا۔ وہ سات بج کر پچپن ہی منٹ پر اس کے دروازے پر پہونچ گئے۔ اتفاق سے اسی وقت بارش شروع ہو گئی۔ معتبر راوی کا بیان ہے کہ وہ پانچ منٹ تک بارش میں بھیگتے رہے لیکن آٹھ بجے سے پہلے اپنے دوست کے گھر کی کنڈی نہیں کھٹکھٹائی۔

یہ واقعہ خود میرا دیکھا ہوا ہے کہ دعوت ولیمہ میں دوسرے مہمانوں کے ساتھ بھورے چچا بھی مدعو تھے۔ دعوت کا وقت دس بجے دن رکھا گیا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر پہونچ گئے، تو معلوم ہوا کہ میزبان سے اور بکرے فروخت کرنے والے سے ابھی بکروں ہی کی بابت مول تول ہو رہا ہے اور جو منتظم بازار چاول اور گھی لینے گئے ہیں وہ ابھی لوٹ کر نہیں آئے ہیں۔ پھر کیا تھا! بھورے چچا اس قدر گرجے اور تڑپے بلکہ برسے کیونکہ ایک منتظم کے انھوں نے کئی بید بھی رسید کر دیئے کہ بالآخر بیچارے میزبان کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہر مہمان سے معافی مانگنی پڑی اور دعوت کا وقت ملتوی کر کے دس بجے رات میں رکھنا پڑا۔ اور اُس وقت بڑی پابندی سے کھانا ہو گیا۔

بھورے چچا نے خود اپنے لڑکے کی شادی کی تو بہت پرلطف تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ نکاح کا وقت ۹ بجے صبح مقرر تھا۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر بارات لے کر پہونچ گئے۔ اس وقت تک دلہن والے کے وہاں فرش بھی نہیں بچھا تھا لیکن انھوں نے وہ اُودھم مچایا کہ دولہا کا منہ زبانی یعنی کھڑے ہی کھڑے نکاح ہو گیا۔ کھانے کا وقت ۱۲ بجے مقرر تھا لیکن چونکہ کھانا اس وقت تک تیار نہیں تھا اور غالباً چچا پہلے ہی سے جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے باراتیوں کو اپنے ہی گھر سے کھانا منگوا کر

صحیح وقت پر کھانا کھلوا دیا۔ اور پھر قریب قریب جبراً وہ دلہن کو مقررہ وقت پر رخصت کیا اغوا کرا لے گئے۔ ان تمام مرحلوں سے گذرتے وقت انھیں کیسے کیسے ہفت خوان سر کرلے پڑے ان کو اب بیان کرنے سے کیا حاصل۔ بہرکیف نکاح ہونے سے قبل ہی قطع تعلق ہوجانے اور نکاح کے بعد تو فوراً قدم قدم پر رشتۂ مناکحت ٹوٹ جانے کی نوبت آگئی تھی لیکن شاید دولہا دولہن کی قسمت میں رہائی تھی ہی نہیں جو ایک کیا بیسیوں طوفانوں اور منجدھاروں سے ان کی ڈگمگاتی کشتی غرقاب ہوئے بغیر نکل گئی۔ اور پالا بھورے چچا کے ہاتھ رہا۔

خود بھورے چچا کے یہاں دعوت ولیمہ ہوا تو انھوں نے ۱۱ بجے ٹھیک وقت مقررہ پر دستر خوان بچھوا دیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک جو مہمان آئے ان کو تک انھوں نے کھانے پر بٹھایا۔ وہ کھا کر جا چکے تو انھوں نے اپنے گھر کے دروازے بند کرا دیئے اور بچا ہوا کھانا یتیم خانے بھجوا دیا۔

قصبے میں ایک نیتا جی آنے والے تھے۔ بڑی تیاریاں کی گئیں۔ پھاٹک اور پنڈال سب ہی آراستہ تھے۔ اُن کے آنے کا وقت ۴ بجے مقرر تھا۔ سوا چار بجے تک نہیں آئے تو منتظمین کی جانب سے روکے جانے کے باوجود بھورے چچا نے تقریر شروع کردی۔ اور ساڑھے چار بجے جب نیتا جی پنڈال میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو مجمع بھورے چچا کی قیادت میں پنڈال سے باہر جا رہا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ بھورے چچا کی وجہ سے جتنی گھڑیاں لوگوں نے خریدی ہوں گی اتنی شاید کسی دوسرے ہندوستانی کی وجہ سے نہیں۔ لیکن افسوس کہ خود بھورے چچا اس دنیا سے بہت قبل از وقت چلے گئے۔ اور ان کے ورثا نے ان کی تجہیز و تکفین میں جب وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھا تو وہ بہت یاد آئے۔

غزلیں

رشید سمیع جلیل

بیگم کی حکومت ہے انجام نمی دانم
کیا حکم بجا لاؤں جب کام نمی دانم

دن رات فقط نخرے آرام نمی دانم
کب گھر میں سحر آئی کب شام نمی دانم

شادی کا وہی اِک دن پھر آج کا یہ دِن ہے
فالودہ نمی نوشم بادام نمی دانم

پہنا تو دیئے کنگن آں چہرہ نمی بینم
ہر روز دُھلے برتن حمّام نمی دانم

خلوت میں بھی محفل، محفل ہوئی تنہائی
ترسیل کا موسم ہے ابہام نمی دانم

مصری کے اُچھلتے ہی آغازِ نظر بندی
اے عدلِ جہانگیری اِلزام نمی دانم

بگڑی ہوئی کچھ سطریں، پھیلے ہوئے کچھ نقشے
مکتوب پُرانا ہے پیغام نمی دانم

تولید میں ایم۔ فل ہوں تقلید میں پی۔ ایچ۔ ڈی
ہر ڈگری ہے ترغیبی اکرام نمی دانم

بلّی بھی ہے کُتّا بھی، چُوہا بھی، تماشا بھی
ہے کون مگر اِن میں گلفام نمی دانم

زُلفوں کی درازی پر سمجھو نہ مجھے شاعر!
مَن بندۂ ہپّی اَم، حجّام نمی دانم

ہر شعر جلیل اپنا لوکل بہ ولادت ہے
از آندھرا پردیشم، خیّام نمی دانم

بوگس حیدرآبادی

جب چھینکدیا مَیں نے بھی اِک مطلع اُٹھا کے
ہونے لگے تعریفوں کے محفِل میں دَھما کے

کر دیتے ہیں میری شبِ فرقت کو شبِ وصل!
خود پیاس بجھا جاتے ہیں وہ خواب میں آکے

مَیں جس کو لگا دوں وہی جنّت میں چلا جائے
لایا ہُوں نیا جُوتا یہ مسجد سے چُرا کے

اُس دِن کی خوشی یاد ہے جب مجُھ سے مِلے تھے
اِک روز چنبیلی کے وہ منڈوے تلے آکے

کرتی نہیں چالان حسینوں کا پولس کیوں؟
جب ڈالتے ہیں یہ بھی دِل و جان پہ ڈاکے

اِک غنڈے کے ہمراہ رواںہ ہوئے لندن،
دو تین برس تک وہ مجھے گول پھرا کے

تعریفوں کے پُل باندھ دیئے زندہ دِلوں نے
بوگس نے سُنائی جو غزل بزم میں گا کے

بھارت چند کھنہ

غریبی ہٹاؤ

پہلے

انتخابات کے زمانے سے ہم مسلسل "غریبی ہٹاؤ۔ غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ سنتے آئے ہیں۔ غریب سوچتے رہے ہیں کہ ان کا پیٹ خالی ہے۔ عام جنتا الگ اس جنت میں جانے کے لئے ایڑیاں رگڑ رہی ہے جو غریبی ہٹنے کے بعد پیدا ہونے والی تھی۔ سفید پوش داویلا مچا رہے ہیں کہ وہ ننگے ہو گئے ہیں اور ان پر غریبی کی میلی کچیلی چادر ڈال دی گئی ہے۔ اس حالت کے لئے آئے دن حکومت کو کوسا جاتا ہے کہ اس نے غریبی نہیں ہٹائی۔ یہ سب کچھ ایک زبردست غلط فہمی کے باعث ہو رہا ہے اور حیرت ہے کہ اب تک حکومت نے اس بارے میں وضاحت کیوں نہیں کی۔ دراصل غریبی ہٹانے کا جو اعلان کیا گیا تھا ان کا منشا صرف یہ تھا کہ ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومت کی کبھی نہ ختم ہونے والی غربت کو ہٹایا جائے۔

چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر نئے مالیاتی سال کے موقعہ پر ریاستوں اور مرکزی
حکومت کے وزرائے خزانہ نئے ٹیکسوں کی دریافت میں اپنے اس حصۂ جسم کو جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ
سوچ سمجھ سکتے ہیں' بغیر اوور ٹائم' الاونس حاصل کئے' بڑی بے دردی سے استعمال کر رہے ہیں
کام واقعی بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کے پیش روؤں نے پسینہ بہا کر عوام کو ایسی حالت
میں پہنچا دیا ہے کہ جس میں ٹیکسوں کی ادائی کے لئے ان کو خون بہانا پڑ رہا
ہے اس حالیہ مالیاتی سال کے بعد تو حالت یہ ہو گئی ہے
کہ ان حضرات

احتیاط اور اختصار سے چائے میں ڈالتے ہیں جس طرح کوئی ہومیوپیتھک ڈاکٹر دوائی کی خوراک بنا رہا ہو، برش پر ٹوتھ پیسٹ اس طرح پھیلائی جاتی ہے جس طرح کوئی پیتھالوجسٹ قطرۂ خون کو سلائیڈ پر یہ جاننے کے لئے پھیلاتا ہے کہ آخر اس نے مریض کے دل میں اس قدر شور کیوں مچایا ہوا تھا اور پھر صابن کے استعمال میں گیلا ہاتھ صابن پر اس طرح پھیرا جاتا ہے جس طرح کوئی بزرگ کسی بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر آشیرواد دے رہا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اب تک جو ٹیکس لگائے گئے ہیں وہ اشیاء بشمول آمدنی پر عاید ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ ٹیکس کافی کڑے ہیں، حکومتوں کی غریبی اب تک قائم و دائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سڑکیں ٹوٹی پھوٹی، شہر غلیظ و گندے، ریلیں خراب و خستہ، ملک بھر میں پانی، بجلی، کوئلے اور اب تو نوٹ چھاپنے کے کاغذوں کی بھی قلت پیدا ہو گئی ہے۔ اور ہر جگہ خاک اُڑ رہی ہے۔

حکومتوں کا اپنی غریبی دُور کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا اب تک سوائے لوگوں کی بد دعائیں حاصل کرنے اور اسمبلیوں میں مخالف پارٹی والوں کی گالی گلوچ کھانے کے بالکل بے سود ثابت ہوا ہے۔ ہر حکومت کا موازنہ خسارے کا موازنہ ہے۔ آمدنی کم اور اخراجات زیادہ ہیں اس لئے اب وہ وقت آن پہنچا ہے جبکہ اشیاء اور آمدنی کے علاوہ انسان کی نقل و حرکت عادات و اطوار وغیرہ کو بھی جھنجھوڑ کر مزید ٹیکس نچوڑا جائے تاکہ ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومت کی غریبی ہٹ جائے۔ آپ ہی تبلائیے کہ حکومتیں اوروں کی غریبی کیوں کر ہٹا سکتی ہیں جبکہ وہ خود سالہا سال سے مرض غربت میں مبتلا ہیں اور اپنا علاج ابھی تک نہیں کر سکیں۔

ہم نے بڑے سوچ بچار کے بعد چند تجاویز نئے ٹیکسوں کی سوچی ہیں جو تمام وزرائے خزانہ کی نذر کی جاتی ہیں۔ جو ذرائع ان تجاویز میں بتلائے گئے ہیں ان پر ابھی تک ملک کے ٹیکس تراشوں کی نظر نہیں پڑی۔ ملاحظہ فرمائیے:

ایک قانون نافذ کیا جائے جس کا نام ضابطہ کی تکمیل کی خاطر "قانونِ برناری سدھار" رکھا جائے اور یہ وضاحت کی جائے کہ قوم سے مُراد ہے ہندوستان کے سب باشندے بشمول ٹامل ناڈو کے رہنے والے، بال ٹھاکرے کے چیلے، اسمبلیوں کے اراکین، لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے بھی ممبران، وزرا قلمدانی، خاندانی یا پھر پاندانی ---!

اس قانون کی جملہ دفعات ملک کے ہر حصہ میں عائد کی جائیں۔ ان سے کوئی شخص بوجہ رنگ یا بے رنگی، نسل یا بے نسل، اصل یا نقل، ذات پات یا صنف (سوائے ایک استثناء کے جس کا ذکر آگے آئے گا) مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ ملک کے موجودہ دستور اور دیگر تمام قوانین کی کوئی دفعہ ترامیم سے پہلے یا بعد یا پھر ایسی ترامیم جو آئندہ کی جائیں اس قانون کی کسی دفعہ کو رد نہیں کر سکے گی۔ اس قانون کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا اقدام کرنے پر اور کسی عدالت میں درخواست قبول کرنے پر درخواست گزار اور عدالت کے متعلقہ جج کو حبس دوام کی سزا ان کی جائیداد بطور ٹیکس ضبط کرنے کے بعد دی جائے جس میں کسی نوبت پر کسی بھی ذریعہ سے کوئی کمی نہ کی جائے۔ اس ضمن میں سزا یافتوں کے رشتہ داروں یا عزیزوں (بلالحاظ اس کے کہ انھوں نے جنگ آزادی کے زمانے میں حقیقتاً جیل بھگتی ہو) کے خاطیوں کو چھڑانے کی کوشش بجائے خود ایک جرم متصور کیا جائے جس کی پاداش میں ان کی بھی تمام جائیداد ضبط کر کے ان کو بھی حبس دوام کی سزا سے سرفراز کیا جائے۔

اس قانون کے تحت پس ماندہ طبقہ کو خواہ وہ کتنے ہی پس ماندہ کیوں نہ ہوں اور اقوام درج فہرست کو بلالحاظ اس کے کہ ان کے نام زرّیں حروف میں لکھے گئے ہوں کسی قسم کی رعایت نہ دی جائے۔

قانون کا نفاذ چلتی پھرتی متحرک عدالتوں کے ذریعہ کیا جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جائے وقوع پر ہی جرم پر سزا دی جائے اور وہیں ٹیکس وصول کیا جائے۔ عدالتوں کی سہولت کی خاطر سزاؤں کی صراحت بھی مسودۂ قانون میں درج کی جا رہی ہے۔

مندرجہ ذیل حرکاتِ انسانی اس قانون کے تحت جرم کی تعریف میں آئیں گی جن کی سرزدگی پر خطاواروں کو سزا دی جائے گی۔

جرم (۱) جو لوگ سائیکل کے پیڈلوں پر ایڑیاں جمائے اکڑ کر سائیکل چلائیں۔ اول تو سائیکل کی پیڈل پر ایڑی جمانا بجائے خود ایک حماقت ہے اور اس پر سائیکل ران کی اکڑ اس حماقت کو دوآتشہ بنا دیتی ہے جس سے سائیکل چلانے والا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس حرکت سے بے شمار حادثے واقع ہوتے ہیں جن کی روک تھام ضروری ہے۔ اس جرم کے ارتکاب پر سائیکل سوار سے سائیکل کی قیمت کی حد تک ٹیکس وصول کیا جائے۔

جرم (۲) جن اکڑ بھگوں کا ذکر جرم (۱) میں کیا گیا ہے، اگر ان کے سر کے بال (مردوں کی حد تک) ایسی اکاس کے ہوں جس سے ان کی آنکھوں پر بال چھائے ہوئے ہوں تو ان سے دو سائیکلوں کی قیمت بطور ٹیکس وصول کی جائے۔

جرم (۳) جو لوگ سڑکوں کے بیچوں بیچ ہی چلنا پسند کریں یعنی سڑک کے کنارے نہ چلیں ان سے ان کے جسم کے کپڑوں بشمول جوتوں یا چپل کی قیمت بطور ٹیکس وصول کی جائے۔

جرم (۴) جرم (۳) کا مرتکب اگر مرد ہو اور اس کی آنکھوں پر بالوں کا پردہ پڑا ہوا ہو تو قابلِ وصول ٹیکس دوگنا ہو۔

توضیح: (۱) جرائم ایک تا چار اگر طالب علموں سے سرزد ہوں تو ٹیکس وصول کرنے کے علاوہ ان سے امتحان میں نقل مارنے کا حق چھین لیا جائے اور ان کا امتحان مقامی فوجی چھاؤنی میں ایک مسلح فوجی دستہ کی نگرانی میں لیا جائے۔ دورانِ امتحان ایسے طالب علموں کو سوائے پانی کے، کسی قسم کی مدد مہیا نہ کی جائے۔ دیگر ضروریات کے رفع کرنے کے لئے ان کو کسی کھلے میدان میں بٹھایا جائے اور اس موقعہ پر ان کی نگرانی ایسا فوجی عہدیدار کرے جس کو جنگ میں بہادری کا تمغہ مل چکا ہو۔ اور جس کا رتبہ بریگیڈیر سے کم نہ ہو اور جس کے ہاتھ میں مشین گن ہو۔

استثنا: جن چار جرائم کی تفصیل بتلائی گئی ہے ان سے زبانِ اردو کے شعرائے کرام بلالحاظ معیارِ کلام مستثنیٰ کئے جائیں۔ کیونکہ ان کے پاس سوائے اپنی پریشان زلفوں اور وحشتِ دل کے اور کوئی سرمایہ نہیں ہوتا ان سے کسی قسم کا ٹیکس وصول کرنا بھی ممکن نہ ہوگا، کیونکہ ٹیکس کی طلبی پر وہ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل کا قصہ، منظوم اور ترنم میں اس وقت تک عنایت فرماتے رہیں گے جب تک کہ ٹیکس وصول کرنے والا دامن چھڑا کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نہ جائے۔

جرم (۵) جو لوگ لب سڑک اور بے دھڑک کھڑے کھڑے یا بیٹھ کر فٹ پاتھ پر پیشاب کریں۔ اس جرم کے لئے ان سے دو سو پچاس روپے ٹیکس وصول کیا جائے۔

جرم (۶) جن معصوم پیشہ لوگوں کا ذکر پانچویں جرم میں کیا گیا ہے۔ ان میں بعض منچلے لاپرواہ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پیشاب کرتے وقت یہ تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے کہ تیزی سے ارتکاب جرم کریں۔ مزاجِ یار میں جوں ہی جرم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا

وہ دیدہ بے دریغ و بلا شرم جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ دراصل ایسے مجرموں کو بے دردی سے کوڑے لگانے چاہئیں اور ان کے ہاتھ میں جھاڑو دے کر ان سے سڑک کو صاف کرانا چاہئے مگر ایسا کرنے سے حکومتوں کی غریبی دور نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر یہ جرم تہذیب اور شرافت سے مہذب طریقہ پر عمل میں آئے تو سزا دو سو پچاس روپے ٹیکس بحیثیت بے شرم اور بدتمیز خاطیوں سے پانچ سو روپے بطور ٹیکس وصول کئے جائیں۔

توضیح: یہ جرم بہت عام ہے اور ہندوستانیوں کی عادت بن چکا ہے، اس کا تعلق ہماری پُرامن درخشاں تہذیب سے ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کو باعث فخر سمجھا جائے۔ گو یہ دن دہاڑے اور جگہ جگہ پر سرزد ہوتا ہے۔ مگر سنیماؤں کے آس پاس لوگ قطار در قطار ہو کر اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ متحرک عدالتوں کو ایسی جگہوں پر خاص طور پر چھاپے مارنے چاہئیں۔

جُرم (۷) اسٹرائیک پر جانا اور اسٹرائیک کروانا بھی جرائم قرار دیئے جائیں۔

وضاحت: ان جرائم کی روک تھام ملک کی بقا کے لئے از بس ضروری ہے اور حکومتوں کی غریبی ہٹانے میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ہر قسم کی اسٹرائیک قابلِ نفاذ ٹیکس سمجھی جانی چاہئے۔ مثلاً طالب علموں کی اسٹرائیک سے لے کر ٹیچروں، ڈاکٹروں، ریل کے ملازمین، انڈین ایرلائنز کے کارکنوں، لائف انشورنس کے ملازمین (جنہوں نے لائف بھر میں وقفہ وقفہ سے اسٹرائیک کرنا اپنا شیوہ بنا لیا ہے) فیکٹریوں کے مزدوروں وغیرہ وغیرہ بشمول ان کے لیڈروں کے خطا کار سمجھے جانے چاہئیں۔

۵ اسٹرائیک پر جانا اور اسٹرائیک کروانا ابتدائی جُرم قرار دیا جائے جس کی پاداش میں۔

(الف) اسٹرائیک پر جانے والوں کی حد تک ہر ملازم سے اس کی ایک ہفتہ کی تنخواہ کی حد تک ٹیکس وصول کیا جائے۔

(ب) اسٹرائیک کرانے والے ہر لیڈر سے اسٹرائیک پر جانے والے اور کم سے کم یافت پانے والے ملازم کی ایک ماہ کی یافت کی حد تک ٹیکس وصول کیا جائے۔

(ج) اسٹرائیک کے ہر دن کے لئے اسٹرائیک پر جانے والے سے اس کی ڈیڑھ دن کی یافت کی حد تک ٹیکس لیا جائے۔

(د) اسٹرائیک کرانے والے ہر لیڈر سے اسٹرائیک کے ہر دن کے لئے اسٹرائیک پر جانے والے اور کم سے کم یافت پانے والے ملازم کی ہفتہ کی یافت کی حد تک ٹیکس وصول کیا جائے۔

وضاحت:۔ اسٹرائیک کے لئے اُکسانے کے جُرم کے لئے مناسب سزا حبسِ دوام ہو سکتی ہے۔ مگر ایسا کرنے سے خالی حبسِ دوام میں اور حکومتیں دائمی غریبی میں پڑی رہیں گی۔ اس کے علاوہ ٹیکس ادا کرنے والوں کی ایک کثیر تعداد سے حکومتیں محروم ہو جائیں گی۔ اس لئے لازم ہے کہ خاطی ٹیکس ادا کریں اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کی خاطر کام کرنے والوں کو اسٹرائیک پر جانے کی ترغیب دینے کی پاداش میں خود کنگال ہو جائیں۔ اس جرم کی روک تھام سے فیکٹریوں وغیرہ کی پیداوار میں بے حساب اضافہ ہوگا)۔

جُرم (۸) اوور ٹائم کے حصول کے لئے احتجاج کرنے والوں سے اوور ٹائم کے ذریعہ وصول ہونے والی متوقع رقم سے چار گنا زائد ٹیکس وصول کیا جائے۔

وضاحت:۔ دورانِ اوقات معینہ کام نہ کرنے کی بیماری کسی وبا کی طرح ملک بھر میں پھیل گئی ہے۔ اوقاتِ دفتر میں وقت ضائع کیا جاتا ہے۔

تاکہ وقت کے بعد کام کرنے کے لئے دوگنی یافت حاصل ہو۔ اس بیماری کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ جس امید پر یہ حرکت مجرمانہ کی جاتی ہے۔ اس سے فائدہ ہونے کی بجائے اُلٹا نقصان ہونے کی کیفیت پیدا کی جائے۔

جُرم (۹) گھیراؤ کرنے اور کروانے کی پاداش میں بھی اسی شرح سے ٹیکس وصول کیا جائے جس کی تفصیل جرم نمبر ۷ یعنی اسٹرائیک پہ جانے یا اسٹرائیک کروانے کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ البتہ گھیراؤ کے دوران ٹیکس کا انحصار فی گھنٹہ کی بجائے فی یوم ہوگا۔

جُرم (۱۰) دھرنا دھرنے والوں اور اس کارساتی کی ترغیب دینے والوں سے ٹیکس وصول کئے جائیں جن کی مقدار اسٹرائیک اور گھیراؤ کے جرائم کے لئے تجویز کئے گئے ٹیکس سے دوگنا ہو۔

جُرم (۱۱) دفتروں، فیکٹریوں اور دیگر صنعتوں میں "آہستہ کام کرنے" یا "قاعدہ کے مطابق کام کرنے" کے جرم اور اس کے ارتکاب کے لئے اکسانے والوں سے، کام کم ہونے یا نہ ہونے سے جس قدر خسارہ یا نقصان ہونے کی توقع ہو اس لحاظ سے نہ صرف خسارہ کی پابجائی کی حد تک بلکہ اس سے ڈیڑھ گنا ٹیکس خاطیوں سے وصول کیا جائے۔

جُرم (۱۲) ہر اس شخص کو جو ووٹ حاصل کر کے ریاستوں کی مقننہ یا مرکزی پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہو جائے یا نامزد کیا جائے منتخب یا نامزد ہوتے ہی فوراً چاندی سونے سے نہیں بلکہ لوہے کے باٹوں سے یا وزن لینے کی مشین پر کھڑا کر کے تول لیا جائے اور اس کا وزن ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائے۔ ہر تیسرے مہینے اس کا وزن لیا جائے اور جس رکن کا وزن انتخاب کے بعد سے بڑھنا شروع ہو اس سے ایک ہزار روپیہ فی پونڈ کے حساب سے سال میں چار مرتبہ ٹیکس وصول کیا جائے۔

جُرم (۱۳) بڑھے ہوئے وزن والا ریاستی مقننہ یا پارلیمنٹ کا رکن اگر بعد کے الیکشن میں پھر منتخب ہو جائے تو اس سے اسی فارمولے کے تحت ٹیکس وصول کیا جائے جس کی تفصیل جرم (۱۲) میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹیکس کی رقم کا اندازہ لگانے کے لئے وہی وزن جائز اور غیر مجرمانہ متصور ہوگا جو پہلے انتخاب کے بعد پہلی مرتبہ رجسٹر میں درج کیا گیا تھا۔

وضاحت: ان جرائم کی سزا کے خوف سے ممکن ہے کہ بعض ایسے نیتا جو انتخاب کے بعد آسائش و آرام اور مرغن غذا کھا کھا کر موقع بے ڈھنگے، بے ڈول، چکنے اور گھناؤنے ہو جاتے ہیں۔ بُری عادتوں سے احتراز کرنے لگیں۔

جرم (۱۴) سڑک پر یا دیواروں پر پان کھا کر تھوکنے والوں سے ایک سو روپیہ فی پیک کی شرح سے ٹیکس وصول کیا جائے۔

جرم (۱۵) پبلک جلسوں میں مہمانِ خصوصی یا صاحب صدر کے اعلان کردہ وقت سے دیر کے بعد آنے کے جرم کے لئے ایک سو روپیہ فی منٹ کے حساب سے ٹیکس وصول کیا جائے۔

جرم (۱۶) پبلک جلسوں میں اگر کوئی مقرر موضوع سے بھٹک کر بھاشن دینے لگے تو اس سے بھی ایک سو روپیہ فی منٹ کی بکواس کے حساب سے ٹیکس وصول کیا جائے۔

جُرم (۱۷) بلدیہ کے کسی نل کے استعمال کے بعد اگر استعمال کنندہ نل بند نہ کرے یا احتیاط سے بند نہ کرے جس کی وجہ سے پانی ضائع ہونے لگے تو ایسے مجرم سے پچاس روپے ٹیکس لیا جائے۔

توضیح: ہمارے ملک میں پانی کی قلت اس حد تک شدید ہو گئی ہے کہ پانی ضائع کرنا ایک خطرناک جرم سے کم نہیں۔ اس جرم کے

ارتکاب کی وجہ سے نہ صرف پانی بلکہ دودھ کی قلت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے خالصوں کی لا بندی کا موثر انتظام کیا جانا بہت ضروری ہے۔)

(۱۸) اگر کوئی نیتا یہ دعویٰ کرے کہ ہماری پنج سالہ یوجنائیں کامیاب ہوتی ہیں یا یہ اعلان کرے کہ سبز انقلاب سے ہمارا ملک غلہ کی بابت خود مکتفی ہو گیا ہے تو اس جرم کے لئے اس سے پانچ ہزار روپیہ ٹیکس وصول کیا جائے۔

۱۹) کسی میاں بیوی کے گھر دوسری اولاد ہونے کے جرم میں دو سو روپیہ ٹیکس لیا جائے۔ تیسری اولاد ہونے کے جرم میں پانچسو روپیہ سالانہ کے حساب سے ٹیکس لیا جائے۔ چوتھی اولاد کے لئے ایک ہزار سالانہ اور پانچویں اولاد پر دو ہزار روپے سالانہ کی شرح سے ٹیکس وصول کیا جائے۔ مگر اس کے ہاں چھٹی اولاد ہو جائے تو میاں کو پاگل خانے بھجوا دیا جائے۔ بیوی کا علاج اُمید ہے کہ خود بخود ہی ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا جرائم نمونتہً پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے ارتکاب پر ٹیکسوں کی وصولی سے یقیناً ریاستی حکومتوں اور کرنی حکومت کو خزینہ بھرانے میں کافی مدد ملے گی اور قوم کے کردار کو بہتر بنانے کا کام بھی ہوتا رہے گا۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد ہندوستانیوں کی اور بُری عادتوں اور خصلتوں پر بھی ٹیکس عاید کئے جا سکتے ہیں۔

لقمیاں دوستو

اسمٰعیل ظریفؔ

کر کے فرمائشیں نظمی گانے سُنو کتنی میٹھی ہے اُردو زباں دوستو
بعض گانوں میں عریانیت ہی سہی پھر بھی دلکش ہے حُسنِ بیاں دوستو

اک زمانے میں ہم محفلِ شعر میں جا کے کھاتے تھے بریانیاں دوستو
آج کی محفلوں میں بجز چائے کے کھا رہے بسکٹ نہ کچھ لقمیاں دوستو

شاعروں ہی کے دم سے ہیں یہ محفلیں چائے خانوں میں گوشوں میں بیٹھیں
یہ جو پھرتے ہیں راتوں میں ٹھلے ہوئے کیا یہ رکھتے نہیں ہیں مکاں دوستو

اک غزل دو قطعے گر خرید ے کوئی اک رباعی لیشن میں مل جائیگی
یہ سنا شہر میں آج کل کھل گئی شاعری کی نئی اک دکاں دوستو

نام فنکار ہے پھر بھی بے کار ہے شاعری کرنے والا گنہ گار ہے
میرے اپنے نہیں ہیں خیالات یہ ایک واعظ کا ہے یہ بیاں دوستو

مر رہا ہے وہی جو کہ ہے بے خبر کیونکہ خود کار سگنل ہیں اب روڈ پر
کوئی رہبر ہے اس کا نہ ہے رہنما جا رہا ہے یونہی کارواں دوستو

غیر تو غیر ہیں بعض اپنوں میں بھی دل میں پوشیدہ رکھتے ہیں اب دشمنی
کام بننے کو ہوتا ہے جب آپ کا ہاتھ دیتے ہیں بھائی میاں دوستو

ویسے داداگری میں وہ مشہور ہے پھر بھی بے چارہ عادت سے مجبور ہے
ہار بیٹھا ہے سٹے میں سب مال و زر رکشہ میں جانے کو ہیں کھمیاں دوستو

کوئی مر بھی چکا کوئی مرنے کو ہے گویا کیو میں کھڑا ہے ٹکٹ کے لئے
رفتہ رفتہ کھسک جائیں گے ہم سبھی اُٹھ گئی ہیں کئی ہستیاں دوستو

دوستو چار دن کی ہے یہ زندگی بے سبب کیوں ہے آپس میں رسہ کشی
ہے غنیمت یہ آپس میں مل بیٹھنا ورنہ پھر تم کہاں ہم کہاں دوستو

کام دھندہ نہیں ہے آتے اگر تو اس کے بیچے میں بس گئی شاعری
بے سبب خون اپنا جلاتا ہے وہ ہے ظریفؔ اسلئے ناتواں دوستو

پختگیٔ ایمان

نظم نعیم تیغی

کرتے ہیں قبر پر جو چراغاں کبھی کبھی
ہوتا ہے اُن کے دل کا درماں کبھی کبھی
عرسوں میں جاؤ دوستو قوالیاں سنو
اس سے بھی پختہ ہوتا ہے ایمان کبھی کبھی

غزل

نیاز حنیفی

خیمہ زن جب سے ہوا سسرال میں — پھنس گیا ہوں اک نئے جنجال میں
وقت پیری بوالہوس کی عاشقی — کچھ پھسی اٹھتی ہے باسی دال میں
آرہے ہیں سامنے وہ بار بار — کچھ تو آتا ہے کالا دال میں
قیمتیں راکٹ سے آگے بڑھ گئیں — کنکرے چنتے رہے ہم دال میں
سن کے باتوں کو مرے سرکار بھی — دیتے ہیں جوتے لپیٹ کر شال میں
صاحب زرخائف و مضطر ہیں کیوں — ہم ہیں خوش اپنے دوشالہ شال میں
شیخ کو پینے کی جب سے لت پڑی — آرہا ہے وجد میں اور حال میں
ایک ہی حمام میں ننگے ہیں سب — مست ہے ہر ایک اپنے حال میں
افسری کا دے کے انٹرویو جناب — اب ملازم ہو گیا ہوں نال میں
ایسے ویسے نا قدیں جانیں گے کیا — فرق کیا ہے غالب و اقبال میں
رٹ کے بحریں بن گئے استاد آج — پھانستے ہیں مبتدی کو جال میں
اقتدار آتے ہی وعدوں سے پھرے — فرق کیا ہے لیڈر و کنگال میں
پیٹ میں رکھ کر غلاظت عمر بھر — ہے اکڑ توں پھر بھی تیری چال میں
ہم رہے بے بہرہ جہد و عمل — کٹ گئی بس عمر قیل و قال میں
جوڑے گھوڑے کی چلی جب گفتگو — پڑ گئی ہے شادی لیت و لعل میں
ہے تلاش زر تو ہو جائے ریسرچ — دیکھ لیجئے چیل کی پینچال میں
چاندی سونے کا نہیں ہے مسئلہ — اب کہاں کھوٹا کھرا ٹکسال میں

دوسروں کو تم تڑی دیتے ہو فنیش
دل سدا رکھ کر پرائے مال میں

جدید مناجات

اشرف مالوی

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری — زندگی نیتا کی صورت ہو خدایا میری
ہو مرا کام غریبوں کی حجامت کرنا — چوروں اسمگلروں سیٹھوں سے محبت کرنا
کارناموں سے بڑھے میرے وطن کی زینت — کاغذی پھولوں سے ہو جیسے چمن کی زینت
ہاتھ آجائے جو قسمت سے حکومت یارب — کوئی پوری نہ ہو جنتا کی ضرورت یارب
چور بازاری سے گھر میں بھی اندھیرا ہو جائے — کالے دھندے سے مرے گھر میں اجالا ہو جائے
میرے اللہ بھلائی سے بچانا مجھ کو — نیک جو راہ نہ ہو اس پہ چلانا مجھ کو

شفیقہ فرحت

مختصر مختصر خط

اپنی تین صفحوں پر مشتمل

اے میری ... یعنی ڈیئر... ڈیش... محبوب!

مجھے آپ کی شادی خانہ برباد کی رنگین و منقش اطلاع سے کوئی خاص غم نہیں ہوا کیونکہ آپ "ایکس یعنی" واحد غائب (EX) تو ہو ہی چکی تھیں۔

سچ تو یہ ہے میں بھلا کب تک انتظار کرتا۔ برادرم مجنوں بھی دو چار سال میں دیوانے ہو گئے تھے۔ اور برادرم فرہاد سلمۂ تو بالکل ہی بودے نکلے چند مہینے بھی ہجر کی سختیاں نہ برداشت کر سکے اور ایک جھوٹی خبر کو دانستہ موت کا بہانہ بنا لیا۔

تو میرا خیال ہے کہ عاشقی کی اس پوری تاریخ میں بلکہ تاریخ سے پہلے والی تاریخ میں بھی اس سے زیادہ طویل انتظار کا ذکر چراغ اور دوربین اور خوردبین سب کچھ لے کر ڈھونڈنے کے باوجود کہیں نہیں ملتا۔

اور چونکہ عاشقی کی تاریخ صرف اتہاس شاعری کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ اور یہ چاہے شاعر صاحب کتاب کیا جائیں شب ہجر کے دس بارہ گھنٹوں کو تو وہ ناپ نہیں سکتے۔ پھر بھلا باقاعدہ (DATE WISE) انتظار کا ان سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے اور یوں بھی وہ اس سلسلے میں بڑے عجیب و غریب برکار غیر مرکزی بیانات دیا کرتے ہیں۔ سینے کے طور پر لیجئے

دی ہاؤس یعنی شاعر اعظم مرزا غالب کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تو ثابت ہوا کہ عاشق لوگ انتظار کا دم بھرنے والے یہ سارے کے سارے شاعر اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں کی وجہ سے ڈس کوالیفائیڈ ہو جاتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے تاریخ عاشقی میں یہ خاکسار اکیلا ہی ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہے کہ

میں ہی (خود اپنی رائے اور خود اپنے فیصلہ کے مطابق) ریکارڈ ہولڈر ہوں۔ (ورنہ اب ہولڈروں کا زمانہ بیل گاڑی اور بال گاڑی میں لد کے کوچ کر چکا ہے اور اب فاؤنٹین پن اور بال پن کا حکم ہے!) میرا یہ انتظار یقیناً دنیا کا سب سے طویل انتظار ہے ——!!!

نوکری کے لئے درخواست بھیجئے سال، دو سال جواب نہ آئے تو آدمی

ریکشن مان لیا جاتا ہے۔ راشن کے کیو میں کھڑے رہئیے ساتھ آٹھ گھنٹے بعد "مال ختم" کی تختی طلوع ہو کر آپ کو غروب ہو جانے کی بشارت دے دیتا ہے۔

امتحان دیجئے — سال چھ مہینے میں بھلا بُرا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکل ہی آتا ہے! بلکہ اس طویل عرصے میں تو سرکاری فائلیں تک اپنی منزل کی طرف رینگنا شروع کر دیتی ہیں —!

اور آپ ہیں کہ سر ناک کو نہ مشرق نہ مغرب کی جانب جنبش دیتی ہیں نہ شمال سے جنوب تک —!!

تو پھر آخر کیوں میں آپ کی ویٹنگ لسٹ میں ٹنگا رہتا —!!!

یہ کوئی پبلک اسکول یا کالج کا رجسٹریشن تو تھا نہیں کہ جہاں بچے کے پیدا ہوتے ہی نمبر لگا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی نوکری کے پانچ سات سال بعد اسے کار نصیب ہو جائے اور اسے نہ سہی اس کے بچے کو ہی اس شہرت یافتہ اسکول میں داخلہ مل جائے —!!!

اس عشق و عاشقی جیسے غیر ضروری اور قبل مسیح یا PRE HISTORIC AGE والے کاموں پر تو لوگ کم سے کم وقت صرف کرتے ہیں۔ سو اس دقیانوسی بجے بعد کچھ نہیں تو پتھر کا چکر تو ملنا رکا جا ہیئے —!!

اور صاحب سنتے ہیں کہ بارہ برس میں تو گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں سو اس خوف سے کہ لوگ بالک مجھے گھورا نہ سمجھ لیں میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور بغیر کسی زور زبردستی کے خود اپنی مرضی سے گیارہ برس گیارہ مہینے اور انتیس دن بعد آپ کی عاشقی سے دستبردار ہو گیا —!

محترمہ ڈیش ڈیش صاحبہ آپ اس خیال خام سے خوش ہونے کی ناکام کوشش نہ کیجئے کہ مجھے ان گیارہ سال اور گیارہ مہینوں اور انتیس ۲۹ دنوں کے ضائع ہونے کا افسوس ہو رہا ہے۔

محترمہ میں کوئی عقل کا اتنا کورا تھوڑا ہی ہوں جتنا نظر آتا ہوں تو آگے بڑھنے سے پہلے سقراط اور بقراط قسم کے بزرگوں کا ایک نکتہ پلو میں باندھ لیجئے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں (چودہ کیرٹ کا بھی نہیں) اور ہر احمق دکھائی دینے والا بے وقوف نہیں —!

تو عرض یہ تھا کہ میں عقل کا کھوٹا نہیں — لہٰذا انتظار کے اس عرصے کے ایک ایک لمحے کو کہ جو دفتر — سیر تفریح — پکچر دیکھنے سونے اور راشن کی لائن میں کھڑے ہونے سے بچ رہتا تھا۔ اس ہر لمحے کو میں نے اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اگر بلانگ کمیشن والوں کو خبر لگ جائے تو وہ اس خاکسار کو اپنا آنریری چیئرمین بنا لیں —!!

حضور وہ کونسا کام ہے جو اس طویل عرصے میں میں نے نہیں کیا۔ آپ کو سنانے کی خاطر ڈھیروں نئے نئے شعر یاد کئے — جنھیں خیر آپ نے تو کبھی سننے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ لیکن جس کی بدولت میں ہر محفل کا مرجع زوال (درجہ دوم) تسلیم کیا جانے لگا اور میری رسائی بڑے بڑے لوگوں تک ہو گئی۔ کیوں کہ میرے پاس ہر موقعے کے لئے بے موقع شعر موجود تھے۔ بڑی ریاضت اور محنت سے اچھی اچھی معلوماتی اور سنجیدہ ثقیل ادبی کتابیں پڑھیں بلکہ لغت تک حفظ کر لی تاکہ آپ پہ میری قابلیت کا سکہ جم سکے — وہ تو مجھے بر وقت عقل آ گئی ورنہ اب تک پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر ہی لی ہوتی —!! آپ کو خط لکھ لکھ کر نہ صرف میری ہینڈ رائٹنگ خوبصورت ہو گئی اور آرٹ کے حلقوں میں خوشنویسی کر کے چار پیسے بھی کمانے لگا بلکہ آڑے ترچھے افسانے بھی لکھنے لگا جنھیں سارے ادبی اور غیر ادبی رسالے بڑے ذوق شوق سے چھاپنے لگے ہیں۔

(میں کہاں تک گنواؤں یہاں —)

ابتدائے عشق میں میں ادب کے بجائے اگر یہ نسخہ...

تھا نہ نل میں پانی ۔۔۔!) میں نے فرنچ کا ڈپلوما لے لیا۔ کیوں کہ آن دنوں آپ فرنچ پڑھایا کرتی تھیں ۔۔۔!

اور پھر آگے آگے سمجھا یہ کہ اپنی بالکونی میں بیٹھ کر آپ کی راہ تکتے تکتے دکھا کر یہ شہ کوچۂ رقیب تھا نہ گذرگاہِ خیال ۔۔۔!)

میں نے ستار سیکھنا شروع کر دیا چار پانچ سال اس میں نکل گئے ۔ پھر پینٹنگ کرنے لگا اور اپنے چھیتے بلے کی دم کو رنگ میں ڈبو ڈبو کر وہ وہ شاہکار بنائے کہ سارے جدید آرٹسٹ دنگ رہ گئے ۔ بلکہ بعضوں نے تو خودکشی کے بھی خوبصورت پروگرام بنا لئے ۔۔۔

آپ کی خاطر میں کچھ اسٹو بنانے بلکہ بھنانے تک کی تمیز نہ تھی نہایت اعلیٰ درجہ کی کافی عرف دیسی ایسپریسو اور بے انتہا لذیذ اور خستہ اور ہر دلعزیز کباب بنانے لگا اور شکر ہے کہ ان کے طفیل لندن میں دو سال عیش سے گذر گئے ۔

جی ہاں حضور! بندے نے خاص شہر لندن میں کباب پراٹھوں کا خوانچہ لگایا تھا ۔۔۔!

تو گویا تو اس عشق میں مجھے کسی قسم کا گھاٹا [illegible] ۔۔۔

(POINTS) اپنے ہی فیور (FAVOUR) میں نکلتے ہیں ۔۔۔ پھر رونا کیا اور گلہ کا ہے کا ۔۔۔ اور یہ تو مجھ پر روزِ اول سے ہی روشن تھا کہ حضور کی شادی میرے بجائے کہیں اور ہوگی ہی۔ پھر مجھے شکایت کیوں ہو ۔۔۔ مگر اے میری ڈیش ڈیش ۔ محبوب مجھے شکایت اس بات کی نہیں کہ تو نے شادی کر لی (اندازِ تخاطب میں تبدیلی کرسی کی تبدیلی کا نتیجہ ہے ۔۔۔!) نہ اس بات کا شکوہ کہ کہیں اور کر لی ۔۔۔ ویسے اس سلسلے میں ایک فی البدیہہ اور حد درجہ جدید نظم ہو گئی ہے ملاحظہ فرمائیے ۔۔۔ اور ذرا دل کھول کے داد دیجئے ۔۔۔!

اے میری محبوب
میں یہ تو نہیں کہتا تجھ سے
کہیں اور لا کر مجھ سے
کیونکہ ۔۔۔؟
تو ملتی ہی کب تھی مجھ سے ۔۔۔!
اے میری محبوب
میں یہ تو نہیں کہتا تجھ سے
کہ تو شادی کر لیتی مجھ سے
کیونکہ ۔۔۔!
تو پیار کرتی ہی کب تھی مجھ سے ۔۔۔!!

ہاں تو شکایت صرف اتنی ہے کہ جب تم نے تیرہ سال گذار لئے تھے تو چار دن اور انتظار کر لیا ہوتا [illegible]

اپنے ہونے والے کا ۔۔۔!)

میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے اپنے بارہ اور تیرہ برسوں کے ضائع ہونے کا کوئی غم نہیں ۔۔۔ ان بارہ تیرہ برسوں کے ڈبل ٹربل سبھی کھاتوں میں تو نفع ہی نفع ہے ۔۔۔ اتنا نفع کہ ڈر ہے کہیں ٹیکس نہ لگ جائے ۔۔۔!

مگر ہائے یہ چار دن ۔۔۔!

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کمند کہاں ۔۔۔

ہائے کیا تیرے لئے موسم سرما کے یہ چھوٹے چھوٹے چار دن بہاڑوں زینے کی چوٹیوں کی طرح نا قابل عبور تھے ۔ تو نے میرا جینا تو اتنا ہی خیال کیا ہوتا اے نادان تو نے تو تاریخ اس ستائیس تاریخ کو ہم تجھے شایانِ شان تحفہ دینے کے لئے پیسے کہاں سے لائیں ۔۔۔!!

تنخواہ ملنے میں پورے چار دن! بینک میں مبلغ بارہ روپے بیالیس پیسے ۔۔۔! اور لین دین اور ادھار کھاتے کا یہ عالم کہ ممکن ہوتا تو بازار سے بُرقع اوڑھ کر گذرتے ۔۔۔!!

[illegible] یہ میری ان اور آپ کے [illegible] نہیں ۔۔۔

[illegible] احتیاط کیجئے ۔۔۔

• [illegible]

مجیب آفی

شیطان کی نصیحت

ہر بات پہ مشرق کی تنقید کرو یارو
مغرب کی بہر صورت تقلید کرو یارو
مسجد کی طرف بچے جائیں تو انھیں روکو
پھر انھیں جانے کی تاکید کرو یارو
روزوں کی نمازوں کی تکلیف اٹھاؤ کیوں
ہاں شاٹ سے تم لیکن ہر عید کرو یارو
رستے پہ بدی کے ہر دم چلتے ہیں جو دنیا میں
ہر بات میں تم ان کی تائید کرو یارو
ہر جھوٹ کو تم اپنے سچائی کی صورت دو
سچائی کی ہر ممکن تردید کرو یارو
دنیا سے مٹا دو اب ہر نقش صداقت کو
باطل کی جہاں تک ہو تائید کرو یارو
دنیا سے خدا والے نابود تو کیا ہوں گے
تم ان پہ مگر ہر دم تنقید کرو یارو
تا زیست رہو قائم مسلک پہ مرے لیکن
اللہ سے بخشش کی امید کرو یارو

کرشن پرویز

غزل

گھر میں جب بیوی ہماری آئے گی
کام سب چوپٹ یہاں پر پائے گی
گھر میں واشن ہے نہ بستر دوستو
وہ کہاں بیٹھے گی اور کیا کھائے گی
اُس کی آرائش کا بل جس دن ملا
نیند آنکھوں سے مری اُڑ جائے گی
صبح کر جلدی چلیں سسرال میں
ورنہ اپنی چائے ماری جائے گی
سارا کوٹھی مائیں کرشن کو نہیں
زندگی فٹ پاتھ پر کٹ جائے گی ▲

ظفر چکدیزی

غزل

میرے ماتھے پر ازل سے صاف یہ تحریر ہے
میں ہوں بیوی کا مرید اور بیوی میری پیر ہے
دیکھ کر قول مرا ... سے وہ کہنے لگیں
ڈال آ چولہے میں کس چنڈول کی تصویر ہے
گھر سے باہر کر کے کہتی ہے کہ مسجد بھی نہ جا
کیا خدا کا گھر بھی تیرے باپ کی جاگیر ہے
دیگچی حلوے کی چولہے پر ہے دل میں اکھاڑ
رال منہ سے گر رہی ہے ہاتھ میں کفگیر ہے
دیکھ کر سیٹھ اور سیٹھانی کو یہ ہوتا ہے گماں
پہلوئے کٹھل میں جیسے اک غریب انجیر ہے
کیوں نہ میں چاہوں بھلا کیوں آپ ہیں اتنی حسین
یہ خطا میری نہیں خود آپ کی تقصیر ہے
گر ہی وی ان کی حجامت میں نے جس دن یہ کہا
زلفِ جاناں عاشقوں کے واسطے زنجیر ہے
لے تری چاہت میں آخر مجھ کو ٹی بی ہو گئی
دل تو تھا ہی پھیپھڑا بھی اب ترا نخچیر ہے
دیکھ کر بیوی کو میری کیا عجب کہہ دے کوئی
گرچہ دو پایہ ہے ہاتھی کی مگر ہمشیر ہے
شاعری میں تو ظفر لگتا ہے پورا مسخرہ
پر بھی جیون میں اپنے وہ بڑا گمبھیر ہے

واک آؤٹ

عاتق شاہ

واک آوٹ کی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں کوئی اہمیت ہو تو ہو لیکن پبلک کے پاس یعنی عوام کے پاس کچھ نہیں۔ ان کے لئے واک آوٹ ایک کھیل ہے۔ یا ایک ایسی بات جیسے کوئی خفا ہو کر کھانا نہ کھائے یا پھر غصے میں آکر پیر پٹکنے لگے۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ پیر پٹکنے اور تالی بجانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اس نازک فرق کو بھول جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے حضرات تالی بجانے لگ جاتے ہیں اور عورتیں پیر پٹکنے لگتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پہلے مردوں کا تالی بجانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل عورتوں کا تالی بجانا برا سمجھا جا رہا ہے۔ اس لئے پیر پٹکنے والی خواتین ہائی جمپ اور لانگ جمپ کے مقابلوں میں حصہ لے رہی ہیں اور مرد بیڈ منٹن کھیل رہے ہیں ۔۔۔ !

ویسے نازک کھیلوں سے فائدہ ایک ہوتا ہے کہ ہاتھ پاؤں میں چوٹ نہیں آتی۔ یہاں تک کہ کلائی میں بھی موچ کا امکان کم ہوتا ہے لیکن لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں ہمیشہ گھٹنے یا پیر کے فریکچر کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے خواتین ہائی جمپ کے بعد کسی کلینک کا رخ کرتی ہیں ورنہ تاوقتِ حالات ہیں سستانے کے لئے کسی ہوٹل یا پکچر ہاؤس میں وقت گزارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اور مرد بے چارے بیڈ منٹن کے بعد چولہے کی آگ سے اپنے نرم نرم ہاتھوں کو سینکتے ہیں۔ ظاہر ہے مرد کے لئے یہ لمحہ بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے جب وہ بیوی کی غیر حاضری میں کچن کا انچارج بن جائے اور منا یا منی کو بجائے دودھ کے چاول کی پیچ پلائے اور اس سے زیادہ نازک اور جان لینے والا لمحہ وہ ہوتا ہے جب بیوی رات کے ایک بجے سکنڈ شو دیکھنے کے بعد تھکی تھکائی گھر میں داخل ہوتی ہے اور شوہر اسی لمحے اور اسی جانب سے گھر کے باہر چلا جاتا ہے۔ پالیٹیکل حاشیہ کی زبان میں ایسی حرکت کو واک آوٹ کہتے ہیں ۔۔۔ !

واک آوٹ کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں ۔۔۔ جن میں سے دو قسمیں بڑی پاپولر ہیں۔ ایک وہ جس میں ناراض آدمی سر جھکا کر خاموشی سے باہر چلا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں وہی ناراض آدمی اپنی مٹھیوں کو بھینچ کر نعرے لگاتا

اور پیروں کو زمین پر پٹک پٹک کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے ۔!

اور پھر یہ گڑبڑ جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل جاتی ہے ۔ کرفیو کے نفاذ کے بعد یہ آگ اسی طرح ٹھنڈی پڑ جاتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا !

واک آوٹ جمہوری زندگی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے ۔ معلوم نہیں دنیا کی وہ پہلی کون سی شخصیت تھی جس نے واک آوٹ جیسے حربے کو دریافت کیا اور انسان کو اپنی برہمی اور ناراضگی کے اظہار کا ایک آسان طریقہ بتایا ۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس طریقے کو عوامی سطح پر اتنا برتا گیا کہ اب واک آوٹ ایک سستی چیز ہو کر رہ گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے اپنے انداز میں واک آوٹ کر رہا ہے ! کیا طالب علم، کیا استاد، کیا نرس، کیا ڈاکٹر، کیا کسان کیا مزدور اور کیا زمیندار، کیا کلرک، کیا باس ۔ غرض سب ہی اپنی بات دوسرے کو سنوانا چاہتے ہیں ۔ اور دوسرا اپنی بات ۔ اس شور و غل اور ہنگامے میں کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے اور نہ یہ پتہ چل رہا ہے کہ کون واک آوٹ کر رہا ہے !

واک آوٹ ہمیشہ اپوزیشن پارٹی کی طرف سے ہوتا ہے خواہ وہ اسمبلی میں ہو یا پارلیمنٹ میں ہو یا گھر میں ۔ ان دونوں میں بنیادی فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی کی ساری کارروائی اخبارات میں چھپتی ہے اور گھروں کی نہیں ۔ اگر گھروں کی تفصیلات بھی چھپنے لگیں تو عوام پارلیمنٹ اور دنیا کے پبلک ہاوز کو بھول جائیں اور روزنامہ اخبارات کی اشاعت دگنی چوگنی ہو جائے ۔ گھروں میں اپوزیشن پارٹی کی لیڈر ہمیشہ عورت ہوتی ہے اور وہ بھی بیوی ۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی کوئی دوسری عورت غیر قانونی طور پر برسرِ اقتدار آجاتی ہے ۔ ایسی صورت میں اپوزیشن اور بھی سخت اور مستحکم ہو جاتی ہے ۔ ورنہ بیوی خواہ وہ جاہل ہو یا دنیا کی پڑھی لکھی ہو، اپوزیشن ہی کی کرسی پر اپنے بچوں اور بچیوں کے ساتھ بیٹھنا زیادہ پسند کرتی ہے ۔ اور مرد بے چارے کو ہر ناخوشگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ ادھر پیاز کی قیمت بڑھی اُدھر شوہر کو بیوی کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا ہے کہ وہ ہر مہینہ دیے جانے والے مقررہ پیسوں میں اضافہ کیوں نہیں کرتا ! اس کے برعکس جہاں بیوی کمانے والی ہو اور شوہر گھر میں بچوں کو سنبھالتا ہو تو وہاں سرے سے اپوزیشن ہوتا ہی نہیں ۔ کیا مجال جو شوہر اپنی بیوی سے یہ دریافت کرلے کہ رات میں وہ کس کی اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر آئی تھی ۔

ارے ہوگا کوئی ! بے روزگار شوہر آفس کے ان رموز کو کیا سمجھے !

اگر کوئی شوہر اس رمز کو سمجھنے پر اصرار کرے تو بیوی مستقلاً شوہر کی زندگی سے واک آوٹ کرتی ہے ۔ اس عمل کو مذہبی زبان میں خلع اور سرکاری زبان میں طلاق کہتے ہیں ۔ !

اس کے برعکس اگر شوہر کو اپنی بیوی کا آفس کے کسی افسر کی اسکوٹر کے پیچھے بیٹھنا پسند نہ آئے تو اسے بھی یہ قانونی حق پہنچتا ہے کہ بیوی کو اپنی زندگی سے، اپنے گھر سے نکال دے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اسی وقت مہر کی رقم اپنی بیوی کو ادا کردے ورنہ شوہر اکثر بیوی سے سمجھوتہ کرتا ہے ۔ سمجھوتہ کیا بیوی کے باس کے سگریٹ لانے کے لئے وہ بیوی اور افسر والوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بازار چلا جاتا ہے ۔!

عام طور پر گھریلو زندگی میں واک آؤٹ کی دلچسپ قسم وہ ہوتی ہے جب شروع شروع میں کمرے کے کھسر پھسر کی آوازیں آتی ہیں اور پھر آہستہ سے دروازہ کھلتا ہے اور بیوی باہر آکر دالان میں اپنی ساس یا نند یا اپنے بچوں کے ساتھ سو جاتی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ شوہر محترم باہر آکر اپنے بھائی یا بچے کے ساتھ سو جائیں!

واک آؤٹ انفرادی سطح پر ہو، یا اجتماعی، گھر سے ہو یا اقوام متحدہ کی کسی اسمبلی کے ہال سے وہ اٹھتا ہوا تیر ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا لیکن کسی گروہ، طبقے، قوم یا فرد کا بدترین واک آؤٹ وہ ہوتا ہے جب وہ خفا ہو کر دنیا کو ہی چھوڑ دے۔ ان حضرات کے یہاں ایک ٹکنیکل غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ واک آؤٹ کی پوری تعریف سے واقف نہیں ہوتے۔ واک آؤٹ کسی خاص مسئلہ پر اپنی ناراضگی کا ایک جذباتی ردعمل ہے جو لمحاتی ہوتا ہے جیسے ہی منظر بدلے اور دوسرا موضوع زیر بحث آئے وہ سب کے سب واپس آ جاتے ہیں اور زندگی کی بھرپور دلچسپیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کس انشکھوری نے ان سے کہہ دیا کہ واک آؤٹ کرنے والا جا کر لوٹتا نہیں!

ناظم انصاری

صرف دو شعر سُنانے کی اجازت دیجئے

مجھ سے یہ کہتا ہوں کہ مسند صدارت دیجئے
صرف دو شعر سُنانے کی اجازت دیجئے

سیکڑوں میل کی دُوری پہ ہے میرا گاؤں
چل کے آیا ہوں بمشکل یہاں پاؤں پاؤں
دُھوپ ہی دھوپ تھی اب آپ نہ دو تھوڑی چھاؤں
جیب خالی ہے مری پھر بھی نہ اُجرت دیجئے

صرف دو شعر...

ٹھیک سے کھانا نہیں وقت پہ کھانا پھر بھی
سر چھپانے کو نہیں کوئی ٹھکانا پھر بھی
قابلِ رحم ہے میرا یہاں آنا پھر بھی
آپ کا دل ہے مجھے کوئی مصیبت دیجئے

صرف دو شعر...

لوگ چاہیں تو مجھ سے بھی کرا سکتے ہیں
شاعروں کے لئے ماحول بنا سکتے ہیں
مجھ سے شاعر کو بہ آسانی کھپا سکتے ہیں
[illegible] ہو جاؤں گا ناچیز کو زحمت دیجئے

صرف دو شعر...

[illegible] میں بھی غزل اپنی سنا سکتا ہوں
اور قوالی کے لہجے میں بھی گا سکتا ہوں
ایک ہی تان میں اس چھت کو اڑا سکتا ہوں
اس کلاکار کو اک موقع تو حضرت دیجئے

صرف دو شعر...

[illegible] نظر آتے ہیں فنکار یہاں
ایک سے ایک سنائیں گے جو اشعار یہاں
[illegible] ناظم کا بھی پرچار یہاں
[illegible] اس کی نہ ضمانت دیجئے

صرف دو شعر...

میکدوں کا مستقبل!

[illegible] ہو گیا ہے دور سبھی
تشنہ لب پھرنے لگے ہیں دربدر
دار و پینے [illegible] تھا دورہ پیش
میکدے سب ہو جائیں گے پیشاب گھر

آثارِ قدیمہ

آئی تھی دلہن بن کے میرا گھر [illegible]
[illegible]
اب گردش حالات نے سب چھین لیا
دونوں ہی نظر آتے ہیں [illegible]

"فسادوں کی ریہرسل"

بھول جائیں نہ کہیں تم کو عوام
[illegible] اُن کی [illegible] کرو
خیر یہ کام [illegible]
[illegible] فسادوں کا [illegible] کرو

[illegible]

معشوق جفا پیشہ

یعنی

اسکوٹر ہمارا

اشفاق احمد

ایک تو شہر اونچا نیچا

سطح کا ہوا، دوسرے سڑکوں کا یہ عالم کہ کہیں گلیاں پھیلی ہوئی

ہیں، کہیں گڑھے اپنا آغوش وا کئے ہوئے ہیں اور کہیں پھسلن ایسی کہ ذرا چوکے اور تصویر

اتری۔

لیکن ہم آپ جو اتفاق سے انسان کہلاتے ہیں اور انسان کہلانے کا حق قائم رکھنے بلکہ بھرم بنائے رکھنے کیلیے وہ سارے کام کرنے پر مجبور ہیں جن کی کسی انسان سے توقع کی جاتی ہے۔ اس لئے راہ فرار کوئی نہیں۔ انہیں سڑکوں پر چلنا اور اگر اللہ نے تھوڑی بہت توفیق عطا کی ہے تو کسی سواری کا بھی سہارا لینا ہے۔ سواری اپنی ذاتی ہو تو کیا کہنا ہے ورنہ دوسرا نام بس ہے۔

اس زمانے کے دھندلے دھندلے نقوش اب بھی جب یاد آتے ہیں تو تڑپا جاتے ہیں۔ جب ہم بھی بالا تھے

لیکن بہت بڑھ کر بھی اتنے فرد نہ تھے کہ کمار کی گدی نشینی سے معزول ہوئے تو خود

کو سائیکل کا ہینڈل تھامے پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا لڑکپن کا

جب سائیکل بھی ہوائی جہاز تھی

ہم سفر

کرتی تھی لیکن جوں جوں عناصر کا اعتدال ساتھ چھوڑتا گیا، سائیکل وبالِ جان بنتی گئی۔ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہے اور اگر ایسی حالت کچھ دیر اور برقرار رہی تو خود کے چل بسنے کا خطرہ ہے۔

بس ذرا حالات کا ساز گار ہونا تھا کہ موٹر اور سائیکل کے بیچ کی چیز یعنی اسکوٹر پہ گھر تہ کر لیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ یکسشتہ جو بظاہر موٹر سے ذرا نیچی اور سائیکل سے ذرا اوپر ہے اور جس کے انتظار میں ہم دیڑھ سال تک شاعروں کی شالی شب ہجر کے علاوہ اپنے دن کو بھی مسلسل آزار کی شکل دیئے ہوئے تھے، جب ملے گی تو تھوڑے سے عرصہ بعد ہی ہمیں "ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے" کی تفسیر بنا دے گی اور یہ واقعہ تب کا ہے جب آتش جوان تھا!

اسکوٹر ملنے کے بعد پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ "ہدایت نامہ اسکوٹر" اتنے غور سے پڑھا جتنا کبھی طالب علمی کے زمانے میں میٹرک کا سوال کا جواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ مثلاً گیر کہاں بدلنا ہے؟ کلچ کیسے دبانا ہے؟ اور جب تک ایک ہزار کلومیٹر نہ ہو جائیں زیادہ اسپیڈ میں گاڑی نہیں چلانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے دن ہی ہمارے ایک کرم فرما نے کہا کہ ذرا اسکوٹر دینا۔ ۵ منٹ میں آیا۔ ہم نے کہا: شوق سے لے جاؤ۔ مگر ۳۵۔۴۰ سے زیادہ اسپیڈ میں نہ چلانا! اور ڈرانے کو یہ بھی کہہ دیا کہ کچھ خرابی ہے۔

ہمارے ان کرم فرما کے ۵ منٹ پون گھنٹے کے برابر نکلے۔ ادھر اس درمیانی عرصہ میں ہماری جان سوکھتی رہی کہ پتہ نہیں کیا حادثہ پیش آیا۔ ہم اپنے اسکوٹر کی سلامتی کی دعا مانگتے رہے۔ بہت بعد میں خیال آیا کہ بے جان چیز کے لئے اتنی فکر! اگر خدا نخواستہ ہمارے دوست کو کچھ ہو گیا تو! مگر یہ سوچ کر پھر اسکوٹر کی سلامتی کی ہی دعا مانگی کہ اس کی سلامتی میں ہی ہمارے دوست کی بھی سلامتی تھی۔

آتے ہی ہمارے دوست بولے "خواہ مخواہ ڈرا دیا۔ کوئی خرابی ورابی نہیں۔ میں نے ۷۰۔۷۵ کی اسپیڈ میں بھگایا کچھ بھی نہیں ہوا!"

سوچا کہ اگر اپنی روایتی مروت کا یوں ہی مظاہرہ کرتے رہے تو اسکوٹر سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ فوراً ایک پارٹی کا اہتمام کیا۔ اور سارے شناسا، جن کے بارے میں یہ خدشہ تھا کہ مستقبل قریب یا بعید میں اسکوٹر مانگ سکتے ہیں۔ انہیں لذتِ کام و دہن کے سامان فراہم کرنے کے بعد اس قسم کا اعلان کیا کہ ہم اپنا اسکوٹر کسی کو نہ دیں گے۔ اس خطاب کی ایک قسم بھی کھائی۔

اس اعلان اور قسم کے نتیجہ میں کچھ نے زیر لب اور کچھ نے برلب اور دھڑلے ہوۓ قسم کے تحفے اچھالتے ہوئے ہماری بے رخی کو "ایک ذرا سا اسکوٹر" پانے پر دماغ بہک جانے کا طعنہ دیا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ ہم اس شغل کے چکر میں اچھے بہت سے دوستوں کی محبت سے محروم ہو گئے ہیں۔ سچ ہے کہ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں حالات۔

یہ پہلا تلخ تجربہ تھا جو اس اسکوٹر کے توسط سے ہمیں ملا۔ ہمیں کیا معلوم تھا اس "معشوق جفا پیشہ" کے سبب ہمیں ابھی بہت سے تجربات سے ابھی دو چار ہونا ہے۔

چند دن تو گاڑی ٹھیک چلی۔ کیونکہ اسکوٹر ٹھیک چلا۔

لیکن دھیرے دھیرے ہمیں احساس ہوا کہ اسکوٹر کے طفیل ہمارے اندر بہت سی تبدیلیاں ہونے لگی ہیں۔ پہلے ہم اس بات کے لئے مشہور تھے کہ سویرے اٹھتے ہی گل گشت کو جاتے ہیں۔ احباب دوستوں کو ہوا خوری کے لئے پیدل چلنے کے فوائد پر اکثر لیکچر دیا کرتے تھے۔ خود میلوں چلتے تھے اور اپنی تن درستی اور جوانی کا راز اسی سیر گشتی کو سمجھتے تھے مگر ہمیں اب یہ محسوس ہوا کہ پیدل چلنے کے نام سے ہمیں بخار آنے لگا ہے اگر سویرے گل گشت کو جائیں گے یا باسکٹ بال کو یا باکی گراونڈ تک جائیں گے تو کیا مجال جو ایک قدم بھی چلیں۔ اسی اسکوٹر کا سہارا لیں گے۔ حالانکہ گراونڈ کا فاصلہ مشکل سے نصف فرلانگ ہوگا۔

دھیرے دھیرے اسکوٹر نے ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کئے۔ آج ٹیوب میں فریکچر ہو گیا ہے۔ کل ٹائیر پھٹ گیا ہے پرسوں پہلے وائر ٹوٹ گیا ہے۔ گیئر وائر کا ٹوٹنا، پلگ کا خراب ہوجانا، جیب میں کچھ آتا روز کا معمول ہو گئے۔

ہمارے حلقۂ احباب میں اس اسکوٹر کی آمد سے جو کمی ہوئی تھی وہ میکینک صاحبان کی دوستی سے پوری ہونے لگی۔ پہلے جو وقت اپنی دالسنت میں علمی و ادبی محفلوں میں گزارا کرتے تھے اس میں سے بیشتر حصہ اب اسکوٹر کو درست کرنے والے کارخانے ہو گئے۔

اسکوٹر کی ٹوٹ پھوٹ تک ہی بات محدود رہتی تو صبر کر لیتے اب خود ہماری ٹوٹ پھوٹ بھی ہونے لگی۔ ہمیں اپنی اسکوٹر چلانے کی صلاحیت اور کارکردگی پر بڑا ناز تھا۔ اکثر حیران رہتے کہ پھر بھی حادثات میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے۔ اور اسی نسبت سے ہمارے بے داغ جسم پر عجیب و غریب قسم کے نشانات کیوں جگہ پا رہے ہیں۔

ہمارے ایک دوست نے اس عقدہ کو یوں حل کیا کہ تم اچھی ڈرائیونگ کرتے ہو ٹھیک ہے۔ لیکن اس کی کیا گیارنٹی کہ سامنے سے آنے والی کار یا پیچھے سے آنے والے ٹرک کا ڈرائیور بھی اتنے ہی محتاط ہوں۔ اور پھر وہ بچے جنہیں ماں باپ نے پیدا کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد سڑکوں کے سایہ میں پل کر جوان ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہے کب سامنے آجائیں۔ انہیں بچاؤ تو خود مرو اور ان پر گاڑی چڑھا دو۔ تو بھی خود مرو۔ پہلی شکل میں گرنے سے چوٹیں آئیں گی۔ دوسری شکل میں پٹنے سے۔ منزل دونوں کی ہاسپٹل ہوگی!

بات دل کو لگی۔ اور اب ہم نے اپنی اسکوٹر کی رفتار اتنی دھیمی کر دی کہ بعض اوقات یہ دیکھ کر ہمیں بڑی شرم آتی کہ کوئی بھی سائیکل والا سیٹی بجاتا ہوا ہم سے آگے نکل جاتا۔

ایک بار تو ہماری یہ شرمندگی انتہا کو پہنچ گئی۔ راستہ میں پیدل چلتے اپنے ایک ساتھی کی حالت پر ترس کھا کر ہم نے اپنی گاڑی روکی اور اس سے کہا "آؤ ہم تمہیں چھوڑ دیں"

وہ بڑی بے نیازی سے یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"مجھے ذرا جلدی پہنچنا ہے"۔

پتہ نہیں اس کا اشارہ ہماری سست رفتاری پر تھا یا ہمارے اسکوٹر کے بار بار بگڑ جانے پر "ہوٹنگ" کر رہا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ بار ہا سنا یہ لطیفہ خود ہم پر بھی صادق آئے گا۔

آخر ان روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر ہم نے یہ طے کیا کہ اسکوٹر کی سواری وقت وقت پر۔ پیدل چلیں گے

بس میں۔ پتہ نہیں کس منحوس گھڑی میں ہم نے یہ سوچا تھا کہ عین اسی وقت ایک لمبی چوڑی تنہا سڑک پر ایک ہاتھ ٹھیلے دیکھتے ہوئے ہم اپنا ہاتھ اتروا بیٹھے۔

ڈاکٹر نے ایک ہفتہ کیلئے ہاتھ پہ پلاسٹر چڑھایا اور اب ہم واقعی پیدل تھے۔ ہمیں احساس ہوا کہ اس تیز رفتاری کے ساتھ چلتی مصروف دنیا میں پیدل چلنے میں کتنا وقت نکل جاتا ہے۔ ایک دو دن آٹو اور ٹیکسی سے کام چلایا۔ پتہ چلا کہ اتنے پیسے نہیں ہیں۔

بس میں جوڑ گئے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس بس نشینی کا انجام ہمارے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا کی شکل میں ہوگا۔ اسٹینڈ سے چل کر بس کوئی نصف فرلانگ چلی ہوگی کہ رک گئی۔ پتہ چلا ٹکٹوں کا حساب ہوتا ہے۔ دس منٹ بعد پھر بڑھی تو کچھ ہی سواریاں بھرنے کیلئے رک گئی۔ ۵ منٹ اس میں بھی لگے۔ پھر بیٹھنے کے مسئلہ پر دو سواریوں میں جھگڑا ہو گیا۔ بس پھر رک گئی۔ دس منٹ اور خراب ہوئے۔ مشکل سے تھوڑا راستہ طے کیا ہوگا کہ پھر بس رک گئی۔ اب کیا ماجرا ہے؟ پتہ چلا کہ چالان ہو رہا ہے۔ ہم بڑے حیران کہ یہ ہر قدم پر چالان کیوں؟ سواریاں گنی گئیں۔ یقیناً زیادہ تھیں۔ نصف گھنٹہ کی مختصر کارروائی کے بعد چالان مکمل ہوا۔ اور بس پھر آگے بڑھی۔

لیکن بس آگے بڑھنے سے قبل ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔

ہم سے پہلے بس میں بیٹھا ایک من چلا مسافر اٹھا اور بولا "ممکن ہو آگے بھی پولیس کھڑی ہو۔ اس لئے رسید دے دیجئے کہ یہ بس پہلے سے چالان شدہ ہے۔ مزید تکلیف کی ضرورت نہیں"۔

ایک دوسرے بس میں بیٹھے تبے بس ورنے چلا کر کہا۔

"کیوں غریبوں کے پیٹ پہ لات مارتے ہو؟"

(ہم نہیں سمجھ سکے کہ جس غریب کے پیٹ پر لات مارنے کا تذکرہ تھا اس سے مراد بس والا تھا یا چالان کرنے والا۔ یا دونوں؟)

ہم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ بس سے نیچے اتر جائیں۔ بدقت تمام اس مہم کو سر کیا اور سوچنے لگے کہ ہر زمانے میں سزا دینے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ البتہ جرائم کی نوعیت کے ساتھ سزا کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ سزا دینے والوں کے ہاتھ بدلتے .... اور سزا کی قسموں میں ہیرا پھیری ہوتی رہتی ہے۔ شاید بس میں سفر بھی ایک سزا ہے!

ہمیں بے اختیار اپنا اسکوٹر یاد آیا۔ کتنا ہی خراب ہو۔ اپنے دامن میں کتنی ہی الجھنیں رکھتا ہو۔ کتنے ہی خطرات کا نام اس سے جڑا ہوا ہو۔ یہ سب کچھ ہو مگر:

"اس سے اپنا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائے"

سارویس

برقؔ آشیانوی

یہ وہ "سارویس" نہیں جس کے اختتام پر پنشن مل جاتی ہے بلکہ یہ سارویس ہے جس میں پہنچنے کے بعد ہر لمحہ یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں زندگی ہی سے بغیر "پنشن" کے ریٹائرڈ نہ ہو جائیں۔ صحیح لفظ اپنی اصلیت میں کسی زمانے میں قائم رہا ہو اور سرویس کہلاتا ہو تو ہو لیکن جس وقت یہ ہمارے گوش گزار ہوا اس وقت تک امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں "سارویس" (بہ یائے مجہول) ہو گیا تھا۔ سارویس نے اپنے بطنِ مادر یعنی کارخانے سے کسی زمانے میں ایک موٹر وہیکل کی شکل میں جنم لیا ہوگا لیکن آج اس کی شکل دیکھ کر دل یہی کہتا ہے کہ اس کو "موٹر" کے بجائے "باقیاتِ موٹر" کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ جس طرح کسی شاعر کے جملہ عناصرِ ترکیبی "فانیاتِ شاعر" ہو کر رہ جاتے ہیں اور صرف شاعری "باقیاتِ شاعر" کی شکل میں شاعر کا نام زندہ رکھتی ہے۔ اسی طرح موٹر کے "اجزائے ترکیبی" بدل بدلا کر یا گم ہو کر صرف چند باقیاتِ موٹر رہ جاتے ہیں جس کا نام "سارویس" رکھ دیا جاتا ہے۔ اس لفظ سے اس کی تاریخِ پیدائش، ارتقائے حیات، تقویمِ زندگی اور موجودہ حالِ پریشانی کا پورا نقشہ ہر اس شخص کے ذہن میں آ جاتا ہے جس نے اس کو صرف دیکھا ہو بلکہ اس میں سفر کرنے کے عذاب میں مبتلا بھی ہوا ہو۔ اگرچہ کہ "بس" نے اس کو سارویس کرتے ہوئے "بس" کر دینے میں اپنی مساعی کا کوئی حربہ نہ چھوڑا لیکن یہ بھی ایسی سخت جان واقع ہوئی ہے کہ اگر ایک سمت میں اس کو کچلا گیا تو دوسری سمت میں نمودار ہوئی۔ ایک شاہراہ پر اس کو روکا گیا تو دوسری "گداراہ" (شاہراہ کی ضد پر گداراہ کی ترکیب شاہ و گدا کے [illegible] کو ملحوظ رکھ کر وضع کی گئی ہے [illegible]) شاہراہ [illegible] کے اشارہ پر چلتی ہے اور سارویس گداؤں کی [illegible] کہتی ہے [illegible]۔ بہرحال برقؔ آشیانوی کے اس شعر کے مصداق [illegible]

اس کی اس کشمکش حیات کا حال سننے کے بعد اس
ایک طرف منافسہ کی کوشش کی جاتی ہے تو دوسری طرف سر اٹھاتی ہے۔
کے موجودہ اجزائے ترکیبی کا حال سنئے کہ کن عناصر منتشر کو اپنے سینے میں دبائے وہ اپنی موت و حیات سے برسرپیکار ہے۔ "ساروِیس" کا ایک حصہ ہے جو اس کے جسم سے اس طرح لگا دیا ہے جس طرح علی بابا کے بھائی قاسم کا سر علحدہ کر دینے کے بعد "خلیفہ" نے (اس وقت کے حجام جو اپنے وقت کے سیول سرجن ہوا کرتے تھے) چمڑے کے رشتے سے سی دیا ہو جسم یعنی باڈی پر نظر ڈالئے تو ایسی نظر آتی ہے جیسے کسی جانور کے جسم سے کھال کھینچ دی گئی ہو۔ اس کے تمام پاؤں یعنی ٹائر کئی جگہ سے زخمی ہیں لیکن سب کی مرہم پٹی کر دی گئی ہے۔ ایک پر تو گمان ہوتا ہے کہ رسولی نکل آئی ہے جب ہم نے اس میں داخل ہونے کے لئے فٹ بورڈ پر قدم رکھا تو وہ تھر تھرا کر اس طرح لرز اٹھا کہ ہم فوراً اس اندیشے سے نیچے اتر [illegible] کہیں وہ ہم کو لے کر نیچے نہ آ [illegible] ڈ کا تو کچھ باقی ہی نہ تھا جو بگڑ سکتا لیکن ہمارے اعضائے جسمانی باوجود اس گرانی و مصائب کے موٹر کے اجزائے ترکیبی سے بہر حال بہتر حالت میں تھے جن کے بگڑنے کا امکان ابھی باقی تھا لیکن ایک صاحب نے جو فٹ بورڈ سے اوپر کی منزل پر کھڑے تھے ہماری بزدلی پر ہنس کر کہا۔ "آپ اطمینان سے چڑھ جائیں۔ فٹ بورڈ اگرچہ ہلتا بلکہ لرزتا ہے لیکن ابھی اس میں اتنا دم خم ہے کہ ہم سے دو چند وزن تو ہلتے جلتے آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔ جب ہماری زندگی کو خطرے سے باہر بتلایا گیا تو ہم نے ہمت کر کے پھر فٹ بورڈ پر ایک قدم رکھا اور جب دوسرا قدم اندر رکھنا چاہا تو معلوم ہوا کہ "اندر" کسی قسم کی کوئی گنجائش ہی ہی نہیں ہے یعنی آگے

> **نوٹ:** (جو کرنسی نہیں ہے) تقریباً پندرہ سال پہلے جب ہم سنٹرل جیل پر کارگزار تھے تو ہمیں اکثر حیدرگوڑہ چادرگھاٹ وغیرہ جانے کے لئے جس سواری کے ذریعہ سفر کرنا پڑتا تھا وہ ایک "خانگی سرویس گاڑی" ...
> بقیہ ص ۵۹ پر

قدم بڑھانے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں رہی ہے کیونکہ ساروِیس ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ولیمہ کی دعوت کھانے کے بعد ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے اور مزید ایک نوالہ کھانا تو کجا پانی پینے تک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہم بورڈ سے اوپر کے زینے کو غور سے دیکھ کر یہ "دریافت" (یعنی DISCOVERY) کرنا چاہتے تھے کہ پورا نہ سہی آدھا ہی قدم رکھنے کی کوئی جگہ نکل سکتی ہے یا نہیں کیونکہ صرف ایک ٹانگ پر کھڑا ہونا نہ صرف نامعقولیت پر مبنی تھا بلکہ تکلیف دہ بھی۔ اتنے میں ایک تحکمانہ لہجے میں کسی نے کہا "اندر آجایئے صاحب"۔ اس حکم کو سن کر ہم حیران رہ گئے۔ اندر تو ہم خود ہی جانا چاہتے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ کچھ "اندر" باقی رہ بھی رہا تھا کہ جس میں جائیں پھر یہ حکم کیا معنی رکھتا ہے۔ ابھی ہم مسئلے کی نزاکت پر غور کر ہی رہے تھے کہ پھر ایک آواز آئی اور پہلے کی نسبت زیادہ زور دار اور زیادہ تحکمانہ کہ "اندر آجایئے صاحب" ہم نے جواب دیا "کس کے اندر۔ گاڑی کے اندر یا سڑک کے اندر" اس پر ایک صاحب نے جن کے گلے میں ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا تھا اور ہاتھ میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی جس پر بہت سے رنگوں کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے اور غالباً حکم دینے والے بھی وہی تھے، ہمیں غضبناک نظروں سے دیکھا، ہم نے ڈر کر نظریں نیچی کر لیں کہ کہیں ہماری نظر ملانے پر ان کے غصے کا پارہ اور نہ چڑھ جائے۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے کہا "گاڑی کے اندر"۔ ہم نے نظریں نیچی رکھے ہوئے عرض کیا۔ "ہم میں تو اتنی ہمت نہیں ہے کہ کوشش کر کے اندر جا سکیں۔ اگر آپ اٹھا کر ہمیں اندر کہیں ڈال دیں تو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔" اس پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے ان حضرات نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا جو اس قابل تھے کہ ہماری

آواز نہ صرف سن سکیں بلکہ سمجھ بھی سکیں۔ باقی وہ لوگ جو بیٹھنے کو تو بیٹھے تھے لیکن دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ اس بیٹھنے کے عذاب سے جلد از جلد نجات نصیب ہو۔ یا تو انھوں نے سنا ہی نہیں یا اگر سنا ہو تو جس درد و کرب میں مبتلا تھے اس پر خوش مذاقی کچھ اثر کر ہی نہ سکتی تھی۔ ان کے علاوہ جو لوگ کھڑے ہوئے تھے کچھ ایسے حالات سے دوچار تھے کہ وہ نہ کچھ سن سکتے تھے نہ دیکھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے نہ ہنس سکتے تھے نہ رو سکتے تھے نہ ہل سکتے تھے۔ البتہ اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سانس لے سکتے تھے اور سانس لینے کے لئے انھیں جو ہوا مل رہی تھی اس میں کئی ایسی ہوائیں بھی شامل تھیں جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔ ہم نے اپنی تجویز کا ردعمل معلوم کرنے کے لئے ان حضرات کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا کیوں کہ آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔ تب معلوم ہوا کہ وہ "اندر" جس کو سیاسی اصطلاح کا جائزہ لے رہے ہیں تاکہ ہم کو "بازآباد" کر سکیں میں "سرپرے" کہا جاتا ہے اندر کی طرف رخ کر کے اس کے بعد انھوں نے "ہم بھائی" ذرا آجا حکم جاری کر دیا "اندر ہٹیں گے جگہ ہی نہیں ملا۔" ابھی کتنا اندر کہہ کر رہے تھے۔ اندر کا تب آقا صاحب نے جو درمیان میں پہلے سر ڈالا کیا۔ اور لوگوں کے وہ بھی اپنے ساتھ لے کر کیونکہ اپنا پورا جسم زور سے لگا کا۔ "آجا۔ نہ جا سکتے تھے پھر آپ ذرا سید ھے کھڑے ام بھائی صاحب صاحب سے یہ مخاطب رہیے نا" کیوں کہ جن کہ ذرا سا پھیلا کر اتفاق تھے وہ ہاتھ اور پاؤں "آرام" سے کھڑے ہو خود غرضی کے ساتھ لے انہیں "سیدھا" تھے جیسا کہ کندکٹر صاحب

تھی جس کا نام بگڑ کر "سارودیس" ہو گیا تھا۔ یہ مضمون ہم نے اسی زمانے میں لکھا تھا لیکن شائع اس لئے نہیں کروایا تھا کہ کہیں دوسرے ہی دن علمبرداران سارودیس ایک بڑا سا اسکرو ڈرائیور لے کر آئیں اور ہمارے دماغ کے کل پرزے ٹھیک نہ کر دیں۔ اب جبکہ شہر میں سارودیس کا وجود باقی نہیں رہا ہم نے پوری جراءت کے ساتھ یہ مضمون اشاعت کے لئے روانہ کیا ہے تاہم ایڈیٹر صاحب "شگوفہ" پہلے اس بات کا اطمینان کر لیں کہ اب اس کی اشاعت میں ہمارے اور ان کے لئے کوئی خطر باقی نہیں ہے۔ ورنہ دو چار سال اور انتظار کر لیں تاکہ ملک کے کسی گوشے سے بھی "سارودیس" کی ہنگامہ پرور آواز بلند نہ ہو۔ بہرحال اس مضمون کی شکل ایک ٹائم کیپسول کی سی ہے جس کو مناسب و موزوں وقت پر کھولا گیا ہے۔
ویسے آج یہ مضمون آر ٹی سی بس پر بھی تقریباً پورا اترتا ہے لیکن ہم ڈبل ڈیک کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ مضمون آر ٹی سی بس کے لئے نہیں لکھا۔ اگر مضمون کے کسی جز یا اجزاء میں مطابقت پائی جائے تو یہ مطابقت محض اتفاقی ہے۔ اس لئے عرض ہے کہ کوئی آر ٹی سی بس اس کو اپنی طرف منسوب نہ کر لے اگر یہ رضا و رغبت قبول کرے تو ہمیں بھی ایجاب و قبول میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

کر دیا یعنی [illegible] انھیں بھی ایک عذاب میں مبتلا کر دیا۔ پھر وہیں سے "اندر" تیسرے صاحب کو بھی کہ زیادہ عذاب میں مبتلا کرتے ہوئے آگے ایسا حکم دیا "اندر آجایئے" ہم نے دیکھا کہ واقعی پاؤں رکھنے کی گنجائش اندر نکل آئی ہے۔ اس پر ہم خوش [illegible] ذرا ہیچ پر کچھ ہو گئے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم "اندر" ہو گئے "یعنی اندر" ہوتے ہی ایک اور مصیبت کا سامنا ہوا یعنی ہم ایک پاؤں تو پورا رکھ سکے لیکن دوسرا پاؤں آدھا ہی رکھ سکے تھے یا پھر [illegible] طرف جھکنا پڑتا تھا [illegible] پاؤں کو ذرا اندر [illegible] کسی کی ایک [illegible] آواز آئی "ہائے اللہ مر گیا" [illegible] ہم [illegible]

باہر دھکیلے گئے تو اگر اوپر کے ڈنڈے کو پکڑے ہوئے کھڑے نہ ہوتے تو سڑک پر لیٹے ہوئے نظر آتے تب ہمیں پتہ چلا کہ ہمارا ایک پاؤں ایک معمر خاتون کے پاؤں پر پڑا تھا جو اپنی انتہائی حد تک سمٹی سمٹائی کھڑی تھیں۔ ہمیں بہت رنج و ملال ہوا اور ہم نے پوری شرافت انسانی و نجابت خاندانی کے ساتھ معافی مانگ لی جو کچھ زیر لب بڑبڑانے کے بعد مل گئی۔ اس تجربے نے ہمیں بتایا کہ اب ایک یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ اس سے آگے بڑھنا حماقت ہے، چنانچہ ہم اس حماقت سے باز رہے۔

موسم گرما تھا اور گرمی کے مارے سب کا بُرا حال تھا، عورتیں چلا رہی تھیں، بچے رو رہے تھے البتہ مرد بیچارے پورے صبر و تحمل کے ساتھ کھڑے اور بیٹھے ہوئے اپنی باقی ماندہ زندگی کی خیریت کے لئے دعاؤں میں معروف تھے کہیں سے رہ رہ کر ایک آواز آتی "ارے بھائی اب چلو نا، گرمی سے مرے جا رہے ہیں" کسی صاحب نے اطلاع دی "ڈرائیور صاحب ہی غائب ہیں؟" پھر ایک آواز آئی۔ "ابھی دس منٹ باقی ہیں کیسے چلیں" یہ غالباً کنڈکٹر صاحب تھے۔

خدا خدا کر کے ڈرائیور صاحب کے دس منٹ اور مسافروں کی گھڑیوں میں پورے پچیس منٹ بھی گذر گئے تو ڈرائیور صاحب اپنی پوری شان ڈرائیوری کے ساتھ سامنے والی ہوٹل سے برآمد ہوئے اور سارویس میں سوار ہو کر ہارن بجائے تو ایسا محسوس ہوا کہ صور اسرافیل پھونکا گیا ہے اور تمام مُردے اپنی قبروں میں بیدار ہوئے یعنی مسافر اپنی اپنی جگہ پہ ایک بار سنبھل کر چوکنے کھڑے ہو گئے یا لٹک گئے۔ آخر وہ لمحہ بھی آیا جبکہ سارویس نے ایک خاص قسم کی آواز سے جس کو کسی نہ کسی جانور کی آواز سے تشبیہ دی جا سکتی نہ کسی استادی گانے کی تان سے بلکہ کسی آسیب زدہ کھنڈر سے کسی گنہگار کی روح کی آواز سے منسوب کیا جا سکتا ہے، ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی اور اس سے زیادہ زوردار جھٹکے سے کچھ زیادہ ہی پیچھے ہٹ گئی۔ تمام مسافروں کے سر ایک خاص انداز میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پھر اپنی جگہ واپس آگئے۔ تاہم لوگوں کو یقین نہیں آیا کہ اپنے سر اپنے جسم پر قائم ہیں اس لئے سب نے اپنے سروں کو ہاتھوں سے ٹٹول کر یقین کر لیا سر سلامت ہے لہذا پگڑی کی فکر باقی نہ رہی ہے کیونکہ ہر مردانہ سر کا ایک پگڑی اور زنانہ سر کا ایک "پگڑا" (ہم نے صیغۂ تذکیر کی رعایت سے کہا ہے اس لئے کسی کو زبان اور قواعد کے مسئلہ پہ بحث کرنے کی اجازت نہیں ہے) ہوا کرتا ہے البتہ جو سر پگڑی و پگڑے سے محروم ہو گئے تھے یا جن سر پہ ابھی پگڑی یا پگڑا رکھا ہی نہیں گیا تھا وہ اتنے مضبوط تھے کہ ایسے ہزار جھٹکے لگتے تو ان کا بال بیکا نہ ہوتا۔ چند ہی سکنڈ میں سارویس بھی حرکت میں آئی۔ مشکل سے ایک قدم آگے بڑھی تھی کہ ایسا معلوم ہوا کہ کسی گہری کھائی میں اتر گئی ہے اور دوسرے ہی لمحہ اس کھائی سے نکل کر ایک پہاڑی پر چڑھ گئی۔ ایک مرتبہ پھر تمام مسافر ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہ گئے۔ ہم حیران تھے کہ یہ سڑک عنبر بازار کی روڈ کی طرح پہاڑی روڈ نہیں ہے بلکہ گنجے کے سر کی طرح نہایت صاف اور ہموار ہے پھر یہ اترنا چڑھنا کیا معنی۔ جب سارویس آگے بڑھی تو پھر اسی کھائی میں اتر گئی لیکن اس مرتبہ فوراً ہی نکل آئی کیونکہ اس کی رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ جب دوڑنے لگی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ ایک کھائی میں تیزی سے اتر کر اس سے زیادہ تیزی سے ایک پہاڑی پر چڑھ جاتی ہے۔ اب ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ سارویس میں سوار ہونے سے پہلے ہم نے دیکھا کہ ایک ٹائر کی شکل ایسی تھی "ایک بہت بڑی معمولی سی شکل آئی ہو۔ جب سارویس اپنی پوری تیز رفتاری میں آگئی تو اس کی وجہ سے تمام مسافر ایک مقررہ وقفہ سے ایک طرف ہچکولے کھاتے اور پھر اپنی جگہ پہ آجاتے۔ کچھ دیر کے بعد تو ہم اس

سے محظوظ ہونے لگے۔

شہر کی انتہائی معروف سڑک پر ڈرائیور صاحب سارویس کو دوڑانے لگے تو ہم نے یقین کرلیا کہ سڑک پر دو چار راہ گیروں کو بکساں پیس کر رکھ دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اندر بھی کچھ لوگ ہلاک ہوں گے، کچھ زخمی ہوکر دواخانہ میں شریک ہوں گے اور باقی آؤٹ پیشنٹ میں مرہم پٹی کے بعد گھروں کو چلے جائیں گے۔ لیکن ہمیں سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جبکہ کوئی رہرو ایسا نظر آتا تھا کہ اب سارویس کے نیچے آکر پس جائے گا وہ ڈرائیور صاحب کی چابکدستی کی وجہ سے صاف بچ کر نکل جاتا اور ہم ڈرائیور کے کمالِ ڈرائیوری کی دل ہی دل میں داد دیتے۔

غرض یہ سارویس آڑی ٹیڑھی ترچھی (البتہ اُلٹی چلنا باقی رہ گیا تھا)، ہچکولے کھاتی اور کھلاتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی، وہ دہریہ جو یہ دیکھ کر بھی قدرت کا قائل نہ ہو
اس سارویس کو دیکھ کر قائل ہوجاتا کہ اس کو چلانے والی ایک ایسی کوئی طاقت ضرور ہے جو ساری دنیا کے کاروبار کو بھی چلارہی ہے۔ اور اسی کا نام قدرت ہے۔

منزل کے قریب آنے پر مسافروں کا ہجوم کم ہوا اور ہمارے لئے بیٹھنے کی جگہ نکل آئی تب نظر آیا کہ سارویس کے دونوں پہلوؤں میں لمبی نشستیں ہیں۔ یہ سیٹیں ساگوان کے تختوں کی بنی ہوئی تھیں جن پر کہیں موم جامہ کی تہہ چڑھی ہوئی تھی کہیں سے پھٹ گئی تھی تو ناریل کا بھوسہ نکل آیا تھا کہیں سے اسپرنگ نکل کر بیٹھنے والوں کو ہشیار رہنے اور سنبھل کر بیٹھنے کا حکم دے رہے تھے بعض جگہ تو ایسا خطرناک شگاف بھی تھا کہ ذراسی بے احتیاطی سے ایک بندر اور بڑھئی کی کہانی کا سبق یاد دلاتا تھا۔

بہرحال ـــ ہم اس سارویس پر سفر کرتے رہے کبھی بیٹھے ہوئے کبھی کھڑے ہوئے۔ کبھی لٹکے ہوئے۔ ـــ ہچکولے کھاتے رہے رگڑے جاتے رہے، روندے جاتے رہے لیکن بفضلِ خدا ہمیشہ اپنی منزلِ مقصود پر صحیح وسالم پہنچتے رہے۔ البتہ پسلیوں میں درد ہوتا کبھی کمر اکڑجاتی کبھی کندھے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے لیکن ہماری جان اور سارویس دونوں ہمیشہ سلامت رہتے اور اکثر ہم یہ دعا کرتے کہ ع

"تاابد ہم دونوں کو خالقِ عالم سلامت رکھے"

سرپٹ حیدرآبادی

وہ فیشن سے نہ کسی ابجھن نے لوٹ لیا — مجھے پڑوسی کی گھر والی ہی نے لوٹ لیا
اسیر ہو گیا میں اس کے نقلی چٹلے میں — فریب دے کے مجھے لڑکی نے لوٹ لیا
کسی کی فہم و فراست نہ مجھ کو لوٹ سکی — میں سر پھرا تھا، مجھے سر پھری نے لوٹ لیا
دکھا کے جلوۂ رخ مجھ کو کر دیا اندھا — بجھا کے لیمپ مجھے بجلی نے لوٹ لیا
پچھاڑا مجھ کو اسی نے، پچھاڑا میں نے جسے — میں جس کو لوٹتا تھا، مجھ کو اسی نے لوٹ لیا
اُدھڑی چال کہیں کامیاب ہو نہ سکی — بہ ہر مقام مجھے کرکری نے لوٹ لیا
خمارِ بادہ سے مخمور ہو گیا جب میں — بغل کے شیشے سے مجھ کو پری نے لوٹ لیا
مقابلہ مرا کرتا مجال تھی کس کی! — اکیلا پا کے مجھے کمپنی نے لوٹ لیا
کسی طرح نہ چلا مجھ پہ موت کا جادو — کھلا کے زہر مجھے خودکشی نے لوٹ لیا
خوشی سے آ گئے دوزخ میں چھوڑ کر جنت — جنابِ شیخ کو حقہ کشی نے لوٹ لیا

میں کھٹی دال تھا سرپٹ تو کیا بُرائی تھی
نہ جانے کیوں مجھے باسی کڑھی نے لوٹ لیا!

غزلیں

نسیم اختر

ترے کُتّوں سے ڈرتے ہم تو یہ جان چھوٹ جاتا — ترے گھر ہر روز آتے جو نہ چوکیدار ہوتا
ترے ہجر میں تڑپنے سے کہیں گنا ہے بہتر — مجھے نزلہ کھانسی ہوتی مجھے کچھ بخار ہوتا

سرِ راہ ان سے میری لڑائی ٹل تو جاتی — ق کی روڈ ویز بس پہ میں سوار ہوتا
تو تمہاری ہڈیوں کا میں بناتا ایسا سرمہ — نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا"
مجھے باوفا، مہذب ہیں تمہارے سارے عاشق — ہاں نہیں چکھاتا جو کوئی گنوار ہوتا

مری کھال کے وہ جوتے بڑے شوق سے پہنتے
اگر ان کی انجمن میں جو کوئی چمار ہوتا

فضل جاوید

جماہی

جماہی منہ پھاڑنے کے ایک میکانکی اور نفسیاتی عمل کا نام ہے۔ اسے فعل متعدی بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ متعدی مرض کی طرح ایک سے دوسرے میں منتقل ہو کر تباہی مچاتی ہے ایک کو جماہی آتی ہے تو فوراً دوسرے کا منہ ہونقوں کی طرح کھلتا جاتا ہے۔ شرفا اس کے اظہار پر پابندی لگانے کے لئے ہتھیلی کی پشت سے کھلے ہوئے منہ کو ڈھانکنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

جماہی آتی ہے تو عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ تھکن زیادہ ہو گئی ہے یا نیند کی آمد آمد ہے، لیکن محض نیند کی وجہ سے جماہی کا آنا قرین قیاس نہیں ہے۔ اگر یہ نیند کا الارم ہے تو سونے سے پہلے ہر ایک کو چشم و دہن کی اس ورزش سے دوچار ہونا چاہئے لیکن بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں اس غیر شاعرانہ فعل کے مرتکب وہی اصحاب ہوتے ہیں جنھیں کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا یا کام سے جی چرانے کے عادی ہوتے ہیں یا پھر کوئی کام چار و ناچار کرتے ہیں۔ اس کا شکار وہ بھی ہوتے ہیں جو ایسے لوگوں کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔

میرے ایک دوست ہیں۔ انھیں نئی نئی اور نایاب و کمیاب کتابیں خرید کر الماریوں میں سلیقے سے جما کر رکھنے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ ان کے خیال میں عالم کی پہچان ان مختلف النوع موضوعات کی کتابوں میں پوشیدہ رہتی ہے جو اس کی لائبریری میں جمع ہیں۔ نتیجہ یہ کہ میرے ان دوست کے پاس ایک شاندار لائبریری ضرور ہے لیکن موصوف کی ذہنی قابلیت اتنی نہیں کہ ان بیش بہا ذخیروں سے نایاب ہیرے موتی چن کر ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ کر سکتے۔ ہاں کتابوں کی فہرست انھیں زبانی یاد تھی۔ ہر کتاب کا مصنف ان کی نوک زبان پر ہوتا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی کتاب انھوں نے شروع سے آخر تک توجہ کے ساتھ پڑھی ہو۔ کبھی کبھی مجھے کسی تحقیق کے سلسلہ میں ان کی لائبریری سے استفادہ کرنے کی ضرورت درپیش ہوتی۔ میرا ساتھ دینے کے لئے موصوف بھی ایک موٹی سی کتاب کھول کر بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد ان کا ذہن خشک موضوع کو قبول کرنے سے انکار کرنے لگتا۔ اور پھر جماہیوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ عجیب و غریب آوازوں کے ساتھ ان کا منہ کھلتا اور میں بھی شرم سے سر جھکا کر منہ پھاڑنے سے اپنے آپ کو نہ روک سکتا۔ اور کچھ ہی دیر میں ہم دونوں کی

جماہیاں اتنی شدت اختیار کر جاتی ہیں کہ بار بار رومال سے آنسو پونچھنا پڑتا۔ عجیب عمل تھا۔ سانس کھینچ کر منہ پھاڑنا اور اس دوران چشم پرنم پوری طرح سے بند اور اس پر عجیب و غریب آوازیں۔ غرض میری تحقیق اس نفسیاتی عمل کا شکار ہو جاتی۔ اور موضوع جماہیوں کی نذر ہو جاتا۔

جماہی کو حربے کے طور پر تخریبی کارروائیوں کے لئے بخوبی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امتحان کے زمانے میں اسے ذہین ہونہار اور پڑھاکو لڑکوں اور لڑکیوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پڑھائی کے میدان کا آپ کا کوئی حریف ہے یعنی وہ ہمیشہ چند نمبروں سے آپ کی پہلی پوزیشن پر قبضہ جمائے رہتا ہے۔ آپ کسی نہ کسی ترکیب سے کسی "جماہیا" (جماہی لینے والا۔ اردو لغات سے معذرت کے ساتھ) کو اس کی پڑھائی کا ساتھی بنا دیجئے۔ وہ جماہیاں لیتا رہے گا۔ اور آپ اپنی پوزیشن کی طرف قدم بڑھائیے۔

عشق کے میدان میں بھی یہ خوب تباہیاں مچاتی ہیں۔ پرسکون ماحول ہے۔ چھاؤں کے سائے میں دو دل دھڑک رہے ہیں۔ پیار و محبت کی گفتگو ہو رہی ہے۔ نگاہیں زبان بن گئی ہیں۔ عجیب بےخودی کا عالم ہے۔ اچانک عاشق کی نظر ایک طرف اٹھتی ہے۔ جہاں کوئی شدت سے جماہی لینے میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے یہ عمل یوں ہی رائگاں نہیں جا سکتا۔ عاشق بھی جواب میں ایک عدد جماہی لیتا ہے۔ محبوبہ بھلا اس کی دسترس سے کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔ اب جو جماہیوں کا تبادلہ شروع ہوا تو محبوبہ عاشق کو تعجب سے دیکھنے لگتی ہے۔ ڈیئر! کہا یہ سچ مچ تمہارا پہلا پیار ہے۔ مجھے تو شک ہو چلا ہے مجھے اپنی باہنوں میں سمیٹ کر تم اس قدر اکتاہٹ کا شکار ہو جاؤ گے یہ میں نے سوچا تک نہ تھا۔" اب عاشق بےچارہ بار بار اپنی صفائی میں کیا کچھ کہتا جا رہا ہے لیکن محبوبہ اس کی ایک نہیں سنتی۔ سچ بھی تو ہے۔ جو عاشق شادی سے پہلے اتنے رومانٹک موقعہ پر جماہیاں لینے لگے تو شادی کے بعد اس سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔

ACTIVE SERVICES میں جماہی کو غلط انداز بلکہ خشمگیں نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ دشمن کے خلاف جنگ جاری ہے اور اگر کوئی جماہیا وہاں موجود ہو تو سارا فوجی دستہ اس شغل متعدی میں مشغول ہو جائے گا اور پھر میدان کارزار جماہیوں کا میدان بن جائے گا۔ خفیہ جاسوسوں کو دشمن فوج میں بھیجنے سے بہتر اور محفوظ طریقہ تو یہ ہے کہ کچھ تربیت یافتہ "جماہیے" دشمن فوج میں بھیج دیئے جائیں۔

اب مجھے اس کار ڈرائیور سے ہمدردی ہونے لگی ہے جس نے برسوں پہلے میرے ایک جماہیا دوست کو جو اس ڈرائیور کے پہلو میں بیٹھا تھا، ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ اس کی اس نازیبا اور ہٹلرانہ حرکت پر ہم سب دوست احتجاج کے طور پر سارے ڈرائیوروں سے نالاں تھے۔ لیکن اب یہ بات اچھی طرح ہماری سمجھ میں آ چکی ہے کہ میرے دوست کے جماہی لینے سے ڈرائیور کو بھی جماہی آ گئی تھی۔ فنکارانہ مہارت سے اس نے اسٹیئرنگ نہ سنبھالا ہوتا تو اس وقت ہم سب سینکڑوں فٹ گہری کھڈ میں دفن ہو چکے ہوتے۔

نظرؔ جبرنی

--- جب پٹائی کی!

اپنی بیوی نے جب پٹائی کی — رات بھر ہم نے پھر سنکائی کی
ان کو لڑکی ملی ہے اسٹینو — اب نہیں خیر پارسائی کی
قرض لے کر جو عیش کرتے ہو — بات اس میں ہے کیا بڑائی کی
چار گھنٹے میں وہ ہوئے تیار — انتہا ہو گئی صفائی کی
لیڈروں کی چلم بھرو ہر دم — بات اس میں نہیں برائی کی
ہائے اس در سے ہم کو کچھ نہ ملا — مدتوں جس پہ جبہ سائی کی
شادی ہوتے ہی ہو گیا معلوم — شکل ممکن نہیں رہائی کی
روز میکے نہ جا شریکِ حیات — ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

وہ پولس میں ہوا ہے جب سے نظرؔ
کوئی حد ہی نہیں کمائی کی

اِستام اچودنا

--- ہم بُرے ٹھہرے!

کھرے دو بول منہ پر کہہ دیئے تو ہم بُرے ٹھہرے — جو دُکھتی رگ پہ انگلی رکھ دیئے تو ہم بُرے ٹھہرے
یہاں تو پینے والے آدمی کا خون پیتے ہیں — ذرا سی یار دو سینڈھی پی لیئے تو ہم بُرے ٹھہرے
دیا کر قوم کے چندے وہ پھر بھی نیک کہلائے — کبھی کچھ نیچے اوپر کر لیئے تو ہم بُرے ٹھہرے
کمیشن کھا کے خود تو شیخ صاحب سُود کھاتے ہیں — دو پیسے لے کے رشوت کھا لیئے تو ہم بُرے ٹھہرے
کھلا کر بلیوں کا پیٹ تو بیگم بھراتی ہیں — کبھی کچھ خرچ یاروں پر کیئے تو ہم بُرے ٹھہرے

[illegible] کر بھی آتے ہیں اچھے ہی لوگوں میں
[illegible] کے گھر کا اک پھیرا [illegible] تو ہم بُرے ٹھہرے!

متاثرینِ طوفان کیلئے امداد ۔ ضلع کرشنا

ایک اپیل

ایسے افراد، رضاکارانہ تنظیمیں اور دوسرے ادارے جو ضلع کرشنا کے طوفان سے متاثرہ افراد کی امداد، ملبوسات، بلانکٹس، بیڈ شیٹس، ادویات، اشیائے خورد و نوش، گھریلو استعمال کے برتن اور اشیائے تعمیر امکنہ بشمول ٹرپالنس وغیرہ کی شکل میں کرنے کے خواہشمند ہوں، ان سے درخواست ہے کہ اشیاء کی صحیح تقسیم اور رہنمائی کے لئے اسپیشل آفیسر سائیکلون ریلیف سپلائز سے جو سب کلکٹر آفس وجئے واڑہ میں کارگذار ہے، ربط پیدا کریں۔

ایسی تنظیمیں اور افراد جو متاثرین کی بذاتِ خود مدد کرنا اور اشیاء کی تقسیم کا کام سنبھالنا پسند کرتے ہوں ان سے گذارش ہے کہ وہ دستخط کنندہ ذیل سے مشورہ کریں تاکہ اشیاء کی دوہری تقسیم سے احتراز ہو۔ یا کسی ایک مخصوص علاقے پر پوری کی پوری توجہ مرکوز نہ ہونے پائے اور اشیاء کی صحیح تقسیم اور متاثرین کی مناسب خدمت ہو سکے۔

رضاکارانہ تنظیموں سے خصوصی استدعا ہے کہ وہ دستخط کنندہ ذیل کے مشورے سے ایک یا ایک سے زائد گاؤں کا انتخاب کریں اور وہاں طوفان سے متاثرہ افراد کی عارضی سکونت کے لئے فوری طور پر کمیونٹی پنڈالس قائم کریں۔

ربط پیدا کیجئے:۔

فون نمبرز:۔ ۸½ صبح تا ۵½ شام ۶۲۲۹۰ وجئے واڑہ
دوسرے اوقات ۶۲۱۵۲ وجئے واڑہ

بی۔ دائم، آئی اے ایس
اسپیشل آفیسر
سائیکلون ریلیف سپلائز۔ وجئے واڑہ

DIPR 28/77-78

رام لعل نابھوی

تعزیرات ہیں زمانے کی!

ایک صاحب
ہیں ایک صاحب کے
گھر لے گئے معلوم
ہوا چوبارے میں تشریف
فرما ہیں، اوپر پہونچے
دیکھا بستر پر لیٹے مطالعہ
فرما رہے ہیں۔ ہمارے
صاحب نے ہمارا تعارف
کرایا۔ انھوں نے اچٹتی
نظر سے دیکھا لیٹے لیٹے
ہی مصافحہ کیا پھر اٹھ
بیٹھے۔ ہمارا تعارف تو
دو لفظوں میں ختم ہو گیا
ان کا تعارف خیر آپ
بھی سنئے:

آپ کا نام مسٹر سنگھ
ہے۔ ایک ادبی اور
مذہبی گھرانے سے تعلق
رکھتے ہیں۔ اپنا مکان
ہے۔ اپنی زمین ہے
آٹھویں جماعت میں تھے
کہ تعلیم کو خیرباد کہا اور
پٹواری بن گئے۔ دو
سال بعد طبیعت اکتا گئی
... پیشہ اختیار
کیا اور ... کرلی

زبانوں میں ایم۔ اے
کیا۔ اور ان میں سے
ایک زبان میں ڈاکٹریٹ
کرلی۔ ترقی کی منزلیں
طے کرتے ایک یونیورسٹی
میں لیکچرر مقرر ہو گئے
کچھ تعلیمی اداروں کے
نظم اور کچھ سرکاری
کمیٹیوں کے ممبر بن
گئے۔ دن بھر پڑھتے
اور لکھتے ہیں۔ کتاب

سے ہوتا ہے۔ دس
گیارہ بجے ہیں جنھیں
یہ خدا کی دین کہتے ہیں
یہ تو بڑا ہوتا ہی پلنگ
والوں کا جوان پر
اثر انداز ہو گیا۔
میں نے پہلے مسٹر
سنگھ پر نظر ڈالی اور
پھر ان کے کمرے کے
ماحول کو دیکھا جس
چارپائی پر وہ بیٹھے

رنگوں کے اور غالب
مختلف سیاہیوں کے
پورے دس ٹکڑے
لنڈی پنڈنٹ ملے سکتے
ہوئے اپنی رنگینی دکھا
رہے تھے۔ کمرہ اور
الماریاں کتابوں سے
اٹی پڑی تھیں۔ ان
کی چارپائی کے چاروں
طرف مختلف زبانوں
کے رسالے اخبارات

دھری تھیں۔ ایک پیالی
ٹوٹی پڑی تھی جس
میں سے چائے گر کر
پھیل گئی تھی اور
جم چکی تھی۔ گھر والوں
کو سخت ہدایت تھی کہ
کمرے کی صفائی اس
طرح کی جائے کہ کوئی
کتاب یا کاغذ اپنی جگہ
سے نہ ہلنے
پائے اس لئے صفائی

مقرر ہو گئے۔ پڑھنے
لکھنے کے لئے کافی وقت
مل جاتا تھا۔ پڑھائی
شروع کی اور پرائیوٹ
طور پر باقاعدہ گریجویٹ
بن گئے۔ سرکاری ملازمت
مل گئی اور وہیں دو

چھوڑنا بہت کے بیمار
سمجھتے ہیں۔ شاید بہت
ہی ان سے کتاب چھڑا
سکتی ہے۔ خدا پر بہت
بھروسہ رکھتے ہیں اور
انھیں کامل یقین ہے
کہ سب اس کی منشا

تھے اس کا قد ان کے
قد سے چھوٹا تھا۔
سرہانے ایک تکیہ تھا
جس پر وہ ٹیک لگائے
گھٹنوں پر کتاب لئے
تھے۔ بنیان پہن رکھی
تھی جس میں مختلف

کتابیں زمین پر چاروں
طرف چت پڑی تھیں
چارپائی کے نیچے سرہانے
اخبارات ہوا سے
پھڑپھڑا رہے تھے
نزدیک ہی دو تین
چائے کی مستعمل پیالیاں

یا تو ہوتی ہی نہیں تھی یا پھر بہت مجبوری کی حالت میں کی جاتی تھی۔

جس کتاب کی ضرورت پڑتی، سیدھی نظر وہاں پہونچتی جہاں کتاب پڑی ہوتی۔ ہاتھ بڑھایا کتاب اُٹھائی اور مطلوبہ صفحہ اس طرح نکال لیا جیسے سب ازبر ہو، استعمال کر کے وہیں کہیں رکھ دی جاتی۔ سبھی کتب نشان زدہ ملیں۔ لیٹے لیٹے پڑھتے تھے لیٹے لیٹے لکھتے تھے۔ چائے آئی۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی لطف آگیا معلوم ہوا بہترین چائے استعمال فرماتے ہیں اور اُسے بنانے کے ڈھنگ سے گھر والوں کو مکمل واقفیت دے رکھی ہے۔ چار پائی پر لیٹے لیٹے چائے کا گھونٹ لیا ذرا اُٹھے اور کتاب پر چائے کی پیالی رکھ دی جیسے پھر اُٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ معرفت سے تاریخ۔ فلسفہ سے ادب۔ ہر موضوع پہ گوہر لٹاتے گئے۔ بات کا سلسلہ تب ٹوٹا جب دو اسکالر تشریف لے آئے۔ ایک صاحب ایک کتاب لینے آئے تھے۔ دوسرے صاحب کچھ معلومات حاصل کرنے۔ پہلے صاحب کو ہدایت کی "سامنے الماری کھولو۔ نچلے خانہ میں دائیں طرف دس بارہ کتب کے نیچے پڑی اس نام کی کتاب اٹھاؤ اور لے جاؤ" دوسرے صاحب کو یونیورسٹی لائبریری میں اس جگہ کا پتہ دیا جہاں وہ کتاب مل سکتی تھی جس کی انہیں ضرورت تھی۔ ادھر سے فارغ ہوئے تو گھڑی پر نظر گئی فرمانے لگے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ کل اسی وقت بات پھر ہوگی۔

ہم چلے آئے۔ راستے میں میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ صاحب بہت دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں فن پر بھی عبور حاصل معلوم ہوتا ہے۔ آپ ان کے بارے میں کچھ اور بتائیے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے کہ یہ حضرت اُردو۔ فارسی ہندی پنجابی۔ انگریزی کے ماہر تو ہیں ہی گجراتی اور بنگالی پر بھی دسترس حاصل ہے کمی ہے تو بس یہ کہ گھر کے معاملات سے بے نیاز ہیں۔ بازار۔ آٹا۔ دال۔ سبزی لینے کے لئے مجبوراً جاتے ہیں اور راستے میں اگر کوئی دوست یا ادیب مل جائے جن کی کوئی کمی نہیں تو پھر یا تو وہیں گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں یا پھر ان کے گھر پہونچ جاتے ہیں اور کہیں رات کے وقت گھر لوٹتے ہیں۔ ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ گھر سے پیسے لے کر کپڑا خریدنے گھر سے چلے اور راستے میں پتہ لگ گیا کہ لاہور ایک علمی کانفرنس ہے اور یہ انہیں کپڑوں میں لاہور پہونچ گئے۔ گھر میں سب ان کی عادت کو جانتے ہیں اور وہ بھی ان کی طرف سے بے فکر ہوگئے ہیں۔ تنخواہ کا بیشتر حصہ کتابوں پر خرچ کرتے ہیں اور اگر کوئی کتاب مانگ لے کبھی انکار نہیں کرتے۔ واپس مانگتے نہیں اور واپس ہوتی بھی نہیں۔ ضرورت پڑنے پر نئی خرید لاتے ہیں۔ اسی دوران گھر والوں کی چیخ پکار بڑے مزے سے سنتے رہتے ہیں۔

میں اگلے روز وقت مقررہ پر پہونچا۔ معلوم ہوا غائب ہیں اور کل کے گئے واپس ہی نہیں لوٹے۔ مڑا ہی تھا کہ سامنے آتے دکھائی دئے۔ بستر پہ دراز ہو کر فرمانے لگے "پوچھئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" میں نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ آپ کی آمدنی کے کیا ذرائع ہیں۔ کہنے لگے "تنخواہ محض" میں نے پوچھا "زمین سے کیا آمدنی ہے؟" جواب ملا "زمین مزارعوں کے پاس ہے۔ وہ پیسے نہیں دیتے۔ میں مقدمہ بازی کی الجھن میں نہیں پڑ سکتا۔" میں نے پھر پوچھا کہ اس محدود آمدنی میں اتنے بڑے کنبے کا خرچ کیسے چلتا ہے اور جس طرح آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنے بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ فرمانے لگے "شروع میں بچے ایک دو ہی تھے۔ میں نے سوچا میری طرح یہ بھی از خود تعلیم حاصل کر لیں گے۔ ادھر میرا

اپنا خرچ بہت تھا۔ اندازہ تھا آخری وقت کافی رقم جمع کرلوں گا آرام اور بے فکری سے زندگی بسر کروں گا۔ ادبی دنیا میں نام بھی مل جائے گا اور غیر ممالک کی سیر بھی کر آؤں گا لیکن غلطی یہ ہوئی کہ ادھر تعلیم بھی بڑھتی گئی اور اعزہ بھی بڑھتے گئے اخراجات میں اضافہ ہوگیا۔ آمدنی حد سے تجاوز کر گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ بچ نہ پایا۔ اب بچوں کی تعلیم۔ پرورش ان کی شادیاں ایسے مسائل ہیں جن سے میں پریشان ہوں۔ فیصلہ اب یہ کیا ہے کہ زمین کو سنبھالوں۔ خود کاشت کراؤں اور پٹوار کے تجربے کا فائدہ اٹھاؤں۔ کتابیں مجھے نہیں چھوڑتیں۔ میں کتابوں کو چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ کروں تو کیا کروں۔ سرکار سے قرض لے کر ٹریکٹر اور کھاد خریدوں گا۔ اب چار پائی پر کتاب پڑھتا ہوں۔ پھر ٹریکٹر پہ پڑھوں گا۔" پھر کہنے لگے "بھئی ہر کام اس کی منشا مبارک سے ہوتا ہے۔ اپنے بس میں کیا ہے۔ یہ بچے بھی اسی کی ہی دین ہیں۔ وہ خود ہی سنبھالے گا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنی کتاب میں یہ کہہ کر جٹ گئے۔

"تعزیرات ہیں زمانے کے"

ہپی ازم

نرگس سہسوانی

داڑھی مونچھوں کی صفائی ایک فیشن بن گئی ! — سر کے بالوں کا بڑھا لینا ہے گویا لازمی
اونچی ایڑی کا ہر اک جوتا ہے اب کھیل سری — بیل باٹم لڑکیوں لڑکوں میں یکساں چل پڑی
بے حیائی کا ہر اک انداز اب تو عام ہے
تُف ہے اس تہذیبِ نو پر جس کا یہ انعام ہے

باپ دادا نے ہمارے جو نہ دیکھی تھیں کبھی — دیکھتے ہیں آج وہ باتیں یہ طرز بے حسی
کوئی مجنوں کا چچا ہے کوئی لیلیٰ کی پچی — دیکھ کر جن کو ہے چکر میں ہماری کھوپڑی
مرد و عورت میں بمشکل ہو رہا ہے امتیاز
ایک کے پیچھے ہیں ایک کی زلفیں دراز

آج ہر کالج پہ فیشن کی کرم فرمائی ہے — علم کا ہر ایک طالب اس کا ہی شیدائی ہے
اس قدر شدت سے فیشن کی وبا اب چھائی ہے — سمجھنا مشکل ہے سمجھنا ہے بہن یا بھائی ہے
وقت نے کچھ اس طرح بدلا زمانے کا مزاج
دیکھیے جس کو اٹھا کر طاق پر رکھ دی ہے لاج

عورتوں کو آج کے فیشن نے عریاں کر دیا — ان کے سر پہ جو دوپٹہ تھا ہوا اب ہو گیا
اس پہ وہ پوچھے کہ بتیں انھیں کیا ہو گیا — فرق جو "سر" اور "تن" میں تھا جانے کیا ہوا
وہ جو تھیں پردے کی باتیں ہو گئیں وہ ان تو تیرہ
اس لئے اب ہو گئے ہیں حسن کے جلوے فزوں

[illegible] — بن چکے ہیں گھر وہ "نانا" خیر سے خوش حال ہیں
آج ہپی ازم [illegible] دولت سے مالا مال ہیں — مشرقی تہذیب میں بے حد مگر کنگال ہیں
جب بزرگوں کا یہ عالم ہو تو بچے کیا کریں!
کیوں نہ وہ اسلاف کی عزت کو پھر رسوا کریں!

آج کی دنیا میں عورت مرد سے کچھ کم نہیں — بھیڑ میں مردوں کی چلتی ہے مگر کچھ غم نہیں
بے حجابی، بے حیائی کا ذرا ماتم نہیں — اس کو کوئی ٹوک دے اتنا کسی میں دم نہیں
عورتیں مردوں کو دھکا دیکے آگے بڑھ گئیں
بے حیائی کی پہاڑی پر وہ گویا چڑھ گئیں

اس سے پہلے اور کچھ بگڑے زمانے کی ہوا — اس سے پہلے توڑ بیٹھے دم یہاں خود ہی حیا
آج کی اس نسل کو کوئی کرے نیکی عطا — ورنہ بیڑا غرق ہو جائے گا ملک و قوم کا
پا نہ لے منزل کہیں یہ پستیوں کا کارواں
تم ہی کچھ تدبیر سوچو اب ذرا نرگس میاں

ہم نے کتاب چھپوائی

ایم۔ اے۔ خالد

کہیں آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ ہماری کتاب چھپوانے کے لئے کوئی ناشر تیار نہ تھا اور بیچارہ ناچار ہمیں ہی
عنوان کرم عنایت سے
ان خیالات پریشاں کو اوراق پریشاں میں بدلنے کا نیک فریضہ انجام دینا پڑا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان گنج ہائے
گراں مایہ کو یہ صرف بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا پبلشر شائع کرنے کے لئے ہر وقت تیار تھا بلکہ
بعض تو ایک ہی ساتھ دو تین ایڈیشن شائع کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی بندۂ خدا اس کا
معاوضہ عطا کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا۔ البتہ کبھی کسی کشادہ قلب و فراخ دل
ناشر کا ارادہ کچھ عنایت کرنے کا ہوا بھی تو وہ کسی بیوہ کے ماہانہ
وظیفہ سے زیادہ نہ تھا۔ مثلاً ایک صاحب ہماری ہی
[illegible] کے چار پانچ مطبوعہ نسخے بطور معاوضہ
پیش کرنا چاہتے تھے [illegible]
[illegible] مدد کرم [illegible]
سرفراز فرمانے کا
تھا۔ پھر بھی یہ
حالت زار
باعث

غنیمت سمجھئے یہ حضرات کچھ نہ کچھ دینے کی طرف مائل تھے۔ کیونکہ [illegible] چند ایسے پبلشر بھی دنیا میں [illegible]
[illegible]

ناخوشگوار واقعات کے پیش نظر ہم نے یہ سوچا کہ ایک طویل عرصے سے بے چارے ادیب کے ساتھ جو نا انصافیاں ہو رہی ہیں اس کے ازالہ کی واحد صورت یہی ہے کہ زبانی جمع خرچ کرنے اور خالی خولی ناشروں کو برا بھلا کہہ کر توانائی اور وقت خراب کرنے کی بجائے خود ناشر بن کر ان کے بزنس کی چُولیں ہلا دیں۔

چنانچہ اس نیک خیال کے آتے ہی ہم نے اس کو حقیقت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ حالاں کہ میدانِ طباعت و اشاعت میں ہماری حیثیت طفلِ مکتب بلکہ "طفلِ چوں چوں" کی سی تھی۔ اس باب میں ہمارا تجربہ سِنِ بلوغ کو پہنچنے سے قبل سرزد ہوئیں دو ایک غلطیوں تک محدود تھا۔ یعنی ایک مرتبہ ہم نے کبڈی ٹیم کی جانب سے "چیلنج" چھپوا کر مخالف ٹیم کو روانہ کیا تھا اور دوسری بار خاندان کے ایک بزرگ کی وصیت کے مطابق ان کی فاتحہ سوم کے منی رقعے شخصی نگرانی میں چھپوائے تھے (شخصی نگرانی سے یہاں مراد پریس میں کام کرنے والوں کو صرف گھور گھور کر دیکھنا ہے)۔ چونکہ ناشروں کو دو ٹوک جواب دینے کی ہم نے ٹھان رکھی تھی۔ لہٰذا اسی تجربہ کو بنیاد بنا کر طباعت و اشاعت کے کام کو تیزی سے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ اور سب سے پہلے ایک عدد زبان داں کی خدمات مستعار لینے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی کتاب کی اشاعت سے قبل ہر شاعر و ادیب سے یہ غلطی ضرور سرزد ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی مسودہ کسی زبان داں کو بتلا کر زبان و بیان کی غلطیوں سے بے نیاز ہو جانا مناسب سمجھا۔ اگرچہ کہ ان کے انتخاب کے وقت ہمیں خاصی دقت پیش آئی کیونکہ وہ تھے تو سب کے سب زبان داں لیکن ایک دوسرے کو خود ساختہ اور نام نہاد سمجھتے تھے۔ بہر حال جی مضبوط کر کے اپنے مضامین کو ایک شریف زبان داں کے حوالے کیا لیکن جب ان صاحب نے ہمارے مضامین کی تصحیح فرماتے ہوئے "جز بز" کو "جُز بُز" اور گہما گہمی کو "گُما گُمی" کر دیا تو پھر بھی برداشت کرتے رہے لیکن جب سمندر کی تہہ کو طہہ لکھ دیا تو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے ان کی تمام تصحیحات کو کالعدم قرار دے کر کسی دوسرے کرم فرما کا دامن تھام لینا مناسب سمجھا لیکن بدقسمتی سے وہ "اردو املا" کے دشمنِ جانی نکلے۔ وہ املا کو ٹھیک ہمارے مزاحیہ مضامین کی طرح مزاحیہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ جس شخص کی بھی اس پر نظر پڑتی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زعفران کے کھیت میں کھڑا ہے یا اس کے اندر کا آدمی اسے گدگدیاں کر رہا ہے۔ غرض کہ سنجیدہ سے سنجیدہ شخص کو ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ اور ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ یہ حضرت اپنے اس املا کی تبلیغ سے ہماری برسوں کی کاوشوں پر پانی پھیر دیں گے۔ چنانچہ اس ناگہانی صورتِ حال سے گھبرا کر ہم نے بزرگوں کے کہے کے مطابق ذوقِ سلیم کو ہی اپنا رہبر بلکہ زبان داں تسلیم کرتے ہوئے حضرتِ کاتب کی تلاش شروع کر دی۔

کاتبین کے بارے میں تو کافی سے زیادہ سُن رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان پر لکھے گئے بعض مضامین سے کافی لطف اُٹھایا تھا لیکن جب حقیقت میں ان سے سابقہ پڑا تو چوکڑی بھول گئے۔ چند دنوں تک تو کسی کاتب سے راست بات چیت نہ ہو سکی کیونکہ بیسویں صدی کے کسی عجوبہ کی طرح ساری برادری برسرِ روزگار تھی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ناول نگار دوست کے توسط سے ایک کاتب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور انھوں نے ہمارے فرشی سلام کے جواب کو کسی ہونہار قت کے لئے محفوظ رکھتے ہوئے کہا کہ میں صرف اس شخص کے لئے کتابت کا کام کرتا ہوں جس کی

دلی خواہش میرے دست مبارک سے کتابت کرونے کی ہو اور جو میرا معاوضہ ادا کرنے کی سکت رکھتا ہو۔" ان کلمات کو مخصوص طنزیہ انداز میں ادا کرنے کے بعد حیرت سے دریافت کیا کہ کیا آپ وکیل صاحب کو ساتھ نہیں لائے؟ جواب میں جب ہم بھی سرتاپا مجسم حیرت بن گئے تو انھوں نے ہم کو کچھ سمجھنے سے قاصر دیکھ کر یا فاترالعقل سمجھ کر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کتابت کے آغاز سے قبل آپ کو اسٹامپ پیپر پر وکیل اور گواہان کی موجودگی میں یہ اقرارنامہ تحریر کرنا ہوگا کہ کتاب کی مکمل کتابت کروائی جائے گی اگر کسی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ جائے تو تکمیل شدہ کام کی فوری اجرت ادا کر دی جائے گی۔ خام اشیاء ہرگز بطور معاوضہ پیش نہیں کی جائیں گی وغیرہ۔ یہ تمام شرائط اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھیں لیکن خام اشیاء کا معاملہ ہمارے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ چنانچہ وضاحت طلب کرنے پر انھوں نے ریڈیو، ٹرانزسٹرس، دستی گھڑیاں، دھوپ کی عینکیں، اونی و سوتی سوئٹرس، مفلر اور لنگیاں ہمارے آگے کر دیئے جو انھیں بطور معاوضہ ادا کئے گئے تھے اور بعض اشیاء کو خود کاتب صاحب ضبط کر لینے پر مجبور ہو گئے تھے اس موقع پر انھوں نے چند ایسے مسودات کا دیدار بھی کرایا جو چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے چاہئے تھے لیکن بدقسمتی سے کاتب صاحب کے قبضہ میں تھے اور جن مسودوں کو کاتب صاحب کے قبضہ میں ہونا چاہئے تھا وہ شو کیسوں کی زینت بن چکے تھے اور اردو اکیڈیمیوں سے دھڑا دھڑ انعامات حاصل کر رہے تھے۔

ایک خوشنویس کے بارے میں خارجاً مسموع ہوا کہ وہ کتابت شروع کرنے سے قبل مضامین کا گہری مطالعہ فرمانے کے عادی ہیں اور مضامین ان کے معیار پر پورے اترنے کے بعد ہی اپنا نرخ بتاتے ہیں۔ چنانچہ ان اصول پر سختی سے کاربند رہنے کی وجہ سے گذشتہ کئی برسوں سے کسی کو نرخ بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہماری معلومات میں اضافہ کا سبب بنی کہ وہ فی غلطی ایک روپے کا اضافہ بھی فرماتے جاتے ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ہر کتاب کی کتابت مکمل ہونے تک ان کے یہاں ایک لڑکی کا جہیز تیار ہو جاتا ہے۔ اور وہ بفضل تعالیٰ اپنی چاروں لڑکیوں کے جہیز کی تیاری سے سبکدوش ہو چکے تھے لیکن چونکہ بشر سے غلطی ممکن ہے اس لئے ہم نے کسی دوسرے کاتب کو ڈھونڈ لینا مناسب سمجھا اور دانستہ ایک ایسے صاحب کی خدمت میں پہنچے جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ صرف عنوان صحیح تحریر فرماتے ہیں۔ اور دوران گفتگو اس امر کی تصدیق بھی ہو گئی کیونکہ وہ صرف سرخیوں کی حد تک گیارنٹی دے رہے تھے اور متن کے بارے میں کوئی صاف بات نہیں کہہ پا رہے تھے۔ بعدازاں پتہ چلا کہ وہ ایک ایسے استاد کے شاگرد تھے جن کی یہ خاص ہدایت تھی کہ "خبردار! سرخی میں کوئی غلطی نہ ہونے پائے" چنانچہ یہاں سے بھی ہماری چھٹی ہو گئی۔

کافی تگ و دو کے بعد ہم ایک ایسے قابل استعمال کاتب کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے جن کی دیرینہ خواہش ایک عدد کتاب تحریر فرمانے کی تھی۔ کیونکہ اب تک وہ متعدد روزناموں، ہفتہ واروں اور ماہناموں کی کتابت فرما چکے تھے لیکن کوئی بندۂ خدا ان کے ہاتھوں کتاب لکھوانے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے انھیں اپنی کتاب لکھنے کا پیش کش کیا۔ یہ سوچ کر کہ زمانے سے بدلہ لینے کے لئے وہ ہماری کتاب کی کتابت فرماتے وقت اپنا فن نچوڑ کر رکھ دیں گے۔ اور جس طرح ایک صاحب کسی شاہکار کی تخلیق کرتے ہوئے اپنا قلم توڑ دیتا ہے بالکل اسی

طرح یہ حضرت کتابت کی پتیاں اور دیگر سامانِ خوشنویسی تو سپرد کر کے رکھ دیں گے بلکہ معاملہ اس کے قطعی برعکس ثابت ہوا۔ اور مدتِ اول سے ہی ان میں ضعفِ ادل کے کاتب کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ یعنی وہی وعدہ کبھی وفا نہ کرنا، گھر میں رہ کر غیبل ہے کہہ دینا، پہلے سسرال سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں اور تیسرے سے پہلے سسرال میں منتقل ہوتے رہنا، بیماروں کی کثرت سے عیادت شروع کر دینا اور خود کو سخت علیل اور جاں بلب بتانا وغیرہ۔ بہر حال جوں توں کر کے سال بھر میں پچاس ساٹھ صفحات کی کتابت ہو سکی اور ساتھ ہی یہ عقدہ کھلا کہ ایک کاتب کو سال بھر میں اوسطاً پندرہ مرتبہ بخار آتا ہے، سولہ مرتبہ ملیریا ہوتا ہے، ڈبل نمونیا، ڈبل ٹائیفائیڈ ہونے کے علاوہ تیس پینتیس مرتبہ پیچش ہوتی ہے اور یومیہ دل کے دو تین دورے بھی پڑ جاتے ہیں۔

اب ہم اس کتابت شدہ نسخہ کو جلد سے جلد پریس کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ دورانِ کتابت ایک آدھ برس کی تاخیر سے ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ دوست احباب کو تو مذاق کا موضوع ہی ہاتھ آ گیا تھا۔ جہاں چار شناسا آپس میں ملتے ہماری متوقع کتاب کا تذکرہ چھڑ جاتا اور طرح طرح کے مشورے دیئے جاتے۔ کوئی کہتا کتاب جلد چھپوالو ورنہ حروف اُڑ جائیں گے، تو دوسرا گویا ہوتا کہ اگر روپیوں کی ضرورت ہے تو فوراً بیت المال سے قرض لے لو، سود بھی دینا نہیں پڑے گا اور دھیرے دھیرے ادائیگی ہو جائے گی۔ شاید ان مشیر صاحب کو پتا نہیں کہ بیت المال میں ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے کوئی مد نہیں ہے اور یہ ادارہ زیادہ تر یتیم و لیسیر لڑکیوں کی شادیوں اور لاوارث لاشوں کی تدفین میں مدد دیتا ہے۔

چنانچہ ان مشوروں سے گھبرا کر ہم نے پہلی فرصت میں پریس کا رُخ کیا۔ پریس میں ہُو کا عالم تھا۔ چاروں طرف اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ مشینوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ یہاں کسی ذی روح کی موجودگی کے نشانات امکانات معدوم نظر آ رہے تھے۔ ہم مایوسی کا شکار ہوا ہی چاہتے تھے کہ اچانک سیٹھ صاحب برآمد ہوئے اور یہ کہہ کر ہم پر لرزہ طاری کر دیا کہ وہ سالِ جاریہ ہماری کتاب چھاپنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں کام کا انبار پڑا ہے۔ ہم نے منت سماجت کی تو چھ مہینے بعد آنے کو کہا۔ کچھ اور درخواست کی تو ایک مہینہ بعد تشریف لانے کو کہا۔ لیکن جب باتوں ہی باتوں میں کمال ہوشیاری سے ہم نے ان سے دور کی رشتہ داری نکال لی تو مسودہ اسی وقت مشین پر چڑھا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سو کتابیں چھاپ کر ہمارے حوالے کر دیں۔ اب یہ سوچ کر یک گونہ اطمینان ہوا کہ پانچ سو کتابوں میں سے ساڑھے چار سو کتابیں اعزازی طور پر تقسیم کر دیئے جائیں تو مابقی پچاس کتب کی فروخت سے ہم چار پانچ سو روپلے کے آسامی بن ہی جائیں گے۔ چنانچہ ہم نے فوراً شہر کے مشہور کتب فروشوں سے رابطہ قائم کیا۔ تقریباً سبھی حضرات نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ اور دس دس کتابیں لے کر الماریوں میں قرینے سے سجا دیں۔ اب ہم اس کی نکاسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ جب بھی فرصت ہوتی ان دکانوں کی طرف جا نکلتے اور ان الماریوں کا سرسری جائزہ لیتے جن میں ہماری کتابیں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ لیکن جب ان دکانوں کے قریب ہماری نقل و حرکت کچھ زیادہ ہی شروع ہو گئی تو ایک دکاندار نے بلا کر سمجھایا کہ اردو کتابوں کی فروخت کا آغاز ان کے بازار میں

[illegible]

آنے کے چھ ماہ بعد ہوتا ہے، لہٰذا چھ ماہ بعد حرکت میں آنے کی کوشش کریں تو بہتر ہے۔ چھ ماہ بعد خدمتِ عالیہ میں پہنچے تو انھوں نے یہ کہہ کر ہم ماتمی کیفیت طاری کر دی کہ صاحب آپ کی پانچوں کتابوں کو دیمک کھا گئی کیونکہ پچھلے برس اُردو کتب کی فروخت کا کچھ ایسا عالم رہا کہ میں اس برس احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے موقف میں نہ تھا ــــ یہ دلخراش خبر سُن کر ہم پر مرگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی لیکن پھر بھی ہمت کر کے ہم دوسری دکان پر اس کی نکاسی کا جائزہ لینے پہنچے۔ یہاں یہ دیکھ کر ہماری آنکھیں چمک اٹھیں کہ ہماری رکھوائی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب کم تھی۔ چنانچہ یہ خوشخبری سیٹھ صاحب کو سُنا کر جب ہم نے پیسوں کا مطالبہ کر دیا تو ان کی نورانی پیشانی پر درجنوں شکنیں اُبھر آئیں۔ اور قدرے توقف کے بعد انھوں نے فرمایا کہ نو سال سے نوے سال کی عمر تک کوئی اُردو کتاب ایک سال سے قبل نہیں بِک سکی اب یہ کیسے ممکن ہے؟ چنانچہ اس شبہ کا سر اُٹھانا تھا کہ انھوں نے اس کو تلاش کرتے ہوئے دکان کا سارا سامان تتر بتر کر دیا، صندوق دیکھ ڈالے، الماریاں چھان ڈالیں اور شطرنجیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ بیٹھنے کی گدی کو اس قدر جھٹکا کہ اس میں سے روئی خارج ہونا شروع ہوگئی۔ پڑوسی دکان داروں سے پوچھ آئے، نوکروں سے باری باری دریافت کیا لیکن جب سب نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بیس پچیس منٹ گہری سوچ میں غرق رہنے کے بعد کہا کہ شاید چوری ہوگئی ہے اگر فروخت ہوتی تو اس کا کیا مجھے علم نہ ہوتا۔ نوے سالہ بزرگ کے کہے پر ایمان نہ لانا سراسر کفر تھا۔ سو ہم نے ایک کتاب انھیں معاف کر دی۔ اور باقی چار کتابوں پر کڑی نظر رکھنے کی ہدایت کر کے اس دکان پر پہنچے جو اُردو کتابیں فروخت کرنے میں کافی مشہور تھے۔

انھوں نے ہمیں دیکھتے ہی بآوازِ بلند فرمایا، "مبارک مبارک" آپ کی بیس جلدیں فروخت ہوگئی ہیں ابھی دس بکنے باقی ہیں۔ دو چار سال بعد تشریف لایئے حساب کتاب چکتا کر دوں گا۔ چنانچہ حسبِ ارشاد پورے چار سال بعد دکان پہنچے تو انھوں نے کافی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ پہلی مرتبہ سادہ چائے پلائی، پھر بعد نہائی کمیشن ادا شدنی رقم کا تعین کر کے دوسرے دن حاصل کر لینے کو کہا۔ دوسرے دن رقم حاصل کرنے پہنچے تو انھوں نے فرمایا "آپ کے لئے بہت بُری خبر ہے" یہ سُن کر ہم خشمگیں نگاہوں سے انھیں گھورتے ہوئے آپے سے باہر ہو جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وہ بولے "ممتاز مزاحیہ شاعر علامہ بے غیرت کا انتقال ہوگیا" پھر اس افسوس ناک خبر کی ترسیل کے فوری بعد مرحوم کے حسب نسب، معمولی ادبی خدمات، پیشہ، تعدادِ لواحقین، مقام تدفین کے علاوہ نماز جنازہ کا وقت کچھ ایسا بتایا کہ شرکت لازمی ہوگئی، نماز جنازہ پڑھی، سوئے قبرستان گئے، چادرِ گل چڑھائی اور ضروری دعاؤں سے فارغ ہوکر تھکے ہارے دکان لوٹے۔ ادھر سیٹھ صاحب پڑوسی کے غم کو اپنے غم سے زیادہ اہمیت دے کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس موقعہ پر ہم نے پیسوں کا مطالبہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئے۔

لیکن اگلے دن تو انھوں نے ہمارے سلام کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی نہایت بھرائی ہوئی آواز میں کہا، چلئے ذرا عثمانیہ دواخانہ ہو آتے ہیں۔ میرے ایک قریبی عزیز کا ایکسی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم کچھ اعتراض کرتے انھوں نے کچھ کہے سنے بغیر ہم کو رکشے میں

سوار کرلیا اور وہ اٹھا کر پہنچ کر ایک سمت میں گم ہوگئے پھر کوئی دس پندرہ منٹ بعد اسٹکبار تشریف لاکر ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہنا شروع کیا ۔ " ہمارا یہ خاندان کا چشم و چراغ گل ہونے کو ہے کسی رشتہ دار کا خون نہیں ملتا اگر آپ ایک شیشہ خون عنایت فرمائیں تو نہ صرف سوگوار خاندان کے حق میں بلکہ ساری انسانیت پر احسانِ عظیم ہوگا "

حاضرین کو اشکبار ہمارے فیصلہ کے منتظر دیکھ کر انکار کرنے کی جرأت نہ ہوسکی ۔ چار و ناچار ہمیں ایک شیشہ خون دینا پڑا ۔ زندگی میں خون دینے کا پہلا اتفاق تھا ۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا ۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا ۔ ہم جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہتے تھے کہ سیٹھ صاحب نے ہمیں آلیا اور شیروانی کے جیب سے ایک خوبصورت چیک نکال کر یہ کہتے ہوئے ہماری ہتھیلی پر رکھ دیا کہ

" لیجئے یہ رہی آپ کی کتابوں کے پیسوں کی پہلی قسط "

اس واقعے کے بعد ہم نے قسم کھالی کہ زندگی میں پھر کبھی کتاب چھاپنے کی غلطی نہیں کریں گے ۔ اگر چھپوائیں گے بھی تو ہرگز اسے فروخت کرنے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ سب کی سب مفت تقسیم کردیں گے ۔

الحاج برق آشیانوی

سالِ نو

یارو، منصوبے بناؤ آگیا ہے سالِ نو
چند ہڑتالیں کراؤ آگیا ہے سالِ نو
پہلے آبادی گھٹاؤ آگیا ہے سالِ نو
قیمتوں کو پھر بڑھاؤ آگیا ہے سالِ نو
چھوڑ کر اِک پارٹی کو دوسری میں جا ملو
اس سے نکلو اس میں جاؤ آگیا ہے سالِ نو
شاعرو تم کیک بسکٹ تو کھلا سکتے نہیں
کچھ "شگوفے" ہی کھلاؤ آگیا ہے سالِ نو
وقت بیداری کا ہے سر پہ الکشن ہے کھڑا
نیند سے جاگو جگاؤ آگیا ہے سالِ نو
یوں تو سب ہی جانتے ہیں آپ کی عمرِ دراز
بتیاں ستّرہ جلاؤ آگیا ہے سالِ نو
ایک سو سَرد سے تو پورے ہوچکے سیلاب کے
ایک سَروے پھر کراؤ آگیا ہے سالِ نو
سب پُرانے ہوگئے جو بے الکشن کے حضور
کچھ نئے بھی آزماؤ آگیا ہے سالِ نو
کی ترقی مُلک نے ہر شعبۂ صنعت میں اب
ایک بُل ڈوزر چلاؤ آگیا ہے سالِ نو
نوجوانو، اُڑ کے اب تم آسمانِ علم پر
تارے بن کر جگمگاؤ آگیا ہے سالِ نو
سُن چکے ہیں آپ کی باسی غزل سو مرتبہ
اِک غزل تازہ سُناؤ آگیا ہے سالِ نو

روتے روتے گزرا سن اُنیس سو ستّر پہ سات
برقؔ اب تم ہی ہنساؤ آگیا ہے سالِ نو

ڈھکن رائچوری

نکّو چ نکّو!

عُرف "شادی نکّو!"

نکّو نکّو نکّو نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو!
نکّو گے نکّو چ نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو!
امّاں مجھے شادی نکّو — کو بیٹے کی بربادی نکّو!
جورُو سیدھی سادی نکّو — جہیز نکّو گا دی نکّو!
نکّو گے نکّو چ نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو!
تنخاں چالیس نام بارش — آکو کریں گی سُسر کی مالش
جھگڑے بڑھ کو ہوئینگی نالش — کرنا پڑینگا مسکہ پالش
نکّو گے نکّو چ نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو!
جب بی جائینگی اُنّے بازار — بَن کو ٹھن کو کر کو سِنگار
دیکھے اَنکھیاں اُٹھینگے ہزار — ہوئینگی پھر تو جو تم بیزار
نکّو گے نکّو چ نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو!
بولیا تو پھر بولیا کیئنگی — دِل کے اندر بھر کو چ رئینگی
ہوتے ساتھیاں کو لے کیئنگی — رو دھو کو پھر میکہ جئینگی
نکّو گے نکّو چ نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو!
مان جا امّاں کہنا میرا — سوچ لے میرا اچھا بُرا
چَین مِرے جی کا نہ چُرا — کر کو شادی سر نہ پھرا
نکّو گے نکّو چ نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو
جب بی ہوئینگی ہم میں اَن بَن — آئینگی پیچھے تیری سمدھن
ہاتھ میں لے کو پھُکنی بیلن — بجانے کوں تیرا ڈھکن!
نکّو گے نکّو چ نکّو — نکّو گے نکّو چ نکّو

رشید الدین

بارے فقراء کا کچھ بیاں ہو جائے

غالب نے کہا تھا ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ　　　تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

لیکن اہلِ کرم کو فقیروں کا تماشا دیکھنے کے لئے کوئی بھیس بنانے کی ضرورت نہیں بلکہ جوں ہی آپ گھر سے باہر نکلے اور یہ آموجود ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ گھر سے نہ نکلیں تب بھی یہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے بلکہ منہ اٹھائے آپ کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ دفتر جانے کی تیاری کرنے والے ایک صاحب کے گھر پر ایک ایسے ہی فقیر نے صدا لگائی:

"اللہ کے نام پہ ۱۰ پیسے دلا دیجئے"

"نہیں ہے" صاحب خانہ نے جھنجھلاہٹ سے جواب دیا۔

"ایک روٹی ہی دلا دیجئے" فقیر نے پھر صدا لگائی۔

"روٹی بھی نہیں ہے" انھوں نے پھر جھنجھلا کر جواب دیا۔

"آٹا ہی دلا دیجئے" فقیر کہاں تھکنے والا تھا۔

"آٹا بھی نہیں ہے" ان کی جھنجھلاہٹ بدستور قائم تھی۔

"کچھ بھی دلا دیجئے" فقیر نے آخری حربہ استعمال کیا۔

"کچھ بھی نہیں ہے" ان کا پارہ بھی چڑھ چکا تھا

"تو پھر آپ اندر بیٹھے کیا کر رہے ہیں، آیئے میرے ساتھ"

فقیر نے جواب دیا اور تو دو گیارہ ہو گیا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فقیر بے غیرتی اور ڈھٹائی سے آپ سے خیرات مانگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ہمارا تو یہ تجربہ ہے کہ زیادہ تر فقیر موقع شناسی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ہی فقیر نے ایک گھر پر صدا

لالہ گھر کی مالکن آنگن میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی جھلا کر بولی :

" ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے۔ تمہیں شرم نہیں آتی " فقیر نے معاملہ بگڑتے دیکھ کر فوری پینترا بدلا اور عاجزی سے بولا : " بیگم صاحب ! اپنی اپنی قسمت ہے۔ اب یہی دیکھئے آپ جیسی خوبصورت عورت کو کیا اس طرح اپنے ہاتھ سے برتن دھوتے بیٹھنا تھا "

عورت یہ سن کر ہاتھ دھوتے ہوئے بولی :

" ذرا ٹھیرو میں باورچی خانہ میں تمہارے لئے کچھ دیکھتی ہوں "

عام طور پر فقیر موقع شناس ہونے کے علاوہ بلا کے حاضر جواب بھی ہوتے ہیں۔ ایک اچھی شکل و صورت کے ایک فقیر کو ایک عورت نے ایک روپیہ خیرات کیا اور پھر بولی :

" صورت سے تو تم اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تمہاری یہ حالت کب سے ہو گئی۔

" بیگم صاحب ! میں بھی پہلے آپ ہی کی طرح کھلے ہاتھ کا تھا " فقیر نے جواب دیا۔

یہ سمجھنا غلط ہے کہ بھیک زندگی میں جو کچھ نہیں کر سکتا وہ فقیر بن جاتا ہے اور یہ کہ فقیر نرے جاہل، کند ذہن اور غبی ہوتے ہیں، بلکہ اس میں بھی بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور فقیری میں بھی عقلمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک صاحب نے ایک فقیر کو پہچان کر کہا :

" جہاں تک مجھے یاد ہے تم پہلے اندھے بن کر اس نکڑ پر بیٹھے بھیک مانگا کرتے تھے اور اب تم اپنے لنگڑے پن کی دُہائی دے رہے ہو "

" سرکار آپ نے بالکل صحیح پہچانا " فقیر بولا۔

" میں دراصل پہلے اندھا بن کر بھیک مانگتا تھا لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ لوگ مجھے کھوٹے سکے دینے لگے۔ اس لئے میں اب لنگڑا بن گیا ہوں "

لیکن بعض ایسے بھی موقعے آتے ہیں کہ فقیر سیر ہو تو خیرات دینے والا سوا سیر نکل آتا ہے۔ کئی منزلہ عمارت کے اوپر بالکونی میں کھڑے ایک صاحب کو کسی نے نیچے سے اشارہ کر کے بلایا۔ وہ دوڑے دوڑے آئے اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ بلانے والے نے کہا :

" بات کچھ نہیں۔ میں ایک فقیر ہوں۔ کچھ دلا دیجئے "

وہ بولے اچھا میرے ساتھ اوپر آؤ۔ فقیر خوش خوش ان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ اپنے گھر کے دروازہ پر پہونچ کر انھوں نے فقیر سے کہا :

" اس وقت تو گھر میں کچھ تیار نہیں۔ پھر دیکھا جائے گا "

فقیر نے جھلا کر کہا " جناب یہ بات آپ مجھے نیچے بھی بتا سکتے تھے اتنی سیڑھیاں چڑھانے کی کیا ضرورت تھی "

اس پر ان صاحب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا " تم بھی مجھ سے نیچے سے ہی خیرات مانگ سکتے تھے "

بُلانے کی کیا ضرورت تھی۔"

یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ سارے ہی فقیر پیسے یا کھانے کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں بلکہ بعض فقیر دل کی جھولی لئے حُسن کی بھیک بھی طلب کرتے پھرتے ہیں۔ ہم نے اسٹیشنوں پر بعض فقیروں کو صرف لیڈیز کمپارٹمنٹس ہی میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ بعض فقیر بھری ہوئی بس میں داخل ہوتے ہیں لیکن صرف عورتوں کی نشست کا ایک چکر لگا کر اُتر جاتے ہیں مردوں کی نشستوں کی طرف وہ نظر اُٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ ایک ایسے ہی دل والے فقیر سے ایک بار ایک صاحب نے کہا:

"میاں میں دیکھتا ہوں تم روزانہ بانو کے مکان پر پابندی سے صدا لگاتے ہو جبکہ آج تک تمہیں وہاں سے کچھ نہیں ملا۔"

فقیر نے جواب دیا۔ صاحب اب اندر کی بات آپ کو کیا بتائیں لیکن آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو سُن لیجئے۔ اُس گھر سے تو ہمیں روز ہی خیرات ملتی ہے لیکن اس کی نوعیت الگ ہوتی ہے وہاں حُسن کی خیرات بٹتی ہے جب بھی اندر سے صاحبِ خانہ کی لڑکی دروازے میں آکر معاف کرو کہتی ہے اپنی جھولی بھر جاتی ہے۔

فقیروں سے زیادہ شاید ہی کوئی انسانی نفسیات سے کھیلتا ہو۔ ہر گھر کی اُنھیں خبر رہتی ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ کس گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں اور ان کے باہمی رشتوں کی کیا نوعیت ہے جس گھر میں بھی انھیں لڑکے نظر آئیں گے، وہ بیٹوں کی جوڑیاں سلامت رہے ضرور کہیں گے۔ جہاں لڑکیاں نظر آئیں بیٹیوں کی سلامتی ان کا مخصوص جملہ ہوگا۔ ہم ایک ایسے گھر کو بھی جانتے ہیں جہاں صرف ایک بوڑھی اور ایک بوڑھا رہتے ہیں چنانچہ وہاں فقیروں کا عام طور پر یہ جملہ ہوتا ہے۔

"بڈّا بڈّی کی جوڑی سلامت رہے۔"

اور اس گھر سے تقریباً ہر فقیر کو خیرات ملتی ہے۔

اب تک ہم نے صرف جمالی فقیروں کا ذکر کیا ہے لیکن فقیروں کا ایک طبقہ جلالی بھی ہوتا ہے۔

آپ کہیں گے جلال اور فقیری تو دو متضاد چیزیں ہیں۔ جلال کا فقیر سے کیا علاقہ لیکن صاحب علاقہ ہے اور ضرور ہے ایسے فقیر آپ کو زیادہ تر درگاہوں، خانقاہوں اور اعراس و میلے ٹھیلوں میں نظر آئیں گے۔ کپڑے عام طور پر رنگین ہوتے ہیں۔ بال بڑے بڑے۔ گلے میں موٹے منکوں کی مالا ایک ہاتھ میں چمٹا اور دوسرے ہاتھ میں پیچ دار ڈنڈا ہوتا ہے چونکہ دونوں ہاتھ مصروف ہوتے ہیں اس لئے کاسۂ گدائی عام طور پر زنجیر سے بندھا گلے سے لٹکا ہوتا ہے۔ وہ نہ ہو تو جاکٹ کے جیب پیسے جمع کرنے کا فرض انجام دیتے ہیں۔ ایسے فقیروں کو نعرے لگانے میں خاص ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ "مٹی کے پتلے کو دیمک لگی ہے کوئی جھٹکنے والا۔" "چمڑے کی جھونپڑی میں آگ لگی ہے کوئی بجھانے والا۔" "آنکھوں کا نور دل کا سرور ہے کوئی لینے والا۔" ایک کے بدلے چار۔ ہے کوئی کمانے والا۔" اور اسی قسم کے جملے ان کے مخصوص نعرے ہوتے ہیں۔ پانچ پیسے، دس پیسے، چار آنے، آٹھ آنے ایسے سائلوں کے پاس کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ کم از کم ایک روپیہ دینا پڑتا ہے کوئی اگر کم دے تو اپنے ہاتھ میں موجود چمٹا وہ اپنے ہی سر پر اس زور سے مارتے ہیں کہ خیرات دینے والا دہل کر رہ جاتا ہے اور اس کے بعد جیب سے روپیہ ہی نکال کر دیتا ہے۔

پتہ نہیں دنیا میں وہ کون شخص تھا جس نے سب سے پہلے خیرات طلب کی تھی اور وہ بے چارہ کون تھا جس نے سب سے پہلے خیرات دی تھی لیکن اب تو یہ لین دین صدیوں سے جاری ہے اور زندگی کا ایک معمول بن گیا ہے۔ ہم اب فقیروں کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ کسی دن فقیر در پہ صدا نہ لگائے تو عجیب محسوس ہوتا ہے یا کسی بس اسٹینڈ پہ آپ بغیر کسی صدائے گدا کے بس میں سوار ہو جائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس کے سفر میں کچھ کمی رہ گئی۔

یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ لوگ جب اتنی مشکل سے خیرات مانگتے ہیں تو پھر کوئی دوسرا باعزت پیشہ کیوں اختیار نہیں کرتے۔ ایک فقیر سے ہم نے ایک بار اس موضوع پہ بڑی لمبی چوڑی بحث کی اور اسے بھیک مانگنے کی برائیوں اور عزت کی روزی کی اچھائیوں سے واقف کروایا۔ اس نے سب کچھ سننے کے بعد کہا کہ "صاحب وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ایک توسے کی روٹی کا کچھ مزا نہیں آتا"

فورین کا جنون
(FOREIGN)

حیدرآبادیوں کی ایک ادا یہ بھی ہے
کہ یہ فن بھی دل و جان سے فدا ہو چکا ہوں اور وہ ہے اپنے وطن
اور ہم وطنوں سے بے رخی و بے مہری اور پردیس میں بھی بے چینی، ایک طرف تو شملہ نشیں تھی
وطن سے بیزار ہو کر پردیس گئے تو آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ؎
دلی کی سرزمین رد مجھ، دکن کی سانولی شاہو — تمہارے چاہنے والے ابھی تک یاد کرتے ہیں
تو دوسری طرف ہر شخص ترکِ وطن کے لئے جان لڑائے ہوئے ہے اور کہتا ہے "عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا"

اس جنونِ ترکِ وطنی یا ترکِ دکنی نے ایک اور دلچسپ ادا کو جنم دیا ہے کہ لوگ جو وطن میں ہیں وہ پردیس کی چیزوں پر جان دیتے
ہیں اور جو پردیس میں مقیم ہیں وہ وطن کی چیزوں پر مرمٹتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بھی آسان نہیں ہیں مگر اس کا
طریقہ یہ ہے چلے جاتے ہیں اور اس طرح ایک نئی وبا یعنی "شرفاء کی اسمگلنگ" کی شروعات ہوئی —
میری اسکوٹر کو دیکھ کر ایک صاحبزادے نے جو وحشیانہ بال اور دراز شدہ دیوداس جیسی
چشمک سے کہا "جانی! آپ جاپانی ہونڈا اسکوٹر کیوں نہیں چلاتے" ...
مجھے اس لڑکے پر غصہ آگیا۔ میں نے جل کر کہا "آپ سے کم عمر
صاحب میں دیسی مال ہوں" وہ خوش ہو کر بولا "جی ہاں ..."

محمد برہان حسین

جانتے ہیں انھیں؟

میں نے دوسرا وار کیا "وہ کالے عرب ہونا!"

"جی ہاں ۔ جی ہاں! آپ [illegible] ہیں انھیں۔

میں نے چڑھ کر کہا "توبہ! مجھے ان سے کیا واسطہ میں تو آپ کے چہروں اور صورت سے سمجھ گیا تھا کہ آپ کے بہنوئی ...."

ہمارے ایک دوست نے آہستہ سے ہمارے کان میں کہا "ارے یار! پوچھو اگر اس کا بہنوئی کویت جانے والا ہے تو بڑے خالو اپنے داماد کے لئے کچھ چیزیں بھجوانا چاہتے ہیں اور اگر ابوظہبی جانے والا ہے تو منجھلے چچا اپنے لڑکے کے لئے اچار اور بڑیاں بھجوانا چاہتے ہیں اور اگر سعودی عرب جا رہا ہے تو چھوٹے ماموں اپنی لڑکی کے لئے" میں نے تنگ آکر کہا "توبہ توبہ توبہ ہے بھائی کیا مصیبت ہے میں نے یہ کیا مصیبت مول لی"

یہ منگوانے اور لے جانے کا معاملہ بھی خوب ہے ۔ایک صاحب بڑے خوش تھے کہ کسٹم والوں نے ان نئے دس قمیضوں پر ڈیوٹی نہیں لگائی جو وہ امریکہ سے لے آئے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانی برآمد شدہ کپڑے تھے۔

اب تو یہ حال ہو گیا ہے جب کوئی صاحب پردیس سے مختصر عرصہ کے لئے آتے ہیں تو لوگ جوق در جوق دعوتیں دیتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص دو سیر بڑیاں ایک سیر اچار، چار جوڑے کپڑے، دو کیلو گاجر کا حلوہ، دو جوتے، دو چپل لے کر پہنچ جاتا ہے ۔وہ اس کے اس رشتہ دار کو پہنچا دیا جائے جو پردیس میں ہے جو لوگ کچھ نہیں بھجوا سکتے وہ کم از کم خطوط کا بنڈل حوالے کر دیتے ہیں ۔ یہ خطوط بھجوانا بھی خوب ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ڈاک ایجاد ہی نہیں ہوئی یا یوں لگتا ہے جیسے ہم اکبر اعظم اور شیر شاہ سوری کے دور میں واپس ہو گئے ہیں اور ہرکارے ڈاک لے کر جا رہے ہیں اور یہ عادت اس قدر رچ بس گئی ہے کہ اندرون ملک بھی اس کا استعمال عام ہے ۔ایک دفعہ ہم رائے پور گئے ۔جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہم حیدرآباد سے آئے ہیں تو دو بوڑھے آدمیوں کو سامنے لا کر بٹھا دیا گیا ۔معلوم ہوا کہ یہ دونوں بوڑھے کسی زمانہ میں حیدرآباد میں چند دنوں کے لئے رہنے آئے تھے ۔گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ وہ چالیس سال قبل دو سال تک حیدرآباد سے ڈیڑھ سو میل دور واقع ایک گاؤں نرمل' میں رہ آئے تھے ۔ دو دن کے بعد' وہ ہم کو رخصت کرتے ہوئے دو خطوط حوالے کرنے لگے جن پر نرمل کے پتے لکھے تھے ہم نے کہا "نرمل تو حیدرآباد سے ڈیڑھ سو میل دور ہے" تو وہ معصومیت سے بولے "کوئی بات نہیں" "آپ کبھی اتوار یا تعطیل میں ہو آئیں" ہم نے کہا "آپ اسے ڈاک سے کیوں نہیں بھجواتے" وہ دونوں ویسی ہی معصومیت سے بولے "میاں! پتہ نہیں وہ لوگ ان پتوں پر رہتے ہیں یا نرمل میں ہی نہیں ہیں یا پھر مر بھی چکے ہوں۔ کیوں کہ یہ پتہ چالیس سال پہلے کا ہے"

ایک بار ہم نے ایک صاحب کی عینک کی قیمت دریافت کی' وہ بولے "سو روپئے" ہم نے کہا "بہت مہنگی خریدی" تو وہ بولے "نہیں' سستی بھی تھی لیکن یہ شیشے 'کروکس' ہیں امپورٹیڈ"

ہم نے کہا "ارے یار شیشے کی چیزیں تو ساری دنیا کو جاپان سپلائی کرتا ہے اور ہم خود بھی بناتے ہیں ۔حیدرآباد کے سب عینک ساز' موسیٰ ندی کے کنارے والے کارخانے سے شیشے خرید کر عینک سازی کرتے ہیں۔

تو وہ بڑی بے بسی سے بولے "کیا مطلب یعنی افسر کے بھتیجے حیدرآباد کے باہر کے بھی ہیں، یار کم از کم بمبئی وغیرہ کہتا! بعض لوگ تو اس عادت میں بڑا "کلاسیکل رنگ" دے دیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست عبدالوحید صدیقی ہیں جو علاء حیوانات میں نلگنڈہ ضلع پر تعینات تھے جو حیدرآباد شہر سے صرف پچاس میل دور ہے۔ ایک دفعہ حیدرآباد آنے سے انھوں نے اپنے آفیسر سے دریافت کیا کہ اگر وہ کوئی چیز منگوانا چاہتے ہوں تو کہہ دیں۔"

انھوں نے کہا "بھئی وحید صاحب! آپ مجھے صرف نامپلی کی بیکری کی ڈبل روٹی اور چادر گھاٹ کے پان لا دیجئے۔"

وحید صاحب جب حیدرآباد سے واپس ہوئے تو دونوں چیزیں لے جانا بھول گئے۔ جب وہ نلگنڈہ بس اڈے پر اترے تو خیال آیا۔ انھوں نے سوچا آفیسر کا معاملہ ہے جھٹ بس اسٹینڈ ہی سے ڈبل روٹی اور پان خرید کر آفیسر کو بھجوا دیئے۔ دفتر میں انھوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "سر! آپ کو آپ کی چیزیں مل گئیں؟"

تو وہ بولے "واہ! شکریہ۔ بھئی وحید صاحب! یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کے پان میں وہ کیوں نہیں ہوتا اور صاحب، ڈبل روٹی کے ذائقہ کے کیا کہنے۔"

اس واقعہ کے بعد وحید صاحب کا یہ اصول بن گیا کہ وہ جب بھی حیدرآباد سے لوٹتے ہیں تو نلگنڈہ بس اسٹینڈ سے ڈبل روٹی اور پان خرید کر آفیسر کو ضرور بھجوا دیتے جس کے عوض وہ ان کی دو تین دن کی غیر حاضری یونہی معاف کر دیا کرتے تھے۔

کلیم سید کی

خبط خبطی ہے آفس میں گھر میں کرکری توبہ
ہوگی ایسے عالم میں کیسے نوکری توبہ

ہیں کھوں اگر سیدھا وہ سکتے ہیں نا بنا
سچ تو یہ کہ ہے ان کی الٹی کھوپڑی توبہ

سامنے تو بیگم کے دم دبائے رہتے ہیں
دبدبی ہے دفتر میں ان کی افسری توبہ

ریس تا بہ رقص سب کھیل ہم تو کھیلے ہیں
رہ گئی ہے بس باقی کیمیا گری توبہ

بن بریک کے جہان آ رہے ہیں بے کھٹکے
جن سے تھی شناسائی اپنی سرسری توبہ

ناخلف زمانے کے کہہ رہے ہیں دادا دل
یہ غضب ہے بوڑھا، ساس بڑبڑی توبہ

کر لئے تھے ہم قرضہ پیشگی تو تھے پر
ہاتھ دے گئی آخر ہم کو لاٹری توبہ

یہ بھی داخلِ فیشن ہے سماج میں اپنے
گر جلا سے ہو تو ہو سکے اگر بُری توبہ

قوم کو تو ہے عادت سن کے بھول جانے کی
بس کلیم رہنے دو اپنی شاعری توبہ

غزلیں

مونس بریلوی

طاری ہے اک سکوت غزل کہہ رہا ہوں میں
جاری ہے رقصِ بھوت غزل کہہ رہا ہوں میں

دنیائے شاعری میں نہ جس کا جواب ہو
ایسی کوئی اچھوت غزل کہہ رہا ہوں میں

غالب کا اور جگر کا ہے دیوان سامنے
کیا اور دوں ثبوت غزل کہہ رہا ہوں میں

رہ رہ میں تیری ذہن سے مصرعہ نکل گیا
چپ ہو جا میرے پوت غزل کہہ رہا ہوں میں

ہر شعر ہے غزل کا اک آسیبیت لئے
پڑھ پڑھ کے عنکبوت[1] غزل کہہ رہا ہوں میں

احباب کو گلے سے بھی کوئی گلہ نہ ہو
کھا کھا کے حبِ توت[2] غزل کہہ رہا ہوں میں

مونس جو جا کے ہند سے غارن میں رن کرے
اک ایسی راہ ووٹ غزل کہہ رہا ہوں میں

[1] ایک مشہور آسیبی ناول
[2] گلے کی خراش کی لاثانی دوا

ارشد علیخان

ضرورت ہے!

ایک ماڈرن ٹیوٹر کی ——————

شرائط ——————

۱۔ ہمہ مقصدی و ہمہ وقتی ہو۔ ۲۔ کسی جگہ کم از کم دس سال نوکر کی حیثیت سے کام کر چکا ہو۔ ۳۔ بلاوڈ جیسی آواز کا مشاق ہو۔ اس لئے کہ ہمارے بچے سوائے اس آواز کے کسی اور آواز سے نہیں ڈرتے [نوٹ :۔ سابقہ مرحوم ٹیوٹر کتے کی طرح بھونکتے بھونکتے پرسوں ہی دوران "درس طفلاں" اسی گھر کے گمنام گوشے میں جاں بحق ہو چکے ہیں۔ وہ تو خیر کوئی خاص بات نہ ہوئی ہمارے بچے کتے سے ڈرنا بھول گئے ہیں] ۴۔ فطرتاً شکاری واقع ہوا ہو —— اس لئے کہ روزانہ نہ صرف جنگل سے نیا شکار مار لائے بلکہ اس کی کھال اپنی کھال پہ لپیٹ کر آیا کرے یوں اپنا رعب و دبدبہ قائم و دائم رکھے۔ [نوٹ : ہمارے سائنس صاحب ریچھ کی کھال کے سوا کسی سے مطلق نہیں ڈرتیں۔ لہذا ان کو کسی کمرے میں مقید کرنے کا صرف یہ ہی ایک تیر بہدف نسخہ باقی بچ گیا ہے۔ اس کارروائی کے بعد گھر کے نیچے بچے بھی بچنے کا ہاتھ آ سکتے ہیں] ۵۔ موڈ میکانک ہونا نہایت ضروری ہے

لی یہ ہے کہ پڑوسی کی کار تقریباً پچیس برس سے "فروخت طلب" ہے۔ لہٰذا جب بھی کوئی آثارِ قدیمہ والا گاہک اسے
سے یعنی خریدنے وارد ہوتا ہے تو ہمارے بچوں کو طلب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ٹیوٹر کا کام یہ ہوگا کہ بچوں کی تعلیم میں حرج نہ
نہ دے اور خود آگے بڑھ کر کار کی مرمت کر ڈالے۔

۶۔ علاج حیوانات کی شُدبُد بھی ایک حد تک ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہمارا "بلڈاگ" نامعقول حد تک پاگل ہوگیا
۔ وہ ہر اجنبی پر کچھ یوں جھپٹ کر اس کا خاتمہ کرتا ہے جیسے وہ چڑیا کا بچہ رہا ہو ـــــ حیوانات کے ڈاکٹروں کا متفقہ
لہ اور زریں مشورہ یہ ہے کہ وہ کمبخت لاعلاج ہوگیا ہے اور خارش اور کھانسی کا پرانا مریض بن گیا ہے۔ لہٰذا اسے صرف
بندوق کی گولی کافی ہے۔ لیکن ہمارے پاس نہ بندوق ہے نہ لائسنس چنانچہ ٹیوٹر کے فرائض میں یہ داخل ہوگا کہ وہ بلاناغہ کُتے
سل نسے اور ایوڈیکس (AYODEX) کی پانچ سو گرام والی ایک عدد ڈبیہ وقتِ واحد میں اس مردود کی کھال پر
ش کرے۔

[نوٹ: مرہم آہستہ آہستہ لگائے ورنہ خطرہ [illegible] ظاہر ہے جس کے ہم کسی طرح بھی ذمہ دار نہ ہونگے]

۷۔ شام اپنے گھر لوٹتے وقت بچوں کو سلا دیا کرے اور ہو سکے تو میر عالم منڈی یا سبزی منڈی سے دوسرے دن کے لئے کچھ
ترکاریاں نہایت سستے دام والی کسی طرح خرید کر لایا کرے۔

[نوٹ: گھر میں کسی قسم کی کوئی سواری نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے پاؤں اور ہاتھوں کو غنیمت سمجھے۔ ویسے چہل قدمی ہزار بیماری
کی لاکھ دوا ہے]

۸۔ تنخواہ دو چار ماہ بعد ایک آدھ وقت، بدقت تمام کسی طرح بھی باہمی مارم توڑی کے بغیر ہرگز نہ دی جائیگی۔
یہ بات شروع [illegible] ذہن نشین کرلی جائے کہ گوناگوں مشکلات، آسمانی بلیات و زمینی تغیرات کا کون کیا کر سکتا ہے۔
ویسے عموماً وہ روزانہ اِسی گھر کا گشت کرتی رہتی ہیں لہٰذا ایسے کڑے وقتوں میں گھر کا خرچہ خود برداشت کرنے کا حقیقتاً اہل
ہو ـــــ

ہمارا پتہ: کلو خاں، ریٹائرڈ جمعدار
توپ کا سانچہ

ضرورت ہے ایک شیر دل پیش امام کی ـــــ

شرائط: ـــــ

۱۔ جس کا جگر شیر کا، قد اونٹ کا، وزن ہاتھی کا اور چال لومڑی کی ہو ـــــ
۲۔ کیمسٹری و باٹنی میں واعلیٰ و ادنیٰ درجے کا ڈپلما کسی مستند یا غیر مستند یونیورسٹی سے جبراً و کرہاً حاصل کر چکا ہو۔
ویسے الجبرا میں اپنا حسب نسب بالجبر ہو سکتا ہے۔
۳۔ محلے یا گھر کا بچپن ہی سے "دادا" تسلیم کیا جا کر گولڈ میڈل حاصل کر چکا ہو۔ داؤں پیچوں سے کماحقہٗ واقف ہو
بلکہ کمیٹی دونوں اکھاڑوں کا ـــــ

۴۔ نماز کی ہر رکعت میں ہر مکتبِ خیال کی عکاسی کرے مثلاً کبھی بریلوی طرز تو کبھی دیوبندی! ویسے سلام پھیرتے ہی مسجد کے دنگل یعنی صحن میں جھٹ لنگوٹی لگا کر آ جائے کیونکہ گذشتہ پچیس سال سے پھر اس قسم کی دھما چوکڑیاں یہاں چل رہی ہیں۔

[نوٹ : سابقہ پانچ عدد پیش اماموں کو تاریخی وجغرافیائی شہادت اسی دنگل مبارک میں نصیب ہوئی ہے۔]

۵۔ تنخواہ کوئی خاص مقرر نہیں ہے ویسے حسبِ منشاء خود راتوں میں دیوار پھلانگ کر کسی کی بھی تجوری سے جو چاہے تھیلے۔ اگر حلال روزی کا دلدادہ ہو تو بھیک یا چندہ پہ گذارہ کرے ___ ویسے اگر نمازیوں سے بدلہ ہی لینا مقصود ہو تو گھنٹوں رکوع وسجدے کی حالت میں انھیں اکڑا دے ___

۶۔ میت کو غسل دینا، کفن دینا، قبر کھودنا، دفن کرنا، پھر خالی ڈولہ اپنے آپ پہ ڈھو کر قبرستان سے خود بنفسِ نفیس واپس لانا۔ یہ تمام فرائض بذمہ پیش امام رہیں گے۔ محلے والوں کا کام صرف اتنا ہوگا کہ وہ اس قسم کی ناگہانی موت کی اطلاع پیش امام کو کم از کم ایک آدھ گھنٹہ پہلے دیدیں۔

ہمارا پتہ : گلشن دربار، شاہی قبرستان
اکھاڑے کی مسجد محلہ ٹیپو خاں

ضرورت ہے ایک لیڈی اسٹینو کی ___

شرائط:___

۱۔ عمر کی کوئی قید نہیں، ہر عمر والی بے دریغ قبول کی جائے گی، سر آنکھوں کے سوائے ہر جگہ بٹھائی جائے گی۔

قابلیت : فی سکنڈ اپنی انگلیوں کو سات مرتبہ تیزی سے حرکت دے سکنے کی قابل ہو ___ ناخن دار انگلیاں قابل ترجیح ہیں جو دور سے بھالوں برچھوں کی انیاں نظر آتی ہوں۔

نوٹ : ان ہی انگلیوں پہ منیجر کو کم از کم روزانہ پانچ گھنٹے پابندی سے نچایا کرے۔ اوور ٹائم (OVER-TIME) کے الگ پیسے، اسی کو کہتے ہیں ایک کام دو کاج۔

۲۔ بھاگنے میں گھوڑ سنگھ کا ریکارڈ توڑ چکی ہو۔ ملاحظہ کے لئے توڑے ہوئے ریکارڈ کا چورا لازما ساتھ لیتے آئے۔

۳۔ اشاروں وکنایوں کے رموز سے نہ صرف واقف ہو بلکہ ہماری پوری کمپنی کو واقف کرانے کی صلاحیت ماں پیٹ سے ازشاً ملی ہو۔

۴۔ کم از کم بائیس توڑے ناچ سکتی ہو اور نچا سکتی ہو۔ لہٰذا کمپنی کو ہر بات ناچ کے ذریعہ ہی سمجھائے۔

۵۔ کسی جگہ کم از کم دس سالہ شادی شدہ ہونے کا تجربہ حاصل کر چکی ہو ویسے قانوناً شادی شدہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ کمپنی کے بوجھ کا بار برداشت کرنے کی اہلیت ہو۔

۶۔ دور سے لٹھ کا نظر آتی ہو پھر بھی دیکھنے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہو بشرطیکہ قریب آنے پر صدفی صد لڑکی لگے ورنہ درخواست واپس کر دی جائے گی۔

۷۔ ہیلی کاپٹر یا ہوائی جہاز چلانا جانتی ہو — پیراشوٹ سے کودنے کی دس سالہ مشق لازمی ہے۔
نوٹ :۔ اسٹینو کا کمرہ بیسویں منزلہ عمارت پر ہوگا اور اُسے جو نوکر دیا جائے گا وہ بچپن سے جنسی جنون میں مبتلا ہے۔

ہمارا پتہ : چٹ پٹے چنے جور گرم کمپنی، پرانا کھنڈر محلہ مجھلی بیگم کی گلی۔

ضرورت ہے — ایک نوکرانی کی!

شرائط :—

۱۔ عمر مالکن عمر سے زیادہ رہی ہو — اس طرح صورت مالکن سے بدصورت ہو۔
[نوٹ : مالکن کی عمر گذشتہ تیس ۳۰ برس سے تیئس ۲۳ سال ہی چلی آ رہی ہے اور صورت مت پوچھئے کس طرح صورت کہلائی جاتی ہے]

۲۔ خاندانی شرافت کا دور سے بھی تعلق نہ ہو — بیوہ کو ترجیح دی جائے گی۔
[نوٹ : جن کے شوہر بدقسمتی سے زندہ ہیں ——— وہ بھی آسکتی ہیں۔ انشاءاللہ جلد بیوہ ہو جائیں گی]

۳۔ کم از کم بی اے پاس ہو — صاحب کی انگریزی کمزور ہے 'توی کیا کرے' ویسے صاحب سے دُور رہنے کی حتی الامکان کوشش ضرور کرے ورنہ دوران تعلیم وہ پکا پکچ بچوں کی طرح لپٹ جانے کے عادی ہیں۔

۴۔ کرا ٹا فن میں یکتائے روزگار ہو جس کے بل بوتے پر چھٹانک "بغیر ہڈی" کا گوشت قصاب سے برابر تلا کر لایا کرے۔ [نوٹ : صاحب پر بھی اس فن کو بطور نمونہ استعمال کر سکتی ہے ویسے وہ بھی دھوبی پچھاڑ کے ماہر ہیں]

۵۔ فسٹ ایڈ ٹریننگ یافتہ رہی ہو — اس طرح ہمارے نجی معاملات کے بعد وہ اپنا کام شروع کر دیا کرے۔

۶۔ صاحب کے اشارے و کنائے 'من و عن' مالکن سے کہتی رہے 'ورنہ راز فاش ہونے پر تنخواہ کاٹی جائیگی —

۷۔ دستکاری میں دسترس حاصل ہو — فرصت کے اوقات بور رہئے 'ازار بند وغیرہ بنتے رہا کرے بلکہ فروخت کر کے لایا کرے اس طرح گھر کے بچوں کی فیس آسانی سے باندھی جا سکتی ہے۔

ہمارا پتہ : گھوڑ بلی، محلہ سید گلی چبوترہ۔

نریندر لوتھر

★

طنزنامہ

فکرنامہ

فکر تونسوی کی کتاب "فکرنامہ" پر تبصرہ

اُردو ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ لکھنے والا، سب سے زیادہ چھپنے والا اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادیب فکر تونسوی ہے۔ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فکر کا شمار دُنیا کی کسی بھی زبان میں سب سے زیادہ چھپنے والے ادیبوں میں ہوگا۔

یہ پڑھ کر آپ شاید مصنفوں کی تصنیفات کی گنتی کرنا شروع کر دیں گے ـــــ لیکن ذرا ٹھہرئیے ـــــ یہ مت بھول لیجئے کہ نہ جانے پچھلے کتنے دنوں سے فکر ہر روز تقریباً دو ہزار لفظ لکھتا، چھپواتا اور پڑھواتا ہے ـــــ اور جس دن وہ الفاظ نہیں چھپتے اُس دن ہندوستان کے ایک کثیرالاشاعت اخبار کی کئی کاپیاں بکنے سے رہ جاتی ہیں!

یاد رکھیے! فکر ایک روزنامہ کی روزانہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ کسی اور مُلک، اور کسی اور زبان کے کسی ایسے ادیب کی کُلیات لائبریری ایڈیشن میں چھپ کر، اَن پڑھ امیرزادوں کے دیوان خانوں کی زینت بنتیں۔ لیکن فکر کی غلطی بقول خود اُس کا پیدا ہونا تھا۔ مجھے اُس کے اِس فعل (اُس کے ہ) پر اعتراض نہیں لیکن اگر اس تجربے کے لئے اُس نے کوئی اور مُلک چُنا ہوتا تو اس وقت ہندوستان میں اس کا نام اور درشن دونوں بڑے ہوتے۔ لیکن ایک مدرسہ فکر (تونسوی) کا قول ہے کہ فکر پچھلے جنم میں یورپ میں پیدا ہوا تھا۔ اور اس نے سالہا سال برٹش میوزیم کی لائبریری میں سر کھپائی کر کے ایک بھاری بھرکم کتاب لکھی تھی۔ (کتاب کا نام داس کیپٹل ہے۔ اس کتاب کے تمام پچھلے حصے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب ضرور کسی ہندوستانی نے ہی لکھی ہوگی۔)

کیونکہ اس نے اس جنم میں ریسرچ زیادہ کی تھی اور لکھا کم تھا، اس لئے اُسے ایک اور جنم دیا گیا تاکہ وہ پچھلے جنم کی کی ہوئی ریسرچ کی بناپر دل کھول کر لکھ سکے۔ فکرؔ کے "گرم قلم" کا یہی راز ہے۔

ہندوستان کی معاشی حالت کے پیشِ نظر یہی بہت غنیمت ہے کہ کلیات نہیں تو کم از کم فکرؔ کی تحریروں کا انتخاب ہی اُس کی زندگی ہی میں ترتیب دیا گیا اور چھاپا گیا۔ ورنہ لاتعداد مداحوں کے ہوتے ہوئے بھی بعد از مرگ صرف لفاظی پرمشتمل ریزولیوشن ہی پاس ہوتے ہیں اور ایسی دُعا کی جاتی ہے جس کا اثر کم از کم فکرؔ کے کیس میں تو بالکل نہ ہوتا۔ ـــــ بھلا خدا فکرؔ ایسے شخص کو جوارِ رحمت میں جگہ دے کر اپنی عاقبت کیسے بگاڑ سکتا ہے؟

جب سے اُردو زبان پیدا ہوئی ہے، ہندوستان کی روایت رہی ہے کہ یہاں کے بادشاہ بھی اپنے مزار اپنی زندگی میں خود ہی بنواتے رہے ہیں۔ لیکن وہ مزار رعایا کے پیسوں سے بنوائے جاتے تھے۔ یہ بدلے ہوئے دَور کی علامت ہے کہ آج کی جمہوری حکومت شہنشاہ طنز و مزاح کے لئے ایک کاغذی مزار بھی نہ بنوا سکی۔ بیچارے شہنشاہ کو اس کام کے لئے جمہوریہ کی وزارتِ تعلیم کا "جُزوی مالی تعاون" ہی ملا۔ غنیمت ـــــ صد غنیمت!!

یہ کتاب کیسے اور کس طرح شائع ہوئی۔ اس پر غالباً خود فکرؔ کبھی روشنی ڈالے گا تاکہ اُردو کے دوسرے ادیبوں کو ہدایات یا عبرت ملے۔ (خدا کم از کم اِس کام کی تکمیل کے لئے اُس کی عُمر دراز کرے) ویسے سُننے میں آیا ہے کہ اس کتاب کے چھپنے میں کافی لاگت آئی ہے، جس میں اس سوشلسٹ ادیب کی پس انداز کی ہوئی بیشتر پُونجی لگ گئی ہے۔ بزرگوں نے سچ ہی کہا ہے، پیسہ جیسے آتا ہے، ویسے ہی جاتا ہے۔

میری بیٹی نے جو فکرؔ کے مضامین، سُن چکی ہے، لیکن پڑھ نہیں سکتی۔ سرورق پر فکرؔ کی تصویر دیکھ کر اُس نے اپنی رائے کا اظہار کیا، کتاب بڑی اچھی ہے۔ مَیں نے پوچھا کیسے؟ تو جواب دیا کہ تصویر بڑی اچھی ہے، لیکن اس میں بھی کچھ فریب ہے۔ تصویر اگر مزاح کی ہے تو کتاب طنز کی۔ اصل زندگی میں کسی نے بھی فکرؔ کو اتنی خالص اور معصومانہ ہنسی ہنستے نہیں دیکھا۔ تصویر کی یہ ہنسی فکرؔ کی اصل مُسکراہٹ سے تجاوز کر گئی ہے۔ اُمید ہے یہ تصویر فکرؔ کو بے فکری سے مُسکرانا اور ہنسانا سکھائے گی۔

خیر! مطلب اِس کا یہ ہُوا کہ کتاب کا گٹ اَپ اچھا ہے۔!!

اب کتاب کے اندر "گٹ اِن" ہوئیے۔ مضامین کی تفصیل دیکھئے، پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک زندگی کا نہیں ـــــ متعدد زندگیوں کا۔ پچھلے جنم سے لے کر اگلے جنم تک اور پھر واپس اس جنم تک شٹل ٹنگ ہوتی رہتی ہے۔ فکرؔ نے ادب اور تاریخ کی کسی بھی روایتی حد کا لحاظ نہیں کیا۔ لکھتے لکھتے وہ زندگی سے موت میں اور موت سے پھر زندگی میں ایسی دیدہ دلیری اور بے فکری سے وارد اور خارج ہوتا رہتا ہے۔ جیسے راج کپور کی فلم میں ہیرو دُھند کی تہوں کو چیرتا ہُوا ہیروئن سے ملنے جاتا ہے۔ فکرؔ سب دیواروں کو دُھند کی دیواریں سمجھتا ہے۔ میری نظر میں فکرؔ کی یہ خاص خوبی ہے۔ اس نے گویا زندگی کو مختلف مَدوں کے تحت تقسیم کیا اور پھر ہر مَد کے تحت دِل کھول کر لکھا۔

"فکرنامہ" کتابِ زندگی ہے جس میں ہر مضمون میں دوسروں کی زندگی کا نچوڑ ملتا ہے۔ کئی ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریروں میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ لیکن بہت کم مصنف ایسے ہیں جن میں "عالمگیری" پائی جاتی ہے۔ طنزیہ ادب میں فکرؔ ہی واحد ایسا ادیب ہے، جس میں "عالمگیری" اورنگ زیبی حد تک موجود ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ نوٹ ہے کیوں کہ فکرؔ، ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے، جن میں اکثر گھسے پٹے موضوعات پر ہی لکھتے رہے ہیں۔ مثلاً مرزا ادیہ کیرکٹر، اُردو میں بہت سخت جان واقع ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر طبع آزمائی کیے بغیر "حُسنِ فروغِ شمعِ سخن" دُور ہی رہتا ہے۔ اس لئے اُردو ادیبوں کی نسل ہانسلانے

اس بے چارے بزرگ کو رُسوا کیا ہے !) "مشاعرہ"۔ "شاعر"۔ "خالہ" یا "چچا جان"۔ (ان کے نام بدلے جاتے ہیں) "شادی"۔ "قرض"۔ "دوست"۔ وغیرہ۔ "بیوی" کو تو ہر ادیب نے پامال کیا ہے (اس پر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بقول فرائیڈ یہ بات بالکل فطری ہے۔ اور ہندی رامائن کے مصنف تلسی داس نے بھی کہا تھا کہ 'ناری' تاڑن کی ادھیکاری ہے) لیکن ادھر نئی نسلوں کے لکھنے والوں نے کئی نئے اور اچھوتے مضامین کو بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ ان کی تحریروں میں جدت، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو فکرؔ اور میری نسل کے ادیبوں میں کوئی "جنریشن گیپ" نہیں ہے۔ فکرؔ کے ہاں اگر موضوعات کی بھرمار ہے تو اسٹائل بھی ہر مضمون کے مطابق کچھ بدلتا رہتا ہے۔ اکثر مضامین، افسانوں کے ڈھانچوں میں ہیں اور انھیں پڑھتے وقت کیفیت وہی ہوتی ہے جو افسانہ پڑھتے وقت ـــــ لیکن فکرؔ کو پڑھتے وقت آپ کو محتاط رہنا پڑتا ہے، نہ جانے کب نشتر چل جائے مضامین پڑھ کر اکثر "کتھارسس" (CATHARSIS) کا احساس ہوتا ہے۔ آپ "بیویوں کی ٹریڈ یونین" پڑھیئے اور بتائیے کہ کیا آخری چند سطروں میں آپ کی آنکھیں پُرنم ہوتی ہیں یا نہیں۔ "فکرؔ تونسوی نے الیکشن لڑا"۔ نہایت ہی پُر اثر مضمون ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد ہمارا وہ خیال اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ الیکشن کی پالیٹکس شریف انسان کے بس کا روگ نہیں۔ "ڈر کے لئے کنیا کی ضرورت" یا "چڑت رام نے فلم بنائی"۔ میں آپ کو اپنے سماج کے اسٹینڈرڈ کرداروں کے مانوس اور مُستند نقوش نظر آئیں گے۔ جن مسئلوں کے بارے میں آپ اکثر شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ سے یا سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے چیدہ چیدہ دوستوں سے پوچھتے آئے ہیں۔ "آخر ایسا کیوں؟" وہ سب آپ کو اس کتاب کے ورقوں میں ملیں گے۔

مجتبیٰ حسین نے فکرؔ کو "بھیڑ کا آدمی" کہا ہے۔ (بھیڑ 'زیر' کے ساتھ بمعنی مجمع کے نہ کہ بکری کے ساتھ ذکر آنے والے جانور کے) فکرؔ کے مضامین بھی بھیڑ کے مضامین ہیں۔ اُن کے موضوع عوام کے مسائل ہیں۔ وہ مسائل جو ازل سے اَبد تک رہیں گے۔ وہ مسائل، راجہ ہریشچندر اور وکرمادیتہ، خلیفہ ہارون رشید، سیزر، جواہر لال نہرو، ہر ایک کے دَور میں رہے ہیں۔ ہر نسل نے اِن کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نسل ختم ہو گئی۔ مسائل ابھی زندہ ہیں اور مسائل امر ہیں۔ فکرؔ اُن کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ صرف اُن کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرواتا ہے اور پھر ایک طرف کھڑا ہو کر دیکھتا ہے کہ کہیں آپ بھی معصومیت سے ان کو حل کرنے کی کوشش میں مُبتلا تو نہیں ہو گئے۔

فکرؔ کا عقیدہ ہے کہ اُسے خدا نے ہندوستان کے ایسے معاشرے میں پیدا کر کے اُس کے ساتھ مذاق کیا ہے' بھونڈا اور بے وقت کا مذاق۔ یہ حرکت خدا کی غلطی تھی۔ اس کے لئے فکرؔ نے آج تک اُسے معاف نہیں کیا۔ اور کئی صدیوں سے وہ خدا اور اُس کے نظام، اُس کے بنائے ہوئے انسان، اُس کے سماج اور اُس کے مختلف اجارہ داروں کو "ایکسپوز" کر رہا ہے۔ "فکر نامہ" ایک نثر نگار کا شکوہ ہے۔ کسی ایک مذہب یا مِلّت یا قوم کا شکوہ نہیں، بلکہ انسان کا شکوہ خدا کے خلاف، انسان کا شکوہ سماج کے خلاف۔ لیکن ہم نے سُن رکھا ہے کہ خدا سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ سمجھتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو فکرؔ کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا پُنر جنم اس کے پلان کے مطابق اس کی موجودہ گلی میں اپنے ہمسایہ کے گھر نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو یورپ کے کسی نہایت متمول گھرانے میں ہوگا جہاں وہ اپنے پچھلے جنموں کی تلخیاں اور اس جنم کی خرافات سب کو بھول جائے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ یہ فکرؔ کا آخری جنم ہے۔ مصلحتِ ایزدی اسی میں ہوگی کہ اس جنم کے بعد فکرؔ کو مُکتی دے دی جائے۔ نہیں تو خدا کی خدائی اور سماج کی دُنیا دونوں کو سخت خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ "تعس کم جہاں پاک"!

اِس کتاب کی قیمت ساڑھے سولہ روپے ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اُردو کی اور وہ بھی طنز و مزاح کی کتاب

ا یہ مجال کہ انگریزی کی جاسوسی کتابوں کی قیمتوں کا مقابلہ کرے۔ آپ اس کو 'انسٹال منٹ' پلان کے تحت خریدیئے
د ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالیئے۔ اگر آپ قسط بھی افورڈ نہیں کر سکتے تو اپنی کارپوریشن یا میونسپلٹی پر دباؤ ڈالیئے
۔ وہ اس کتاب کی کاپیاں خرید کر ہر ریڈنگ روم میں رکھے۔ کیونکہ لوکل باڈیز کے اکثر ممبران اُردو سے بے بہرہ ہوتے ہیں
س لئے ہوسکتا ہے کہ وہ صرف تصویر دیکھ کر ہی آپ کے دل کے بہلانے کا سامان مہیّا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ■

اے شوق کہیں لے چل !

عبدالقادر ادیب (ایڈوکیٹ)

اے شوق کہیں لے چل، غربت کی رفاقت سے
ابّا کی اُلفت سے، بنئیے کی عنایت سے
مہنگائی کی جنت سے، گندم کی کرامت سے
اے شوق کہیں لے چل، اے شوق کہیں لے چل

دولت کی خدائی سے مُنہ موڑ رہے ہیں ہم
مظلوم تھا جن کا دل توڑ رہے ہیں ہم
محبوب جو گندم تھا وہ چھوڑ رہے ہیں ہم
اے شوق کہیں لے چل، ...

ظلم کی دُکاں ہے یا گودام ہے یہ دُنیا !
ہر دام جو مُٹھی میں پھر جام ہے یہ دُنیا
اصنام کی دُنیا ہیں، گلفام ہے یہ دُنیا
اے شوق کہیں لے چل ...

بچّوں سے ملوگے تو پاؤگے اُنھیں گلشن
مِل جاتے ہیں وہ اکثر کیوڑے کا جہاں ہو بَن
ہمدرد ہیں، مخلص ہیں، سچّے ہیں مگر پُر فن
اے شوق کہیں لے چل، ...

فیاض افسوس

قطعات

اُستاد ہے فنکار ہے یہ جان لیا ہے
چالاک ہے کمبخت نے پہچان لیا ہے
صد فخر کہ اِس دورِ ترقی میں بشر کو
شیطان نے گھبرا کے گرُو مان لیا ہے

ان کی بے پردگی بھی پردہ ہے
سب کو ایسا ہُنر نہیں آتا
میک اَپ ہوتا ہے اس قدر گاڑھا
اصلی چہرہ نظر نہیں آتا

اب تو دعوتِ گری بھی اِک رسم عام ہے
[illegible]
[illegible]
بیٹھے کر اپنے [illegible] بجنے لگے ہیں [illegible]

غزل

نیاز انجم

گالیاں سُن کے ہنستے جاتے ہیں بچے بالغ
سیکس تھیوری پہ کہیں آپ کا لیکچر تو نہیں
ڈگری بی اے کی یہاں ملتی ہے یا B.A کی
دھوم دھام اتنی ہے کالج میں سوئمبر تو نہیں
بِل یا بم جو نظر آیا ہے بُرقعے میں کبھی
شک ہوتا ہے یہی پردہ میں ڈکیٹ تو نہیں
ہاتھ میں ہاتھ لیے عید مبارک کی طرح
[illegible]
[illegible] آپ ٹھلّی بنا [illegible]
آپکے [illegible] کے اُوپر کہیں [illegible] تو نہیں

غزل

آن ٹرپہ ہونگری

رہ گئے اب تو فقط باتیں بنانے والے
ہیں بریک اپنی زبانوں کو چلانے والے
باڑوں باڑوں میں ہیں یہ مُرغے پھنسانے والے
بنا لائسنس کے بزنس ہیں چلانے والے
دانے دانے کو ہیں محتاج خزانے والے
رشتہ انگور کی بیٹی سے لگانے والے
کیا یقیں ہے کہ چبائیں گے وہ فولادی چنے
عُمر بھر گُلگُلے گُڑ کے جو چبانے والے
ایسے بجتے ہوئے چمچے بھی بہت ہیں یارو
باتوں باتوں میں جو گردن ہیں کٹانے والے
بن بلائے چلے آتے ہیں وہ گُھس کر گھر میں
کتنے اڈوانس ہیں بیگم کے گھرانے والے
[illegible]
بے وضو [illegible] کا دعوت [illegible] چلانے [illegible]

★

صرف آنسو اور ہمدردی ہی نہیں

ہم میں سے لاکھوں اپنے آنسوؤں کو تھامنے کی سخت کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری زندگیاں ذیل کے مطابق مسخ ہو چکی ہیں:

دھان کے کھیتوں پر جو کبھی لہلہاتے تازہ ہرے بھرے تھے گدھ منڈلا رہے ہیں
طوفانی موجوں نے سب کچھ تباہ کر ڈالا جو ہمارے پاس تھا۔
ہم جانتے ہیں کہ آپ بھی آنسو بہا رہے ہیں، لیکن ہمیں جس کی شدید ضرورت ہے وہ آپ کی امداد ہے۔

★ آپ سے جو کچھ ممکن ہو چیف منسٹرز ریلیف فنڈ کو بھیجئے۔
★ دی سکریٹری ٹو گورنمنٹ، ریونیو ڈپارٹمنٹ، سکریٹریٹ
حیدرآباد۔ پن کوڈ ۵۰۰۰۲۲
★ چک "چیف منسٹرز سائیکلون ریلیف فنڈ" کے نام دیئے جا سکتے ہیں۔

تحفوں کے لئے

۱۔ دی ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسر، ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسرز آفس، اے سی گارڈز، مانصاحب ٹینک حیدرآباد ۵۰۰۰۲۸۔
۲۔ دی سپرنٹنڈنٹ، آفس آف میونسپل کارپوریشن، دارالشفاء حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
۳۔ دی سب کلکٹر، وجئے واڑہ، آندھرا پردیش

دی ڈائرکٹر آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز حیدرآباد
گورنمنٹ آف آندھرا پردیش

23/77-78

رشید قریشی ایم۔ اے

حویلی کا چاند

[نواب میر محبوب علی خاں چھٹے آصف جاہ گذرے ہیں۔ ان کے دورِ حکومت کو تاریخی واقعات کی بناء پر اہمیت حاصل ہے تو ان کی شخصیت فقیرانہ جذب و سلوک اور شاہانہ سخاوت و معدلت کی وجہ سے جاوداں شہرت کی مالک بنتی ہے۔ وہ اپنی رعایا کے حال احوال سے بذاتِ خود واقف ہونے کے لئے راتوں میں بھیس بدل کر شہر میں گھومتے تھے اور حاجت مندوں اور مصیبت زدوں کی مدد کا انتظام کرتے تھے ان کے حالاتِ زندگی پر مبنی "حویلی کا چاند" کے عنوان سے میں نے ایک ڈرامہ لکھا جو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہوا۔ اس ڈرامہ میں بازار کے سین کچھ مزاح آلود ہیں اس لئے "شگوفہ" کی نذر ہیں] ر۔ق

پہلا سین

ہوٹل

ہوٹل کا مالک : ارے دیکھ جانی ۔ میر صاحب کے آنکھاں چھت کو لگ گئے ۔ تو کب تک اپنی اُجاڑ صورت آئینہ میں دیکھتا رہیگا ۔ چل جلدی چائے دے میر صاحب کو

جانی : ابھی میاں مالک ان آنکھوں سے نجانے کیا خرابی پڑنے والی ہے ۔ ایک دن ایک چھوٹی ہوجاتی ہے تو دوسرے دن ' دوسری ۔

میر صاحب : (چھت کو تکتے تکتے جھنکولا کھاتے ہیں) ۔ آج ہماری طرف کی آنکھ چھوٹی ہوجاتی ۔ مہربانی! کنجال دار ' کھڑا چھپنہ ' نہ جلدی میرے جانی ۔

ایک گاہک : تو ... میں ... کیا کہہ رہا تھا ... ہاں میں

کہ رہا تھا اپنے محبوب علی پاشا، شکار کو ابراہیم پٹن گئے۔

دوسرا گاہک : (دستی سر سے باندھا ہوا کامدار صدری پہنا ہوا) محبوب علی پاشا دونی اچھال کر گولی سے اڑاتیں دونی بن گیا ہوں گا شیر۔

ایک گاہک : ذرا گڑبڑ ہوگئی شکار میں۔

(بھیس بدلا ہوا شخص آتا ہے۔ ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

بھیس بدلا ہوا شخص : کیا ہوا۔ ہم بھی تو سنیں؟

ایک گاہک : ہاں کہ ہوا۔ شیر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھ کر ایسا دھاڑا کہ جنگل لرز گیا۔ مچان پہ محبوب علی پاشا کے بازو ریذیڈنٹ بیٹھا تھا۔ انہیں بھی لرز گیا، انگریزی بھُول کو، داستان بجانے لگا۔ اب محبوب علی پاشا، انوں بھی ایک بجھتے ہوئے آزمانے کو بولے۔ دِل دھن۔

دوسرا گاہک : دِل دھن' یہ بات اپنے پلے نیں پڑی۔

ایک گاہک : ارے اپنے پاشا انگریزی میں بھی فرفر ہیں۔ بولے 'ریذیڈنٹ دم ہے تو بندوق چلا۔

دوسرا گاہک : اچھا یہ بات۔ ہاں... پھر

ایک گاہک : اب جو ریذیڈنٹ کانپتے ہاتھوں سے بندوق چلایا۔ گولی شیر کے پیچھے میں لگی۔ قلم پکڑنے والا ہاتھ کیا بندوق سنبھال سکتا ہے؟

دوسرا گاہک : اجی انہیں کیا شکار کھیلنے آیا تھا مطلب فقط یہ کہ شیر اس کو بادشاہ کے بازو بیٹھا ہوا دیکھنا۔ چپ شوقی۔ ہاں آگے بڑھو۔

ایک گاہک : شیر پھر دھاڑا اور غصہ میں ریذیڈنٹ کے منہ پر تھوک دیا۔

بھیس بدلا ہوا شخص } اچھا!

ایک گاہک : منہ نیں سو جانور، فقط تھوک دیا۔ اس کی جگہ میں رہنا تھا۔

دوسرا گاہک : چلو چلو قصہ ختم کرو۔

ایک گاہک : تو شیر لنگڑاتا ہوا ایک جھاڑی میں جا چھپ

بھیس بدلا ہوا شخص } ایسا؟

ایک گاہک : اجی ہاں ہاں میرا چشم دید سنا ہوا واقعہ ہے

بھیس بدلا ہوا شخص } مجھے ذرہ برابر شک نہیں۔ آپ بیان جاری رکھئے

ایک گاہک : اب اس جھاڑی پہ پتھر پھینکے۔ ہوا میں فائر کئے لیکن شیر باہر نہیں نکلا۔

دوسرا گاہک : (بھیس بدلے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) شیر کیا ان کے جیسا دیوانہ ہے جو سامنے آکے بیٹھ جائے گا۔ انیں سمجھ گیا محبوب علی پاشا تاک میں ہیں۔ جھاڑی سے باہر نکلا اور جہان سے گیا۔

ایک گاہک : اجی اب سنو کیا ہوتا ہے اپنے سالم چاؤش ہیں نا؟

دوسرا گاہک : کون سے سالم چاؤش؟

ایک گاہک : اجی وہی علی آباد کے دو جوروؤں والے سالم چاؤش۔

دوسرا گاہک : انیں تو جوشیلا ہے جو جی میں آئے کر گزرتا ہے

ایک گاہک : تو سالم چاؤش اپنی جمدار بندوق اچھالتے جھاڑی کی طرف لپکے۔

دوسرا گاہک : دو جورؤوں والا ہے۔ شیر سے کیا ڈرتا! نہیں

ایک گاہک : محبوب علی پاشا چھپے۔ سالم چاؤش کیا کتا ہے یا کمبخت لیکن معلوم ہوتا ہے سالم چاؤش دونوں جوروؤں سے لڑ کر آئے تھے گھس گئے جھاڑی میں۔ جھاڑی میں کچھ حرکت ہوئی تو محبوب علی پاشا' رزیڈنٹ کی طرف دیکھے۔ رزیڈنٹ پھر کانپنے لگا اور کانپتے کانپتے پھر بندوق چلادیا۔ شیر کو تو کچھ نہیں ہوا۔ سالم چاؤش تڑپتے، بلبلاتے باہر آئے۔

دوسرا گاہک : کیا اندھا رزیڈنٹ تھا، شیر میں سالم چاؤش میں تمیز نئیں کر سکا۔

ایک گاہک : ایسا نہ کہو۔ سالم چاؤش کی لنگی سے کوئی بھی دھوکا کھائینگا۔

بھیس بدلا شخص : پھر کیا ہوا؟ بہت دلچسپ قصہ ہے۔

ایک گاہک : عربی زبان کی لغت میں کیا بولوں پاشا۔ کسی چاؤش کو گولی مارو اور پھر دیکھو اس زبان کے فراٹے۔

دوسرا گاہک : قصور سالم چاؤش کا ہے محبوب علی پاشا کے حکم کے بغیر اُن کو میدان میں نہیں آنا چاہیے تھا شیخی کا مزہ کڑوا۔

ایک گاہک : بالکل ٹھیک۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ رزیڈنٹ کی گولی، سالم چاؤش کا شانہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔

بھیس بدلا شخص : محبوب علی پاشا نے کیا کیا؟

ایک گاہک : [illegible] بیچارے مچان سے نیچے آئے۔ زخمی سالم چاؤش کو افسر جنگ کے حوالے کئے۔

دوسرا گاہک : سالم چاؤش بہت بپھرا ہونگا۔

ایک گاہک : شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ کہتا تھا کہ کی گولی ہوتی تو ہم خوشی سے کھالیتا، لیکن رزیڈنٹ ہمارا کاندھا توڑا۔ ہم بھی اس کے کاندھے پر گولی مارے گا۔

دوسرا گاہک : اپنے محبوب علی پاشا کو تو تاؤ آگیا ہوگا انوں اپنے لوگوں کا خون دیکھ کر آپے میں نئیں رہتے۔

ایک گاہک : تاؤ کیا بول رئیں۔ محبوب علی پاشا پہ زنانا سوار ہوگیا۔ گھس گئے جھاڑی میں آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لوگوں کے دل دھڑکنے لگے۔ جنگل کا سانس رک گیا' اتنے میں بندوق کی آواز ہوئی .... اور ...

دوسرا گاہک : اور... جلدی بول نا۔

ایک گاہک : اور محبوب علی پاشا بندوق کی نال چھپکتے' مسکراتے ... جھاڑی سے باہر آئے۔

بھیس بدلا شخص، اور شیر۔

ایک گاہک : اب شیر کہاں پاشا۔ شیر کی دم' لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔

دوسرا گاہک : میں نے سُنا ہے اب پاکھال کو جا رہے ہیں سرکار

ایک گاہک : پاکھال سے پہلے میلوارم کو جانے کی خبر ہے

بھیس بدلا شخص : یہ محبوب علی پاشا کیا جنگل کے بادشاہ ہیں' جب دیکھو شکار کو چلے۔ اس طرح سیر سپاٹوں میں رہیں گے تو رعایا کی خبرگیری کون کریگا؟

(دوسرا گاہک اٹھ کھڑا ہوتا ہے بھیس بدلے ہوئے شخص کو کھڑا کر کے اس کا گریبان

پکڑ لیتا ہے۔ بھیس بدلا ہوا شخص اپنے آپ کو
چھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا گاہک
ایک زور دار جھٹکہ دیتا ہے)

دوسرا گاہک : کونسے جنگل کا ترڈس ہے رے تو ؟

بھیس بدلا شخص : گریبان چھوڑ میرا ، دور ہٹ

میر صاحب : (اپنی جگہ سے اٹھ کر موقعہ واردات پر
آجاتے ہیں) کیا ارشاد فرمائے میاں آپ
محبوب علی پاشا جنگل میں شکار کھیلتے رہے
تو رعایا کی خبرگیری کون کریگا ؟
آپ کو معلوم ہونا چاہیئے میاں انوں ریاست
کا ایسا اچھا انتظام جمائے ہیں کہ انوں کیئں
بھی رہو یہ کارخانہ چلتیچ رہتا۔ اب دیکھو
آپ۔ اللہ آسمان پر ہے ہے نا ! بولو۔
ہے نا ؟

بھیس بدلا شخص : جی ہاں۔ ہے۔

میر صاحب : اللہ آسمان پہ ہے لیکن دنیا کے کاروبار
برابر چل رئیں یا نئیں۔ بولو چل ریں نئیں ؟

بھیس بدلا شخص : جی ہاں چل تو رہے ہیں !

میر صاحب : تو بحث ختم (پھر اپنی جگہ جا بیٹھتے ہیں)
ایک پیالی اور میرے جانی۔ دلدار . . . .

دوسرا گاہک : بحث ختم نہیں ہوتی۔ شروع ہوتی ہے۔
(چاقو نکالتا ہے) اپنی رگوں میں مکہ مسجد
کی کھچڑی کا خون ہے۔ میرے محبوب علی پاشا کو
کوئی برا بولینگا تو انتڑیاں زمین پر گرادونگا
(چاقو اونچا کرتا ہے)

مالک : (بیچ میں آجاتا ہے) ارے یہ کیا جھگڑا ہے
ادھر آؤ میاں میرے ساتھ (بھیس بدلے ہوئے
شخص کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کرسی تک لے جاتا ہے) ہاں اب
خدا کو حاضر و ناظر جان کر بولو . . . . . . میں گاؤں کا گدھا

بھیس بدلا شخص : میں گاوں کا گدھا !

مالک : سن گاؤں کے گدھے۔ اپنے محبوب علی
پاشا شکار کو گئے تو فقط جنوروں کے پیچھے ہی نہیں
پڑے رہتے جہاں بھی وہ جاتے ہیں رعایا کی
عرضیاں لیتے ، ان کی فریاد سنتے اور ظلم کرنے
والوں کو سزا دیتے ہیں۔ اتنی بڑی سلطنت کے
بادشاہ کو تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ شکار تو بہانہ
ہے۔

بھیس بدلا شخص : یہاں میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔
بہت شکریہ (جانے لگتا ہے)

جانی : شملے والا۔ جھگڑا کیا۔ چاقو نکلا۔ کھایا پیا
کچھ نہیں۔

مالک : اجی کدھر چلے ادھر آؤ۔ ذرا پڑھو۔ وہاں
کیا لکھا ہے۔ چاقو جمبیہ کی لڑائی۔ پانچ روپیہ
جرمانہ۔

بھیس بدلا شخص : (روپے نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے)
یہ لیجئے (چلا جاتا ہے)

دوسرا گاہک : (چاقو نچاتا ہوا آتا ہے) مالک نکالو چاقو
کے دو روپے۔

مالک : یہ لے۔ جب تک محبوب علی پاشا ہیں عیش کرلے

دوسرا گاہک : (روپیوں کو چومتا ہے) مالک کے ہاتھوں سے
دیتا ہے میرا محبوب !

دوسرا سین

[مداری بین بجاتا بیٹھا ہے۔ سامنے سانپوں کی پٹاری ہے دو چار لوگ کھڑے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک راہگیر معمولی لباس پہنا ہوا شملہ کے نچلے سرے سے چہرے کو ڈھانپا کھڑا ہے]

مداری : جنتر منتر چال چلنتر سات سمندر، چار قلندر... چھو (دونوں ہاتھ خالی بتا کر ایک ہاتھ پر دستی رکھ دیتا ہے) پہلی پگڑی گنبد پیٹ، مٹی کھاتا بھنگی بیٹھ۔ چھو۔ چھو۔ چھو (دستی اٹھاتا ہے، انڈا بتاتا ہے)

ایک شخص : دستی میں تھا انڈا۔

مداری : (آگے بڑھ کر انڈا اس شخص کی جیب میں ڈال دیتا ہے) اچھا اب بولو میرے بھائی۔ انڈا کہاں ہے؟

ایک شخص : (اپنی جیب ٹٹول کر) میری جیب میں ہے انڈا؟

مداری : تو بھائی میرے آپ مرغا ہیں یا مرغی؟

ایک شخص : تجھ کو میں کیا نظر آتا ہوں۔

مداری : مجھے تو آپ (مرغی کے کڑکڑانے کی آواز نکالتا ہے)

ایک شخص : پاگل ہے کیا؟

مداری : پاگل نہیں بھائی۔ یہ دیکھئے (آگے بڑھ کر جیب میں ہاتھ ڈال کر چوزہ نکالتا ہے لوگوں کو دکھاتا ہے)... یہ دیکھئے مرغی کا کمال انڈا غائب، چوزہ حاضر (لوگ ہنستے ہیں۔ مداری ڈھول بجانے لگتا ہے۔ بھیس بدلا ہوا شخص لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ مداری چوزہ پر دستی ڈالتا ہے اور بھیس بدلے ہوئے شخص کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ بین بجانے لگتا ہے)

پیٹ میں گڑبڑ۔ جادو سر چڑھ... چھو (دستی اٹھاتا ہے، چوزہ موجود نہیں رہتا) میرا چوزہ کیا ہوا مہربان؟

ہضم؟

(لوگ ہنس پڑتے ہیں مداری ڈھول بجانے لگتا ہے)

چھدر کے پیٹ میں چوزہ۔ اونٹ کے منہ میں زیرہ..... چھو.. چھو... ہری ہری لال لال۔ چھوٹا سر لمبے بال چھو... چھو... (چھینکتا ہے) اچھو (بھیس بدلے ہوئے شخص کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ انڈا لوگوں کو دکھاتا ہے۔

بھائیو! بھائی اپنا شاہی باورچی خانے کا ہے۔ چوزہ کھاتا، انڈا دیتا (بین بجانے لگتا ہے)

[بھیس بدلا ہوا شخص جیب سے کچھ روپے نکال کر مداری کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ ہنستا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ مداری پٹاری میں سے سانپ نکال لیتا ہے لوگوں کے پاس لیجا کر ان کو ڈرا ڈرا کر پیسے وصول کرتا ہے۔]

تیسرا سین

[استاد تخت پر بیٹھے ہیں۔ کالی دو پلی۔ کالی صدری، کالا کرتہ... سر جھکا ہوا۔ شاگرد داخل ہوتا ہے۔ پاؤں دباتا بیٹھ جاتا ہے]

شاگرد : استاد آج آپ بہت اداس ہیں۔

استاد : کیا بولوں پاشا۔ دنیا مری اُجڑ گئی نا۔

شاگرد : استاد آج پہلی بار میں آپ کو کالے لباس میں دیکھ رہا ہوں۔ استانی ماں جب جنت کو سدھاری تھیں۔ اس وقت بھی آپ نے کالا لباس زیب تن نہیں کیا تھا۔ اب کیا ہوگا استاد؟ ضرور کوئی بڑا سانحہ واقع ہوگیا ہے (استاد کی گود میں سر رکھ دیتا ہے) مجھ سے چھپائیے مت استاد۔ بولیے کیا بات ہے؟

استاد : پاشا میرا حال دیکھنے والے تڑپ اٹھے ہیں تو

میں جو اس غم کا نشانہ بنا ہوں مجھ پر کیا کچھ نہ گذر رہی ہوگی۔ پاشا اب میں بھی بس بس چند گھڑیوں کا مہمان ہوں۔ ہائے ... ہائے ... رستم!

شاگرد : رستم ؟

استاد : ہاں رستم۔ میرے کلیجے کا ٹکڑا رستم۔ کیا بانکا۔ کیا جیالا۔ بڑے بڑوں سے ٹکرا گیا۔ پرنچے اڑا دیئے سب کے۔ ہا ... ہا ... رستم ... رستم ... تم میرے رستم .... تم ...

شاگرد : ماشاءاللہ کیا عمر ہوگی ؟

استاد : عمر ہی کیا تھی پاشا۔ پچھلے ہفتہ ہی اس کی پہلی سالگرہ کا جشن ہوا تھا۔ رستم تیری موت مجھے آجاتی

شاگرد : استاد مرنا تو سبھی کو ہے۔

استاد : مرنا آسان ہوتا ہے، سوگ میں جینا مشکل ہوتا ہے۔ اب میں رستم کے بغیر کیسے زندہ رہوں پاشا!

شاگرد : استاد! صبر سے کام لیجئے۔

استاد : صبر مجھے کس طرح سہارا دیگا پاشا۔ جدھر دیکھتا ہوں رستم ہی رستم نظر آتا ہے۔ وہ دیکھو میرا رستم آرہا ہے

بھیس بدلا شخص : (نزدیک آکر) ... کیا رستم میاں آپ کے صاحبزادے تھے۔ ؟

استاد : صاحبزادے یا صاحبزادے کی کیا حقیقت ہے پاشا! رستم تو ... سب جاناتھا، تو نہیں جاناتھا۔

بھیس بدلا شخص : پھر وہ کون تھا جس کے غم میں آپ اپنی جان کھو رہے ہیں۔

استاد : پاشا وہ میرا بٹیر ... مرا رستم ... انیں مرگیا جی (زور سے لگتا ہے) جی .... اما .... ای

شاگرد : ارے کیا ہوگیا تھا اُسے ؟

استاد : بہانہ، اچھا خاصا گھر کے آنگن میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ اتین صاحب کا کالا مرغا گھس آیا۔ مرغ ہوں گا، اپنے گھر کا۔ میرا رستم کہاں خاطر میں لانے والا۔ اچھل کر کلغی سے لٹک گیا۔ میں چھڑانے گیا تو ایسا جھٹکا دیا کہ میرا شانہ اتر گیا (شانہ دباتے ہوئے) اب تک درد ہے پاشا۔

شاگرد : پھر کیا ہوا استاد ....

استاد : مرغ کی کلغی، تربوز کے ٹکڑوں کی طرح سارے آنگن میں بکھر گئی۔

بھیس بدلا شخص : بڑا جنگجو تھا آپ کا رستم۔

استاد : لیکن کالے مرغ کی نظر بہت بُری ہوتی پاشا، کھا گئی میرے رستم کو۔ صبح میں پنجرہ کھولا تو باہر نہیں نکلا مٹھی میں لے کر باہر نکالا تو بس ایک بار میری طرف دیکھا۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

بھیس بدلا شخص : آپ کے اُستاد

استاد : میرے رستم کے پاشا، اُنیں جارہا تھا نا اس دُنیا سے

شاگرد : آپ نے کیا کیا استاد!

استاد : میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ رستم نے آسمان کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں ... لیکن جیا بھی شان سے مرا بھی شان سے۔

شاگرد : خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

استاد : جب دم نکلا ہے ... دونوں ٹانگیں آسمان کی طرف ایسی موت کس کو نصیب ہوتی پاشا۔ چھیا رستم تھا میرا رستم

بھیس بدلا شخص : اس میں کیا شک ہے۔

شاگرد : اللہ کا پیارا۔ اللہ کو پیارا ہوگیا۔

استاد : (شاگرد کو لپٹا لیتا ہے) ہم نے رستم کو پہچانا نہیں۔ (استاد، شاگرد، دونوں روتے ہیں) نہیں پہچانا رستم کو، ہم نے ـــ

[بھیس بدلا ہوا شخص ہنستا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے]

کارٹون

خواجہ عبد الغفور آئی اے ایس

ابتدائے آفرینش سے ہی انسانوں کی خواہش اور کوشش رہی کہ ماحول سے اثر انداز ہو کر اپنے تاثرات اور احساسات کو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھیوں پر ظاہر کریں۔ ان کا تعاون حاصل کریں۔ صدیوں یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا کہ کھانے پینے کو تازہ پھل مل جائیں یا شکار، کچھ آذوقہ حاصل ہو جائے تو اپنی طمانیت اور اپنی خوشی کا اظہار گلا پھاڑ کر اور دانت دکھا کر اپنی دانت میں کچھ معنوں والی آوازوں سے کرتے رہے، ڈر اور خوف کو کچھ اور طرح کی آوازوں سے اور غم و غصہ کو کسی اور طرح سے اس کے بعد دوسرا دَور ایسا آیا کہ یہی خانہ بدوش اور آفاقی بن گئے اور جہاں کھانے پینے کو وافر مقدار میں پھل اور جانور بطور شکار ملے ادھر ہی اپنا ڈیرا ڈال لے۔ جب یہ اس طرح اپنا مقام بدلنے لگے اور اپنے قریبی عزیزوں ساتھیوں دوستوں سے بچھڑنے لگے تو اس امر کی ضرورت درپیش آئی کہ آپس میں کوئی رابطہ قائم رکھنے کے لئے کچھ علامات کچھ نقش اور کچھ تصویریں بنائی جائیں اور ان کے ذریعہ اپنا "مافی الضمیر" دوسروں کو سمجھایا جائے۔ محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے کھدائیوں میں جو نقوش نکلے ہیں وہ زیادہ تر مضحک اور کارٹون قسم کے ہیں اور یقیناً یہی کارٹون اور خاکے کی ابتدائی اشکال ہیں اور آج کا متمدن اور مہذب انسان بھی جب زیادہ موثر طریقہ پر کسی کے دل و دماغ پر کوئی بات مرتسم کرنا چاہتا ہے تو وہ بجائے اصل ماہیت اور ہو بہو شکل کی تصویر بنانے کے کچھ ادھورے خاکے بنانے کو پسند کرتا ہے۔ اگر کسی کی صورت پر تاثرات کو منعکس کرنا چاہتا ہے تو چہرہ نمایاں بنا کر ہاتھ پیر اور جسم کو الٹی سیدھی لکیروں سے ظاہر کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی شئے بتانا مقصود ہو تو ہاتھ کو اور

اس شئے کو نمایاں طور پر بتا کر چہرہ، شکل صورت سب کو مبہم سا بنا دیتے ہیں۔ کسی بات کا یا کسی واقعے کا مذاق اڑانا ہو تو اس کو بجائے تصویر کے روپ میں ظاہر کرنے کے کارٹون کی شکل میں بتاتے ہیں۔ کارٹون میں خوش مذاقی کے ساتھ کسی حد تک تضحیک کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس واقعے سے منسلک لوگوں کے سوا سب ہی محظوظ ہوتے ہیں لیکن متعلقہ افراد کی برہمی و خفگی یقینی ہوتی ہے۔ بالعموم کارٹون صورت حال، سیاسی الجھن، رفتار زمانہ اور وقتیہ گیرائی کو طنزیہ اور مزاحیہ طریقے پر ظاہر کرتے ہیں اور کبھی کبھی متعلقہ افراد پر بھرپور چوٹ ہوتی ہے ورنہ صرف چھیڑ چھاڑ ۔۔۔ رمز و کنایہ بھی ہوتا ہے کہ کسی نے سمجھا کسی نے نہیں سمجھا۔۔۔

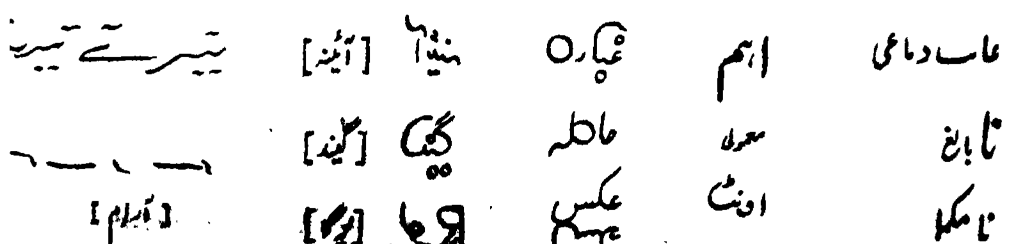
آج کل ہر اخبار اور ہر رسالہ میں دو ایک کارٹون ضرور ہوتے ہیں تاکہ علی الصبح اخبار بینوں کی خوش مزاجی کی حس اُجاگر ہو جائے اور وہ اپنا دن صبر و شکر اور اطمینان قلب کے ساتھ گزار سکیں اور زندگی کی تلخیوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔

الغرض کارٹون ایسی تصویریں اور اس طرح کے مرقع ہیں کہ جن میں اصلیت کی جھلک کو برقرار رکھ کر چلتے پھرتے کردار۔ وقوع پذیر ہونے والے سانحے۔ سیاسی و سماجی و اقتصادی حادثے۔ روزمرہ کی کٹھنائیاں، نفسیاتی چوٹیں، تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہونے والی باتیں ناقدانہ انداز میں تفنن کی چاشنی کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں اس طرح حواس باختہ کرنے والی خبریں شیریں حلاوت کے ساتھ دل و دماغ میں اترتی ہیں اور برے تاثرات جگہ نہیں پاتے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ تحریر کے بجائے تصویر کا سہارا لے کر دل پذیر انداز میں بہت ساری تلخ و تند باتیں بتائی جاتی ہیں۔

اصل نفس مضمون کی طرف رجوع ہوتے ہوئے یہاں پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ تحریر کی ابتداء سے پہلے انسانی دماغ نے کارٹونوں ہی کا سہارا لیا تھا جبکہ لفظوں اور حرفوں نے جنم نہیں لیا تھا۔ مسخ تصویر میں ہی دل و دماغ کے تاثرات کو آشکار کیا تھا۔

اب ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ لفظوں اور حرفوں کو تصویروں سے جوڑ دیا جائے تو اظہار کا ذریعہ اور بھی زیادہ موثر ہو سکتا ہے چنانچہ ہم نے ابتدائے آفرینش کے اس انسان کی ابتدائی مساعی کو پیش نظر رکھ کر الفاظ کی ایک ایسی لغت تیار کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن کے مفہوم و معانی کو ماثل یا دوسری زبان کے الفاظ سے سمجھانے کی قطعی ضرورت نہیں پیش آتی۔ لفظ خود بولتے اور معنی ہم پہنچاتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا اور اس قسم کی لغات زیادہ مبسوط تیار ہو جائے تو تعلیم بالغان بلکہ نابالغان بھی سہل ہو جائے۔ مثال کے طور پر چند لفظی شکلیں پیش ہیں اور ہمیں امید ہے کہ اگر اس سلسلہ کو جاری رکھا گیا تو بہت جلد ایک نئی لغت نئے رسم خط میں تیار ہو سکتی ہے۔



علامہ اقبال کی پیروڈی

ڈاکٹر سیّدہ جعفر، ریڈر شعبہ اردو - جامعہ عثمانیہ

بیسوی صدی اردو شاعری میں پیروڈی اور تحریف کے فن عروج کا زمانہ ہے۔ پیروڈی ظرافت کی وہ قسم ہے جس میں کسی شاعر یا ادیب کے مخصوص طرز ادا کی تقلید کر کے مزاحیہ تاثر کو ابھارا جاتا ہے یا اُسکے تفکر کی سنجیدگی کو ظرافت سے بدل دیا جاتا ہے یہ ایک طرح کی مضحک نقالی ہے جسے "تقلید خندہ آور" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ ہنسی کو برگساں زندگی کی تخلیقی قوت کا میکانکی مظاہر کے خلاف ردعمل کہتا ہے۔ پیروڈی کے فن کی اساس ان ہی میکانکی مظاہر سے بے تعلقی اور ان سے بلند ہونے کے تصور پر قائم ہے۔ پیروڈی ایک ایسا فنکارانہ تصرف ہے جس میں اصل تخلیق کے مرکزی تصور، فنکار کے تاثرات و نظریات، اس کی مخصوص لفظیات اور ابلاغ کے منفرد انداز کو پیروڈی کہنے والا اپنے ظریفانہ تصورات میں ڈھال کر انھیں نیا پیرہن عطا کرتا ہے۔ لیکن لب و لہجے کے تیور اور تخلیقی فنکار کی خاص لَے اور اسکے شخصی نغمے کو متغیر اور مسخ نہیں بنا دیتا تاکہ پیروڈی کے پردے میں اصل ادبی اکتساب کا جلوہ نظر آتا رہے اور متضاد مظاہر، ظرافت کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکیں جس طرح تصویری مزاح میں کارٹون اصل تصویر کی تحریف ہوتا ہے اور کارٹونسٹ اپنے خاکے میں اصل شخصیت کے حقیقی خدوخال سے بے اعتنائی نہیں برت سکتا۔ اسکی جسامت، تناسب یا قد و قامت کو بے ہنگم بنا کر انھیں مضحک اثر عطا کرتا ہے اسی طرح پیروڈی نگار اصل تخلیق کی ترتیب، لفظوں کے نظام اور بنیادی آہنگ میں تحریف کر کے اُسے نئی ترتیب اور نئے خیالات کے ساتھ پیش کر کے مزاحیہ عنصر کو ابھارتا ہے۔ پیروڈی یونان کے ذہین فنکاروں کی ایجاد ہے ارسطو نے اسکا ایک مخصوص آرٹ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ اور تھوسوس (THOSOS) کے ہیگی من (HEGEMAN) کے یہاں اسکی پہلی جھلک "دی بیٹل آف جائنٹس" (THE BATTLE OF GIANTS) کی نقل میں دیکھیے یونان سے نکل کر یہ فن یورپ کے دوسرے ملکوں میں پہنچا اور انگلستان میں اسکا آغاز نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی دور میں ہوا اسکے باوا آدم چاسر نے ازمنۂ وسطیٰ کی رومانی داستانوں کو مزاحیہ رنگ دے کر اس میں ایک نئی حقیقت پسندی اور معنویت کا اضافہ کیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے اردو میں پیروڈی کا فن

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے قدیم شعری سرمائے میں ایسے بہت سے اشعار مل جاتے ہیں جو ہم عصروں سے چشمک اور نوک جھونک یا ادبی معرکوں کی پیداوار ہیں لیکن اپنے حقیقی روپ میں مزاح نگاری کی یہ صنف بیسویں صدی کی دین ہے۔ ڈاکٹر جانسن (JOHNSON) نے اپنی ڈکشنری میں پیروڈی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پیروڈی تحریر کی وہ قسم ہے جس میں کسی فنکار کے الفاظ یا خیالات کو خفیف ردّ و بدل کے ساتھ ایک نئے موضوع میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جانسن نے اپنی اس تعریف میں مزاحیہ عنصر کو نظر انداز کر دیا ہے جو پیروڈی کی روح ہے۔ برلسک (BURLESQUE) میں اصل تصنیف کو نیا موضوع عطا کر کے اس کو دوبارہ اس ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں ظرافت کی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے دراصل کسی خاص ادبی تخلیق کی "تقلیب" ہے جس میں ترتیب کو نئے انداز سے سنوار کر سنجیدگی کو مزاح سے بدل دیا جاتا ہے اُردو کے اچھے مزاح نگار ابھی برلسک کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں اس لئے ظرافت کے اس طرز نے اردو میں ہنوز مستقل ادبی حیثیت حاصل نہیں کی ہے۔ شپلی نے "ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر" (DICTIONARY OF WORLD LITERATURE) میں پیروڈی کی تین قسمیں بتائی ہیں (۱) لفظی پیروڈی (VERBAL PARODY) جس میں اصل شعر یا عبارت میں محض ایک یا دو الفاظ کو بدل دینے سے پورا شعر یا تمام عبارت ظریفانہ رنگ میں ڈوب جاتی ہے (۲) طرزی پیروڈی (FORMAL PARODY) جس میں کسی شاعر یا ادیب کے مخصوص طرزِ ادا کو مزاحیہ موضوع میں صرف کیا جاتا ہے اور (۳) موضوعاتی (THEMATIC PARODY) جس کا دائرۂ اثر زیادہ وسیع معلوم ہوتا ہے۔ اس میں پیروڈی نگار فنکار کے اندازِ فکر، اس کے موضوعات اور مخصوص لفظیات کو مبدل بظرافت کر کے انھیں مزاحیہ مفہوم سے روشناس کرتا ہے۔

پیروڈی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ایسے شاعر یا ادیب کے کلام کا انتخاب کیا جائے جو مشہور و معروف ہو اور جس کا کلام زبان زد خاص و عام ہو تاکہ جب پیروڈی اصل سنجیدہ کلام کے بالمقابل لائی جائے تو موازنے اور مقابلے کے ذریعہ سے قاری اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے اور اس کا ذہن فوراً اصل نظم کی طرف رجوع ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں غالب اور اقبال پر سب سے زیادہ پیروڈیاں لکھی گئی ہیں۔ اُردو کے اکثر سربرآوردہ مزاح نگاروں نے اقبال کی شاعری کو اپنی پیروڈی کا موضوع بنایا ہے۔ شوکت تھانوی، عاشق محمد غوری، سید محمد جعفری، مجید لاہوری، غلام حسین میر کاشمیری، فرقت کاکوروی، دلاور فگار، راجہ مہدی علی خاں اور رضا نقوی واہی نے اقبال کی مقبول نظموں کی پیروڈی لکھ کر اُردو کی ظریفانہ شاعری کے سرمائے میں خوشگوار اضافہ کیا ہے نظم "شکوہ" بھی "ساقی نامہ" اور "مسجد قرطبہ" کی طرح اقبال کی ایک ایسی شعری تخلیق ہے جس نے بے پناہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اقبال کی نظم "شکوہ" میں شاعر خدا سے مخاطب ہو کر عرض حال کرتا ہے۔ دلاور فگار کی پیروڈی میں استاد اپنے ادارے کے سربراہ سے مخاطب ہے۔ دلاور فگار نے اپنی پیروڈی میں ایک استاد کی مشکلات بیان کی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اکثر اساتذہ کو اس بات کی شکایت ہوتی ہے کہ انھیں اپنی محنت کا معقول معاوضہ نہیں ملتا۔ استاد کہتا ہے :

کیوں غلط کار بنوں غرض فراموش رہوں　　　طعنے بیگم کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں

کیوں نہ تنخواہ طلب کر کے سبکدوش رہوں　　　ہم نوا میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آمیز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ تنخواہ کا خاکم بدہن ہے مجھ کو

آگیا عین پڑھائی میں جو قرضے کا خیال ماسٹر بھول گیا ماضی و مستقبل و حال
آگیا یاد کہ بھوکے ہیں میرے اہل و عیال کیسے ٹیگور و اسد کیسے کبیر و اقبال
گھٹے شبلی و خیام و ولی ایک ہوئے
ذہن افلاس میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ماچس لکھنوی نے بھی اسی نظم کی پیروڈی لکھی تھی اور ان کا خطاب اُن ذخیرہ اندوزوں، منافع خور سرمایہ داروں اور خود غرض مل کے مالکوں سے تھا جو محنت کش طبقے کا استحصال کرتے اور چور بازاری کے ذریعہ سے کالا دھن پیدا کر کے عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس پیروڈی میں شاعر نے شکر کی کمیابی اور راشن کی دوکانوں سے اس کی عدم دستیابی کے مسئلہ کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔

خاص درجہ کی مٹھاسوں میں تو مشہور ہیں ہم اب کے چٹنی سے مربے سے بھی مجبور ہیں ہم
مرثیاں لکھتے ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے شکر شکوۂ ارباب غذا بھی سن لے
تلخ کاموں سے ذرا اپنا گلہ بھی سن لے

ٹل نہ سکتے تھے جو ہم کھیت میں اڑ جاتے تھے پاؤں سب چوروں کے میداں سے اُکھڑ جاتے تھے
پاس آئے جو تیرے کوئی بگڑ جاتے تھے لاٹھیاں تان لیا کرتے تھے لڑ جاتے تھے
نقش اس طرح ہر اک دل پہ بٹھائے ہم نے
جان دے دے کے تیرے کھیت بچائے ہم نے

ماچس کے علاوہ سید محمد جعفری نے بھی "شکوہ" کی پیروڈی لکھی ہے جس میں انھوں نے وزیروں کی نماز کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ سید محمد جعفری کی پیروڈیاں محض تفریحی حیثیت کی حامل نہیں ہوتیں بلکہ ان میں معاشرتی زندگی کے نقائص اور کمزوریوں کا احساس بھی موجود ہوتا ہے۔ ان کے پیش نظر بلند اخلاقی معیار اور اعلیٰ تہذیبی قدریں ہیں جب موجودہ معاشرتی رجحانات سے وہ ان کا موازنہ کرتے ہیں تو انھیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اس لئے اصلاحی میلان ان کے ظریفانہ کلام کا ایک نمایاں وصف دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی پیروڈیوں میں سماج کے ناسوروں اور اخلاقی بے اعتدالیوں کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں۔ سید محمد جعفری نے اقبال کی نظم "شکوہ" کی پیروڈی میں جاہ پسندوں اور تصنع پرستوں کو اپنے طنز کا ہدف بنایا ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں

عید الضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہ کثیر جبکہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر
وہ مصلوں پہ مسلط تھے بہ حسن تقدیر تھے رعیت ان کے مصلّے پہ مساوات کبیر
آج کل ہے یہ نماز اور کبھی تھی وہ نماز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے — ساتھ لائے تھے مصلّے وہ بچھایا ہم نے
دور سے چہرہ وزیروں کو دکھایا ہم نے — ہر بڑے چھوٹے کو سینے سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
کون کہتا ہے کہ ہم لائق دربار نہیں

پیروڈی یونانی لفظ "پیروڈیا" سے مشتق ہے جس کے معنیٰ "نغمہ معکوس" کے ہیں۔ پیروڈیا ایسے گیت کو کہتے
ہیں جو کسی مقدس نغمے کی غیر معتدل حد تک بڑھی ہوئی سنجیدہ فضا اور اس کی پیدا کردہ خاموش متانت کے اثر کو زائل کرنے کے
لئے گایا جاتا ہے کیلس کی ادبی قاموس میں پیروڈی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ "حد سے متجاوز" سنجیدگی کے "سنگین جرم" کے خلاف
ایک اشارہ ہے۔ اقبال کے شعری کتابات میں ان کا خاص طرز (MANNERISM) ان کی مخصوص اصطلاحیں اور منفرد علائم ان
کے تعمق فکر اور فلسفیانہ متانت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں مرد مومن کا ایک خاص تصور پیش کیا ہے
یہ انسان کامل خودی کا پیکر اور جہد مسلسل کا ترجمان ہے وہ خودی کی ناقابل تسخیر قوت سے کام لے کر کائنات پر فتح حاصل کرتا ہے اور
اس آبجو سے "بحر بیکراں" پیدا کر کے رموز حیات اور اسرار کائنات کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ شوکت تھانوی نے مومن کو ایک
نئے رنگ میں پیش کیا ہے پیروڈی لکھنے والے شاعر کے تصورات و خیالات سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کی عظمت
کا منکر ہوتا ہے بلکہ اس کا مقصد "سنجیدہ نغمے" کے بجائے یونانی اصطلاح میں "نغمہ معکوس" پیش کرنا اور متانت کی گرانباری
کو ہلکا کر کے انبساط میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ دعوتِ فکر کے مقابلے میں دعوت تبسم دیتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظموں میں مرد مومن
کی پر عظمت شخصیت کی جن اعلیٰ و ارفع خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے انھیں ذہن میں رکھتے ہوئے شوکت تھانوی کے یہ اشعار
پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ اقبال کے فنی اور فکری مزاج کا بھرپور شعور رکھنے والا شاعر ہی ایسی پیروڈیاں لکھ سکتا ہے۔
اقبال کے مرد مومن کو ذہن میں رکھتے ہوئے شوکت تھانوی کے مرد مومن کی شان ملاحظہ فرمایئے۔

مومن دنیا میں

کمزور مقابل ہو تو فولاد ہے مومن — انگریز مقابل ہو تو اولاد ہے مومن
تہاری و غفاری و قدسی و جبروت — اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
ہو جنگ کا میدان تو اک طفل دبستاں — کالج میں اگر ہو تو پری زاد ہے مومن

مومن جنت میں

شکوہ ہے فرشتوں کو کم آمیز ہے مومن — حوروں کو شکایت ہے بہت تیز ہے مومن

یہاں قاری کا ذہن اقبال کے باوقار پرشکوہ اور سنجیدہ اسلوب کی گرفت سے اچانک اور غیر متوقع طور پر آزاد ہو کر تفریح و تفنن
کی ایک نئی فضا میں پہنچ جاتا ہے اور یہ سبکباری نفسیاتی طور پر نشاط آفریں ثابت ہوتی ہے۔
اقبال کی بہترین نظمیں اپنی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت کی وجہ سے پیروڈی لکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہیں اقبال
کا خطاب قوم کے مردوں سے تھا اور نذیر احمد نے عورتوں کے مسائل پر اپنی تخلیقات میں روشنی ڈالی ہے لیکن اقبال کے تخاطب کا انداز

بہت وسیع ہے۔ انھوں نے جہاں مردوں پر شاہین کی عظمت اور مردِ مومن کی با وقار اور حر کی شخصیت کا رمز آشکار کیا ہے وہیں عورتوں کو "زمرد کے گلوبند" اور "آزادیٔ نسواں" کی حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور قوم کی نوخیز نسل کو آدابِ زندگی سکھائے ہیں اقبال نے بچوں کے لئے جو معنیٰ خیز اور نصیحت آمیز نظمیں کہی ہیں ان میں "ہمدردی" "پرندے کی فریاد" اور "بچے کی دُعا" پر دلاور فگار نے طبع آزمائی کی ہے۔ اقبال کی نظم میں بچہ خدا سے دُعا کرتا ہے کہ وہ نیکی کے راستے پر گامزن رہے اس کی حیات صالح سماج کے لئے ایک ایسی شمع فروزاں ثابت ہو جس کی روشنی باطل کے اندھیرے پر خندہ زن رہے۔ دورِ جدید کے طالب علم کی دُعا ملاحظہ ہو :

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری زندگی کھیل میں غارت ہو خدایا میری
فلم میں میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے متوجہ میری جانب مدھوبالا ہو جائے
ہو مرا کام بزرگوں کو نصیحت کرنا سٹھ گئے ہیں جو بزرگ ان کی مرمت کرنا
میری بگڑی ہوئی تقدیر بنادے مالک نقل کرنے کی تو تدبیر بتادے مالک
مرے اللہ پڑھائی سے بچانا مجھ کو نیک جو راہ ہے نہ اُس راہ پہ چلانا مجھ کو

دلاور فگار ان چند مزاح نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو شاعری میں پیروڈی کی اہمیت منوائی ہے۔ انھوں نے اپنی سماجی بصیرت، زندگی کی ناہمواریوں کے احساس اور اپنے اخلاقی و تمدنی شعور کی مدد سے اُردو شاعری کو مزاح کا صحت مند اور قابلِ قدر سرمایہ عطا کیا ہے۔ ان کے کلام میں مسرّت انگیزی اور انبساط پروری کا احساس جاری و ساری نظر آتا ہے۔ "طالب علم کی دُعا" کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں :

زندگی ہو مری نوشاد کی صورت یارب فلم کی شمع سے ہے مجھ کو محبت یارب
علم کی دولت اندان میرے قابل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو عالم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کیا ہوا ذہن اگر کند و غبی رکھتا ہوں آگ ارمان کی سینے میں دبی رکھتا ہوں

اقبال نے اپنی ایک معرکۃ الآراء نظم میں فرمانِ خدا کی تشریح کی ہے۔ یہ نظم ان کے سماجی اور سیاسی نظریات کی غمازی کرتی ہے اور اس سے ان کی انسان دوستی، نادار طبقے سے ہمدردی اور مساوات پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ مجید لاہوری اور راجہ مہدی علی خاں نے اقبال کی اس بلند پایہ نظم کی اچھی پیروڈیاں لکھی ہیں اور اس کے عنوان میں بھی ردّ و بدل اور تصرف کیا ہے۔ مجید لاہوری کی پیروڈی کا عنوان "فرمانِ ابلیس" ہے۔ شیطان اپنے کارکنوں کو حکم دیتا ہے۔

اُٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو مٹا دو کاخِ امراء کے در و دیوار سجا دو
گرماؤ امیروں کا لہو دھکی درہم سے کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مٹی کے حرم سے میرے لئے مرمر کا محل اور بنا دو

پیروڈی کا اُسلوب کبھی پرشکوہ الفاظ اور غیر اہم معانی کے امتزاج سے بھی مزاحیہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے جیسے مضحک رزمیہ (MOCK HEROIC POETRY) تو کبھی کسی نظریئے یا فلسفے کے تضاد سے جیساکہ چسٹرٹن اور

برنارڈ شاہ نے کیا ہے یا پھر لفظی پیروڈی (VERBAL PARODY) کا حربہ استعمال کر کے ظرافت کے عنصر کو نمایاں کیا جاتا ہے لفظی پیروڈی کی اچھی مثالیں ہماری شاعری میں موجود ہیں۔ اصل تخلیق میں صرف دو تین لفظوں کے تغیر یا الٹ پھیر سے ایک نئے اور پُرمزاح معنیٰ پیدا کئے جاتے ہیں۔ لفظی پیروڈی کی قابل ذکر کوشش رضا نقوی واہی، مجید لاہوری، سید محمد جعفری اور راجہ مہدی علیخاں کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ مجید لاہوری کے کلام میں اقبال کی مذکورہ بالا نظم کے تین شعروں کی پیروڈی اسی نوعیت کی ایک نکاہی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سلطانیٔ فغفور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش نیا تم کو نظر آئے مٹادو
پھر خالق و مخلوق میں حائل ہیں پردے — پیران کلیسا کو کلیسا میں بٹھادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر ہوئی روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

محبوب مانجھوی نے "فرمان خدا فرشتوں سے" کی پیروڈی لکھی ہے اصل نظم میں خیالات کا تسلسل اور ربط موجود ہے اس کے برخلاف یہ پیروڈی غزل کے فارم میں لکھی گئی ہے اور اس کا ہر شعر انفرادی معنیٰ دیتا ہے جیسا کہ غزل کی فنی روایت کا تقاضہ ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

گر اپنی کمائی ہے تو پھر بنک میں رکھو — باوا کی کمائی ہے تو یاروں میں لٹا دو
میخانے میں دھوکے سے چلے آئے ہیں شاید — مسجد کا پتہ حضرت واعظ کو بتا دو
درویش ہوں اس دورِ ترقی کا میں لوگو — میرے لئے پکچر کی ٹکٹ کوئی منگا دو

اقبال نے اپنی ایک شعری تخلیق میں خدا سے دُعا کی ہے کہ "دلِ مسلم" کو وہ "زندہ تمنّا" عطا ہو جو اس کی "روح کو تڑپا دے" اور "قلب کو گرما دے"۔ بعض مزاحیہ شاعروں نے اس کی پیروڈی لکھی ہے۔ اسرار جامعی کی "لیڈر کی دُعا" اور رضا نقوی واہی کی پیروڈی "نئے لیڈر کی دُعا" میں اقبال کے بلند تخیل، ان کی فلسفیانہ سوجھ بوجھ اور تصورات کی سنجیدگی کو جب ہم ہلکے پھلکے، سبک اور شگفتہ خیالات کی صورت میں دیکھتے ہیں تو ذہن سنجیدہ تصورات کے دباؤ سے آزاد ہو کر ایک خوشگوار اچنبھے اور دلنواز تحیّر سے آشنا ہوتا ہے۔

گرد و پیش پھیلی ہوئی زندگی کے تضادات اور اس کے قابلِ گرفت پہلوؤں پر رضا نقوی واہی نے اپنے مخصوص انداز میں اچھی تنقیدیں کی ہیں۔ مذہب سیاست اخلاق اور ادب کے مختلف گوشوں تک ان کا ذہن پہنچا اور ان کی سطحیت اور کھوکھلا پن واہی کے طنز و مزاح کا ہدف بنتا ہے۔ انھوں نے ہماری معاشرت کی ریاکاری اور بد دیانتی کا پول کھولا ہے خانگی زندگی کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں اور حیات اجتماعی کے سنجیدہ مسائل میں لایعنی اور غیر معتدل عناصر کا نفوذ بڑھتا جا رہا ہے۔ واہی تہذیبی زندگی کی کجروی کو اس لئے مزاح کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں کہ کہیں ان کی بہتات حیات کی مثبت قدروں کو غیر معتبر اور سبک نہ بنا دے "نئے لیڈر کی دعا" میں رضا نقوی واہی نے اقبال کے گمبھیر فلسفیانہ خیالات اور ان کے بلند آہنگ طرزِ ادا کی کایا پلٹ دی ہے۔ نیا لیڈر بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں دُعا کرتا ہے ؎

بھگوان میرے دل کو وہ زندہ تمنّا دے — جو روح کو بھڑکا دے اور جیب کو گرما دے

دادیٔ سیاست کے اس ذرّے کو چمکا دے — اس خادم ادنیٰ کو ایک کرسیٔ اعلیٰ دے
تحریر میں چستی دے تقریر میں نرمی دے — جنتا کو جو پھسلا لے اور قوم کو بہکا دے
سکھلا دے مجھے داتا وہ رازِ جہاں بانی — قطرے سے جو دریا لے اور دریا کو قطرہ دے
قاتل کی طبیعت کو بسمل کی ادا سکھلا — خوں ریزی کے جذبے کو ہمدردی کا پردہ دے
کرسیٔ وزارت پہ اک جست میں چڑھ جاؤں — تدبیر کو پھرنے دے تقدیر کو چمکا دے

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے پیروڈی لکھنے والا شاعر اصل شعری تخلیق کی بحر اور اس کے مخصوص ردیف و قوافی کو برقرار رکھتے ہوئے متانت کو مبدل بہ ظرافت کر دیتا ہے اور اگر شاعر سنجیدگی کو اپنا شعار بنا کر کسی خاص فنکار کا تتبع کرتا ہے تو یہ محض نقالی ہوگی جس کی ادبی قدر و قیمت سے بحث کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر امین حزیں سیالکوٹی اقبالؔ کے طرز کلام کو اپنانے کے متمنی تھے۔ انھوں نے بلند آہنگ الفاظ، لہجے کی گونج، طرزِ ادا کے طمطراق اور لفظیات (DICTION) کی آن بان سے اقبال کے رنگِ سخن کی پیروی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فنی ذکاوت، ادبی بصیرت اور فطری اپج کی کمی نے انھیں ایک عظیم شاعر کے بجائے اقبالؔ کا مقلد اور خوشہ چین بنا دیا۔

علامہ حسین میر کاشمیری نے عبد المجید سالکؔ، اختر شیرانی اور اقبالؔ کی بعض نظموں کی اچھی پیروڈیاں لکھی ہیں وہ اصل شعری تخلیق کو پیشِ نظر رکھ کر نہ تو ردیف و قوافی میں زیادہ ردو بدل سے کام لیتے ہیں اور نہ نظم کے مجموعی آہنگ کو مجروح کرتے ہیں اُسی عروضی سانچے اور صوتی فضاء کو برقرار رکھتے ہوئے وہ موضوع میں ندرت اور تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ پروفیسر اعجاز حسین نے حسین کاشمیری کی پیروڈی نگاری کو سراہا ہے۔ انھوں نے اقبالؔ کی نظم "پرندے کی فریاد" کی کامیاب پیروڈی کہی ہے۔ اقبالؔ کی نظم میں پرندے کو قفس میں اپنا آشیانہ اور چمن یاد آتا ہے اور اپنے ہم نواؤں کی یاد اس کے دل کو تڑپا دیتی ہے تو میر حسین کاشمیری کی پیروڈی میں گذرے ہوئے ماہ و سال ایک لیڈر کے ذہن پر اس طرح ہتھوڑے برساتے ہیں۔

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ — وہ کانگریس کے چندے وہ سب کا مل کے کھانا
وہ آشرم کے بھوجن وہ سیر موٹروں کی — پھولوں سے لد کے آنا پھولوں سے لد کے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — وہ دیویوں میں مل کر بھارت کے گیت گانا

اچھا پیروڈی نگار اپنی "نقل" سے اصلاح کا کام لے سکتا ہے اگر وہ جذبۂ تحقیر کے زیرِ اثر اپنی نظم کو ہجویہ عنصر سے ملوث کر دے تو اس کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ ارسطو کا خیال ہے کہ انسانی فطرت میں نقالی کی صلاحیت ازلی ہے۔ پیروڈی کو انسانی جبلت کا ایک موثر اظہار انبساط پرور ادب ہے۔ بعض وقت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پیروڈی لکھنے والے شاعر میں ذاتی اپج جودتِ طبع اور انفرادیت کی کمی ہوتی ہے، پیروڈی نگار دوسروں کی طبع آزمائی کیے ہوئے موضوعات پر قناعت کرتا ہے اس لئے پیروڈی کو تخلیق کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تصور حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اردو میں ایسے بہت سے پیروڈی نگار ملیں گے جن کی ذہانت، ادبی صلاحیت اور تازگیٔ فکر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے فنکاروں کے تخلیقی سرمائے کو پیشِ نظر رکھ کر پیروڈی لکھنے والا اس کی من و عن نقل نہیں اتارتا بلکہ اس کے بنیادی تصورات اور خیالات کو ایک نئے زاویے سے

دیکھنے اور ان میں نئی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سنجیدہ موضوع سے مزاحیہ اسلوب کی طرف اس وقت کامیابی کے ساتھ ذہن منتقل ہو سکتا ہے جب نئے تصورات اور تازہ افکار اس کے جلو میں موجود ہوں۔

جواہر سیوانی کے سرمایہ کلام میں اقبال کے اشعار کی تحریفیں موجود ہیں۔ اقبال کی نظم "تصویرِ درد" کی پیروڈی "نقہ طرب" کے زیرِ عنوان منظرِ علم پر آئی ہے اس پیروڈی میں جواہر سیوانی نے اقبال کے استعمال کئے ہوئے ردیف و قوافی کو برقرار رکھتے ہوئے مزاحیہ فضا پیدا کی ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

نہ پلے پڑ سکا کچھ لالے کے نرگس کے کچھ اور گل کے
یہ انداز جدیدیت لکھی تھی داستاں میری

مزہ آ جائے یارب مجھ سے جب میں لوٹ کر آؤں
نہ دیکھے چشم کسٹم مال سے پُر پیٹیاں میری

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

گوپی ناتھ امن نے پیروڈی نگار کی حیثیت سے بھی خاص مقبولیت حاصل کرلی ہے انھوں نے اُردو کے اکثر نامور شعرا کے اشعار کی پیروڈیاں کہی ہیں۔ ان میں میر، سودا، غالب، داغ، اصغر گونڈوی، ہری چند اختر، اور اقبال بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کا مشہور "ترانۂ ہندی" ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

زبان زدِ خاص و عام ہو چکا ہے۔ یہ ترانہ اُردو کی اُن چند نظموں میں ہے جس نے ہندوستان کے ہر گوشے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ نظم اقبال کی حب الوطنی اور قوم پرستی کی ترجمان سمجھی جاتی ہے۔ گوپی ناتھ امن نے اپنی پیروڈی میں اُن مسائل کی نشان دہی کی ہے جن سے ہندوستان کا نچلا اور متوسط طبقہ روزمرہ زندگی میں دوچار ہے۔ رہائش کے مسائل، انتظام معاشی بدحالی اور اخلاقی قدروں کے تنزل کی طرف امن نے اس طرح اشارہ کیا ؎

بارش سے دب گیا ہے ٹوٹا مکاں ہمارا
آندھی کا منتظر ہے اب سائباں ہمارا

شغلِ شراب بھی ہے تنخواہ بھی ہے تھوڑی
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

پرنالہ نظم اپنی ان کا کلام دریا
اقبال سے جدا ہے طرزِ بیاں ہمارا

"ضربِ کلیم" کی ایک نظم "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" میں اقبال نے خودی کی پوشیدہ قوتوں کا رمز آشکار کیا ہے اس کو "تیغ فساں" سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

سید محمد جعفری نے اقبال کی اس نظم کی آڑ لے کر اپنے عہد کے ریاکار مذہبی پیشواؤں، لیڈروں اور حکومت کے کارکنوں پر چوٹ کی ہے اور ان کی خود غرضی، مفاد پرستی اور باطل پسندی کا مذاق اڑایا ہے۔

کہا ہے منہ سے تو ہاں لا الٰہ الا اللہ
نہیں عمل سے عیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

وہ مولوی ہیں جو کھلتے ہیں رات دن فکر
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

میں تجھ کو کہتا ہوں حاجی تو مجھ کو حاجی کہہ
فریب سود و زیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

نہ ضبط و نظم نہ ایماں نہ اتحاد عمل
نہ منزلوں کا نشاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

سید محمد جعفری کے مزاج میں پھکڑپن اور ابتذال کا شائبہ بھی نہیں ہے ان کی شاعری کے پیچھے جو ذہن کار فرما ہے وہ کسی ہنسوڑ پھبتی کا رسیا ذہن نہیں بلکہ ایک ایسے باشعور اور حساس شاعر کا ذہن ہے جو تہذیبی اقدار کی پامالی دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔

این یاسین ناشاد تحریف کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے "جنت کی آرزو" کے زیرِ عنوان اقبالؔ کی مشہور غزل ؎

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے　　نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

کی اچھی پیروڈی پیش کی ہے۔ روز مرہ زندگی کے چھوٹے بڑے اور تلخ و شیریں تجربات ناشاد کے مزاحیہ کلام کا موضوع بنتے اور تہذیبی زندگی کی ناہمواری کا احساس دلاتے ہیں۔ اقبالؔ کی مذکورہ بالا غزل کی پیروڈی کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

اخباروں کے مدیروں سے جو دوستی نہیں　　شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے
رقصاں ہے تیرے ساتھ جو بیگم رقیب کی　　بیگانہ شئے پہ نازشِ بیجا بھی چھوڑ دے

"بانگِ درا" میں اقبال کی ایک غزل نے جس کا مطلع ہے ؎

گلزارِ ہست و بود کو بیگانہ وار دیکھ　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ ناشادؔ نے اس غزل کی پیروڈی لکھی ہے اور اسے "بار بار دیکھ" کی سرخی سے مزین کیا ہے اور اقبالؔ کے عالمانہ تصورات کی گہرائی اور آفاقیت کو پُرلطف اور ہلکے پھلکے موضوعات سے بدل کر ظرافت پیدا کی ہے۔

اقبالؔ کے بعض اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں ان کا یہ شعر ؎

تیرا طریق امیری نہیں فقیری ہے　　خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

بھی اسی نوعیت کا ہے، مناظر عاشق نے تضمین کی صورت میں اس کی دلچسپ پیروڈی لکھی ہے۔ عاشق محمد غوری اردو کے ایک اچھے پیروڈی نگار ہیں انھوں نے بعض مشہور شعراء کی تخلیقات پر مزاحیہ انداز میں طبع آزمائی کرکے ہماری شاعری کو پیروڈی کے پُرلطف اور دلنشین نمونے عطا کئے ہیں۔ اقبالؔ نے ولیم کاپر کی نظم سے متاثر ہو کر بچوں کے لئے "بانگِ درا" میں ایک نظم "ہمدردی" لکھی تھی۔ اس نظم کی پیروڈی میں عاشق محمد غوری نے اصل نظم کے کرداروں کو یکسر بدل کر بھی مزاحیہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پیروڈی میں بلبل کی جگہ ملّا نے لے لی ہے اور جگنو کے بجائے اُلّو کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ملّا کو کھنڈر میں پریشان دیکھ کر اُلّو کا جذبۂ ہمدردی بیدار ہوتا ہے۔ اُلّو ملّا کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر اُسے شب بسری کے لئے اپنے گھونسلے میں جگہ دیتا ہے :

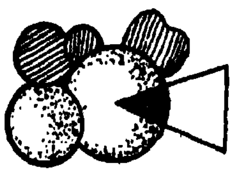
گوشے میں کسی کھنڈر کے تنہا　　ملّا تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی　　جوئیں چُننے میں دن گذارا
سُن کر ملّا کی آہ و زاری　　اُلّو کہیں پاس ہی سے بولا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری　　میں پیش یہ گھونسلہ کروں گا

اُردو شاعری میں پیروڈی کی ترقی کے اچھے امکانات موجود ہیں۔ پیروڈی محض وقتی تفریح و تفنن کی چیز نہیں ہے۔ وہ ادبی اکتسابات کی بیزارکن یکرنگی ان کے یک سُرے پن اور تھکا دینے والی یکسانیت کی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے ادبی شعور کو تازگی عطا کرتی ہے بقول میگڈوگل ظرافت بے راہروی کو اعتدال پر لاکر زندگی کو توازن اور توانائی عطا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے، ظرافت ایک طرح کی شفقت آمیز تنقید ہوتی ہے جو فہم کا احتساب کرتی اور زندگی کی کجروی اور ناہمواری کا احساس دلا کر ہماری سماجی بصیرت کو جلا بخشتی اور اخلاقی شعور کو بیدار کرتی ہے۔ پیروڈی میں ناگوار طنز اور تخریب کے عناصر کار فرما نہیں ہوتے۔ یہ دل آزاری کے بجائے دل لگی اور دل نوازی کا فن ہے اس کا طنز ہلکا اور گوارہ ہوتا ہے اور جس کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے وہ اس کے وار سے مضطرب نہیں متبسم ہوتا ہے۔ ▼▼

(۱)

ہائے میرا یار مرگیا، لنگوٹیا تو نہ تھا لیکن لنگوٹیے سے کم بھی نہ تھا۔ لکھنا' لکھانا تو بہت بعد میں شروع کیا تھا۔ اس سے کافی پہلے سے وہ ہمارا دوست تھا۔ لکھنؤ، بھوپال کے علاوہ اِدھر اُدھر بھی ٹکرا جاتا' ورنہ اس کے خط چلتے۔ ڈاک بٹھا دیتا ہم خط کے شروع سے چور اور وہ ادھار کھائے بیٹھا رہتا۔ ادھر خط لکھا اور چڑھا چھان کر سودے، شروع قلم کا ڈنڈا۔ جوش کی طرح خط کے پتے ہی سے بے تکلفی بلکہ ماں' بہن شروع۔ ان گالیوں میں کس قدر شیرینی' محبت اور خفگی ہوتی۔ غرض کبھی جواب الجواب کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ خط کیا بم کا گولہ ہوتا۔ جس طرح مولوی نذیر احمد اپنے بچوں' بچیوں سے گلستاں کے صفحے چھپاتے اسی طرح ہم ان کے مادرزاد خط گھر بھر سے چھپاتے پھرتے۔ ہوا یوں کہ ایک دن جو گھر میں گھسے تو والد صاحب جو غلصے جلالی بزرگ تھے' انھوں نے ایک خط ہمیں تھماتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔ "لاحول ولاقوۃ!" لفافہ دیکھ کر ہم نہ صرف خط کا مضمون بھانپ گئے بلکہ کانپ گئے۔ احتیاطاً بتائے دیتے ہیں کہ یہ خط ہمارے شجرۂ نسب سے شروع کیا گیا تھا اور ہر قسم کے انکشافات کے بعد وارد ہونے کی دھمکی دی گئی تھی۔ جب انھیں اسٹیشن سے گھر لائے تو ملازم نے آکر مژدہ سنایا کہ "والد صاحب آپ دونوں کا کھانے پر انتظار کر رہے ہیں"۔ گویا والد صاحب ہم پر گرم تو ہوئے تھے مگر مہمان کی آمد سے نہ صرف واقف بلکہ ملاقات کے مشتاق و منتظر تھے۔ کھانے میں تخلص نے غالباً اس لئے شرافت برتی کہ بزرگ ان کی کمزوری تھے۔ یہی کمزوری بعد میں اصلاح و نجات کا ذریعہ بن گئی۔ بعد میں والد صاحب کے بارے میں ان سے پوچھا: "والد صاحب سے مل کر آپ نے کیا محسوس کیا" تو بولے: "یار پہلے یہ تو بتا دو کہ تم دونوں میں باپ کون تھا؟"

احمد جمال پاشا



پوسٹ مارٹم رپورٹ

بڑے ڈیل ڈول اور سنتے مچھتے کے تھے۔ ہم بالکل دھان پان سیک سلائی۔ اِن سے ڈرتے اس لئے کہ بات چیت، ہنسی مذاق میں ہاتھ پیر بہت پھینکتے۔ بلکہ اکثر ہمیں اٹھا کر پھینکنے کی کوشش کرتے۔ جسمانی تشدد کی دھمکی کے ساتھ صحت بنانے پر زور دیتے، فوجی زندگی کے کارنامے سنا کر جوش دلاتے۔ ترنگ میں ہوتے تو بالکل قابو کے باہر ہو جاتے۔ مگر کوئی جملہ ایسا سر کر دیتے کہ پھڑک اٹھتا۔ ایک دن نیلم جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ بولے :

"چپ کیوں ہو؟ کچھ تو بولو۔ سر سے کھیلو!" عرض کیا:

"آپ کی زبان جو قینچی کی طرح چل رہی ہے، اس کے آگے میری کیا چلے گی؟" بولے :

"وہ تو چلے گی! میاں درزی ہوں! درزی کی قینچی نہیں چلے گی تو کس کی چلے گی۔"

ایسے ہی ایک دفعہ اِن کی افغانیت اور پٹھانیت نے مل کر جوش مارا تو میرا ہاتھ دبا کر بولے :

"اس کو طاقت کہتے ہیں طاقت!" ہاتھ کچھ اس زور سے دبا کہ میرے آنسو آگئے۔ روہانسا ہو کر کہنے لگا :

"ارے یار! چھوڑ بھی دو! ہڈی دبی جا رہی ہے....!" بولے

"تو کیا ہوا؟ ہڈی پیسنا تو میرا کام ہی ہے۔ کر دوں سرمہ؟ بہت عمدہ کھاد ہو گی تمہاری!" آنسو دیکھ کر انھیں اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ تھے بڑے رقیق القلب، اپنی گردن بڑھاتے ہوئے بولے :

"یہ میرے جسم کا سب سے ملائم حصّہ ہے۔ بس تم اب میرا ٹینٹوا دبا دو۔"

اور میں بے اختیار ہنس دیا۔

ایک زمانے میں انھوں نے "موٹر پارٹس" کا کاروبار شروع کیا۔ بس اب خط پر خط چلے آ رہے ہیں :

"موٹر کا شوق ہو تو پارٹس بیچنا شروع کر دوں؟"

"پولٹری فارم" کیا تو خط اور مذاق میں ساری رعائتیں مرغی، انڈوں پر صرف ہونے لگیں۔ اِدھر جواب میں دیر ہوئی اور تحقیقات شروع :

"انڈے دلوا رہے ہو؟ کیا انڈوں پہ ہو؟ پَر جھاڑ رہے ہو؟ کب تک کڑک رہو گے؟ مختصر......

مرغا لنڈورا ہی بھلا۔ جو جو مرغی موٹی، وہ وہ دُم چھوٹی۔!" میں نے پوچھا :

"اِدھر کچھ لکھ وکھ نہیں رہے ہو؟ بہت دن سے کچھ نظر سے نہیں گزرا...!" بولے :

"میاں! مرغا نہ بولے تو سحر ہو گی؟ آپ کیوں خالی خولی کڑکڑا رہے ہیں۔ آپ ہی کوئی ادب کا انڈا دے دیجئے۔"

ایک دفعہ لکھا :

"مرغوں کو دیکھ کر ایک اور غلطی کرنے کا دل چاہتا ہے۔" پھر لکھا :

"کسی بھی مرغا کو دیکھ کر شرما جاتا ہوں.... ارے یہ تیتی صاحب حرم ہیں اور ہم مسٹنڈے نکھٹو۔ بس ایک ہی پر شٹروں لڑں!"

نہ تو میں اس کا مطلب سمجھا اور نہ جواب میں اِس پر روشنی ڈالی کہ خط آ گیا....

"یا تماشا خان..... تمہارے تماشا خان ایک جوڑ مول لے آئے۔ اب ہم بھی کسی مرغی والے سے کم نہیں۔ ہمارے ڈربے میں اب دو مرغیاں ہو گئیں۔"

اس کے بعد ہم پر کچھ لعنت ملامت تھی۔

"اگر دنیا میں کچھ نہ کر سکو تو کم از کم اس معاملہ میں ہماری تقلید ہی کر دو۔"

تخلص نے مذاق ہی مذاق میں بیٹھے بٹھائے ایک شادی اور کر ڈالی۔ وہ بھی اس زمانے میں جب وہ جوانی کی سرحد پار کر چکے تھے۔ کچھ مرغِ مسلّم اور انڈوں کی کثرت، کچھ بڑھاپے میں جوانی کے چونچلوں نے میرے یار پر ایک دم سے بڑھاپا طاری کر دیا۔ پہلے ان پر دل کا دورہ پڑا پھر نقاہت نے ڈیرے ڈال دیئے۔

تخلص نے بڑی رنگین جوانی گزاری تھی۔ بس ایک طوفانِ کیف و مستی تھا۔ پھر جو ڈھیلے پڑے تو پہلا دورہ قوم کا پڑا۔ "اہلِ قوم" کے لئے "بھوپال ہیرلڈ" بڑی آب و تاب سے نکالا۔ دوسرا دورہ اصلاح کا تھا۔ مولانا محمد عمران خان ندوی کا فیضِ صحبت تھا کہ "تاج المساجد" پر بھی "احمد برادرز" کا نام چمکنے لگا۔

رائے بریلی گئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مبارک ہاتھوں پر بیعت کی۔ مولانا منظور نعمانی، مولانا سید محمد الحسنی ندوی، مولانا رابع میاں، مولانا عبدالسلام قدوائی، مولانا اسحٰق جلیس کی خدمت میں حاضری شروع ہو گئی۔ ندوے کا نورانی ماحول۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، نسیم امروہوی اور قاضی عدیل عباسی جیسے اکابرینِ ملت کا حلقہ۔ غرض دنیا ہی بدل گئی میرے یار کی۔

حیدرآباد مزاح نگاروں کی کانفرنس میں تخلص اور فرقت ایک ہی کمرے میں اور ایک کمرہ چھوڑ کر میں اور سردار جعفری سالکے تھے۔ تخلص نے بلوا کر معذرت کرتے ہوئے کہا:

"مریضِ دل ہوں۔ نقل و حرکت سے معذور۔ ہر امپیریل بھجّی سے اجازت لے کر دیکھ جایا کرو۔" ہم نے مذاقاً پوچھا:

"بیماری کا ثبوت؟" موصوف نے بیڈ کے نیچے سے سیب کی پیٹی کھسکا کر دکھلاتے ہوئے کہا:

"دل کی بیماری میں ڈاکٹر سیب سے پرہیز ختم کرا دیتے ہیں۔"

بغل میں جھولا تھا۔ فرقت ناک میں منمناتے رہ گئے۔ ہم نے چھانٹ کر کئی اچھے سیب جھولے میں ڈالے اور ایک سیب چکھتے ہوئے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر عیادت سے زیادہ سیبوں میں دلچسپی لی۔ پھر جو آکر سیب اٹھائے تو انھوں نے پوچھا:

"ویل تم بھی ڈِل کا مریض ہے؟" ہم نے کہا:

"یس۔" بولے:

"زحمت نہ کیجئے گا۔ بازار سے سیب منگوا لیجئے۔ اب میں خود آپ کی عیادت کے لئے آؤں گا۔"

بھوپال میں انھوں نے مزاح نگاروں کی کانفرنس برپا کی۔ سب اپنے جمع ہو گئے۔ سلیمان خطیب، یوسف ناظم، مصطفٰی... مجتبیٰ حسین، وجاہت علی سندیلوی۔ ہم دونوں تخلص کے گھر پہنچے۔ موصوف نے بڑی خاطریں کیں۔ گھر میں علم، دیمک، بیویاں، داماد ـــ سب کچھ تھے۔ مگر خود بہت ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ وہی زندہ دلی مگر دواؤں کے ساتھ، قہقہے مگر تنفس کے ساتھ۔ خوب بھوپال کی سیر کروائی۔ ہمارے پرانے دوست پروفیسر آفاق احمد بھی ساتھ تھے۔ کبھی بھوپال کی تاریخ بولتی کبھی جغرافیہ۔ ہم ڈاکٹر...... صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کے عاشق جو ٹھیرے مگر وہ تھے کہ مُصر:

"بڑے خشک ہیں! مار کر بھگا دیں گے۔" آخری یہ حیلہ یہ تھا کہ:

"جیب میں پٹرول بہت کم ہے۔" ہم ٹیکسی کرنے لگے، لیکن انھوں نے روک دیا۔ معلوم نہیں کیوں ان کی رگ اس وقت ٹیڑھی تھی۔ تھے بڑے بھولے بھالے۔ ایک دفعہ کہنے لگے:

[illegible]

میں نے کہا : "ارے یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ملک کے آپ ممتاز و مایہ ناز طنز نگار ہیں۔ رشید صاحب آپ کے مداح ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" تمتمی پھلا کر بولے :

"یوں تو ایک سے ایک بڑا آدمی میرا یار ہے' مگر رشید صاحب سُنا ہے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ اگر گٹ آؤٹ کر دیا تو ..... ؟" میں نے کہا :

"حضور آپ نے بالکل غلط سنا ہے۔ آپ بسم اللہ تو کیجئے' فوراً "گٹ اِن" ہو جائیں گے۔"

دراصل "ناک پر مکھی" سے بے حد بھڑکتے تھے۔ مزاج میں بے حد خاکساری تھی۔ اسی کی دوسروں سے توقع بھی کرتے تھے۔

(۲)

خاکساری ہی تھی کہ انھوں نے بڑی تیاری کی۔ کہ ہم ان پر لکھیں۔ پہلے انھوں نے "پوسٹ مارٹم" کے تحت ہمارا خاکہ لکھا..... پھر دادطلب خطوط کا تانتا باندھ کر ہم سے داد وصول کی۔ ہر خط میں لکھتے :

"کہو .. کیسی درگت بنائی تمہاری .... کارٹون پسند آیا ؟ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی... ! اچھا اب تم ہم پر لکھو ..... !"

ہدایت نامے شروع ہو گئے :

"کنھیا لال کپور سے ذرا دبتا ہوا ہو۔ رشید احمد صدیقی اور تخلص کی نسل الگ الگ دکھانا۔ وہ ٹھہرے پرانی نسل کے اور ہم نئی نسل کے۔ وہ .... ہیں' ہم مرغِ اصیل ہیں۔ اُن کے یہاں چنیں وچناں بہت ہے ..... ہم سامنے سے طنز کا وار کرتے ہیں۔ پٹھان ہیں پٹھان۔ باطل سے دبنے والے .... نہیں۔ وہ شریف .... ہم ننگے' ہاں قلم مزی کا ذکر ضرور کرنا۔ پھر ہو جائے ..... موازنہ رشید احمد صدیقی اور تخلص بھوپالی ..... !"

ہم نے لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ انھوں نے رجسٹری سے "بھوپال پنچ" کی جلدیں بھیج دیں۔

اُن کے فائلیں بھیجنے کا ہم پر اس لئے چنداں اثر نہ ہوا کہ فائلیں ہمارے پاس پہلے سے موجود تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ ٹلتا رہا۔ تخلص نے ایک سال صبر کیا۔ دو سال' اس کے بعد تیسرا سال اور پٹھان کا افغانی جلال شروع ہوا۔ دو ایک چکر لکھنؤ کے دس بیس خطوط مگر یہاں جواب دینے کی عادت نہیں۔ اب پڑتی شروع ہو گئیں گالیاں۔ مگر ادھر سے وہی خاموشی۔ خط لکھ کر پوچھا :

"کس مٹی کے بنے ہو ؟"

پھر ایک مشترک دوست کو بیچ میں ڈال کر' بڑی حکمت عملی سے "فائلیں واپس منگا لیں۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈے پڑ گئے۔

ایک دن اچانک نازل ہو گئے۔ ہم اس حملہ کے لئے تیار نہ تھے۔ چھوٹتے ہی پوچھا :

"مجھ پر مضمون" میں نے کہا :

"یار معاملہ یہ ہے کہ تم پر صرف ایک مضمون لکھنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ میرا ارادہ اب تم پر ایک پوری کتاب لکھنے کا ہے۔ "تخلص بھوپالی — شخصیت' فن اور فتوحات' ...." بولے :

"بس خوش ہو گئے ! ہو گئے خوش ! مگر بات یہ ہے کہ تم لوگ ...... ہو مردہ پرست۔ لکھ گئے کتاب نہیں لکھتا ہیں۔ مگر ہمارے مرحوم ہونے کے بعد — بھلا دیکھیں تو کتاب کی تیاری ..... !"

ہمارے پاس مرحوم اپنی سب کتابیں، اخبار اور کتاب کا خاکہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے :

"میاں ! ایک مضمون لکھ دو ..... مسلمان ہوں، عاقبت بخشوانے کے لئے زادِ آخرت ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ یہ منٹو اور کنگ رسیی جنت میں بھی نہ جینے دیں گے۔ بلا تمہارے سرٹیفکٹ اور تعاون کے طنز نگار تک ماننے سے انکار کر دیں گے پھر اپنا تم کتابیں لکھتے رہنا۔"

ہم نے وعدہ کر لیا۔ وہ چلے گئے۔ پھر دنیا سے بھی چلے گئے۔ مگر وعدہ وفا نہ ہوا۔ کتاب کا خاکہ جوں کا توں ہے نیت اب بھی سالم اور ارادہ مصمم ہے۔ یہی مضمون سترہ اٹھارہ سال پہلے لکھا جا سکتا تھا۔ اور لکھا بھی ایک نشست میں۔ عجب شرمندگی سی ہے، شائد کتاب لکھنے پر دور ہو جائے۔

(۳)

تخلص بھوپالی ہم عصر مزاح نگاروں میں بڑے معروف و مقبول تھے۔ وہ ہمارے طنزیہ ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں، جیسے جیسے ان کے کارناموں کی پرکھ ہوتی جائے گی۔ تاریخ ظرافت کے صفحات پر اُن کا نام ابھرتا جائے گا۔

تخلص بھوپالی سماج اور قوم کے بے لاگ ترجمان تھے۔ آخر دم تک وہ سماجی اور اقلیتی حقوق کے لئے آواز بلند کرتے رہے۔

تخلص بھوپالی نے بامعنیٰ و بامقصد طنز کے وسیلہ سے سماج اور قوم کو آئینہ دکھا کر اس کی خامیوں اور کمزوریوں سے خبردار کرنے کا فرض انجام دیا۔

تخلص بھوپالی نے بے حد شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ وہ زندگی اور زندہ دلی کی مجسم تصویر تھے۔ محض ہنسوڑ نہ تھے، دلِ دردمند بھی رکھتے تھے۔ ان میں طنز و تحریف کا مادہ خداداد تھا۔ ان کی ظرافت ہنسنے ہنسانے تک محدود نہ تھی۔ اس سے انھوں نے تنگ نظری، علاقہ پرستی، کنبہ پروری، سیاسی بدعنوانیوں، ہر قسم کی عصبیت، جہالت اور عدم توازن پر طنز کے ذریعہ اصلاح کا مقدس فرض انجام دیا۔

تخلص بھوپالی کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں سماج کے تمام قابلِ ذکر پہلو آ جاتے ہیں گلی اور سڑک کے عام آدمی سے لے کر علماء اور مشاہیر تک اِن کا دائرہ احباب وسیع تھا۔ وہ زندگی کی بھیڑ بھاڑ اور چہل پہل کے ہر گوشہ میں قہقہے لگاتے نظر آ جاتے۔ ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ اپنے معاشرہ میں ان کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے انھیں کسی ادبی، ادبی معاشی، ادبی مذہبی، ادبی علاقائی گروہ بندی، ادبی تحریک یا رجحان کا سہارا نہیں لینا پڑا۔ وہ بے جڑ کے پودے نہ تھے۔ ان کا سیاسی اور سماجی شعور بہت گہرا اور واضح تھا۔

تخلص بھوپالی کے انتقال سے مزاح نگاروں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور علماء میں ایک کہرام مچ گیا۔ ہندوستان، پاکستان میں کتنے ہی تعزیتی جلسے ہوئے، ایصال ثواب کیا گیا۔ بیرونِ ملک سے جو خطوط موصول ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غم کی یہ لہر ملکوں ملکوں پھیل گئی، جس کے اتنے چاہنے والے ہوں لاریب وہ جنتی ہوا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی، جن کے دنیا میں پڑھنے والوں کی اور عقیدت مندوں کی تعداد مختلف زبانوں میں کروڑوں سے بھی زائد ہے۔ انھوں نے اپنے تعزیتی خط میں فرمایا :

"کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کان ان (تخلص) کی خیریت کے سوا کوئی اور خبر سنیں گے ..... اور جو روتوں کو اپنی باتوں سے ہنساتا تھا اور جس کے قلم نے ہمیشہ ظرافت و لطافت کے پھول کھلائے اس پر خود آنسو بہانا پڑیں گے.. ..... بہ حیثیت ادیب اور مزاح نگار کے لوگ ان پر بہت کچھ لکھیں گے لیکن میں تو ان کے خلوص اور ان کی محبت اور ان

کی اس شرافتِ نفس سے متاثر اور اس کا عقیدت مند ہوں جو اب اس خود غرض اور مادّیت کے دور میں خال خال نظر آتی ہے اور جو ...... خدا کی دین ہوتی ہے۔

.... زمانہ آئے گا جب لوگ ان کی ادبی قدر و منزلت سے آشنا ہوں گے۔ ان پر مضامین اور کتابیں لکھی جائیں گی، انصاف کیا جائے گا۔"

یہ تھی شان میرے یار کی کہ مرکر بھی سربلند ہوا۔ مولانا علی میاں نے جن الفاظ سے نوازا۔ ایسی عزت افزائی شاید ہی کسی طنز نگار کی مرکر بھی ہوئی ہو۔ ایک عالمی ادیب تک نے محسوس کیا کہ مرحوم کے ساتھ اہلِ نقد نے انصاف نہیں کیا۔ انصاف کا مطالبہ ہے، جسے اہلِ نقد اب تو پورا کریں۔

(۴)

تخلص بھوپالی کا "بھوپال پنچ" اردو کی مزاحیہ صحافت میں ان کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

"بھوپال پنچ" اردو کے پنچ اخبارات میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" کے اجرا سے ۱۹۶۰ء تک پنچ اخبارات نے مزاحیہ صحافت کے فن میں کتنی ترقی کی، اس کی بہترین مثال "بھوپال پنچ" ہے، جس میں ارتقا کے نقوش بہت واضح ہیں۔

"بھوپال پنچ" سرزمین بھوپال سے یکم جنوری ۱۹۶۰ء سے ۴ نومبر ۱۹۶۲ء تک پورے دو سال دس ماہ ایک ہفتہ تک باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ اپنے قہقہوں سے اردو دنیا میں گونجتا رہا۔

"بھوپال پنچ" چار صفحات کا ہفتہ وار اخبار تھا۔ یہ جدید طرز کا پہلا باقاعدہ اخبار تھا۔ اس میں مستقل عنوانات کے کالم، ممتاز مزاح نگاروں کی نظم و نثر کی تخلیقات، کارٹون، لطیفے اور مزاحیہ اعلانات و اشتہارات ہوتے۔

شذرات میں، مسائلِ حاضرہ میں عدم دلچسپی پر طنز کر کے بے اعتدالیوں اور عدم توازن کو نشانہ بنایا جاتا، کچھ عنوانات ملاحظہ ہوں:

"خونِ ناحق، انسدادِ تعلیم گردی، نیکی کر دریا میں ڈال، خلق خدا کی۔ سلطنت بادشاہ کی۔ حکم کمپنی بہادر کا، یا رب بخش دے ان غلاموں کو، پہلے بیک ڈکاریں، کیا حکومت کرنا بھی پیدائشی حق ہے؟ عوام اور کانگریس کے درمیان دیوار چین، ڈنگے اور دنگے، کھجور اور برگد کا جھگڑا، سرکاری ارلڈ برائز، کانگریس کے گنگ، مرنجیا قانون، شارٹ کٹ دعا، مسلم کوہ قاف، گنگ رلیسی، کانگریس الملوکی، میں مر جاؤں یا کانگریس کہتے کہتے، الجیریا نے فرانس کو آزادی عطا کی۔"

"پوسٹ مارٹم" کے کالم میں بھوپال کی اہم شخصیات کے خاکے ہوتے:

"کیف بھوپالی، جوہر قریشی، حکیم سید قمر الحسن، باسط بھوپالی، حاجی عیسیٰ بھائی....."

"پان دان" .... کے عنوان سے پاندان والی خالہ ہوتیں ..... تخلص کے قلم کی جلوہ گری تھی، جس نے خالہ کو اردو ادب کا ایک سدا بہار مزاحیہ کردار بنا دیا۔

"پنچ کی ریسرچ لیبورٹری سے" میں ہر قسم کی سیاسی، مذہبی بدعنوانیوں، تعصب، تنگ نظری اور سماجی ناہمواریوں کو تحقیق کے ساتھ بے نقاب کیا جاتا۔

"اور نرمدا بہتی رہی...." مستقل کالم تھا جس میں حالاتِ حاضرہ پر علامہ ڈھیمر دلچسپ اور تیکھے انداز میں تبصرے کرتے۔ اس کالم کو کچھ دن نادم سیتاپوری نے بھی چلایا تھا:

"اس سال مولانا آزاد میڈیکل کالج میں ۴۵ لڑکوں کا داخلہ ہوا جس میں ایک مسلمان ہے!" — یہ بھی مولانا کا کوئی

عزیز ہی ہوگا۔

"لکھنو۔ یوپی کابینہ کے سابق وزراء کا جلسہ۔"

...... جو بکرے نے مارا بت بکری کے سینگ
تو بکری بھی مارے گی بکرے کے سینگ

"ڈاکٹر...... دیہات کا رخ کریں۔"

.... تو کیا نرسیں بھی ساتھ جائیں گی۔

"بے غسل وکفن" کا مستقل کالم علامہ گورکن لکھتے۔ سوال و جواب کی آڑ میں معاشرتی بے ہنگم پن پر سے وے کرتے۔

سوال: آپ کے بھوپال میں اردو کا کیا حال ہے؟

جواب: زبانوں پر تو اردو ہی کا راج ہے، جس کا تحریری کوئی ثبوت نہیں۔"

"غفور میاں" کا مزاحیہ کالم مستقل تھا۔ جس میں تخلص کے دوسرے لازوال مزاحیہ کردار "غفور میاں" یا بھوپال کے "خان چلی" نے جنم لیا۔

دنیا کا کوئی ایسا معاملہ نہیں، جس میں غفور میاں ٹانگ اڑاتے نظر نہ آئیں۔

"غفور میاں نے بات ٹھہرائی، غفور میاں نے روزہ رکھا، غفور میاں کسی کے انتظار میں، غفور میاں الکشن میں ووٹ ڈلوائیں گے، غفور میاں محلے کے وڈڑوں پر عذاب"

"پرپنچ کی ڈکشنری"...... میں لفظ کے استعمال اور معنی کی تحریف سے ایسے ایسے پہلو پیدا کئے جاتے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے۔

"ر رشوت رشوت ... سائڈ بزنس، رباعی ... معروف شاعر کا مختصر کلام
رویت ہلال ... ۲۹۔۳۰ کی کھینچا تانی فری ... شرم دان فوراً ... تاخیر
زن، زر، زمین ... نیتاؤں کے بی سینہ جات قاصر ... قصر میں رہنے سے مجبور
قافلہ سالار ... قافلہ پر سوار رہنے والا قوّال ... جن کے دم سے مزار باقی ہیں
کاپی رائٹ ... امتحان میں حرف بہ حرف نقل کرنا کورٹ شپ ... شادی کا ریہرسل

"بھوپال پنچ" میں بڑے دلچسپ اعلانات ہوتے:

"مردم شماری کے وقت
اپنی مادری زبان کے خانہ میں
صرف یہ لکھو ایئے
"ہے"

(دکھیوں سے بچنے کا نسخہ) "آج کل منہ پر خالی پیپر لگا کر قہقہہ لگائیے ......"

"ماہ صیام آرہا ہے، مسلم ہوٹلوں کے مالکان کو چاہیئے کہ ابھی سے ...... پچھلے پردے ٹاٹوں کا انتظام کرلیں، تا کہ بے روزہ داروں کی بے حرمتی نہ ہو۔"

"یاد رکھئے! مسلم ہوٹلوں میں ہمہ وقت افطار اور پردہ کا معقول انتظام رہتا ہے۔"

• بے روزہ دار درزیوں سے
تقاضے شروع کر دیں عید سر پہ
آپہونچی "

• تلاش گمشدہ
"حمد جمال پاشا ایڈیٹر اودھ پنچ عرصہ ڈیڑھ ماہ سے
لاپتہ ہیں ' حلیہ یہ ہے :
جوان العمر ' گورا رنگ ' میانہ قد ' باتیں کرتے وقت
'کنہیا لال کپور نمبر ' کا ذکر زیادہ کرتے ہیں ۔ جن صاحب کو ملیں
براہ کرم سمجھا بجھا کر گھر جانے کی ہدایت فرمائیں ' اعزا سخت پریشان ہیں ۔"

• قوم یتیم کی مانگ
مسلم وقف بورڈ برائے مدھیہ پردیش جلد از جلد عوام کے سامنے
اپنے حسابات پیش کرے ۔"

• مدکیں کمیشن دلواؤگے ؟
اگر کچھ مسلمانوں کو حج بیت اللہ کی زیارت کرنے کے لئے کسی طرح ہموار
کر لیا جائے اور پھر ان کو کسی متعلقہ حج کمیٹی کو سپلائی کر دیا جائے تو خاکسار کو کیا
کمیشن ملے گا .... خط وکتابت انتہائی صیغۂ راز میں رہے گی ۔ (منیجر حجاج سپلائی اینڈ کو)

بھوپال پنچ کے اشتہارات بھی بڑے دلچسپ ہوتے :
• فتح گڑھ کی خوشی میں کوئی اشتہار نہیں لیا جائے گا "
• سنہری موقع ..... ۱۴ جولائی کی قیامت کو دیکھنے کے بعد بھی اپنے تمام قرضوں
اور بلوں کی ادائیگی کرنا دور اندیشی کی بات ہوگی "

• پوسٹ مارٹم
تخلص کی تصنیف :
..... چہرے کی یتیمی دور کرنے میں تیر بہدف ہے
...... فلک شگاف قہقہے جو کسی وجہ سے بند ہوگئے ہوں ' استعمال کے
فوری بعد چالو کرنے میں اکسیر ہے "

• تخلص بھوپالی کا
نگارین شاہکار پاندان والی خالہ
فی الحال
دماغی خلا میں
گردش کر رہا ہے تاریخ اشاعت کا
انتظار کیجئے (ادارہ) "

(باقی آئندہ)

پرویز یداللہ مہدی

چہ خوب

خوفزدہ نسوانی چیخ نے جو بھگدڑ مچائی تھی، اس کے نتیجے میں کوئی المناک حادثہ پیش نہیں آیا کیونکہ چند مضبوط دل گردے والے نوجوانوں نے جو یقیناً کنوارے ہی ہوں گے، بہت جلد اس خوفناک شے کی اصلیت کا پتہ لگا لیا، جسے دیکھ کر سہمی ہوئی خاتون کی چیخ نکل گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ سہمی ہوئی مسماۃ کے آگے بیٹھی ہوئی خاتون کے نقلی بالوں کا چٹلا پتہ نہیں کس طرح ان کی بالشت بھر اصلی چوٹی سے علیحدہ ہو کر فرش پر گر گیا، اور کچھ ایسا زاویہ بنا ڈالا جیسے کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ مذکورہ مسماۃ کی نظر پڑنے کی دیر تھی پھر تو نقلی چوٹی کا سانپ بن جانا قدرتی بات تھی۔ بہرحال جلد ہی سارے ماحول پر مع ان مسماۃ کے قابو پا لیا گیا لیکن دوسری خاتون شرم، غصے اور ندامت کی وجہ سے بے قابو ہو گئیں۔ ہمیں موصوفہ کی اس حالت غیر پر کسی کا یہ مصرع یاد آگیا ؎

بہت شرما گئے جب دور پر چٹلا نظر آیا

قسط ۲۱

البتہ اس وقتی ہنگامے نے طوطا پری کے مظاہرے کو اس قدر متاثر کیا کہ اس نے اپنا اگلا پروگرام منسوخ کر دیا اب ساری بھیڑ نے اس ہال کا رخ کیا جہاں فینسی ڈریس شو ہونے والا تھا — !!

جیسے ہی ہم وسطی ہال سے باہر نکلے بے دھڑک کے ہتھے چڑھ گئے بے دھڑک چونکہ فینسی ڈریس شو کے اہتمام میں حسب معمول مسز چہ خوب کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اس نے شو میں حصہ لینے والے افراد کو ڈریسنگ روم کی طرف ہانک کرلے جانا بھی اسی کے ذمہ تھا۔

ڈریسنگ روم میں قدم رکھتے ہی یوں لگا جیسے ہم پلک جھپکتے میں راجہ اندر کے اکھاڑے میں پہنچ گئے ہوں۔ اندر سبھا کی پریاں بھی شاید آج کی ان فیشن کی پریوں کے آگے مات کھا جائیں ——— مسز چہ خوب نے ہمیں دیکھتے ہی مسکراہٹ کا ایک تیز تر رفتار بمپر [illegible]

پھینکا، ہم نے جھکائی دے کر اپنے ہوش و حواس کے وکٹ کو موصوفہ کی مسکراہٹ سے تو بچالیا، لیکن شبّو کے دل آویز حسن لباس کی وضع قطع اور مخصوص دل نشین مسکراہٹ کے "اسپن" (Spin) نے ہمیں "ایل۔ بی۔ ڈبلیو (L.B.W) کر دیا۔ لباس کی تراش خراش اور شاہانہ چال سے یوں لگتا تھا جیسے شبّو کے روپ میں کوئی نوخیز مغل شہزادی تاریخ کے تمام بندھنوں کو توڑ کر لال قلعے سے سیدھے یہاں چلی آئی ہے۔ لیکن تاریخ کے بندھن توڑنے والی اس مغل شہزادی نے زیادہ دیر تک ہمارے جغرافیہ کو تہہ و بالا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی سہیلیوں کے جھرمٹ کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اسی بیچ بے دھڑک ہمارے لئے بغداد کے چور کی وردی لے آیا۔ اور پھر اسے ہمارے حوالے کر کے سامنے والے کیبن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اُس کیبن میں جا کر اپنے زاویے اور پیمانے بدل لیجئے ۔"

کیبن سے ہو کر لوٹنے تک نہ صرف ہمارے زاویے اور پیمانے بدل گئے بلکہ شخصیت تک بدل گئی۔ اب بے دھڑک ہمیں اپنے ساتھ میک اپ روم میں لے گیا جہاں اس نے اپنے بھدے ہاتھوں کا کمال دکھانا شروع کیا۔ لباس نے پہلے ہی شخصیت بدل دی تھی بلکے سے میک اپ نے چہرا مہرا بھی بدل دیا۔ اس کارروائی کے اختتام پر جب سامنے والے قدِ آدم آئینے پہ نظر ڈالی تو یوں لگا جیسے آئینے میں ہمارا عکس نہیں بلکہ اصلی بغداد کا چور کھڑا ہے جو اپنی ہی آنکھ سے اپنا سرمہ اڑالے اور خود اپنی آنکھ کو خبر نہ ہو ۔

میک اپ روم سے باہر نکلتے ہی مسز محبوب سے ٹکراؤ ہوا۔ لگتا تھا جیسے موصوفہ ہماری نکاسی ہی کی منتظر تھیں۔ حسبِ عادت ان کی زبانِ مبارک سے "واؤ، واؤ" اور پتہ نہیں کیسے کیسے انوکھے بول ادا ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ نظریں بھی ہمارے سراپا کا بہ نظر غائر جائزہ لیتی رہیں اور پھر اسی طرح باہیں پھیلا کر ہماری طرف بڑھیں جیسے ہمیں اپنی کھلی باہوں میں بھر لینا چاہتی ہوں۔ آج پھنسے تھے ہم بُری طرح کوئی راہ فرار نظر نہیں آتی تھی۔ مسز محبوب کی پھیلی ہوئی باہیں "کرین" (crane) کے ان قومی ہیکل کانٹوں سے مشابہہ نظر آ رہی تھیں جو منوں وزنی اشیاء کو روئی کے گالوں کی طرح اٹھا لیتی ہیں ——— ہم نے یہ سوچ کر خود کو موصوفہ کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا کہ مجبوری کا دوسرا نام ہے صبر اور صبر کا پہلا نام وہی مجبوری، لیکن ہمارے پاس پہنچ کر محترمہ نے اچانک اپنے پھیلے ہوئے بازو گرا کر ہمیں ایک اور ذہنی جھٹکا دیا اور پھر اندر کہیں گہرائیوں میں دبا قہقہہ، موصوف کے حلقوں سے قسطوں میں آزاد ہونے لگا۔ گویا اب تک موصوفہ ہماری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ لیکن بہت دیر تک لطف نہیں اٹھا سکیں، کیونکہ ان کے قہقہے میں وہی جذباتی لہریں شامل ہو گئیں جو شاید خود ان کے کسی جذبے کے گھائل ہونے کا ثبوت تھیں۔ لیکن موصوفہ کو اپنی اس کیفیت پہ بہت جلد قابو پانا بھی آتا تھا۔ جانے کتنی اذیتوں سے گذرنے کے بعد وہ اس مقام پہ پہنچی تھیں۔ وہ دوبارہ اپنی مخصوص ترنگ اور موڈ میں آچکی تھیں۔ چنانچہ شرارتی لہجے میں کہا "اے بغداد کے چور، قربان تجھ پہ سمرقند و بخارا، آ میں تجھے مکاروں کے مکر دشمنوں کے شر اور بد نظروں کی نظر سے بچانے کے لئے کالا ٹیکہ لگا دوں ——" اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے، پاس ہی کے ٹیبل سے کاجل کی ڈبیہ اٹھا لائیں اور اپنی انگلی کی مدد سے تھوڑا کاجل لیا اور ہماری کنپٹی کے قریب ٹیکا لگا دیا۔ یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ ہم کچھ کہہ بھی نہ سکے۔ البتہ محترمہ کے اس نئے انداز پر ضبط کے باوجود ہماری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ موصوفہ نے گھبرا کے پوچھا "کیا ہوا؟ آنکھوں میں یہ جھلملاہٹ کیسی ۔!"

"کچھ نہیں ۔! بہت دن ہو گئے ہیں نا وطن سے نکلے ہوئے" ہم نے خود پر قابو پا کر کہا "آپ نے کالا ٹیکا لگایا تو اچانک بھابی کی یاد آ گئی ——"

بھابی۔۔ ؟" موصوفہ نے ہمارے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے دہرایا۔

"ہاں، عیدین اور خوشیوں کے موقع پہ جب بھی کوئی نیا لباس پہنتا ہوں تو بھابی، مجھے کالا ٹیکا ضرور لگاتی ہیں اور" ہمارا جملہ ادھورا ہی رہ گیا، کیونکہ جو رنگ مسز چہ خوب کے چہرے پر اچانک نمودار ہوا تھا اس نے ہمیں چپ سی لگا دی۔ یہ رنگ بڑا عجیب تھا اس سے پہلے کبھی موصوفہ کے چہرے پہ یہ رنگ نہیں دیکھا تھا موصوفہ کی آنکھوں میں ہر دم ڈھلنے والی، وہ ان مٹی ان بجھی پیاس بھی جانے کہاں غائب ہو گئی تھی اب ایک عجیب سے وقار ایک گمبھیر ٹھہراؤ اور ایک معصوم سی پاکیزگی نے لے لی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک جھلملاتی نمی آنکھوں کے کناروں پہ نمودار ہونے لگی جس پہ قابو پانے کے لئے ہی موصوفہ نے شاید بلا وجہ قہقہہ لگایا اور بولیں ۔" پاگل ہو تم ارے تم کوئی عمر بھر یہاں رہنے کے لئے آئے ہو، آزاد پنچھی ہو اپنی مرضی کے مالک و مختار ہو، جب جا ہو گے اپنی بھابی، اپنے ماں باپ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں میں لوٹ جاؤ گے۔ پاگل کہیں کے خواہ مخواہ اداس اور ملول ہوتے ہو ۔" اتنا کہہ کر وہ ایک جھٹکے کیساتھ پاس والے خاکی میک اپ روم میں داخل ہو گئیں۔۔۔

مسز چہ خوب کے اس بدلے ہوئے روپ رندھے ہوئے گلے اور کہے ہوئے الفاظ میں جو اپنا پن تھا ہم اُسے کوئی نام نہیں دے سکے، کیونکہ آج کے اس نئے روپ میں جو کچھ ہمیں نظر آیا تھا وہ ماں کی ممتا، بہن کے پیار اور بھابی کے دُلار سے بھی بڑھ کر کچھ تھا۔ اندھی خواہش کی سیاہیوں ہوس کے مکروہ اندھیروں اور لذتوں کی گناہ آلود پیاس کے بھیانک بوجھ تلے دبی ہوئی ممتا اور پیار کی بے لوث کرن جب ساری سیاہیوں تمام اندھیروں اور گناہوں کے مکروہ دلدل کا سینہ چیر کر نکلتی ہے تو پھر انسان اتنا اوپر اٹھ جاتا ہے اتنا اونچا ہو جاتا ہے کہ فرشتے اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ !!

"فینسی ڈریس شو" کے لئے خاص طور سے بنائے اور سجائے گئے عارضی اسٹیج کا جب پردا اٹھا تو حاضرین کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اسٹیج کی خوبصورتی، بناوٹ اور سجاوٹ کو دیکھ کر حاضرین اس قدر متاثر ہوئے کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا حالانکہ شو میں حصہ لینے والا ایک بھی فرد ابھی اسٹیج پر نمودار نہیں ہوا تھا لیکن اسٹیج خالی کب تھا وہ تو رنگ و نور سے پُر تھا جیسے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ تھمی، مسز چہ خوب کی آواز ہال میں گونج اٹھی وہ اسٹیج کے پیچھے سے کومنٹری دے رہی تھیں پہلے تو کلب کے پچھلے چار سال کے کارناموں کے بارے میں مختصر رپورٹ پیش کی پھر آج کے فینسی ڈریس شو کے بارے میں فرمایا کہ صرف لباس کی تراش خراش اور مختلف ملکوں کے کپڑوں کی پبلسٹی اور پروپگنڈا کی خاطر اس شو کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ شو اس اعتبار سے ایک یادگار شو ثابت ہوگا کہ اس میں حصہ لینے والے مرد اور خواتین اپنے اپنے لباس اور وضع قطع کی مناسبت سے اس دور اس زمانے اور اس جگہ سے وابستہ خصوصیات کا عملی مظاہرہ بھی کریں گے۔ موصوفہ نے سب سے پہلے لڑکے لڑکیوں کے اس گروپ کا تعارف کروایا جو سب سے پہلے اسٹیج پر پیش ہو کر اپنے ہسپانوی (SPANISH) لباس اور وضع قطع کی مناسبت سے اسپین کا مشہور رقص پیش کرنے والا تھا جس اعلان کے ساتھ ہی ہال پھر تالیوں سے گونج اٹھا ادھر مخصوص ہسپانوی دھن گونج اٹھی جس کی لے پر تھرکتا ہوا لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ اسٹیج پر نمودار ہوا۔۔۔ یہ سارا تماشہ ہم اسٹیج کے عقب سے دیکھ رہے تھے۔۔۔ لڑکے لڑکیوں کا یہ پہلا گروپ کوئی دس منٹ تک اپنے رقص کا مظاہرہ کرنے کے بعد تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں واپس ہوا۔ اس کے بعد ہنسنے ہنسانے کی باری تھی یعنی کامیڈی آئٹم پیش کیا گیا۔ چار نوجوان سرکس کے جوکروں کا حلیہ اور وضع قطع بنائے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور پھر کوئی پندرہ منٹ تک عجیب و غریب حرکتیں کر کے حاضرین کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرنے کے بعد لوٹ

انڈے ـــــ اب مسز چہ خوب نے نہایت ہی حسین پیرائے میں مغلیہ حسن اور مغل آرٹ پر روشنی ڈالتے ہوئے انکشاف کیا کہ حاضرین اب کچھ دیر کے لئے خود بھی مغلیہ دور میں لوٹ جائیں گے۔ ادھر اعلان ختم ہوا ادھر اسٹیج پر پوری آب و تاب کے ساتھ شبو مغل شہزادی کے روپ میں اپنی کنیزوں کے جھرمٹ میں نمودار ہوئیں دس منٹ کے اس چھوٹے سے منظر میں مغل شہزادی کو اپنے محبوب کے فراق میں اداس دکھایا گیا تھا اور اس کی منہ چڑھی کنیزیں اس کا دل بہلانے کے لئے رقص و موسیقی کا سہارا لیتی ہیں۔ دس منٹ کے اس تماشے نے بڑا دیرپا اثر چھوڑا خود ہم بھی اس سے متاثر ہوئے بلکہ شبو کے مغلیہ روپ کو دیکھ کر ہم خود کو بجائے بغداد کا چور کے شہزادہ سلیم سمجھ بیٹھے نتیجتاً اگلے آئیٹم کے بارے میں کیا اعلان کیا گیا' ہم کچھ نہ سن سکے' کیونکہ شبو کے حسن کے توسط سے ہم پر مغلیہ دور کا شدید "دورہ" پڑا تھا اس "دور دورے" سے چونکے' اس وقت جب لاؤڈ اسپیکر پر ہمارا نام پکارا گیا۔ معلن کے لہجے کی جھلاہٹ بتاتی تھی کہ ہمارا نام کئی بار پکارا جا چکا ہے۔ مارے گڑبڑاہٹ اور بوکھلاہٹ کے ہم یہ سوچے بغیر ہی اسٹیج پر پہنچ گئے کہ جانے ہمارا تعارف کس ڈھنگ سے کروایا گیا ہے اور ہمیں اپنی پوشاک اور وضع قطع کی مناسبت سے پتہ نہیں کس خصوصیت کا حامل بتایا گیا ہے ـــــ ہم نے اس طرح خالی الذہن مگر اعتماد مند اسٹیج کا رخ کیا تھا کہ ہم پر یہ پرانی کہاوت تھوڑے سے اضافے کے ساتھ صادق آئی تھی کہ چڑھ جا بیٹے سولی پہ رام یا تو بھلی کریں گے یا پھر اپنا رام نام ہی ست ہو جائے گا ـــــ ہماری اس وقتی بوکھلاہٹ نے حاضرین کے لئے تفریح کا خاصا سامان مہیا کر دیا" کسی دل جلے نے ہماری طرف جملہ پھینکا " اے بغداد کے چور ویسے تو سر سے پیر تک ایک ایک انچ چور معلوم ہوتا ہے لیکن تلوار کے بغیر پینترے کس طرح دکھائے گا' تیری تلوار بازی کے جوہر کس طرح کھلیں گے' آخر تیری تلوار گئی کہاں ـــ ؟" ادھر اس جلے کا جملہ ختم ہوا ادھر ہم پر ایک نیا زلزلہ طاری ہو گیا جس سے نجات پانے کے لئے ہم نے جواباً بہانہ گڑھا ـــ " اے بغداد کے چور کے برادر گرہ کٹ میں اب امن اور اہنسا کا پجاری ہو گیا ہوں۔ میں دنیا پر یہ ثابت کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پیار کے زور سے پھیلا ہے"۔ ہمارے اس کرارے جواب کو حاضرین نے خوب سراہا ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ گردن پھنسنے اور کٹنے سے بچ گئی ویسے یہ حیرت اپنی جگہ اب بھی باقی تھی کہ ہمیں تلوار کا دھنی ازراہ مذاق بتایا گیا تھا یا پھر اس کے پیچھے بھی کسی کی سازش ہو سکتی ہے۔ بستی کے سربرآوردہ اشخاص کے سامنے ہماری ہیٹی ہو ہم اسی ادھیڑبن میں الجھے ہوئے تھے کہ ایک عدد جوکر نما شخص دونوں ہاتھوں پر اس طرح ادب کے ساتھ تلوار اٹھائے اسٹیج پر پہنچا جیسے اس تلوار کا تعلق کسی شاہی خاندان سے ہو' ہمارے نزدیک پہنچ کر تلوار کے ساتھ والا مخملی کمربند ہماری کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے نہایت ہی فدویانہ انداز میں بولا ـــ "تلوار مظلوموں' بیکسوں کی جان و مال کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے اور بغداد کے چور کی تلوار ہمیشہ ظلم کے خلاف اور مظلوم کی حمایت میں اٹھتی آئی ہے"۔

اتنا کہہ کر جوکر الٹے قدموں لوٹ گیا اور ہم تلوار کے دستے کو چھو کر ہی یہ جان گئے کہ یہ تلوار فلم کمپنی والی نقلی تلوار نہیں بلکہ اصلی تلوار ہے پھر بھی مزید تصدیق کے لئے بڑی احتیاط سے تلوار کو بے نیام کیا۔ تلوار کا وزن اس کی چمکتی دھار اور آب و تاب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر ڈالی۔ ہم نے سوچا کہ حاضرین ہمیں اس وقت تک نہیں بخشیں گے جب تک کہ ہم تلوار بازی کے دو چار پینترے نہیں دکھا دیتے' چنانچہ اللہ کا نام لے کر شروع ہو گئے یعنی خواہ مخواہ ہوا سے لڑنے لگے مطلب یہ کہ اپنی گردن بچاتے ہوئے ہوا میں تلوار اس طرح گھمانے لگے جیسے چاروں طرف ان دیکھے دشمن ہوا میں تحلیل ہو کر ہماری گھات میں ہیں' مزید اب ہم ہوا میں تلوار گھما کر انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ ہماری اس پینترے بازی نے یقیناً ہمیں مضحکہ خیز بنا دیا ہوگا تب ہی تو حاضرین کی اکثریت قہقہے لگا رہی تھی۔ اسی بیچ ایک ایسا دل خراش اعلان ہوا کہ تلوار ہمارے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ معلن نے فرمایا کہ اب حاضرین کی تفریح طبع کے لئے

بغداد کے چور اور بحری قزاق کے درمیان تلوار بازی کا ایک دوستانہ مقابلہ ہوگا بحری قزاق کا نام سنتے ہی تمام تربیت کے باوجود ہم اپنے اس تجسس کو نہیں دبا سکے کہ آخر بحری قزاق کا بہروپ کس نے دھارا ہے — پھر تھوڑی دیر میں یہ بھید بھی کھل گیا جب طوطا پری انتہائی بھیانک وضع قطع بنائے ہماری ہی طرح چمکدار اور اصلی تلوار ہاتھ میں سونتے ہوئے اسٹیج پر آ پہنچا ہمارا یہ حال کہ اگر طوطا پری سچ مچ اپنی تلوار سے ہم پر وار کرتا تو ہمارے دو ٹکڑے ضرور ہو جاتے لیکن لہو کا ایک قطرہ نہیں نکلتا کیونکہ سارا خون مارے خوف و دہشت کے منجمد ہو چکا تھا۔ جسم کے تمام اعضائے رئیسہ و غیر رئیسہ شل ہو چکے تھے۔ کچھ سجھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طوطا پری نے تلوار ہلا کر حاضرین کو مخاطب کر کے جو کچھ کہا ہم سن نہیں سکے۔ ہو سکتا ہے اگر سن لیتے تو پچھلے دھڑے سے مطلع' بلکہ مقطع' بھی خطا ہو جاتا اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا۔ کیونکہ خوف و دہشت کی کیفیت سے گزرنے کے بعد جسم کا تمام تر لہو تو یہ کہہ کر منجمد ہو جاتا ہے کہ رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل لیکن جسم میں دوڑنے پھرنے والی دیگر فضول اشیاء اور بھی تیزی سے گردش کرنے لگتی ہیں بڑی مشکل سے ان "اشیاء" کی نقل و حرکت پر اتنی پابندی لگا سکے کہ یہ اپنی جغرافیائی "حدود" کو پھلانگنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ اور پھر اپنی اس کامیابی پر خوش ہوا ہی چاہتے تھے کہ طوطا پری عرف بحری قزاق نے کسی ماہر تلوار باز کی طرح اڑان بھر کر بغیر کسی اعلان کے وار کر دیا ———— باقی۔ باقی

مُراسلات — خُرافات

○ برادرم مصطفٰی کمال صاحب۔ تسلیم

مَیں تین ماہ سے ہندوستان میں ہوں اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ مَیں نے مزید تین ماہ کے لئے ویزا میں توسیع لے لی ہے اور اب میرا قیام بدایوں میں ۵ راپریل ۷۷ء تک رہے گا۔ آپ سے ملاقات کو جی چاہتا ہے۔ پچھلا تاثر ابھی باقی ہے۔ سارے زندہ دلانِ حیدرآباد کو سلام۔ آپ کا اپنا

★ دلاور فگار۔ حال مقیم۔ بدایوں

○ کمال صاحب۔ تسلیمات

اگر 'سالنامہ' کو ہری جھنڈی نہ دکھائی گئی ہو تو۔ "مختصر مختصر خط" حاضر ہے۔ ایک ڈرامہ بھی اپنے انجام کو پہنچنے ہی والا ہے۔ شاید "ڈرامہ نمبر" کا آخری ڈبہ ہاتھ لگ جائے۔

ویسے تو آپ کو سال میں تیرہ مبارکبادیں (کہ سال میں صرف بارہ مہینے ہی ہوتے ہیں اور سالنامہ کم از کم دو گننے کا حقدار تو ہے ہی!) دینی چاہئیں۔ مگر تخلص نمبر خصوصیت سے مبارکباد کا مستحق ہے۔

(دیگر حقداروں تک بھی حق پہنچایا جا چکا ہے)

★ شفیقہ فرحت۔ بھوپال

○ بھائی مصطفٰی کمال۔ السلام علیکم

"دستخط" بڑا قاتل لفظ ہے۔ لوگ محبت میں اسے مونث سمجھتے ہیں ــ حالانکہ یہ مونث ہے نہ مذکر! اس کی جمع بھی بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بیک وقت واحد بھی ہے اور جمع بھی:

درج ذیل دو جملوں کی صحت کا کیسے یقین آئیگا؟

(۱) "شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں"! جناب یوسف ناظم کا بہترین مزاحیہ مضمون ہے، جس کے آخر میں مضمون نگار نے اُردو میں اپنے دستخط ثبت کئے ہیں"۔

(۲) "اپنے مضمون میں جناب یوسف ناظم نے چند مشہور لوگوں کے دستخط کے نمونے بھی پیش کئے ہیں"۔

★ راہی قریشی۔ گلبرگہ

○ مائی ڈیر مصطفٰی کمال۔ تسلیم

تخلص نمبر کے بھوپال میں تعریف و تحسین کے چرچے رہے۔ شگوفہ کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ یوسف ناظم نے بڑا اچھوتا مضمون قلمبند کیا ہے۔ مبارکباد

★ فضل جاوید۔ بھوپال

○ کمال صاحب۔ آداب

یوسف ناظم نے دستخطی اسٹائیل و فنیشن کی اچھی خاصی خبر لی ہے۔ یہ پڑھ کر راز افشا ہوا کہ لفظ دستخط مونث ہے۔ 'دستخط' لفظ مرکب ہے اور اس کے دونوں اجزاء "دست' خط" مذکر ہیں۔ دونوں ملے تو مونث ہو گئے ہیں۔ شگوفہ اُردو ادب میں عروج کمال پر بہ کمال پہنچا ہوا پایا۔ اللھم زد فزد

★ ایم۔ ایچ۔ نور حسین

ویراجپیٹ کورگ

○ مصطفٰی جناب۔ السلام علیکم

تخلص نمبر ملا۔ جزاک اللہ

بڑا عمدہ (لذیذ) نمبر ہے۔

★ مظہر امید۔ بنگلور

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

شگوفہ کا سالنامہ اپنی مخصوص انفرادیت اور سج دھج کے ساتھ جلوہ گر ہے!

حیدرآباد میں کتابوں کی اشاعت کا کام اُردو اکیڈیمیوں کی سرپرستی کے نتیجہ میں کچھ اس طرح وُسعت حاصل کرگیا ہے کہ اچھے اور اوسط کاتب حضرات بروقت کام کی تکمیل کے موقف میں نہیں رہے۔ (یُوں بھی بروقت کام کے یہ قائل نہیں۔ وقت اور کام کے حسابی اصول کے منافی ہے) جس کی وجہ سے سالنامہ کسی قدر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے[لہ]۔ تاہم یہ بات طمانیت کا باعث ہے کہ یہ ضخیم شمارہ جنوری ہی میں شائع ہوگیا اور اس میں ملک کے تمام نمائندہ و اہم طنز و مزاح نگاروں کو ہم یکجا کرسکے۔

شگوفہ اپنی زندگی کے دسویں برس میں قدم رکھ چکا ہے۔ اس عرصہ میں ہمیں ملک کے ہر حصہ سے پرخلوص تعاون ملا۔ مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں نے ہماری آواز پر ہمیشہ لبیک کہا۔ اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ شگوفہ کو معیار کی بلندیوں تک پہنچایا۔ جنوبی ہند کے اردو ادبی رسالوں میں شگوفہ کو سب سے کثیرالاشاعت اور مقبول ماہنامہ کا مقام حاصل ہے (تعداد اشاعت کا انکشاف کرکے ہم اپنے ساتھ دوسرے اُردو رسائل کی بند مٹھی کو خاک میں ملانا نہیں چاہتے خصوصاً جب کہ جنتا پارٹی حکومت چھوٹوں میں سب سے چھوٹے اخبارات کے اشتہارات مسدُود کرنے کے وسائل ڈھونڈھ رہی ہے) شگوفہ کی اس ترقی میں سب سے زیادہ ہمارے معاونین کی سرپرستی کو دخل ہے۔ امید ہے کہ طنز و مزاح نگاروں اور قارئین کرام کی رفاقت سے ہم اسی اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں گے۔

★ یہ خبر بڑے افسوس اور دکھ کے ساتھ سنی گئی کہ نامور و مشہور طنز و مزاح نگار ابن انشا ۱۱ر جنوری ۱۹۷۸ء کو دماغ کی شریانیں پھٹ جانے کی وجہ سے اچانک انتقال کرگئے۔ ان کی عمر ۵۲ سال تھی اور وہ ان دنوں لندن کے پاکستانی سفارت خانہ سے وابستہ تھے۔

ابن انشا کے انتقال سے اُردو طنز و مزاح کو ایک دھکا پہنچا۔ ابراہیم جلیس کے انتقال کا زخم ابھی تازہ تھا کہ ابن انشا بھی داغ دے گئے۔ ابن انشا نے خوبصورت انشائیے، خاکے لکھے اور روزمرہ کے معاملات پر صحافتی مزاحیہ و طنزیہ کالم بھی اُردو طنز و مزاح میں ان کا اپنا الگ رنگ تھا۔ مزاحیہ شعر بھی وہ لکھتے تھے طنز و مزاح کی اس بے مثال ہستی کے انتقال سے اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہوا خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

[لہ] واضح رہے کہ مدیر شگوفہ کی مذکورہ شکایت کسی خوشنویس سے نہیں۔ سلام خوشنویس

ابراہیم جلیس کو شگوفہ کا خراجِ عقیدت

ابراہیم جلیس نمبر بہت جلد شائع ہوگا ——— ادارہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ★

ماہنامہ

شگوفہ

فروری ۱۹۷۸ء ★ جلد (۱۱) ★ شمارہ (۲)

مدیر: سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت:

★ منظور احمد
★ حمایت اللہ
★ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:

○ راجندر سنگھ بیدی
○ بھارت چند کھنہ
○ خواجہ عبدالغفور
○ نریندر لوتھر
○ مجتبیٰ حسین

★ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے (Rs. 1.50)
★ سالانہ (۲۰) روپے ★ بیرونی ممالک سے ۳۵ شلنگ

ٹائٹل: شعیب
طباعت لیتھو: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۲
طباعت ٹائٹل: اسٹینڈرڈ ایکسپنشن، شانتی نگر، حیدرآباد
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، مسجد دبار حسینی، پرانی حویلی حیدرآباد ۲

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ } ماہنامہ شگوفہ ۔ ۳۱ / مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱

فون: 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)



سالنامہ میں بھوپال کے پروفیسر آفاق احمد کا مضمون "معشوق وفاپیشہ یعنی سکوٹر چالو" اشفاق احمد کے نام سے چھپ گیا ہے
قارئین تصحیح فرما لیں۔ (مدیر)

زندہ دلانِ حیدرآباد کی دو نئی مطبوعات

...کیا نام نہ ہوگا

(مجموعۂ مضامین)

بھارت چند کھنہ

قیمت مجلد آٹھ روپے

فقط

(مجموعۂ مضامین)

یوسف ناظم

قیمت مجلد چھ روپے

بتوسط شگوفہ

حاصل کیجئے

ماہنامہ شگوفہ کی ایک اور خصوصی اشاعت

ابراہیم جلیس نمبر

اپریل ۱۹۷۸ء میں شائع ہوگا

کرنل محمد خان

نشۂ لفٹینی و مشکلہا

ہمیں ہٹلر سے ہمیشہ شکایت رہے گی کہ اس نے دوسری جنگِ عظیم شروع کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ نہ کیا۔ یہ نہیں کہ ہم موصوف کو اس کارِ خیر سے روکنے کی کوشش کرتے، ہم فقط اعلانِ جنگ میں دو مہینے کا التوا چاہتے تاکہ اپنی تعلیم پوری کر لیتے، لیکن ہم بمشکل گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر کالج پہنچے ہی تھے کہ آپ نے ہم سے بالا بالا پولینڈ پر چڑھائی کر دی جس کا بعد میں ہمارے ذاتی پروگرام پر خاصا گہرا اثر پڑا ——— جنوری ۱۹۴۰ء میں ہرچند کہ پولینڈ اور ہٹلر کے دوسرے ہمسائے جرمن بمباروں اور ٹینکوں کے درمیان ایسی پُرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے تھے، تاہم باقی دنیا بفضلِ خدا خیریت سے تھی۔ اور ہمارے اپنے ملک ہندوستان[1] میں تو انگریز کی برکت سے اس شدت سے امن برپا تھا کہ شیر بکری مع جملہ ہندوستانیوں کے ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے، چنانچہ صلح و آشتی کے اس خوشگوار ماحول میں کسی کو گمان تک نہ تھا کہ عین اس وقت ملک کے ایک گوشے میں ایک اہم جنگی واقعہ کی ابتدا ہو رہی ہے یعنی لاہور میں ایک نوجوان کالج چھوڑ کر جنگ میں کود پڑنے پر تُل گیا ہے ——— یہ نوجوان میں ہی تھا۔

---

[1] اس وقت پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

لیکن بھرتی ہونے سے نہ تو ہٹلر کی دل آزاری مقصود تھی، نہ انگریز کی دلجوئی' ہمارے مراسم دونوں سے دوستانہ تھے۔ ہمیں فقط لفٹین[1] بننے کا شوق تھا اور قدرت اور ہٹلر نے مل کر اس شوق کی تکمیل کا سامان پیدا کر دیا تھا؛ چنانچہ ہم نے فوج میں کمیشن کے لئے درخواست دے دی۔

ان دنوں ابھی وہ مصیبت نازل نہیں ہوئی تھی جسے آج کل سیلیکشن بورڈ کہتے ہیں۔ انٹرویو تو خیر اُن دنوں بھی ہوتے تھے بلکہ ایک چھوڑ تین تین، لیکن نہایت شریفانہ قسم کے۔ ایک بزرگ سا جرنیل اور کچھ نیم بزرگ سے بریگیڈیر اور کرنل بیٹھے ہوتے تھے، سامنے کرسی پر اُمیدوار کو بٹھا دیا جاتا تھا۔ اور پھر اس سے نہایت بے ضرر سے سوال پوچھے جاتے تھے:

آپ کا نام کیا ہے؟

تعلیم کہاں تک ہے؟

فوج میں کوئی رشتہ دار ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہرچند کہ کچھ خاندانی اسرار فاش کرنا پڑتے تھے' لیکن دماغ پر ایسا ناگوار بوجھ نہ پڑتا تھا کہ اُٹھائے نہ اُٹھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہلکا پھلکا اور خاصا مفرح قلب سا انٹرویو ہوتا تھا۔ ان دنوں نہ تو اُمیدواروں کی ذہانت کی پیمائش کی جاتی تھی نہ ان کے لاشعور کی تلاشی لی جاتی تھی۔ یہ بدعتیں چند سال بعد کی پیداوار ہیں۔

چنانچہ ہمارے دو انٹرویو جہلم اور پنڈی میں ہوئے' اور ہم کامیاب رہے۔ آخری انٹرویو کے لئے حکم ملا کہ فلاں تاریخ شملہ حاضر ہو جاؤ۔ یہ سن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر آخری انٹرویو میں کامیابی نصیب ہو جائے تو انسان فی الفور لفٹین بن جاتا ہے۔ اور باقاعدہ لفٹینی کرنے لگتا ہے ——— اس بات کا علم نہ تھا کہ آخری انٹرویو اور لفٹینی کے درمیان ٹریننگ کا ایک خاصا مہلک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم ایک نیم لفٹینی کے عالم میں شملہ روانہ ہوئے اور جب انٹرویو ہو چکا' تو ہمیں محسوس ہوا کہ اب کسی لمحے سالم لفٹین ہوئے، کیونکہ انٹرویو تسلی بخش قسم کا ہوا تھا۔ ہم میں کوئی ایسی بنیادی خامی بھی نہ تھی۔ تعلیم کی شرط میٹرک تھی اور ہم نے تو میٹرک کے علاوہ کافی فالتو تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ ہمارے خاندان کی فوجی خدمات کی فہرست بے شک ایسی طویل نہ تھی لیکن ہم نے شجرۂ نسب کو تھوڑا سا کھینچ تان کر اس قدر صوبیدار چچوں اور کپتان چچازادوں کا احاطہ کر لیا تھا کہ جرنیل صاحب کو مطمئن کرنے کے بعد کچھ بچ بھی گئے تھے۔ بہر حال یہ راز ہمارے اور خدا کے درمیان ہی تھا۔ پولیس کی طرف سے صفائی کی بھی شرط تھی، تو ہم یوں بھی امنِ عامہ میں مخل نہیں ہوئے تھے' لیکن چونکہ پولیس والے بھی آخر انسان ہوتے ہیں لہذا ہم نے احتیاطاً ان کی انسانیت کا تقاضا بھی پورا کر دیا تھا۔

شملے سے گھر پہنچے تو لفٹینی کے حکم کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اِدھر چند عجلت پسند بزرگوں نے ہماری لفٹینی کے اعزاز میں پیشگی دعوتیں دینا شروع کر دیں جنھیں ہم واجبی برخورداری مگر افسرانہ وقار کے ساتھ قبول کرتے رہے۔ آخر ایک دن ڈاکیہ کھلا تار لے کر آیا اور دُور ہی سے بولا:

"لفٹین صاحب' لفٹینی مبارک ہو!"

لیکن تار پڑھا تو فقط اتنا لکھا تھا:

"تمہیں او۔ٹی۔ ایس[2] مہو میں ٹریننگ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ ۸ر اگست ۱۹۴۰ء کو حاضر ہو جاؤ!"

---

[1] لفٹننٹ [2] او۔ ٹی۔ ایس ۔ آفیسرز ٹریننگ سکول [illegible]

یہ پڑھ کر کچھ مایوسی تو ہوئی، لیکن پھر سوچا کہ آخر لفٹیننی ہے یہ تھوڑا ہی ہے کہ یوں اُٹھا کر بانٹ دی جائے ۔ اس کے کچھ ادب آداب سکھانے ہوں گے، کچھ خفیہ گُر بتانے ہوں گے کہ لفٹیننی چلائی کیسے جاتی ہے؛ چنانچہ خوشی خوشی دوستوں سے رخصت ہوئے ۔ ہر طرف سے لفٹین صاحب کہہ کر پکارا جارہا تھا جو ہمیں بیحد گوارا محسوس ہونے لگا ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نشست وبرخاست اور لب ولہجہ سے بھی لفٹیننی ٹپکنے لگی ۔

ریل کے سفر کے لئے درجہ اول کا ٹکٹ ملا ۔ یہ بھی ہماری عالیجاہی کی علامت تھی ۔ ٹکٹ دیکھنے والے ڈبے میں داخل ہوتے تو سر کہہ کر خطاب کرتے ۔ خدا جانے انھیں کیسے محسوس ہو جاتا کہ یہ عام آدمی نہیں لفٹین ہے ۔ بہر حال ہم ان سے وہی سلوک کرتے جو ایک افسر کو درمیانہ درجہ کے سرکاری ملازم سے کرنا چاہئے ۔ ہم سفروں میں انگریز بھی تھے ۔ یہ لوگ اگر ہم سے بولنا چاہتے تو پہلے کہتے "معاف کیجئے گا" اور پھر عرض مدعا کرتے ۔ ہمیں نہ صرف اپنی لفٹیننی کا یقین ہو گیا بلکہ اس کی بلندی کا بھی احساس ہونے لگا؛ چنانچہ دلی سے آگے جب گاڑی میں ہم ایسے لفٹینوں کی تعداد کافی ہوگئی تو موضوعِ گفتگو زیادہ تر یہی رہا کہ لفٹیننی اور کپتانی میں آخر فرق کیا ہے؟ اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ معمولی فرق ہے؛ چنانچہ رتلام اور مہو کے درمیان ہمارا مزاج عرشِ معلیٰ سے کچھ ہی اِدھر تھا بلکہ کوئی ایک تو دبی زبان سے یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آخر ان تاریخ والوں نے نپولین کو کیوں سر چڑھا رکھا ہے!

آخر مہو کا اسٹیشن آ گیا ۔ توقع تھی کہ ہمارے استقبال کے لئے فوج کا دستہ آئے گا، بینڈ ہوگا، موٹریں ہوں گی جن کے ڈرائیور ہمارے لئے دروازہ کھولیں گے، اور با ادب باملاحظہ ہمیں اپنے بنگلوں تک پہنچا دیں گے، لیکن دیکھا تو یہاں کا بند و بست کسی قدر مختلف نظر آیا ۔ استقبال کے لئے آدمی تو تھے لیکن ان میں ایسی وافر آدمیت نہ تھی ۔ گاڑی رکی تو ہمارے ڈبے میں ایک گورا داخل ہوا جس کے بازو پر تین سفید دھجیاں لگی تھیں ۔ آتے ہی بولا :

"اگر اس ڈبے میں کوئی کیڈٹ ہے تو ابھی مت باہر نکلے ۔"

ہم بیٹھ تو گئے، لیکن اس گورے کی زبان بے حد کھردری لگی ۔ علاوہ ازیں کیڈٹ کا لفظ سُن کر کچھ تشویش سی ہوئی کہ ہم سے کوئی دھوکہ تو نہیں ہو رہا ۔ لفٹین تو لفٹین ہوا، یہ کیڈٹ کیا جنس ہے؟ چنانچہ ہمیں ذرا پختہ سا شبہ ہونے لگا کہ ان انگریزوں نے لفٹیننی سے وصل کی کچھ خفیہ شرطیں بھی ٹھہرا رکھی ہیں جن سے ہمیں پہلے آگاہ نہیں کیا گیا ۔

جب اسٹیشن دوسرے مسافروں سے خالی ہو گیا، تو گورا پھر آیا اور ہم سب کو گاڑی سے باہر نکلنے کا گستاخانہ سا حکم دیا باہر نکلے تو دوسرے ڈبوں سے بھی تیس چالیس ہم جنس حضرات نکلتے دکھائی دیئے ۔ اسٹیشن پر تین چار اور گورے بھی موجود تھے ان میں سے ایک جو بظاہر سینئر تھا، اچانک چلایا :

"سب کیڈٹ میرے سامنے قطار میں کھڑے ہو جائیں ۔"

ہم نے کسی قدر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کچھ بے دلی سے قطار بھی بنالی ۔ گورا پھر چیخا :

"دائیں سے ایک دو تین بولو ۔"

ہم نے حکم کی تعمیل تو کی، لیکن محسوس ہوا کہ یہ سلوک ہماری شان کے شایان نہیں ۔ آخر ہم رنگروٹ تو تھے نہیں جو قطاریں بناتے پھرتے یا گنتی شروع کر دیتے ۔ بہر حال ہمیں تین

ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر وہی گورا بولا:

"باہر تین ٹرک کھڑے ہیں، ہر ٹولی ایک ایک ٹرک میں سوار ہو جائے۔"

ہمیں یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کچھ بھی ہو ہمیں ٹرکوں میں لے جانا شدید غلطی بلکہ بے ادبی ہے، موٹر کاریں ہونا چاہئے تھیں، مگر سوچا کہ ان معمولی ٹامیوں سے الجھنا ہمیں زیب نہیں دیتا؛ چنانچہ ہم نے قلیوں کو آواز دی کہ ہمارا سامان ٹرکوں میں ہی رکھ دیں۔ ہمارا یہ کہنا تھا کہ گورا گرج کر بولا:

"کیا کہا، قلی؟ تم فوجی اسکول میں آئے ہو، ہسپتال میں نہیں۔ اپنا سامان خود اٹھاؤ، ٹرکوں میں لادو اور اوپر بیٹھ جاؤ یا کھڑے رہو۔ سمجھے؟"

سمجھ تو آگئی اور ہماری خوش فہمیوں پر کچھ اوس بھی پڑی لیکن ہم سب نے حتی المقدور جلال میں آکر اس بے ادب ٹامی کو گھورے اور متفقہ غضب سے دیکھا اور کھڑے کھڑے فوجی زندگی کا پہلا فیصلہ کر ڈالا کہ جوں ہی لفٹین ہو گئے اس گستاخ گورے کا کورٹ مارشل کر دیں گے۔ اس دلیرانہ فیصلہ پر ہر طرف سے مرحبا کی صدا اٹھی ـــــ اس وقت ہم کورٹ مارشل کو مارشل لا کا قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے اور گورے کے مستقبل کو دل ہی دل میں تباہ کر کے ٹرکوں پر سوار ہو گئے۔

منزلِ مقصود کی جھلک توقعات سے بہت غیر مشابہ تھی۔ ہماری جائے قیام کے خدوخال بنگلے کی نسبت جیل سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ ایک سنگین بلکہ سنگدل سی بارک تھی، تنگ و تاریک اور طویل، جس کے اندر دیواروں کے ساتھ آہنی چارپائیاں پڑی تھیں اور چارپائیوں پر ہمارے ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں۔ انھیں دیکھ کر ہمیں جھٹکا سا لگا۔ گویا جیسے ہمارے خوف کو بھانپ گیا اور کڑک کر بولا:

"یہ تختیاں گلے میں لٹکانے کے لئے نہیں محض تمہاری نشستوں کے تعین کے لئے ہیں۔ اب اپنی اپنی چارپائیاں ڈھونڈ لو اور اپنا سامان وہاں اٹھا کر لے جاؤ۔"

ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ "سامان اٹھانے اور چلنے پھرنے میں چستی دکھاؤ اور شور مت کرو۔"

ہمیں یہ آخری حکم خاص طور پر ناگوار گزرا۔ ہم نے پرانے فوجیوں سے سن رکھا تھا کہ یہ لفٹین لوگ ہر وقت گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے رہتے ہیں۔ انھیں زبان بندی کا حکم دینا چھوٹے منہ کی بہت بڑی بدتمیزی ہے۔ ایک حضرت بولے "ان جاہل گوروں کو کیا معلوم کہ ایک لفٹین کرنے پر آئے تو کیا کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ کورٹ مارشل تک باوقار خاموشی اختیار کرنا ہی قرینِ مصلحت ہے۔

شام ہوئی تو کھانے کے لئے MESS میں گئے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں سے لفٹینی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم سب ایک افسرانہ ٹھاٹھ سے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے مودب اور باوردی بیروں نے ہماری خواہش کے مطابق مشروبات پیش کئے۔ اس خوشگوار ماحول میں ہم نے اسٹیشن اور بارک کے ان ناخوشگوار واقعات کو بھلا دیا جو ان گھٹیا خاندان کے گوروں سے سرزد ہوئے تھے اور ایک سرور کے عالم میں باہم گٹ پٹ گٹ پٹ کرنے لگے۔ اتنے میں دو خوش لباس انگریز اندر داخل ہوئے۔ یہ بھی فوجی وردیاں پہنے ہوئے تھے لیکن ان کے بازوؤں پر تین دھجیاں نہ تھیں بلکہ کندھوں پر پیتل کے تین تین چمکتے ستارے تھے۔ یہ انف

تھے اور وہ سارجنٹ۔ ان کی وضع قطع، بات چیت اور طور طریقوں میں شائستگی اور وقار تھا۔ انھیں دیکھا تو فخر سا محسوس ہوا کہ اصولاً ہم اور یہ افسر ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ آج نہیں تو کل ہمارے کندھوں پر بھی وہی جگ مگ کرتے ستارے اُبھرنے والے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لئے گئے۔ انگریزی کھانے اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اُردو بولنے میں ہے جس طرح ایک نوآموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں اسی طرح ہمارا انگریزی 'مٹن گوشت' بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا۔ ادھر ہاتھوں سے کھانا خلافِ شان تھا، لیکن برضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا، لہٰذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جائے تو اُردو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے اسی طرح جہاں انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ چلتا، ہم آنکھ بچا کر انگلیوں سے ہی بوٹی اُچک لیتے۔ گویا انگریزی کھانا اُردو میں کھا لیتے۔ بعض حضرات البتہ ایسے بھی تھے جو لفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اُتارتے ہی نہ تھے۔ ان میں سے کئی ایک کو دیکھا کر چھری کانٹے لئے پلیٹ میں مٹروں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مٹر ہیں کہ ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے! قصہ مختصر بیشتر اس کے کہ ان موٹن مٹروں کو کوئی گزند پہنچتا، بیرے پلیٹیں اُٹھا کر چل دیئے اور لفٹین صاحبان اپنا سا منہ اور چھری کانٹا لے کر رہ گئے ——— بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ بیرا جو کچھ سامنے رکھ گیا ہے اس کے ساتھ سلوک کیا کرنا ہے [illegible]

کے پیچھے اور کانٹے اُٹھا کر رکوع و سجود میں جاتے۔

کھانا ختم ہوا تو اینٹی روم میں آئے اور کافی کا دَور چلا لیکن تھوڑی دیر بعد دونوں انگریز کپتان اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ خوشگوار مجلس برخاست ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے

در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد۔ وہاں سے اُٹھ کر بارک میں واپس آئے، تو وہی بدزبان گورا پہلے سے موجود تھا۔ سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

'کل صبح سات سو بجے پی ٹی کے میدان میں حاضر ہونا ہے۔ لباس، بنیان، نکر اور ربڑ کے جوتے'۔

اور اتنا کہہ کر اکڑتا ہوا چل دیا۔ گویا یہ گورا باز نہیں آتا تھا۔ وہی حرکتیں کرتا تھا جو لفٹینی کے منافی تھیں۔

کسی نے پوچھا: 'ارے یار، یہ سات سو بجے کس بلا کا نام ہے؟'

ایک صاحب بولے: 'بے معنی بات ہے۔ گورا انگریزی غلط بولتا ہے'۔

ایک فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا: 'اس کے معنی ہیں صبح سات بجے'۔

دن بھر کے تھکے تھے۔ صبح تیار ہوتے ہوتے ہم سے کئی ایک پی ٹی کے لئے سات بجے سے دو ایک منٹ بعد پہنچے۔ کالج میں ہم گھنٹوں دیر سے پہنچا کرتے تھے اور اگر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر ایک آدھ ہلکی سی شکن آ جاتی تو لمحے بھر میں بغیر استری کے ہموار بھی ہو جاتی تھی لیکن اس گورے نے جو ہمیں ذرا دیر سے آتے دیکھا، تو کچھ اس انداز سے [illegible] گیا ... [illegible] اس کی پیشانی کی شکنیں [illegible]

استری کی بجائے روڈ رولر دکار تھا۔ معلوم ہوا کہ گورا محض پھٹ ہی نہیں گیا، کچھ بول بھی رہا ہے، لیکن اس کی انگریزی اس انگریزی سے بہت مختلف تھی جو ہم نے کتابوں میں پڑھی تھی۔ گورے کے الفاظ تو خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن ان کی تاثیر ہمارے دلوں میں آناً فاناً سرایت کر گئی کیونکہ اس کے ہر لفظ کے ساتھ ہماری رہی سہی نفسیاتی بتدریج زائل ہو رہی تھی۔

ہم خاموشی سے قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور پی ٹی شروع ہوئی۔ پہلے تو ہمیں میدان کے اردگرد دوڑایا گیا یعنی ڈبل کرایا گیا (ڈبل کے یہ معنی ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوئے) بعد ازاں چند ایسے زاویوں پر جھکنے کا حکم ملا جو فطرت کی منشا کے سراسر خلاف تھے۔ کوئی آدھ پون گھنٹے کی پی ٹی کے بعد ہم تسخیر فطرت میں تو کسی قدر کامیاب ہو گئے لیکن ہماری اپنی ترکیب عناصر میں خاصا خلل آگیا۔

آخر پی ٹی ختم ہوئی اور حکم ہوا کہ ناشتہ کے بعد پھر یہیں حاضر ہونا ہے اور وقت نو سو تیس بجے کا ملا۔ فوجی کیڈٹ سے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ صبح کے ساڑھے نو بجے مراد ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کھلا کہ یہ گورا کمپنی سارجنٹ میجر ہے جس کی نافرمانی ایک کیڈٹ کی عاقبت کے لئے سخت مضر ثابت ہوتی ہے۔

ناشتہ کے بعد جب میدان میں پہنچے تو سارجنٹ میجر کو غیر حاضر پایا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ غیر حاضر نہیں، ہم ہی وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔ گویا فوجی ضبط کی پہلی خوراک ہی اس قدر زود اثر نکلی۔ صحیح وقت پر سارجنٹ میجر نمودار ہوا تو اپنی فتح پر ذرا مسکرایا لیکن فوراً منجمد ہو گیا اور ہمیں حکم دیا کہ کوارٹر ماسٹر سٹور میں جا کر اپنے اپنے سائز کے بوٹ لے آؤ۔

بوٹ دیکھتے ہی محسوس ہوا کہ ہمیں پہننے کو وہ چیز دی جا رہی ہے جو گینڈوں کے پاؤں کے لئے زیادہ موزوں ہے اور جب پہن کر دو چار قدم چلنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے ٹانگا پر بت گھسیٹ رہے ہیں۔ فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا کہ ان بوٹوں کے ساتھ تو ڈبل بھی کرنا پڑے گا۔ یہ سنا تو تمام سلسلۂ قراقرم سر پر آ پڑا۔

دو تین دن خاکی کپڑوں کی تیاری میں صرف ہو گئے۔ اور ٹریننگ کے سلسلے میں فقط پی ٹی ہوتی، لیکن جب خاکی یونیفارم تیار ہو گئی اور ہم نے بوٹ پٹی پہننا سیکھ لیا تو باقاعدہ ڈرل شروع ہوئی۔

ڈرل کے آغاز سے پہلے کپتان صاحب نے ہماری TURN-OUT یعنی یونیفارم وغیرہ کا معائنہ کیا اور معائنہ کیا کیا، گویا ہمیں خوردبین کے نیچے رکھ دیا، وہ عیب بھی ڈھونڈ نکالے جو درمیانہ قابلیت کا فرشتہ بھی نہ دیکھ پاتا، یا دیکھ بھی لیتا، تو نظر انداز کر دیتا۔ ہم نے ڈرل میں شرکت سے پہلے فوجی کیڈٹ کو بوٹ، پٹی، نمبر، بٹن، بیٹی، فلیش وغیرہ دکھائی تھی، لیکن کمپنی کمانڈر صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی جیسے پہچان لیا اور فرمایا:

"کیڈٹ نمبر ۱۵، کالر پر ایک سفید ذرہ،

— INCORRECTLY DRESSED.

سزا: تین اکسٹرا ڈرل۔"

سارجنٹ میجر نے جو کاپی پنسل لئے کمپنی کمانڈر کے ارشادات قلمبند کر رہا تھا فوراً ہمارے اعمال نامے میں ہماری سزا کا اندراج کیا۔ کم و بیش ایسا ہی حشر ہر کیڈٹ کا ہوا حتیٰ کہ بیچارے فوجی کیڈٹ بھی نہ بچ سکے جو بظاہر پیدا[illegible]

[illegible]

یونیفارم میں ملبوس ہونے تھے۔

اس کے بعد ڈرل شروع ہوئی اور خوب تیزی اور تُندی سے حکم ملنے لگے :

"سیدھے دیکھو۔ چھاتی باہر۔ تھوڑی اُوپر، بازو ہلاؤ۔ ہاٹ، ہلو مت۔ مکھی مت اڑاؤ۔ ہنسو مت" وغیرہ وغیرہ۔

ان سب میں "ہلو مت" کے حکم پر عمل کرنا عذابِ عظیم تھا۔ سیدھے بُت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھجلی محسوس ہوتی ہے۔ اب ہاتھ کو جنبش دینا جرم ہے۔ کندھا کان تک نہیں پہنچ سکتا۔ کان کا خود ہلنا منشائے فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا منشائے سارجنٹ نہیں۔ عین اس وقت ایک مکھی ناک پر نازل ہوتی ہے۔ مکھی کو فنا کرنے کی بے پناہ خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن سارجنٹ سے آنکھ بچا نا کراما کاتبین سے آنکھ بچانا ہے مکھی پر دست درازی کا خیال آتا ہے تو گویا سارجنٹ ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے اور اپنی کاکنی[1] انگریزی میں چلا اٹھتا ہے: "DON'T KILL NO FLY" یعنی مکھی مت مارو۔ ہاتھ وہیں کا وہیں سوکھ جاتا ہے اور مکھی نہایت اطمینان سے ناک کے نشیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے۔ ایسے اشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کشی تھی۔ اس وقت زندگی کی واحد خواہش صرف اتنی ہوتی کہ کب ڈرل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان کھجائیں۔ اور بالآخر جب ڈرل ختم ہوتی اور ہم بلا خوفِ تعزیر کانوں کو چھو سکتے اور مکھیوں کو اُڑا سکتے تو ہمیں محسوس ہوتا کہ کان کھجانا اور مکھی اُڑانا بھی کس قدر عظیم عیاشی ہے، بلکہ اسی خوشی میں وہ آبلے بھی بھول جاتے جو اِن آہنی بوٹوں کے اندر ہی بنتے اور پھوٹتے تھے۔

لیکن اس بے مزہ ڈرل کا ایک پہلو مزےدار بھی تھا۔ اس کی درشتی کو گوارا کر دیا تھا اور وہ تھیں سارجنٹوں کی لا متناہی پھبتیاں جو وہ بے بس کیڈٹوں کی حرکات پر کستے تھے۔ سارجنٹوں نے نسلاً بعد نسل اس موضوع پر ایک بسیط و دلپذیر لٹریچر چھوڑا ہے جو اپنی نابکاری کی وجہ سے زیورِ طبع سے تو شاید کبھی آراستہ نہ ہوگا لیکن اس ادبِ عالیہ کے تلف ہونے کا بھی اندیشہ نہیں، کیونکہ یہ شہ پارے بیشمار سپاہیوں کے تواریخی سینوں میں محفوظ ہیں۔ ایک دن ڈرل کرتے ہوئے میرے ساتھ کے کیڈٹ نے پھرتی سے دو تین غلطیاں کر دیں۔ تیسری غلطی پر سارجنٹ کا رنگ پہلے لال، پھر پیلا اور بالآخر نیلا ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے جہاں کھڑا تھا وہیں رُک گیا۔ پھر باقی دنیا و مافیہا سے قطع نظر کرتے ہوئے خطاکار کیڈٹ کی طرف بڑھا۔ جب سارجنٹ اور کیڈٹ کا درمیانی فاصلہ صفر تھا، یعنی دونوں کی ناکیں چھو رہی تھیں، تو سارجنٹ الفاظ پیس پیس کر اپنے شکار سے یوں مخاطب ہوا:

"میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، ضبطِ تولید سراسر جائز معلوم ہونے لگتا ہے"

ہنسی کے بے پناہ ریلے سے ہمارے منہ کھلنے ہی والے تھے کہ سارجنٹ کے منہ سے "ہنسو مت" کا ایٹمی دھماکہ ہوا۔ ہم نے دانت تو بھینچ لئے لیکن ہماری اندرونی کیفیت وہ ناظر ہی سمجھ سکتا تھا جس کے پھٹنے میں تھوڑی سی مزید جھٹکے کی ضرورت ہو۔

بدقسمتی سے ہم میں سے ایک کیڈٹ ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار کھلکھلانے لگا۔ یہ سارجنٹ کے لئے دوسرا چیلنج تھا۔ اب کے ذرا بلند آواز سے مجرم سے مخاطب ہوا اور ہمارے مضمون کو شعر کے جامے میں پیش کیا:

لہ لندن کے غیر مہذب طبقے کی زبان

"ذرا آپ ہی بتائیں کہ آپ نے پیدائش کی زحمت کیوں گوارا کی ؟"

کیڈٹ ذرا کھسیانا ہو کر نیچے دیکھنے لگا، تو سارجنٹ گرجا :

"اوپر دیکھو، زمین کا معائنہ جنگی صبح سویرے کر چکا ہے۔"

کیڈٹ سارجنٹ کی یورش سے لڑکھڑایا اور اضطراب میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا ۔ اس پر سارجنٹ دوسرے کیڈٹوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا :

" ذرا دیکھنا، اب یہ حضرت براہ راست خدا سے آرڈر لینا چاہتے ہیں :

پھر کیڈٹ کی طرف مڑ کر چلایا :

" میری ناک کی سیدھ میں دیکھو، خدا بہت بلند لیول پر ہے :

پریڈ کے بعد اس کیڈٹ کا وزن خاصہ ہلکا ہو چکا تھا۔

ڈرل کے بعد تمام پریڈ پڑھائی یا پستول اور مشین گن وغیرہ کی سکھلائی کے تھے ۔ اگرچہ لیکچروں کے کمروں تک جانا بھی چپ راست یا ڈبل کے تابع تھا ؛ تاہم کمروں کے اندر دست و پا کی حرکات پر پابندی نہ تھی ۔ مثلاً مکھی یا مچھر سے تحفظ ہمارے بس کی بات تھی ۔ ان کی ناجائز پرواز پر ہم حسب ضرورت ہاتھ پاؤں ہلا سکتے تھے اور فقط اتنی سی آزادی سے زندگی میں کیف باقی تھا ۔

رات کو ڈنر پہ گئے تو ذکر اس موضوع پر نہ تھا کہ ہماری لفٹینی کس مرحلے پہ ہے بلکہ یہ کہ ڈرل میں کچھ نا غہ بھی ہوتا ہے یا نہیں ۔ فوجی کیڈٹ کے اس انکشاف پر کہ اتوار کو مکمل چھٹی ہوتی ہے بے اختیار اس کا منہ چومنے کو جی چاہا ۔ جبین نیاز میں تشکر سرسے [illegible]

سے اتوار کی تعطیل کا خصوصیت سے احساس ہونے لگا ۔ اتوار کا انتظار ہم سے زیادہ کسی نے نہ کیا ہوگا ۔ اب ہماری تمام تر دعائیں چھٹیوں اور بارش کے لئے وقف ہو گئیں اور لفٹینی کی عنایت کے لئے ہم نے اللہ تعالیٰ کو کبھی مزید زحمت نہ دی ۔

الغرض لفٹینی کا وہ حسین و جمیل قصر جسے ہم نے تصورات کے موقلم سے بنایا اور سجایا تھا، پہلے روز ہی منہدم ہو گیا اور یہ ابھی ابتدا تھی جو کچھ آگے ہوا ، اس کی روداد طویل بھی ہے اور جانگسل بھی ۔ مختصر یہ کہ پہلی ڈرل میں پاؤں فگار ہوئے تھے ۔ چند روز میں رائفل ملی تو سلوپ (SLOPE) کرتے کرتے ہاتھ بھی خونچکاں ہو گئے ۔ رائفل پر سنگین کا اضافہ ہوا اور مصنوعی دشمن کو مارنے کی مشق کرائی جانے لگی، تو تقریباً خودکشی ہو کر رہ گئی ۔ میلوں بے آب و دانہ مگر با پٹھو[1] مارچ کیا ۔ حتیٰ کہ ان کافر بوٹوں کے دل بھی موم ہو گئے لیکن کسی سارجنٹ کو رقت نہ ہوئی ۔ مسلسل کھدائی سے ارضِ مہو[2] کا سینہ شق ہو گیا لیکن کمپنی کمانڈر کا دل نہ پگھلا ۔ کمانڈنٹ صاحب نے ہمارے کھودے ہوئے مورچوں کے ہر خط اور زاویئے کا جائزہ لیا لیکن ہمارے زخمِ جگر کی خبر نہ لی ۔ نیمچ روڈ[3] کے چپے چپے پر ہم نے رنجور قدموں کے نقوش چھوڑے ۔ ہیما پہاڑی کے ہر سنگریزے پر ہم نے آبلے چھوڑے ۔ ہماری ہر صبح چوبی گھوڑے پر سے کودنے اور رسے پر چڑھنے میں صرف ہوئی اور ہماری ہر شام بے مرچ اور بد ذائقہ انگریزی ڈنر کی وجہ سے حرام ہو گئی ۔

---

[1] پٹھو ساز و سامان کا وہ وزنی تھیلا ہے جو مارچ کرتے وقت پشت پر اٹھایا جاتا ہے ۔

[2] مہو کے نواح میں ایک [illegible] ہے ۔

[3] ہیما ایک مشہور پہاڑی کا نام ہے [illegible]

اکسٹرا ڈرل سے بچنے کے لئے ہسپتال میں داخل ہونے کی بارہا کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ دلیسی کھانے کے لئے باورچی کی ہزار منتیں کیں لیکن بدبخت سارجنٹ کے ڈر سے وہ راضی نہ ہوا۔ جی چاہتا کہ اگر سارجنٹ کو نہیں تو کم از کم باورچی ہی کو قتل کر ڈالیں، لیکن اگر اس کی ہمت بھی ہوتی تو فرصت کہاں تھی ؟ اور آخرکار ایک روز فرصت ملی، تو معلوم ہوا کہ لفٹین ہوگئے ہیں۔

لیکن یہ لفٹینی ہم پر دوسرے جیسے ہی نازل نہیں ہوگئی تھی، بلکہ اس کی پیدائش کے لئے ہمیں بے چاری نرگس کی طرح پورے نو مہینے اپنی بے نوری پر رونا پڑا۔ چنانچہ ہم ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نیرنگیِ سیاست

ثاقب زیروی لاہور

یہی تو آج کی نیرنگیِ سیاست ہے
کہیں پہ ڈوبنے والا کہیں ابھرتا ہے
ہر ایک شخص یہاں پر ہے مرغِ بادنما
ہوا کے ساتھ ہی جو اپنا رُخ بدلتا ہے

اعجاز وارثی

قطعات

مشتاقِ وزارت

کہا جب ایک مشتاقِ وزارت دوست سے میں نے
غریبوں بے کسوں کو آج بھی روٹی نہیں ملتی
تو جھنجھلا کر بہ آوازِ بلند ارشاد فرمایا
تمہیں روٹی کی سوجھی ہے یہاں کرسی نہیں ملتی

انسان بے قصور ہے

بھلا انساں سے کیا مطلب یہ بیکاری کے اڈے تو
یہ بام و در چلاتے ہیں، یہ دیواریں چلاتی ہیں
سڑک کے حادثے میں قتل کرتے ہیں یہ تہمت ہے
حقیقت یہ ہے کہ مٹے نوشتوں کو خود کاریں چلاتی ہیں

اُردو

ہائے اُردو زباں! تری تقدیر
تیرے گلشن ہی تیرے مدفن ہیں
جن کو تو نے عروج بخشا تھا
آج ان میں بھی تیرے دشمن ہیں

پرائیویٹ بسیں

یہ پرائیویٹ بسیں ! خدا کی پناہ
جو ہے دانوں کو مات کرتی ہیں
ان کی رفتار ' جیسے جنگ کے مرد
جنگ بازوں سے بات کرتی ہیں

مونس بریلوی

ایک آزاد اُمیدوار!

میرا نشاں گدھا ہے مگر میں گدھا نہیں
صورت بُری ضرور ہے، دل کا بُرا نہیں
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کبھی بولتا نہیں
کوئی ام۔ ال۔ اے۔ ایم۔ پی میرا چچا نہیں
رنڈوا ہوں، ہوں اناتھ مجھے ووٹ دیجئے
میں جوڑتا ہوں ہاتھ، مجھے ووٹ دیجئے

اک بار مجھ کو آپ بنا دیجیے ایم۔ پی
چومے گی آکے میرے قدم خود منسٹری
یہ طے ہے بن ہی جاؤں گا میں کوئی منتری
سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
جنگوں میں پہلوانوں کے چھکے چھڑائے ہیں
جتنے ہیں داؤ پیچ سبھی آزمائے ہیں

دلّی کبھی گیا نہیں، اب جاؤں گا ضرور
ہوٹل اشوکا جا کے ڈنر کھاؤں گا ضرور
جن پتھ پہ اپنی کوٹھی میں بنواؤں گا ضرور
تقریر پارلیمنٹ میں فرماؤں گا ضرور
تقریر، جس کو سن کے حکومت بھی جائے کانپ
میرے مخالفوں کو تو بس سونگھ جائے سانپ

تنکے کی طرح وقت کی موجوں میں بہہ گیا
وابستہ دشمنوں کا ہر اک وار سہہ گیا
یہ راز کی ہے بات سرِ بزم کہہ گیا
قسمت خراب تھی جو میں فیل رہ گیا
ورنہ سیاسیات کا ماہر ہوں دوستو
تقریر میری سن کے نہ یوں زیرِ لب ہنسو!

روزِ ازل سے فرقہ پرستی کے ہوں خلاف
گانجا شراب جنگ کی مستی کے ہوں خلاف
گندی اگر ہے بستی تو بستی کے ہوں خلاف
راکٹ کا آج دور ہے پستی کے ہوں خلاف
انسان آج گھوم رہا ہے خلاؤں میں
ہے جنگ امن کے لئے ایٹم کی چھاؤں میں

پہچانتا ہوں قوم کا اچھی طرح مزاج
بھوکے کو روٹی چاہیئے بیمار کو علاج
ہونے نہ دوں گا قید میں تہہ خانوں میں اناج
نہ ٹیکس میں لگاؤں گا نہ لوں گا میں خراج
میں جانتا ہوں دیش کی جنتا غریب ہے
سرمایہ داری اصل میں ان کی رقیب ہے

اردو کو اس کا حق میں دلاؤں گا دوستو
ہندی کو دیش بھاشا بناؤں گا دوستو
چھوٹے بڑے کا فرق مٹاؤں گا دوستو
ہر ایک کو گلے سے لگاؤں گا دوستو
حق بات گر ہے جرم تو میں جیل جاؤں گا
بزدل نہیں ہوں جان پہ بھی کھیل جاؤں گا

آخر میں بس یہ تم سے گزارش ہے دوستو
بنواؤ ایم۔ پی تو نوازش ہے دوستو
نہ میرے پاس کوئی سفارش ہے دوستو
ہمت تمہاری اور مری کوشش ہے دوستو
جیتوں یا ہار جاؤں رہوں گا ترنگ میں
"گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں!" ▲

مناظر عاشق ہرگانوی

تبصرہ

لفظ تبصرہ میں جو لطافت، شیرینی، بھیانک پن اور خوفزدگی ہے اس سے کوئی بھی پڑھا لکھا شخص متاثر ہو سکتا ہے۔ تبصرہ کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے یا اس کے لغوی، لفظی، ظاہری، باطنی، تخیلی اور حقیقت سے قریب معنی پر غور کیا جائے تو متاثر ہونے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ پانچ حرفی لفظ اپنے اندر بے شمار معنی پوشیدہ رکھتا ہے۔ مثلاً

ت سے تصویر ۔ ب سے با اثر ۔ ص سے صحیفہ یعنی کتاب یا رسالہ

ر سے رابطہ یعنی تعلق ہ سے ہادی یعنی رہبر

اب اگر ان سبھی حروف کے معنی کو ملا کر پڑھا جائے تو تبصرہ کا مطلب یوں واضح ہوتا ہے :

تبصرہ وہ با اثر تصویر ہے جو کتاب یا رسالہ سے تعلق پیدا کراتی ہے اور اس کے بارے میں رہبری کرتی ہے۔

لیکن یہ معنی تو سنجیدہ لوگوں کے لئے ہے اور ان لوگوں کے لئے ہے جو نپٹ جاہل ہیں اور جن کے نزدیک کالا حرف، سفید حرف، سیاہی سے لکھا ہوا ہرا پیلا حرف یا پنسل سے لکھا ہوا حرف سبھی بھینس کے برابر ہے۔ حالانکہ بھینس کے دودھ سے صحت بنتی ہے، دماغ بڑھتا ہے اور آنکھوں کو روشنی ملتی ہے۔ مگر جن کے پاس یہ بھینس ہوتی ہے وہی لاغر، کند ذہن اور اندھے ہوتے ہیں۔

لفظ 'تبصرہ' کو ایک اور طرح سے پرکھا جا سکتا ہے جیسے

ت سے تبلد یعنی کند ذہن

ب سے بہمن یعنی چالاک

ص سے صحیفہ یعنی کتاب یا رسالہ

ر سے ردب یعنی جھاڑو دینا   ہ سے ہاتھ یعنی حربہ

اب ان سب کو ملا کر یوں پڑھا جائے :

تبصرہ وہ حربہ ہے جس کے ذریعہ نہایت چالاکی سے کسی کتاب یا رسالے پر جھاڑو پھیرتے ہوئے مصنف کی کند ذہنی کو ظاہر کیا جائے۔ یہاں کتاب یا رسالے سے شخصیت —— اور مصنف سے کوئی بھی آدمی مراد لیا جاسکتا ہے لیکن کسی بھی شخصیت یا آدمی پر تبصرہ کرنے والے ذہن کے گھوڑے کو لگام دینے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ بس کسی سانڈ کی طرح اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ سرپٹ دوڑتا پھرے اور ریلا مارتا رہے خواہ لہو کسی کا گرے، چھینٹا کہیں پر پڑے۔

جس طرح اسم کی، فعل کی، ماضی کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح 'تبصرہ' کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ میں مثال کے ذریعہ ان اقسام کو شمار کرتا ہوں، دیکھئے :

زبانی تبصرہ :

میرا بھانجہ مون اور بھانجی ہما کسی بات پر جھگڑا کر رہے تھے ہاتھا پائی کرتے کرتے جب دونوں بھائی بہن تھک گئے تو زبانی پر اتر آئے، دو چار فقرے کہنے کے بعد مون بولا۔ "تو گدھی ہے"

ہما نے فوراً تپاک سے جواب دیا "اور تو اس کا بھائی ہے"

بے ساختہ تبصرہ :

دوسری قسم کی مثال دیکھئے :

بھابی اپنے مائکے گئی ہوئی تھیں۔ ایک دن اپنے منّے کا سوئٹر بن رہی تھیں۔ اتنے میں ڈاکیہ آگیا۔ خط پڑھنے کے لئے جونہی انھوں نے سوئٹر نیچے رکھا، اس میں سے ایک پھندہ نکل گیا۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا "میرا گھر (پھندہ) گر گیا"

پاس بیٹھی ہوئی ڈولی ایک دم بول اٹھی "ممی، اچھا ہوا، آپ وہ بنگلہ میں نہیں تھیں، ورنہ گھر میں دب جاتیں۔

بے حیا تبصرہ :

تیسری قسم ملاحظہ فرمائیے :

ایک شام میرے ایک دوست اپنے اہل و عیال کے ساتھ سینما دیکھنے نکلے۔ اسکوٹر پر آگے والی سیٹ پر وہ خود بیٹھے اور پیچھے ان کی بیوی اور منّا۔

ابھی تھوڑا ہی راستہ طے ہوا تھا کہ میرے دوست کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ انھوں نے بیوی سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ پروگرام رد کر دیا جائے مگر بیوی صاحبہ کی قوتِ ارادی بہت تیز تھی چنانچہ انھوں نے اپنے شوہر کو سمجھایا "آپ ناحق فکر کرتے ہیں۔ معمولی درد ہے سینما چل کر تھوڑا سوڈا وغیرہ پی لیں گے۔ اب آدھا راستہ تو آ ہی گئے ہیں، تھوڑی دیر کی بات ہے"

شوہر صاحب نے بڑے مسکین انداز میں کہا "مگر مجھ سے اسکوٹر نہیں چلایا جا رہا ہے"

بیوی صاحبہ ایک دم گویا ہوئیں "آپ میری جگہ آجائیں۔ میں اسکوٹر چلاتی ہوں۔ آپ منّا کو اپنی گود میں لیکر بیٹھ جائیں وقت بہت کم ہے"

اور تھوڑی دیر بعد بیوی صاحبہ مڈک پہ اسکوٹر چلائے جا رہی تھیں اور شوہر نامدار، ناہنجار، زن مرید مُفّا کو گود میں بیٹھے تھے اور بے حیائی سے دیکھنے والوں کی نگاہوں کا سامنا کر رہے تھے۔

نانسنس تبصرہ : چوتھی قسم

میرے ایک دوست نے گھر کی آخری جمع پونجی داؤ پہ لگا کر ایک اسٹوڈیو کھولا۔ اسٹوڈیو کے دونوں طرف اُردو اور ہندی میں دو لمبے لمبے بورڈ آویزاں کئے جن پہ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

یہاں ڈیولپنگ، پرنٹنگ، انلارجمنٹ اور ٹیسلیو پرنٹنگ کا کام نہایت تسلّی بخش ہوتا ہے نیز مووی کیمرہ سے ۱۳۵ ملی میٹر کے فلم تیار کئے ڈھلتے ہیں۔ بیاہ شادی، جنم دن اور مرن دن پہ ہماری خدمات سے فائدہ اٹھائیے۔

پہلے ہی دن جو گاہک آیا اس کا حلیہ کچھ اس طرح تھا ـــ پرنالے کے مانند پائینچے والی سیاہ پتلون اور سفید رنگ کا کرتا میں ملبوس۔ سر کے بال کچھ اس طرح نظر آرہے تھے جیسے گھوڑا مونڈنے کی مشین غلطی سے سر پہ چل گئی ہو۔ اس کے ساتھ ایک دوشیزہ نازک اندام بھی تھی۔ جسم پر نہایت چست لباس تھا۔ چہرے پہ پاؤڈر اور سرخی کا استعمال دل کھول کر کیا گیا تھا آنکھوں کے کاجل کے ڈورے کانوں پہ یلغاریں کر رہے تھے۔ بال باب کئے ہوئے تھے۔ میرے دوست نے انکساری سے کہا "آئیے" تشریف لائیے"۔

" آپ کے پاس کوئی ایسا البم ہے جس سے ہم کوئی پوز چن سکیں ؟" نوجوان بولا۔

" اس کی فکر نہ کیجئے۔ میں خود ہی عمدہ سا پوز بنا دوں گا۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے ؟"

"شادی ؟" نوجوان حیرت سے بولا " نہیں "

"منگنی !"

" نہیں " نوجوان نے الجھن بھری آواز میں کہا " سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بے تکے سوالوں کا مقصد کیا ہے ؟ "

" انہی پہ تو پوز کا دارومدار ہے " میرے دوست نے اپنی بغیر تجربے کی قابلیت کا مظاہرہ کیا " خیر آپ سچے عاشق کی طرح اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھام کر دو زانو ہو جائیے "

" وھاٹ نانسنس " نوجوان بڑبڑایا۔

دوشیزہ جھینپ گئی۔ میرے دوست نے سمجھا کہ آج کل رومان زدہ جوڑے کو زیادہ رومانٹک پوز کی ضرورت ہے۔

" تو پھر آپ ان کی بغل .... "

" یو فول ! یہ میری بہن ہے۔ آؤ شبانہ "

اور اگلے لمحے اسٹوڈیو میں میرا دوست اور اس کا کیمرہ ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

جادوئی تبصرہ : پانچویں قسم

فی زمانہ انسان کے پاس سب کچھ ہو۔ زمین، جائداد، دھن دولت، عزت، شہرت، فن کا مانہ مہارت، دماغی جسمانی قوت، حیرت انگیز خوبیاں، مگر ایک کرسی نہ ہو تو یہ ساری خوبیاں بے اثر ہیں ـــ ویسے دیکھا جائے تو ہر زمانے

میں کسی نہ کسی چیز کی محروم ہوتی ہے۔ اگلے وقتوں میں قلم، یعنی علم کو اتنی اہمیت تھی کہ بادشاہ تک کی کرسی اس کے آگے جھکتی تھی۔ پھر زمانہ آیا تلوار کا، جس کے ہاتھ میں تلوار ہوتی، اس کے بس میں قلم اور کرسی سبھی کچھ ہوتا۔ قلم تلوار والے کی قصیدہ خوانی کرتا اور کرسی اسے اپنے اوپر بٹھاتی۔ آج زمانہ ہے کرسی کا۔ تلوار اور قلم دونوں ہی اس کے غلام بنے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب کرسی کے آگے دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ تلوار اور قلم کی بھی اہمیت جاتی رہی ہے۔ کتنا جادو ہے اس کرسی میں۔ اس کی خاطر بعض لوگ اپنی بیویوں تک کا سودا کر ڈالتے ہیں۔

یہ تو سیدھے رُخ سے تبصرہ کی چند قسمیں ہوئیں۔ اب اس کا دوسرا رُخ بھی دیکھئے:

کسی کتاب یا رسالے پر تبصرہ کرنے کے لئے چند شرائط کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان پر عمل کس حد تک ہوتا ہے اور نصابی ڈھنگ کو برتنے والے کتنے لوگ سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام کیا ہے؟ اس کے مصنف کون ہیں؟ یہ تصنیف ہے یعنی طبعزاد ہے یا تالیف ہے یا اُسے کسی صاحب نے مرتب کیا ہے یا چند لوگوں نے مل کر مرتب کیا ہے —— دوسری بات یہ کہ اس کا سائز کیا ہے —— یہ کتنے اوراق پر مشتمل ہے؟ دیباچہ کس کا لکھا ہوا ہے؟ اگر تقریظ ہے تو کس کی لکھی ہوئی ہے یا اس کتاب کے بارے میں خود مصنف یا مؤلف یا مترجم نے عرض حال میں کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے؟ کتاب کا یہ کون سا ایڈیشن ہے؟ کاغذ کیسا ہے؟ طباعت کیسی ہے؟ اور معیار —— کتاب کے معیار کا قطعی ذکر نہیں ہونا چاہئے ورنہ اتنے سارے لوازمات کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ معیار کو سہارا دینے کے لئے دوسری تمام باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے

ویسے ایک اور طرح سے بھی تبصرہ کیا جا سکتا ہے —— چونکہ ہو سکتا ہے اس لئے کسی ایرے غیرے مصنف کی کتاب پر تبصرہ کرنے کی بجائے اپنی ہی وجود میں آنے والی کتاب پر تبصرہ کر کے مثال دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ دیکھئے!

ادب میں گھوسٹ ازم —— مناظر عاشق ہرگانوی

ضخامت: لامعلوم — قیمت: لامعلوم — ناشر: لامعلوم

ہرگانوی کے "ادب میں گھوسٹ ازم" میں برستا ہوا طنز صاف جھلک رہا ہے۔ اس کتاب میں شامل تخلیقات میں شگوفہ، شاعر، اوراق، سیپ، بیسویں صدی، صبح امید، ہیبی پنچ، گمدھو پنچ، مسرو پنچ، حریم اور دوسرے ادبی و غیر ادبی رسائل میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ پڑھنے کی نوبت اب تک نہیں آئی ہے۔ دیکھتے ہوئے ان خردہ کا یہ تھوک روپ مجھے پسند آیا۔ طنز کے میدان میں بنوٹ بھانجتے ہوئے ہرگانوی نے نئے داؤ پیچ بھی نکالے ہیں۔ "ادب میں گھوسٹ ازم" کے بیشتر طنزیے اسی داؤ پیچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ داؤ پیچ کہیں کہیں ادب کی بھول بھلیاں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً "عقل کے دشمن" اور "بیوی ایک سائنسداں کی" میں کہانی پن زیادہ ہے۔ طنز کے ذوق میں یہ نابالغ کہلائے گا۔ ویسے ہرگانوی شروع سے ادب کے ساتھ زنا کرتے رہے ہیں اور ان کے نزدیک یہ فعل جائز ہے کیونکہ طنز نگار گناہ ثواب کا کھاتہ بھی اپنی پیدائش کے ساتھ لے کر آتا ہے۔ فرشتوں کی ڈیوٹی اپنے عمل کے ساتھ نہیں لگا ہے۔ ہرگانوی کے یہاں ایک ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ اب تک تجرد کی زندگی گذار رہے ہیں اور ایک مجرد گاہ میں رہتے ہیں!

ہے کہ ان کے بدن کے ساتھ ان کی تحریر سے بھی ایک سوندھی بو آتی ہے اور اسی بو کے سبب ان پر تھوڑی زنانیت کا اتنا ہی نیا ہے جتنی نئی ان کی طنزیہ تحریریں ہیں۔ اس مجموعہ کے مضامین "ادب میں گھوسٹ ازم" "بچہ" غلط کہیں یچے مطلب .... " "پیکرانِ بے سخن" وغیرہ کو دس پندرہ سال بعد پڑھنے پر ایسا لگے گا گویا بیتے زمانے مثلیں الٹ رہے ہیں۔ باسی کڑھی میں اُبال غالباً ایسی ہی کتابوں میں آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کتاب آج تک دیہ پوری نہ اُترے اور نذرِ دیمک ہو جائے ـــــ حالانکہ پورے ہرگانوی گھوم پھر کر اس مجموعہ میں ہیں۔ اخبار سائل میں مختصر مختصر ہوکر یا ٹوٹ ٹوٹ کر سامنے آتے رہے تھے۔ اس لئے سمجھنا مشکل تھا۔ اب اس مجموعہ کے منظرِعام بانے سے اتنا تو ضرور ہو گیا ہے کہ جوتے گھس کر چپل نہ بنیں گے ـــــ مجموعہ کے معیارِ بخشش کے بارے میں شکایت نہیں ہے۔

شاید آپ یہ سوال اٹھائیں کہ یہ تو نثر کی کتاب پر تبصرہ ہے۔ اگر منظوم کتاب ہوتی تو؟

تو تبصرہ یوں ہوتا :

خرافاتِ عاشق ـــــ مناظر عاشق ہرگانوی۔

ہرگانوی کے ہمعصروں اور تذکرہ نویسوں نے انہیں محض اس لئے نظر انداز کر دیا ہے کہ ان کے کلام میں سوقیانہ مرتی کے الفاظ کی کثرت ہے۔ لیکن ان کے بیشتر ہمعصر شعراء کے کلام کی قریب قریب یہی حالت ہے۔ تذکرہ نویس تعصب سے کام لیں۔ ہرگانوی بنیادی طور پر ایک ظریف شاعر ہیں اسی لئے ان کے اکثر اشعار پر شوخی و تمسخر کا غلبہ ہے بچپن سے ہی اشعار موزوں کرتے لگے ہیں اور رفتہ رفتہ فنا فی الشعر ہوتے جا رہے ہیں۔ نمونۂ کلام سے ان کی اتی شاعری کا اندازہ بخوبی لگ جاتا ہے ؎

مجھے ان کی یاد آج پھر آ رہی ہے ‌‌ ‌ میرے دل کی دھڑکن رُکی جا رہی ہے
کہیں میری بیگم خفا ہوں نہ مجھ سے ‌ ‌ میری کھوپڑی آج کھجلا رہی ہے

میں کیا دیکھ پاؤں گا ان کی بلندی ‌ ‌ میرے سر سے ٹوپی گری جا رہی ہے
یہ فیشن پرستی کی حد ہو چکی ہے ‌ ‌ کہ لڑکی بھی پتلون سلوا رہی ہے

محبت میں لاتیں پڑی تھیں تمہیں جب ‌ ‌ وہ لیپ کا فسانہ تمہیں یاد نہ ہو گا
حسینہ کے فادر کا کوڑا اٹھا کے ‌ ‌ لگانا سڑاسڑ تمہیں یاد ہو گا

الکشن کے وعدے نہیں بھول جانا ‌ ‌ وہ پچھلے ارادے نہیں بھول جانا
ہمیں نے منسٹر بنایا ہے تم کو ‌ ‌ کہ تم پہلے کیا تھے نہیں بھول جانا

سرِ عام کھائیں گے چپل تمہاری　　جو دیکھیں گے ہم کو وہ ہنستے رہیں گے
نہیں مار کھانے سے ڈرتے ہیں عاشق　　یوں ہی دن ہمارے گزرتے رہیں گے

غرض زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر تبصرہ نہیں کیا جاتا ہے اور لوگ اس سے گھبراتے نہیں ہیں اتنی ساری باتیں لکھ کر میں خود سوچ رہا ہوں کہ تبصرہ کا رخ نہ جانے کس کروٹ بیٹھتا ہے ــــ!

[illegible]

حسین منظر ہوں فلمایا گیا ہوں
مگر اندھوں کو دکھلایا گیا ہوں

کبھی چمچوں سے بلوایا گیا ہوں
کبھی گرگوں سے پٹوایا گیا ہوں

گیا میرج میں ان کی گیسٹ ہو کر
مگر گیرج میں ٹھہرایا گیا ہوں

سیہ زلفوں کا جب بھی ذکر چھیڑا
سیہ کتے سے کنواٹا (؟) گیا ہوں

محبت نے کیا میرا کباڑا
فقط وعدے پہ ٹرخایا گیا ہوں

پچھاڑا گردشِ دوراں نے مجھ کو
بڑی مشکل سے اٹھوایا گیا ہوں

مجھے ڈھونڈا گیا مسجد میں لیکن
سینما ہال میں پایا گیا ہوں

مجھے ساقی نے پیاسا مار ڈالا
تھا ندی میں پھنکوایا گیا ہوں

وہ بانکے ہوں کہ اکثر بانکپن سے
[illegible]

[illegible]

افسر کے لئے اور نہ ٹیچر کے لئے ہے
مخصوص یہ کرسی تو منسٹر کے لئے ہے

نائیلون کی ساڑی، مری بیگم پہ کھلے گی
سوتی کی جو ساڑی ہے وہ سسٹر کیلئے ہے

لازم ہے کہ ہو اُن ہی کے ہاتھوں اُدگھاٹن
کیا کام یہی چیف منسٹر کے لئے ہے

قسمت ہی سے بنتا ہے کوئی پرائم منسٹر
یہ پوسٹ ہی قسمت کے سکندر کیلئے ہے

یہ بھیڑ، یہ پولیس، یہ جے جے کی صدائیں
ہنگامہ فقط ایک منسٹر کے لئے ہے

ہم اپنی ہزل اور کسے بھیجیں گے محبوب
یہ صرف "شگوفہ" کے ایڈیٹر کیلئے ہے

[illegible]

وقت کیسا یہ کیا سماں ہے میاں
بوڑھی انّثی کی بھی جواں ہے میاں

کل تھے لیڈر تھا آسماں پہ دماغ
کل تک ان کا نشاں کہاں ہے میاں

آج پھر رسم جو دکھائی ہے
[illegible]

[illegible] سا [illegible]
[illegible] میری جاں [illegible]

سلیم مقصود

ایک شب کا شاعر

"جب ایک بہشتی ایک دن کا بادشاہ بن سکتا ہے تو ہمارے ایک پہلوان دوست زماں بھائی کیوں ایک شب
شاعر نہیں بن سکتے۔؟" ہم نے سوچا

زماں بھائی میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو آجکل کے شعراء میں پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف ڈیل ڈول کا تھا۔
کا ڈیل ڈول ہاتھی اور اونٹ کے درمیان والی کسی شئے جیسا تھا۔ غرض ہم نے اس خیال کے آتے ہی زماں بھائی کی مرضی
نے کے لئے اُن سے کہا "زماں بھائی! آج کے مشاعرے میں آپ بھی حصہ لیں گے!" زماں بھائی ہنس کر بولے "مشاعرہ ہے!
ڈا ہوتا تو بے شک ہم بھی برابر حصہ لیتے!" ہم نے جواب دیا "آج کل کے مشاعرے بھی اکھاڑوں سے کم نہیں۔ اگر آپ چلیں
تو کامیاب شاعر بن جائیں گے!" انھوں نے حیرت سے پوچھا "کیا آجکل مشاعروں میں شاعر سے شاعر کی کشتی کروائی
جاتی ہے! آخر کیا معاملہ ہے کہ ہمارے بھی چل نکلنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں؟" ہم نے انھیں سمجھایا کہ ایسا نہیں ہے
ہم انھیں نقلی یا (DUPLICATE) شاعر بنادیں گے۔ وہ بے چارے تیار ہو گئے۔ ہم نے ان سے کہا کہ یہ کیا ابھی اور اسی وقت
چاہیئے۔ فوراً ہم نے اخبار میں مقامی خبروں کے کالم پر نظر ڈالی ۔ اسی شب "بزم جا ہلان ادب" کے زیر اہتمام ' ایک مشاعرہ تھا
ک بڑی تیاری کے ساتھ اس جگہ پہنچے مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے زماں بھائی المتخلص "شہ زور" کا نام بھی شاعروں
ہرست میں داخل کروا دیا۔ وہاں شاعر گردنیں اکڑائے یوں بیٹھے تھے جیسے ریس کے گھوڑے دوڑنے سے پہلے میدان میں کھڑے
ہیں۔ زماں بھائی کا نام پکارا گیا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے :

"کمبخت نے ہمارے نام کے ساتھ "پہلوان" کے اسم توصیفی کا اضافہ نہیں کیا۔ ہم پہلوان پہلے ہیں اور شاعر
ہیں۔ ہم نے فوراً معتمد مشاعرہ کی توجہ اس خطرناک غلطی کی طرف مبذول کروائی تب ان کا نام ان کے توصیفی اسم کے ساتھ

دوبارہ پکارا گیا۔ زماں بھائی نے ڈائس پر جا کر اپنی شیروانی کی جیبیں ٹٹولنی شروع کیں لیکن ان جیبوں سے کچھ برآمد نہ ہو سکا انھوں نے جھنجھلا کر ڈائس سے ہانک لگائی "مرزا بھائی! دوسری غزل بھیجنا وہ غزل سالی تو کہیں گم ہو گئی"۔ ہم سٹپٹا گئے ہم نے آہستہ سے زماں بھائی کے قریبی و واحد شاگرد رشید کے کان میں کہا کہ پہلوان نے غزل تو لنگوٹ میں لگا رکھی تھی۔ شاگرد رشید نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے چھلانگ لگائی اور استاد کے قدموں میں گرتے ہوئے استاد کو غزل کا اتا پتا بتلایا۔ زماں بھائی نے فوراً سامعین کی طرف پیٹھ کر دی اور فوراً لنگوٹ میں سے مڑا تڑا کاغذ کا ٹکڑا نکالا جس پر غزل لکھی ہوئی تھی اور تحت اللفظ غزل سنانی شروع کی جس پر کمزور دل سامعین ہال سے اٹھ کر باہر آ گئے اور جب باقی غزل انھوں نے ترنم سے شروع کی تو تمام لوگوں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لئے تاکہ چھت گرنے پر آسے اپنے ہاتھوں پر تھام سکیں صرف ڈائس پر بیٹھے ہوئے شاعروں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ زماں بھائی کو اس دہشت و افراتفری میں کسی نے داد نہیں دی۔ ان کے اندر کا پہلوان فوراً جاگ اٹھا۔ انھوں نے غزل کا آخری شعر پڑھنے کے بعد سامعین سے اور پھر ان کے بعد شاعروں سے مخاطب ہو کر یوں وارننگ دی۔ "مجھے کسی نے بھی داد نہیں دی۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ دوسروں کو کیسے داد ملتی ہے؟" بس وہ ایک غزل ختم کر کے ڈائس کی سیدھی جانب کھڑے ہو گئے۔ انھیں وہاں سے ہٹانے کی لاکھ کوششیں کی گئیں لیکن اس میں کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ زماں بھائی کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ اکھاڑے میں زمین پر اگر گر جاتے تو بغیر چیت ہوئے نہیں اٹھتے تھے۔ آج دوسری خصوصیت کا ہمیں پتہ چلا کہ وہ اگر ضد پہ آ جائیں تو گھنٹوں "دھوبی پاٹ مارنے" کے انداز میں کھڑے رہتے ہیں اور کوئی انھیں ہلا تک نہ سکتا۔ لوگ زماں بھائی کے قریب جانے سے ڈرنے لگے کہ کہیں وہ انھیں دھوبی پاٹ نہ مار دیں۔ تھوڑی دیر تک تو لوگوں نے ان سے ڈر کر داد نہ دی لیکن اس کے بعد "زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زماں صیاد" والا معاملہ ہو گیا۔ نظروں کے اشارے، ابروؤں کے خم سے داد دی جانے لگی۔ اس کے بعد انگلیوں کے اشاروں سے پھر بعض دل والوں نے جی دل کر کے کھلے بندوں داد دینی شروع کی تو سب نے اس حق کا استعمال جائز اور ناجائز ہر طرح سے کرنا شروع کر دیا۔ مشاعرہ گاہ داد کے جگر خراش نعروں سے گونجنے لگا۔ زماں بھائی نے فوراً نشست گاہ پر ہلّہ بول دیا۔ بھاگ دوڑ مچ گئی۔ مشاعرہ سیاسی جلسہ میں تبدیل ہو گیا۔ کئی لوگ زخمی ہو گئے۔ کئی دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔ پولیس آ گئی۔ زخمیوں کو فوراً طبی امداد پہنچائی گئی۔ جو لوگ شدید طور پر زخمی ہو گئے تھے انہیں ہسپتال پہنچایا گیا۔ زماں بھائی گرفتار کر لئے گئے۔ توڑ پھوڑ دنگا فساد مچانے کے انعام میں انہیں (۳) ماہ کی قید با مشقت اور کچھ جرمانہ ہو گیا۔ ہمارے (۳) ماہ بڑی مصیبت سے کٹے ہر وقت یہی سوچ لگی رہتی کہ پہلوان کے باہر آنے کے بعد کیا ہو گا؟ عدالت میں انھوں نے ہمیں ایسی نظروں سے دیکھا جیسا ڈاکو مان سنگھ نے اپنے گرفتار کرنے والوں کو دیکھا ہو گا۔ بار بار وہ اپنی خوں بار آنکھوں سے کہہ رہے تھے "قید سے آزاد ہونے کے بعد تیرا نام و نشاں مٹا دوں گا۔ اصل فساد کی جڑ تو تو ہی تھا۔ نہ تو غزل پڑھنے کو اکساتا نہ یہ سب ہوتا۔ ہمیں اپنا نام و نشاں دونوں دھندلے پڑتے نظر آتے۔ نام کے مٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی؟ نام بھی مختصر نشان بھی مختصر۔ داد نہ دینے والوں کا جب اتنا برا حشر ہوا تھا تو وہ شخص جو اس فساد کا بانی تھا اس کا حشر معلوم! بہر حال ان دنوں ہمارا بڑا برا حال تھا۔ پانچوں حواسوں میں سے تین حواس

دتقریباً معطل ہوچکے تھے۔ البتہ باقی دو حواس "دوگنی حِس والے" ہوگئے تھے جو چیز موٹی یا بے ڈیل ڈول دکھائی پڑتی اس پر فوراً زماں بھائی پہلوان کا گمان ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اچانک سامنے آ کھڑے ہوں۔

ایک دن ہمارے کمرے کا دروازہ دھماکے سے آنکڑوں سمیت ہم پہ آن پڑا۔ فلموں میں ایسے منظر ہمیں بہت بھاتے ے لیکن حقیقی زندگی میں ہم اس منظر کو ایک لمحہ برداشت نہ کرسکے۔ زماں بھائی نے ہم پر سے دروازہ اٹھایا اور پھر ہمیں بھی زمین سے کالر پکڑ کر اٹھا کر کھڑا کیا اور کہنے لگے۔ "پیارے! تیری غزل تو تھی بہت اچھی۔ ہمارے پڑھنے کا انداز بالکل بیٹ نسل کے شور پانے والوں جیسا تھا اس لئے وہ ہنگامہ ہوگیا۔ تیرا قصور یہ تھا کہ تو نے ہمیں شعر پڑھنے کا طریقہ نہیں بتلایا اور جیل میں ہمیں س بات پہ بھی کوفت ہوتی رہی کہ تو نے بھی داد نہیں دی تھی۔ تیرا بھی تو کچھ نہ کچھ انجام ہونا چاہیئے تھا۔ تیرے ہاتھ پاؤں رٹ جاتے تو کونسی سزا میں اضافہ ہوجاتا لیکن اب ہم نے تجھے معاف کردیا۔" ہم نے پوچھا "لیکن آپ نے یہ باتیں کس سے سیکھیں؟" ہنس کر بولے "اپنے ساتھ ایک شاعر بھی جیل بھگت رہا تھا اس نے یہ باتیں بتلائیں۔" ہم نے زماں بھائی کو اچھے موڈ ں دیکھ کر مزید کہا۔ "آپ شاعر تو نہ بن سکے چلئے آپ کو نثر نگار بناتے ہیں۔" انھوں نے ہنس کر ہمارے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔ "بھیا اب کے کتنے مہینوں کے لئے اندر بھجوانے کا ارادہ ہے؟" ہم اس دفعہ نہایت ہی سنجیدگی سے انھیں نثر نگار بنانے کے سلسلہ میں سوچ رہے تھے ان کے اس جواب پہ ہمیں بہت غصہ آیا۔ دل میں آیا کہ ان کی گھڑے دار گردن فوراً توڑ پھوڑ دیں مگر ہمارا خیال ان کی وانا پہ تابی مونچھوں اور زندہ طلسماتی ڈیل ڈول میں الجھ کر رہ گیا ـــــ

رشید سمیع جلیل

الیکشن کے مینڈک

موسم پھر آگیا ہے الیکشن کا دوستو
یہ خواب موسمی ہے اسے دیکھنا روا
بارش کی پہلی بوند پہ مینڈک اچھل پڑے
گھر گھر ہے مینڈکوں کی اچھل کود صبح و شام
میدان صاف دیکھ کے نیچے اتر گئے
کچھ پانیوں میں ہیں تو کوئی مینڈ پر ہے خوش
پچھلے الیکشنوں سے یہی بھوت ہے سوار
دیتی نہیں ہے ان کو کوئی پارٹی ٹکٹ
ہابی ہے بس یہی کہ الیکشن وہ ہار دیں
سازش کریں توازنِ طاقت بگاڑ دیں
لڑنا ہے ان کا کام الیکشن ہی کیوں نہ ہو
امن و اماں سے ان کو کوئی واسطہ نہیں
ووٹوں کی بھیک کیلئے "پدیاترا" کریں
گانٹے دکھائی دے کہیں بچھڑا ابھی یہ نہیں
پانی میں رہ کے جسم سے بدبو نہیں گئی
خشکی میں ناچ ناچ کے ٹرائیں گے ضرور
دوگز ہٹا لیتے تو یہ دوڑیں گے میل بھر
ووٹوں کی دوڑ ہار کے گھر بار سے گئے
ووٹوں کے چور ہیں یہ، کفن چور دیکھ لیں
عزت نہ مل سکی بھی تو شہرت وطن میں ہے
سرگرمیاں تمام ملیں جب انتخاب کی
میعاد پوری کر کے چلی جائے گی وبا

دیکھا ہے ایک خواب سیلکشن کا دوستو
تعبیر دو قدم پہ چلے غیب سے ہوا
گمنام خندقوں سے ہزاروں نکل پڑے
آرام بھی حرام ہے اب نیند بھی حرام
چلنے لگی جو سرد ہوا تو ٹھٹھر گئے
ٹرّا کے منتظر ہیں کہ مل جائے "گرمی گیس"
کروا چکے ہیں ضبط ضمانت بھی بار بار
آزاد ہیں بنائیں گے آزاد کیبنٹ
تقسیم کر کے ووٹوں کی شیخی بگھار دیں
جھنڈے مخالفوں کے کسی شب اکھاڑ دیں
گڑبڑ رہے مدام الیکشن ہی کیوں نہ ہو
جائیں گے اس طرف کو جدھر راستہ نہیں
رستے میں ڈھیر ہوں تو بڑی جاترا کریں
جنتا کے روبرو کبھی مرغا بھی یہ بنیں
جوتے ہمیشہ کھائے مگر خو نہیں گئی
کڑکی میں کود کود کے مر جائیں گے ضرور
ٹانگ اپنی بار بار یہ توڑیں گے میل بھر
پیغام تعزیت کے مگر تار سے گئے
زندہ ہیں بے حیا ابھی در گور دیکھ لیں
ہر ہم وطن کے واسطے عبرت وطن میں ہے
نکلے فرشتہ موت کا تعبیر خواب کی
گزرے گی کیا قریب سے پوچھو جو صبا؟

موسم گیا تو پھر وہی خندق نصیب ہیں
بھارت میں تیس سال سے مینڈک غریب ہیں

آہ سوشلزم! واہ سوشلزم!!

مظہرالزماں خاں

برسوں
سے سنتے آرہے
تھے کہ عنقریب سوشلزم
آرہا ہے۔ لیکن کب آرہا ہے،
کہاں سے آرہا ہے؟ کیسے آرہا ہے اور
کس سے آرہا ہے؟ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔
بس سب کا ایک ہی نعرہ تھا کہ بہت جلد سوشلزم
آرہا ہے۔ لیکن اُسے نہ آنا تھا سو نہ آیا۔ اور سوشلزم کا
صحت مند نعرہ بچّوں کے گیتوں اور لوریوں میں ڈھل گیا
مائیں اپنے بچوں کو آجا ری نندیا کی بجائے آجا
رے سوشلزم آجا... میرے ننھے کی
آنکھوں میں گھل جا گا کر سُلانے
لگیں۔ اور بے چارے
بوڑھے بھی سوشلزم
کو رو چکیں

برسیں
بیس گزرنے
لگیں... اب کے ساون
ہم کے آنگن، سوشلزم آ دن
لیکن افسوس دور دور تک سوشلزم کا
پتہ نہ تھا۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ سیاست دانوں
کی کرسیوں کے نیچے دب چکا تھا... چنانچہ سوشلزم
کا وہ پُر زور نعرہ سیکڑوں من برف کے نیچے دفن ہو گیا
اور اس کی صد سالہ برسی منانے کی تیاریاں بھی شروع
ہو گئی تھیں کہ اچانک اور غیر متوقع ریڈیو سے
یہ اعلان نشر ہوا کہ سوشلزم جس کا
تمہیں برسوں سے شدید انتظار تھا
کل وہ یقیناً ریل گاڑی سے
تشریف لا رہا ہے
لہٰذا ہم

سب کا یہ اولین فرض ہوگا کہ ہم سوشلزم کا شایانِ شان استقبال کریں ورنہ وہ پھر ناراض ہو کر لوٹ جائے گا تو کبھی واپس نہیں آئے گا.....
ریڈیو سے جوں ہی یہ اعلان نشر ہوا... ملک کے کونے کونے میں مسرت کی لہر "سردی کی طرح دوڑ گئی۔ مارے خوشی کے سب خالی پیٹ، خالی جیب، ننگے سر، ننگے پیر ہی اچھل اچھل کر ناچنے گانے لگے۔ چنانچہ ہم بھی بڑی بے چینی سے کل کا انتظار کرنے لگے، جو بہت اہم تھا، اور جس کے ہم برسوں سے منتظر تھے۔ وہ پیدا سوشلزم کل آرہا تھا۔ کل جو آنے والا ہے؟ بہرحال! .... خدا خدا کرکے نیا سورج طلوع ہوا تو ہم نے بھی صاف پاک لباس زیب تن کیا (جو ایک ہی تھا) اور سوشلزم کے استقبال کے لئے نکل پڑے.... کیا دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف ساری سروں کا اک سمندر ہے جو چلا جا رہا ہے۔ سبھوں کے ہاتھوں میں پھول مالا، مٹھائی کے ڈبے موجود تھے۔ لہٰذا ہم نے بھی پھولوں کا ایک ہار خرید لیا (مٹھائی کے لئے پیسے نہیں تھے اس لئے نہ لے سکے) اور سوشلزم کے استقبال کے لئے تیزی سے آگے بڑھنے لگے.... ایک بڑے میاں جن کے دونوں کاندھوں اور گردن پر بچے سوار تھے بڑی پھرتی دکھا رہے تھے.... ہم اُن کے قریب گئے اور جان بوجھ کر کہا... "قبلہ! اتنی تیزی سے کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"... وہ بولے۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ آج پہلی مرتبہ ہمارے ملک میں سوشلزم آرہا ہے اور ہم سب اُسی کا سواگت کرنے جا رہے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے قبلہ!" ہم نے کہا۔ "لیکن اس قدر گڑبڑ میں اِن بچوں کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟"
وہ بولے۔ "بچپن میں ہم جب نئے کپڑوں کے لیے ضد کرتے تھے تو ہمارے پڑدادا ہم سے کہا کرتے تھے کہ بیٹا بہت جلد سوشلزم آرہا ہے جب وہ آجائے گا تو ہم تمہیں ضرور نیا لباس سلوائیں گے۔ پھر یہی بات ہم اپنے بچوں سے کہتے رہے اور پھر ہمارے بچے اپنے بچوں سے.... چنانچہ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اچانک کل ریڈیو پر اعلان ہوا کہ اب کی بار سوشلزم سچ مچ آرہا ہے، لہٰذا ہم نے سوچا کہ ضرور ان بچوں کی قسمت جاگی ہے، ورنہ ہمارے آبا و اجداد سے ہم صرف آرہا ہے ہی سنتے آئے تھے۔"

"اچھا قبلہ! آپ آتے رہئے۔" ہم نے کہا۔ "کیونکہ کچھ اور لوگوں سے ہمیں سوشلزم کے متعلق استفسار کرنا ہے۔" یہ کہہ کر ہم آگے بڑھ گئے اور ایک اپاہج کے قریب جا کر... جس کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو چکی تھیں اور وہ کمر کے بل کچھوے کی طرح رینگ رہا تھا.... ہم نے اس سے پوچھا! "بھائی! کیا آپ بھی سوشلزم کا سواگت کرنے جا رہے ہیں؟"
وہ جھلا کر بولا... "کیوں؟ کیا میں سوشلزم کے گلے میں ہار نہیں ڈال سکتا؟ آخر میرا بھی تو دل ہے، دل میں آرزو ہے، اور پھر میں اسی امید پر تو آج تک کمر گھس رہا ہوں کہ ایک دن سوشلزم ضرور آئے گا، اور جب وہ آئے گا تو میں اس سے اپنے لئے ٹانگیں مانگ لوں گا۔ کیا مجھے اُس سے ٹانگیں مانگنے کا بھی حق نہیں ہے؟"
"کیوں نہیں بھائی!" ہم نے کہا۔ "بلکہ آپ کو اُس کی ٹانگیں چھین لینے کا بھی حق ہے... لیکن اس طرح رینگتے رینگتے جائیں گے تو وہ آکر بھی چلا جائے گا۔"

وہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولا۔ "یار! وہ مجھ سے زیادہ اپاہج ہے اور اس کی چال کچھوے سے بھی زیادہ سست ہے.... وہ کیا خاک جلدی آئے گا... سمجھے! اب جاؤ! فضول دماغ نہ چاٹو۔ پہلے ہی سوشلزم کے متعلق سوچتے سوچتے سر کے بال گنتی کے رہ گئے ہیں۔ اب تم مزید دماغ چاٹ کر اُن رہے سہے بالوں کو مجھ سے نہ چھینو اور اپنا راستہ لو۔"
واقعی غریب قابلِ رحم تھا۔ لہٰذا ہم اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے.... چند ہی فرلانگ پر ایک خارش زدہ وجود رینگ رہا تھا۔ اس کے اطراف سیکڑوں مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ ہم نے اس مظلوم سے کہا۔
"بھائی صاحب! اِن مکھیوں کو تو اڑاتے جاؤ!"
وہ بولا۔ "برسوں سے میرے وجود کے گرد مکھیاں چمٹی ہوئی ہیں... اب ان مکھیوں کو صرف سوشلزم ہی آکر اڑائے گا۔ ورنہ پھر میں اِن مکھیوں کی غذا بن جاؤں گا!"

اُس سے کچھ دور فاصلہ پر ایک دیوانہ بیٹھا مسلسل چیخ رہا تھا۔ "تم سب پاگل ہو، جو سوشلزم کے پیچھے دوڑ رہے ہو ..... ارے وہ تو سرمایہ دار کی توند میں مقید ہے ..... وہ کیا خاک آئے گا۔"

ہم نے اُسے سچا پاگل سمجھا اور آگے بڑھے اور ایک بڑی بی کے قریب جا کر کہا۔ جو بچوں کی پوری فوج کے ساتھ شاید سوشلزم پر حملہ کرنے جا رہی تھیں۔ "آداب خالہ جان!" بڑی بی کو ہم نے ادب سے سلام کیا، تو وہ بولیں۔

"شرم نہیں آتی! کیا میں تیری خالہ نظر آ رہی ہوں۔" بڑی بی نے تنک کر کہا، جن کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔

"معاف کرنا!" ہم نے معذرت کے ساتھ کہا۔ "ہم نے آپ کو اپنی سب سے چھوٹی خالہ سمجھ کر کہا تھا، جو ابھی کنواری ہیں"

تب وہ خوش ہو کر بولیں۔ "سوشلزم مبارک ہو!" ہم نے کہا۔ "آپ کو بھی سلامت ہو۔" وہ بولیں۔ "تیرے مُنہ میں گھی شکر۔" ہم نے کہا۔ "آپ کے مُنہ میں گڑ شکر"..... ہم کچھ اور بھی کہنے والے تھے کہ بچّے نے مداخلت کی جو بڑی بی کا ہاتھ تھامے ہمیں بجو بہ سمجھ کر دیکھ رہا تھا۔

"چچا جان! یہ سوسیلزجم کیسا ہے...؟"

ہم نے کہا۔ "سنئے! یہ کسی ماں کا اکوتا بیٹا ہے، جو برسوں پہلے بچھڑ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اب آ رہا ہے، خدا اس کی عمر دراز کرے، وہ صحیح سلامت آئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہ جائے۔" یہ کہہ کر ہم نے بڑی بی کو خدا حافظ کہا اور آگے بڑھنا ہی چاہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ اور ہم جوں ہی چونک کر پلٹے۔ ہمارے سامنے ٹانگے والا بھکو کھڑا تھا۔ جو دن رات اپنے ٹانگے میں سیٹھ دھرم داس سیٹھ کرم داس کو بٹھا کر شراب خانہ اور کوٹھوں پر لایا لے جایا کرتا تھا۔

وہ ہمیں دیکھ کر خوشی سے چیخا۔ "او صاحب! سوشلزم کی آمد مبارک ہو!" ہم نے بھی جواباً مبارک کا نعرہ بلند کیا۔

وہ قریب آکر بولا۔ "صاحب! میں اب اپنا گھسیٹا ٹانگہ سوشلزم کی نذر کر دوں گا۔ بچارا ہمارے لئے بڑی دور سے اور بڑی دیر سے آ رہا ہے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اسے ناراض نہ کریں۔ میں نے تو سنا ہے۔" بھکو، اپنا منہ ہمارے کان کے قریب لاکر بڑے رازدارانہ لہجہ میں بولا۔ "وہ برسوں سے سرمایہ داروں، سیاست دانوں اور اسمگلروں کی کرسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیسے چھوٹ گیا۔ صاحب! کہیں یہ لوگ اُسے پھر پکڑ کر بند تو نہیں کر دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر میری لڑکی کی شادی نہ ہو سکے گی جو تیس سال سے گھر میں بیٹھی ہوئی سوشلزم کا انتظار کر رہی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا بھکو!" ہم نے کہا۔ "تم مطمئن رہو، اور فوراً اپنی لڑکی کے لئے کوئی اچھا سا بر ڈھونڈ کر ہاتھ پیلے کر ڈالو کون جانے اس کا ارادہ بدل جائے اور وہ ہمارے یہاں آنے کی بجائے کہیں اور چلا جائے۔"

"کیا ایسا بھی ہوتا ہے صاحب!" بھکو نے تشویش آمیز لہجہ میں کہا۔

"ہاں بھکو! کیونکہ آج کل کسی کے قول و فعل کا بھروسہ نہیں رہا۔ اور پھر وہ تو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو صاحب! وہ آتے ہی میں اپنی لڑکی کا بیاہ کر ڈالوں گا..... اچھا صاحب! میں چلتا ہوں۔ ذرا جلدی ہے۔" یہ کہہ کر بھکو تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا اور ہم ہر ایک سے سوشلزم کے متعلق سوال جواب کرتے کراتے آخر اسٹیشن پہنچ ہی گئے۔ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں لوگ پھولوں کے ہار اور مٹھائی کے ڈبے لئے سوشلزم کے انتظار میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ لیکن سوشلزم کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ آخر سب تھک کر بیٹھ گئے۔ پھر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے، اور اونگھتے اونگھتے سو گئے۔ سب کو دیکھ کر ہمیں بھی نیند آ گئی اور ہم بھی سو گئے..... اچانک آنکھ اس وقت کھلی جب سردی کا احساس ہوا ہم نے چاروں طرف دیکھا تو سب غائب تھے۔ پورا اسٹیشن ویران ہو چکا تھا اور ہمارے جسم پر صرف انڈرویئر اور بنیان باقی رہ گئے تھے اور اسی حالت میں ہمیں اپنے مکان جانا تھا۔ بہرحال! ہم بچتے بچاتے، چھپتے چھپاتے آخر مکان تک پہنچ گئے اور جوں

ہم ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوئے۔ بیگم نے ہمارا یہ حلیہ دیکھ کر پہلے تو چیخنا شروع کیا کہ کہیں کوئی پاگل تو نہیں گھس آیا پھر چند لمحوں بعد غور سے دیکھ کر مسلسل قہقہے لگانے لگیں اور جب قہقہے رکے تو برہم ہو کر کہا۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ جاتے وقت تو اچھے بھلے گئے تھے۔ پھر یہ پاگلوں کی طرح لباس سے بے لباس کیوں ہو گئے؟"

ہم نے جھینپ کر کہا۔ "سوشلزم کو دے کر آئے ہیں بیگم! بیچارا ننگا تھا۔"

وہ بولیں۔ "ایک ہی تو جوڑا تھا، آپ نے وہ بھی دے دیا۔ اب کیا پہنیں گے؟"

ہم نے کہا۔ "فکر نہ کرو بیگم! وہ جلدی ہی آنے کا وعدہ کر گیا ہے۔ اگر آ جائے تو ہم تمہیں بھی ایک بڑھیا ساڑی خرید کر لا دیں گے۔ کیونکہ تمہاری بھی تو برسوں سے آرزو ہے کہ اگر سوشلزم آئے تو تمہیں ایک اچھی سی ساڑی دلا دی جائے۔"

"وہ آئے نہ آئے بعد کی بات ہے۔ اب کیا پہنو گے؟"

ہم نے کہا۔ "لنگی یا پھر دھوتی!"

الکشن

دو شعر

ہے لیڈر کو فقط دولت سے رغبت
کہاں کی کنٹری (COUNTRY)، اور کیسی نیشن (NATION)

کھلے جاتے ہیں وعدوں کے فلاورز (FLOWERS)
چلی آتی ہے پھر فصلِ الکشن

مصطفیٰ علی بیگ

قیصر شمیم
(نئی دہلی)

استاد

"خلیفہ" کی طرح 'استاد' بھی کثیر الاستعمال لفظ ہے اور اپنے دامن میں بڑی وسعتیں رکھتا ہے۔ کسی کا مذاق اُڑانا یا طنز کرنا ہو تو 'استاد' سے زیادہ موزوں لفظ کوئی اور نہیں، حد یہ کہ سر راہے کوئی صاحب گلے سے لپٹ جائیں اور بار بار یرزور دینے پر بھی انکا اسم مبارک ذہن میں نہ آئے تو 'استاد' کہکر اپنی جان بخشوا سکتے ہیں اس طرح یہ لفظ آپ کو پشیمان ہونے سے بچا سکتا ہے اس کی ت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے محلہ کا جھوندو پہلوان بھی استاد کے لقب سے پکارا جاتا ہے اور کلو جیب کترا بھی اپنی مہارت اور بلدستی کی وجہ سے استاد ہی کہلایا جاتا ہے۔ یہی نہیں سامنے نکڑ پر جو درزی کپڑے تراشتا ہے وہ بھی استاد ہی کے نام سے انا جاتا ہے۔ "استاد" کی اقسام سے آپ یقیناً واقف ہوں گے لیکن اس وقت 'استاد' سے میری مراد مندرجہ بالا کسی ستاد سے نہیں بلکہ اس خاص الخاص قسم کے استاد سے ہے جس کا تعلق تعلیم گاہ سے ہوتا ہے۔ میں بھی اسی قسم کا ایک استاد ہوں یہ دوسری بات ہے کہ استادوں کے مذکورہ تمام اقسام کی جملہ خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہوں اور ان کے مناسب استعمال سے بہت سی منازل میں نے دیکھتے ہی دیکھتے طے کر لی ہیں۔ اب میں ڈاکٹر ...... ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ کہلاتا ہوں۔

میری تحقیق کا موضوع میر تقی میر تھے۔ اپنی تحقیقی کاوش کے ذریعہ میں نے پہلی دفعہ یہ انکشاف کیا کہ میر دائمی قبض کا ر تھے جس کی وجہ سے ان کے پیٹ میں تیزابیت پیدا ہو گئی تھی اور چھاتی جلا کرتی تھی جسے انھوں نے "سوز دروں بلا" کا نام سینہ کی یہی جلن اس شعر کی محرک تھی ؎

چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے ۔۔۔ اک آگ سی لگی ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

میں نے اپنی تحقیقی کاوش کے ذریعہ یہ ثابت کر دکھایا کہ اس وقت نہ تو ہنی من ہی پیدا ہو سکا تھا اور نہ ہومیوپیتھی عالم وجود میں آئی تھی ورنہ آرجنٹم نائیٹریکم کی ایک خوراک ہی میر کو اس موذی مرض سے نجات دلاتی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی

منظور تھا۔ قدرت کے کارخانے میں کس کو دخل؟

میرے اس انکشاف پر ایک دھوم مچ گئی۔ بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب نے اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے قیمتی رائیں دیں۔ عام طور سے لوگ اس بات پر متفق تھے کہ میں نے اس تحقیق کے لئے دوسرے علوم کے علاوہ علم نفسیات اور طب سے بھی وسیع پیمانہ پر استفادہ کیا ہے اور مقالہ بڑی محنت سے لکھا ہے۔ گرچہ میں نے یہ مقالہ پی ایچ ڈی کے لئے لکھا تھا مگر میری تحقیقی اہمیت کے پیش نظر مجھے ڈی۔ لٹ کی ڈگری سے نواز دیا گیا۔ اب اس کو کیا کیجئے کہ ہم ہندوستانی بڑے ہی تنگ نظر واقع ہوئے ہیں کبھی کسی کی ترقی دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اسی واقعہ کو دشمنوں نے نیا نیا رنگ دینا شروع کر دیا۔ ایکسپرٹ کے فیورٹ ہونے اور ان پر ہونے والے اخراجات کی بات تو جانے ہی دیجئے، ان حاسدوں نے اس امر کو بھی پروپگنڈہ کی شکل دی کہ میں نے یہ مقالہ خود سے نہیں لکھا بلکہ کسی اور سے لکھوالیا تھا۔ بھئی اس قسم کی باتوں کے لئے کہا گیا ہے۔ "جواب جاہلاں باشد خموشی" ـــــ مدد حاصل کرنا اور بات ہے ورنہ وہ مسودہ اب تک میرے پاس موجود ہے جسے میں نے صاف صاف اپنے ہاتھ سے لکھا تھا تاکہ ٹائپسٹ آسانی سے پڑھ لے۔ یقین نہ آئے تو خط ملا کر دیکھ لیجئے۔ کمال تو یہ ہے کہ انہوں نے سب کچھ کہا مگر یہ نہیں کہ معاوضہ کتنا ادا کر دیتا ہوں۔ اب انہیں صاحب کا معاملہ لیجئے جنہوں نے میرے مقالے کے سلسلے میں مدد فرمائی۔ ابھی بے وقوفی سے ایم۔ اے میں سکنڈ ڈویژن لے آئے تھے۔ کون پوچھتا بھلا؟ پانچ، پانچ اور سات سات روپے کے عوض اخبارات کے کالم سیاہ کرتے پھر رہے تھے۔ میں نے جب تک کام لیا۔ قسم لے لیجئے جو کبھی تکلیف ہونے دی ہو۔ روپیوں کے علاوہ دعوتیں، فلمیں اور دوسری تفریحات ـــــ مجھ جیسے دو چار آدمی میسر آجائیں تو ساری زندگی ہی آرام سے کٹ جائے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صنعتی نظام ہم پر اسی طرح لادا گیا جس طرح پہلے غلامی اور پھر جمہوریت ـــــ میرا خیال ہے کہ کرپشن بھی ہم پر اسی طرح لاد دیا گیا ہے یعنی ہم بذات خود کرپٹ واقع نہیں ہوئے ہیں ـــــ اب اسی کو لیجئے کہ جب میں نیا نیا ایم۔ اے ہوا تو معلوم ہوا کہ لکچرر شپ ملنے میں آسانی ہو سکتی ہے اگر کچھ مضامین پکی روشنائی میں چھپے ہوئے پیش کر سکو۔ ان کی تعداد جتنی زیادہ ہو گی، اتنا ہی بہتر ہے۔ اگر انہیں دو چار گدھوں پر لاد کر انٹرویو بورڈ کے ممبروں کے سامنے پیش کیا جائے تو کیا کہنے۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے؟ کئی دنوں تک پریشان رہا۔ رات کی نیند حرام ہو گئی۔ کئی دفعہ کوشش کی کہ مختلف مضامین کے پیراگراف کو ملا کر "کاک ٹیل" تیار کر دوں' مگر کاک ٹیل تیار کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔ ہر ایرے غیرے کا کام نہیں۔ پھر انہیں پروفیسر صاحب کی درگاہ مبارک پر جا کر سوال کیا جہاں کے مشوروں اور دعاؤں کی برکت سے بی اے اور ایم اے میں ٹاپ کر سکا تھا۔ ایم اے کرتے ہی ہمارے تعلقات ذرا کشیدہ ہو گئے تھے۔ مگر میں مکھن بازی کی خاص ٹریننگ لے چکا ہوں اور پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں۔ اگر وہ اپنے دربان سے مجھے گیٹ کے باہر کر دینے کے لئے بھی کہتے تو اپنے پہ اعتماد ہے کہ میری مکھن بازی کے طفیل دربان انہیں ہی گیٹ باہر کر دیتا مگر مجھ سے کچھ نہ کہتا مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ میں نے دیکھتے ہی جھک جھک کر تین دفعہ فرشی سلام کئے تو وہ حضرت پگھل گئے اور اپنے زریں مشوروں سے نوازنے لگے۔ وہ تمام نوٹس جو پچھلی کلاسوں میں مختلف مضامین کے اقتباسات بہ ترتیب لکھائے گئے تھے میں نے ایک ایک' کر کے چھپوانے شروع کر دیئے۔

مضامین کا چھپوا لینا بھی آسان کام نہیں، اس کے لئے بھی ایک خاص قسم کی صلاحیت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہرکیف میں نے بھی وہی نسخہ آزمایا جسے ہمارے پیشرو آزما چکے تھے۔ ایڈیٹروں کو اتنے لمبے لمبے خطوط لکھے، ان میں اتنی دفعہ ان کی اور انکے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کی اور ان کی ادب دوستی اور سخن پروری کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رسالے کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا کہ خط پڑھتے پڑھتے بے دم ہوکر انھوں نے مضمون پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور ایسا کرتے بھی کیوں، جبکہ اس کے ساتھ ہی ایک مشہور ادیب کا سفارشی خط بھی منسلک ہوتا تھا اور سالانہ خریداری کی رقم بھی جسے عرفِ عام میں 'سالانہ چندہ' کہا جاتا ہے چنانچہ میں ایک ہی سال میں کسی رسالہ کا کئی کئی بار خصوصی اور عمومی خریدار بن جاتا تھا۔

اب تک میرے مضامین ملک کے اہم ترین رسالوں میں چھپ چکے ہیں اور میں ایک اہم ناقد شمار کیا جاتا ہوں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں کیوں کہ لکچرر بن جانے کے بعد ناقد بن جانا میرا بنیادی حق ہے۔ یہ اختیار صرف ہماری زبان کے اساتذہ کو ہی حاصل ہے اور اسی میں اس زبان کی عظمت کا راز بھی پوشیدہ ہے۔ ادھر چند سرپھرے لوگ تنقید کو کالج کی چہار دیواری سے باہر نکالنے کے لئے ہنگامے کر رہے ہیں۔ یہ لوگ سخت احمق معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس چہار دیواری سے باہر نکلتے ہی اس کی آبرو لٹ جائے گی اور ہر ایرا غیرا ناقد بنا پھرے گا۔ دراصل ایسے ہی سرپھرے لوگ زبان کی تباہی کا باعث ہیں ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

میں صرف ایک ناقد ہی نہیں بلکہ خصوصیت سے تنقید پڑھاتا بھی ہوں۔ میرے شاگرد ملک بھر میں قابلِ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے رعب کا یہ عالم ہے کہ جب ان سے اِملا کی غلطی ہوتی ہے تو اُسے "سلپ آف پن" تصوّر کیا جاتا ہے، خواہ وہ ہر تیسرے جملہ کے بعد ہی کیوں نہ پھسل جاتا ہو' ویسے اس میں میرا قصور نہیں ہوتا کیونکہ عام لڑکے تو میری سالانہ زیارت کر پاتے ہیں۔ اسی میں وہ اتنا کچھ حاصل کر لیتے ہیں کہ "ادب میں مستقل مقام" حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض "مقامات بلند" حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں میری خدمات کا اعتراف کرکے ایک ریاست کی اکیڈمی نے مجھے انعام سے نوازا ہے۔ احباب نے اس موقع پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مبارکباد پیش کرنے کی کوشش کی مگر مجھے تو خاطر خواہ خوشی نہ ہو سکی کیونکہ اس انعام کی رقم سے زیادہ تو میں مذکورہ اکیڈمی کے سکریٹری کی دعوتوں پر خرچ کر چکا تھا۔

لوگ اکثر مجھ سے میری شاندار کامیابیوں کا راز پوچھتے رہتے ہیں۔ اس انعامی واقعہ کے بعد تو اس راز کو جاننے کی خواہش ان لوگوں کے دل میں مزید بڑھ گئی ہے مگر میں سب پر اس راز کو آشکارا کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے صرف وہی مستفیض ہو سکتے ہیں جو ہفتہ میں کم از کم تین دفعہ میرے یہاں حاضری امزید دیتے ہوں۔ ورنہ عام لڑکوں کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ محنت اور ایمانداری سے پڑھیں تاکہ تھرڈ ڈویژن لاکر کلرکی کریں اور ڈبل روٹی کھا کر خوشی سے پھول جائیں۔ ۲۲

سالانہ خریداروں سے التماس ہے کہ خریداری کے اختتام پر بذریعہ منی آرڈر رقم روانہ فرمائیں دفتر سے وی پی بھجوانے کی صورت میں تین روپے زائد ادا کرنے ہوں گے۔ منیجر

اسمٰعیل آذر

مہاجن کی پگڑی

سرکار نے کیا اچھی ترکیب نکالی تھی
بھارت کے مہاجن کی پگڑی جو اچھالی تھی

بنکوں کے سہارے سے وہ دھوم مچا ڈالی
کھیتوں سے مہاجن کی بنیاد ہلا ڈالی

مزدور و جفاکش کی قسمت کے جو والی تھے
برسوں کے وہی داتا پل بھر میں موالی تھے

کچھ ایسی مچی بھگدڑ یوں حال ہوا پتلا
جس سمت ملا رستہ سرپٹ وہ ادھر بھاگا

بٹوے کا قلمداں سے کوئی نہ رہا ناطہ
کانوں سے گری پنسل بستے سے بہی کھاتہ

اتنی تو ملی مہلت پگڑی وہ اٹھا لیتے
آڑی ہی سہی لیکن سر پر تو جما لیتے

کیا خوب مہاجن نے رشتہ تو ہر اک توڑا
پگڑی نے مگر اب تک بھارت کو نہیں چھوڑا

پھرتی ہے ہر اک شئے میں بے خوف و خطر پگڑی
ہے بھوت مہاجن کی چلتی ہے نڈر پگڑی

ہوتا ہے بسر اس کا ہوٹل ہیں دوکانوں میں
رہتی ہے کبھی جا کر بھاڑے کے مکانوں میں

TO LET کی نظر آئی اس کو جو کہیں تختی
فوراً ہی وہاں جاکر بس جاتی ہے وہ تختی

دھندوں پہ تجارت پر اس کا جو پڑا سایہ
پگڑی کی نحوست نے کتنوں پہ ستم ڈھایا

راشن کی دوکانوں پر حق اپنا جماتی ہے
موجود ذخیروں کو آرام سے کھاتی ہے

وہ کونسا دفتر ہے پھیرے نہ لگاتی ہو
دانے نہ بچھاتی ہو مرغے نہ پھنساتی ہو

افسر کی درازوں میں چپکے سے چلی جائے
شوخی سے کلرکوں کی جیبوں میں چھپی جائے

اٹھلا کے پہنچتی ہے جب قصر عدالت میں
انصاف کھڑا ہوتا ہے اس کی وکالت میں

شادی میں براتوں میں بن ٹھن کے چلی آئے
ہر ایک براتی کو تحفہ بھی دیئے جائے

سالی کے لئے پگڑی سالے کے لئے پگڑی
دلہن کے گھر آنے پر نوشہ کے لئے پگڑی

اسکول میں بیٹے کو بھرتی کے لئے پگڑی
پکچر جو چلے شوہر بیوی کے لئے پگڑی

القصہ ہر اک محفل میں جلوہ فگن دیکھا
ہر شخص کو پگڑی کی الفت میں مگن دیکھا

حد یہ ہے کہ پگڑی کا جو بھوت بھگاتے ہیں
وہ ماہر حکمت بھی آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں

آذر بھی چلے آئے لے کر یہ دعا بر لب
پگڑی کا کبھی سر سے سایہ نہ اٹھے یارب

نظام احمد قریشی
(بھوپال)

بیوی کے انتخاب نے...!

خدا نہ کرے کہ سائنس گریجویٹ ہونے کے بعد کوئی ایسی لڑکی سے شادی کرے جس کے آگے بیچلر آف آرٹس کا طرۂ امتیاز لگا ہوا ہے۔ اس کا جتنا تلخ تجربہ ہمیں ہوا ہے اس سے کچھ ہم ہی خوب واقف ہیں۔ ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ جس نے فزکس، کیمسٹری اور میتھمیٹکس کی پرابلمز حل کرتے کرتے اپنی آدھی عمر بھی اس میں حل کر دی ہو، جس نے مکسچر اور کمپاؤنڈ کا تجزیہ کرتے کرتے خود اپنا تجزیہ کر ڈالا ہو۔ ظاہر ہے وہ کتنا خشک مزاج ہوگا اور اُسے رفیقِ حیات ملے تو ایسی جو بالکل اس کی ضد ہو جس نے ہر دم سرسبز و شاداب رہنے والی طبیعت پائی ہوئی آرٹس گریجویٹ ہو اردو اور فارسی جس کے محبوب مضامین رہے ہوں۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ شعر و شاعری سے نہ صرف رغبت ہو بلکہ خود بھی شاعرہ ہو۔ ایسی صورت میں شوہرِ غریب کو خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا پڑتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے جب کہ اس میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اس کی طرح دورانِ گفتگو شستہ اور فصیح الفاظ استعمال کر سکے یا موقع محل پر اشعار کے ذریعہ بات کو لطیف اور مؤثر بنا سکے۔ کوشش کرنے پر بھی اُسے کوئی شعر یاد نہیں آئے گا ہاں اگر کوئی شعر یاد نہیں آئے گا ہاں اگر کوئی چیز یاد آئے گی تو وہ ماڈرن اٹامک تھیوری قسم کی چیز ہوگی جو جانداروں کی موت کے آرڈر پر گھما رہی ہے۔

ممکن ہے بعض اصحاب یہ اعتراض کریں کہ بعض سائنس گریجویٹ بھی ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے ادب میں بڑا نام پیدا کیا ہے تو اُن کے لئے میرے پاس یہی جواب ہے کہ "پنج انگشت یکساں نہ کرد"

ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے یا شامتِ اعمال کہ ہماری رفیقۂ حیات بھی انہیں تمام خوبیوں کی حامل نکلیں اور شعریت تو ان کے مزاج میں اس درجہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا پرانے تمام مشہور شعراء کے مزاروں کی خاک جیسے انھوں نے گھول کر پی لی ہو۔ ہم باہر سے آئیں گے تو کوئی موزوں شعر پڑھا جائے گا "سلامت روی و باز آئی"

توگویا معمول میں داخل ہے۔ غرض کوئی بات ہو کوشش یہ کی جائے گی کہ جواب ایسا ہو جس میں کوئی مصرع یا شعر فٹ ہو سکے۔ یہ سب کچھ تو خیر برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے لئے سب سے زیادہ صبر آزما اور انتہائی آزمائش کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہیں دوری کی وجہ سے آپس میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو۔ آپ جانئے ہم تو ٹھیرے سائنٹسٹ فضول چیزوں سے احتراز کرنے والے اور جہاں تک ہو سکے اختصار سے کام لینے والے۔ ہم نے میتھمیٹکس میں اور سیکھا ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ طویل سے طویل سوالوں کے فارمولوں کی مدد سے منٹوں میں قطع برید کر دیتے ہیں۔ لہٰذا خطوط نویسی میں بھی ہماری روش یہی رہتی ہے کہ خیریت کے بعد دو ایک اور ادھر ادھر کی باتیں لکھیں اور خط تمام لیکن بیگم صاحبہ کے خطوط دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ناول کا اقتباس یا کسی افسانے کی تمہید ہے جو نامکمل رہ گئی ہو۔ ایک خط میں ہمارے عرصے تک خط نہ لکھنے کی شکایت اس طرح کی جاتی ہے ؎

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک　　　ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

مگر آپ تو اس سے بھی گئے گذرے ہو گئے کہ "کیا" فرمانے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے اور یہاں ہمارا حالِ دل کہتے کہتے حال سے بے حال ہوا جا رہا ہے۔ اللہ اب تو خط لکھ دیجئے۔ اچھا مختصر ہی سہی۔ اب تو یہ گلہ بھی نہیں کرونگی کہ آپکی دو حرفی تحریر نقشِ فریادی کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ دل گوناگوں توہمات کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ طبیعت پہ ایک پریشانی مسلط رہتی ہے، ان سب سے نجات پانے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ آپکی تحریر مل جائے۔ روز صبح سے لے کر شام تک

دیتی ہوں تسلی میں دل کو یہی کہہ کہہ کر　　　اب نامہ بر آتا ہے اب خط کا جواب آیا

اور نامہ بر بھی آ جاتا ہے لیکن خط کے جواب سے مایوسی ہی ہوتی ہے۔ کاش یہ خط آپکی بے نیازی کو کچھ ٹھیس پہنچا سکے اور زیادہ کیا لکھوں ؎

شوق مشتاق آرزو مشتاق جاں و مشتاق تست　　　چشم مشتاق آشکارا دل نہاں مشتاق تست

اب ہمارے پاس اس طرح کا فصیح و بلیغ قسم کا جواب کہاں۔ ؟ ہم نے بہت کوشش کی کہ کم از کم دو ایک اشعار ہی لکھ دیں کہ کچھ تو رنگینی پیدا ہو مگر توبہ کیجئے شعروں کو تو گویا ہم سے بیر ہے نہ یاد آنا تھے نہ یاد آئے اور اگر یاد بھی آئے تو جو کبھی بچپن میں زبان زد تھے مثلاً :

لے فوارے سے فوارے　　　اچھے اچھے پیارے پیارے

یا　　　یہ چڑیوں کا گانا چمن در چمن　　　یہ انسر سے شاعر کا دلکش سخن

نتیجہ میں اس خط کا جواب لکھنے میں بڑی شرم محسوس ہوئی وہی اپنا روکھا پھیکا چار چھ لائنوں کا جواب مگر اب ہم نے بھی تہیہ کر لیا کہ یوں کام نہیں چلے گا زندگی جب گذارنی ٹھیری اور گذار ہی رہے ہیں تو مزاج کچھ نہ کچھ تو دوست کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا اب سے ہم بھی شعر یاد کرنا شروع کریں گے اور یہی نہیں بلکہ خود بھی کہنے کی مشق کیا کریں گے۔ پہلی بات تو خیر مشکل نہ تھی۔ صرف حافظہ پر محنت کا بوجھ ڈالنا تھا۔ ہاں مگر دوسری بات ذرا دشوار نظر آئی لیکن جب ہم نے بڑے بڑے سائنس دانوں کی زندگی پر نظر ڈالی جنھوں نے اپنی دریافت کی خاطر اپنی جانوں کی بازی بھی لگا

تو ہم نے اپنی پست ہمتی پر لعنت بھیجی۔ ہم نے سوچا کہ ایک وہ لوگ تھے جنھوں نے ہزارہا دقتوں اور ناکامیوں کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری تو ہم کیا اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ تھوڑی کوشش اور محنت سے اپنے اندر ذوق شعری پیدا کرسکیں۔ کیا خوب کہا ہے اور محنت سے اپنے اندر ذوق شعری پیدا کرسکیں اور شاعر بن سکیں کیا خوب کہا ہے شاعر مشرق نے ؏

جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

جی ہاں! آپ تعجب مت کیجئے اب تو ہمیں مصرعہ اور شعر یاد رہنے لگے ہیں۔ چنانچہ ادھر ذوق یقیں پیدا ہوا اور ادھر زنجیریں کٹنا شروع ہوگئیں۔ بھلا ہو ان شاعروں کا جنھوں نے آزاد شاعری کی بنیاد رکھی، اس نے ہماری بڑی مدد کی اور تھوڑی سی کاوش سے ہی ہم اچھے خاصے شعر موزوں کرنے لگے۔ آپ کو یقین نہ ہو تو ملاحظہ فرمائیے۔

آؤ ہم محبت کا اک معاہدہ کرلیں
تم تو لڑکی ہو اک منسٹر کی
اور میں ایک غریب کنڈکٹر
تم نے وعدہ کیا تھا جو مجھ سے
وہ نہ ثابت ہو تمہارے باپ کا وعدہ
اور پھر جب ملیں گے ہم دونوں
تو ــــــ لوگ کہیں گے
تم ہو بے نظیروں میں، ہم ہیں بے مثالوں میں

اے میرے دوست میرے دل کے مکیں
آ مجھ میں سما جا تو میں تجھ میں سما جاؤں
یہ ایک راز ہے اُلفت کا
جس کو سمجھا کسی نے نہ کسی نے جانا ہے
لیکن اے دوست میں بتاؤں تجھے
تو شمع حقیقت ہے، میں ہوں تیــــرا پروانہ

ہمارے لئے یہی کیا کم تھا کہ شعر موزوں ہونے لگے خواہ وہ آزاد ہوں یا پابند۔ ہماری بیگم صاحبہ کو جب پتہ چلا کہ ہم سے بھی شعر موزوں ہونے لگے ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی شاید اس خیال سے کہ ابھی تک قیس جنگل میں اکیلا تھا۔ اور اب خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو، لیکن انھیں آزاد شاعری پر اعتراض تھا، ان کے خیال میں یہ شاعری کی توہین اور فن شاعری سے گریز کی باتیں ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد نہ جانے کیسے ردیف اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی کچھ اشعار ہم نے موزوں کئے مگر ایسے کہ اگر کسی باذوق محفل میں پڑھے جائیں تو اہل محفل کو راہِ فرار کی سوجھے مثلاً

بھیس بلبل کا لیا ملنے کو اس گل سے مگر — باغباں نکلا چڑی مار بڑی مشکل ہے

غرض وقت گذرتا گیا ہم آگے بڑھتے گئے منزل کا تو ابھی کوئی تعین نہیں بس چلے ہی جا رہے ہیں۔ کئی منازل طے کر چکے ہیں بس یہ سمجھئے کہ ہماری رہبر ہماری نصف بہتر ہیں۔ ایک روز فرمانے لگیں کہ آپ اب اچھے خاصے شعر موزوں کرنے لگے ہیں۔ وزن وغیرہ بھی برابر ہوتا ہے لیکن سنجیدگی اور تغزل کا رنگ پیدا کریئے تاکہ کسی اچھی محفل میں بھی پڑھ سکیں اب ہم نے ذرا اکڑ کر کہا وزن کیوں نہ برابر ہوگا اتنے عرصے جو کیمسٹری ایکویشن بناتے اور بیلنس کرتے رہے ہیں تو کوئی بھاڑ جھونکا ہے۔ رہا سنجیدگی اور مذاق تو یہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہاں شعر کہنے میں آپ سے کم نہیں۔ اتنا سننا تھا کہ بس ہوگئیں برہم۔ بولیں ذرا سی تعریف کیا کر دی کہ اُڑنے لگے ابھی ردیف اور قافیہ تک کی پہچان ہے نہیں اور لگے شاعری کرنے۔ اب اس کو حسن اتفاق کہہ لیجئے یا اور کچھ کہ اس موقعہ پہ کمبخت ایک شعر یاد آگیا ؎

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ — ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

بس کا پڑھنا تھا کہ سارا غصہ کافور ہوگیا اور اس کی جگہ مسرت نے لے لی۔

ہمارے شاعر ہونے کی خبر آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی ہے اب اگر ہم سے کوئی سوال کرتا ہے کہ حضرت یہ ایک دم سے شاعر کیسے بن گئے تو ہم غالب کے ایک شعر کا مصرعہ ثانی بدل کر اس طرح پڑھ دیتے ہیں ؎

کھلتا کسی پہ کیوں یہ مرے دل کا معاملہ — بیوی کے انتخاب نے شاعر کیا مجھے

لیکن ہم اپنے ان دوستوں کو جنھوں نے بی ایس سی یا ایم ایس سی کیا ہے، کر رہے ہیں یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اگر تم میں شاعر بننے کی صلاحیت نہ ہو تو خدارا کبھی بی۔اے یا ایم۔اے پاس لڑکی سے شادی مت کرنا۔

(حلقہ ارباب ادب کے "جلسۂ زندہ دلی" میں پڑھا گیا) ■■

مستقبل کی پکار

آندھرا پردیش کے ساحلی اضلاع کے کچھ حصوں کو حال ہی میں نشانہ بنانے والی دیوہیکل سمندری موجوں سے بچ جانے والے دہشت زدہ ماہی گیروں کی زبانوں پر خوف و ہراس سے معمور بہت سی کہانیاں ہیں ۔ ان میں سے بعض سطح سمندر پر نظر آنے والے مہیب آگ کے گولے کی باتیں کرتے ہیں اور بعض کانوں کو بہرہ کر دینے والی بجلی کی گرجدار آواز کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۹ ر نومبر ۷۷ء ۱۹ کے نحس سنیچر کو موت و تباہی کی جانب بہا لیجانے والی ہیبتناک موجوں کے حملے سے قبل سنائی دی تھی ۔ اب یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنے حواس میں آرہے ہیں اور ریاستی حکومت کی فیاضانہ امداد کی بدولت اپنی حسب معمول سرگرمیوں کی انجام دہی کے قابل ہو رہے ہیں ۔

طوفان کے باعث ضائع ہو جانے والی کشتیوں کی تلافی کے لئے اور نقصان پہنچنے والی کشتیوں کی درستگی کے لئے اضلاع کرشنا ۔ گنٹور ۔ مغربی گوداوری ۔ مشرقی گوداوری ۔ نیلور ۔ پرکاشم اور وشاکھاپٹنم کے کلکٹروں کی تحویل میں ۲ء۸ کروڑ روپیوں کی رقم رکھی گئی ہے ۔

بلاک ڈیولپمنٹ آفیسرز کے توسط سے ماہی گیروں کے ساز و سامان کی تقسیم کے لئے ۰۶ء۲۵ کروڑ روپیوں کی رقم اضلاع کرشنا ۔ گنٹور ۔ مغربی گوداوری ۔ مشرقی گوداوری اور پرکاشم کے کلکٹروں کی تحویل میں دی گئی ہے ۔

کولیرو کے مستحقین کے لئے بانسوں کی خریدی اور ماہی گیری میں کام آنے والی ٹوکریوں کی تیاری کے لئے ۹ء۳ لاکھ روپیوں کی رقم مختص کی گئی ہے ۔ علاوہ ازیں بحالی و بازآبادکاری کے کاموں کے لئے "اے پی فشریز کارپوریشن" کو ۲۶۵ لاکھ روپے اور " بوٹ بلڈنگ انڈسٹریز کوآپریٹیو کریڈیٹ سوسائٹی " گلی کلا دینی کو ۵ لاکھ روپے بطور پیشگی رقم کے مہیا کئے گئے ہیں ۔

ایک نئی صبح سمندر کے جیالے سپوتوں کا خیر مقدم کر رہی ہے
وہ ضرور مستقبل کی پکار پر لبیک کہیں گے ۔

جاری کردہ : ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد

R. No. 32/77-78

نمبر: ۳۴/ ۷۷-۷۸

خوش آئند مستقبل کا پیام

۱۔ جنوب میں ہندوستان کی غلہ گودام کہلانے والی ریاست آندھرا پردیش اس بھیانک ترین طوفان کے جانکاہ صدمے سے آہستہ سنبھالا لے رہی ہے جس نے گذشتہ سال نومبر میں ایک منحوس سنیچر کو ہمارے ساحلی اضلاع کو اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنایا تھا۔ متاثرہ ع میں تقریباً ۴۰، ۳۶ لاکھ ایکڑ زیر کاشت رقبہ اس طوفان نے تباہ و تاراج کر دیا۔

۲۔ ریاستی حکومت کی جانب سے روبہ عمل لائے جانے والے امدادی اقدامات رقمی ۵ ، ۷ کروڑ روپیے کا مرکز توجہ کاشتکار نقصان پہنچنے والے تمباکو کے کوٹھوں کو فی کوٹھا ۵۰۰ روپے کے حساب سے امداد دی جائے گی۔ متاثرہ اضلاع کھیتی باڑی کے کام کے اور دودھیارے مویشی دیئے جائیں گے۔ علاوہ ازیں " اسمال فارمرس ڈیولپمنٹ ایجنسی " قواعد کے تحت مرغیوں اور سوروں کی فراہمی بھی عمل میں لائی جائے گی۔

۳۔ سمندر کی طوفانی موجوں سے متاثر ہونے والے علاقوں میں طلباء کو اسپیشل فیس اور امتحانی فیس سے مستثنیٰ قرار لیا ہے۔ ان کے واسطے کتابوں کی مفت سربراہی کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

۴۔ طوفان سے جن ماہی گیروں کی کشتیوں کو نقصان پہنچا ہے، ان کی درستگی کے لئے اور ضائع ہو جانے لی کشتیوں کی تلافی کے لئے اضلاع کرشنا، گنٹور۔ مغربی گوداوری۔ مشرقی گوداوری۔ نیلور۔ پرکاشم اور شاکھاپٹنم کے کلکٹروں کی تحویل میں ۲۸، ۱ کروڑ روپیوں کی رقم رکھائی گئی ہے۔

۵۔ بنکروں کی امداد کے لئے ۶۲، ۱ کروڑ روپیے منظور کئے گئے ہیں۔ ایک سو روپیے مالیت کے دھاگے لی فراہمی کے علاوہ ہر متاثرہ بنکر کو کرگھوں کی درستگی کے لئے ۱۵۰ روپیے دیئے جائیں گے۔

جاری کردہ: ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR 36.

نصر قریشی

اخباری نیتا

آپ سے ملئے اخباری نیتا ہے آپ کا نام
اخباروں کے دفتر کے چکر کرتے ہیں صبح و شام
اخباروں میں تقریریں چھپوانا آپ کا کام
نیتا آپ کا نام

شہر کے اندیشوں سے بھری ہے آپکی موٹی توند
خبروں کی خاطر پھرتے ہیں لے کر فینسی گوند
آپ کی چھوٹی سی پیشکش کر قبلے ہوٹے عوام
نیتا آپ کا نام

سُنی سنائی، ان دیکھی کو دیتے ہیں وہ روپ
دن میں تارے رات کے آنگن میں پھیلائیں دھوپ
آپ کی چرب زبانی پہ لگ سکتی نہیں لگام
نیتا آپ کا نام

اُجلا کرتا پہنے گھومیں، لے کر تن من دھن
مرنے پہ پائیں گے شاید اخباروں ہی کا کفن
جلی حروف میں چھپوائیں گے تعزیتی پیغام
نیتا آپ کا نام

بھاشا، مہنگائی اور غربت کا دل نا ہے
دوسروں کو سوتے سے جگانا اور خود چلیت
قائدِ ملت بن کر گھومیں اور کہلائیں ا
نیتا آپ کا

ہڑتالوں میں بھی شامل ہیں آپ برائے ش
نعرۂ غربت خوب لگا کر ہو گئے صاحب
جیل اگر جانا ہے تو پھر دوسرے سب کو
نیتا آپ کا

نصر کوئی اخباری نیتا پیچھے پڑ نہ جا
سر پہ آپ کے گندی سیاست کا ڈنڈا
اِن کا کچا چٹھا لکھ کر شاعر ہو بد
نیتا آپ کا

نظر برنی

(حسرت موہانی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

"حُسنِ کرشمہ ساز کرے"

وہ لیڈری پہ بھلا اپنی کیوں نہ ناز کرے
"نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے"

بنا ہے سیٹھ معتدی کے گھر کا وہ داماد
"وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے"

لگا دی تو نے تو پونجی تمام بزنس میں
"ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے"

بنا کے رکھ دیا قابل کو جاہلِ مطلق
"جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے"

جو ووٹ مانگنے آیا ہے وہ ہے بگلا بھگت
"اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے"

اگر ملانی ہے اس کو دکان جرائم کی
"پولیس سے ملتا رہے اور ساز باز کرے"

میرے بزرگوں پہ لعنت ہے رند و شب بیدار
"خدا نہ تجھ سا کوئی بھی زباں دراز کرے"

یہی ہے میری تمنا یہی دلی خواہش
مجھے تو ساس سسر کا نظر نواز کرے

"باقی ہے"

چناؤ ہار گیا، پھر بھی شان باقی ہے
بلا سے ناک گئی، میرا کان باقی ہے

نہیں میں ہار کو ہرگز نہ ہار مانوں گا
ابھی تو جیتنے والوں کا لان باقی ہے

بلا سے لوک سبھا میں پچھاڑ کھایا ہوں
اسمبلی کا ابھی "امتحان" باقی ہے

بلا سے لوٹ لیا مجھ کو نئی کے چمچوں نے
ابھی تو باپ کا آدھا مکان باقی ہے

عوام نے مجھے پتھر سے یوں نوازا تھا
کہ میرے جسم پہ اب تک نشان باقی ہے

اب اس کے بعد پھنسانا ہے ووٹروں کو مجھے
میرے دماغ میں ایسا پلان باقی ہے

مٹا رہے تھے جو اردو کو خود ہی مٹ کے رہے
خدا کا شکر ہے میری زبان باقی ہے

لہو عوام کا جی بھر نچوڑنے والو
ابے بھی ہوس لوٹ میں جو جان باقی ہے

جہیز جو بھی ملا، میں فلش میں ہار گیا
اب اُن کے میکے کا اک پاندان باقی ہے

ابھی تو آدھ بھگت کی ہے صرف بیگم نے
ابھی تو اُن کا بڑا خاندان باقی ہے

جہاں اُدھار نہ چلتا ہو آپ کا جوہر
کوئی بھی شہر میں ایسی دوکان باقی ہے؟

جوہر سیوانی

"کہاں جاتے"

سیاسی غلہ خانوں کے سڑنے والے کہاں جاتے؟
دھلائے مکر کی دوکان چمکانے کہاں جاتے؟

اگر پیشِ نظر گدّی حکومت کی نہیں ہوتی
سیاسی شعبدوں کے جال پھیلانے کہاں جاتے؟

نہ ہوتی حرص مال و جاہ و کرسی کی اگر دل میں
تو نیتا مفت میں جنتا کا غم کھانے کہاں جاتے؟

اگر پیدا گشی بدھو نہ ہوتی ملک کی جنتا
تو یہ نیتا مقدر اپنا چمکانے کہاں جاتے؟

اڑوسن سے پڑوسن سے شکایت کرتی پھرتی ہیں
اگر بیگم نہ ہوتیں میرے افسانے کہاں جاتے؟

ہماری بزدلی مشہور ہے سسرال والوں میں
نہ ہم ہوتے تو سالے رعب دکھلانے کہاں جاتے؟

اگر نقاد کی قینچی نہ فن کی سان پر چڑھتی
تو یہ شاعر حجامت اپنی بنوانے کہاں جاتے؟

جناب شیخ نے اچھا کیا رندوں سے منہ کو الی
وہ آدھی رات کو مسجد سے میخانے کہاں جاتے؟

کوئی سننے کو کب تیار تھا تک بندیاں جوہر
اگر شاعر نہ ہوتے داد ہم پانے کہاں جاتے؟

جوہر سیوانی

احمد جمال پاشا

پوسٹ مارٹم رپورٹ

(بسلسلہ گذشتہ)

"بھوپال پنچ" کے کارٹون بہت دلچسپ ہوتے تھے جن میں تہذیب یا معاشرت کے کسی گوشہ کو بے نقاب کیا جاتا تھا
"بھوپال پنچ" میں لطائف بڑے باغ و بہار ہوتے :-

اناركلی كی واپسی

..... ایک کنواری لڑکی گھر سے بھاگتے وقت مکان کے صدر دروازے پر "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا" لکھ کر بھاگ گئی تھی
جا کہ اب یہ لڑکی مکمل "عورت بن کر" گھر واپس آگئی ہے۔ لیکن اس بار اپنے مکان کے پچھلے دروازہ پر

"محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے"

لکھتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

ایک شخص نے اپنے ملازم کو کسی شہر میں کسی صاحب کے پاس روانہ کیا۔ ملازم اس شہر میں پہونچا تو ان صاحب کا نام بھول گیا۔ چنانچہ بذریعہ تار مالک سے نام معلوم کیا۔ مالک نے حسب ذیل تار اپنے ملازم کو بھیجا۔

"ان صاحب کا نام رام نرائن اور یاد رکھنا تمہارا نام پیارے لال ہے"

"تخلصہ" کے عنوان سے کبھی کبھار کوئی اچھا اور پر گذرا ہوا لطیفہ درج کر تے۔

"چھینٹ چھینٹ" میں بھی عجیب کا جملہ کوئی پھڑکتا ہوا لطیفہ ہی ہوتا ہے۔

مراسلات کے کالم میں "مراسلات" کے علاوہ "ایڈیٹر کی نجی ڈاک" کا دلچسپ کالم بھی تھا۔ جس میں اکثر "بھوپال پنچ" کی تخلیقات بلا اجازت چھاپنے یا بلا حوالہ نقل کرنے والے اخباروں کے ایڈیٹروں کے معافی ناموں پر دلچسپ تبصرے ہوتے:

"بھوپال پنچ" ---- ؟ اودھ پنچ "لکھنؤ" "سرپنچ لکھنؤ" اور "نمکدان کراچی" کے حوالے سے اکثر پھڑکتے ہوئے اشعار نقل بھی کرتا تھا۔ بھوپال پنچ کو مت زمزاح نگاروں کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک، کرشن چندر، احمد جمال پاشا، فکر تونسوی، شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی، کنہیا لال کپور، دلاور فگار، ناچیز لکھنوی، سلیمان اریب، سکار لکھنوی، نسیم انصاری، خواجہ احمد عباس، آفاق احمد، شہباز صدیقی، شاکر، وزیر آغا، ابن انشا، راجہ مہدی علی خان۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی ایک پیروڈی "گلابی امتحان" اسی میں شائع ہوئی تھی جو خاصے کی چیز ہے۔

تخلص بھوپالی کے شاہکار مضامین "بھوپال پنچ" کی زینت ہوتے تھے اپنی یاد ہیں - تعلیم نام ہے فیل ہو ہو کر بڑھ جانے کا - تحریک خودکشی - آپ کی قسمت کا کچا چٹھا - ناپ تول - ادبی زائچہ - خیرات بالشرائط - قالونا اندھا ہونا حق پیدائش — میونسپلیات - نسخے برائے خاص معذورات - وغیرہ"

"بھوپال پنچ" سال نو کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنا اور جانے والے سال کا محاسبہ کرتا....... بھوپال پنچ میں رنگارنگ مزاحیہ کلام، ان کے اور ڈرامے چھپتے۔

"بھوپال پنچ" میں "بھوپالیات" کے کالم کے علاوہ بھوپال کی خبریں اور تبصرے ہوتے.... بھوپال کی سماجی سیاسی اور معاشی زندگی کو بہتر بنانے پر زور دیا جاتا - بھوپال کے دانشور اس میں پابندی سے شائع ہوتے۔

تخلص کا دوسرا صحافتی کارنامہ "بہشتیم خانہ" کا اجرا ہے - اس کے ایڈیٹر ایم طاہر اور نگراں تخلص تھے۔

"بہشتیم خانہ" ۱۹۷۶ء میں نکلنا شروع ہوا - اس کا سیاسی رنگ بڑا چوکھا تھا - "بھوپال پنچ" کے مستقل کالم "بہشتیم خانہ" میں منتقل ہو گئے - جیسے نزہرا بہنی رہی — پاندان والی خالہ - ہفوز میاں - پوسٹ مارٹم وغیرہ۔

تخلص کا شاہکار طنزیہ "غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط" جسے وہ پابندی سے ہر موقع پر پڑھتے تھے - "بہشتیم خانہ" کے شمارہ ۲ میں شائع ہوا تھا - اسی طرح "ادبی ادارے یا پرورش گاہیں ؟" — بھی —۔

"بھوپال پنچ" سے اس میں تخلیقات ڈائجسٹ بھی کی جاتیں۔

"بھوپال پنچ" اور "بہشتیم خانہ" اردو کی مزاحیہ صحافت میں ایک باوقار اور خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں - ضرورت اس بات کی ہے کہ "اودھ پنچ" "فتنہ عطر فتنہ" کی طرح ان کا ایک باغ و بہار انتخاب کتابی شکل میں محفوظ کر دیا جائے۔

اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں تخلص بھوپالی ایک قد آور طنز نگار کی حیثیت رکھتے ہیں - ان کا ادبی کارنامہ "شیطان جاگ اٹھا" کے طنزیہ مضامین ہیں۔

تخلص کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے - سماجی اور معاشرتی ناہمواریاں، بدعنوانیاں، بے حجابی، بے راہ روی، مشرقی آداب اور شعائر اسلامی سے انحراف، بے عملی اور سیاسی کھوکھلے پن کو تخلص نے اپنے شگفتہ طنز کا نشانہ بنایا۔

"شیطان جاگ اٹھا" میں ان کے ۲۹ رنگارنگ مضامین ہیں - یہ مضامین "بھوپال پنچ" سے ممتاز ادبی رسائل اور اخبارات نے بار بار نقل کئے - انھوں نے بعد میں انہیں کتابی شکل میں پیش کر دیا - اس سے قبل "پوسٹ مارٹم" اور "پاندان والی خالہ" حصہ اول شائع ہو کر داد تحسین وصول کر چکی تھیں۔

"شیطان جاگ اٹھا" کا شاہکار مضمون "اپنی یاد میں" اس قدر مقبول ہوا کہ فکر تونسوی اور دوسرے بہت سے طنز نگاروں نے اس مشہور طرح پر طبع آزمائی کی - فکر تونسوی تو اس طرح پہ تقریباً مستقل طبع آزمائی کرتے رہے خصوصاً مضمون کے پہلے حصہ پہ -

---

تخلص دنیا سے آج خلاص ہوا۔

.... بیٹھے ہوئے فرشتے نے ادھر ادھر سونگھ کر پوچھا - تیرے منہ میں خاص گھی کی خوشبو کیسے آ رہی

کیا اب بھی دنیا میں کچھ مل جاتا ہے۔ وہ اپنے عزیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ہیں۔ جزاک اللہ کہہ کر مدنظر تک وہ
میں بانی ملا لیتے ہیں۔

پھر خدا خدا کر کے وہ زمانہ آیا۔ جس کو مہذب اور سائنسی زمانہ کہا جاتا ہے۔ جس میں ہیروشیما کی پوری آزادی کو حیثیت
آزادی ملی تھی۔ (شخص کلاؤڈ بادل)

"ہمارے قبرستان" ــ مردوں کی آڑ میں زندوں پر طنز کیا گیا ہے۔

"میں ہوں ایک غریب القبر مہاجر ــــ مولوی خالی الدین نے میری بھی قبر پر ایک عمارت بنوا کر آج قبر قبر کو محتاج
کر دیا۔"

"میونسپلٹیاں" میں اس کی بے عملی پر تیکھا طنز ہے۔

"اپنی یاد میں" ــ عشق میں ہم ہمارے قبرستان ــ آتش کدۂ ہدایت ــ حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کا احتجاج
ایک انار سو بیمار ــ درخواست اور انٹرویو ــــ بلاشبہ قانون اندھا ہوتا ہے ــ اور ــ نسخہ برائے خالص مضحکات ــ
تخلص کے پیروڈی کے اچھے نمونے ہیں

"استنجائی پاکیات" چار ورقی کتاب ہے۔ یہ مضمون پنچ میں چھپ چکا ہے اور شیطان جاگ اٹھا میں بھی شامل ہے
"پوسٹ مارٹم" رپورٹ میں ۲۱ خاکے ہیں۔ جن میں نادم سیتاپوری اور کنہیا لال کپور کے علاوہ بقیہ ۱۹ بھوپال کی
شخصیات ہیں۔

خاکہ نگاری کے میدان کے تخلص شہسوار ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے جیتے جاگتے انسان پیش کئے ہیں ــ پوری
خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ــــ فرشتہ نہ شیطان ــ بلکہ انسان ــ

تخلص کے خاکوں میں حفظ مراتب کا التزام ــ طنز و مزاح میں توازن، خوبی یہ ہے کہ اپنے جیتے جاگتے کرداروں کو
مثالی بنا دیا ہے ــ شاکر علی خاں، کامل خاں، مجتبیٰ خاں، جلال الدین قریشی، اختر جاگ آپ کو ہندوستان، پاکستان کے سیاسی
معاشی اور انتظامی میدان کے ہر موڑ پر مل جائیں گے۔

تخلص نقش اجالنے، تصویر کھینچنے اور سراپا نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا زعفران زار قلم شخص آب و رنگ
سے خاکے کو مرقع بنا دیتا ہے ــ ایک ایک جان ڈال دیتا ہے ــ تصویر بول اٹھتی ہے ــ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس شخص
سے وہ خود مل چکا ہے۔

بحث مباحثے، لڑائی جھگڑے کو فال نیک سمجھتے ہیں ــ اس کی ٹوپی اس کے سر پر زیادہ محبوب اور پسندیدہ مشغلہ
ہے۔ امن اور آشتی کے [illegible] کہ اس سے جھگڑا بڑھتا ہے ــ کم نہیں ہوتا۔ (سید محمود قریشی)۔

"شاکر علی خاں اس کثرت سے چل بسے کہ اعداد و شمار کا مشغل ہے (شاکر علی خاں)۔

"نادم سیتاپوری [illegible] خاصیات [illegible] الڈائی جو [illegible] رکھتے ہیں ــ نادم صاحب
[illegible] سیاست اور فرصت [illegible] ہے ــ نادم [illegible] کلام کی تکمیل کرنے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ادب میں شامل ہو گئی" (نادم سیتاپوری)
[illegible]

ہونے تو کلام مجید نظم کرنا شروع کردیا۔ بیک وقت ماسکو اور مکہ شریف پر اعتقاد رکھتے ہیں دونوں کی شان بڑھائی۔ [illegible] سے حلاوہ زلیخ بھوپالی۔

" طبیعت میں بھک سے اڑجانے والا مادہ زیادہ ہے ۔ اسی لئے اس رعایت سے پٹرول کا دھندہ کرتے ہیں ۔ اونچے رکھتے ہیں ۔ اسی لئے اونچی اونچی سنگین عمارتیں بنواتے ہیں ۔ خیالات میں ہمیشہ تبدیلی کا امکان رہتا ہے ۔ اس لئے [illegible] موٹر تبدیل کرتے رہتے ہیں " (واشدہ لالہ بک راج) ۔

" دل چاہتا ہے کہ دونوں کو کسی سے دست و گریباں و بجوں " لڑتے جھگڑتے ، ابے تبے کہتے سنوں ۔ مگر ہوتا ہے کہ ہم " تو تو " کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بھلا گالیاں کیا بک سکتے ہیں " ۔ (سعید خاں) ۔

" جنازے کی نماز ہنس ہنس کر پڑھتے ہیں ۔ تعزیت کرتے وقت اظہارِ غم بھی ہنس ہنس کر کرتے ہیں ۔ کسی پر خفا ہیں تو ہنستے ہوئے " ۔ (سید عبدالرقیب ایڈوکیٹ)

...... انگریزی کے زیر لب ، عربی کو تحت اللفظ ، فارسی کو رواں دواں اور اردو کو فر فر ٹے سے بولتے اور ربے کی حد تک لکھتے ہیں ۔ (حکیم سید قمرالحسن) ۔

دہلی اور لکھنؤ کے سامنے " دبستانِ بھوپال کی تعبیر ہوئی ۔ بھوپال کی علمی ، ادبی ، گھریلو چہل پہل اور باہری دھوم بھوپال کی بیگماتی زبان میں " پاندان والی خالہ " کی بات چیت میں مخلص نے محفوظ کردی ۔ خالہ کے بیانات ۔ تبصرے ۔ خوشی ، دکھ ، سکھ " نے انہیں ایک غیر فانی کردار بنادیا ۔

" خالہ کا کردار " بھوپال پنچ کا مستقل کالم تھا ۔ جس میں خالہ دنیا جہاں کے ہر معاملہ میں اپنی رائے پیش کرتی اس کو بعد میں تین جلدوں میں کتابی شکل میں محفوظ کردیا ۔

اس کردار میں بھوپال کا ماضی ، حال اور کسی حد تک مستقبل بھی دیکھا جاسکتا ہے ۔ یہ بے مثال کردار بھوپال کی تہذیبی ، معاشرتی ، ثقافتی ، سماجی اقدار کی زندہ جاوید نمائندہ اور امین ہے ۔

مخلص کا آخری کارنامہ ان کا غیر فانی کردار " خضر میاں " ہے ۔ خضر میاں مسید ھے سادھے پٹھان ، جھکی ، مرغ لیبر کے فقیر ، مانی کے توجہ گر ، شوکت پاکستان کے داستان سرا ، با اصول ، ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے والے ۔ ہر ایک کے شریک غم ۔ بنے بنائے کام کو بگاڑنے والے ۔ بھوپال کے سچے عاشق ، بھوپال کی بولتی ہوئی تاریخ ، بھوپال کے " خان جیلی " ۔

خضر میاں میں عظمت کا مدعیہ احساس ، بھولا پن [illegible] سے گذری ہوئی عظمت [illegible] نے انہیں مزاحیہ کردار بنا دیا ۔ [illegible]

خضر میاں کو ہر معاملہ میں دخل ہے ۔ خواہ معاملات [illegible]

میرا یہ مخلص بھوپالی جیسے مرحوم کہتے ہیں میں اب بھی تیار نہیں ۔ [illegible] مخلص بھوپالی ہوں بہر حال ۔ مخلص کی پہلودار شخصیت ۔ ہمہ گیر طنز [illegible] اس کو [illegible] کرکے اردو ادب کے اس عظیم طنز نگار [illegible] حیثیت [illegible] کے لئے محفوظ کردیا جائے [illegible]

[illegible] میاں میر ۔

بوگس حیدرآبادی

الکشنیات

(الکشن کے موضوع پہ بوگس کے اشعار)

قطعہ

پھولوں کے ہار پہن کے موٹر میں جائیں گے
جلسے کریں گے یاروں سے لیکچر دلائیں گے
اللہ کے حکم سے کوئی خالی ہوئی جگہ
بوگس بھی پھر تو ڈٹ کے الکشن لڑائیں گے

ایک لیڈر کہہ رہے تھے ؎
کوئی ذلیل کوئی بے وقوف کوئی گدھا
دوسرے لیڈر نے کہا: تمہیں کچھ کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ایک نیتا نے اپنی تقریر میں یہ کہا ؎
آج اپنے دیش کا دشمن جو مادر زاد ہے
مادرِ ہندوستان کی ناخلف اولاد ہے

ایک پارٹی لیڈر نے یہ کہا ؎
بعض غنڈوں کی خبریں چھپتی ہیں
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ایک لیڈر نے حقیقت کا اظہار یوں کیا ؎
[illegible] اپنے ووٹ سے [illegible] جو لوگ
کونسل میں جا کے آپ الیکشن [illegible] ہیں

دورانِ تقریر ایک قائد نے کہا ؎
رفاقت میں گرانی بھی ہے اور [illegible]
ہم نے تم دوست جیسے دشمن [illegible]

ایک غیر جانبدار مقرر نے مشورہ دیا ؎
الکشن اک دوا ہے جاد سیاسی چھڑانے کی
وہ سب ممبر بنیں جو آج تک بیکار بیٹھے ہیں

ایک مقرر نے حق بات کہی ؎
جدھر بھی دیکھئے دہزن ہی بیٹھے ہیں [illegible]
جہاں میں ہے بھی کوئی راہبر نہیں معلوم

ایک امیدوار نے کہا ؎
اک روز وہ بھی ہو کے رہے گا وزیرِ خود
جو آدمی وزیر کا چمچہ دکھائی دے

ایک بزرگ نے [illegible] کہا ؎
[illegible] ہزار [illegible]
اسمبلی کا جو ممبر میری [illegible]

ایک [illegible] کو [illegible] دی گئی، انھوں نے کہا ؎
[illegible] ہیں [illegible] ہیں

آئیے ہم اپنی کمر کس لیں

ہمارے ساحلی اضلاع کے کچھ علاقوں میں ۱۹ر نومبر ۱۹۷۷ء کے نحس سنیچر کو آنیوالے ہلاکت خیز طوفان نے تباہی اور بربادی کے جو منظر اپنے پیچھے چھوڑے ہیں اُن کی تشریح امکان سے بعید ہے۔ عوامی جائیداد کو پہنچنے والے نقصان کی کہانی سب سے دردناک ہے۔

متاثرہ علاقوں میں فوری طور پر روزگار کے مواقع فراہم کرنے کیلئے اور ذرائع آبپاشی کی بحالی نیز سڑکوں اور عمارتوں وغیرہ کی تعمیر و ترمیم کیلئے ریاستی حکومت نے ۷۲۵ لاکھ روپیوں کی منظوری دی ہے۔

تعمیر و ترمیم کی سرگرمیاں ایسے کاموں پر مرکوز ہیں جو پنچایت راج۔ عمارات و شوارع۔ تعمیرات عامہ اور بلدیات کے تحت آتے ہیں۔ ہر محکمے کے لئے منظورہ رقومات حسب ذیل ہیں۔

بڑی اور اوسط آبپاشی	(پی ڈبلیو ڈی)	۱۵۰ لاکھ روپیے
چھوٹی آبپاشی کے وسائل	(" ")	۷۵ لاکھ روپیے
عمارات و شوارع	(آر اینڈ بی)	۱۵۰ لاکھ روپیے
عمارات	(")	۵۰ لاکھ روپیے
شوارع	(پنچایت راج)	۱۰۰ لاکھ روپیے
عمارات بشمول مدارس	(")	۱۰۰ لاکھ روپیے
چھوٹی آبپاشی کے وسائل	(")	۵۰ لاکھ روپیے
سڑکیں۔ عمارتیں اور آبرسانی (بلدیات)		۵۰ لاکھ روپیے
جملہ		۷۲۵ لاکھ روپیے

مگر تعمیر اور بازآبادکاری کے کاموں کے لئے طویل مدتی پروگرام درکار ہوتے ہیں۔ آئیے ہم سب اور ہم میں سے ہر ایک کمر کس لے اور آئندہ درپیش آنے والے عظیم مسائل سے نمٹنے کیلئے تیار ہو جائے۔

یقیناً آندھرا پردیش پھر سے مُسکرائے گا

جاری کردہ:- ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد

ڈاکٹر راجندر پال سنگھ

ہندی سے ترجمہ
ترجمہ: رابعہ مسلم

بزوکا-۵۵

ہم لوگوں کے ایک جگری دوست ہیں جنھیں بزوکا نمبر ۵۵ کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ اس سلسلہ ہو
میں ہم لوگوں کا پوشیدہ معاہدہ ہے، کوئی انھیں اس نام سے پکار نہیں سکتا۔ وہ صرف اس نام سے جانے جائے تو
جاتے ہیں، اس کی اپنی ایک کہانی ہے۔ ویسے ہمارے دوست ایک اونچے عہدہ پر فائز ہیں۔ لیکن، کوئی بھی لالچی ہو
صاحب! جب ایک بار منھ سے نکل ہی گیا ہے تو کیوں نہ آپ کو بھی اپنی محفل میں شامل کر لیا ہو سکتا ہے اور کوئی بھی
جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اس انکشاف کو عام ضرور کریں گے مگر اپنی شہرۂ آفاق معمولی آدمی غیر معمولی بن سکتا
تہذیب کا وزن کم نہ ہو اس لئے ہمیشہ یہی کہیں گے کہ صرف آپ کو ہی سنا رہا ہوں ہے۔
مطلب یہ کہ صرف آپ ہی کے کانوں کے لئے میں اپنا منھ کھول رہا ہوں صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کی معلومات
کچھ بھی صحیح۔ نکلا ہوا تیر کمان میں لوٹ کر نہیں آتا (سنا ہے کہیں ہمارے دوست کو ضرور رہی ہوں گی کیونکہ شاید ہی
کہیں یہ بھی ہوتا ہے) اس لئے سنئے صاحب۔ کوئی آدمی ایسا ہو جس کو اپنی صفات اور طاقت کا اندازہ
آپ یہ سوال مت کیجئے گا کہ آدمی "بزوکا" کیسے نہ ہو۔ ممکن ہے اسے اپنی خرابیوں کا احساس نہ ہو۔ انھوں نے ہماری
ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح کے کرشمے ہمارے معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے بتایا کہ وہ ایک مرتبہ ایک سرکاری
دوست کے لئے بالکل غیر معمولی کام سے آسام جا رہے تھے۔ وہ برسات کے دن تھے۔ یہ سبھی کو معلوم ہے کہ
نہیں۔ لیکن آدمی سے بزوکا برسات میں آسام کی ندیوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ باڑھ آئی ہوئی تھی اور شاید
بننے کے اصول کی ہر سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ہوا کچھ اس طرح کہ ایک پورا گاؤں باڑھ میں بہہ گیا تھا۔ فوراً ہی
جانکاری اگر سرحدوں کے محافظ فوجی خدمت میں لگا دیئے گئے۔ ہیلی کاپٹر اور کرین وغیرہ کام میں لائے گئے۔
سبھی کو ساحل کی جانب ہزاروں فوجی پانی کو باندھنے کی کوششوں میں لگا دیئے گئے۔ لیکن ایک تو برسات کا
آسام کی۔ بارش کی دربارہ شروع ہو گئے تو پھر پانی کی سبھی کوششوں سے کہیں بڑھ گئے۔

ہمارے دوست کو یہ خبر اخباروں اور ریڈیو کے ذریعہ ہو ہی چکی تھی۔ ان کی رگوں میں راجستھان کی سرزمین کا بہادر
خون رواں تھا۔ اس کے علاوہ وہ سرکاری ملازم بھی تھے۔ مرکزی سرکار کے ہر ملازم کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ قوم کے لئے
ہر طرح کی قربانی دے۔ فائیلوں پر دستخط کرنے سے لے کر لوگوں کے حقوق کی حفاظت ان کا فرض ہے۔ بس ا
انھیں سب وجوہ کی بناً پر وہ خدمت کے بارے میں سوچ چکے تھے۔ سے کے آ

جیسے ہی گاڑی اس جگہ پہنچی جہاں فوج بھی بے بس کھڑی تھی، لوگ ڈوب رہے تھے۔ ندی ل گئے تے
میں ندیوں کی باڑھ تھی اور گہرے گہرے بھنور بن رہے تھے۔ ایک بار جو اس بھنور میں پھنسا وہ لوگوں نے بعد م
باہر نہ نکل پایا۔ یہ منظر دیکھ کر ہمارے دوست کا دل بھر آیا۔ یک دم سے ضمیر کی اندرونی وہ ڈرے ہوئے تھے
آواز سن کر وہ فوجی آفیسر کے پاس گئے۔ ان کا ارادہ ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا برائی تو لوگ خدا کی بھی کر
جس طرح لوگ غیبی آواز سن لیتے ہیں یا کرشمے کی قوت کو پہچان لیتے ہیں اسی طرح سبھی ہیں۔
نے انہیں پہچان لیا۔ اگر مہمان جی بوٹی کو ڈھونڈ

آیئے! آیئے کی صدا بلند ہو اٹھی۔ ہمارے دوست تو جیسے کی زحمت سے بچنے کے لئے پورا پہاڑ ا
اسی انتظار میں ہی تھے۔ انھوں نے یک دم حکم صادر فرما دیا۔ آپ میری لائے تو ہمارے دوست ڈوبتے اور مرتے، ا
کمر کرین میں لگے ایک رسے سے باندھ دیجئے۔ پھر میں آپ کی ہی لوگوں کو ایک ساتھ اوپر لے آئے۔ اس انسانی
ہمدردی کے کام میں لگ جاتا ہوں خوش قسمتی سے وہاں کرین کے لئے ایک نے کہا۔ "آپ اور کوئی نہیں بغیر پوچھ کے
بھی موجود تھی۔ فوجی افسر کو ان کی تجویز پسند آئی۔ جی ہیں۔" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس مثال کا برا بھی مانتے
پھر کیا تھا۔ سمندر کی طرح اُبال کھاتی انسانی اس وقت وہ بہت تھکے ہوئے تھے لیکن جذبے میں تھے اس۔
ندی کو انھوں نے تقریباً کود کر پکڑ لیا۔ انھیں اس مثال کو سن کر خوشی ہوئی۔

اب نہ انھیں بھنور کی فکر تھی نہ کسی کرین سے نیچے جانا اور پھرتی سے اوپر آنا کئی فوجیوں کو ایسا لگا جیسے
اور بات کی۔ حقیقت تو یہ انسان نہیں بندر کا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں اس دن سے بندر کا کہلانا بہت اچھا
تھی کہ ان کا دل انسانی ہے۔ ویسے بغیر پوچھ کے مہمان کہلانا بھی انہیں اچھا لگنا چاہیئے۔ لیکن اتنی بہت کم
ہمدردی کے جذبے ہے جو یہ تجربہ کم سے
سے سرشار تھا۔ ہمارے دوست کی اور کئی خصوصیات ہیں۔ مثال کے لئے، ایک بار انھوں نے کسی
عہد امن ندی پر ۵۵ صفحے کا ایک نوٹ چڑھا دیا۔ اور وہ نوٹ انھوں نے لکھا نہیں پڑھا تھا۔ اس بات کی خبر
میں جلد پھیل گئی تب سے انسائیکلوپیڈیا کے مدیروں نے ہندوستان کی حکومت سے گزارش کی ہے کہ انھیں اس
کو شائع کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ فیصلہ کسی کی طرف سے ہم [illegible] سے غیرت

چلتے پھرتے اس نسٹ کی بات سننی پڑ جاتی ہے۔

اور ہم لوگوں کی خوشی کی انتہا اس وقت نہ رہی جب ہمارے دوست کو تین ماہ کے لئے انگلینڈ بلایا گیا۔ … ایک
وہ خوش تھے کہ انہیں اب اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔ ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ ایک نہیں انہیں ایسے … اور ثبوت
بہت سے مواقع فراہم ہوئے۔ جیسے انہیں کئی یونیورسٹیوں میں تقریر کرنے کے دعوت نامے ملے۔ … دیا۔ ایک شام
آکسفورڈ یونیورسٹی نے تو ان کے خیالات پریشان کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے۔ وہ ان کے … شفیلڈ میں اپنے
شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے یہاں ایک کرسی قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ان کا خیال … میزبان کے یہاں کھانا
ہے کہ ان کی کتاب کے شائع ہو جانے سے ہی اتنی آمدنی ہو جائے گی کہ ایک کیا کئی … کھاتے وقت انہوں نے بتایا
کرسیاں قائم کی جا سکتی ہیں۔ … "کل شام ٹوکیو یونیورسٹی میں میں نے

ہمیں فخر ہے کہ پہلی بار ایک ایسا ہندوستانی انگلینڈ گیا جس نے … افتتاحی تقریر میں کہا کہ"
اس ملک کو اتنی عزت دلائی۔ وہ نہ پیسے کمانے کے لئے وہاں رکے اور … "کل شام ٹوکیو میں … یعنی جاپان میں!
نہ ہی انہیں وہاں کوئی پیسہ ملا۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریزوں نے … میزبان نے اچنبھے سے پوچھا۔ "میں یہی کہہ رہا
انہیں اتنے تحفے دیئے کہ ان کا گھر ولایتی سامانوں سے بھر گیا … ہوں۔"!
کئی یونیورسٹیوں نے انہیں اصرار کے ساتھ پیسے بھی … اس کے بعد پوچھنے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ بتا
دیئے۔ جسے منع کرنا ان کی تہذیب کے خلاف تھا۔ ان … تھا کہ ست سائیں بابا ایک وقت میں دو جگہوں میں دیکھے جا
کے بلند خیالوں اور ان کی اچھی انگریزی کی بہت … سکتے ہیں۔ لیکن شاید اتنا تو ان کے اختیار کار سے بھی باہر ہوگا۔
تعریف ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آدھ … انہیں دنوں انہوں نے ایک غیر متعلق بحث کے دوران ایک
پروفیسر نے تو ان سے وابستہ امیدوں … اور راز کا انکشاف کر ڈالا۔
کے مطابق ان کے دستخط اپنے … کیا آپ جانتے ہیں کہ آجکل ہز ماسٹرز وائس انگریزی کے
پاس محفوظ کر لئے … لنگوافون ریکارڈ بنا رہی ہے۔ یہ سب ریکارڈ میری انگریزی کی بنیاد پر ہی بنائے
ان کے دستخطوں … جا رہے ہیں۔
نے بڑے چاہ … "اچھا۔"
کرشمہ ساز … "اور ان کی رائلٹی کا ایک حصہ مجھے بھی دیا جائے گا۔"
طبیعت … کئی لوگوں نے احترام کے ساتھ اپنی گردنیں ایک ساتھ جھکا لیں۔
کا

کرگس سہوانی

مغنّی شاعر

یوں اک سخن شناس نے مجھ سے کیا سوال — کب سے ہوا ہے تجھ کو فنِ شعر میں کمال
میں خوب جانتا ہوں کہ کتنا پڑھا ہے تو — بزمِ سخن میں کیسے یہاں آگیا ہے تو
یہ بھی نہیں کہ گھر کا کوئی مال دار ہے — بازار کا سنا ہے بڑا قرض دار ہے
ٹوپی ہے تیرے سر پہ نہ جوتا ہے پاؤں میں — شہرِ سخن سے لوٹ جا تو اپنے گاؤں میں
گائے جو تو نے شعر بھی ناتمام تھے — درد و اثر سے دور تھے اور بے لگام تھے
یہ کون سی زمیں میں غزل پڑھ رہا تھا تو — قصے وصال و ہجر کے کیا گڑھ رہا تھا تو
چسپاں بھی ردیف نہ بندش ہی چست ہے — مضمون دیکھنے میں تو بیحد ہی سست ہے

شاعر تو میں نہیں ہوں مگر ہوں سخن شناس
وجہ کیا ہے کون سا تو نے ادب کا پاس

گستاخیاں معاف کہا میں نے اے حضور — مجھ کو بلائیں لوگ تو کیا ہے مرا قصور!
بزمِ سخن ہو کوئی کہ پھر بزمِ میکشی — جیسی جہاں بھی سمجھی ضرورت "الاپ" دی
"فعلن" "کو" فاعلن" کو یہاں جانتا ہے کون — شاعر جو بے سرے ہیں انہیں مانتا ہے کون
اشعار پڑھ دیئے ہیں جو کمزور و بے اثر — لیکن یہی ہوا کہ کہا سب نے خوب تر
"ساقط" کسے بتاؤں "تواردِ" کہوں کسے — ہر اک سخن شناس پہ پڑھتا ہوں مرثیے
کیسی "عروض" کیسے "قواعد" اے میاں — جو بھر گیا دماغ میں وہ کر لیا رواں
ہوتے جو آج غالب و داغ و حسن رت — کہتے ہر ایک شعر پہ واللہ کیا کہا!
مجھ کو لگے "یہ نادرہ ہے اللہ کی قسم — شاعر کو کم ملے گی تو زائد مجھے "رقم"
لیتا ہوں ڈش کے "داد" میں جم غفیرسے — کہتا ہوں وہ شکار فقط ایک تیر سے
"استاد" پوچھتے ہیں مرا تان سین ہے — گانا ہے ایک فن جو خدا ہی کی دین ہے

کرگس بھی سن رہے تھے یہ دونوں کی گفتگو
کہنے لگے خدا رکھے شاعر کی آبرو

○

رحمت بخاری

کچھ پیروڈیاں

(مرزا غالب سے معذرت کے ساتھ)

(۱)

کس نے اس قسم کی نرسس کو ٹریننگ دی ہے
ان کی تشخیص کا آخر یہ طریقہ کیا ہے
"ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"

(۲)

بیس سالہ جواں سے کہا
ساٹھ سالہ ضعیف قبلہ نے
"اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے"

(۳)

تم تو آرام سے بیٹھے ہیں جمی بیٹھی ہو
مارتے ہیں یہاں جھک مار کے ہم ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

خرافات

(مراسلے)

● "تاڑن کے ادھیکاری"

شگوفہ کے سالنامہ میں فکر تونسوی پر شائع شدہ میرے مضمون کا ایک جملہ یوں چھپا ہے۔
"اور ہندی رامائن کے مصنف تلسی داس نے بھی کہا تھا کہ ناری نارن کی ادھیکاری ہے۔"
یہ لفظ "نارن" نہیں بلکہ "تاڑن" ہے۔ تلسی داس کا پورا دوہا یہ ہے۔

پشو ڈھول، شودر اور ناری
یہ سب تاڑن کے ادھیکاری

یعنی جانور، ڈھول، ہریجن اور عورت ان سب کو پیٹنا مناسب ہے۔ ویسے میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔

نریندر لوتھر، حیدرآباد

● پیارے شگوفہ باز!

سنا ہے آپ سالنامہ پر معززین کی رائے چھپایا کرتے ہیں۔ پیشگی اطلاعاً عرض ہے کہ مجھ سے اس کی امید مت رکھئے گا۔ کیونکہ سالنامہ سوائے میرے ہندوستان کے ہر معزز کو مل چکا ہے۔ بلکہ کئی معززین تو میرا منہ چڑھاتے ہوئے کہہ چکے ہیں۔ "نریندر لوتھر نے فکر نامہ پر ایک فکر انگیز تبصرہ لکھا ہے، کیا آپ نے نہیں پڑھا؟"

فکر تونسوی، دہلی

● شگوفہ کا سالنامہ ملا۔ دل پھول نہیں باغ باغ ہوگیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر اور احمد جمال پاشا کے مضامین بہت اچھے تھے۔ میں تو آپ سے پہلے ہی کہتا تھا کہ ہر شمارے میں ایک سنجیدہ تحقیقی یا تنقیدی مضمون ہونا ہی چاہیئے۔ ظرافت تو اتنا وسیع موضوع ہے کہ لکھنے والے لکھتے لکھتے تھک جائیں۔ احمد جمال پاشاہ دیر سے سو کر اٹھے لیکن نہایت ہی چاق و چوبند حالت میں۔ دلاور فگار اور رضا نقوی واہی کی نظمیں آپ نے آمنے سامنے چھاپ کر شاید یہ بتایا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ ٹائٹل بھی اچھا خاصا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کوئی ٹکسٹائیل مل اسے غصب نہ کرلے۔

ایک بات اور۔ دو چار خطوں میں احباب نے یہ لکھا ہے کہ "دستخط" کا مونث ہونا انھیں ناگوار گذرا۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن دوستی کا تقاضہ ہے کہ اس "غلطی" کو کتابت کی غلطی سمجھ کر نظر انداز کردیا جائے ـــــ یوں دستخط مونث بھی ہوسکتی ہے بشرطیکہ ... اب جانے بھی دیجئے جلیس نمبر کی اشاعت کا اعلان تو آپ نے کردیا لیکن مضامین بھی جمع کیجئے۔ مرزا ظفر الحسن کا مضمون ضرور شریک اشاعت کیجئے۔ میں بھی لکھنے کی کوشش کروں گا۔ اور اپنے دستخط بھی کردوں گا۔

یوسف ناظم، بمبئی

● محترم مصطفیٰ کمال صاحب

تسلیمات، "شب سنگ میں ڈالی کباب شیشے میں" پر شگوفہ کے سالنامے میں خطوط پڑھے۔ ان تبصروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے قارئین کتنی گہری نظر رکھتے ہیں۔ میں اس مضمون کے تعلق سے چند باتیں گوش گذار کرنا چاہوں گا۔

جب اس مضمون کا خیال مصنف کے ذہن میں کلبلایا تو وہ تخلیق کے کرب سے بے قرار ہوا تھا اور مجھ غریب کے سر پر مسلط ہوگیا۔ حضرت یوسف ناظم صاحب نے ماہنامہ شاعر کے قومی یکجہتی نمبر میں اپنے مطلب کے دستخط تلاش کئے اور نشان ڈال کر ٹریس کرا لیئے۔ لالچ یہ تھا کہ مضمون میں میرے دستخط کا بھی ذکر ہے۔

یہ تمام اور ایسے ہزارہا دستخط مشہور شاعر اور صحافی اعجاز صدیقی صاحب نے بقلم خود ٹریس کئے تھے۔ یوسف ناظم صاحب کے مضمون کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی کھل کر آیا۔

اس مضمون کے ایک دلچسپ پہلو پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ یہ دستخطوں کا مکمل قاعدہ ہے کیونکہ اس میں پہلے دستخط آل احمد سرور کے ہیں یعنی الف اور آخری یوسف ناظم کے۔ (گویا ا سے ی تک تمام دستخطوں کا احاطہ ہوگیا) ایسا مکمل مضمون شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

نیازمند سردار عرفان، بمبئی

● بھائی، سالنامہ دیکھا، جی خوش ہوا ہمت کی داد دی کہ "تخلص نمبر" سے فارغ ہوئے کہ ایک عام شمارہ کے بعد سالنامہ پیش کردیا۔ میرے ساتھ آپ اپنا جی بھی خوش کیجئے کہ جھیل میں آپ کی محنت کو سراہا جارہا ہے ہم ادیبوں کے جی خوش کرنے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ ہماری محنت کی داد ملے۔ آپ نے

ترتیب قریب سارے مزاح نگاروں کی [illegible] بہت خوب،
انگریزی میں ویل ڈن اور ہندی میں کیا کہنا!

(پروفیسر) آفاق احمد بھوپال

● شگوفہ کا سالنامہ بہت خوب ہے، پسند آیا۔ آپ اس طرح خصوصی شمارے نکالنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

مصطفےٰ تقوی واہی، پٹنہ

● شگوفہ کا سالنامہ ملا۔ توقعات کے عین مطابق ہے۔ اتنے اچھے مضامین آپ کس طرح لکھوا لیتے ہیں؟ پروفیسر آفاق احمد نے بھی تخلص نمبر ایڈیٹ کرنے کے بعد شگوفہ سے اپنا ناطہ جوڑ لیا ہے۔ لیکن ان کے مزاحیہ "معشوق جفا پیشہ یعنی اسکوٹر ہمارا" کے ساتھ نام اشفاق احمد چھپ گیا ہے۔ دوسرے تمام مضامین اور منظوم حصہ شگوفہ کے معیار کے مطابق ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مضمون اچھا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر پیروڈی کے تعلق سے میرے مضمون (شائع شدہ پیروڈی نمبر) سے متفق نظر آئیں۔

فضل جاوید، بھوپال

● ایک عرصہ سے شگوفہ تفنن طبع کا سامان فراہم کرتا چلا آ رہا ہے اور لگتا ہے کہ اپنے خاص نمبروں کے ذریعہ طنز و مزاح کا پورا اسٹاک قارئین باذوق کی خدمت میں مہیا کرتا رہتا ہے ابھی حال کا تخلص بھوپالی نمبر اس کا ثبوت ہے واقعی آپ کا کمال ہے کہ رسالہ روز بروز نکھرتا اور معیاری ہوتا جا رہا ہے۔

دنیا غم و اندوہ، رنج و مصائب اور آلام و آفات سے مرکب ہے اس لئے اگر دو چار لمحے مسرت و انبساط اور خوشی و شادمانی کے میسر آ جائیں تو غنیمت ہیں:

ع یہ ایک تبسم بھی کیسے ملتا ہے؟

اور آپ تبسم بکھیرنے کا کام بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

موج صہبائیؔ، بمبئی

● محترم مصطفےٰ بھائی سلام مسنون!

"شگوفہ" کا سالنامہ ملا۔ شکریہ۔ یہ دلپذیر و دلفریب سالنامہ دل کے ساتھ ساتھ ذہن و نظر کے لئے بھی غذا مہیا کرتا ہے اور یہ بڑی بات ہے کیونکہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ غذا کے ساتھ اٹکا ہوا ہے۔ ساری تخلیقات آپ کے انتخاب کی گواہی دے رہی ہیں۔ فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، بھارت چند کھنہ اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کو ابھی پڑھ سکا ہوں۔ سیدہ جعفر کا مضمون بے حد اسٹینڈرڈ ہے۔ ان کے ذوق مطالعہ اور دوربین نگاہی پہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ دوسرے تنقید نگاروں کو بھی رسائل اور کتابیں پڑھتے رہنا چاہئے اور لکھتے وقت تعصب کی عینک سے کام نہیں لینا چاہئے۔ اس سالنامہ پہ مبارکباد!

مناظر عاشق ہرگانوی

● ادارہ شگوفہ تخلص بھوپالی مرحوم پر ایک بھرپور جائزہ لینے میں اپنا حق ادا کیا ہے۔ جسے نہ سراہنا ادب نوازوں کی کوتاہ نظری ہو گی۔ [illegible] واہی سے شرف [illegible] سے "شگوفہ" کے لئے کچھ لکھنے کی تحریک لی۔

شمیم قاسمی، سہسرام

● محترم سید صاحب! سلام و نیاز

"شگوفہ" کا سالنامہ ملا۔ ہر لحاظ سے لاجواب ہے۔ سرورق دیدہ زیب، کتابت و طباعت عمدہ، نظم و نثر تیکھی اور دلچسپ۔ غرضکہ کس کس بات کو سراہا جائے۔ غزل کو شعر کی آبرو کہا گیا ہے۔ اسی طرح "شگوفہ" "طنز و مزاح" کا وقار ہے۔ اس کی باقاعدہ اشاعت اور ترتیب کے لئے آپ مستحق مبارکباد ہیں۔

اعجاز وارثی سنبھلی

● یکم فروری ۷۸ء کو سالنامہ شگوفہ ملا شکریہ، واقعی سالنامے کی ترتیب بہت خوب ہے۔ حصہ نظم بھی بہت بہتر ہے۔ میرے احباب نے بہت پسند فرمایا۔ دعا گو ہوں کہ خداوند تعالیٰ شگوفے کو پھلنے پھولنے کا موقع عنایت فرمائے۔ آمین

نرگس سہسوانی

● سالنامہ شگوفہ اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ منظر عام پر آ گیا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

فیض الرحمن

سروار کیمپ (کرناٹک)

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

مدیر 'شاعر' اعجاز صدیقی انتقال کر گئے ۔۔۔!!

۹ فروری کی شام جب مجھے یہ اطلاع ملی تو تھوڑی دیر کے لئے خبر کی صداقت پر یقین نہ آیا حالانکہ وہ خاصی عمر کے تھے اور ان کے اکثر خطوط میں لکھا ہوتا کہ بستر علالت سے خط لکھ رہے ہیں۔ لیکن وہ بستر علالت ہی سے اس پابندی کے ساتھ کام کرتے کہ کوئی صحت مند توانا مدیر بھی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا۔ ان کی علالت کو ادارت سے کبھی بیر نہیں رہا۔ اسلئے کبھی ہم نے ان کی موت کا تصور ہی نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے دم سے ادبی صحافت میں زندگی تھی ۔۔۔ ان کے قلم سے ادارت کا وقار تھا۔ ان کے وجود سے مختلف نقاط نظر کے ادیبوں اور شاعروں میں ربط و تعلق تھا۔ میں نے اردو صحافت میں انھیں کبھی بیمار نہیں دیکھا۔ ذہنی اعتبار سے نہایت صحت مند جسمانی کمزوری اور پیری کے باوجود ادبی کاموں میں چاق و چوبند۔ وہ قادر الکلام شاعر اور اعلیٰ درجہ کے نثر نگار تھے۔ رسالوں کی ترتیب و اشاعت میں ان کی یہ صلاحیتیں خوب کام آئیں۔ ہر کام اپنی نگرانی میں کرنے کی کوشش کرتے۔ یوں بھی ادبی رسالے کے مدیر کی قسمت یہی ہوتی ہے چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام اسی کو کرنا ہوتا ہے۔ ادبی رسالہ کا مالیہ اتنا مستحکم نہیں ہوتا کہ اچھی صلاحیت والے افراد کو ملازم رکھ لیا جائے نتیجۃً لکھنے پڑھنے کے کام کے علاوہ انتظامی نوعیت کے سارے امور سے خود مدیر کو نمٹنا پڑتا ہے بمبئی کی گرانٹ روڈ پر واقع ایک تنگ مکان میں اپنے وسیع خاندان کے ساتھ رہتے ہوئے محترم اعجاز صدیقی کس طرح یہ سارے کام انجام دے لیتے تھے۔ اس کا تصور ہی تکلیف دہ ہے۔ ملک کے سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں سے ان کا شخصی ربط تھا۔ ہر ایک سے نہایت پابندی کے ساتھ وہ خط لکھا کرتے۔ شعری و نثری تخلیقات کا ایک ایک لفظ پڑھتے۔ پروف دیکھتے۔ ممکن ہو تو کاتب کی مدد کے بغیر تصحیح کر لیتے کاغذ کے مختلف نمونے دیکھ دیکھ کر سستا اور اچھا کاغذ منتخب کرنے کی کوشش کرتے۔ جب کبھی مجھ سے ملاقات ہوتی کتابت و طباعت کے مسائل پر تفصیلی گفتگو کرتے اور شگوفہ کے معیار اور اس کی ترقی پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ دسمبر میں دو ہفتوں کے لئے بمبئی جانا ہوا تو کسی طرح اعجاز صدیقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ حسب عادت بہت خوش ہوئے اور پتہ نہیں کیوں میں اسی دن مصروفیت کے باوجود ڈیڑھ دو گھنٹے ان کے ہاں بیٹھا رہا پھر بھی جی نہیں بھرا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ میری ان سے آخری ملاقات ہوگی!

اللہ تعالیٰ رحمت کرے۔ اور ان کی بیوہ اور بچوں کو صبر عطا کرے۔

● اعجاز صاحب کے انتقال سے طبیعت افسردہ ہے۔ میں اتفاق سے اتوار ۵ فروری کو ان کے ہاں چلا گیا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ہاں بیٹھا رہا۔ اچھے خاصے تھے بلکہ ہشاش بشاش تھے اور یہ پہلا موقعہ تھا جب انھوں نے کسی بیماری کا ذکر نہیں کیا بلکہ کہا کہ بہت اچھا ہوں۔ آپ کا بھی ذکر رہا۔ دہلی کے ذکر پر یہ بات نکل آئی تھی۔ (اچھا ہی ہوا کہ پروگرام ملتوی ہو گیا) شاعر کے تبصرہ نمبر کا پروگرام سوچ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ دو ڈھائی سو کتابیں جمع ہو گئی ہیں جن پر تبصرہ کرنا ہے۔ چار کتابیں مجھے بھی دی تھیں کہ میں تبصرہ لکھوں۔ بس نو کی صبح ۵½ بجے اٹھے۔ تھوڑی دیر بعد طبیعت بگڑ گئی۔ دوا خانہ لے جائے گئے اور پونے سات بجے انتقال کر گئے۔ میں دن میں گھر پر چلا گیا تھا۔ دوسرے دن قرآن خوانی میں شریک ہوا۔

یوسف ناظم، بمبئی

قسط وار ناول "چہ خوب" کی قسط بروقت وصول نہ ہونے کی وجہ سے زیر نظر شمارہ میں شائع نہیں کی جا سکی۔

— مدیر

ہماری کتابیں

مرقع اقبال (جگن ناتھ آزاد) قیمت۔ پچاس روپے
(علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرہ نسب، نادر و نایاب تصاویر، بیاض، تحریروں کا البم۔)

سرسید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت پانچ روپے
(ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی پر سرسید اور ان کے رفقاء کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ پروفیسر نظامی نے بڑے عالمانہ انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔)

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر
(ڈاکٹر محمد عمر) قیمت: بیس روپے
(ڈاکٹر تاراچند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔)

ہم ایک ہیں (عرش ملسیانی) قیمت: دس روپے
(ہندوستان مختلف زبانوں، عقیدوں اور طور طریقوں کا ملک ہے اور چمن کی اسی اختلاف سے زیب و زینت حاصل ہے۔ رنگ و بو کے یہ پھول ایک گلدستے میں بندھے ہوئے ہیں اور ہماری قومی زندگی کو تاب و توانائی بخشتے ہیں۔)

ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) قیمت: پانچ روپے
(ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں تھے۔ جدوجہد آزادی کی کوئی بھی تاریخ مولانا آزاد کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔)

روشنی کے مینار (شمیم جیراجپوری) قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے
(سماجی مصلحین، مذہبی رہنماؤں اور سماجی قائدین کے سوانحی خاکے جو آسان زبان میں ہائی اسکولوں کے طلبا کے لئے لکھے گئے ہیں۔)

یہ ہندوستان (شیلا دھر) قیمت: دس روپے
(اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی، معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے اور انہیں بڑے دلچسپ انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس ملک کی دنیا میں کیا اہمیت ہے۔ عمدہ کتابت و طباعت اور رنگین تصاویر سے مزین یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے بچوں کے لئے ضرور خریدنا چاہیئے۔)

جواہر لال نہرو کی کہانی تصویروں کی زبانی
قیمت: تین روپے پچاس پیسے
(محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لئے ایک عمدہ تحفہ۔)

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے
قیمت: دو روپے پچاس پیسے
(گھریلو ضرورتوں کے جام، جیلی، مربے، مارملیڈ، چٹنی اور اچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعہ بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔)

"آج کل" کے سالانہ خریداروں کو بیس فیصد کی رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے۔

پانچ روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔پی نہیں بھیجی جاتیں۔ براہ کرم پوسٹل آرڈر بھیجئے یا وی پی طلب کیجئے

ملنے کا پتہ:۔ بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

77/458

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد (۱۱) ـــــ مارچ [illegible] ـــــ شمارہ (۳)

ایڈیٹر

سید مصطفیٰ کمال ایم۔اے (عثمانیہ)

مجلسِ مشاورت

راجندر سنگھ بیدی ÷ بھارت چند کھنہ

خواجہ عبدالغفور ÷ نریندر لوتھر ÷ مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت

منظور احمد ÷ حمایت اللہ ÷ مسیح انجم

○

فی پرچہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ ـــــ (۲۰) روپے

بیرونِ ہند سے ـــــ (۳۵) شلنگ

○

طباعت ثانی شکل : اسٹینڈرڈ اکویمنٹس، شانتی نگر، حیدرآباد

لیتھو طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۲...۵

جلد بندی : محمد حبیب بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی، روبرو عبادت خانہ حسینی، حیدرآباد

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ } شگوفہ ۳۱۔ مجرد گاہ، بیظلم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

(فون نمبر: 57716)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

شگوفہ
کا آئندہ شمارہ

سوونیر ہوگا

جو ۱۴ اور ۱۵ اپریل ۱۹۷۸ء کو زندہ دلان حیدرآباد کے گیارھویں سالانہ اجتماع
کے موقع پر شائع ہوگا

قیمت تین روپیہ

ابراہیم جلیس نمبر

مئی ۱۹۷۸ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا۔

* ابراہیم جلیس کے انشائیوں کا انتخاب * جلیس پر ان کے احباب کے خاکے
* جلیس کی شخصیت و فن کا جائزہ
* اُردو دنیا کا جلیس کو خراج عقیدت

اور

* بے شمار دوسری خصوصیات

ایجنٹ حضرات قبل از قبل اپنے آرڈر بک کروالیں۔

حبیب ضیا

بڑا ڈاکٹر

کسی بھلے چنگے آدمی کو کسی بڑی بیماری میں مبتلا کرنے والے کو بڑا ڈاکٹر کہتے ہیں۔
اور اسپیشلسٹ وہ ہے جو ایک صحت مند آدمی کو کسی اسپیشل بیماری میں مبتلا کرنے کی بدرجۂ اتم صلاحیت رکھتا ہو۔
دل کے اسپیشلسٹ سے رجوع ہونے سے دل کی ہر قسم کی چھوٹی بڑی بیماریاں انسان
میں آجاتی ہیں۔ دل کے علاوہ دماغ، گردے، پھیپھڑوں وغیرہ
کے بھی اسپیشلسٹ اس سرزمین پر پائے جاتے ہیں۔
بڑے ڈاکٹر مل کے علاج کا طریقہ بھی بہت منظم
ہوتا ہے۔ ایک بڑا ڈاکٹر مریض کو دوسرے
ڈاکٹر کے پاس بھیج کر خون کا امتحان کرواتا ہے
خون والا پیشاب کا امتحان کروا کر دل کے ڈاکٹر
کے پاس بھیجتا ہے۔ دل والا گردوں کے ماہر کو
چٹھی لکھ کر دیتا ہے۔ گردے والا ہڈیوں کے ڈاکٹر سے
ربط پیدا کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور ہڈیوں والا مریض کا رشتہ داروں کے
ڈاکٹر سے جوڑتا ہے۔ اس کبھی ختم نہ ہونے والے چکر میں صرف مریض ہی ختم ہو سکتا ہے۔

ایک صاحب ہاتھ کے درد کے علاج کے لئے ایک بہرے جراح کے پاس گئے۔ جراح نے دس کا نوٹ ڈبّے میں رکھتے ہوئے پوچھا "دانت میں تکلیف ہے؟" وہ صاحب زور سے بولے "جی نہیں! میرے ہاتھ میں درد ہے۔"

"داڑھ ہل رہا ہے؟" انھوں نے غصے سے کہا "جی نہیں، مجھے صرف ہاتھ کا علاج کروانا ہے ـــــ" جراح نے پھر یوں منہ کھولا "آپ کو پورے دانت نکلوانا ہوگا، دانتوں کی خرابی کی وجہ سے ہاتھ میں درد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خارش کے پاس دانت نکلوا کر میرے پاس آئیے۔"

یہ سن کر وہ صاحب غصہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنا چوکھا نکال کر جراح کے پوپلے منہ میں ٹھونستے ہوئے چلتے بنے۔

ایک ڈاکٹر کی فیس ۲۵ روپے اس کے نکاح میں بندھی ہوئی تھی۔ زکام ہو یا کھانسی، جاڑا ہو یا بخار، ڈاکٹر کا چمچہ ۲۵ روپے لے کر مریض کو ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت دیتا تھا ڈاکٹر اچھا تھا لیکن اس کی فیس کو دیکھ کر علاج کروانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن ہم ہمت کر کے اس ڈاکٹر کے پاس گئے اور ڈاکٹر سے کہا:

"ڈاکٹر صاحب! مجھے صرف نزلہ ہے۔ کیا آپ کی فیس ۲۵ روپے سے کم نہیں ہو سکتی؟" اس پر ڈاکٹر نے غصے سے جواب دیا ـــــ "جی نہیں۔ اس میں کچھ کمی نہیں ہو سکتی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ڈسکاؤنٹ ویک چل رہا ہے۔ زکام، کھانسی سر کا درد جیسے امراض پر ۲۵ فیصد ڈسکاؤنٹ ہے اور موذی امراض جیسے دق اور کینسر ایک ساتھ ہوں تو ایک مرض کا علاج فری ہے۔ ڈسکاؤنٹ ویک کے دوران کوئی مریض میرے علاج سے مرجائے تو اس کے کفن دفن پر ۵۰ فیصد ڈسکاؤنٹ ہے۔

۵۰ فیصد ڈسکاؤنٹ سن کر ہم نے ڈسکاؤنٹ ویک میں مرنے کا فیصلہ کیا۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر سے پوچھا "یہ دکان کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے کہا "میرے دواخانے کے پیچھے ہی میرا نان میٹرک سالا یہ کاروبار کرتا ہے، نالائق ہے نا۔ اسی لئے میں نے اس کام میں اسے مصروف کر دیا ہے۔ آپ کو دُور جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

بڑے ڈاکٹر کی ایک خصوصیت جو اسے دوسرے ڈاکٹروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بڑا ڈاکٹر مریض سے زیادہ دیر تک بات کرتا ہے۔ وہ مختلف قسم کے ضروری اور غیر ضروری سوالات پوچھ کر مریض کو اطمینان دلا دیتا ہے کہ اس نے تشخیص میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ پچھلی زندگی کے بارے میں وہ پوچھے گا:

- "آپ کو بچپن میں ٹائیفائیڈ تو نہیں ہوا تھا؟"
- "چیچک تو نہیں نکلی تھی؟"
- "میرا خیال ہے آپ کچھ سوچا کرتے ہیں۔"
- "آپ پر فکروں کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔"
- "کیا آپ پر بہت زیادہ ذمہ داریاں ہیں؟"
- "آپ کی بیوی آپ کو مارتی تو نہیں؟"

ان سوالات میں سے یقیناً ایک ایسا ضرور ہوگا جس کا جواب مریض اثبات میں دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر کے منہ سے اپنی "آپ بیتی" سننے کے بعد مریض "فنا فی الڈاکٹر" ہو جاتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ڈاکٹر مریض سے من مانی کروا سکتا ہے یعنی مختلف قسم کے چیک اپ کے چکر میں مریض کو گھیر لینے میں مکمل طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔ بڑے ڈاکٹر ایک دوسرا روزگار فراہم کرتے ہیں۔ اس فارمولا پر ہمیں اس وقت یقین آیا جب کہ ہمیں ایک شہرت یافتہ لیڈی ڈاکٹر سے سابقہ پڑا ایک

دن بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا کہ وقتاً فوقتاً میڈیکل چیک اپ کروانا صحت کے لئے مفید ہے۔ اس فالتو خیال کے آتے ہی ہم لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ وہ دن ہم کبھی نہیں بھول سکتے جس دن کہ ہمیں زبردستی شکر کی موذی بیماری میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ کوئی موذوں مرض کا نام سمجھ میں نہیں آیا تو ہم نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمیں کچھ تکان سی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے منہ سے اس جملے کا نکلنا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی سانس کی نالی سے ایک لمبی سانس نکلی جو خوشی سے بھرپور تھی۔ وہ کہنے لگی : "ہوں! تو کیا پروفیسر بن گئی ہو؟ —— ہمیں اب تک کسی نے پروفیسر نہیں کہا تھا۔ پروفیسری کے آگے ڈاکٹریٹ ماند پڑتی دکھائی دینے لگی۔ موقع کو غنیمت جان کر ہم نے جھوٹی شان کے ساتھ تنخواہ میں دوسو کا اضافہ کرتے ہوئے کہا "جی ..... جی ہاں! مجھے ترقی ہوگئی ہے اور آپ کی دعا سے آپ جو کہہ رہی ہیں وہ بن گئی ہوں"

ترقی کا لفظ سن کر لیڈی ڈاکٹر فاتحانہ انداز سے ہماری طرف دیکھ کر یوں گویا ہوئی :

"تمہیں شکر آتی ہے؟"

ہم نے کہا "جی —— آتی تو ہے مگر صرف آٹھ کلو کیا بتائیں ڈاکٹر، یہ شکر ہر ماہ ناکافی ہوتی ہے۔ آپ کے پاس زاید ہے تو دے دیا کیجئے"

لیڈی ڈاکٹر نرمی سے بولی "میں شکر کی بیماری کی بات کر رہی ہوں۔ تم کو شکر کی بیماری ہے کیا؟"

ہم نے کہا "آپ کے منہ میں پتھر، خدانخواستہ ہمیں کیوں ہونے لگی یہ بیماری"

"آپ کے ماں باپ میں سے کسی کو ہے یہ بیماری؟"

"جی نہیں۔"

"نانا نانی —؟"

"جی نہیں —"

"دادا دادی —؟"

ہم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا "جی ہاں۔ میرے دادا کی شوگر فیکٹری تھی"

لیڈی ڈاکٹر اچھل پڑی۔ کرسی توڑتے ہوئے بولی :

"میرا شبہ صحیح نکلا۔ خاندان میں ایک بھی ایسی بیماریوں کا شکار ہو تو ورثہ میں جائیداد نہ سہی ایک مہلک مرض تو دے جاتا ہے۔ یہ موروثی مرض ہے۔ انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ میں تم کو چٹھی دیتی ہوں ڈاکٹر باواجی کے پاس مکمل چیک اپ کروا کر آنا"

ہم نے تعجب سے کہا "آپ ڈاکٹر، آپ کے باواجی بھی ڈاکٹر —!!"

لیڈی ڈاکٹر بولی "بدتمیزی مت کرو۔ باواجی میرے والد نہیں، مشہور ڈاکٹر کا نام ہے — تم مریضوں کی یہی عادت بُری ہوتی ہے کہ جہاں روپیہ خرچ کرنا ہوتا ہے وہاں نہیں کرتے۔ رہا اس ڈاکٹر سے میری رشتہ داری کا سوال، ان معاملات میں مریض کو دخل دینے کی ضرورت نہیں — یہ ڈاکٹروں کا آپس کا معاملہ ہے"

اس اثنا میں شکر کی بیماری نے ہمیں گھلانا شروع کر دیا شکر جس طرح چائے میں گھلتی ہے اسی تیز رفتاری سے ہم بھی گھلنے لگے۔ جدھر نظر دوڑاؤ شکر ہی شکر دکھائی دینے لگی۔ ساٹھ روپے خرچ کرکے ہم تیسرے دن "NIL" والی رپورٹ لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ وہ بہت معروف تھی۔ اس نے رپورٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس کی نظر میں

دن میں تین کے تین نوٹس پڑتیں جو ہمارے پیچھے لائن

میں کھڑے تھے۔ فوراً ہی اس رپورٹ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر اس نے ایک کاغذ کے پُرزے پر " ہسٹو کیلیم " لکھ کر کاغذ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور بولی :

" تم کو کوچ نہیں ہے جی۔ آدھا چمچہ دوا لگتو پیو " :

لیڈی ڈاکٹر کے یہ الفاظ اور اس کا نسخہ ہمارے پاس محفوظ ہے بیماری کا خیال آتے ہی ہم اس کا نسخہ دیکھ لیتے ہیں۔

غزل

ظفر جکدیوی

بھول بیٹھوں کیوں نہ رسم میزبانی دوستو
ناک میں لائے ہوئے ہے دم گرانی دوستو

دیش اپنا گویا بنتا جا رہا ہے کربلا!
خوں سے بھی مہنگا ہوا جاتا ہے پانی دوستو

دیکھتی ہے صرف جیبوں کو محاسن کو نہیں
ہوگئی دنیا ہمارے حق میں کانی دوستو

اللہ اللہ انقلاب دہر کی عشوہ گری
آج ہے داسی بنی جو کل تھی رانی دوستو

اب طواف کوئے جاناں بھی مرے بس میں نہیں
بھڑکے چھتے سے کروں کیا چھیڑ خانی دوستو

دیکھ کر اس دیو نما عورت کا کڑیل ڈیل ڈول
بھول بیٹھے پہلوان بھی پہلوانی دوستو

سن رسیدہ ان کو گر بیوی ملی تو کیا ہوا
مئے زیادہ تیز ہوتی ہے پرانی دوستو

ان کی قینچی سی زبان چلتی ہے جب بے روک ٹوک
منہ تکا کرتی ہے میری بے زبانی دوستو

سب کے گھر سے خبریں لے کر نشر کر دیتی ہے جو
میری ہمسائی بھی ہے آکاش وانی دوستو

قد میانہ، شکل معمولی، لیاقت واجبی
ہے ظفر کی شخصیت بھی درمیانی دوستو

اُستادیاں

اُستاد رام پوری

ہیں اس کے ذہن میں ماضی کی یادیں
ہلا دیتا ہے دُم کچھ جانتا ہے
نگاہیں پھیر لے والے اِدھر دیکھ
ترا کتا تجھے پہچانتا ہے

★

کوئی بھی ماہ پیکر چست ملبوسات میں نکلے
اُسے جائز کسی تہذیب کے بانی نہیں کہتے!
اگر بازار میں ننگے کھڑے ہوں کوئی سادھو جی
اسے روحانیت کہتے ہیں عریانی نہیں کہتے!

★

دونوں ہی اب خدا کو فراموش کر چکے
دونوں ہی اپنے مشاغل میں مست ہیں
اتنا سا فرق مشرق و مغرب میں رہ گیا
وہ مادّہ پرست یہ مادہ پرست ہیں

★

یہ سوچ کر کہ ہوئی التجائے وصل قبول
میں پوسٹ مین کی دستک پہ ایک دم نکلا
وفورِ شوق میں کھولا جو اس لفافے کو
بجائے نامۂ محبوب ایک بم نکلا

مونچھ

نوید بلاسپوری

لمبی لمبی مونچھیں میری ہونٹوں پہ اک جھالر تھی
منھ کے اندر بھی اتنی تھی جتنی منھ کے باہر تھی

مونچھ کی میری بات نہ پوچھو تاؤ میں جب بھی آتی تھی
بچے چھپتے پھرتے تھے اور گھر والی تھرّاتی تھی

جب تک مونچھ تھی چہرے پر یہ چہرہ بھی نورانی تھا
جتنا پانی آج ہے اس سے زیادہ ہی کچھ پانی تھا

لہرا لہرا کر جب میرے ہونٹوں کو سہلاتی تھی
آفس میں بھی بیٹھے بیٹھے نیند مجھے آجاتی تھی

مونچھوں کی ہر تان میں گویا اک تارا سا بجتا تھا
جتنی بجتی تھی وہ مجھ کو اتنا ہی میں سجتا تھا

ہائے رے وہ دن جب بھی مجھ کو یاد کبھی آجاتا ہے
ہوک سی اٹھتی ہے دل میں اور منھ کو کلیجہ آتا ہے

بیوی نے جھلّا کے کہا جب تم نے یہ کیا رکھی مونچھ
میں نے اس کی چٹیا پکڑی اس نے پکڑی میری مونچھ

جانے کتنی مونچھیں اکھڑی ہوں گی کھینچا تانی میں
بہتر ہوتا ڈوب کے مرجاتا چلّو بھر پانی میں

مونچھ کا معلوم اسی دن مجھ کو یہ انجام ہوا
یعنی مونچھیں رکھ کر بھی میں بیوی سے ناکام ہوا

آخر پانی پانی ہو کر شرم سے میں نے تج دی مونچھ
میرے بانکے چہرے پر تو تم نے بھی دیکھی تھی مونچھ

لفڑے میں

محبوب راہی

کبھی ہے چلتے لفڑے میں کبھی ہے پاں لفڑے میں
تمہارے گھر جو آنے پڑ گئے مہمان لفڑے میں

ہوتے ہیں عشق کے چکر میں ہم دونوں ہی گھن چکر
تمہارا دل ہے لفڑے میں ہماری جان لفڑے میں

اچانک آگئی جو آج نوبت قرض لینے کی !
اچانک پڑ گئی اس کی میری پہچان لفڑے میں

قیامت تک رہے گا انکے آگے اک نہ اک لفڑا
کہ ہیں روزِ ازل سے حضرتِ انسان لفڑے میں

نگہ نسان کی اہلیت پر اس نے جب ڈالی
حیا سے رہ گیا پھر دیر تک شیطان لفڑے میں

وہ کافر اس کی باتوں پر تو کیا ایمان لائے گا
کسی دن ڈال دے گا شیخ کا ایمان لفڑے میں

کیا کچھ ایسا لفڑا اب کے فیملی پلاننگ نے
میرے گھر آتے آتے پڑ گئی سنتان لفڑے میں

چلو کچھ روز تو بیگم کے لفڑوں سے ملی چھٹی
کہ پڑنے والے ہیں اب انکے بھائی جان لفڑے میں

نظر آتی نہیں لفڑوں سے بچنے کی کوئی صورت
کہ راہی مبتلا ہوں ہر گھڑی ہر آن لفڑے میں

لئیق صلاح

اگر میں .....!

آج تک عموماً یہ سوچا اور کہا کرتے تھے کہ اگر میں عورت ہوتا یا اگر میں مرد ہوتی ــــ! بہت کم مرد عورت بننے کے خواہش مند ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ عورت بننے یا ہونے کی خواہش کرنا مردوں کی دانست میں بڑی بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ پہلے ہی سے ایک طبقہ اس قسم کا موجود ہے۔ اگر وہ عورت بننا پسند کریں تو اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو اسی زمرہ میں شامل کرنے کے مترادف ہے۔

ویسے عورت بننے میں صرف چند خوبیاں پیش نظر ہوتی ہیں۔ ایک تو بھاری بھرکم کپڑے پہننے کو ملتے ہیں اور دوسرے قیمتی زیورات سوائے اس کے اور کوئی خاص بات نہیں۔ ان کپڑوں کو پہننے کے لئے باحوصلہ ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی تکلیف دہ ہوں۔ لیکن لوگوں پر اپنا رعب جمانے کے لئے اپنی دولت، شہرت اور حسنِ سلیقہ کی اشتہار بازی کے لئے یہ سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔ بقولِ شاعر ؎

ناگوارا کو بھی کرتے ہیں گوارا انساں
زہر پی کر بھی مزۂ شیر و شکر لیتے ہیں

رہا زیور، تو اس کے لئے بھی مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ صرف ہاتھ، پیر اور گلے میں پہن لینا "عورت پن" نہیں، اتنا تو اچھے خاصے مرد بھی پہنتے ہیں۔

ان سے بازی لے جانے کے لئے جو تگ و دو کرنی پڑتی ہے ۔ وہ ناک اور کان میں سوراخ کرنے پر مجبور کرتی ہے ۔ کان کا صرف ایک سوراخ تھا تو یہ مقولہ مشہور ہو گیا تھا کہ ——— " ایک کان سے سنیں اور دوسرے کان سے اڑائیں ——— اور جب انسانوں نے خدا کی قدرت میں دخل اندازی کر کے بے حساب سوراخ دونوں کانوں میں کر دیئے تو اب " ایک کان سے سننے کی زحمت اُٹھانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی ۔ شاید اسی لئے عورتیں بہت کم کسی بات کا اثر لیتی ہیں ۔

کان اور ناک جیسے نازک اعضاء کو جب زیور سے لبریز کر دیا گیا تو "صنفِ نازک" کا نفس مطمئن ہو گیا ۔ زیور صرف "گراں بہا" ہونا کافی نہیں ۔ اس کے لئے "گراں بار" ہونا بھی شرط ہے ۔ اس طرح عورت وہ شئے ہے جو سر سے پیر تک زیور میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے ۔ بقولِ حافظ ؎

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کپڑے اور زیور ہی عورت کی زندگی کا سرمایہ ہیں، اس سے ہٹ کر عورت کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے ۔ کولھو کے بیل کی طرح دن رات کام میں جُتی رہنا ۔ پہلے زمانے میں مرد فخریہ کہا کرتے تھے کہ باہر نکلو تو معلوم ہوگا کہ زندگی کی مشکلات کیا اور کیسی ہیں ۔ اُس دور کی عورتیں، طنز کے یہ تیر بلا شہتیر کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتی ہوں گی لیکن آخر کوئی کب تک خاموش رہے ۔ ایک نہ ایک دن اس کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی اور وہ مرد کے دوش بدوش کام کرنے کے لئے تیار ہو گئی ۔ حوا کی بیٹی کو آسان نہ سمجھئے ۔ حوا ہی کی جرأت اور ہمت نے آدمؑ کی خودی بیدار کی تھی، ورنہ آدمؑ برسوں جنت ہی میں رہتے ۔

خدا خدا کر کے، عورت نے باہر قدم نکالا، لیکن یہ قدم اس پر ہی بھاری ہوا ۔ باہر نکل کر اس نے مرد پر کیا احسان کیا ۔ اپنے لئے آرائش و زیبائش کی چیزیں خریدیں ۔ کچھ زیورات اور ملبوسات میں اضافہ کیا اور سونے پر سہاگہ زیور اور کپڑوں کے ساتھ اسے مزید — PURSES اور جوتوں کی بھی ضرورت لاحق ہوئی ۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ گھر کے کام سے چھٹکارا ملے گا جیسے کہ مرد اپنی فوقیت جتا کر اس کام سے بچا کرتے تھے ۔ یا پھر دونوں مل کر ففٹی ففٹی کام کریں گے ۔ اب تو انھیں کوئی بہانہ ہاتھ نہ آئے گا ۔ لیکن اس بے چاری کا حال تو وہی ہوا " عذرِ گناہ بدتر از گناہ " ۔ بیک وقت دونوں کام اس کے سر ہو گئے ۔ اب وہ گھر کے آرام و سکون کی متلاشی ہے تو وہ کہاں نصیب ہوگا ۔ اس لئے کہ وہ عورت "نامرد" ہوئی ہے ۔ بچے بھی سنبھالے، گرہستی کی دیکھ بھال بھی کرے اور ملازمت بھی ۔

ہاں ! وہ جس آزادی کی خواہش مند تھی وہ بھی قسمت سے نہ ملی ۔ آزاد رہتے ہوئے بھی مجبور ہے ۔ گزشتہ زمانے کی بے کس و مجبور عورتوں میں اور اس بیسویں صدی کی آزاد و خود مختار عورت میں کوئی فرق نہیں بلکہ دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے وہی بہتر تھی ۔ اسے باہر کی دنیا سے پالا تو نہیں پڑا تھا ۔ ۱۹۷۵ء میں عورتوں کا بین الاقوامی سال منایا گیا ۔ یہ بھی عورتوں پر بڑی کاری ضرب تھی لیکن بے چاری عورتیں جنھیں حکماء نے " ناقص العقل " کہا ہے اس پر بھی خوش ہو گئیں کہ ہماری کس قدر عزت و توقیر ہو رہی ہے ۔ نہ صرف تمام ریاست اور ملک بھر میں بلکہ پوری دنیا میں ہمارا سال منایا جا رہا ہے ۔ یہ نہیں سوچا کہ ایک ہزار نو سو چوہتر (۱۹۷۴) سال مردوں کے اور صرف ایک سال عورت کو دیا جا رہا ہے ۔ اس کے منانے سے کیا عملی فوائد حاصل ہوئے

وہ ابھی زیرِ غور ہے۔ غرض ان تمام پہلوؤں پر مردوں نے خوب غور و خوض کیا۔ اس لئے صرف چند ہی "عورت" کا روپ رنگ اختیار کرنے کے لئے رضامند ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف دہے تک بھی، ہر عورت کے دل میں یہ تمنا چٹکیاں لیتی تھی کہ کاش! وہ مرد ہوتی۔! سب سے پہلی چیز تو اسے آوارگی اور آزادروی میسر آتی جو ہر انسان کا فطری حق ہے اور یہ حق تو بے چاری عورت سے جملہ حقوق کے ساتھ کبھی کے چھین لیا گیا ہے۔ آزادروی کے بعد اس کی نگاہ جس پہلو پر پڑتی ہے وہ ہیں گھریلو کام کاج۔ باہر کی ملازمتوں (دفتر، کالج، اسکول اور دواخانہ) میں مقررہ وقت تک کی ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر آرام ہی آرام۔ لیکن یہاں تو ہمیشہ ایمرجنسی (EMERGENCY) سے واسطہ رہتا ہے۔ "آرام حرام" جسے کہتے ہیں اس کا دوسرا نام "عورت" ہے۔ دن ہو کہ رات اپنے کام میں لگی رہنا۔ چوبیس گھنٹوں میں اسے کتنے کام کرنے پڑتے ہیں، برتن دھونا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا، سلائی کرنا، کپڑے دھونا، بچے سنبھالنا، جس میں کھلانا، نہلانا، بہلانا سب کچھ شامل ہیں۔ ایک کام بھی پورا نہ ہوتا کہ دوسرے کام اسے "دعوتِ نظارہ" دیتے۔ رات بھی چین سے بسر نہیں ہوتی۔ بچے اگر چھوٹے ہوں تو یکے بعد دیگرے ماں کی مدد کے طلب گار ہوتے ہیں اب آپ ہی کہئے، ایسی صورت میں عورت مرد بننا پسند نہ کرے گی تو اور کیا۔

یہ باتیں تو بہت پرانی ہوگئیں۔ سچ پوچھا جائے تو اب نہ کسی مرد کو عورت بننے کی خواہش ہے۔ اور نہ کسی عورت کو مرد بننے کی۔ بھلا ہو اس "ہپی ازم" اور "جدید انقلاب" کا، دونوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ لباس ایک جیسا، چال ڈھال، وضع قطع اور بالوں کا اسٹائیل سب ہی بالکل ایک جیسے ہیں۔ شکل ہی سے کوئی کہہ سکے گا کہ یہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ اور جس نے پہچانا یقیناً وہ "دیدۂ بینا" کا مالک کہلانے کا مستحق ہے۔ لڑکوں کے جو خاص ملبوسات تھے جیسے پتلون، بشرٹ وغیرہ وہ لڑکیاں پہننے لگیں، اور لڑکے گلے میں (CHAIN) ہاتھ میں کڑا۔ اگلے وقتوں میں مردوں کو یہ طنزیہ کہا جاتا تھا کہ کسی کام کے اہل نہیں لہذا چوڑیاں پہنے ہوئے نظر آتے تھے۔

لوگ تو سب جنسِ مخالف کے تعلق سے سوچتے ہیں لیکن ہمارا اپنا خیال ان سے کچھ مختلف ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اب جس حال میں ہیں غنیمت ہے۔ اگر اس کی بجائے ہمارا وجود کسی اور پیکر میں سمایا ہوتا تو کیا ہوتا؟ دنیا میں مختلف پیشے ہیں جن میں سے صرف تین پیشوں کا سوچ کر ہم شکر گزار ہیں کہ خدا نے ہمیں وہ نہ بنایا۔ ایک تو ڈاکٹر دوسرے چوکیدار اور تیسرے کنڈکٹر (CONDUCTOR)۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وکیلوں کی غلطیاں، سولی پر چڑھاتی ہیں۔ اُستادوں کی غلطیاں زندہ جاوید ہوتی ہیں یعنی ایک شاگرد سے دوسرے شاگرد میں منتقل ہوتیں، اور ڈاکٹروں کی غلطیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہم ان افسانوں میں سے نہیں جو غلطیوں کے پردہ پوشی ہونے سے مطمئن ہو جائیں۔ یہاں تو بقول غالب "زود پشیماں" پشیماں ہی ہوتا رہتا ہے۔ ایک تو پشیمانی کی عادت کافی حد بڑھا ہوا ہے۔ پھر نیند میں سے جاگنا قطعاً گوارا نہیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بیماریاں رات ہی میں اپنا زور دکھاتی ہیں۔ کھانسی ہی کو دیکھئے، تمام دن جوں توں کر کے گزر جاتا ہے لیکن رات کاٹے نہیں کٹتی۔ بیماریوں

سے زیادہ تیمار دار بہت چابکدست ہوتے ہیں جہاں ان کی نیند خراب ہوئی، انھیں دوسروں کی نیند سے رشک بلکہ حسد سا ہونے لگا۔ اس لئے وہ اس کا غبار ڈاکٹر پر اُتارتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتلایا تھا کہ انھیں قدرت کے جاڑے میں کسی نے نصف رات گئے فون کیا کہ فلاں بیمار کے لئے آپ سے مشورہ کرنا اشد ضروری ہے۔ آپ فوری تشریف لائیے۔ جب وہ تشریف لے گئے اور معائنہ کے بعد نسخہ وغیرہ تجویز کر کے تسلی و تشفی دلاکر گھر لوٹے اور ایک پلک جھپکنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر فون آیا۔ گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ اسی مریض کے گھر سے آیا ہے جس کا معائنہ ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب نے کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سمجھے کہ مریض چل بسا یا انھوں نے غلط دوا تجویز کی۔ بہرحال جب ان خدشات کو دل میں لئے وہ فون کے پاس پہنچے تو پتہ چلا کہ دونوں باتیں بھی نہیں بلکہ یہ تیسری ہی بات ہے۔ جس کی طرف ڈاکٹر صاحب کا ذہن منعطف بھی نہیں ہوا تھا۔ ہاں! تو تیمار دار نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے جو نسخہ تجویز فرمایا ہے وہ ادویہ ابھی منگوائی جائیں یا صبح۔ مریض کا پارا اترا کہ نہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ کہنے لگے جب دوائیں صبح میں منگوانی تھیں تو معائنہ کے لئے کیوں بلوایا گیا تھا لاکھ آگ بگولہ ہو، ہزاروں صلواتیں سناؤ مگر نیند جو اُڑ گئی تو اس کی تلافی کون کرسکتا ہے۔ فراقِ یار میں جس طرح تارے گننے پڑتے ہیں وہی حال ڈاکٹر صاحب کا ہوا ہوگا۔ نیند کو ہم ایک "نعمتِ عظمیٰ" سمجھتے ہیں اس لئے صد شکر اس پروردگار کا جس نے ہمیں ڈاکٹر نہ بنایا ورنہ یہ بار بار نیند سے جاگنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اور اگر جاگ بھی جاتے تو ممکن ہے کہ ادویہ غلط تجویز ہوتیں۔ بخار والے کو 'قلب' کے مریض کی دوا اور قلب کے مریض کو کینسر کی ادویہ، پھر یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ہوش و حواس سنبھلے تو پھر پشیمانی الگ، نقصان مریض کا اور ذہنی کوفت ہمارے حصے میں آتی۔

ڈاکٹر اور چوکیدار میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے نیند۔ اس بے چارے کی بھی پوری رات اختر شماری میں گزرتی ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ جتنی نیند چوکیدار کو آتی ہے اتنی دنیا کی کسی ہستی کو میسر نہیں۔ اس کا حال تو بقولِ غالب ؎ .... "کب رات کو یوں بے خبر سوتا" کا سا ہے۔ خواہ اسے نیند آئے یا نہ آئے۔ بعض اوقات اس کا ڈھونگ رچانا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی بیداری کا ثبوت دینے کے لئے کچھ ہل چل کرے تو چور اور ڈاکو اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ اس لئے وہ عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ نیند آئے یا نہ آئے لیکن لوگ اگر اس کی تصدیق کرلیں کہ وہ سو رہا ہے تو بس یہی کافی ہے۔ ہم اگر چوکیدار ہوتے تو فرض شناسی کے ناطے نہیں بلکہ اپنی عادت سے مجبور ہوکر جو ایک وقت جاگتے تو پھر پوری رات سونا محال ہوتا۔ اور "سکون محال" جب قدرت کے کارخانے میں ہوتا ہے تو وہ دوسری صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کلیہ سے ہمارا بچنا بھی محال ہے۔ لہٰذا مسلسل جاگنے سے ہم چوکیدار سے مجنوں ہوجاتے۔ اور اس طرح ایک گھر کی حفاظت کیا، تمام گلی، کوچے، صحرا سب ہی ہمارے احاطے میں آجاتے۔

تیسرا اور دنیا کا ہماری دانست میں سب سے اہم کام کنڈکٹر (CONDUCTOR) کا ہے۔ دنیا والے مختلف لوگوں کو مختلف وجوہات کی بنا پر ذہین سمجھتے ہیں۔ اور ہم یہ ٹائٹل (TITLE) کنڈکٹر کو دینا چاہتے ہیں۔ ایک تو وہ چست، چالاک ہوتا ہے، اس کی نظروں سے بچنا یا اس کو دھوکہ دینے والا اس سے بھی مہا چالو ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کا اگر

کوئی نبض شناس ہے تو وہ کنڈیکٹر ہی ہے۔ وہ دکھتی رگوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ جہاں کسی نے ٹکٹ نہیں لیا، وہ فوراً ٹکٹ کا طلب گار ہوا۔ چارہ ناچار دیتے ہی بنی۔ اس کی ذہانت اور یادداشت پر واقعی رشک آتا ہے۔ وہ "مردم شناس" "نبض شناس" اور "قیافہ شناس" بہ آسانی بتا سکتا ہے کہ کس نے ٹکٹ لیا اور کس نے نہیں —— ہم اگر کنڈکٹر ہوتے تو جو ٹکٹ لیا ہوتا اس سے بار بار اصرار کرتے کہ ٹکٹ لیں۔ اور جس نے ٹکٹ نہیں لیا سمجھتے کہ اس نے ٹکٹ لے لیا ہے۔ اس طرح R.T.C کو پتہ نہیں فائدہ ہوتا یا نقصان —— ؟

بزم فلاح

کل میرے ایک دوست ملے مجھ کو راہ میں
کہنے لگے کہ " چلنا ہے بزم فلاح میں
ملت کے نوجوانوں کی تنظیم کے لئے
ان کی فلاح کے لئے تعلیم کے لئے
ہم لوگوں نے بنائی ہے اک انجمن نئی
جس کی نشستِ خاص بھی رکھی ہے آج ہی
القصہ اپنے دوست کے ہمراہ ہم گئے
ملت کے اور لوگ بھی آئے وہاں پہ تھے
پہلے تو تھوڑی دیر چلا دور چائے کا
پھر سلسلہ لطیفوں کا بھی دیر تک چلا
حالاتِ حاضرہ پہ بھی کچھ گفتگو ہوئی
کچھ بات ترکِ پردہ و برقع کی بھی چلی
پھر ماہتابِ شعر و سخن کا ہوا طلوع
اور شاعروں نے شعر سنانا کیا شروع
آوازے بھی کسے گئے تعریف بھی ہوئی
تضحیک میں ملی ہوئی توصیف بھی ہوئی
سب شعر و نغمہ میں تھے مگن آدھی رات تک
چلتا رہا یہ دورِ سخن آدھی رات تک
غزلیں سنائیں اس نے بھی بزم فلاح میں
اسرار کا بھی وقت کٹا ' واہ واہ ' میں
اغراض اور مقاصدِ بزم فلاح کا
اک بار بھی نہ آیا کسی لب پہ تذکرہ

اسرار جامعی

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(غالب)

مصحفِ رُخ کا تمہارے جو ثناخواں ہوتا
دلِ بے تاب مرا حافظِ قرآں ہوتا
مصرعۂ بحرِ طویل آپ بہ ایں قامت و قد
میں وہ مصرعہ نہیں جو آپ پہ چسپاں ہوتا
تیرے راکٹ سے بھی اے یار میں لیتا ٹکر
میرے قبضہ میں اگر تختِ سلیماں ہوتا
اس میں کچھ تیری نحوست بھی ہے شامل مُلّا
ورنہ اللہ کا گھر ایسا نہ ویراں ہوتا
ہوتی اے قیس جو لیلیٰ کی کوئی اور بہن
ساتھ ہاشم بھی ترے چاک گریباں ہوتا

ہاشم عظیم آبادی

اسمٰعیل آذر

موٹاپا

کچھ لوگ ہم پر نکتہ چیں ہیں کہ آج کل ہم ضرورت سے زیادہ موٹے ہوگئے ہیں۔ ہم نے اپنے چند بہی خواہوں سے (جنھیں آج کی تہذیب خواہ مخواہ "چمچہ" کہتی ہے) بغرضِ تصدیق دریافت کیا کہ آیا ہم واقعی موٹے ہوگئے ہیں یا یوں ہی بے پر کی اڑائی جارہی ہے۔ انھوں نے کافی سوچ بچار اور دماغ سوزی کے بعد بتایا کہ ہم موٹے نہیں ہیں بلکہ اسے صحت مندی کہا جائے گا۔ بہرحال گھر آکر ہم قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہوگئے اور اپنے "صحت مند" جسم پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور مسکرائے کیونکہ یہ جاذب توجہ معلوم ہورہا تھا۔

ادھر چند دنوں سے کچھ بد ذوق قسم کے لوگ ہمارے پیچھے پڑگئے ہیں۔ ہمیں موٹاپے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی چھیڑنے کی خاطر جملے بھی کسا کرتے ہیں۔ اپنوں کی بات تو الگ رہی پرایوں نے بھی ہمیں نہیں بخشا۔ پرسوں کی بات ہے کہ دفتر جاتے وقت دو لونڈوں نے ہماری خبر لے ڈالی۔ پیچھے سے "موٹو موٹو" کہہ کر پکارنے لگے۔ پکارنے کا انداز ایسا تھا گویا ہم ان کے فرزندِ ارجمند ہوں۔ ہم کہ ہمیشہ دوسروں کی کمزوریوں کا مذاق اُڑانے والوں میں سے ہیں بھلا ایسے نکتہ چینوں کی بدتمیزی کو کب برداشت کرسکتے تھے۔ ایک روز چند نامعقولوں سے پوچھ ہی بیٹھے —— "میاں! اگر تم ہم کو موٹا کہتے ہو تو قاسم بھائی دانت والے گرانڈیل کو کیا کہوگے جو اپنے جسم پر ایک بڑا سا پیٹ لٹکائے پھر رہا ہے؟" جواب ملا "وہ توندول ہے اور آپ موٹو ہیں —— کیا آپ کو اتنی بھی تمیز نہیں؟" —— اس جملہ بازی نے ہمیں خاصا دل برداشتہ کردیا مگر ہم نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ ہم واقعی موٹے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تنقید کا دور ہے اور آئے دن ہر شخص کی خوبی/خامی کے متعلق تبصرہ چلتا رہتا ہے لیکن ہم نے جب دیکھا کہ لوگوں کی تنقیدی مد کچھ زیادہ ہی بڑھتی جارہی ہے تو ہم سنجیدگی سے اپنے جسمانی آثار

چڑھاؤ کا جائزہ لینے بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے خود اپنے خیال و تصور کا جائزہ لیا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آدمی کو اپنی خامیاں نظر نہیں آتیں۔ ویسے بھی اگر ہر شخص اپنی خامیاں اور کمزوریاں نکالنے میں مصروف ہوجائے تو بے چارہ جئے کس طرح؟ اس لئے تو علامہ جمیل مظہری نے کہا ہے ؎

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہمارے محلہ میں ایک بزرگ تھے۔ لونڈے انھیں "بڈھا" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ وہ بگڑ جاتے اور جواب میں کہتے ـــــ "میں کیوں بڈھا ہونے لگا ـــــ تم بڈھے تمہارے باپ بڈھے"۔ ہم اپنے تخیل کے پیمانے کو آزمانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے یہ کہہ کر دل کو بہلا لیا کہ دنیا میں ایک سے ایک تنومند آدمی موجود ہیں جو ہمارے دوگنے، چارگنے بلکہ دس گنے ہیں۔ اور موٹاپا کوئی بڑا عیب تو ہے نہیں بلکہ یہ تو کئی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ موٹاپا عام طور پر رعب جمانے میں مدد دیتا ہے۔ اس سے شخصیت کا بول بالا ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت آدمی امیر بھی کہلاتا آرہا ہے۔ (چاہے اس کی شیروانی کے قافیے پریشانی نے قافیہ تنگ کر رکھا ہو)۔ موٹاپے کے مادے نے ملک میں ہزاروں سیاسی لیڈر پیدا کئے۔ بڑے بڑے سیٹھوں، مہاجنوں اور بیوپاریوں کو جنم دیا۔ اور پھر یہ بھی سوچا کہ ہم مزاحیہ شاعر ہیں۔ ایک مزاحیہ شاعر کا بے ڈول ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ شعری محفلوں میں سامعین کلام اور صاحب کلام دونوں سے لطف اندوز ہوں۔ میں اس سنجیدہ شاعر کی طرح جو صرف اپنی خوش گلوئی کی وجہ سے محفل کا شاعر بن جاتا ہے۔ بوخرالذکر خیال نے ہمیں بے حد اطمینان بخشا بلکہ اپنے موٹاپے پر ناز سا ہونے لگا۔

آج صبح ہم بالکل فرش (FRESH) ہوکر دفتر کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ حسب معمول بس اسٹانڈ پر کھڑے ہوکر اخبار نکالا اور پڑھنے لگے۔ ایک دلچسپ سرخی پر نگاہ جم گئی ـــــ "بیویاں اپنے شوہروں کو امراض قلب سے بچا سکتی ہیں"۔ ہم اچنبھے میں پڑ گئے۔ یہ تو ڈاکٹروں کے حق میں سراسر ایک خطرناک بات ہے۔ بیویاں معالج بن جائیں گی تو بے چارے ہارٹ اسپیشلسٹوں کا کیا ہوگا۔ ذوق تجسس بڑھا تو ہم جلدی جلدی متن پڑھنے لگے۔ لکھا تھا ـــــ "امراض قلب کے مشہور ماہر ڈاکٹر اے۔ کے۔ ابراہیم نے انکشاف کیا ہے کہ آدمی دل کے امراض کی پگڈنڈی سے موت کی منزل کی سمت اسی وقت چل دیتا ہے جب اس کی شادی ہوتی ہے"۔ یہ جملہ ایک چپت کی صورت میں ہمارے سر پر تڑسے پڑا۔ ہم نے گھبرا کر سر اٹھایا اور اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ گویا شادی کرکے ہم نے واقعی جرم کیا ہو۔ اسی اثنا میں دفتر کی بس آگئی مگر ڈرتا کہ ہم سوار ہونا بھول گئے۔ بے خیالی ہی میں کچھ خیال کرکے ہم نے پھر آگے پڑھا ـــــ "شادی کے بعد آغاز محبت کے دیباچہ کے طور پر (جو عموماً نہایت دل خوش کن ہوتا ہے) بیویاں اظہار وفاداری میں اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہیں کہ شوہروں کو ہر قسم کی مقوی اور مرغن غذائیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں کھلاتی رہتی ہیں۔ وہ اس سے بے خبر رہتی ہیں کہ دراصل وہ وفا کے پردے میں زبردست بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہیں"۔ ہمیں کچھ اطمینان ہوا کہ بیگم سے شادی رچا کر ہم نے کوئی نامعقول حرکت نہیں کی۔ اب رہی بیگم کی بات تو وہ ایک حد تک صحیح معلوم ہوئی۔ ان کی بے وفائی بے پی نوٹ کی طرح ہمیشہ غائب رہتی ہے۔ اور جب کبھی موقع ملا

پڑتی ہے تو بڑی مہنگی پڑتی ہے ۔ بہرحال ہمیں تو یہ معلوم کرنا تھا کہ آخر ہم دل کے امراض کی پگڈنڈی سے موت کی منزل کی طرف کس طرح چل پڑتے ہیں ۔ لہٰذا ہم آگے بڑھے ۔ لکھا تھا :

- ان سب بدپرہیزیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد ذیابیطس، موٹاپے اور بدہضمی کا شکار ہوجایا کرتے ہیں ۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جو رفتہ رفتہ آدمی کو قلبی امراض کی طرف لے جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں ۴۵ سال کی عمر کے بعد قلبی امراض سر اٹھانے لگتے ہیں :

اس آخری جملے پر ہمارے ہاتھ سے اخبار اس ادا سے چھوٹ کر زمین پر جاگرا کہ جس طرح کسی کی موت کی خبر پڑھنے کے بعد ٹیلی گرام ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے ۔ جس موٹاپے کے زعم میں ہم خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے وہ اب ایک زبردست بھوت بن کر ہمیں ڈرا رہا تھا ، کھڑے کھڑے محسوس ہوا جیسے کسی نے ہوا بھر کر ہمارے جسم کو اور بھی موٹا کردیا ہو ۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے تھے کہ دوسروں کی بہ نسبت زمین پر کچھ زیادہ جگہ لئے ہوئے کھڑے ہیں ۔ اچانک سینہ میں جلن محسوس ہوئی اور ہلکی ہلکی کھٹی ڈکاریں آنے لگیں۔

سویرے ہم نے کھایا بھی کیا تھا ؟ زیادہ تو نہیں ــــــ ! صرف چار پراٹھے ، ایک ڈبل آملیٹ اور تھوڑا سا مربہ ۔ ہاں رات دعوت میں غالباً کچھ زیادہ کھا گئے تھے ۔ چکنا کھانا اور وہ بھی دیر سے لا سکتے ہیں کہتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا ۔ اسی طرح اگر ہم رات دیر سے کھائیں تو کھانا ہمیں بھی ہضم نہیں ہوتا ، پیٹ میں رکھا رہ جاتا ہے ۔ بہرحال اسی دماغی الجھن میں ہوش ہی نہیں رہا کہ ہمیں دفتر جانا ہے ۔ اس دوران پتہ نہیں کتنی بسیں سامنے سے نکل گئیں ۔ ہمارے ہوش تو سب سے زیادہ ہماری عمر ہی گم کئے ہوئے تھی ۔ ۴۵ سال ہونے کو اب کتنا عرصہ رہ گیا ہے ۔ ۳۵ کے تو ہم ہو ہی گئے ہیں ۔ باقی بچے دس سال ، بھلا ان کی بساط ہی کیا ۔ دیکھتے دیکھتے ہوا ہوجائیں گے ۔ ممکن ہے موت کے ڈر سے ہم قبل از وقت بڑبڑا کر پاؤں پسار دیں ۔ اللہ سے عمر مانگ کر ہم لائے بھی ہیں تو کتنی ۔ بقول سیماب چار دن ۔ ان میں سے دو دن شادی سے قبل بیگم کے چکر میں پڑ کر پہلے ہی کٹ چکے ہیں ۔ باقی دو دن ان کے پکوان کی آرزو میں گزر جائیں تو پھر جیئے کیا ؟ اس سے تو اچھا تھا کہ پیدا ہی نہ ہوتے ۔ اب ہمارے قدم دفتر کی بجائے گھر کی طرف بڑھنے لگے ۔ رہ رہ کر ہمیں بیگم پر غصہ آرہا تھا ۔ ہمیں موت کے منہ میں ڈھکیلنے کی ذمہ دار وہی تو ہیں ۔ اچھے کھانوں کے بہانے وہ اتنے دنوں سے فضول خرچی کرتی آرہی ہیں ۔ ہمارے قدم تیز تیز اٹھنے لگے ۔ کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ بیگم کو ان کی ساری خرافات گنوائیں ۔ گھر پہنچے تو ہمیں بے وقت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئیں ۔ ہم نے فوراً وہ تمام ڈائیلاگ جو راستہ بھر تیار کئے تھے ایک فلمی ویلن کے اسٹائل میں ان پر دے مارے ۔ بیگم نے کئی بار بیچ میں ٹوکنے کی کوشش کی لیکن ہماری ذمہ دار آواز نے انھیں دبا دیا ۔ وہ خاموش ہوگئیں اور ان کی خاموشی پر ہم اپنے آپ کو فتح مند سمجھنے لگے ۔ وہ دن گزر گیا ۔ پھر رات گئی بات گئی ۔ اس دن ہم نے صحت کا خیال کرتے ہوئے کچھ نہیں کھایا ۔ دوسری صبح ہم ایسے ہشاش بشاش تھے گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی ۔

باورچی خانے سے بڑی زبردست خوشبو آرہی تھی ۔ یقیناً بریانی ہی پک رہی تھی ۔ ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا لیکن اچانک گزشتہ رات کی بات ذہن پر ایک آہنی شہتیر بن کر گر پڑی اور ہمارے ہوش ٹھکانے آگئے ۔ یکایک ہمیں بیگم پر بڑا غصہ آیا لیکن

فوراً برس جانے کی بجائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ منصوبہ تھا کہ اگر بیگم لذیذ کھانوں کے ساتھ اندر داخل ہوں تو ساری رکابیاں ان پر الٹ دی جائیں۔ کچھ دیر بعد بیگم کھانا لئے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رکابی میں دو تین سوکھی چپاتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں ٹماٹر کی چٹنی ہے اور ایک کونے میں تھوڑا سا اُبلا ہوا ساگ ——— ماجرا سمجھ میں نہیں آیا —— پوچھا تو کہنے لگیں :

• ایسی ہی غذائیں صحت کو برقرار رکھتی ہیں۔ اور عمر کو بڑھاتی ہیں۔"

• مگر بیگم ! ہم نے ابھی ابھی غالباً بریانی کی خوشبو سونگھی تھی ——— ؟

• ضرور سونگھی ہوگی۔ بریانی میں نے اپنے لئے بنائی ہے : بیگم نے جل بھن کر کہا۔

• تم بریانی کھاؤگی اور میں یہ سوکھی چپاتیاں ؟

• جی ہاں ——— !

• کیوں ——— ؟

• اخبار میں جو کل آپ نے پڑھا تھا وہ مردوں کے تحفظ صحت کے لئے لکھا گیا تھا۔ عورتوں کے لئے نہیں۔ عورتوں کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ مردوں کو مرغن غذائیں کھلا کر نہ ماریں "

• تم نے غلط سمجھا بیگم ! یہ نصیحت تو درپردہ مرد اور عورت دونوں کے لئے تھی "

• ہوگی۔ لیکن میں تو جیتے رہنے کی متمنی نہیں ہوں۔ آپ ہی بیٹھے رہئے پتھر کا سر باندھ کر "

• ارے ارے تم تو ناراض ہوگئیں۔ ذرا سوچو تم مرجاؤگی تو ہم اکیلے رہ کر کیا کریں گے۔ دیکھو۔ ایسا کرتے ہیں یا تو ہم دونوں مل کر یہ چپاتیاں کھاتے ہیں یا پھر مرغن غذائیں تاکہ ہماری موتیں آگے پیچھے تھوڑے ہی وقفے پر آئیں۔ اس طرح زیادہ گیپ (GAP) تو نہیں رہے گا :

• دیکھئے جی۔ میں آپ کی طرح ڈبل روٹی نہیں ہوں بلکہ آپ کی ہمیشہ کی جلی کٹی سے آدھی ہوچکی ہوں۔ اس پر یہ یہ غذائیں کھلا کر اور بھی دُبلی کرنا چاہتے ہیں کیا — ؟

• بیگم۔ حُسن دُبلاپے میں ہی زیادہ دلکش ہوتا ہے "

• مبارک ہو۔ شاید اسی لئے آپ اپنے واسطے ایسی غذائیں ڈھونڈھ رہے ہیں "

بیگم نے نشتر زنی کرتے ہوئے کہا۔ ہم ان کی باتوں پر خواہ مخواہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور معلوم نہیں کس دل سے سوکھی چپاتیاں کھانے لگے۔

نگار لکھنوی

عقدِ شاعرہ

کروں گی پیار اسی سے جو خوش خصال بھی ہو
اسی کی دال گلے گی جو مالا مال بھی ہو

کل ایک شاعرہ مجھ سے یہ کہہ رہی تھی نگار
نہ پوچھئے مرا ماضی تو عرضِ حال بھی ہو

میں اپنے دل کا فسانہ سُنائے دیتی ہوں
یہ اس خیال کہ حل نقطۂ خیال بھی ہو

میں چاہتی ہوں سنور جائے میرا مستقبل
یہ آرزو ہے کہ بہتر مرا مآل بھی ہو

مریضِ دل ہیں مری والدہ بھی والد بھی
بس اس سے قبل کہ دونوں کا انتقال بھی ہو

دعائیں کرتی ہیں ممی کہ میرے پھول کھلیں
شگوفہ کاریٔ باغیچۂ وصال بھی ہو

بس اب تلاشِ شریکِ حیات ہے مجھ کو
کہ بعدِ عقد ذرا سیر نینی تال بھی ہو

مگر اک ایسے گلے باز خاں کی طالب ہوں
کہ تان سین نما جس میں سُر بھی تال بھی ہو

وہ ٹوٹے تال کو جوڑے تو اس طرح جوڑے
کہ جوڑ توڑ میں آپ اپنی ہی مثال بھی ہو

نہ بوم و چغد ہو ایسا کہ سب کہیں بھوندو
نہ خر دماغ ہو ایسا کہ خر خصال بھی ہو

سب ارنا بھینسا کہیں، ہو نہ ڈیل ڈول ایسا
نہ چھوئی موئی کی مانند خستہ حال بھی ہو

برائے خدمتِ زوجہ کرے جو وقفِ حیات
اُٹھا کے جوتیاں بیوی کی وہ نہال بھی ہو

میں ڈانٹ دوں تو کھڑا کا کھڑا ہی رہ جائے
نہ یہ کہ مجھ سے وہ مائل بہ قیل وقال بھی ہو

ہزار ہیں متشاعر بصورتِ شاعر
یہ اور بات ہے گھورے میں کوئی لال بھی ہو

ہزار ملتے ہیں خانہ بدوشِ شعر وادب
کروں گی عقد اسی سے جو خوش جمال بھی ہو

جمال سے ہے مراد اس کا حسنِ فن کاری
سخنوری میں نمایاں بہ خط و خال بھی ہو

ہے ایسے شاعرِ پختہ شعور کی خواہش
نہ جس پہ خام خیالی کا احتمال بھی ہو

نہ یہ کہ "ع" گراتا رہے بہرِ اوزان
نگار جس سے دلِ صاحبِ کمال بھی ہو

وہ 'S' کو 'ASS' لکھے اور BELL کو BAIL لکھے
معلی میں جو اک فردِ پیر سال بھی ہو

کرے تلفظ و معنی کا یوں نہ ستیاناس
جو اس کو صحتِ الفاظ کا خیال بھی ہو

نہ توڑ موڑ کے انگلش کے لفظ نظم کرے
کہ شاہراہِ ادب جس سے پائمال بھی ہو

یہ سُن کے میں نے کہا شاعر ہونے میں سمجھا — نہیں پسند وہ شیشہ کہ جس میں بال بھی ہو "
تجھے پسند نہیں ایسا کوئی بھی شاعر — کہ جس کے شعروں میں لفظوں کا گول مال بھی ہو
تجھے پسند نہیں ایسا ایک بھی مصرعہ — " اور بہ تقریب اسے امیدِ انتقال بھی ہو
نظر نہ عین کو 'ع' آئے ہو نظر ایسی — تو کیوں نہ شعروں میں اسکے یہ جھول جھال بھی ہو
نہیں ہے شہر میں اور ایسا ایک بھی فن کار — جو تیرے واسطے موزوں بہ این خیال بھی ہو
تلاش کر وہ ملے گا مشاعروں میں تجھے — گڑی ہوئی تری آنگن میں جس کی نال بھی ہو
مراد مل کے رہے گی تری کبھی نہ کبھی — مگر یہ شرط ہے سختی سے دیکھ بھال بھی ہو
برائے رشتۂ ثانی سنگار حاضر ہے — یہ قید ہو نہ اگر بے عیال و آل بھی ہو
زہے شرف زہے عزت اگر قبول افتد — کھلے یہ غنچۂ دل عقدِ با وصال بھی ہو
قبول ہو تو میں آجاؤں مولوی لے کر — کہ اس سے قبل ترے حسن کا زوال بھی ہو
بنی تو میری بنی، میں بنوں بنا تیرا — بنا بنی میں محبت بہ اعتدال بھی ہو
پھر اس کے بعد وہی ہو جو ہوتا آیا ہے — کہ تیری گود بھرے گھر میں نونہال بھی ہو

او میرے چاند ہنی مون کے لئے آجا
بکارِ نیک یہ تعجیلِ خوش مآل بھی ہو

قطعہ

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا"
کبھی ان کے باپ ہوتے کبھی پہرہ دار ہوتا
ہوئے اس طرح وہ چٹ پٹ گیا وصل کا بھی جھنجھٹ
" اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا "

(سنگار لکھنوی)

یہ تو فرض ہے بیگم کو خوش رکھنا

وہاب عندلیب

وہ دن بھی کیا دن تھے — بے فکری کے دن، بے نیازی کی ساعتیں، جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ زمان و مکان کا ہوش، نہ گھر لوٹنے کی فکر، فرائض نہ ذمہ داریاں شب و روز خوش گپیوں اور رنگا رنگ دلچسپیوں کی نذر ہوتے کیونکہ ہم کنوارے تھے۔ مگر یہ ہماری آزادی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ بزرگوں اور عزیزوں نے پابہ زنجیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ غالباً ان کے خیال میں اسی ایک ہنگامے پر گھر کی رونق موقوف تھی۔ مگر ہماری امن پسند طبیعت فوری کسی ہنگامے کے لئے آمادہ نہ ہو سکی، کیونکہ بہتوں کے تلخ و شیریں تجربات ہمارے سامنے تھے۔ سنتے تو یہی آئے تھے کہ صنفِ نازک کے بغیر زندگی ادھوری اور نامکمل ہے۔ عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو ناگزیر پہیے ہیں۔ کہیں کہیں سے یہ آواز بھی سنائی دیتی کہ "مجھے میری بیگم سے بچاؤ"۔ بعض برملا نہ سہی دبی دبی زبان سے اعتراف کرتے کہ "بہت پچھتائے شادی کرکے"۔ ہمسائیوں نے اس میدان میں قدم پھونک پھونک کر رکھنے کا مشورہ دیا تو بے تکلف احباب کی یہ رائے تھی کہ شادی کا لطف ہنی مون منانے تک ہی ہے چاہے اسے "اوٹی" میں منائیں یا اپنی تنگ و تاریک کھولی میں — سنتے

بیاہتے جوڑے اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ "ویری نائس" "ونڈر فل"!

بہرحال شال مثول کی ہماری پالیسی کارگر ثابت نہ ہوسکی۔ چنانچہ ہم بھی ایک عدد بیگم کے شوہر اور دیکھتے ہی دیکھتے دو عدد بچوں کے ڈیڈی ہوگئے۔ پھر کیا تھا۔ اچانک کایا پلٹ گئی۔ آفس ہو کہ کلب، مارکٹ ہو کہ محفلِ احباب، ہر لمحہ گھر یا اس سے متعلق کسی ذمہ داری کا احساس، گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح ذہن کے کواڑ پر دستک دینے لگا۔ بے فکری کا نور اور سکون عنقا ہوگیا پو پھٹنے سے قبل گھر چھوڑ دیتے اور جھٹ پٹے کے وقت لوٹتے بھی تو گھریلو ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہوسکے۔ ہماری کئی حسین صبحیں اور کئی سرمئی شامیں اسی تگ و دو کی نذر ہوگئیں پتہ نہیں یہ کس کنوارے دانشور نے کہا تھا: "گھر بساؤ اور سکون حاصل کرو"۔ گھر بسانے کی دیر تھی کہ ادھیڑنے لگے۔ چونکہ نسائی فرمائشیں بھی انسانی خواہشات کا جزو ہوتی ہیں، اس لئے ان کا سلسلہ بھی دراز ہوتا ہے۔ چنانچہ بیگم کی جانب سے فرمائشوں کی بارش ہی نہیں بلکہ ژالہ باری شروع ہوگئی۔ ایک فرمائش کی تکمیل کے بعد دوسری فرمائش اس کی جگہ لیتی رہی بقولِ غالبؔ عالم یہ تھا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بھلا بتلائیے، ایک کلرک جس کے بارے میں اکبرؔ الہ آبادی نے کہا تھا ؎

کر کلرکی، کھا ڈبل روٹی، خوشی سے پھول جا

کس طرح ان مطالبات کی تکمیل کر سکے گا۔ ہم کام چلاؤ زندگی کے قائل تو بیگم کو خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ معاملہ گمبھیر ہوگیا اور بات نوک جھونک سے ڈانٹ ڈپٹ تک پہنچ گئی۔ اس ناگوار صورتِ حال سے ہم تنگ آگئے اور غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ عورت اپنی چند فطری کمزوریوں کے باوصف ہماری زندگی کا محور ہے اس لئے اس کو مطمئن اور خوش رکھنا ضروری ہے۔ خیر سے آپ ادیب ہیں، دانشور بھی پینٹنگ سے بھی شغف ہے، مصوری میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ شاعری سے بھی نسبت ہے مگر بیگم کو خوش کرنے کے فن سے ناواقف ہوں تو آپ کچھ بھی نہیں کیونکہ بیگم کو خوش رکھنا بھی ایک فن ہے۔ جو کوئی اس فن سے بہرہ ور ہو وہ نہ صرف امن اور چین کی زندگی بسر کر سکے گا۔ بلکہ ہرفن مولا کہلانے کا مستحق ہوگا، کیونکہ بیگم کو مغلوب کرنا ہمالیہ سر کرنا ہے۔ چنانچہ ہم ہمالیہ سر کرنے کے درپے ہوگئے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے ہم نے اس فائن آرٹ کا سہارا لیا جسے عرفِ عام میں بیگم کو خوش کرنے کا فن کہتے ہیں۔

ایک عرصہ تک گھر کے خرچ کے لئے ہم بیگم کو روزانہ مقررہ رقم دیتے رہے مگر اس سے ان کی تشفی نہیں ہوئی کسی نہ کسی ضرورت کے لئے وہ وقتاً فوقتاً ہم سے رقم بٹورتی رہیں۔ لہٰذا ہم نے اس طریقۂ کار کو بدلا اور مہینہ بھر کے خرچ کے لئے یکمشت رقم بیگم کے حوالے کردی۔ نیز یہ بھی واضح کردیا کہ اس رقم کا حساب دینے کی ضرورت نہیں البتہ ختم ماہ سے قبل ہم سے مزید رقم کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ گو اس سے اعتماد باہمی کو تقویت پہنچی مگر بیگم کو مقررہ رقم میں مہینہ بھر کا خرچ چلانے کے لئے کافی پاپڑ بیلنے پڑے اور یہ بھی پتہ چلا کہ اس انتظام کے باعث بیگم معاشی طور پر بھی خسارہ میں تھیں۔

بسا اوقات مہمانوں کی آمد بھی ہمارے اور بیگم کے درمیان فصل قائم کردیتی ہے۔ مہمان اگر بیگم کی سہیلیاں اور میکے افراد ہوں تو کوئی حرج نہیں، اگر وہ ہمارے احباب ہوں تو پھر

کے موازنہ پر اثر پڑ سکتا ہے ۔ وہ فوری ضمنی بجٹ پیش کر دیتی ۔ اگر وہ نامنظور ہو جائے تو بیگم مشورہ دیں گی کہ کسی قریبی ہوٹل ہمارے احباب کی ضیافت کا انتظام کیا جائے ۔ بیگم کی روش کو بدلنے کے لئے ہم کو بھی دور کی کوڑی لانی پڑی۔ اب پنے دوستوں کے ساتھ ساتھ کبھی بیگم کی سہیلیوں کو کبھی ان قریبی عزیزوں کو بھی مدعو کر لیتے ہیں ۔ اس طرح بے چاری ل زبان پر تالا پڑ جاتا ہے ۔

بیگم کو افزائش حسن سے بھی دلچسپی ہے ۔ غازہ، پوڈر، لوشن، مسکارا اور دیگر کاسمٹکس کا بے تکان استعمال کرتی ان میں سے جب بھی کوئی شئے جواب دیتی ہے تو وہ فوراً ے رجوع ہوتی ہیں ۔ ایک دن بیگم نے یاد دلایا کہ ان کے ماپ کا باکس خالی ہے ۔ ہم موقع کے منتظر تھے ۔ چنانچہ ے حسن کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے ؎

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

مگر بیگم نے میر کے اس شعر کا کوئی نوٹس نہیں لیا ۔ ہم نے ناسخ کا یہ شعر بآواز بلند پڑھا ؎

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لئے پھرتے ہیں

کے لفظ پر بیگم چونک گئیں ۔ ہم نے ایک اور شوشہ چھوڑا انہ ہو تو آئینہ دکھا دو"۔ آئینہ کے ذکر پر بیگم کے چہرے م دوڑ گیا ۔ کیونکہ آئینہ کبھی عورت سے جھوٹ نہیں بولتا ۔ نے پہلی بار محسوس کیا کہ بیگم کے لب لپ اسٹک کے بغیر رخی مائل تھے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بیگم نے پھر کبھی بناوٹ ے سلسلہ کی کسی شئے کی فرمائش نہیں کی ۔

بیگم کو کبھی کبھار ہمارے رات دیر گئے گھر پہنچنے پر بھی تشویش تھی ۔ حالانکہ انھیں علم تھا کہ ہم خالص ادبی سرگرمیوں میں ملوث ہیں ۔ کسی اور مشغلہ میں اوقات خراب کرنے کے ہم قائل نہ تھے ۔ بیگم کی خفگی اس وقت دور ہوئی جب انھیں بھی کبھی کبھار تفریحی پروگرام یا فلم شو میں ہم نشینی کا شرف بخشا گیا ۔

لباس اور زیور بھی بیگم کی کمزوری ہیں ۔ یہ حس ان کی اس وقت جاگ اٹھتی ہے جبکہ کوئی پڑوسن یا سہیلی کوئی نئی ساڑی خریدتی ہے، بھابی یا بہن کوئی نیا زیور بنا لیتی ہے ۔ ساڑی کی فرمائش تو کوئی نئی بات نہیں ۔ اکثر و بیشتر ہم اس مطالبہ کا سامنا کرتے رہے ہیں مگر اب کی بار مطالبہ میں شدت ہوئی تو ہم نے لازمی بچت اسکیم کے دہ سالہ سیونگس سرٹیفکٹس بیگم کے ہاتھ میں تھمائیے ۔ بیگم چپ ہو گئیں ۔ اس لئے بھی کہ مقررہ مدت کے اختتام پر ہی سہی انھیں ساڑی مل جانے کا یقین تھا ۔ البتہ زیور کا معاملہ سنگین صورت اختیار کر گیا ۔ ہمارے تمام وعدے اور ساری یقین دہانیاں ان کے لئے قابل قبول نہیں تھیں ۔ اس لئے بھی کہ پچھلے کئی برسوں سے زیور خریدنے یا بنانے کا ہمارا ارادہ وعدہ آج تک وفا نہ ہو سکا ۔ حال میں بیگم نے جب زیور کے لئے یاد دہانی کی تو ہم نے انھیں خبردار کیا کہ " ملک میں دوبارہ گولڈ کنٹرول ایکٹ نافذ ہو سکتا ہے ۔ ویسے بھی سونا کیا چیز ہے حُبِ حبیب اور حبِ وطن سے بڑھ کر تو نہیں ۔ یوں بھی آج زیورات سے لدی پھندی عورتوں کے مقابلہ میں تکلف سے بے نیاز خواتین ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں ۔ زیورات تو دورِ جاہلیت کی یادگار ہیں " ہماری اس تقریر کے بعد بیگم چپ تو ہو گئیں مگر ان کے چہرے کا کرب آسانی سے پڑھا جا سکتا تھا ۔

بیگم کو اپنے بچوں سے محبت ضرور ہے مگر ان کی شرارتوں پر چراغ پا بھی ہو جاتی ہیں ۔ ایک بار جب میں گھر لوٹا تو وہ

بھری بیٹھی تھیں۔ تیمور سے پتہ چلا کہ گھر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ یا سانحہ سرزد ہو چکا ہے۔ "مزاجِ دشمناں ......؟" ابھی ہم جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو رواں ہوگئے کہنے لگیں "آپ کے بچے از بس خودسر ہوگئے ہیں۔ ماں کا کہا تک نہیں مانتے۔ آج تو صاحبزادے مجھ ہی کو آنکھیں دکھا رہے تھے"۔ ہم جانتے تھے کہ اس دفعہ بیگم افہام و تفہیم سے مطمئن نہیں ہوں گی لہٰذا ہم نے میز پر رکھی ہوئی ہتھوڑی ہاتھ میں لی۔ ہمارا مطلق ارادہ نہیں تھا کہ صاحبزادے کی خبر لیں مگر اس ضرر رساں شئے کا ہاتھ میں پہنچنا تھا کہ بیگم کا سارا غصہ کافور ہوگیا اور انھوں نے لپک کے ہتھوڑی چھین لی۔ پتہ نہیں یہ ممتا کا کرشمہ تھا یا پھر بیگم کو یقین ہوگیا تھا کہ ہم بچوں کے مقابلہ میں انھیں زیادہ چاہتے ہیں۔

بہر حال بیگم کی فرمائشوں اور ان کی طبعِ نازک کی کرشمہ سازیوں سے ہم خاصے پریشان تھے۔ خدشہ لاحق تھا کہ اس کشمکش میں کہیں ہمارا وجود، عدم وجود کے برابر ہو جائے مگر ہم نے حوصلہ نہیں ہارا۔ بعض تجاویز پر سنجیدگی سے غور کیا اور چند مجرب نسخے آزمائے۔ "ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ آئے چوکھا" کے مصداق کسی صرفہ کے بغیر ہم نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اب صورتِ حال بہتر، ماحول پُرسکون اور فضا پر خاموشی چھائی ہے۔ پتہ نہیں یہ خاموشی کسی طوفان کے گزرنے کی علامت ہے یا آنے والے طوفان کا پیش خیمہ!

ارشد علی خاں

شادی کا ہنگامہ

قاضی صاحب کا خطبہ جوں ہی اختتام کو پہنچا ہمیں کچھ یوں لگا جیسے پُرسکون سمندر میں یکایک طوفان اُمڈ آیا ہو۔ یا افراسیاب آندھی پرسوار دولھا سے گلے ملنے آگیا ہو ــــــ لوگ مصری بادام پر چیلوں اور گِدھوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قمقموں میں جگمگاتا منڈپ عڑاپ سے گرپڑا۔ اور پھر لائٹ آف ہوگئی۔ دلہن کے والد نے چند نامور دلاوروں کو مدد کے لئے للکارا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بے ہنگم شور وغل بپا تھا۔ منڈپ کے اندر دھماچوکڑی جاری تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق اس منڈپ کے بھنور میں پھنسے ہوئے قابلِ ذکر افراد یہ تھے ــــ دولھا میاں، قاضی صاحب، دولھا میاں کے والد اور دونوں گواہ جن میں ہم بھی شامل تھے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال ہم اس منڈپ کے ملبے سے نکلنے کے لئے پوری ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور بے تحاشا چیختے بھی جا رہے تھے۔ جب بھی ہم میں سے کوئی فرد ہاتھ پاؤں مارتا تو چیخ و پکار میں اضافہ ہو جاتا کیونکہ اس کی ضرب کسی نہ کسی ساتھی کو لگ جاتی تھی۔ پھر امدادی ٹیم آگئی۔ غالباً وہ پہلوان قسم کے لوگ تھے۔ ہم انھیں بھلا دیکھ کس طرح سکتے تھے البتہ آوازیں سن رہے تھے جو خالص پہلوانی انداز کی تھیں۔ ایک نے منڈپ کے اندر ہاتھ ڈالا اور جھلا کر بولا "شاید تکیہ ہاتھ آیا ہے" دوسرے نے کہا نیچے پھینک دو ــــ اس کے ساتھ ہی ایک دلخراش چیخ گونجی۔ دوبارہ پھر کوئی چیز نیچے پھینکی گئی ــــ ایک اور چیخ اُبھری اور اس کے ساتھ ہی یکایک لائٹ کھل گئی۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر ہم فوری منڈپ سے نکل آئے اور ہانپنے لگے۔ اندھیرے میں تکیہ سمجھ کر پھینکے جانے والوں میں قابلِ رحم خود دولھا اور قاضی صاحب تھے جو اتفاقاً صوفوں پر آگرے تھے پھر بھی وہ دونوں بے اختیار کراہ رہے تھے۔ منڈپ کے گر جانے کے بعد بھی اُچکے بدستور بادام مصری لوٹنے میں مگن تھے۔ انھوں نے اس بہانے لوگوں کی شیروانیوں کے بٹن، دستیاں، کنگھے، قاضی صاحب کی شیروانی کا سالم ایک آستین، دولھا میاں کا چھ گز والا سہرا معہ دستار لوٹ لیا تھا ــــ قاضی صاحب کے ہوش ٹھکانے لگتے ہی وہ "ٹوپی ٹوپی" چیخنے لگے۔

لوگوں نے ان کی ٹوپی کی تلاش شروع کردی۔ کافی دیر بعد جب وہ ملی تو پہچان مشکل ہوگئی تھی۔ دراصل اس عظیم بھونچال کی زد میں آکر وہ ردی سے یکایک منکی کیپ (MONKEY CAP.) میں تبدیل ہوچکی تھی۔ پھر ایک ہمدرد نے اسے قاضی صاحب کی طرف اُچھال دیا۔ قاضی صاحب مارے خوشی کے اسے لینے جو اُچھلے تو صوفے سے اچھل کر ایک اسی سالہ بڑے حضرت پر ڈھیر ہوگئے۔ بڑے حضرت اس تیندوے کے اُوپر گرتے ہی بھینسے کی طرح ڈراونی آواز میں چیخ مار کر نیچے گر پڑے۔ اس ڈراونی چیخ کا ردِ عمل یہ ہوا کہ زنانے میں اک دم سناٹا چھاگیا۔ چھوٹے بچے بندر کے بچوں کی طرح ماؤں سے لپٹ پڑے۔ پہلوان ایک بار پھر حرکت میں آگئے اور جھپٹ کر قاضی صاحب کو اُٹھایا اور منکی کیپ کی تاج پوشی کرڈالی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ٹوپی کی بجائے خالی چنگیری پہنادی گئی ہو۔ وہ اس قدر بھلے لگ رہے تھے جیسے کوئی جنرل ابھی ابھی خون آشام محاذ سے لوٹ رہا ہو۔ دلہن کے والد جناب کریم الدین صاحب نے کھڑے ہوکر اپنی باریک مونچھوں کو جھینگروں کی طرح بار بار حرکت دی اور کچھ بات پلے نہ پڑی تو مبارک باد کی کے بہانے کئی زخمیوں سے لپٹ پڑے۔ اس سے پہلے کہ عثمانیہ دواخانہ کا عملہ بذریعہ ایمبولینس یہاں پہنچ جاتا کسی نے یہ کہہ کر ہنگامہ کا رُخ موڑ دیا کہ کھانا بائیں جانب والے ہال میں نکل رہا ہے۔ ادھر کریم الدین صاحب نے نوبت بجانے کا سگنل دے دیا۔ پھر کیا تھا۔ ان نوبت چیوں نے جو طبلِ جنگ کے منتظر ہی بیٹھے تھے غدر کا ریہرسل شروع کردیا۔ ہم کسی وحشت زدہ گینڈے کی طرح بالکل ناک کی سیدھ میں باہر کی طرف بھاگ نکلے ــــــ یہاں اور روح فرسا منظر تھا۔ نہ صرف پورا ہال بھر چکا تھا بلکہ صحن بھی مہمانوں کے سروں سے لدا پڑا تھا۔ لوگ اس طرح کھانے کے ہال کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے جیسے کسی نمائش کا افتتاح ہو رہا ہو۔ اور یہ کہ گیٹ کا ازار بند کھلتے ہی وہ اندر دھڑلے سے گھس پڑیں گے۔

اس بھیڑ بھاڑ کے عالم میں بھلا کون کس کی خاطر مدارات کرسکتا تھا۔ چونکہ ہم دلہن کے قریبی عزیز تھے اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ اندھیرے گوشوں میں کھڑے رہیں ورنہ کسی سے تو تو میں میں ہوگی تو عمر بھر رنجش دور نہ ہوگی۔ کیونکہ عموماً "تناولِ طعام" کے معاملے میں ہر چھوٹا بڑا آدمی بڑا حساس ہوجاتا ہے۔ خیر کوئی آدھے گھنٹے تک ہم اندھیرے گوشے میں اطمینان سے کھڑے رہے لیکن ایک رشتہ دار نے آخر کار ہمیں ڈھونڈ ہی نکالا۔ قریب آکر نہایت ہی سرگوشیانہ انداز میں فرمایا "جناب آپ اندھیرے میں کیوں روپوش ہوگئے ہیں؟"

ہم نے بات بناتے ہوئے کہا "دراصل ہماری آنکھیں روشنی میں دُکھنے لگی ہیں"

وہ تشویشناک لہجے میں بولے "یہ مرض وبائی شکل اختیار کرگیا ہے۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے فوری رجوع ہوجائیے"

"جی ہاں! کل کسی ڈاکٹر کے ہاں جائیں گے!"

اس کے بعد وہ خاموش ہوگئے۔ کچھ دیر بعد وہ برسرِ مطلب آتے ہوئے بولے "انتظام بڑا ناقص ہے"

"آپ کسی دواخانے کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" ہم نے شرارت سے بات بدل دی۔

"میں اس دعوت کے بارے میں کہہ رہا تھا"

"واقعی! یہی دیکھئے ہمیں روشنی کا پرہیز ہے لیکن ان لوگوں نے ہر جگہ لائٹ لگا چھوڑی ہے"

"میرا مطلب طعام کے بارے میں تھا ——— وہاں اتنی بھیڑ ہے کہ مجھے اس لنگر سے کچھ ملنے کی امید نہیں ——— لہٰذا چلتا ہوں ——— وہ بڑی مایوسی سے بولے۔

"ارے اتنی جلدی!" ہم نے معصومیت سے کہا۔

"جلدی ——— ؟" وہ بھتّے سے اکھڑ گئے۔ "اجی جناب رات کے دس بج رہے ہیں اور یہاں کا حال یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو کھانے لگے ہیں۔ لہٰذا گھر جلد از جلد پہنچ جانا چاہئے۔ ورنہ گھر کا کھانا بھی ختم ہو جائے گا" ——— پھر وہ تیز تیز قدم ڈالتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

کھانے کے ہال پر ہنوز تابڑ توڑ جارحانہ حملے جاری تھے جن میں کرب ناک چیخیں بھی شامل تھیں۔ اُدھر گیٹ سے یارانِ طریقت کا بلا تکلف، بلا امتیاز مذہب و ملت داخل ہونے کا سلسلہ منقطع ہونے کا نام نہیں تھا۔

اس دوران ہم بھی بھوک کا شکار ہو گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا کریں۔ اسی اثناء میں امجد صاحب یعنی گواہ نمبر ایک دوسرے اندھیرے گوشے سے تیر کی طرح لپک کر ہماری طرف جھپٹے اور بولے "عجیب طومار ہے ——— چلو باہر چلیں گے"

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ سڑکیں سنسان ہونے لگی تھیں۔ امجد صاحب نے کہا ——— "سامنے ہوٹل میں کچھ کھا لیں گے۔ ہم فوری راضی ہو گئے۔ یہ ایک وجیٹیرین ——————— ہوٹل تھا۔ ہم نے کہا "مبادا کوئی شادی خانہ سے ادھر نہ آجائے!"

"آنے دو ——— !" وہ جھنجھلا کر لاپرواہی سے بولے۔

"لیکن سوچئے۔ تمام لوگ ہمیں بحیثیت گواہوں کے جان چکے ہیں۔ وہ جب دیکھیں گے کہ ہم خود "اوپا" پر گزارہ کر رہے ہیں تو ان کا خدا ہی حافظ ہے"

"ہاں ——— یہ بات تو ٹھیک ہے" وہ تشویشناک انداز میں بولے۔

اتنے میں ویٹر نے "اوپا" لاکر رکھ دیا اور ابھی ہم لوگ چمچے بھی سنبھال نہ پائے تھے کہ "سلام علیکم" کا بم پھٹنے پر بلبلا اُٹھے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو ان صاحب کو بے تحاشا پانی پیتے کھڑا پایا۔ وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی کر ہماری طرف متوجہ ہوئے:

"آپ لوگ شاید شادی میں آئے تھے؟"

"جی ہاں ——— آئے تو تھے" امجد صاحب نے کہا۔

"پھر یہ اوپا ——— ؟" انھوں نے گویا اپنی دانست میں ہمیں چوراہے پر "دھپا" رسید کر دیا۔

"دراصل ہم لوگ گیس کے بیمار ہیں اس لئے غلو معدہ نہیں رہ سکتے"

"جی ۔۔۔۔ جی۔ میں سمجھ گیا ——— " وہ زہریلی مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولے۔ "ویسے اکثر مہمان مایوسی کا شکار ہو کر واپس لوٹنے لگے ہیں۔ کچھ ہوٹلوں کی طرف اور کچھ گھروں کی طرف"

ہم دونوں بھی "اوپا" سے فارغ ہو کر شادی خانہ کی طرف چلے۔ ہمیں گیٹ سے نکلتے ہوئے کریم الدین صاحب نظر آئے

ان کی مونچھیں مرجھا کر گر چکی تھیں اور وہ موز سیکل پر کچھ اس طرح جھکولے کھا رہے تھے جیسے طبی امداد کے محتاج رہے ہوں۔ جھنجھلاہٹ کا دورہ طاری تھا۔ کہنے لگے ـــــ "کئی بریانی چور گھس پڑے ہیں جنھوں نے منٹوں میں بریانی کو بگھارا کھانا بنا دیا ہے":

"آپ کہاں کا قصد کر رہے ہیں ـــــ؟" ہم نے دریافت کیا۔

"اپنے محلہ کو جا رہا ہوں ـــــ وہاں چند بکرے مستعار لینے کی کوشش کروں گا۔ ویسے آپ سے یہ استدعا ہے کہ ان چوروں پر نظر رکھیں ـــــ":

اس آخری نصیحت یا وصیت کے بعد وہ دندناتے ہوئے غائب ہوگئے۔ ابھی ہم سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک گوشے سے شور و غل بلند ہوا۔ اس کے فوری بعد ایک بچی گیٹ کی طرف تیزی سے بھاگتا نظر آیا۔ اس کے تعاقب میں چند منجھے ہوئے پہلوان ہاتھوں میں جلانے کی بڑی بڑی لکڑیاں لئے لپکے۔ پھر دونوں فریقین باہر کے اندھیروں میں تحلیل ہوگئے۔ ہم نے ایک تماشائی سے حال دریافت کیا تو عقدہ کھلا کہ بچی نے کھانے کی شان میں گستاخی کی تھی اور جب یہ خبر باورچیوں تک پہنچی تو وہ مشتعل ہو کر اس پر جھپٹے ہیں۔

اس اندوہناک خبر کے بعد ہم ہمت کر کے کھانے کے ہال میں پہنچے تاکہ مشکوک افراد کا جائزہ لیں۔ یکایک ہماری نظر ایک صاحب پر پڑی جو انتہائی مخدوش حالت میں اِدھر سے اُدھر ناچ رہے تھے۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوری انھیں غلیطے دے کر باہر ڈھکیلنا شروع کر دیا۔ لیکن چند لوگ دوڑ کر جھپٹے اور انھیں ہمارے غضب ناک پنجے سے یہ کہتے ہوئے رہا کرایا کہ موصوف دولھے کے والد ماجد ہیں۔ ہم کافی معذرت خواہ ہوئے اور پھر دوسرے مشکوک افراد کی جھڑتی لینے کے لئے کھانے کے ہال میں داخل ہوئے۔ ادھر دسترخوان کا یہ حال تھا کہ لوگ پوری طوفانی رفتار سے ہاتھوں کو کچھ یوں چلا رہے تھے جیسے مشین گن چل رہے ہوں۔ ایک تیز ہاتھ چلانے والے کو ہم نے مشکوک پایا اور دریافت کر بیٹھے ـــــ "مسٹر تم کس کی طرف سے آئے ہو؟" وہ بدستور ہاتھ چلاتا ہوا بولا "کریم الدین صاحب کے پاس کا پرانا کاریگر ہوں":

دوسرے کو پکڑ کر پوچھا گیا تو اس نے یہ کہہ کر "بریانی بچائی" کہ وہ دولھا میاں کی دکان پر اناج تولتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے ہاتھوں کے طوطے چھوٹ گئے۔ پھر ہم انھیں پکڑنے کے لئے اپنی پوری قوتِ فیصلہ کو جمع کیا اور کافی تلاش اور جستجو کے بعد ہم نے ایک اور صاحب پر عین اس وقت چھاپہ مارا جب وہ دوسرے صاحب سے بیڑی مستعار لے رہے تھے اور کھانے کے منتظرین کے گروہ میں کھڑے تھے۔

"جناب! آپ کس طرف سے ہیں؟" ہم نے دریافت کیا۔

"چو طرف سے ہیں ـــــ!" وہ برہم ہوگئے اور ہماری سٹی گم ہوگئی۔

"آخر دولھے والے یا ......" ہم ہمت کر کے بولے۔

"دولہن کا دادا ہوں۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں؟ وہ ہم پر الٹا سوار ہوگئے پھر سنبھل کر کہنے لگے" ان معزز مہمانوں کی سواریوں کا کرایہ دیتے دیتے دیوالیہ ہو چکا ہوں ـــــ" اس حادثے سے دوچار ہونے کے بعد ہمارا موڈ کچھ اس طرح چوپٹ ہوا کہ ہم نے اس مخمصے سے چھٹکارا پانے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور گھر چلے آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شادی کا ہنگامہ سحر تک چلتا رہا تھا۔ ▲

ڈی. کے. کنول

ماڈرن ایڈیشن

سیٹھ بنارسی داس گھی کا تھوک بیوپاری تھا۔ سال کے ۳۶۵ دن اس کی دکان کے باہر "بناسپتی گھی نایاب ہے" کا بورڈ لٹکا رہتا مگر دکان کے اندر یہی نایاب گھی بلیک کے بھاؤ بکتا تھا۔ لوگ خوشی خوشی بلیک میں گھی خریدتے تھے ——— اپنی امن پسند جنتا جو ٹھہری ——— سیٹھ بنارسی داس خود شدھ دیسی گھی کھا کھا کر اتنا موٹا ہو گیا تھا کہ وزن کرنے والی مشین بھی اس کا وزن نہیں سنبھال سکتی تھی۔ ایک دن نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے لیڈر بننے کا فیصلہ کیا۔ لوگوں نے اس کے اس فیصلے کا سواگت کیا۔ پہلی بار اس نے سوشلزم کا نعرہ لگا کر لوگوں میں ہلچل پیدا کی (یہ الگ بات ہے کہ لوگوں میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے اسے شدھ دیسی گھی کے تین کنستر مفت تقسیم کرنے پڑے) جنھوں نے شدھ گھی کو آج تک سونگھ کے نہیں دیکھا تھا انھیں مفت میں دو دو ڈھائی ڈھائی سو گرام مل گئے تو وہ سیٹھ بنارسی داس کی جے جے کار کیوں نہ کرتے۔ سیٹھ بنارسی داس راتوں رات ڈیلر سے لیڈر بن گیا ——— ملک میں الیکشن ہونے والے تھے سیٹھ بنارسی داس بھی الیکشن میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا مقابلہ گوالا پرشاد سے تھا۔ گوالا پرشاد نے چیخ چیخ کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سیٹھ بنارسی داس "سوشلزم کے نعرے کا سہارا لے کر ووٹ بٹورنا چاہتا ہے جب کہ

حقیقت یہ ہے کہ بنارسی داس سوشلزم کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ دراصل لوگوں پر اس وقت سوشلزم کا بھوت اس طرح سوار تھا کہ انھوں نے گوالا پرشاد کی باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بے چارہ گوالا پرشاد پاگل ہو گیا اور ایک دن میونسپلٹی کے اہل کاروں نے اسے سیدھے پاگل خانے پہنچا دیا۔

سیٹھ بنارسی داس بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا۔ گاؤں میں چراغاں کیا گیا، گھر گھر بھجن کیرتن ہوئے۔ ہر طرف بنارسی داس زندہ باد اور سوشلزم زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ سوشلزم کے نعرے نے سیدھی سادی جنتا پر جادو کر دیا تھا۔ اس نعرے میں واقعی جادو کا اثر تھا۔

اگلے روز گاؤں کا سارا کام کاج ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ گاؤں کی مہترانی نے غلاظت اٹھانے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ اب وہ مہترانی نہیں رہی۔ اس نے بنارسی داس کو ووٹ دے کر سوشلزم کے لئے راہ ہموار کی ہے، اس لئے اب سوشلزم آئے گا اور اسے "برابر۔ برابر" کر دے گا۔ گوالن نے کسی کے گھر میں جاکر دودھ نہیں دیا۔ جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ آئندہ وہ کسی کے گھر میں دودھ نہیں ڈالے گی ــــ اب تو برابری کا زمانہ آگیا، اس لئے ضرورت مندوں کو خود اس کے پاس دودھ لینے کے لئے آنا ہوگا۔ ضرورت مند بھی جھکنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے بھی بنارسی داس کو ووٹ دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گھروں میں بچے دودھ کے ایک ایک قطرے کے لئے ترسنے لگے۔ جب ان سے بچوں کا رونا بلکنا دیکھا نہ گیا تو انھوں نے گوالن کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ بچاری گوالن سوشلزم سے آنکھ لڑانے کے جرم میں اس طرح لٹ گئی کہ نہ دودھ رہا نہ ڈھور ڈھنگر ــ حملہ آور سب کچھ اٹھا کر لے گئے۔

وہ اپنے سینے پر دوہتھڑ مارتے ہوئے اور اپنے بال نوچتے ہوئے بھاگی بھاگی بنارسی داس کے بنگلے پر پہنچی۔ بنارسی داس اس وقت اپنی کوٹھی میں موجود نہ تھا۔ گوالن نے اس کی عدم موجودگی میں رو رو کر اپنا برا حال کر دیا۔ سیٹھ بنارسی داس کے نوکر چاکر جب اسے چپ کرانے میں ناکام ہوئے تو انھوں نے پولیس طلب کی۔ پولیس نے ہر نسخہ آزمایا مگر انھیں بھی ناکامی ہوئی۔ گوالن ایک خاص کلاسیکل انداز میں یوں روتی رہی جیسے وہ ٹھمری گا رہی ہو۔

اسی دوران سیٹھ بنارسی داس آپہنچا۔ گھر میں پولیس دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے پولیس آفیسر سے استفسار کیا۔

"یہ سب کیا تماشہ ہے ــ؟"

"صاحب یہ گھسیارن دھرنا دے کر بیٹھی ہے۔ پچھلے چار گھنٹے سے یہ رونے میں اس قدر محو تھی کہ ہم نے آنسو گیس کے گولے پھینکے، ہلکا سا لاٹھی چارج کیا لیکن یہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔"

"اگر تم لوگ اسے یہاں سے ہٹا نہیں سکتے تو پھر فوج کو بلاؤ ــ توپ خانہ منگاؤ۔"

سیٹھ بنارسی داس کا سکریٹری اسے ایک کونے میں لے گیا اور اس سے سرگوشیانہ انداز میں بولا:

"سر! اگر ہم نے فوج کو طلب کیا تو ہماری بدنامی ہوگی۔"

"تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔"

"کیوں نہ اس گھسیارن کی فریاد سن لی جائے اور بعد میں اسے بڑھا دیا جائے۔ اس طرح سانپ بھی مرے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔"

"زندگی میں پہلی بار تم نے عقل کی بات کی ہے۔" سیٹھ

بنارسی داس خوش ہوکے بولا ۔

سیٹھ بنارسی داس جوں ہی گوالن کے پاس پہنچا گوالن نے اسے دیکھ کر پھر وہی تان چھیڑی ۔

" یہ تم کس مردود کو لے آئے ہو ۔ مجھے بنارسی داس سے ملنا ہے "

" بدتمیز عورت سیٹھ بنارسی داس بولو ، سیٹھ بنارسی داس کے سکریٹری نے گوالن کو ٹوکا ۔

" سیٹھ تم لوگوں کے لئے ہوگا ۔ میرے لئے تو وہ صرف بنارسی داس ہے ۔ بنارسی داس "

" جاہل اور منہ پھٹ عورت بنارسی داس تمہارے سامنے کھڑا ہے " بنارسی داس اپنی ہیٹ گھماتے ہوئے بولا ۔"

" کیوں مسخری کر رہے ہو بابو ۔ ؟ میں بنارسی داس کو اچھی طرح پہچانتی ہوں ۔ آخر میں نے اسے ووٹ دیا ہے "

سیٹھ بنارسی داس نے اپنے سر سے ہیٹ اُتاری اور اپنا منہ گوالن کے قریب لے جاتے ہوئے کہا :

" اب غور سے دیکھو کہ کون تمہارے سامنے کھڑا ہے "

" ارے یہی تو ہے بنارسی داس ۔ ہاں ہاں یہی ہے "

وہ ایک بار پھر رو پڑی ۔ " بابو تیری گوالن کا ہوگیا ستیاناس ۔ میں لُٹ گئی ، برباد ہوگئی ۔ اپنے گاؤں کے چھوکروں نے مجھے دن دھاڑے لوٹا ۔ وہ میرے سارے کپڑے لتے ، زیور گہنے ، ڈھور ڈھنگر لوٹ کے لے گئے "

" یہ [illegible] آئی ہو ۔ [illegible] تم کیا ہے ؟

[illegible] کھوے ۔ مجھے نہیں پہچانتے ، میں ہوں دھنیا گوالن ۔ یاد [illegible] نے میرے تو [illegible] تھے تمہیں میرا ووٹ چاہئے تھا نا ۔ تم نے وچن دیا تھا کہ تم جب جیتو گے تو گاؤں میں " بھگوان " کا راج چالو کرو گے ۔ کھدر کا کرتا پاجامہ چھوڑ کر سوٹ بوٹ کیا پہن لیا کہ اپنی پیاری جنتا کو بھول گئے ۔ حیف ہے تم پر ۔ حیف ہے تم پر "

سیٹھ بنارسی داس بناسپتی گھی کا ڈیلر رہ چکا تھا ۔ اور اسے اب تک بنیوں والے نسخے یاد تھے ۔ اس لئے وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا :

" پیاری گوالن ! سوشلزم ایک خواب ہے جو حقیقت نہیں بن سکتا ــــ جاؤ پولیس میں جا کر اپنی گم شدہ بھینسوں کے بارے میں رپورٹ درج کراؤ ۔ یہ پولیس تھانہ نہیں ایک منسٹر کی کوٹھی ہے ــ سمجھی ــ "

گوالن سیٹھ بنارسی داس کے اس جواب سے اس کا منہ تکتی رہ گئی ۔

مصطفےٰ علی فاروقی محبوب نگر

قلمی دوستی

ڈیر اجنبی !

(آئندہ تمہیں اس طرح مخاطب نہیں کیا جائے گا)

گڈ نون (GOOD. NOON)

مجھے اُمید ہے کہ تمہیں یہ خط بارہ بجے ملا ہوگا یا نہیں تو کم از کم خط پڑھ کر چہرے پر بارہ ضرور بجیں گے ۔

بہت دنوں سے رسالوں وغیرہ میں "قلمی دوستی" کا کالم دیکھ کر میرے دل میں بھی آرہا تھا کہ کسی نہ کسی سے قلمی دوستی کرنی چاہئے ۔ (ویسے بھی ان دنوں فرصت چین لینے نہیں دیتی) ۔

قلمی دوستی کرنے سے پہلے دیکھنے والی بات یہ ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اس شخص کا پتہ ہونا چاہئے ۔ قلم اور کاغذ کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے ۔ چنانچہ سب سے پہلے' پہلا مرحلہ یعنے پتہ ڈھونڈنا شروع کیا ——— آخر کار بڑی جدوجہد کے بعد مجھے پرانے کاغذات میں ایک قلمی دوستی کالم والا صفحہ مل گیا جو ایک مشہور رسالے کا صفحہ تھا ۔ سارا رسالہ تو خیر ردّی میں چلا گیا تھا مگر یہ قلمی دوستی کا کالم والا صفحہ باقی رہ گیا تھا (اس لئے نہیں کہ اس پر یہ کالم تھا بلکہ وہ ورق تو محض اس لئے رہ گیا تھا کہ دوسری جانب ایک ہیروئن کی رنگین تصویر تھی) ۔

ہاں ! تو میرے سامنے اب یہ پرابلم تھا کہ دوستی کس سے کی جائے ۔ ٹارگٹ (TARGET) کس کو بنایا جائے بہت غور کرنے کے بعد میں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ اگر دوستی کروں گا تو صرف تم سے کروں گا حالانکہ تمہارے مشغلے میری طبیعت کے بالکل خلاف ہیں اور اس کے باوجود بھی میں تم سے دوستی کرنے پر آمادہ ہوگیا ہوں ۔ (بڑے دل گردے والی شے ہے) لیکن میرے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ کیونکہ دوستوں میں اکثریت ہی ایسی ہے ۔ لیکن پھر بھی ان کے

ساتھ برابر دوستی نبھائے جارہا ہوں ——— ہاں تو میں تم سے دوستی کرنے کے لئے تیار ہوچکا ہوں ۔ اور وہ بھی قلمی دوستی ۔ چنانچہ میں نے قلم سنبھالا اور اب دوستی شروع کرنے والا ہوں ——— لیکن . . . . یہ کیا ۔ صرف قلم سے کر کس طرح دوستی کی جاتی ہے ۔ اس کے لئے کاغذ بھی تو ضروری ہے جو آج کل بڑا مہنگا ہے ۔ (میرا بی ۔ اے کا رزلٹ بھی دو مرتبہ اس اخباری کاغذ کی قلت کا شکار ہوا) ۔ لیکن دوستی سستا یا مہنگا نہیں دیکھتی ۔ تمہارے مشغلوں میں مجھے یہ مشغلہ "دوستی کرنا اور نبھانا" بڑا پسند آیا (دیکھیں اب عمل کیا ہوتا ہے) ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے صرف دو چار مشغلے ہی کیوں لکھے ہیں ۔ کیا ان مشغلوں کے علاوہ تمہارے کچھ بھی مشغلے نہیں . . . . کیا تم . . . کھاتے نہیں . . . سوتے نہیں ، اُٹھتے نہیں ، چلتے نہیں ، پھرتے نہیں ، بیٹھتے نہیں وغیرہ ۔ تم نے یہ MAIN مشغلے لکھنا چھوڑ دیئے اور صرف SIDE مشغلے لکھے ہیں ۔ (عجیب آدمی ہو) ۔ اس بات پر مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آگیا ۔ ایک دفعہ کی بات ہے جب میں نے ایک مشہور رسالے کے قلمی دوستی والے کالم میں اپنا "نام" پتہ اور مشغلے بھیجے تھے جو کچھ اس طرح تھے :

نام . . . . . (یہاں پر میں نے اپنا نام لکھا تھا) ۔

پتہ . . . . . (یہاں پر پتہ لکھا تھا) ۔

مشغلے . . . . . (یہ اہم چیز ہے) ——— لکھا تھا کہ علی الصبح ۸ بجے اٹھنا (دیکھو ! میں نے صبح سے شروع کیا تھا) اُٹھ کر خلاؤں میں گھورنے کی کوشش کرنا لیکن درمیان میں چھت آڑا آتا دیکھ کر خاموش رہ جاتا ۔ بستر سے پوری طرح بیدار ہو جانا ۔ انگڑائی لینا ، منہ ہاتھ دھونا ۔ کچھ گوشت ، ترکاری ، سودا سلف وغیرہ (جو بہت ضروری ہے) لانا (خرید کر) ۔ پھر ناشتہ کرنا چائے پینا وغیرہ ——— خیر چھوڑو ، SIDE مشغلوں میں میرا سب سے اہم مشغلہ تو نیلے کار رہنا ہے ۔ اگر کوئی کام نکل آئے تو کرلینا ۔ کام جس سے کہ کچھ فائدہ ہوتا ہے کرتے ہوئے گھبرانا) کچھ کھا لینا ۔ کچھ پڑھنے کی ناکام کوشش کرنا ۔ کبھی پبلک لائبریری میں جاکر مطالعہ کرنے کی ایکٹنگ کرنا ۔ اخبارات کی صرف صفحہ گردانی کرنا مگر صفحہ ۲ یا صفحہ ۳ ضرور دیکھ لینا ۔ وغیرہ وغیرہ . . . . . (تمام مشغلے لکھنا تضیع کاغذات ہے) جب میں نے اپنے یہ مشغلے اس رسالے کو بھیجے تو اس رسالے کے ایڈیٹر نے شکریہ کے ساتھ واپس کرتے ہوئے لکھا کہ برادرم ! اس کالم میں ہمیں آپ کی جملہ مصروفیات اور حرکتوں وغیرہ کی ضرورت نہیں ۔ ہمیں صرف آپ کے پسندیدہ مشغلے بھیجئے) ۔

رسالہ کے ایڈیٹر کے اس خط کے بعد میں کافی کوفت میں مبتلا ہوں اور عرصے سے مبتلا رہا ہوں (یہ ایڈیٹر لوگ ہوتے ہی ہیں ایسے) ۔ لیکن ۔ لیکن آج جب تم کو میں یہ خط لکھ رہا ہوں یہ کوفت دور ہو رہی ہے ۔ امید ہے کہ تم کو میرے مشغلے پسند آئے ہوں گے اور میرے ساتھ "قلمی ۔ کاغذی دوستی" کرنا ضرور پسند کرو گے (ناپسندیدگی کی کوئی وجہ بھی نہیں) ۔ ایک ضروری بات یاد آگئی . . . . . ایک خوش خبری ہے . . . . اور وہ یہ کہ اگلے ہفتہ میری سالگرہ

ہے (سالگرہ .... یعنی کہ .... برتھ ڈے .... وہی جس میں کیک کاٹا جاتا ہے اور تحفے وصول کئے جاتے ہیں) سبھی دوست آرہے ہیں۔ کتنا اچھا ہوگا کہ اس خوشی کے موقعہ پر تم بھی آجاؤ۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔ اور میں دوستوں کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ تمہارا تعارف کراؤں گا کہ یہ میرے بڑے پُرخلوص قلمی دوست ہیں۔ چندی گڑھ میں رہتے ہیں۔ دوست بھی تم سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔ اور تمہارے لائے ہوئے خوبصورت تحفوں کو دیکھ کر تو دم بخود رہ جائیں گے۔ م ... م ... مہ ... مگر .... مجھے افسوس ہے — (آہ!) کہ شاید تم اس موقعہ پر نہیں آسکو گے۔ کیونکہ یہ خط پہنچنے کے بعد تمہیں شاید ایک دن بڑی مشکل سے رہتا ہے — آ تو نہیں سکو گے — چلو تحفہ ہی بھیج دو۔ کیا کریں مجبوری ہے۔

میں یہ خط بڑا اوٹ پٹانگ قسم کا لکھ رہا ہوں۔ حالانکہ بڑے لوگ اور اساتذہ کرام بتاتے چلے آئے ہیں، خط لکھنے کے کچھ القاب و آداب ہوتے ہیں۔ لیکن میں ان القاب کو کہاں سے ڈھونڈوں؟ یہی سوچ رہا تھا کہ دفعتاً فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط "خط لکھیں گے ....." کے عنوان سے ایک رسالہ میں نظر آئے ..... اوہ فکر تونسوی .... اتنا بڑا ادیب .... اس کے ہاں تو ضرور القاب وغیرہ مل جائیں گے — لیکن غور سے دیکھنے کے بعد "القاب" نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ تو القاب کی طرف سے مایوس ہوگیا تھا کہ دفعتاً ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کود پڑا .... میں اچھل پڑا ..... کہ چلو چچا غالبؔ کے خطوط کی کتاب "اُردوئے معلیٰ" دیکھیں گے — چچا غالبؔ کے خطوط سے القاب لے کر تم پہلے ہی خط میں ایسا IMPRESSION ڈالوں گا کہ بس ...... مگر جب اُردوئے معلیٰ کے لئے سوئے لائبریری جارہا تھا تو چند اہلِ ذوق دوستوں نے مجھ سے لائبریری جانے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا کہ ایک خط کے لئے القاب کا چکر ہے۔ فکر کے ہاں سے تو مایوسی ہوئی — دوستوں نے کہا، ارے! ... یہ چچا غالبؔ تو فکرؔ کے باپ ہیں۔" (تو اس طرح فکرؔ صاحب ہمارے چچا زاد بھائی ہوئے) دوستوں کی اس بات پر مجھے بالکل یقین نہیں آیا لیکن پھر بھی گھر لوٹ آیا (دوست جو کہہ رہے تھے) — اب جس طرح مجھے خط لکھنا آتا ہے اسی طرح تم کو لکھ رہا ہوں (عادت سے مجبور ہوں) — ار .... ارے!! ..... یہ کیا ... کاغذ اتنا خرچ ہوتا جارہا ہے اور اِنک بھی — اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں واقعی تم سے قلمی دوستی کر رہا ہوں۔ اب خط کافی طویل ہوچکا ہے اور مجھے اپنی دوسری معروفیات (بیکار کام) بھی اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ اس لئے اب اجازت۔ فقط

(ابہام)

(ORIGINAL بالکل SIGN [illegible]) [illegible] جو [illegible] ہے [illegible]
[illegible] عزیز ترین [illegible] جواب [illegible] گے۔

[illegible]

روشن مستقبل

آندھرا پردیش شیڈولڈ ٹرائبس کارپوریشن، گریجن کوآپریٹو کارپوریشن، گریجن ڈیولپمنٹ ایجنسی، او
انٹگریٹیڈ ٹرائبل ڈیولپمنٹ ایجنسی کی تشکیل کی بدولت ریاست آندھرا پردیش جائز طور پر یہ دعو
کرسکتی ہے کہ قبائلیوں کی ترقی کے لئے ایک مستحکم ادارہ جاتی بندوبست فراہم کرنے کے معاملے میں د
ملک کی اوّلین ریاست ہے۔

یہ ریاست اس بات پر فخر کرسکتی ہے کہ اس نے پہاڑوں کی آغوش میں پرورش پانے والے ا
باشندوں کو ایک نیا معاشی نظام عطا کیا ہے۔ تیسرے منصوبے میں قبائلی بہبود کے لئے اخراجا
کی گنجائش ۰۸ء۱ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر پانچویں منصوبے میں ۶۵ء۴۵ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔
منصوبہ جاتی اسکیمات، زراعت، افزائش مویشیان، برقی، چھوٹی آبپاشی اور تعلیم سے متعلق سرگرمیں
مرکوز ہیں۔ آج ایسی طاقتیں فتحمند ہیں جو ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ قبائلیوں کو اُن کی اپنی دقیانوس دنی
سے نکال کر تابناک ماحول میں لایا جارہا ہے۔

ایک روشن مستقبل اُن کے انتظار میں ہے

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد۔

DIPR NO — 37/77-8

اصغر امام آروی

صدرِ جلسہ

جس طرح سرمایہ، منتظمین
اور مزدور کسی کمپنی کے انفرا اسٹرکچرس
(INFRA-STRUCTURES) ہوتے ہیں اس طرح
جلسے کے انفرا اسٹرکچرس صدرِ جلسہ، سامعین، آڈیٹوریم اور مائیک
ہیں۔ سامعین اور مائیک کسی جلسے کے لئے اتنے اہم نہیں جتنا کہ صدرِ جلسہ
بذاتِ خود ہوتا ہے۔

سامعین جلسے کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ سامعین کے بغیر بھی جلسے ہو سکتے ہیں، اور کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ اور اب تو سامعین کے نہیں رہنے پر ہی جلسے کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ سامعین کی موجودگی میں جلسے کے درہم برہم ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔

لفظ سامعین میں کافی وسعت ہے۔ سامعین سے مراد صرف جلسہ گاہ میں بیٹھے ہوئے حضرات ہی نہیں ہوتے بلکہ پٹرومکس اور لائیٹ والے، شامیانے اور دری والے اور آس پاس ٹہلنے اور گھومنے والے بھی ذی سماع سمجھے جاتے ہیں۔

مائیک جلسے کی زینت ہوتی ہے۔ یہ مقرروں کو تقویت بخشتی ہے اور سامعین کو اذیت پہنچاتی۔ مگر صدرِ جلسہ اس کا کبھی خیال نہیں رکھتے کہ مائیک سے نکلی ہوئی آواز اور مقرر کے خیالات میں مطابقت ہے بھی یا نہیں۔

عام طور پر جلسے میں جو مائیکیں ہوتی ہیں، ان سے آتی ہوئی آواز پر کسی کنٹر یا نامل شاعر کے اشعار کا گمان ہوتا ہے۔

صدرِ جلسہ کے بغیر جلسہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ جلسہ خواہ کسی قسم کا ہو ــــ ادبی ہو یا مذہبی، شامِ غزل ہو یا شبِ افسانہ، بچے کا ختنہ ہو یا عقیقہ یا کسی شاعر کے مجموعۂ کلام کا رسمِ اجراء، مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے اجتماع ہو یا کسی لیڈر کے درازیٔ عمر کے لئے دعا کی ترتیب ــــ غرض کہ ہر قسم کی مجلس میں صدر کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے۔

صدرِ جلسہ کا تصور نہایت قدیم ہے اور فرسودہ بھی۔ یہ صدیوں پرانی ریت ہے جسے انسان ڈھوتا چلا آرہا ہے۔ جب انسان غور و فکر کے عمیق سمندر میں غوطہ زن ہونے سے خوف کھاتا تھا تو کسی بھی اہم مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے لئے اپنے ہی میں سے کسی ایک شخص کو اس کام کے لئے مامور کردیتا تھا اور خود کو راضی بہ رضا سمجھ کر اس کے حوالے کردیتا تھا مگر آج جب کہ غور و فکر اور نتائج اخذ کرنا سب کا پیدائشی حق ہے ـــــ پھر بھی صدارتِ جلسہ جیسی فرسودہ اور تاریخی رسم کو لوگ گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

جس طرح جمہوری ملکوں میں وزراء کی کرسیوں پر کوئی بھی براجمان ہوسکتا ہے اسی طرح صدرِ جلسہ کی کرسی پر کوئی بھی اپنا حق جتا سکتا ہے۔ پھر بھی کسی خاص جلسے کی صدارت کے لئے صدر میں چند خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ مذہبی جلسوں کے لئے ایسے صدر کی تلاش رہتی ہے جو کفر کا فتویٰ صادر کرنے میں فراخدل ہو۔ ادبی جلسوں کی کرسیاں عموماً رسالوں کے مدیران کے ہاتھ لگتی ہیں کیونکہ ادبی جلسے کے منتظمین (جو کہ عموماً ادیب ہی ہوتے ہیں) کلجگ میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کو یہ یقینِ کامل ہوتا ہے کہ آج اگر وہ کسی مدیر کو کرسیٔ صدارت پیش کرکے عزت بخشتے ہیں، تو کل وہ ان کی تخلیقات کو اپنے رسائل میں جگہ دے کر (جو کہ رسالے بے چارے کے لئے سلو پوائزن (SLOW POISION) ہی ثابت ہوتے ہیں) ادیب کی صف میں لا کھڑا کرے گا۔

ایک جلسے کا صدر سماعت سے زیادہ بصارت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ یہ نہیں سنتا کہ کیا کہا جارہا ہے بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ کون کہہ رہا ہے ــــ؟

صدرِ جلسہ کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ وقتِ مقررہ پر کبھی بھی جلسہ گاہ میں تشریف نہیں لاتا۔ کسی جلسے کے صدر کی PRESTIGE اس بات میں مضمر ہوتی ہے کہ وہ جلسہ میں کتنی تاخیر سے پہنچتا ہے۔ جلسہ گاہ میں آکر عموماً وہ خموش بیٹھتا ہے۔ اسے خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں جنبشِ لب سے نکاحِ صدارت باطل نہ ہوجائے۔

اس طرح ایک جلسے کے صدر کے لئے ضروری ہے کہ سماعت کند، بصارت تیز، تکلم خستہ اور اس پر سستی حاوی ہو۔

صدرِ جلسہ کے تشریف لانے سے سب سے زیادہ خوشی منتظمین کو ہوتی ہے کیونکہ وہ کسی دوسرے صدر کو منتخب کرنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ صدرِ محترم کے تشریف لاتے ہی منتظمین ان کی گلپوشی کرتے ہیں جیسے وہ بے چارے نکال کر اپنے آگے رکھ لیتے ہیں (جیسے معاً انہیں یہ احساس ہوگیا ہو کہ ان کی گردن پھولوں کے اس مالے کی مستحق نہ تھی)۔

پھر وہ سامعین پر ایک نظر اس انداز سے ڈالتے ہیں جیسے وہ سوچ رہے ہوں :

I AM MONARCH OF ALL I SURVEY ;

MY RIGHT, THERE IS NONE TO DISPUTE ,

کبھی کبھی تو صدر جلسہ کا انتخاب اسٹیج ہی پر حاضرین میں سے ہوتا ہے ۔ اس حالت میں جس کا نام پیش کیا جاتا ہے وہ پہلے تو بناوٹی انکار سے کام لیتا ہے پھر چند لکھے پڑھے جملے دہراتا ہے ــــ مثلاً ۔ خواہ مخواہ آپ لوگ یہ بوجھ مجھ جیسے نالائق کے سر تھوپ رہے ہیں (اس طرح وہ اول ہی میں حقیقت کا اعتراف کر لیتا ہے) ..... مجھ سے زیادہ موزوں حضرات تشریف فرما ہیں .... اور ساتھ ساتھ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ SECONDER کے چہرے کو حسرت بھری نظروں سے تکتا رہتا ہے کہ کہیں اس انکساری سے آئی ہوئی کرسئ صدارت کھسک نہ جائے ۔

صدر جلسہ کی تقریر بالکل اخیر میں ہوتی ہے ۔ اس تقریر کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ بہت ہی مختصر اور موضوع اور غایت سے منقطع ہوتی ہے ۔ اپنی تقریر میں وہ چند ذاتی باتیں یا اپنے کسی دلچسپ سفر کا حال بیان کرتا ہے اور پھر یہ سوچتا ہوا اپنی جگہ آکر بیٹھ رہتا ہے کہ ؎

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

فارم ۱۷ (دیکھئے رول ۸) ــــــــ بابت ماہنامہ شگوفہ

(۱) مقام اشاعت : حیدرآباد

(۲) وقفہ : ماہنامہ

(۳) پرنٹر کا نام : سید مصطفیٰ کمال

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۷۶۸، دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳

(۴) پبلشر کا نام : سید مصطفیٰ کمال

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۷۶۸، دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳

(۵) ایڈیٹر کا نام : سید مصطفیٰ کمال

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۷۶۸، دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳

(۶) ملکیت : قیصر کمال

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۷۶۸، دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳

سید مصطفیٰ کمال اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میری واقفیت اور معلومات کے مطابق درست ہیں ۔

(دستخط) سید مصطفیٰ کمال پبلشر

ہمارے منصوبوں کو کامیاب ہونا چاہیئے

ہمارے پانچ سالہ منصوبوں کا مقصد فیصلہ کن انداز میں ملک کے مستقبل کی تشکیل جدید عمل میں لانا ہے۔ برسوں سے ہمارے منصوبے ملک کی معاشی ترقی کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرتے آرہے ہیں۔ آندھرا پردیش میں قومی تعمیر کی سرگرمیوں پر ان منصوبوں نے پائدار اثرات مرتب کئے ہیں۔

معاشی ترقی کے معاملے میں پانچواں منصوبہ سب سے زیادہ اُمید افزا ثابت ہوا ہے۔ منصوبے کے تحت اخراجات کی گنجائش سال ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۹۳ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۱۴۸ کروڑ روپے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۲۰۳ کروڑ روپے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۰۸ کروڑ روپے اور ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۲۸۲ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں منصوبے کے تحت فراہم کی جانے والی گنجائش ۴۵۰ کروڑ روپیوں تک پہنچ جائیگی۔ اس طرح سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں منصوبہ جاتی اخراجات کی رقم پورے چوتھے منصوبے کی رقم کے تقریباً مساوی ہو جائیگی جو ۴۹۹ کروڑ روپے تھی۔ پانچویں منصوبے کی پوری مدت کے دوران ۱۴۸۰ کروڑ روپے سے زائد رقم خرچ ہوگی جو چوتھے منصوبے کے اخراجات سے تین گنا زیادہ ہے۔

ہمارے منصوبوں کی کامیابی کی صورت میں ہی

عوام خوشحالی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

D.I.P.R. NO: 39/77-78

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

برق آشیانوی

ڈرامہ

کردار

* لکچرر۔
* لکچرر کی بیوی۔
* لکچرر کا دوست۔

پنشن

(لکچرر کا مکان۔ وقت شام کے پانچ بجے کے بعد سے رات کے دس بجے تک۔ قارئین اپنی پسند سے مقرر کرلیں ۔ ۔ ۔)

لکچرر: (مکان میں داخل ہوکر) بیگم۔ او بیگم۔ بھئی کہاں ہو تم؟ (دھیرے) بڑی مشکل ہے۔ مکان اتنا بڑا ہے کہ میں بیگم کو ڈھونڈتا ہوں تو مجھے بیگم نظر نہیں آتیں۔ اور بیگم مجھے ڈھونڈتی ہیں تو میں بیگم کو دکھائی نہیں دیتا۔ (اونچی آواز سے) ارے بھئی بیگم سنتی ہو، کہاں ہو تم؟

بیگم۔ (دور سے) میں یہاں ہوں۔

لکچرر۔ تم یہاں ہو ___؟ بھئی گھر کے کونسے حصے کا نام 'یہاں' ہے۔ یہ تو آج تک نہیں معلوم ہوا۔ حمام میں ہوتی ہو تو کہتی ہو "یہاں ہوں"۔ کچن میں ہوتی ہو تو آواز آتی ہے ___ "میں یہاں ہوں"۔ ڈرائنگ روم میں ہوتی ہو تو صدا دیتی ہو ___ "میں یہاں ہوں"۔ بالاخانے پر ہوتی ہو تو سنائی دیتا ہے "میں یہاں ہوں" اور تہہ خانے میں ہوتی ہو تو گونجتی ہو "میں یہاں ہوں" باغیچے میں ہوتی ہو تو گرجتی ہو "میں یہاں ہوں" ___ اب جو تم یہ کڑک رہی ہو کہ "میں یہاں ہوں" تو کوئی کیسے سمجھے کہ آخر تم کہاں ہو۔

بیگم۔ (دور ہی سے) اوہو ہو ہو ___ بس آپ کو تو لکچر دینے کی عادت پڑگئی ہے۔ گھر کو بھی کالج بنا رکھا ہے بات ذرا سی ہوتی ہے، اس پر لکچر شروع ہوجاتا ہے۔ ذرا آواز پر بھی تو دھیان رکھو کہ کہاں سے آرہی ہے۔۔ ۔ ۔ ۔ "میں یہاں ہوں ___ یہاں"۔

لکچرر۔ جی معلوم ہوگیا کہ یہاں ہیں ___ یعنی وہاں جہاں

سے آواز آدی ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ جب تم بات کرتی ہو تو گھر کے در و دیوار سب بولنے لگتے ہیں۔ گھر کے گوشے گوشے سے تمہاری آواز آتی ہے۔ خدا کے لئے اب بتا بھی دو کہ تم کہاں ہو ___؟ (ترنم سے آواز دے) کہاں ہے، دنیا مری جواں ہے۔

بیگم۔ کہہ تو دیا کہ ___ میں یہاں ہوں ___ یہاں ___ ادھر ___ یعنی کباڑ خانے میں۔

لکچرر۔ لاحول ولا ___ بیگم ___ کباڑ خانہ بھی بھلا کوئی آرام کرنے کی جگہ ہے۔ اتنے بڑے مکان میں تم کو ملا بھی تو کیا کہ کباڑ خانہ ___ کبھی کچن میں بھی تو نظر آیا کرو۔

بیگم۔ (قریب آکر) میں کب کہتی ہوں کہ کباڑ خانہ آرام کرنے کی جگہ ہے۔ وہ تو آپ کے صاحبزادے کا پرانا ٹینس کا ریکٹ (RACKET) ڈھونڈ رہی ہوں ___ آپ کے لئے۔

لکچرر۔ کیوں۔ کیا ہاکی کا اسٹک (STICK) کافی نہیں ہے۔

بیگم۔ وہ تو غلطی سے کتے پر اُٹھایا تھا تو ٹوٹ گیا۔ لیکن یہ تو کہئے کہ کون سا ضروری کام ہے جس کے لئے یاد فرمایا جا رہا ہے ___"

لکچرر۔ ضروری کام نہیں ___ ضروری "بات" ہے۔

بیگم۔ اچھا تو "بات" ہی بتائیے کہ وہ کونسی ضروری یا راز کی "بات" ہے ___؟

لکچرر۔ "راز کی باتیں" تو ختم ہو چکیں بیگم۔ البتہ ہم تمہیں ایک نئی خبر سنانا چاہتے ہیں ___!

بیگم۔ سنئیے۔ ایسی کونسی نئی خبر ہے جو اخبار میں شائع نہیں ہوئی ___ آج کا اخبار تو میں نے دیکھ لیا ہے۔ پورے کا پورا ___ یہاں تک کہ کونسے تھیٹر میں کونسی پکچر چل رہی ہے اب آپ کونسی نئی خبر لے آئے ہیں۔

لکچرر۔ بیگم یہ ہماری تازہ خبر ہے، وہ یہ کہ ہمیں پنشن ہو گئی ہے۔

بیگم۔ ہائے اللہ۔ یہ کونسی نئی بیماری ہے۔ خدا خدا کر کے پیچش سے صحت ہوئی تھی اب پنشن ہو گئی ہے۔

لکچرر۔ یہ بیماری نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے۔ اب تک ہزاروں آدمی اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

بیگم۔ نئی ہو یا پرانی ___ اس کے علاج میں تو دیر نہ کرنی چاہئے۔ پیچش کا علاج وقت پر نہیں کرایا گیا تو وہ پرانی ہو گئی تھی۔ اب پنشن کا علاج نہ کرائیے گا تو پھر یہ بھی پرانی ہو جائے گی۔ جائیے ڈاکٹر کے پاس۔

لکچرر۔ بیگم یہ وہ بیماری ہے جو ہر ملازم سرکار کو پچپن سال کی عمر میں ہو جاتی ہے۔

بیگم۔ تو پھر آپ کو ابھی سے یہ بیماری کیسے ہو گئی۔

لکچرر۔ اس لئے کہ ہم پچپن سال کے ہو گئے ہیں۔

بیگم۔ یہ لو ___ کل کی بات ہے، آپ چالیس کے تھے اور آج پچپن سال کے ہو گئے ___؟

لکچرر۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری عمر کو تیس سال کی قائم رکھنے کے لئے ہم نے اپنی عمر کو چالیس سال پر روک دیا تھا۔ اور پورے پندرہ سال تک روکے رکھا۔

بیگم۔ تو کیا ایک دن میں میری عمر بھی بڑھ گئی ہے ___؟

لکچرر۔ خدا نخواستہ تمہاری عمر تو گزشتہ بیس سال سے صرف تیس سال ہے اور آئندہ بیس سال تک بھی تیس سال ہی رہے گی۔ بھلا تمہاری عمر کیسے بڑھ سکتی ہے۔

بیگم۔ تو پھر آپ کی عمر کیسے بڑھ گئی؟

لکچرر۔ ہماری عمر اس لئے بڑھ گئی کہ ہم سرکاری ملازم ہیں تمہاری عمر اس لئے نہیں بڑھ سکتی کہ تم ملازم سرکار نہیں ہو۔

بیگم۔ میری عمر تو تیس سال ہی ہے نا ___؟

لکچرر۔ ہاں ہاں۔ تمہاری عمر تو سو سال تک بھی تیس سال ہی رہیگی۔

بیگم۔ خدا آپ کی زبان آمین کرے۔ اب آپ اپنی بیماری کا علاج کروائیے۔ ورنہ یہ بھی پیچش کی طرح کہنہ ہوجائے گی تو علاج ناممکن ہوجائے گا۔

لکچرر۔ بیگم۔ پیچش کا علاج تو آسان ہے لیکن پنشن کا مرض لاعلاج ہے۔ جب یہ بیماری لاحق ہوجاتی ہے تو مرتے دم تک لپٹی رہتی ہے۔

بیگم۔ ایک نہ شُد دو شد۔ برسوں سے پیچش تھی۔ اب یہ پنشن بھی برسوں تک رہے گی۔

لکچرر۔ بیگم۔ تم خواہ مخواہ ہی بیماری کی رٹ لگا رہی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ پنشن کوئی بیماری نہیں ہے۔ پنشن کا مطلب یہ ہے کہ ہم کل سے آفس نہیں جائیں گے۔

بیگم۔ آفس نہیں جائیں گے تو اور کہاں جائیں گے ۔؟

لکچرر۔ کہیں نہیں جائیں گے۔ کل سے ہم گھر پر ہی رہیں گے۔

بیگم۔ ہائے اللہ۔ پھر میں کہاں چلی جاؤں ۔؟

لکچرر۔ اپنے میکے چلی جاؤ۔

بیگم۔ میکے میں کون بیٹھا ہے مجھے سنبھالنے کے لئے۔

لکچرر۔ تو پھر گھر پر ہی رہو۔

بیگم۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔

لکچرر۔ بیگم اب نہ ہم تلوار رہے ہیں اور نہ تم ہی تلوار رہی ہو اب ہم دونوں اتنے کُند ہوگئے ہیں کہ ہمیں تو سرکار نے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا ہے۔ یعنی ملازمت سے علحدہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے تنخواہ بھی اب آدھی سے کم ملے گی ۔ رہا تمہارا معاملہ تو تم بھی اب بغیر غیرۂ مروارید جواہر والا کے باورچی خانہ تک نہیں سنبھال سکتیں۔

بیگم۔ ہائے اللہ۔ تو اب گزر کیسے ہوگی ۔؟

لکچرر۔ اب ہمیں کوئی ہلکا پھلکا کام دیکھنا پڑے گا۔

بیگم۔ تو ایسا کیوں نہ کریں۔ کل بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ محلہ کی مسجد میں موذن کی ضرورت ہے۔

لکچرر۔ یعنی ہم اذان دیا کریں ۔؟

بیگم۔ اور کیا اس سے زیادہ ہلکا اور کیا کام ہوسکتا ہے؟

لکچرر۔ پہلی مرتبہ جب ہم ایک مشاعرہ میں کلام سنا رہے تھے تو آواز آئی ۔ "ترنم سے سناؤ"۔ ہم نے ترنم سے جو شعر پڑھا، تو اچانک ایک گنوار آدمی محفل میں داخل ہوگیا اور ہمیں دُور سے ہی گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں لوگوں نے اسے پہچان لیا ۔ وہ تھا دھوبی ۔ لوگوں نے پوچھا ۔ "کدھر چلے آئے ۔؟" تو اس نے کہا، میرا گدھا صبح سے غائب ہے۔ اب رات کے وقت اس کی سریلی آواز یہاں سے آئی تو میں نے خیال کیا کہ شاید یہاں باندھ کر رکھا گیا ہے۔ ایک صاحب نے ہماری طرف اشارہ کرکے کہا ۔ "وہ دیکھو جو آواز تم نے سُنی وہ ان صاحب کی ہے"۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہم نے شعر ترنم سے نہیں سُنایا۔ اب تم ہی بتاؤ، ہم اذان کیسے دے سکیں گے۔ اذان دینے کے لئے تو سریلی آواز اور لحن کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر آج کل تو تم جانتی ہو کہ اذان کوئی بھیرویں میں دے رہا ہے اور کوئی دادرا میں اور کوئی خیال میں۔ بعض موذن تو توتا کی دھن میں اذان دینے لگے ہیں۔ وہ دن دور نہیں ہے جب کہ استادانہ موسیقی میں اذان دی جانے لگےگی۔ اگر تمہاری رائے کے مطابق ہم اذان دینے لگیں گے تو وہ چار نمازی جو

بٹوے جھٹکے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے مسجد آجاتے ہیں وہ بھی آنا بند کر دیں گے ۔

بیگم ۔ تو پھر کوئی دوسرے دھندے کی سوچئے ۔

لکچرر ۔ ایک مزیدار بات پنشن کی بتاؤں تو تم خوش ہو جاؤ گی ۔

بیگم ۔ وہ کونسی مزیدار بات ہے ؟

لکچرر ۔ ہمیں جو پنشن ہوئی ہے نا یعنی کہ جو رقم پنشن کی مقرر ہوئی ہے اس سے زیادہ تمہاری پنشن مقرر ہوئی ہے ۔

بیگم ۔ اے لو ۔ میں نے کونسی نوکری کی تھی جو مجھے پنشن مل جائے گی ۔

لکچرر ۔ بات دراصل یہ ہے کہ نئے قواعد کی رُو سے مجھے جو پنشن مقرر ہوئی ہے اگر کل ہی میں مر جاؤں تو کوئی چالیس روپے زیادہ پنشن میری خوش نصیب بیوہ کو — یعنی تم کو ملے گی ۔

بیگم ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے ۔ پھر اب دیر کس بات کی ہے ۔

لکچرر ۔ یعنی کہ میں ... فوراً انتقال کر جاؤں — ؟ مگر موت بھی تو آئے — !

بیگم ۔ خدانخواستہ میں کب کہتی ہوں کہ آپ سچ مچ انتقال فرمائیں ۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں ۔

لکچرر ۔ بھلا بتاؤ تو کیا سوچ رہی ہو — ؟

بیگم ۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ کل ہی آپ کے انتقال کا صداقت نامہ داخل کر دیا جائے ۔

لکچرر ۔ بغیر انتقال کے صداقت نامہ کون دے گا — ؟

بیگم ۔ ڈاکٹر صاحب کو فیس دے دیجئے اور صداقت نامۂ انتقال لے لیجئے ۔

لکچرر ۔ اگر کوئی تحقیقات کرے تو پریشانی ہوگی ۔

بیگم ۔ پریشانی کس بات کی — ؟ اگر آپ سے کوئی پوچھے تو صاف کہہ دیجئے کہ آپ کا انتقال ہو چکا ہے یقین نہ آئے تو آپ اپنا صداقت نامہ فوتی (DEATH CERTIFICATE) پیش کر دیجئے ۔ کوئی اعتراض کرے تو کہہ دیجئے کہ صداقت نامہ دینے والا آپ سے زیادہ معتبر ہے ۔ آپ کو وہ قصہ یاد نہیں کہ کسی صاحب کے انتقال کا صداقت نامہ ان کے وارثان نے پیش کر دیا تھا ۔ جب وہ خود آفس پہنچے اور کہا کہ وہ زندہ ہیں تو آفس میں جواب یہ ملا کہ ان کی بات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ صداقت نامہ دینے والا ڈاکٹر ان سے زیادہ معتبر ہے ۔ آپ بھی اپنے انتقال کا صداقت نامہ آپ سے زیادہ معتبر شخصیتوں اور ڈاکٹر وغیرہ کا پیش کر دیجئے ۔ کوئی آپ کو پوچھے گا بھی نہیں ۔

لکچرر ۔ بات تو معقول ہے بلکہ ..... (کال بل بجتی ہے) ۔ یہ لو کوئی صاحب آ دھمکے ۔ (باہر جاتے ہیں) ۔

ایک دوست ۔ آداب عرض ہے لکچرر صاحب بلکہ مبارک باشد بھی ۔

لکچرر ۔ کیسی مبارک باد ۔ کس بات کی مبارک باد ۔

دوست ۔ مبارک باد اس بات کی کہ بفضلِ الٰہی آپ کو پنشن ہو گئی ۔

لکچرر ۔ بھلا یہ بھی کوئی مبارک بادی کی بات ہوئی ۔ کہ ہماری آمدنی میں تین چوتھائی کمی واقع ہو گئی ہے ۔ اور آپ چلے ہیں مبارک باد دینے ۔

دوست ۔ ارے صاحب ۔ یہ ایک چوتھائی بھی آپ کو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے آمدنی ہوگی ۔ پھر ہاتھ پاؤں ہلا کر تین چوتھائی سے بھی زیادہ رقم کمائی جا سکتی ہے ۔

لکچرر ۔ مگر بھائی صاحب ! ہمارے ہاتھ پاؤں ایسے قابل ہی کہاں ہیں کہ انھیں ہلایا جا سکے ۔ حکومت نے ہم کو اسی لئے گھر بٹھا دیا ہے کہ اب ہمارے ہاتھ پاؤں میں ہلنے کی طاقت ہی نہیں رہی ۔

دوست ۔ برادر ! آپ کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت ہی کیا ہے !

لکچرر۔ پھر آدمی کیسے ہو جائے گا ــــ؟

دوست۔ یہی تو میں آپ کو بتانے چلا ہوں کہ اب آپ کی بجائے میں ہاتھ پاؤں ہلاؤں گا۔۔۔۔ اور آپ میرے ہاتھ پاؤں کو اپنے ہاتھ پاؤں سمجھئے۔۔۔۔ مطلب یہ کہ آپ کو جو گرایچوٹی (GRATUITY) کی رقم مع پراویڈنٹ فنڈ ہاتھ آئی ہے وہ آپ میرے حوالے فرمادیں میں اس سے بزنس کروں گا۔ اس سے اس قدر منافعہ ہو گا کہ نہ صرف آپ کی تین چوتھائی رقم کی پابجائی ہوگی بلکہ میرے لئے بھی کچھ بچے گا۔

لکچرر۔ معاف فرمایئے جناب یہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے محلے کے اسٹیشن ماسٹر صاحب کو ریٹائرمنٹ کے وقت ہزاروں کی رقم ملی تو ان کے ایک دوست نے اسی بزنس کا نام لے کر ان کی پوری رقم ہڑپ کر ڈالی۔

دوست۔ لیکن پانچوں انگلیاں مساوی نہیں ہوتیں۔ میں آپ کی رقم ہضم تو نہیں کروں گا بلکہ اصل سے دوگنی اگل دوں گا سمجھے ــــ؟

لکچرر۔ جو کچھ بھی ہو صاحب، آپ نگل جائیں یا اگل دیں، ہمیں یہ بات منظور نہیں ہے۔

دوست۔ لکچرر صاحب ہم نے تو آپ کو ایک نیک مشورہ دیا تھا عمل کرنا نہ کرنا آپکے اختیار کی بات ہے۔ ہمیں فکر اس بات کی ہے کہ اب آپ کیا کریں گے ــــ؟

لکچرر۔ برادر۔ اب ہمارے تمام دوست احباب، عزیز و رشتہ دار سب کے سر پر یہی فکر سوار ہے کہ ہم کیا کریں گے۔ ویسے پنشن پر تو ہم کل ہی علحدہ ہوئے ہیں لیکن کئی دن قبل ہی سے لوگ ہماری فکریں بُری طرح گھُل رہے ہیں۔ حالانکہ اب تک ہم نے یہ طے نہیں کیا ہے کہ کیا کریں گے۔

دوست۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس کے دل میں درد ہوتا ہے وہی سچا دوست ہوتا ہے۔ چنانچہ میں بھی آپ کا سچا خیرخواہ ہوں۔ اس لئے عرض کرتا ہوں کہ آپ غور فرمالیں۔ اس مسئلے میں تاخیر مناسب نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ پکا ہوا کھانا، مرا ہوا آدمی اور وظیفہ یاب ملازم اگر زیادہ دن رکھے جائیں تو ان کے سڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اب ایک منٹ بھی ضائع کئے بغیر کمر کس کے آپ کچھ نہ کچھ کرنا شروع کر دیجئے ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔

لکچرر۔ جناب عالی! ہمارے بچپن میں بھی یہی کہا جاتا تھا کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جوانی میں بھی یہی کہا جاتا رہا کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور اب بڑھاپے میں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ حالانکہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب وقت ہی کہاں ہے جو ہاتھ یا پاؤں سے نکل جائے گا۔

دوست۔ ارے نہیں صاحب۔ ایسا نہ کہئے۔ اب بھی وقت ہے سچ پوچھئے تو مرتے دم تک وقت باقی رہتا ہے۔

لکچرر۔ دوست حقیقت یہ ہے کہ وقت تو نکل چکا اب جو کچھ بچا ہے وہ وقت نہیں بلکہ "اصل" وقت کا سود ہے جس کو ہم شرعاً منافعہ کہتے ہیں۔ کیونکہ ہم سود لینا جائز نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سیکورٹی ڈپازٹ کی رقم پر ہمیں جو سود ملا اس کو بھی ہم نے "منافعہ" کا نام دیا۔ بیمہ فنڈ کی جو رقم وصول ہوئی وہ بھی سود کے ساتھ وصول ہوئی۔ شرع کی پابندی کے لئے اس کو بھی ہم نے منافعہ کا نام دے کر حاصل کیا

بہر حال زندگی میں اب جو وقت بچا ہے وہ بھی زندگی
کے اصل کا سود ہے اور ہم اب سود میں جیئے
جا رہے ہیں ۔ لیکن . . . . ہم شرع کے پابند ہیں ۔
اور شرع کی پابندی کے خیال سے اس کو بھی منافعہ
کا نام دے کر گزارا کر رہے ہیں ۔

دوست ۔ سبحان اللہ ۔ آپ تو شرع کے بہت پابند ہیں ۔

لکچرر ۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہم نے اپنی پوری زندگی شرع کی پابندی میں گزاری ۔ نماز ۔ روزہ ۔ زکوٰۃ وغیرہ کو ہم نے ہمیشہ یاد رکھا ۔ یہ اور بات ہے کہ ادا کرنا بھول گئے فقط ایک معاملہ میں ذرا سی بھول ہو گئی ۔ یعنی یہ کہ شادی ہم نے صرف ایک ہی کی ۔ حالانکہ شرع کے لحاظ سے ہم چار شادیاں کر سکتے تھے ۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے جب کہ صرف ایک ہی چڑیا کھیت چگ گئی ہے ۔ اگر چار چڑیاں ہوتیں تو برسوں پہلے ہم کو ہی چگ جاتیں ۔ اور آج ہم پنشن پر علٰحدہ ہونے کی بجائے برسوں پہلے زندگی ہی سے علٰحدہ ہو جاتے ۔

دوست ۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب آپ وقت کیسے گزاریں گے ؟

لکچرر ۔ مہربان ۔ وقت گزارنے کے لئے کئی مشغلے ہیں ۔

دوست ۔ مثلاً ـــ ؟

لکچرر ۔ جھک مارنا ـــ !

دوست ۔ یعنی ـــ ؟

لکچرر ۔ یعنی مچھلی کا شکار کرنا ۔ صبح سے شام تک بنسی ڈالے بیٹھے ہیں ۔ مچھلی لگے یا نہ لگے وقت تو کٹ جاتا ہے ۔

دوست ۔ آپ مذاق کر رہے ہیں ۔

لکچرر ۔ جی نہیں ۔ بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں ۔

دوست ۔ اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو خود ہی کوئی کاروبار کیجئے ۔

لکچرر ۔ عزیز من ۔ کاروبار ہم صرف ایک ہی کر سکتے ہیں اور وہ ہے سوا سو کے ہزار کرنا ۔

دوست ۔ کسی رسالے کے ایڈیٹر بن جائیے ۔ آج کل ڈائجسٹ نکالنا نہایت نفع بخش دھندا ہے ۔ بہتر تو یہ ہے کہ کوئی نئے قسم کا ڈائجسٹ نکالئے ۔ مزاحیہ قسم کا ڈائجسٹ نکال کر آپ اس کا نام "مذاق" اُردو ڈائجسٹ رکھ سکتے ہیں ۔

لکچرر ۔ بہت مذاق ہو چکا ۔ اب ہمارا پیچھا چھوڑیئے ۔ اپنی جگہ بیٹھ کر مضمون لکھنا الگ بات ہے اور ایڈیٹر بننا الگ بات ہے ۔ ایڈیٹری کے چند خاص قسم کے جراثیم کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے خون میں نہیں ہیں ۔ بہر حال اب ہمارے جی میں جو آئے گا کریں گے ۔ آپ کو ہماری فکر میں دُبلے ہونے کی ضرورت نہیں ـــ

دوست ۔ خیر صاحب ۔ اب میں چلتا ہوں ۔ لیکن پھر ایک بار عرض کرتا ہوں کہ سوچ سمجھ کر کوئی مناسب کام شروع کر دیجئے ۔ ورنہ . . . . . .

لکچرر ۔ ہمارا جنازہ نکل جائے گا ۔ چنانچہ آپ ہماری تجہیز و تکفین کی تیاری شروع کر دیجئے ۔

دوست ۔ افوہ ۔ آپ تو ناراض ہو گئے ۔

لکچرر ۔ جی نہیں ۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔ البتہ دوسری بار ملنے کی ہوس نہیں ہے ۔

دوست ۔ (ناگوار لہجے میں) اچھا تو . . . . .

لکچرر ۔ خدا حافظ ـــــ (دوست چلا جاتا ہے)

(پردہ ـــ پردہ سے مراد برقعہ نہیں)

نزولِ لفٹیننی

کرنل محمد خان (پاکستان)

ٹریننگ کا چھٹا مہینہ تھا کہ سگنل کی تربیت کے لئے دس کیڈٹوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب امید واروں کو ایک علٰحدہ ادارے یعنی سگنل ٹریننگ سنٹر میں جانا تھا۔ شاید یہ اکسٹرا ڈرل کا خوف تھا کہ ہر کیڈٹ نے او۔ ٹی۔ ایس سے جان چھڑانے کے لئے عرضی دے دی۔ کیونکہ اڑتی سی خبر تھی کہ سگنل ٹریننگ سنٹر میں کیڈٹ بھی انسانوں میں شمار ہوتا ہے اور جب ہمارا نام دس منتخب کیڈٹوں کی فہرست میں آ گیا تو باقی کیڈٹ ہمیں اس طرح مبارکباد دینے آئے جیسے جشن استقلال کی خوشی میں قبل از وقت رہا ہونے والوں کو پس ماندہ قیدی رخصت کرتے ہیں۔

سگنل ٹریننگ سنٹر بھی مہو میں تھا اور او ٹی ایس سے بہت دُور تھا۔ جس روز ہم او ٹی ایس سے رخصت ہوئے ہمارے ذمہ دو چار اکسٹرا ڈرل باقی تھیں اور ہمیں خوف تھا کہ کہیں سگنل سنٹر میں پہنچنے کے بعد بھی او ٹی ایس والے اس اُدھار کی ادائیگی کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔ اتفاق سے دو دن بعد او ٹی ایس کا سارجنٹ میجر سگنل سنٹر میں آنکلا اور ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ اکسٹرا ڈرل کا حساب چکانے آیا ہے' لیکن جب اس نے عام انسانوں کی طرح ہم سے ہاتھ ملایا اور اسی طرح مسکرانے بھی لگا جس طرح ہم آپ مسکراتے ہیں' تو باور نہ آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ کیڈٹ خدا کی اسفل ترین مخلوق ہے' لیکن ابھی ہمارے لئے آخری حیرت باقی تھی۔ جب پیار و محبت کی باتوں کے بعد ہم سے رخصت ہونے لگا تو ہمیں سر کہہ کر خطاب کیا' پھرتی سے سیلوٹ کیا اور جانے کی باقاعدہ اجازت مانگی۔ یہ واقعات ہمارے لئے اس قدر غیر متوقع تھے کہ اگر اسی لمحے کوئی شہزادی ہمارے گلے میں ہار ڈال کر ہمیں خاوند منتخب کر لیتی تو ہمیں بالکل تعجب نہ ہوتا' اور ہم بلا تکلف ولیعہدی شروع کر دیتے۔

سگنل سنٹر میں پہنچے تو وہ جو احترامِ انسانیت کی افواہیں تھیں' سچ مچ درست نظر آنے لگیں۔ تمام استاد ادب سے پیش آئے' لیکن چھ ماہ کی متواتر بے ادبی کے بعد ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھی قابلِ ادب قسم کے آدمی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری تعظیم ہمیں جعلی سی لگتی تھی۔ ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی جیسی نظام سقے کی اپنی مختصر سی جلالتمآبی کے دور میں ہوئی

ہوگی۔ شاید ہماری حالت نار نظام سے بھی کچھ پتلی تھی، کیونکہ اسے اپنا انجام معلوم تھا اور ہمیں اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ فالتو احترام واقعی کوئی دیرپا چیز ہے یا کسی وقت یہ ہی مودب انسٹرکٹر ایک ہلاکرانہ قہقہہ لگا کر ہمیں ثریا سے کھینچ کر زمین پر دے ماریں گے اور پھر ہم ہیلنگے اور اکسٹرا ڈرل! لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ اس احترام میں ملاوٹ نہ تھی اور یہ کہ ہمیں مرتبے کا احساس قصداً دلایا جارہا تھا، وہی احساس جو اوٹی ایس میں ہمارے دماغ سے نچوڑ دیا گیا تھا۔ اس وقت کہ ہم تازہ تازہ شہری زندگی سے فوج میں آئے تھے، وہی صحیح تھا، اور اب کہ افسری کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ہمیں افسرانہ انداز سکھائے جارہے تھے۔

لیکن ہم اپنے استادوں کی نسبت اپنے انگریز ہم جماعتوں سے وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو زندگی بھر نہ سیکھا تھا۔ جماعت میں ہم بیس کیڈٹ تھے، دس دیسی اور دس انگریز۔ یہ انگریز ہندوستان میں انگریزی فرموں کے ملازم تھے اور جبری بھرتی کے قانون کے تحت تربیت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یوں تو ہم سب برابر تھے، لیکن جماعت میں ان انگریز طلبا کا کاروبار ہم دیسیوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ جماعت میں استادوں کے ساتھ یوں ہم کلام ہوتے جیسے چائے پیتے ہوئے دوستوں کے ساتھ گفتگو کر رہے ہوں۔ ادب ضرور کرتے لیکن خوف نہ کھاتے۔ ان سے کوئی انسٹرکٹر سوال پوچھتا تو جواب دینے سے پہلے آرام سے پائپ کا کش لگاتے، پھر اسے ڈسک پر رکھتے اور پھر کرسی پر ذرا نیم دراز ہو کر جواب دیتے اور اس انداز سے کہ اگر درست ہے تو خیر، اگر نہیں بھی تو کوئی حرج نہیں کہ یہی ہمارا نقطۂ نگاہ ہے۔

برخلاف اس کے ہم دیسیوں کے دل میں ہر وقت چور سا رہتا۔ جواب آتا تو جواب دینے میں بے تابی، اگر نہ آتا تو احساسِ جرم اور چھپنے کی کوشش۔ ان لوگوں کی خود اعتمادی اور پختگی ان کے کردار کا حصہ تھی۔ اور یہ غالباً ان کی ابتدائی تعلیم کا فیض تھا۔ ہمارا احساسِ کمتری ہماری اپنی ابتدائی تعلیم کا عطیہ تھا۔ وہی تعلیم جس میں شاگردوں کو مرغا بنانا اُستاد کی بہترین TEACHING AID یعنی درسی امداد ہے ــــــ یہ کہنا بجا ہے کہ ہمارے لئے نئی چیزیں سیکھنا اتنا ضروری نہ تھا جتنا پرانی عادتیں بھلا دینا۔ اور ہم میں سے وہ جو ایسا نہ کر سکے، سینئر عہدوں پر پہنچ کر بھی نابالغ ہی رہے۔ یہ نہیں کہ انگریزوں میں نالائق یا نکمے نہیں ہوتے۔ کئی ایک کا ذکر آگے آئے گا بھی۔ نکتہ یہ ہے کہ صرف ذہین ہونا ہی کافی نہیں، کچھ شخصیت ہونا چاہئے، کچھ کردار ہونا چاہئے اور وہ جو اقبال نے کہا ہے، کچھ محفل میں بات کرنے کا شعور ہونا چاہئے۔ سچ یہ ہے کہ ان معاملات میں ہم ان انگریز دوستوں کو بتائے بغیر ان کی شاگردی کر رہے تھے۔ اور مرغا بنے بغیر وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو مکتب کی خاکباری میں نہ سیکھ پائے تھے۔

ذکر سگنل سنٹر کی زندگی کا تھا۔ اس زندگی میں آسائش تھی لیکن خدا جانے کیا وجہ تھی کہ وہ لطف نہ آرہا تھا جو درشتی اور مشقت کے باوجود اوٹی ایس کی زندگی میں تھا۔ جب اس مسئلے کو اندر سے جھانک کر دیکھا تو ہم پر روشن ہوا کہ درشتی اور مشقت ہی تو لطف کا منبع تھے ؎

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

یکن سگنل مینز کی زندگی فقط اللہ ہُو کے گرد ہی نہیں گھومتی تھی جہاں ارجن سنگھ ایسے ہم جماعت ہوں وہاں کئی ایسے واقعات ناگزیر تھے جو دلِ یزداں میں بھی کھٹکنے لگیں ۔ ارجن سنگھ ایک قوی ہیکل اور خوش مزاج سکھ کیڈٹ تھا۔ پینا اس کی کمزوری تھی ۔ ایک شام ارجن سنگھ کو معمول سے زیادہ بدمست پایا گیا۔ حالانکہ اس روز میس میں ارجن سنگھ نے شراب کو چھوا تک نہ تھا ۔ دوسرے روز کلاس میں بھی ارجن سنگھ معمول سے زیادہ موج میں تھا اور کلاس کے رستے میں کوئی میخانہ بھی نہ پڑتا تھا ۔ ہمارے ایک انگریز ساتھی مارٹن نے شرارتاً کہہ دیا کہ ارجن سنگھ نمبو پانی پر ہی ٹائٹ ہوگیا ہے ۔ ارجن سنگھ اس تہمت پر بزرگانہ انداز میں مسکرادیا ۔ شام ہوئی تو ارجن سنگھ کی مستی عروج پر تھی ۔ دفعتاً اپنے کمرے سے نکلا اور ایک دوسرے کیڈٹ کی کمر میں بازو ڈال کر ناچنے لگا ۔ معمّا یہ تھا کہ ارجن سنگھ آخر کیا پی رہا ہے جو دو روز سے ہوش میں نہیں آتا ؟ رقص جاری تھا کہ ہمارے کمان افسر یعنی کرنل صاحب ادھر آنکلے ۔ دراصل وہ بھی ارجن سنگھ کی مستی کا عقدہ حل کرنے کی فکر میں تھے ۔ ارجن سنگھ نے انھیں دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، بڑھا اور کرنل صاحب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنے کی ابتدا کرنے لگا ۔ لیکن کرنل صاحب نے مسکرا کر کہا :

" ارجن سنگھ، ناچیں گے بعد میں، آؤ ذرا تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں "

ارجن سنگھ بخوشی راضی ہوگیا ۔ بدستور کرنل صاحب کی کمر میں بازو ڈالے انھیں کمرے میں لے گیا اور حسبِ دستور پوچھا کہ کچھ پیئیں گے ؟ کرنل صاحب یہی تو معلوم کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ انگریزوں کا وہ روایتی فقرہ بولے : "WOULD I LOVE IT" اس پہ ارجن سنگھ اُٹھا، اپنا پلنگ اُلٹایا ۔ نیچے دو کنستر دیسی شراب کے پڑے تھے ۔ ارجن سنگھ نے ایک پر سے ڈھکنا اُٹھایا اور ایک لمبا گلاس لبالب بھر کر کرنل صاحب کو پیش کیا ۔ کرنل صاحب ذرا جھجکے، تو ارجن سنگھ بولا :

" چھک جاؤ موتیاں والیو ۔ آہ وسکی اے ۔ آپاں گھر بنا دتے ہاں "

کرنل صاحب کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا ۔ البتہ انھوں نے ارجن سنگھ کی خوشنودی کے لئے گلاس منہ سے لگالیا ۔ خدا جانے ارجن سنگھ کی خانہ ساز میں کیا تاثیر تھی کہ کرنل صاحب ایک دفعہ گلاس کو ہونٹوں سے لگانے کے بعد جُدا نہ کرسکے اور پورا گلاس حلق میں انڈیل لیا ۔ راوی یعنی ارجن سنگھ کے بیرے کا کہنا ہے کہ کرنل صاحب نے دوسرا گلاس اپنے ہاتھوں سے بھرا اور چڑھا گئے ۔ کوئی آدھا گھنٹہ بعد جو نظارہ ہم باہر کھڑے ہوئے تماشائیوں نے دیکھا، یہ تھا : کیڈٹ ارجن سنگھ اور کرنل صاحب اپنے ہاتھوں میں جامِ شراب تھامے اور بازو ایک دوسرے کے گلے میں حمائل کئے تھرکتے تھرکتے کمرے سے باہر آتے ہیں اور ہم سے قطع نظر کئے ہوئے چل نکلتے ہیں ۔ اگر کسی سے ذرا آنکھ لڑ جاتی ہے تو نہایت چابکدستی سے جوابی آنکھ مارتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں ۔ ارجن سنگھ کا بیرا سر پر کنستر اُٹھائے ان کے پیچھے پیچھے رواں ہے ۔ بیرے سے پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کنستر کی منزل کرنل صاحب کا بنگلہ ہے ۔

یہ سگنل سنٹر کی زندگی کا ایک پہلو تھا کام کی بھی کمی نہ تھی، تاہم ظاہر تھا کہ اس ماحول میں وہ ٹی ایس کے

دنوں کے خودکشی کے منصوبے قطعاً بے جا ہیں۔ بلکہ یہاں کچھ اس تیزی سے دن کٹے کہ ایک دن ففٹیننی کا حکم آگیا اور آناً فاناً ہمارے شانے پھولوں سے جگمگا اٹھے۔ اگرچہ ان کی تعداد بالفعل ایک پھول فی شانہ ہی تھی۔

اب ہمیں آنے والی زندگی سے عجیب کیف محسوس ہو رہا تھا۔ کورس کے خاتمے سے چند روز پیشتر پوسٹنگ کے سلسلے میں ہم سے اپنے مرغوب اسٹیشن پوچھے گئے۔ ہمارا انتخاب بالترتیب لاہور اور پشاور تھا۔ لاہور آنے کا ہمیں خاص شوق تھا کہ جس دیار کے کوچوں کی ہم نے ایک گمنام طالب علم کی حیثیت سے خاک چھانی تھی اب اسی خاک کو افسرانہ شان سے روندنا چاہتے تھے۔ جب پوسٹنگ کا حکم شائع ہوا تو ہمارا تقرر پشاور ڈسٹرکٹ سگنلز میں ہوا۔ لاہور نہ ملنے پر مایوسی تو ہوئی، لیکن قابلِ برداشت سی تھی۔ پشاور کی ایک خوبی تو ظاہر تھی کہ ہمارے لئے نئی جگہ تھی علاوہ ازیں جب اپنے پٹھان دوستوں سے پشاور چھاؤنی کی دلچسپیوں اور پشاور کلب کی رنگینیوں کے چرچے سنے، تو نہایت بے تابی سے رختِ سفر باندھا۔

میاں عاشق تجھے ہوا کیا ہے
جوتیاں کھا کے ہنس رہا کیا ہے

پاس بی اے ہیں پر نہیں معلوم
باپ کیا چیز ہے چچا کیا ہے

مار کھاتو رہے ہیں بیگم کے
پر نہیں جانتے خطا کیا ہے

سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے گا
ٹیڑھی کر دوست سوچتا کیا ہے

جان دینی تھی دے دیا مرکر
پنچنامے سے فائدہ کیا ہے

دردِ دل دے کے کہتے ہیں کروٹ
میں نے اس شخص کا کیا کیا ہے

معید جاوید کوٹ

غزلیں

ساغر سیفی (حیدرآباد)

جس میں ہیں سب مسالے میں ایسا اچار ہوں
مہنگائی کے سبب سے مگر بے بگھار ہوں

اپنوں کی بے رخی کا ازل سے شکار ہوں
جس پر چڑھے نہ پھول اک ایسا مزار ہوں

ہے آفیسر وہی جو سنے کچھ نہ کہہ سکے
تکیہ کلام جس کا ہے "زیر بار ہوں"

ٹٹو بھی میرا آپ کے گھوڑوں سے کم نہیں
اک ایڑ جب لگائی تو خندق کے پار ہوں

ساغر یہ مفلسی کی بدولت ہوا ہے حال
سب کچھ ہے میرا نقد مگر میں ادھار ہوں

امام رائچوری

ہیں بہت مشہور مکاری میں ہم
کر دئے گیہوں کو چھتیاری میں ہم

خوف چوری کا نہ گم ہونے کا ڈر
رکھ کے دل پھرتے ہیں الماری میں ہم

تیر نظروں کے چلاتے کس طرح
ہائے وہ رکشہ میں تھے لاری میں ہم

ساری دنیا کو تعجب ہے امام
چُل رہے ہیں کیسے بیکاری میں ہم

ڈاکٹر قمر رئیس

نظر برنی کی شاعری

معاشرہ میں جب اتھل پتھل ہوتی ہے، طبقاتی مفادات جب جنگھاڑتے ہاتھیوں کی طرح آپس میں ٹکراتے ہیں، مادی اور صنعتی ترقیاں جب اخلاقی اور روحانی زندگی کے نازک شیشوں پر سنگسار کرتی ہیں، تہذیبی آشوب و ابتلا میں جب پرانی قدریں اکھڑنے لگتی ہیں اور نئی قدریں شور و شر میں جنم لینے سے ڈرتی ہیں، جب وزنی اشیاء، افراد اور خیالات نیچے تہہ میں چلے جاتے ہیں اور کھوکھلی اشیاء، بے وزن افراد اور بےحس خیالات اوپر تیرنے لگتے ہیں تب طنز و مزاح کی فصل کا موسم آتا ہے۔ فرد اور معاشرہ دونوں اس طرح ہانپنے اور کانپنے لگتے ہیں جیسے ضعیفی میں زنا کر کے اٹھے ہوں۔

خودگیری، خواہش پرستی، تسکین و اضطراب، احساسِ جرم، خوف عذاب، بے تہی، بے بسی، بزدلی، نعرہ زنی، نمائش پرستی، ریاکاری، الغرض انسان کے ہزاروں مضحک پہلو سامنے آتے ہیں اور سماجی زندگی کے ہر شعبہ میں قدروں کی بےقدری کا بازار گرم ہوتا ہے۔

ایسے میں بقول سوئفٹ سیاست، مذہب، اخلاق، معیشت، تعلیم، تہذیب، سب طنز کی عدالت میں مجرم بن کر حاضر ہوتے ہیں اور طنز نگار جب ان کے مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے تو وہی نہیں سارے حاضرین شرماتے اور منہ چھپاتے لڑکیوں کی طرح بجا طور پر بہیمانہ جرائم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

اردو شاعری میں اکبر طنز و مزاح کے اکبرِ اعظم ہیں ان کے بعد مغل دور کی طرح یہ صنف مسلسل انحطاط کا شکار رہی جس کا نقطۂ عروج آزادی کے بعد کا عہد ہے لیکن آج ہمارا معاشرہ شکست و ریخت، بے اعتدالیوں، بے لگامیوں، بوالعجبیوں اور ہمہ گیر بدعنوانیوں کے جس بحرانی دور سے گذر رہا ہے اور وہ جس طرح کے نامردانہ اور مریضانہ ماحول کو جنم دے رہا ہے اس میں صرف طنز نگار کا قلم ہی کچھ شفابخش ہو سکتا ہے۔ اب ممکن ہے کوئی

اکبر پیدا نہ ہوسکے لیکن نظر برنی صاحب کا کلام دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ایسے "اکبر نادے" ضرور پیدا ہو رہے ہیں جو ہم
کی زندگی اور اس کے ہوش ربا تضادات کے بارے میں اپنے احتجاجی جذبات کو طنز کے نوکیلے نشتروں میں ڈھال سکتے ہیں۔
سید نظر برنی کے سنجیدہ کلام کے دو مجموعے "متاعِ نظر" اور "ذوقِ نظر" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ سچ تو
یہ ہے کہ موجودہ قومی معاشرہ کے معائب پر نظر برنی نے جس ژرف نگاہی اور جز رسی کے ساتھ نگاہ ڈالی ہے وہ
کامیاب طنز نگار ہی سے متوقع تھا۔ چمچہ اور چمچہ گیری، خوشامد اور چلم بازی ایسے تلازمے ہیں جو نظر کے یہاں عام
طور پر تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ عہد کو اگر کسی ایک علامتی لفظ سے ادا کیا جاسکتا ہے تو وہ
چمچہ ہی ہے ؎

کوئی بھی کام ہو حل کیجے اس کے دم سے   اس خوشامد نے تو دنیا کو ہلا رکھا ہے۔

صرف دنیا ہی نہیں ہفت آسمان تک اس کا اثر پہونچتا ہے۔ بقول نظیر ع

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

نظر برنی نے متعدد اشعار میں اپنے زمانے کے خوشامدانہ مزاج پر کھل کر طنز کر کے گویا روحِ عصر کا احاطہ کیا
طنز و مزاح کی شاعری اگر عام فہم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ تیر یا تو ایک پل میں شکار کرتے ہیں یا پھر اگر کچھ پل گذر گئے
تو پلٹ کر خود شکاری پر وار کرتے ہیں۔ اس لئے اس مشق ناز میں مہارت ضروری ہے جو آتے آتے آتی ہے۔ نظر برنی اگر
اس کوچہ میں نئے ہیں لیکن اناڑی نہیں۔ دو مجموعے شائع کر کے وہ پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکے ہیں۔ زبان و بیان پر
قدرت نے ہی انھیں اس کوچے میں قدم رکھنے کی جراءت بخشی ہے۔ نظم ہو یا غزل وہ بے جا مبالغہ آرائی کے بغیر
ہی اپنی بات میں چٹیلا پن پیدا کر دیتے ہیں۔ ان نظموں میں اگر بیانیہ کیفیت ہے تو غزل کے اشعار میں لطیف لیکن
زود اثر اشاریت۔ اساتذہ کے کلام کی پیروڈی میں بھی کہیں کہیں ان کی ہنر مندی چمک اٹھی ہے۔ یہ چند اشعار
ملاحظہ ہوں۔

اب بچ کے کہاں جائیے ہر سمت ہے دیوار   بیوی میرے پیچھے ہے تو بچہ مرے آگے

وہ کلاکار بن کے بیٹھے ہیں   یہ نہیں جانتے کلا کیا ہے

شیخ صاحب کی آستیں نہ ٹٹول   صرف بوتل اور دھرا کیا ہے

ان کو بلی ہے غالباً یوپی کی لاٹری   چہرے پہ اب نہ پہلی سی پھٹکار بھی نہیں

اپنے افسر کی تم چلم بھر دو   پھر یہ دیکھو کہ کیا نہیں ہوتا

کیوں گھور رہا ہے اسے چوبارے میں کلوا   ہمسائی تیری رشتہ میں کیا تائی لگے ہے

اس طرح کے بہت سے تیکھے اشعار زندگی کے بارے میں شاعر کے مثبت اور متوازن رویے کی نشاندہی کرتے یا
زندگی کی ناہمواریوں اور بے تکے مظاہر کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنا کر وہ ایک صحت مند اور حیات بخش ماحول کی آمد
کرتے ہیں۔

خرافات

(مراسلے)

● تمہارا ماہنامہ ہزاروں رسالوں پہ بھاری ہے۔ سارے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا ماہنامہ ہے سرزمین دکن کو فخر ہے کہ مخلص بھوپالی کا تم نے حق ادا کر دیا بڑا خوبصورت اور معلومات آفریں نمبر نکالا ہے بعض مضامین میرے لئے بالکل نئے تھے۔ مرحوم کے فن اور شخصیت کا مکمل ترجمان — اتنا اچھا نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول کرو۔

سلیمان خطیب، گلبرگہ

● مکرمی کمال صاحب! آداب!
آپ کا موقر رسالہ نظر سے گزرا۔ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔

جوہر بھارتی، پٹیالہ

● شگوفہ فروری ۱۹۷۸ء از اول تا آخر چاٹ کر ابھی ابھی فارغ ہوا ہوں۔ تمام وجود میں ایک شگفتگی سی رچ بس گئی ہے۔ شگوفہ کے دسترخوان کو آپ جس بدمعاشی غذا سے سجاتے ہیں وہ بے حد لذیذ، انتہائی چٹخارے دار اور نہایت زود ہضم ہوتی ہے۔ پھر بھی مگر کچھ ضعف معدۂ طبع کے شکار لوگ 'مالِ مسروقہ' یا 'مالِ مفت' کا کچھ حصہ ثقالت کی وجہ سے ہضم نہ کر پائیں تو ان کے لئے آپ نے "چورن" کا بھی اہتمام کیا ہے۔ 'خرافات' تو ان دنوں حاصلِ مشاعرہ کے اعزاز سے نوازی جاتی ہیں۔ شگوفہ کے تعلق سے تو صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ شگوفہ بھوپال پنچ' اودھ پنچ، سرپنچ اور نمک دان وغیرہ کے ورثہ کو ایک سعادت مند اور ہوشیار اولاد کی طرح نہ صرف یہ کہ سینے سے لگائے ہوئے ہے بلکہ اس میں روز بروز بیش بہا اضافے کر کے بزرگانِ سلف کی ارواح کے لئے ایصالِ ثواب کا اسباب مہیا کر رہا ہے۔ آج بے شک ہند و پاک میں طنز و مزاح کی نمائندگی کا فرض بلا شرکتِ غیرے شگوفہ ادا کر رہا ہے۔

محبوب راہی، بارسی ٹاکلی (اکولہ)

● پرچہ برابر مل رہا ہے۔ شکریہ۔
'جشنِ ظرافت' پٹنہ میں بہت کامیاب رہا۔ رپورٹ سے اندازہ ہو ہی گیا تھا مگر وہاں جب میں پہنچا تو سبھی نے اس کا ذکر کیا خاص کر حیدرآباد کی پارٹی کا۔ جی خوش ہوا۔

ابوالفیض سحر، نئی دہلی

● جناب مدیر کمال صاحب! تسلیم
"شگوفہ" بھرپور طنز و مزاح کے نمونے پیش کرنے میں پیش پیش ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی یہ پیشکش طنز و مزاح کے ادب میں خوشگوار اضافہ کا سبب ہے۔

نصر قریشی، الہ آباد

● 'شگوفہ' کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ چہرہ سے لے کر آخری ورق تک حسن ہی حسن ہے بقول عزیز وارثی "ہم صبح بنارس سے سب اس کا اور شام اودھ گیسو اس کے"، کنہیا لال کپور سے لے کر ارشد علی خاں صاحب کی ضرورت تک عمدہ تخلیقات ہیں، بہرحال شگوفہ کا سالنامہ موسم بہار کا بہترین تحفہ ہے جس کے لئے میر کارواں مدیر شگوفہ قابل مبارکباد ہیں جو طنز و مزاح ادب کو ایک نیا موڑ دینے میں انتہاء مصروف ہیں

منظور النعمان خاں، حیدرآباد

● محکمہ السنہ ہریانہ نے میرا مقالہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" شائع کیا ہے ۱۹ مارچ کو سالانہ سیمینار میں پڑھا جائے گا۔

رام لعل نابھوی

● 'شگوفہ' کا مخلص نمبر بے حد پسند آیا۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ امید ہے آپ شگفتہ ہوں گے۔

جی یم نعمی، بھوپال

● سہسوان میں شگوفہ بے حد پسند کیا گیا ہے۔ شگوفہ کے کاتب صاحب نے سالنامہ اور فروری کے شمارے خاص طور پہ بڑی توجہ سے لکھے ہیں۔ ان تک مبارکباد پہنچائیں۔

نرگس سہسوانی

● شگوفہ کا جنوری خاص نمبر ملا۔ پرچہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ پرچہ شاندار ہے۔ بہت شاندار ہے۔

امام راجگیری

● سالنامہ دستیاب ہوا۔ جی خوش ہوا آپ کی محنت عجیب ہے۔

صابر بہاری، رانچی

● شگوفہ کو اس دور کے ہر رسالہ میں سب سے الگ تھلگ سمجھتا ہوں اور اس میں ایک نیا پن پایا جاتا ہے۔

م، ق، انور، جمشید پور

● "شگوفہ" برابر پڑھتا ہوں۔ ان دنوں خوب نکھر گیا ہے اور کافی مقبول ہو چلا ہے اس لئے کہ اس پرچے کی حیثیت منفرد ہے اور اب تک ایسا کوئی ماہنامہ شائع نہیں ہوا ہے۔

سید احمد قادری، گیا

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

زندہ دلان حیدرآباد کا گیارھواں سالانہ اجتماع ۱۴ اور ۱۵ اپریل ۷۸ء کو منعقد ہوگا۔ ملک کے بعض نامور طنز و مزاح نگاروں کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس موقع پر شگوفہ کا حسب روایت دیدہ زیب سوونیر شائع ہوگا جس میں سالانہ تقریبات میں شریک ہونے والے مزاح نگاروں کی منتخبہ تخلیقات شامل اشاعت ہوں گی ــــــــ

"ابراہیم جلیس نمبر" سابقہ اعلان کے مطابق اپریل ۷۸ء میں چھپنا چاہیئے تھا لیکن سالانہ تقریبات کی وجہ سے اب یہ خصوصی نمبر مئی ۷۸ء کے اوائل میں شائع ہوگا۔ جلیس نمبر کی کتابت کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ ہند و پاک کے نامور ادیب و صحافی ابراہیم جلیس پر ملک کے اہم ناقدین اور ان کے قریبی دوستوں سے خصوصی مضامین لکھائے جا رہے ہیں۔

★ آندھرا پردیش میں اردو تحریک کے ایک اہم رہنما جناب یم باگا ریڈی کو ریاست کی کابینہ میں شامل کیا گیا ہے۔ جناب باگا ریڈی اسمبلی کے سینیئر ترین رکن ہیں۔ دیر سے سہی لیکن کانگریس کی تقسیم کے نتیجہ میں ان کی خدمات سے استفادہ کا خیال تو ہوا! یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جناب باگا ریڈی کے انشائیے "شگوفہ" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہم، جناب باگا ریڈی کو کابینی درجہ کے وزیر مقرر ہونے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

★ پروینہ ید اللہ مہدی کے قسط وار ناول "یہ خوب" کا سلسلہ اس بار بھی جا نہ رہ سکا جس کا ہمیں افسوس ہے۔ لیکن اپریل ۷۸ء کے شمارہ میں قسط ۲۲ شریک اشاعت

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ

اپریل ۱۹۷۸ء ★ جلد (۱۱) ★ شمارہ (۴)

مدیر

سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت

منظور احمد ● حمایت اللہ ● مسیح انجم

مجلسِ مشاورت

راجندر سنگھ بیدی ● بھارت چند کھنہ ● خواجہ عبدالغفور ● نریندر لوتھر ● مجتبیٰ حسین

قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ: (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۳۵) شلنگ

طباعت لیتھو: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
طباعت ٹائٹل: اسٹینڈرڈ پروسیس، شانتی نگر، حیدرآباد
بائنڈنگ: محمد یعقوب بائنڈنگ ورکس روبرو دربار حسینی، پرانی حویلی، حیدرآباد ۲

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شگوفہ ۳۶ - مجرد گاہ، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۱
فون: 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

شگوفہ کا آئندہ شمارہ

سووینیر ہوگا

جو ۲۸ر اور ۲۹ر اپریل ۱۹۷۸ء کو زندہ دلانِ
حیدرآباد کے گیارھویں سالانہ اجتماع کے موقع پر
شائع ہوگا۔ قیمت : ۳ روپے

ابراہیم جلیس نمبر

یکم جون ۱۹۷۸ء کو شائع ہوگا

ابراہیم جلیس کے انشائیوں کا انتخاب
جلیس پر ان کے احباب کے خط کے
جلیس کی شخصیت و فن کا جائزہ
اردو دنیا کا جلیس کو خراجِ عقیدت
اور بے شمار دوسری خصوصیات

ایجنٹ حضرات قبل از قبل
اپنے آرڈر بک کروالیں۔

کرنل محمد خاں

نیم لفٹین پشاور میں

اپریل ۱۹۴۱ء کی وہ صبح بھولنے کی نہیں، جب وہ چھوٹی ریل گاڑی ہم نیم لفٹینوں کی ہنستی گاتی ٹولی کو لیے تھو کے اسٹیشن سے نکلی۔ معاً ہمیں وہ دن یاد آیا جب ذرا پیشتر ہم اسی اسٹیشن پر پہلی مرتبہ اُترے تھے اور گورے سارجنٹوں نے ہمارے پندار کی گربہ کا روزِ اوّل ہی کام تمام کر دیا تھا لیکن وہی گورے آج ہمیں سلیوٹوں سے رخصت کر رہے تھے۔ ہمارا مورال* اس بلندی پر کبھی نہ پہنچا تھا۔ اب ہمیں کسی سے گلہ تھا نہ شکوہ۔ دنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی حتیٰ کہ وہ مضافات بھی جو چلتی گاڑی سے دلفریب نظر آ رہے تھے جن سے چند ایک قسم کی فوجی مشقوں کی یاد وابستہ تھی یا پہاڑی تو ہمیں وادیٔ گنگا کی طرح محبت کے اشارے کر رہی تھی۔

درازیٔ سفر میں ہم نے افسرانہ مستقبل کے لیے جو منصوبے بنائے وہ زیادہ تر میس، کلب، برج، سواری اور یونیفارم وغیرہ کے متعلق تھے، یہ پوچھنے کی زحمت نہ تھی کہ ہمیں اس وقت ایک عالمگیر جنگ بھی جاری تھی جو ہمارے وطن تک اگرچہ نہیں پہنچی تھی، تاہم ہمارے ہزاروں ہم وطن اس تک پہنچ چکے تھے اور کئی سر دھڑ کی بازی بھی لگا چکے تھے اور یہ کہ خود ہمیں بھی کچھ اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا لیکن فی الحال ہم لڑائی سے مختلف سمت میں جا رہے تھے اور جنگ کا خیال قطعاً بے جا تھا! البتہ ہمارے ایک پشاوری ساتھی محاذِ جنگ پر نہ بھیجے جانے کی وجہ سے خاصے افسردہ تھے بلکہ ٹریننگ کے دنوں میں بھی جب ایک دن کسی مضمون میں فیل ہونے پر ان سے بازپرس ہوئی تو انہوں نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

"ہم فیل میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم بنیا نہیں جو سوال نکالے۔ ہم کو لڑائی میں بھیجو ہم بادشاہ کا خدمت کرنے آیا ہے۔"

دراصل ہمارے دوست کو تکلیف یہ تھی کہ ان کے گھر میں ایک ڈھال اور ایک تلوار رکھی تھی اور یہ تاریخی اسلحہ ان کی خاندانی روایات کے مطابق بانیٔ خاندان کے استعمال میں آیا تھا۔ اگرچہ کہ اس بات کا تعین نہیں ہو سکا تھا کہ یہ واقعہ سکندر کے حملے سے پہلے ظہور میں آیا

---

* MORALE — حوصلہ اور خود اعتمادی کے لیے فوج کا سکہ بند لفظ

تھا یا بعد میں لیکن بہرحال یہ اس امر کی صریح علامت تھی کہ آپ ایک مارشل خاندان کے چشم و چراغ تھے چنانچہ آبائی سپہ گری کے اس تابناک پس منظر میں آپ کو یہ کسی صورت گوارا نہ تھا کہ حسنِ اتفاق سے جنگ جاری ہو (یعنی خدا نے ان کے لیے دادِ شجاعت دینے کے تمام اسباب پیدا کر رکھے ہوں) اور وہ راولپنڈی جیسے دارالامان کو بھیج دیے جائیں چنانچہ تمام راستے ان کا مارشل خون کھولتا رہا اور ہم سے الگ قصے میں WARLIKE STORE[ہ] بنے بیٹھے رہے۔

جہلم سے پشاور تک سب ساتھ تھے درمیانی اسٹیشنوں پر اتر گئے اور گاڑی سرِ شام پشاور پہنچی، ہمارے استقبال کے لیے دو افسر موجود تھے دونوں انگریز، ان دنوں دیسی افسر ابھی گنتی کے تھے ـــــ دیسی افسروں کی تھوک بھرتی کسی قدر بعد میں شروع ہوئی۔ جب جاپان نے جنگ میں کود کر آگ سی لگا دی اور وہی لفٹینی جو ہم نے خونِ جگر سے حاصل کی تھی سرِ راہ بٹنے لگی ـــــ اب استقبال کو تو یہ دو انگریز آگئے تھے لیکن ان کا طرزِ تپاک کچھ ایسا تھا جسے دیکھ کر دل جل تو گیا، لیکن جھلس ضرور گیا۔ پھیکی سی مزاج پرسی اور بس ـــــ پھر کار میں بٹھا کر ہمیں خارج از بحث سمجھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ گویا پچھلی سیٹ پر انسان نہیں بستر رکھا ہے۔

سگنل آفیسرز میس پر پہنچے تو پہلا پتا کوارٹر دکھایا گیا ایک امیدوار بیرا شیر باز پہلے ہی سے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آنے والا صاحب بے بیرا ہو تو شاملِ خدمت ہو جائے، ایسا ہی ہوا، وقت کم تھا ہم نے ڈنر کے لیے کپڑے بدلے چونکہ میس میں جانے کے لیے پہلی شب کا معاملہ تھا، اپنی "ٹرن آؤٹ" کی نوک پلک خاص طور پر سنواری اور اس سلسلہ میں شیر باز کے ماہرانہ مشوروں سے استفادہ کیا کہ وہ مقامی رسوم سے باخبر تھا اور سالہا سال کی بیرا گیری کے طفیل ان معاملات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔

میس میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم سب سے پہلے آگئے ہیں انٹی روم کے زیبائشی سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ پاس ریڈیو پڑا تھا۔ ایک سگنل افسر کو کہیں ریڈیو نظر آجائے تو بقول شخصے اسے چھیڑنے کا "چسکا" ضرور لیتا ہے۔ ہم نے بھی لیا۔ شومئی قسمت لاہور کے اسٹیشن پر جا رکی جہاں سے کوئی غیرتِ ناہید ڈھولک کا گیت گا رہی تھی "ماہی دے تھلے بہہ کے" ہم اس کے شعلے کی لپک میں آگئے اور میس و مافیہا سے غافل ہو کر پاس کے صوفے پر بیٹھ کر سننے لگے۔ باہر سے یک وقت دو چار انگریزی آوازیں بلند ہوئیں اور متفقہ طور پر اس گستاخ کے نام اور نمبر کا مطالبہ کیا جو یہ وحشیانہ موسیقی سننے کا ارتکاب کر رہا تھا۔

یہ چند انگریز افسر تھے جو ابھی میس کے بیرونی دروازے تک پہنچے تھے اور اس انگریز کدے میں دیسی گانا ایک باغیانہ فعل سمجھتے تھے وہ ابھی باہر ہی شور مچا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یونٹ میں پہلا دن ہے۔ اپنے متعلق اولین تاثرات خراب کرنا قرینِ مصلحت نہیں لہٰذا ریڈیو بند کر دینا چاہیے، لیکن کسی اندرونی آواز نے شہوہ دیا کہ ریڈیو بند کر کے تم ان کی خوشنودی تو شاید حاصل کر سکو گے یا نہیں! البتہ اپنی بزدلی کا خاصا پختہ ثبوت دو گے۔ چنانچہ ریڈیو کو لگا رہنے دیا۔ بلکہ اب سحرِ موسیقی کی وجہ سے نہیں، بلکہ تحفظِ ناموس کی خاطر۔

انگریز افسروں کا خیال تھا کہ کسی نوکر نے میس خالی دیکھ کر لگا رکھا ہے لیکن جب اندر داخل ہوئے اور مجھے ریڈیو کے پاس بیٹھا دیکھا، تو سمجھے کہ سچ مچ غدر کی ابتدا ہو رہی ہے۔ ذرا رک کے ان میں جو ایجاٹو کا سب سے بڑا خدائی تھا، بڑھا اور مجھ سے کہنے لگا "نہ سنو گے؟" اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سوئی گھما کر بابر پر کر دی۔ اتفاق سے اس وقت خبریں بھی شروع تھیں! چنانچہ میں خاموش رہا۔

میں اس میس میں نووارد تھا لیکن کسی نے مجھ سے معارفہ نہ کیا۔ ظاہر تھا کہ نووارد افسر ہیں لیکن تعارف ہم نے عرضِ

ہ سامانِ جنگ کے لیے فوجی اصطلاح

انگریزوں کی آئندہ نسلیں بھی معاف نہ کریں گی۔ بعد میں دو دوسرے افسر
ئے۔ وہ بھی انگریز تھے، لیکن انہیں ہماری بغاوت کا علم نہ تھا۔
میں سے ایک جو اسٹیشن سے ہمیں ساتھ لایا تھا اور ایڈجوٹنٹ
، ہمارے صوفے پر آ بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ میں نے میس
اس کی آرائش کی تعریف کی۔ اتفاق سے سامنے ایک عورت کی
آویزاں تھی۔ میں نے پوچھا:

"یہ عورت کون ہے؟"

میرا یہ کہنا تھا کہ ایڈجوٹنٹ صاحب کا رنگ بدل گیا اور مجھے
حیرت، ایک قہر کے عالم میں گھورتے ہوئے بولے:

"عورت؟ خدا کے بندے یہ محض عورت نہیں، پرنسس
ال ہے! تمہاری سگنل کور کی کرنل کمانڈانٹ! تم واقعی "سگنل" ہو؟"

اب یہ واقعہ ہے کہ مجھے شہزادی موصوف کے کرنل کمانڈانٹ ہونے
علم اور تقرر منظور تھا، لیکن یہ کہ سامنے والی تصویر انہی کی ہے اس کا
علم نہ تھا۔ ایسے حالات میں انگریزوں میں معذرت کا ایک معروف
فقرہ دہرایا جاتا ہے اور سارا گلہ دھل جاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی عمل
یا لیکن گلہ دھلنا تو کجا، اس انگریز کے چہرے پر سیم اور تھور کی نوع
علامات پیدا ہونے لگیں اور ان آثار کے زائل کرنے کا طریقہ ابھی
تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ناچار چپ ہو کر بیٹھ گیا۔

ہمارے پہلے رپورٹ کی ابتدا یقیناً اچھی نہیں ہوئی تھی، لیکن اب
کیا ہو سکتا تھا۔ دل کو سمجھایا کہ دیکھو میاں! اس ملک میں جب
تک ہمارا واسطہ انگریزوں [illegible] تو ہوگا۔ باقی رہیں
میس کی پہلی رات کا [illegible] ناخوشی کی شان
[illegible] میس کے [illegible] سمجھایا
جا سکتا ہے اور [illegible] ہیں —— دیکھا ہی
جب کا سفر کے دوران ان کے [illegible] نظر نہ آیا بلکہ
پلٹ [illegible] تو یوں معلوم ہوتا
[illegible]

سازش کر رکھی ہے۔ فقط ایک شخص جو بائیں جانب میز پر بیٹھا تھا، ہم
سے کسی قدر گرم جوشی سے باتیں کرتا رہا۔ وہ ولایت سے تازہ تازہ آیا
تھا اور ایک دیسی کا انگریز کی خاطر لڑنا احسان سمجھتا تھا۔ یہ لفٹننٹ
وائٹ تھا۔ جان وائٹ کی ملاقات اس شب کے ناگوار حادثوں
کے بعد منہ میں گویا میٹھا ذائقہ چھوڑ گئی۔

دوسرے دن کمان افسر سے ملاقات ہوئی، خیال تھا رات کی لغزشوں
کی صفائی طلب کریں گے، لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔
ایڈجوٹنٹ صاحب نے البتہ اعلان جنگ واپس نہیں لیا تھا۔ وانت
پیس پیس کر ہمیں اپنے نئے فرائض کے متعلق حکم سنایا اور نتیجتاً ہم ایک
ایسے سیکشن کے افسر یا فوجی زبان میں او سی (O.C.) مقرر ہوئے
جس کا کام پہاڑی توپ خانے کو مواصلات بہم پہنچانا تھا۔

اس سیکشن میں انسان تھوڑے تھے اور گھوڑے اور خچر زیادہ۔ طبیعت
پہلے تو کچھ برہم ہوئی، لیکن جب میں اپنے سیکشن میں پہنچا اور ان لوگوں سے
ملاقات ہوئی تو ایمان تازہ ہو گیا۔ یہ سیکشن تمام تر پنجابی مسلمانوں پر مشتمل
تھا۔ یہ سن کر کہ ایک دیسی افسر پہلی دفعہ او سی مقرر ہوا ہے۔ ان لوگوں
نے اس خلوص سے میرا خیر مقدم کیا کہ میں انگریزوں کی رنجش بھول گیا
سینیئر عہدہ داروں نے نہایت شوق سے مجھے سیکشن کا سامان دکھایا اور
جوانوں کے علاوہ تمام گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ جی ہاں ان
سب کے اپنے اپنے نام تھے، اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی شخصیتیں! اس پہلی
ملاقات پر سیکشن کے لوگ جس محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ علاوہ اس
سے کہیں زیادہ محبت کیے جانے کے قابل تھے اور میرے دل میں یہ عہد
مستحکم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی توقعات کو کبھی تشنہ نہ رہنے دوں گا۔

اس شام جب میں میس میں گیا تو انگریز اگرچہ بدستور کھچے کھچے
سے تھے لیکن میرے دل میں ایک ایسا اطمینان تھا جسے انگریزوں کی
ناراضگی نہیں چھین سکتی تھی اور ہمارا مقاطعہ اب ممکن بھی نہ تھا۔ جان وائٹ
ہم سے غیر معمولی تپاک سے بغلگیر ہوئے اور ریڈیو کی طرف اشارہ کر کے
بولے: "ذرا اپنے ملک کا کمال تو سنا دو" پھر ہنس کر بتایا کہ [illegible]

تمہارے بنیان کا اسنے اور مسس رائی کی تصویر کو نہ پہچاننے کے متعلق رپورٹ ہو گئی ہے۔ سارجنٹ لوگوں نے تو تمہارے خلاف کمان افسر تک شکایت پہنچا دی، لیکن الٹی اُن کو تنبیہ ہوئی۔ میں نے پوچھا: سارجنٹ لوگ کون؟ تو کہنے لگا: یہی تم سے لڑنے والے افسر۔ یہ سب پہلے سارجنٹ تھے اور اگر لڑائی نہ چھڑتی، تو اس وقت بھی سارجنٹ ہی ہوتے۔ بہرکیف ہم نے کسی قدر فاتحانہ انداز سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ انتقامی جذبے پر قابو پاکر ریڈیو کو نہ چھیڑا، لیکن جان واٹ کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر منہ سے ماہیے کی ایک کلی گنگنا دی اور جان نے اپنی تحسین کے اظہار کے لیے والہانہ تالی بجا دی۔

واٹ سے اب ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ دوسرے انگریزوں سے بھی ہمیں تو کچھ بیر نہ تھا، البتہ وہ ذرا خفا سے تھے اور واٹ کی حرکتیں اس خفگی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔ واٹ دراصل ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان تھا۔ کیمبرج سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر آیا تھا۔ اسے اپنے تلفظ کا خاص طور پر خیال تھا اور باقی انگریز افسروں سے نہایت اہتمام سے نفرت کا اظہار کرتا تھا، کیونکہ ان کی زبان اور تلفظ گرامر کی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ ان کے پاس فقط دس بارہ فحش گری پڑی اور جانے سے الفاظ تھے جن سے وہ اپنا تمام تر ما فی الضمیر ادا کرتے تھے۔ یہ الفاظ کسی ڈکشنری میں نہیں ہوتے، یہ صرف سارجنٹ لوگوں کے یہاں سینہ بہ سینہ چلا کرتے ہیں۔ واٹ کی اپنی زبان بیشک کلچر کی آئینہ دار تھی، لیکن جو چیز ان سارجنٹوں کا مرصع زبان میں تھا، اس سے بھی انکار مشکل ہے۔

رجمنٹ میں کوئی پندرہ دن گزرے تھے کہ اچانک ہمارے کمان افسر کا تبادلہ ہو گیا۔ ان کا جانا تھا کہ ہمیں ایڈجوٹنٹ نے طلب کیا اور حکم دیا۔

"تم آج اٹھارہ سو بجے (یعنی شام چھ بجے) کی گاڑی سے بنوں جاؤ گے اور وہاں سے آگے ٹوچی کالم میں جاکر شامل ہو گے جو اس وقت فقیر ایپی کے خلاف وزیرستان میں دتہ خیل کے مقام پر مصروفِ جنگ ہے۔ وہاں تم لفٹننٹ کم کو فارغ کرو گے۔"

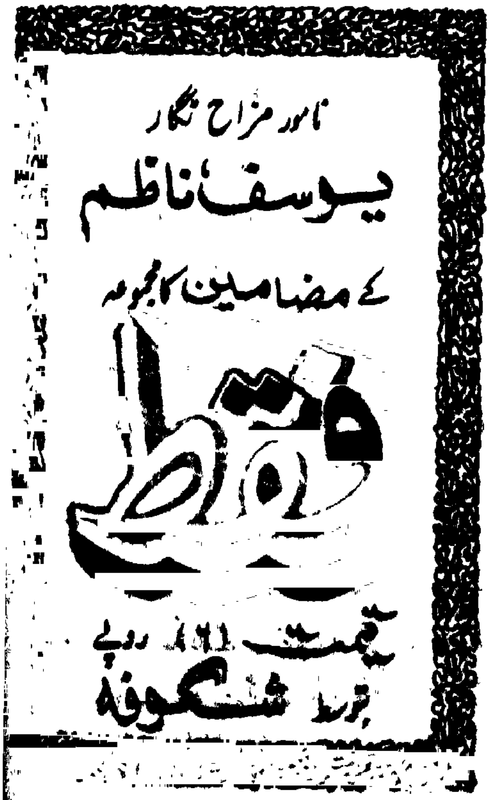
جب واٹ کو ہمارے تبادلے کا علم ہوا تو بھاگا بھاگا آیا اور بولا:

"یہ نام بھی سارجنٹ ہے۔ اس کے دہونے سے ان لوگوں کو یہ کی چوکڑی نامکمل تھی۔ صرف کمان افسر کے بھلے تمہیں یہاں رکھا گیا تھا، ورنہ پہلے ہی دن فقیر ایپی کی خدمت میں بھیج دیے جاتے۔"

اٹھارہ سو بجے ہم بنوں جانے والی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ فرنٹیئر کی لڑائیوں میں بیرا ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے، چنانچہ شیر باز ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنے کئی انگریز صاحبوں کے ساتھ ان معرکوں میں شریک ہو چکا تھا۔ عام لوگوں کو علم نہیں کہ ان سرحدی لڑائیوں میں بھی دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ شیر باز سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک انگریز صاحب قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دو کان واپس ملے تھے۔ ہمارے اطمینان کے لیے شیر باز نے اتنا اضافہ کیا کہ "تم فکر مت کرو، وہ مسلمان کا لاش خراب نہیں کرتے۔"

ادھر سیٹی بجی اور گاڑی بنوں کو روانہ ہو گئی۔

▲▲



خواجہ عبدالغفور

دیوان خانہ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اور اگر آپ کو وہ جگہ دیکھنی ہو، جہاں شب و روز تماشہ ہوتا ہے تو پھر کسی کے دیوان خانہ میں تشریف فرما ہونا پڑیگا جہاں پر دل سے مانیں کہ نہ مانیں میزبان مہمان سے ضرور کہیں گے "خوش آمدید۔ خوش آمدید ۔ زہے نصیب تشریف لائے آپ کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی" یہ اس قسم کی ظاہرداری بلکہ کسی حد تک ایکٹنگ کا مظاہرہ، کسی کا دیوان خانہ ہوتا ہے۔ اب اس خاص کمرہ کو جہاں پر صاحب خانہ اور مہمان کی مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ بیٹھک کہہ لیجئے یا گول کمرہ، مطلب تو اس ملاقات کے کمرہ سے جو دولت خانہ یا غریب خانہ کا پہلا جزء ہے۔ نہ معلوم انگریزی دور کے دور میں اس کو گول کمرہ کا نام کیوں دیا گیا، شاید ہی محل، کوٹھی یا حویلی کا یہ کمرہ کبھی گول بنایا گیا ہو۔ غالباً اس زمانہ میں یہ محسوس کیا گیا ہوگا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سیدھی سیدھی باتوں کے بجائے گول مول یا ٹال مٹول کی باتیں بڑے ادب اور سلیقہ بلکہ سفارتی انداز میں کی جاتی رہی ہیں اور ابھی بھی کی جاتی ہیں۔ اسی زمانہ میں گول میز اور گول میز کانفرنسوں کا دور دورہ رہا کہ جہاں سب برابری سے گفتگو کرتے۔ کسی کو صدارت کی کرسی نصیب نہ ہوتی اور کوئی صدارتی حقوق سے نوازا نہ جاتا۔ آج کل کے فلیٹوں کے رہن سہن اور انداز عمارت سازی میں تو کسی کمرہ کو گول بنانے کا سوال ہی نہیں کہ اس سے خواہ مخواہ جگہ خراب ہوتی ہے۔ تعمیر کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ہاں کسی زمانے میں جبکہ شاہی ٹھاٹ رئیسانہ طرز زندگی میں شاہی محل اور

حویلیاں ہوتی تھیں تو بڑے پیمانے پر دیوان عام اور دیوان خاص اسی غرض سے بنائے جاتے تھے کہ عام لوگوں سے دیوان عام میں اور چنے چنے لوگوں سے دیوان خاص میں ملاقات ہو۔ خلوت اور جلوت کا فرق یہیں دکھائی دیتا اور جو اتنے ٹھاٹ باٹ کی زندگی نہ ہو بلکہ اس سے کچھ کم درجہ کا معیار زندگی ہو تو غلام گردش سے گذر کے صحن کو پار کرکے پیش دالان میں صاحب سلامت علیک سلیک آداب تسلیمات کے بعد دالان میں بٹھایا جاتا اور یہی دیوان خانہ ہوتا۔

اس قدر میں دیوان عدالت اور کچہری کو بھی کہا جاتا تھا۔ اور مقام دربار یا اجلاس کو بھی وزیر مملکت رکن سلطنت دیوان جی، امیروں کے تحویلدار بھی دیوان کہلاتے اور اسی مناسبت سے ان کے ماتحت کارکنوں، سربراہوں اور اہل دفتر کی نشست کی جگہ کو بھی دیوان خانہ کہا جاتا، لیکن اب یہ قصۂ پارینہ ہیں اور بھولی بسری باتیں۔

فی زمانہ انگریزی لفظ ڈرائینگ روم نے سارے تفرقے مٹا دیئے ہیں۔ معنوی اعتبار سے ڈرائینگ روم وہ کمرہ ہونا چاہیئے جہاں ملاقاتی دوست احباب لوٹ جانے کے لئے تیار ہو کر چل پڑتے ہیں گویا یہ آمد کا نہیں رفتن کا محل وقوع ہوتا ہے۔

اس دور میں اور آج کی تہذیب میں دیوان خانہ وہ جگہ بھی ہے جہاں ریڈیو گرام ہوتا ہے اور ٹی وی ہوتا ہے کہ اپنا بھی دل بہلائیے۔ آنے جانے والے ملاقاتیوں کو بھی گپ شپ، غیبت اور اتہام تراشی سے باز رکھنے کے لئے اپنی پسند کے ریکارڈ سنوائیے یا ٹی۔ وی کا پروگرام لگا کر زبان سے خاموش رہنے، محض کانوں سے سننے اور چشم گنہگار کو مصروف رکھنے پر مجبور کر دیجئے۔ تاش کھیلئے، شطرنج کی بازی جمائیے، تفریح طبع کا کوئی مشغلہ شروع کیجئے۔

دیوان خانہ اپنی امارت، اپنے مذاق اور اپنی شائستگی کے دکھا دے کے لئے سب سے مناسب و موزوں جگہ ہے یہاں پر نامور مصوروں کی تصویریں لگا کر اپنے اعلیٰ ذوق فن شناسی کی داد حاصل کیجئے یا نایاب اور قیمتی مورتیوں کو سجا کر رعب جمائیے کہ آپ بھی صاحب نظر ہیں اور اپنی دولت کو آرٹ کی نذر کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

اعلیٰ تہذیب اور شائستگی نے خوابگاہ اور غسل خانہ کو قریب سے قریب تر جوڑ دیا ہے کہ کسی زمانہ میں زیادہ فاصلہ دور ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح دیوان خانے میں طعام خانہ بھی گھس آیا ہے کہ جہاں بیٹھئے وہیں کھانے پینے سے بھی لطف اندوز ہوئیے۔ ایک حصہ میں جب کھانے کی میز، برتنوں کے سائڈ بورڈ سجا دیئے گئے تو پھر پینے پلانے کے لئے اہتمام بھی ضروری ہوتا ہے جس کے لئے ایک حصہ میں بار کا ہونا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح سوائے بستر استراحت کے جو بڈروم میں ہی ہوتا ہے ساری زندگی اسی ماڈرن دیوان خانہ میں کھچ آتی ہے کہ جہاں ملنے ملانے کے سوا اور بھی بہت ساری تفریحات نمائشی چیزیں۔ مشروبات و ماکولات سب ہی کچھ مہیا ہوتے ہیں۔ ہاں میں نے بستر استراحت کا استثناء جو کیا ہے وہ بھی اکثر غلط ہو جاتا ہے کہ آج کل ہر دیوان خانہ میں ایک خاص صوفہ بھی لازماً ہوتا ہے جس کو صوفہ کم بیڈ کہا جاتا ہے جو اردو زبان کی اصطلاح میں بڈ کم صوفہ ہوتا ہے لیکن انگریزی لفظ "کم" نے صوفہ کو بستر کے ساتھ جوڑ دیا ہے کہ اس صوفہ کو وقت ضرورت بستر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ آخر دیوان خانہ ہے اسی لئے ۔۔۔ سمجھئے اس حساب سے تو ساری زندگی دیوان خانہ میں ہی گذر بسر ہو سکتی ہے۔

آپ نے ایک بات ضرور محسوس کی ہوگی کہ پرانی تہذیب میں دیوان خانہ محض مردوں کی ماجد حاضری رہا ہے جہاں

صاحب خانہ مرد ملاقاتیوں سے مصافحہ، معانقہ کے بعد گفتگو میں محو ہو جایا کرتے تھے۔ عورتوں کا عمل دخل اس حصہ میں قطعی نہیں تھا۔ گھر والی کا مقام گھر کے اندرونی حصوں میں ہی ہوا کرتا اور خواتین کی میل جول کی دنیا الگ ہی ہوتی لیکن اب چونکہ زندگی کے گذر بسر کے لئے چار دیواری بیچ بیچ چار دیواری ہو گئی ہے تو یہ دیوان خانہ اب مردوں اور عورتوں کے درجوں کو ایک سطح پر لے آیا ہے۔ مردانہ حصہ اور زنان خانہ سب دیوان خانہ یعنی سب مدغم ہو گئے ہیں۔ اب سب کو ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ بیگم کی سہیلیاں اگر دیوان خانہ میں براجمان ہوں تو صاحب خانہ جو اب برائے نام صاحب خانہ رہ گئے ہیں اپنی امان صرف خوابگاہ میں پاتے ہیں۔ ایک مرتبہ کا دلچسپ حادثہ سنئے کہ جب بیگم کی سہیلی نے دیوان خانہ پہ ہلہ بول دیا اور گھنٹوں گپ بازی میں لگا دیئے تو صاحب بڑی دیر تک خوابگاہ میں صبر و سکون کے ساتھ بند پڑے رہے۔ بڑی دیر کے بعد انھیں لگا کہ دیوان خانہ میں بڑبڑ نہیں ہو رہی ہے تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور مطمئن انداز میں آواز دے کر دریافت کیا "ارے بھئی وہ آپ کی بک بک کرنے والی سہیلی دفع ہو گئیں" اب دیوان خانہ میں وہ مہمان خاتون موجود تھیں اور جب یہ سوال کیا گیا تو میزبان خاتون سوکھ ہی گئیں ایسے کہ کاٹو تو خون نہیں۔ اپنی دوست کی اس طرح کی تذلیل انھیں بھی برداشت نہیں لیکن بھلا ہو ان کی حاضر دماغی کا اور خاطر جمعی کا کہ انھوں نے فی الفور جواب دیا "ہاں جی، وہ جو ہماری سہیلی تھیں وہ تو کب کی واپس چلی گئیں۔ بڑی دیر سے اپنی پڑوسن مسز باجا تشریف فرما ہیں اور اپنے دہلی کے سفر کی دلچسپ روداد سنا رہی ہیں" لیجئے دیوان خانہ میں ہونے والے بدترین حادثہ سے سب ہی بچ گئے۔

دیوان خانے میں کھانے کی میز لگی ہے آپ آرام اور اطمینان سے بیٹھے کھا پی رہے ہیں۔ ایسے میں کوئی تکلف والے یا خواندہ مہمان آ جائیں تو جو بھگدڑ مچ جاتی ہے وہ بھی عجیب منظر ہوتا ہے۔ میز صاف کی جاتی ہے۔ برتن اٹھائے جاتے ہیں اور صاحب خانہ اور بیگم اپنے گھر کے کپڑے ٹھیک ٹھاک کر کے یا بدل کر ملاقاتیوں کی خاطر معقول اور مناسب کپڑے پہن کر دیوان خانے میں آتے ہیں۔ اس وقت تک اگر سلیقہ کا نوکر ہو تو آنے والوں کا خیر مقدم کر کے دیوان خانہ میں بٹھاتا ہے۔ پانی یا ٹھنڈا شربت پیش کرتا ہے اور کبھی موقعہ ہو تو ریڈیو یا ٹی وی بھی چالو کر دیتا ہے تاکہ انھیں انتظار برا نہ لگے۔ ایسے باتمیز نوکر کی غیر موجودگی میں ایک صاحب نے اپنے ننھے لڑکے سے کہا کہ کچھ دیر تم آنے والے مہمانوں کے ساتھ بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں۔ مہمان کچھ باتونی تھے بچے سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اس سے مدرسے کی باتیں کرتے کرتے پوچھے "تو بیٹا تم اسکول پابندی سے جاتے ہو؟" لڑکے نے سچ سچ جواب دیا "ہم اسکول جاتے نہیں ہیں بھجائے جاتے ہیں" اس پر خوب قہقہہ لگا اور باتوں کا سلسلہ چلا تو فرمائش کی "بیٹے اسکول میں کچھ گانا وانا سیکھا ہو تو سنانا" لڑکے نے اس سوال پر بھی ایمانداری سے جواب دیا "جی، میں گانا ایسے نہیں سناتا۔ ابا جان جب مہمانوں سے تنگ آ جاتے ہیں تو مجھ سے کہتے ہیں کہ گانا سناؤں۔ ایک آدھ ہی گانے کے بعد آنے والے اٹھ جاتے ہیں اور جانے کی اجازت لیتے ہیں"

ایک محاورہ ہے کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں اور اس اندیشہ اور وہم کے تحت اکثر و بیشتر باتیں سرگوشی

یں کی جاتی ہیں تاکہ کوئی غلط آدمی آپ کی باتیں سن نہ لے ۔ فی زمانہ یہ محاورہ کچھ زیادہ ہی صحیح لگتا ہے کہ دیوان خانہ میں مدد چار سے زیادہ لوگ جمع ہوں تو کوئی کسی کی بات نہیں سنتا۔ ہر شخص اپنی بات اپنا لطیفہ اپنی سیاسی جانکاری خود کی دانشوری اور فراست سنانے پر تلا ہوا ہوتا ہے اس لئے اب سننے کا کام دیوان خانہ کی دیواروں کے تفویض کر دیا گیا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دیوار کے کان ہیں ۔ اسی بات پر ہمیں یاد آیا کہ کسی کے گھر ایک مہمان آنے والے تھے جن کی ناک نہ ہونے کے برابر تھی اور بالعموم لوگ پہلی نظر میں اسی کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ ریمارک کر دیا کرتے ۔ ان کی آمد سے پہلے ننھے میاں کو تاکید کی گئی کہ آنے والے مہمان کی ناک کی طرف وہ کچھ اشارہ نہ کریں نہ اس کی بات کریں یہ بات خوب اچھی طرح سے سمجھا کر اطمینان سے مہمان کا خیر مقدم کیا گیا اور سب گفتگو میں مصروف ہو گئے ۔ کچھ دیر تک ننھے میاں نے مہمان کو بڑے انہماک سے دیکھا اور بے اختیار کہہ اُٹھے " ابا جان ابا جان آپ نے تو کہا تھا کہ ان کی ناک کے متعلق ہم کچھ نہ کہیں ۔ جب ان کی ناک ہے ہی نہیں تو ہم ناک کی کیا بات کریں گے ؟ " لیجئے دیوان خانہ کی اچھی خاصی فضاء ایک دم سے ناخوشگوار ہو جاتی ہے مہمان جزبز ہوتے ہیں میزبان خفیف ۔

اب آپ ہی اندازہ فرمایئے کہ دیوان خانہ ایک بہت بڑی تھیٹر کا اسٹیج نہیں قرار دیا ہے کہ جہاں شب و روز تماشہ ہوتا ہے اور ہوتا ہی رہے گا ۔ روزمرہ کی ساری کارروائیاں یہیں پہ ہوتی ہیں اور ساری مصروفیات کا یہی ایک ٹھکانہ ہوتا ہے ۔ لگتا ہے کہ تمام زندگی کھنچ کر اسی ایک کمرہ میں سما گئی ہے اور خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ دیوان خانہ کو دیوانگی سے بچا کر رکھا جائے ۔

اقبال شیدائی
(ورنگل)

کہانی ایک انڈے کی

حسب معمول آج بھی دفتر سے لوٹتے ہوئے انور کی دوکان سے ایک انڈا ہم نے ادھار خریدا اور انور میاں نے حسب معمول ایک ردی کاغذ میں انڈے کو لپیٹ کر انڈا ہماری طرف بڑھا دیا اور ہم نے انڈا لے کر اپنے گھر چلے۔ گھر پہنچ کر حسب معمول ہم نے اُسے ابالنے کی تیاریاں شروع کر دی۔ چولہا جلایا، چولہے پر پانی رکھا اور جب پانی کھولنے لگا تو انڈے کو کاغذ کے کفن سے نکال کر کھولتے ہوئے پانی کے جہنم میں جھونکنے ہی والے تھے کہ انڈے کی ہیئت دیکھ کر ہم چونک پڑے۔ انڈا نہ تو مرغی کا معلوم ہوتا تھا اور نہ بطخ کا۔ بھینس کا تو کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ بھینس انڈا نہیں دیتی۔ انڈا عجیب سا تھا۔ اس کا رنگ زردی مائل تھا۔ اس پر ہلکی نیلگوں لکیریں تھیں جو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتی تھیں۔ ہمیں خیال گذرا کہ کہیں انور صاحب کی کوئی غزل تغیراتِ زمانہ سے گھبرا کر انڈے میں تو تبدیل نہیں ہوگئی۔ اس منحوس قسم کے خیال کے دل میں آتے ہی ایک بار ہم پھر اچھل پڑے اور انڈے میں ہماری دلچسپی بڑھ گئی۔ ہم اس انڈے کو گھورنے لگے۔ گھورتے گھورتے تھوڑی دیر بعد ہمارا سر چکرانے لگا۔ یوں لگا جیسے ہر شئے گھوم رہی ہے اور ہم کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر اڑے جا رہے ہیں۔ اور کئی صدیاں آگے نکل گئے ہیں۔ یوں لگا جیسے یہ انور کی دوکان کا انڈا نہیں ہو قرۃ العین حیدر کے افسانے "روشنی کی رفتار سے" والے افسانے کا راکٹ ہو۔ اور پھر یوں لگا جیسے ہمارا وجود گھٹ کر صفر ہوگیا ہو اور ہم تب کسی زبردست عامل کے معمول کی طرح بڑی گمبھیر آواز میں بولنے لگے۔

"ہم مسٹر ایڈم کذابی۔ ولد نامعلوم۔ قوم لیس۔ سی۔ ساکن بھارت ورش۔ عمر ماجی، پیشہ محفوظ بہ ہوش و حواس خمسہ، بلا جبر و اکراہ غیرے حاضر ناظر جان کر اس نیلی چھتری والے کو کہ جس کے قبضے میں ہماری اور آپ کی جان ہے، وچن دیتے ہیں اس بات کا کہ ہم جو کچھ کہیں گے جھوٹ کہیں گے اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں کہیں گے۔

قدر دان سننے والے غور فرما سکتے ہیں ہم اپنی رام کہانی اس چکر دھاری کے نام سے کہ جس کے ایک اشارے پر آج تک یہ دنیا چکر میں ہے اور غریب کو غریب ترین اور امیر کو امیر ترین بنا کر خوش ہوتا ہے۔ معلوم ہو کہ ہماری پیدائش کوئی غیر معمولی معجزہ نہیں ہے کیونکہ ہم کمالات کے قدر دان ہوتے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ سورج کو مغرب سے طلوع ہونے میں ابھی تھوڑا ہی دیر تھی۔ چاند اور مریخ پر انسان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ملک جیسے بٹوارے ہو چکے تھے۔ چاند کا ایک ٹکڑا بھارت کے حصے میں بھی آگیا تھا۔ بھارت میں راجہ اندر کی حکومت پھر سے قائم ہو گئی تھی اس لئے جو کچھ نہیں ہونا چاہئے تھا وہ بڑے تزک و احتشام سے ہو رہا تھا اور جس بات کو شد و مد سے ہونا چاہئے تھا وہ قطعی ہو نہیں رہی تھی۔ انسان تمام غیر فطری کاموں پر عبور حاصل کر لینے کے بعد انڈے سے دینے کی آرٹ کو سیکھ چکا تھا اور ان انڈوں سے گرگٹ اور نیولے جیسے جانور [illegible] تھے اور وہ جانور جو خاص انڈے سے دینے کیلئے مشہور ہیں ان سے اڑن طشتری کی طرح مخلوق پیدا کی جا سکتی تھی اور کبھی کبھی ان

سے سونڈ یونڈ قسم کے حضرت آدم بھی تشریف لے آئے تھے۔ لوگ پانی کی بجائے پیٹرول پیتے تھے اور ہوا میں معلق تیرتے پھرتے تھے۔ لیلیٰ و مجنوں، وامق و عذرا، سوہنی و مہیوال، نل دمینتی، رومیو جولیٹ کی عشقیہ داستانیں کتابوں سے مٹ چکی تھیں۔ آدمی کمپیوٹر سے عشق کرتا تھا اور اپنی پسند کا محبوب خود حاصل کر لیا کرتا تھا۔

بھارت میں فیملی پلاننگ نے وہ اثر دکھلایا تھا کہ شرح پیدائش ایک دم صفر ہو گئی تھی۔ سارے مرد سے اُجڑ چکے تھے اور ان میں اکثر بوڑھے لگے تھے۔ انسان اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔ ویسے تو انسان پیدا کرنے والے انڈوں کا ایجاد ہو چکا تھا لیکن وہ اتنے مہنگے تھے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار انھیں خریدنے کے متحمل نہیں تھے۔ بچوں کو متبنیٰ لینے والوں کی سہولت کیلئے بعض غیر ملکی ایجنسیاں کام کرنے لگی تھیں جو روسی امریکی چینی اور عرب بچے بلیک میں فراہم کرتی تھیں لیکن حکومت کی انتہائی سخت پالیسیوں کی وجہ سے بچے اب بلیک میں بھی نہیں ملتے تھے۔ جنس بدلنے کی وبا اتنی عام ہو گئی تھی کہ لوگ دن میں کئی کئی مرتبہ اپنی جنس بدل لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے مردوں اور عورتوں میں غضب کی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ نتیجتاً لوگوں کی صحت قابلِ رشک ہو گئی تھی۔ لوگ مرنے کا نام نہیں لیتے تھے ایسا لگتا تھا کہ بھگوان نے یم راج کو کمپلسری ریٹائرمنٹ کی چھٹی کر دی ہو۔ جیسے جیسے لوگوں کی عمریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان کی جوانیاں عود کر واپس آتی جا رہی تھیں۔ مثلاً پچھلے برس ۱۲ اکتوبر کو اپنی ننانویں سالگرہ منانے والی مس ٹام ٹام اگلے برس ۱۲ اکتوبر کو اپنی اٹھانویں سالگرہ منانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ سائنس کی بے انتہا ترقی کی بدولت لوگوں نے بڑھتی ہوئی عمر کو اپنی مرضی کے عین مطابق گھٹا لینے کا راز پالیا تھا۔ بھارت کی ایک خاتون پردھان منتری وزارتِ عظمیٰ سے محض اس علت میں برطرف کر دی گئیں کہ ان کی عمر گھٹتے گھٹتے اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جس میں انگوٹھا چوسا جاتا ہے اور جہاں قلم کی بجائے جھنجھنے کی اور کرسی کی بجائے پالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سرکاری دفتروں میں سرکاری کرمچاریوں کی معیادِ ملازمت گھٹتے گھٹتے محض دس برس ہو کر رہ گئی تھی۔ یعنی جو بھی کرمچاری بھارت سرکار کی دس سال خدمت کرتا یا اس اثنا میں وہ تیس سال کا ہو جاتا تو جبری طور پر اسے ملازمت سے چلتا کر دیا جاتا۔ لفظ وظیفہ بھارت کی ہر بھاشا کی لغت سے خارج کر دیا گیا تھا۔

ہر چیز پر سیلنگ لگی ہوئی تھی۔ سیلنگ قانون سے مستثنیٰ اگر کوئی شے تھی تو وہ تھی سیاست۔ سرکاری کرمچاری تیس۳۰ برس کا ہوتے ہی ناکارہ سمجھا جاتا تھا لیکن سیاست داں ۵۰۰ برس کی عمر میں بھی بلا کا ذہین، چاق و چوبند، پھرتیلا اور صحیح الدماغ مانا جاتا تھا۔ چنانچہ بھارت ورش کا ایک سینئر سیاست داں پانچ سو تریاسی سال کی عمر میں بھارت کا پردھان منتری بنا۔

پھر کیا تھا بھارت کا ہر کرمچاری دفتر سے چھٹی ملنے کے بعد نیتا بننے کا خواب دیکھنے لگا۔ اور ایک سہانی صبح بھارت کے ۵۰ فیصد شہریوں نے اپنے آپ کو نیتا بنا ڈالا۔ اس کے نتیجے میں بھارت میں اچانک ہی ووٹروں کا کال پڑ گیا۔

دستور میں ترمیم کے ذریعہ ہر پارٹی کے لیڈر کو نائب وزیر اعظم کا عہدہ دیا گیا جس کے نتیجے میں بھارت میں اتنی سیاسی پارٹیاں بنیں کہ جن کو کمپیوٹر کی مدد سے شمار کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

پارلیمنٹ میں جب سیاست دانوں کی بھرمار ہو گئی تو کمپلسری ریٹائرمنٹ ایکٹ کو سیاست دانوں پر بھی لاگو کر دیا گیا۔ پہلی ہی سٹنگ میں جھلا جو انند، اماں کی دھرم پتنی اور بچے اس نامعقول ایکٹ کی زد میں آگئے۔ اور انھیں بن باس لینا پڑا۔

بھارت میں قطاروں کی بہت دھوم تھی ہر طرف کیو لگے رہتے تھے۔ راشن کی کیو، بھاشن کیلئے کیو۔ دوکانوں پر کیو، حجامت خانوں پر کیو۔ ملازمت کے لئے کیو، عدالت کے لئے کیو۔ ایک قطار سے دوسری قطار میں داخل ہونے کے لئے رشوت کے پل سے گذرنا پڑتا تھا۔ —

پل مراد سے کہیں زیادہ دشوار گزار تھا۔

اردو جیسی سخت جان زبان ابھی زندہ تھی۔ اس کے بولنے بکنے والے، لکھنے پڑھنے والے ابھی موجود تھے اور اس زبان کو بھارت کی دوسری سرکاری بھاشا بنانے کے لئے اندولن چلا رہے تھے۔ اردو ادب میں ساقی جیسے بزلہ سنج، بیخود جیسے غزل گو، مسعود مرزا محشر جیسے گل اندام اور اقبال شیدائی جیسے شاعر موجود تھے۔ عاتق شاہ جیسے ادیب کے فن کو پھولوں میں تو تولا جاتا تھا لیکن اس کی چائے کی پیالی میں شکر تو کجا گڑ تک نہ گھولا جاتا تھا۔

لیلیٰ مجنوں ابھی بھی بچے پیدا کر رہے تھے۔ یہ اور بات کہ لیلیٰ مجنوں اب انسانوں میں نہیں بلکہ جانوروں میں پائے جانے لگے تھے اور ایسی خبریں اخبارات کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں چھپتی تھیں۔ اور جنھیں پڑھ پڑھ کر لوگ گھڑوں آنسو بہایا کرتے تھے۔ اپنی نامرادی پر شاہ جہاں کا بنایا ہوا تاج محل تغیراتِ زمانہ کے اثر سے دنیا کے سب سے بڑے اور انوکھے ہاتھی کے انڈے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ لوگ اس پر سیڑھیاں لگا کر چڑھتے تھے اور پھسل پھسل جاتے تھے اور بچوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔

یہ وہ دور تھا کہ جس میں قدرت اپنے بندوں کو عجیب عجیب نظارے دکھا رہی تھی۔ ایسے حالات میں ایک نامعلوم مرغی نے ایک عجیب و غریب انڈا دیا۔ اور نو ماہ تک اس انڈے میں ہم مسلسل جدوجہد کرنے کے بعد اس قابل ہو سکے کہ انڈے کے خول پر کچھ دراڑیں ڈال سکے۔ اور جب ہم نے اپنی پوری طاقت سے اچھل کر انڈے کے خول کو زبردست ٹکر لگائی تو ہماری حالت بیسویں صدی کے اس بھارتی ریل کے تھرڈ کلاس کے مسافر کی سی ہو گئی جو اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے پر ڈبے میں ٹھنسے ہوئے مسافروں کے سروں پر سے گذرتا ہوا پھاند دونوں ٹانگوں کو کھڑکی تک پہنچاتے پہنچاتے بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس بات کا متمنی رہتا ہے کہ کوئی رحم دل قلی آئے پیروں سے پکڑ کر کھینچ کر باہر نکال لے۔

ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ باہر نکلنے کے لئے کیا ترکیب کی جائے کہ کسی نے مشینی انداز میں ہماری ٹانگوں کو پکڑ کر ہمیں کھینچ لیا۔ اور ہم نے اپنا داہنا ہاتھ یوں گھمایا کہ ہمارے ہاتھ میں تھما ہوا انور کی دوکان کا انڈا پستول سے نکلی ہوئی گولی کی طرح سنسناتا ہوا دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ دیوار پر سفیدی اور زردی گڈمڈ ہو گئے تھے پھر یوں لگا جیسے زردی، سفیدی میں سے انور کا چہرہ نمودار ہوا۔ اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔ پیارے اگر تم ہماری دکان کے انڈے یوں برباد کرو گے تو ایک دن تمہارے افسانوں اور غزلوں کے مسودے بھی زردی کی شکل میں ہمارے پاس آ جائیں گے اور ہم ان میں انڈے لپیٹ کر بیچ ڈالیں گے۔

قطعات

مجھے غم کیا اگر میں شعر اچھے کہہ نہیں سکتا
میں موسیقی کا ہوں استاد گانے کا میں ماہر ہوں
مگر بزمِ سخن میں داد پا کر کیوں نہ یہ کہہ دوں
میں شاعر ہوں میں شاعر ہوں میں شاعر ہوں میں شاعر ہوں

○

دیکھنے سے ان پہ شاعر کا گماں ہوتا نہ تھا
باوجود اس بات کے اشعار سب پُر زور تھے
ایک دن یہ گل کھلا پڑھتے تھے اوروں کا کلام
خود کو جو کہتے تھے شاعر در حقیقت چور تھے

— حضوری سلطانی

رنگ گورا کالا چشمہ سر پہ لمبے بال ہیں
چھینٹ کی لنگی پہ بش شرٹ اس میں بوٹے لال ہیں
مرد عورت ایک سا کرتے ہیں فیشن آج کل
کیسے پہچانے کوئی مس ہیں یا مسٹر پال ہیں

○

ایک صاحب مل کے اک شاعر سے یوں کہنے لگے
آپ کی غزلیں تو غزلیں خوب ہے آواز بھی
لوٹ ہی لیتے دلوں کے ساتھ جیبوں کو بھی آپ
ساتھ گر رکھتے ہمیشہ آپ کوئی ساز بھی

— اسلم ارا کوٹوی

چند موقعہ پرست لوگوں نے
ہر وہ ممکن گناہ کر ڈالا
چند روزہ مفاد کی خاطر
قوم کو ہی تباہ کر ڈالا

○

چور بازاری کے ماہر جعل ساز
قوم کا یارو مقدر بن گئے
جو کبھی تھے باعثِ ننگِ وطن
ایسے ہی کچھ لوگ لیڈر بن گئے

○

مفلسی بے کلی و بدحالی
ہر طرف بے کسی و پامالی
اس پہ دعویٰ ہے چند لوگوں کو
دیش میں ہر طرف ہے خوشحالی

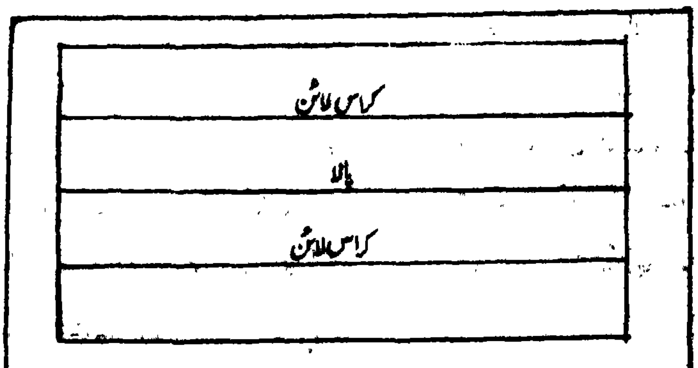
— شفیق جونپوری

از:- مختار یونس
مالیگاؤں

کبڈی کبڈی

کبڈی ہر مہنگے دور کا سستا گیم ہے۔ ہمارے دیش کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں کبڈی کے رسیا کھلاڑی بافراط دستیاب ہوتے ہیں۔ کھیل کود کے ایک ترجمان کا قیاس ہے: مستقبل قریب میں کبڈی اولمپک کے بین الاقوامی فیلڈ پر کھیلا جائے گا: لہٰذا یہ کھیل خود کھیلئے اپنے اہل و عیال کو کھیلنے پر مجبور کیجئے۔ اس کھیل میں نہ بیٹ کا خرچ ہے نہ نیٹ کا۔ و گیند خریدنے کی ضرورت ہے نہ اسٹمپ اور اسٹک کی۔

کبڈی اسٹیڈیم:- کسی میدان کو اسٹیڈیم کے لئے ہموار کیجئے۔ زمین پر تین متوازی خطوط کھینچئے (جیومیٹری بکس کا استعمال لازمی نہیں) ان "خطوط" کو مستطیل کے "لفافہ" میں بند کر دیجئے۔ اس مستطیل کے ہر ضلع کی حفاظت کے لئے اس کے گرد دوسرا بڑا مستطیل ضرور بنائیے لیجئے کبڈی اسٹیڈیم تیار ہو گیا۔



نقشہ:- یہ نقشہ کسی بھی میدان میں بنایا جا سکتا ہے ایشیاڈ کا گھاس کا میدان ہو یا سندھ و گنگا کا میدان، کشمیر کی وادی ہو یا دکن کا سطح مرتفع ہر ہموار جگہ یہ نقشہ بنایا جا سکتا ہے۔ گھر کا دالان، مکتب کا کمرہ، اسمسان، جھاڑی، سڑک اور گلی کوچے میں بھی اس نقشہ کے نقوش پائے جاتے ہیں۔

"اوہ! اس میدان کے وسط سے خطِ استوا گزر رہا ہے"

"اجی صاحب وہ پالا ہے۔ کبڈی کا خطِ آغاز"

"پالا؟ کس بے وقوف سے پالا پڑا ہے۔ بھئی ہم جغرافیائی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں"

"خوب! باقی دو خطوط سے متعلق کیا فرمان ہے؟"

"اوپری خط کبڈی کا خطِ سرطان ہے اور نچلا خطِ جدی!"

"وہ تو کراس لائن ہے جسے عبور کرنا کھلاڑی کا قانونی فرض ہے"

"ایک مستطیل کافی تھا آخر دو مستطیل بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ فضول خرچی ہے!"

"بھائی صاحب! دو مستطیل کا درمیانی خلا، امپائرز کی بھاگ دوڑ کیلئے ہے"

ٹیم اور میچ: ہر کراس لائن (عبوری خط) کے قرب و جوار میں ایک عدد وحشی قوم آباد ہے جس میں سات عدد سورما ہیں۔ دونوں قومیں حریف ٹیم کہلاتی ہیں۔ ان ٹیموں کی لڑائی کو نہ فساد کہتے ہیں نہ بلوہ، نہ یہ خانہ جنگی ہے نہ جنگِ عظیم۔ اس لڑائی میں نہ ہاکی کی چوبی تلوار استعمال ہوتی ہے نہ کرکٹ کی بلہ نما ڈھال، اسے کبڈی میچ کہتے ہیں۔ جب ایک ٹیم کئی میچ یکے بعد دیگرے کھیلتی ہے تو اسے کبڈی ٹورنمنٹ کہتے ہیں۔ (ثابت ہوا "میچ" کا صیغۂ جمع "ٹورنامنٹ" ہے)

زبان رابطہ: دونوں قومیں ایک ہی زبان استعمال کرتی ہیں۔ کبڈی کے میدان میں ایک کھلاڑی ایک مخصوص لفظ مسلسل اپنے جملہ میں استعمال کرتا ہے، اور با آواز بلند دہراتا ہے تاکہ مخالفین سن لیں اور دبکے بیٹھے جائیں وہ مخصوص لفظ ہے "کبڈی" کبڈی کبڈی کبڈی کبڈی ——————!"

یہ مصرعہ فعولن کے وزن پر تحت اللفظ میں پڑھا جاتا ہے (ترنم سے پڑھنے پر کھلاڑی چند معلوم ہوتا ہے)۔ بعض تیز و طرار چرنیلے کھلاڑی صاحبان فعولن کا وزن ادا نہیں کرسکتے وہ فعلن فعلن فعلن فعلن کے وزن پر "کب ڈی کب ڈی کب ڈی کب ڈی" کا ورد کرتے ہیں ایسے کھلاڑی یا پالا مار لیتے ہیں یا پالا ہار جاتے ہیں۔ اسی مصرعہ طرح پر ہر کھلاڑی اپنا کلام سناتا ہے۔ اور مجمع لوٹ لیتا ہے یا مجمع اُسے لوٹ لیتا ہے۔

امپائرس: پالے کے قطبین پر دو امپائرس کھڑے ہوتے ہیں جو کھلاڑی کے ساتھ ساتھ سرحدی علاقے میں یوں حرکت کرتے ہیں جیسے بحر ہند میں روس اور امریکہ کے بحری بیڑے۔ ہر امپائر ایک انتہائی غیر مہذب حرکت کرتا ہے بھرے مجمع میں سیٹی بجاتا ہے کتنی بڑی بات ہے! "حضرت آپ کو سیٹی بجانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کسی میلے ٹھیلے میں شوق فرمائیے!"

"مولانا! یہ سیٹی غنڈہ گردی والی نہیں پولیس چوکی والی ہے۔ اسے منہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ماؤتھ آرگن ہے مگر کبڈی والے اسے "موت آرگن" قرار دیتے ہیں۔ کھلاڑی حضرات امپائر کو "عدالتِ عالیہ" سمجھتے ہیں۔ اکثر وبیشتر ان کی بارگاہ میں "اپیلیں" دائر کرتے ہیں۔ "فلاں کو آؤٹ قرار دیا جائے"۔ اپیل کو مسترد کرنا امپائر کا بنیادی حق FUNDAMENTAL RIGHT ہے۔

امپائرس کے فرائض حسبِ ذیل ہیں۔

(الف) :۔ کھیل میں شرکت کے لیے دونوں ٹیموں کو آمادہ کرنا (بعض اوقات خوشامد کرنا)

(ب) :۔ کھیل کے آغاز پر دونوں ٹیموں کے کپتان کو پاسے پر بلانا اور سکہ رائج الوقت اچھالنا اور پھر انہیں بتانا کہ سکہ کھڑا ہے یا گرا۔ انگریز قوم اس نازیبا حرکت کو TOSS (ٹاس) کہتی ہے۔

(ج) :۔ کھلاڑیوں کی سانسیں گننا اس کی طوالت ناپنا اور داد دینا

(د) :۔ اگر کھلاڑی غیر قانونی حرکت کا مرتکب ہو تو اسے جلا وطن کر دینا

(ہ) :۔ کھیل کے اختتام پر کھلاڑیوں میں ریفریشمنٹ تقسیم کرنا یا کروانا اور خود بھی ریفریشمنٹ ہونا

کھیل کا آغاز :۔ میچ شروع ہو رہا ہے کبڈی کے میدان میں کھلاڑی کھڑے ہیں ان کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے امپائرس ٹاس کے موڈ میں ہیں۔ لیجئے ٹاس جیتنے والا کپتان پالی پر کھڑا ہے۔ اس کے ساتھی اس کے پشت پناہ ہیں اور حریف آگے صف بستہ مؤدب کھڑے ہیں۔ وہ دیکھئے کپتان "کبڈی نامہ" لحن داؤدی میں پڑھ رہا ہے مخالف کھلاڑی شاید پڑھ رہے ہیں (دل میں) کپتان اپنا "جسمانی جہاز" کراس لائن پر لنگر انداز کرنے کی فکر میں ہے۔ مخالفین اس کا گھیراؤ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کپتان کے ہاتھ، پیر اور زبان تینوں چل رہے ہیں۔ گویا وہ ہاتھا پائی پر بھی مائل ہے اور گرم گفتاری پر بھی آمادہ۔ کپتان کی دیرینہ آرزو مخالفین کا جسم / لباس مس کرنا۔ لیجئے کپتان کو کراس لائن پر ناچتے گاتے ہوئے دیکھئے۔ مخالفین اس کی کمر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مگر کپتان بھی بڑا شوخ اور چالاک ہے۔ اس نے اچھل کر حریف کھلاڑیوں کے گھیرے دراز کو چیر دیا۔ محفل رقص و سرود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ رقیبوں نے کپتان کو گود لینا چاہا مگر اس کا بال بیکا نہ ہوا۔ اور وہ کودتے پھاندتے صحیح و سلامت اپنی حدود میں واپس آ گیا۔ امپائرس کی عقابی نظروں نے معاملہ تاڑ لیا اور وہسل چیخ اٹھی ٹیم ایک ہم زلف کھلاڑی سے محروم ہو گئی اور کھلاڑی جیتے جی "مرحوم" ہو گیا۔ اب مخالف کپتان پالے کی سرحد سے للکارتا ہے اسے اپنے ایک ساتھی کے بچھڑ جانے پر غم و غصہ ہے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتا ہے۔ اس کا "جسمانی جیٹ" کراس لائن کو عبور کر کے دشمنوں پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ہاتھ، پیر اور منہ میں بلا کی تیزی تھی۔ آخر کار اس نے دو کھلاڑیوں کو علی الترتیب کاندھے اور ہاتھ پر ضرب کاری لگا دی۔ تیسرے کا دامن چاک کیا اور رخ میں چور لوٹا۔ حریف ٹیم کے جانباز وں نے اس کی کمر پر قبضہ کر لیا۔ خلیم کھلاڑی نے ہاتھی جیب کا سہارا لیا۔ اب تو حریفوں نے کمر بند پر دست درازی کی بیچارے کپتان موصوف نے وہیں دم توڑ دیا۔ آخر میں عزت بھی تو کوئی چیز ہے۔ اس طرح تین کھلاڑی جو آنجہانی بنتے بال بال بچ گئے مگر پھر تیسرا کپتان شہید ہو گیا۔

اب دونوں کیمپوں میں ہلچل مچ گئی۔ کھلاڑیوں کی آمد و رفت تیز تر ہو گئی رسل و رسائل کی راہیں کھل گئیں۔ ٹیمیں اپنا اپنا لٹریچر کھلاڑیوں کی معرفت مخالفین میں مفت تقسیم کرنے لگیں۔ کبڈی کے مصرعے طرح پر فرسٹ و فرسٹ سے فرسٹ پڑھے گئے۔ نیم میدان کے کئی ایڈیشن شائع ہونے ہونے رہ گئے۔ اس [illegible]

بیشتر کھلاڑی حلک بدر ہو گئے۔ امپائرس کی سیٹیوں کا گلا بیٹھ گیا۔ خدا خدا کرکے کھیل کا وقت ختم ہوا تو پتہ چلا ایک ٹیم ہار گئی اس لئے دوسری ٹیم جیت گئی۔ ہارنے والوں کی محفل میں امپائرس کی بے ایمانی کے چرچے ہو رہے تھے مگر فاتح کھلاڑی امپائرس کی قابلیت کے گن گا رہے تھے۔

ضروری لیاقت:۔ کبڈی فیلڈ میں اترنے سے قبل ذیل کی لیاقت پیدا کیجئے۔

۱۔ قطب مینار نما قد جس میں لمبے ہاتھ اور لمبی ٹانگیں جڑی ہوں تاکہ آپ پالے پر کھڑے ہو کر مخالفین کی خبر لے سکیں۔

۲۔ موڑ ٹائر جیسا مضبوط جسم جس پر حریفوں کی ہر انتقامی کارروائی ناکام ہو جائے۔

۳۔ ۳۰ فیصدی ہرن کی پھرتی ۲۰ فیصدی ببر کی طاقت اور ۵۰ فیصدی لومڑی کی عیاری اگر کسی کبڈی سورما میں آجائے تو وہ MAN OF THE MATCH کہلائے گا۔

۴۔ رہبری سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی صلاحیت آپ کو کیپٹنی کا اعزاز دلا سکتی ہے۔

۵۔ طویل سانس والے جس دم کے ماہر سادھو اور یوگی مہاراج کو اس گیم میں ضرور حصّہ لینا چاہیئے۔ ان کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔ کیونکہ حریف انہیں گرفتار بھی کر لیں تو کب تک! ایسے کھلاڑی کبڈی کا لانگ پلے ریکارڈ ثابت ہوں گے۔ کراس لائن اور پالا ان کی مٹھی میں ہوگا۔ ایسا ہمارا قیاس ہے۔

تاریخی اور سیاسی پس منظر:۔ کبڈی ایک تاریخی کھیل بھی ہے اگرچہ موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب میں کبڈی فیلڈ کا تذکرہ نہیں ملتا۔ نہ ہی کھدائی میں پالا اور کراس لائن کا پتہ چلا ہے پھر بھی ہمارے آبا و اجداد کبڈی کھیلتے تھے ورنہ آج ہم کیوں کھیلتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کبڈی ایک ہندوستانی کھیل ہے جو نسل در نسل سینہ بسینہ پاؤں بہ پاؤں ہم تک پہنچا ہے۔

ہمارے ملک کے مختلف میدانوں میں بڑے بڑے بادشاہ اپنی ٹیم لاچکے ہیں۔ پنجاب کے میدان میں سکندر اور پورس کا میچ ڈرا ہو گیا۔ محمد غوری اور پرتھوی راج چوہان کا پہلا ٹسٹ ترائن کے مقام پر چوہان ٹیم نے جیتا۔ مگر دوسرا ٹسٹ "ربر" محمد غوری نے اڑا ۔ تیمور لنگ کے مغل کھلاڑیوں کے سامنے ہمارا کوئی خدا لگ سامنے نہ آیا اور دہلی پہنچ کر برباد کر دی گئی۔ اس بات کا مغلیہ خاندان کو صدیوں افسوس رہا۔ نادر شاہ نے دہلی میدان میں ہمارے کھلاڑیوں کو ایسا زبردست آؤٹ کیا کہ آج تک وہ زندہ نہیں ہوئے۔ کم بخت محمود غزنوی نے کمال کر دیا اس نے سترہ مرتبہ کبڈی ٹورنامنٹ فائنل جیتا اور سومنات ٹرافی حاصل کی۔ انگریز امپائری کرنے آئے تھے انھوں نے ہندوستانی کیپٹن شپ پر بھی قبضہ کر لیا۔

سیاسی دنیا میں بھی کبڈی کا کھیل جاری ہے۔ دنیا کے گلوب پر خونریز کبڈی دھوم سے کھیلی جاری ہے روس اور امریکہ کی ٹیم میں دنیا کے بیشتر ممالک بطور کھلاڑی کا ونٹی کھیل رہے ہیں۔ کوریا، کمبوڈیا، لاؤس اور ویتنام کے سیاسی فیلڈ پر عظیم عالمی طاقتیں اپنی زیر نگرانی خونین کبڈی میچ کھلاتی رہی ہیں۔ جس میں پسماندہ ممالک کے کمزور کھلاڑی آؤٹ ہوتے ہی نہیں بلکہ نا کے آؤٹ ہو گئے مگر بڑی طاقتیں ہنوز میدان سیاست سے ناک آؤٹ نہیں ہوئے۔

مجید مقبول

بر

حکومتِ
وقت نے طوعاً وکرہاً
ایکشن لیا' تب جاکر دام گرے
لیکن عوام' مالکِ ہوٹل کے شکر گزار ہوئے
گویا جیب کا پیسہ جاتا ہے' مفت کا احسان اُٹھایا
جاتا ہے۔ آسمان سے گرتے ہیں کھجوروں میں اٹکتے ہیں۔ کہنے کو بڑے
نام دام گر گئے ہیں' وزن مگر غیر معمولی انداز میں کم ہوجاتا ہے۔ اب تو ہوٹل
کی ہر شئے کا نام فتح گال لگتا ہے مثلاً لقمی گھمی ہے تو ق م ی اڑ گئے۔ صرف
پہلا حرف رہ گیا۔ پیالیاں سکڑ کے پیا پیا کہہ رہی ہیں۔ بڑی پلیٹیں اُلٹ کے رہ گئیں
زمین سے اُوپر ہوگئے۔ بڑے بڑے کٹورے پیالی نما ہوگئے۔ مذکر چمچے نے مونث چمچی کا روپ دھار لیا۔
اور یہ سب حال حال ہی میں نہایت قلیل و تنگ عرصہ میں ہوا ہے ـــــــــــــــــــ

ـــــ اگلے وقتوں کی نہیں صرف نصف صدی پرانی بات ہے۔ گیہوں روپے کے تیس سیر چاول روپے کے پچیس سیر نخے دکھلے بازار فروخت ہوا ہے۔ قدرتی طوفان کی تباہی جان و مال کو آناً فاناً تباہ کر دیتی ہے مگر یہ چڑھتے بھاؤ کا طوفان

جان و مال کو سکرات کے عالم میں رکھتا ہے۔ ہم یہ سوچ رہے ہیں' تیز رفتاری کا یہ عالم جنس اور رقم کا تناسب اُلٹ کے رکھ دے تو کیا ہوگا ـــــــ !

تصور کی دنیا میں ہم ایک بہت ہی ترقی یافتہ شہر میں پہنچے۔ بریانی کا آرڈر دیا۔ بیرہ ایک منحنی سی پلیٹ میں کچھ چاول کے دانے' چند کارفل مٹن کے ریشے۔ ایک خوشنما ہڈی ہم وزن چاول کے ٹیبل پر نہایت خوبصورت انداز میں سجا گیا۔ غمگین ایک گرانڈشا میوزک کے فورگراؤنڈ میں ہنسی کے ساتھ ہمیں رونا آیا اور سوچنا پڑا :

" یا اللہ یہ بریانی ہے یا بر ـــ ؟"

یہی بریانی کل بڑی پلیٹ میں آتی تھی آج ساسر میں آئی ہے۔ کل چمچ میں آئے گی۔ بس چکھئے اور چلتے بنئے۔ پھر آنے والے کل کے بعد جو آنے والا کل آئے گا اس میں یہ ہوگا ـــــ ادھر آپ نے آرڈر دیا اُدھر میز والا صدا لگائے گا' بریانی مختصر کچھ ہی دیر بعد میز والا بریانی کی خوشبو ایک مخصوص نلی میں بھر لائے گا۔ آکسیجن کی طرح آپ کی ناک پر چڑھادے گا۔ ابھی آپ اچھی طرح بُو سونگھنے بھی نہ پائیں گے' میز والا سوال کرے گا " صاب چائے لاؤں " آپ " یس " کا اشارہ کر ہی رہے ہوں گے' بجلی کی سُرعت سے وہ کہے گا :

" نکالئے پچاس روپے ۹۵ پیسے۔ اور ہاں سو کی نوٹ سے کم ٹپ نہ لوں گا ورنہ ہماری یونین مجھے نوکری سے رہا کر دے گی "

آپ گھبرا جائیں گے تو وہ کہے گا :

" غالباً آپ اَن گنت ٹیکسوں کے علاوہ لائف ٹیکس بھی ادا کرتے ہوں گے۔ گھبرائیے نہیں میں ٹپ کی بل الگ سے دوں گا ـــــ "

آپ حیران' پریشان' ششدر کہ یہ ٹپ کی بل تو بجا' درست لیکن ابھی ابھی کوئی ایک برس پہلے آپ پورے اکیاون روپے بھر چکے ہیں۔ یہ آج پانچ پیسے کم کیسے ہوگئے ـــــ ؟ طنز بھرے لہجے میں میز والا کہے گا :

" غالباً آپ اخبار نہیں سونگھتے "

(ملاحظہ ہو۔ ملّا اخباری کا مضمون " پندرھویں صدی میں کیا ہوگا " صفحہ ۴۰۰/۱ پیراگراف ۴۱ سطر چھٹی۔ لکھتے ہیں :

(" وہ زمانہ ایسا ہوگا۔ نرودھ کی مدد سے آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ اخبار سونگھنے بھی نہ ملے گا۔ ڈکشنری سے اخبار بینی کا لفظ ضخیم آبادی کے تلے روندھا جائے گا' متروک ہوگا۔ بس ہاتھ کے پنکھے کی طرح لوگ اخبار کی ہوا لیں گے اور چلتے بنیں گے ..... ")

ہاں تو بیرہ کہے گا :

" آپ کو پتہ نہیں ہوٹلوں کے چڑھتے داموں پر احتجاج کرتے ہوئے چھ ماہ قبل بیچلرس بلڈنگ کے اندر ڈیڑھ لاکھ آدمی پولیس فائرنگ میں ڈھیر ہو گئے۔ تب کہیں حکومت جاگی۔ تب ہمارے سیٹھوں نے ہوٹلوں کی تشہیر کے طور پر پانچ پیسے معاف فرما دیئے "

نوٹ:۔ آج آپ یہ نہ سوچیں ایک مختصری بلڈنگ میں ڈیڑھ لاکھ اشرف المخلوقات کیونکر سما جائیں گے ؟ ــــ ناظرین! اس تاریخی حقیقت سے کیسے منہ موڑیں کہ پچھلے وقتوں میں جو بات ناممکن تھی آج سائنس کی بدولت ممکن ہو گئی۔ کہتے ہیں ہر تخریب میں تعمیر کا پہلو نمایاں طریقے سے پنہاں ہوتا ہے۔ مرحوم ہٹلر کی رُوح کو اللہ سلامت رکھے، اس کی سائنسی تجربات نے اس قدر جلد منزلیں طے کرلیں کہ صدیوں کا کام گھنٹوں میں ہونے لگا ہے۔ بیرہ نے ڈیڑھ لاکھ نفوس کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کے ختم ہوتے ہوتے امریکہ یا روس کے کسی سائنس داں کا کامیاب تجربہ ٹی وی پہ دکھا دیا جائے کہ اس نے کس طرح ڈیڑھ کروڑ انسانوں کو چیونٹیوں کے قد میں تبدیل کر کے ایک کمرے میں بسا دیا۔

معاف فرمائیں ہم اصل موضوع سے قدرے ایک ہزار میل دُور ہٹ گئے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی سائنسی ترقی ہو ــــ

الغرض آپ ضبط کر کے بیرہ سے کہنے لگیں گے :

" قبلہ محترم۔ آپ درست فرماتے ہیں لیکن گزشتہ برس جب ہم نے بریانی کا آرڈر دیا تھا تو سوئی کی نوک پر بریانی لاکے ہمیں کھلائی گئی۔ آج صرف اس کی خوشبو سُنگھائی جا رہی ہے۔ آخر یہ قصّہ کہاں دم توڑے گا :

بیرہ یہ سن کے حیرت سے آپ کو ایک ثانیہ کے ہزارویں حصہ تک گھورتا رہے گا۔ پھر مختلف قسم کے بیروں کو آوازیں دے گا۔ سب یکجا ہو جائیں گے۔ آپ کا وجود ان کے لئے سرکس کا رنگ ہو جائے گا۔ وہ بیرہ ایک نئی زبان میں ان سے آپ کے بارے میں کچھ کہے گا۔

نوٹ:۔ ہندوستان میں جس طرح مختلف زبانوں کے ملاپ سے ایک نئی (لشکری) زبان اُردو نے جنم لیا تھا، اسی طرح آنے والے دنوں میں بھارت کی سیاسی و غیر سیاسی مختلف پارٹیوں کے ملاپ سے ایک نئی زبان پیدا ہوگی جو کبھی سمجھ میں آئے گی اور کبھی کہنے والے کو خود سمجھ میں نہ آئے گی۔ قصہ مختصر آخر میں وہ بیرہ آپ کو زو کے جانور کی طرح دکھا دکھا کر دوسروں سے ہندی (بمعنی اردو) میں یوں گویا ہوگا :

" لو غور سے دیکھو۔ کیسا اُلٹا زمانہ آگیا ہے۔ یہ مسٹر سوئی کی نوک والی بریانی کی بات کر رہے ہیں یعنی ابھی تک اگلے وقتوں کے لوگ زندہ ہیں !!"

اللہ محفوظ رکھے۔ آنے والے زمانے سے۔ سنتے ہیں ایک قیمتی وقت ایسا بھی آئے گا۔ دو چار دوست راہ چلتے کسی کھانے کا ذکر کر رہے ہوں گے۔ ٹیلی پیتھی کے تحت کسی قریبی ہوٹل کا بیرہ دوڑا آگیا اور فی کس کے حساب سے بل وصول کرے گا ورنہ چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دے گا۔

کل جس طرح کسی دھات کے آخری کونے کو " ایٹم " کہا گیا، اسے توڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ آج کے سائنس دانوں نے اسے توڑا، نتیجۃً ہم دنیا دہم برہم کیا اسی طرح کسی غذائی ڈش کی حد کو انتہائی کتنی قلیل و مختصر ہوگی اسے بتا نا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ آج ہم ڈش کا صرف نام لینے ہی کو کو انتہائی تصور کر رہے ہیں (آنے والے) کل کا مورخ کیا سراغ دے گا۔ زندگی باقی رہی تو کل والے مضمون میں ہم اس کی اطلاع دیں گے۔ آج ہم بریانی کی مقدار دیکھ کر صدفی صد سچ اگل رہے ہیں کہ وہ قو ہو گئی ہے۔

برنک بریانی کے پلیٹ کی تنزل نما ترقی کی بھی مختصر سی لمبی تاریخ ہے۔ پہلے دیسی گھی اور اصلی زعفران کی بو آیا کرتی تھی جس کا ذکر تاریخ کی قدیم کتب میں درج فہرست ہے۔ پھر یہ ڈالڈا اور زعفرانی رنگ سے آراستہ ہوئی۔ چودھویں صدی کے اقوال زریں میں ذکر خیر ملتا ہے۔ اس کے بعد گھٹنے لگی تو "بریان" ہوگئی۔ یہ ہماری نوجوانی کے دنوں کی بات ہے۔ چوتھا نمبر "بریا" کا آیا (غالباً گوا اور دمن فتح ہو چکا تھا)۔ پانچویں میں وہ "بر" ہوئی۔ آگے گردان آپ خود مکمل کرلیں۔ مناسب رہیگا کیونکہ ہمارے قلم کی سیاہی ختم ہو رہی ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے، یہ راقم الحروف صرف بریانی کے پیچھے کیوں پڑگیا تو عرض یہ ہے کہ اگر جملہ اشیاء کا جائزہ لیا جائے، ان کے دبلے ہونے کی وجہ پر ریسرچ کی جائے تو ہمیں ڈر ہے بے چارے مصطفےٰ کمال اس فکر میں دبلے نہ ہو جائیں۔ بقول شاعر

"بڑی مشکل سے ہڈی پر ہوا ہے اک "مٹن" پیدا"

پھر بھی آپ کی تسلی کے لئے نان ویجی ٹیبل ہوٹلوں کی ایک مختصر سی فہرست ملاحظہ ہو :-

- بریانی سے بر۔ — لقمی کا صرف لام رہ گیا ہے۔ — کباب کھاتے جایئے کب کھایا؟ یہ بھول جایئے۔
- مرغ کی جگہ چکن نے لی ہے اور چکن منگوایئے تو یوں سمجھئے بے بال و پر کا ایسا پرندہ جو عنقا ہو چکا ہے۔
- افیونچی قسم کے لوگوں کے لئے پہلے کھڑا پیچ چائے مشہور تھی۔ بزرگان بے دین فرماتے ہیں اس چائے کی پیالی کو اگر شکر کی پیالی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کپ کے بیچوں بیچ چمچہ کوئی جھنڈے کے بانس کی طرح اپنے ہی محور پر کھڑا کھڑا گھوما کرتا۔ اس کے بعد بے چارہ نظروں سے ایسا گرا، بس غائب ہی ہوگیا۔ — بلا مبالغہ نہاری پہلے بڑے پیالہ (کٹورے) میں آتی تھی۔ بھوک پیاس کے اس پانی پر قدیم ہندوستان کے غریب غربا، صدیوں پلے ہیں۔ اب مبالغہ کے ساتھ گڑیوں کے جہیز والی پیالی میں ملتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ نہاری کے اس پانی کو ہوٹل سے خرید فرما کر گھر تک لے جایئے اسپرٹ کی طرح اُڑ کر آدھا رہ جاتا۔
- پہلے صرف ایک شیرمال سارے محلہ کے لئے کافی تھا اور ایک کلچہ "ہم دو ہمارے دو" کے لئے ناشتہ میں کافی ہی نہیں بچا کچھا فقرا و مساکین میں تقسیم ہو کر ڈھیر ساری دعاؤں کا سرچشمہ ہوا کرتا۔ آج کئی کئی شیرمال ایک اکیلے شیرخوار کے لئے کافی نہیں۔

ویجی ٹیرین ہوٹلوں کا حال اور بھی نرالا ہے :

- آج دوشا کے معنے ہیں کھانے والے کو خواہ مخواہ دھوکہ دینا۔ — فل پلیٹ دہی وڑہ منگوایئے تو نمونہ ملاحظہ ہو کی طشتری آتی ہے۔ — اُپما کھاتے سمے اپنے پیٹ کے اپمان کرنے کا خیال آتا ہے۔ — آلو وڑہ ٹینس کے بال جیسا ہوا کرتا تھا آج کل آنکھ کی پتلی کے مماثل ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بہت پرانی نہیں بچپن کی بات ہم بتائیں۔ ویجی ٹیرین ہوٹل کی کوئی ایک پلیٹ صبح صبح منگوا کر کھا لیجئے۔ شام تک کے لئے بھوک مر جاتی تھی۔ ہر وقت یوں لگتا جیسے ابھی ابھی کوئی مزیدار کھانا کھا چکے ہیں۔ آج ہمارے بچے اڈلی وڑہ، دوشا وغیرہ کی کئی کئی پلیٹیں چٹ کرتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں " ابا۔ اور بھوک لگی ہے" گویا

بھوک مٹانے کی چیز نہ ہوئی بھوک لگنے کی دوا ہوئی ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے جب بھی کسی مدراسی ہوٹل میں ہم پلیٹوں پہ پلیٹیں صاف کرتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کھانا نہیں سکرات میں سانس لینے کی پریکٹس کر رہے ہیں ۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس زمانہ میں مزیداری کی تعریف کرنا بھری بزم میں مادر زاد گالی دینا ہے ۔

ہاں ایک زمانہ تھا جب ہوٹل بازی معیوب تھی 'خلاف فطری فعل تھا ۔ ہم اپنے بڑے ابا کے ساتھ نادانی میں ضد کر کے کسی ہوٹل میں جا گھستے اور باورچی کی نادانی سے کوئی ڈش اتفاقاً اک ذرا بدمزہ پائی جاتی تو سارے ہوٹل میں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ۔ مالک ہوٹل دوڑا آتا ۔ بصد احترام پگڑی اتار کر ہمارے پیروں پہ رکھ دیتا ۔ گڑگڑاتا کہ یہ بات ہوٹل کے باہر نہ جائے کیونکہ اسے اپنے نام اور ہوٹل کے وقار کی ہر دم فکر تھی ۔ اس کے دل میں خدا اور بھگوان کا خوف تھا۔ آج کے مالک کے دل میں بینک بیلنس کا خوف ہے ۔ خدا بھگوان دل سے نکل کر طغروں' تصویروں کی شکل میں ہوٹل کی دیواروں میں آویزاں ہو گئے ہیں ۔ آج کا گاہک بھی عجیب ہے ۔ چپ چاپ الابلا جو ملے نصیب سمجھ کر یوں کھا لیتا ہے جیسے اس کے منہ میں زبان ہی نہ ہو اور کہا یہ جاتا ہے کہ قیامت کے قریب مزیداری اٹھا لی جائے گی ۔ قیامت کے لئے ابھی کتنے برس باقی ہیں یہ اللہ ہی جانے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہوٹل مالکین اس روایت کا آج خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ گویا " آنے والے کو آنا ہوگا ۔ کھانے والے کو کھانا ہوگا ۔"

غرض کہاں تک زلف ہوٹل کی گرہیں کھلتی جائیں ۔ مبادا کہیں کسی ہوٹل کی موٹی توندنے ہمارا پیچھا کیا تو سمجھئے ہم اپنے اس مضمون کے خالی پیٹ ہی خدانخواستہ خدانخواستہ زندہ درگور نہ کر دئیے جائیں' یا ہمارے فرشتے کسی مالک ہوٹل کے فرشتوں سے مل کر یہ کہہ دیں :

" ہمارا آدمی تمہارے آدمی کو بشکل مضمون گالی دے رہا ہے ۔ تو ۔ تو ۔ تو ۔"

قلم امر' اکبر' انتھونی کا گانا بج جائے گا تو جان کسے پیاری نہیں ہوتی ۔ ایسے مضمون سے اپنی ہی جان پر آ بنے ۔! نہ بابا ہم ہاتھ دھرئے ایسے مضمون ۔ اس لئے ہم اسے " نذر ردی (ٹوکری) " کرتے ہیں اور اگر ہمارے ایڈیٹر دوست جناب مصطفےٰ کمال ہماری نظروں سے بچا کر ٹوکری سے اٹھا لیں اور چھاپ دیں تو بخدا ساری ذمہ داری ایڈیٹر پرنٹر' پبلشر کی گردن پر ہے ۔ اے مالکان ہوٹل کیفے و رستوران ! براہ کرم ایڈیٹر صاحب کی گردن ناپئے ۔ ہم پر رحم فرمایئے کیونکہ رحم کرنا عین ہندو انسانیت ہے' مسلم انسانیت ہے ۔

مچھر

ہمارے شہر کے مچھر انوکھے جگ سے نیارے ہیں
ہماری بلدیہ بورلسی ہے یہ اس کے سہارے ہیں
ہماری بلدیہ کی آنکھ کے دمدار تارے ہیں
اگر ہے بلدیہ اپنا تو مچھر بھی ہمارے ہیں

نہا دھو کر وہ ڈی ڈی ٹی سے ٹِک ٹونٹی جو کھاتے ہیں
ہوا میں مست ہو کر جھومتے کورس میں گاتے ہیں

یہ مچھر ہیں مگر اُڑتے ہوئے خونخوار چیتے ہیں
ہماری بلدیہ کے لاڈلے اس کے چہیتے ہیں
وہ ہم کو چوستی ہے یہ ہمارا خون پیتے ہیں
کرم دونوں کا ہے اب تک جو ہم مر مر کے جیتے ہیں

ہمارا ان کا رشتہ خون کا ہے خاندانی ہے
ہم اُن کے ہیں، اگر زندہ ہیں ان کی مہربانی ہے

ہمارا خوبصورت جسم دسترخوان ہے ان کا
رگوں میں اپنے جو بہتا ہے خوں پکوان ہے ان کا
ہماری ناک ہے ان کی ہمارا کان ہے ان کا
ہماری مانگ پگڈنڈی تو سر اک لان ہے ان کا

موافق ہے زمینِ ہند کی آب و ہوا ان کو
نہیں چھوتی نہیں چھوتی نہیں چھوتی قضا ان کو

●

کالوجی رامیشور راؤ شاد

ہزل

فائدہ مند جو ثابت ہوا پینا پیشاب
ڈر یہی ہے کہیں ہو جائے نہ عنقا پیشاب
اک مہاشے نے کہا جب سے اِسے "آبِ حیات"
سارے مرضوں کی دوا بن گیا گویا پیشاب
ڈر سے پیشاب خطا ہونے کا اب ڈر نہ رہا
اب تو ڈھونڈے سے ملے گا نہ ہمارا پیشاب
ہوٹلوں میں یہی کہتے نظر آئیں گے گگی
بوائے، لے آنا ذرا بھر کے پیالہ پیشاب
بورڈ آویزاں نظر آئیں گے دوکانوں پہ
اتنا عمدہ نہ ملے گا کہیں سستا پیشاب
کیا تعجب کہ یہ کہتے نظر آئیں کل لوگ
ہم نے مہمانوں کو جی بھر کے پلایا پیشاب
ختم کرتا ہوں یہی کہہ کے ہزل کو محبوب
ہو مبارک تمہیں ہر صبح کا پینا پیشاب

●

محبوب ماہجوی

شکیل رضا (بجنور)

محاورے

عروج ادب کے ایک ادبی جلسے میں محاوروں پر مضامین کی بھرمار بلکہ برسات سی ہو رہی تھی اور برساتی مینڈکوں کی طرح ہر کوئی محاوروں پر اپنی معلومات کا اظہار اس شان بے نیازی سے کر رہا تھا جیسے سارے شہر میں وہی ایک ہے جس کے کندھوں پر محاورے لدے ہیں! ایک طرف قلمکار حضرات اپنے مضامین اس طرح مزلے لے لے کر سنا رہے تھے جیسے کوئی انتہائی بھوک کی حالت میں کسی گھٹیا شراب کی دوکان میں بکنے والے شامی کباب نوش کر رہا ہو۔ دوسری طرف سامعین حضرات اس قدر توجہ اور سنجیدگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے سن رہے تھے جیسے کوئی دیہاتی کسی بہت بڑے عالم و مفکر کی کوئی نرالی بات سن رہا ہو!!

محاورے جس کا سہارا لے کر کوئی صاحب مغلیہ تاریخ کی دھجیاں اڑا رہے تھے کوئی اپنے ہپی جیسے سر پر ہلمٹ رکھے ہوئے طنز و مزاح کے گھوڑوں پر سواری فرما رہے تھے، اور ایک صاحب تھے جنھیں اپنی علمی ادبی معلومات پر زعم ہے وہ اپنی عمر سے زیادہ کی عینک لگائے "ٹرانک ویک" کے بیانہ پڑھنے میں مشغول تھے! جب یہ صورت حال ہماری نگاہوں کے سامنے کسی شاعر کی مفلسی کی طرح بے نقاب ہوئی تو ہم نے سوچا کیوں نہ ہم بھی اس موقع و محل سے فائدہ اٹھائیں۔ موقع سے فائدہ اٹھانے والا محاورہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ پھر ہم کہاں چھوڑنے والے تھے کوئی چیز مفت میں ملے اور کوئی اسے ٹھکرا دے تو لوگ اسے نرا بدھو ہی کہیں گے۔ ہاں صاحب لوگوں کا کام ہی بس کہتے رہنا ہے اور لوگ جب کہنے پر اتر آتے ہیں تو نہ جانے کیا کیا کہہ دیتے ہیں اور پھر لوگوں کے کہنے کا وہ منظر ... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی گلی و کوچہ میں گدھوں کے پیچھے کتے بھونک رہے ہیں۔ بھونکنا تو آج کل ایک فیشن بن چکا ہے! فیشن تو خیر فیشن ہے۔ چاہے وہ امریکہ

سے آئے چاہے انگلینڈ یا پولینڈ سے ... بہرحال بھونکنے والی زبان کو کوئی روک نہیں سکتا۔ آپ نے وہ کہاوت تو ضرور سنی ہوگی کہ بڑے سے بڑے گھڑے کو بند کر سکتے ہیں مگر لوگوں کی زبان کو بند کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

خیر جناب من اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر ہم جلد از جلد اپنے مکان پہنچنا چاہتے تھے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہمیں صرف اپنے مکان ہی پہونچنا تھا۔ کسی کی گردن تو کاٹنا نہیں تھا کیونکہ اکثر لوگ کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے کبھی گدھے کو اپنا باپ بنا لیتے ہیں تو کبھی اپنے دوست کی گردن بھی کاٹ دیتے ہیں ـــــ مگر جلسہ تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ "شیطان کی آنت" اس لئے کہ یہ بھی ایک محاورہ ہے۔ اسی محاورے سے ملتا جلتا ایک اور محاورہ بھی آپ نے سُنا ہوگا وہ ہے" دانت ہیں تو آنت ہیں" ! ارے صاحب کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ دانت اور آنت میں کیا تعلق ہے۔ تعلق تو میاں بیوی میں ہو سکتا ہے چولی دامن کا ہو سکتا ہے۔ چاند اور چکور کا ہو سکتا ہے مگر یہ دانت اور آنت کا تعلق تو ذرا نرالی چیز ہوئی یہ تو وہی بات ہوئی جیسے مارون گھٹنا تو پھوٹے آنکھ۔ خیر صاحب کہنے کو تو آج کے زمانے میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر مسلمانوں میں کبھی اتفاق و اتحاد نہیں ہو سکتا کیوں کہ پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا اور ہم بھی اسی خیال کے پیشِ نظر جلسے کے برخواست ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ انتظار جو اس صدی کی سب سے بڑی دین ہے۔

لوگوں پر جب بُرا وقت پڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ خدا یاد آتا ہے۔ اسی محاورے کے مصداق جب خدا خدا کرکے جلسہ برخواست ہوا تو بڑے طمطراق کے ساتھ ہم چلے اپنے دولت کدے کی طرف۔ ایک صاحب جو خراماں خراماں ہمارے ساتھ چلے آرہے تھے۔ اب آپ خود ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہاں پر ہم نے خراماں خراماں کیوں لکھا ہے! راستے میں ان صاحب نے اپنے مضمون کے بارے میں ہم سے پوچھا کہ ان کا محاورہ والا مضمون ہمیں کیسا لگا تو محض بات کو ٹالنے کی خاطر ہم نے ان کے مضمون کی تعریف کردی ہماری تعریف پر وہ لگے اترانے اور اسکا ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم آئندہ سے چھوٹے منہ بھی کسی کی تعریف نہیں کریں گے۔ محاورہ "چھوٹے منہ" کی جگہ اگر کھوٹے منہ یا لوٹے منہ ہوتا تو ہم اسی کو استعمال کرتے ـــــ !!

خیر بھائی جان۔ کسی طرح ہم نے ان صاحب سے پیچھا چھڑایا اور جیسے ہی اپنے دولت کدے کے آنگن میں قدم رنجہ فرمایا تو ہماری آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ ہماری آنکھیں حیرت سے کیوں پھیلنے لگی تھیں یہ تو آپ خود ہی سمجھ گئے ہونگے اگر آپ کسی وجہ سے سمجھ نہیں سکے ہیں تو چلئے ہم خود ہی سمجھائے دیتے ہیں۔ ہماری آنکھیں حیرت سے پھیلنے کی وجہ ' ایک تو یہ تھی کہ حیرت سے آنکھوں کا پھیلنا تو خیر محاورہ ہے ہی مگر دوسری وجہ یہ ہوئی تھی کہ ہم نے جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا تو ہم نے دیکھا کہ ہماری بیگم صاحبہ اپنی دم چھلّہ میں باندھ رہی ہیں ـــــ

پچھلے زمانے میں لوگوں کا یہ چلن تھا کہ وہ اپنے ساتھ ایک عدد "جی حضور" یعنی دُم چھلّہ رکھا کرتے تھے۔ آج کا زمانہ تو زبان کا زمانہ ہے اسلئے لوگ اپنے دُم چھلّے کو چمچہ کہا کرتے ہیں!

جب اپنی بیگم صاحبہ کو اپنا دم میں چھلّہ باندھتے دیکھ کر ہم نے پوچھا کہ بیگم صاحبہ یہ آپ دم چھلّہ کیوں باندھ رہی ہیں تو جناب عالی اب ہم آپ سے کیا بتائیں۔ ہمارے اس طرح دریافت کرنے پر بیگم صاحبہ کو کس قدر طیش آیا اور جب کبھی بیگم صاحبہ

طیش آگئے تو ان کی چڑھتی ہوئی جوانی کے نشے میں ڈوبی ہوئی لال آنکھیں اور لال ہو جاتی ہیں اور جناب طیش میں آنکھوں کا لال ہونا تو خیر ...... سمجھ گئے نا آپ !!

خیر صاحب بیگم صاحبہ ہماری بات پر بہت برہم ہوئیں اور کہنے لگیں کہ دیکھو جی! کان کھول کر سن لو۔ آئندہ سے ہمارے کتے کو دم چھلا نہ کہا کرو۔ ہاں ۔ ہم کیا ایسی نمائش پسند کریں گے کہ کتے کو ساتھ لے کر تفریح کے لئے جائیں۔ تو کہنے لگیں کہ آج خواتین کے کلب میں کتوں کی نمائش لگنے والی ہے۔ جب پڑوس کے سبھی لوگ اپنے اپنے کتوں کو لے جا رہے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ لے جائیں ؟

لیجئے صاحب اور سنئے! یہ عجب نرالی بات ہوئی۔ بچپن میں ہمارے دادا جان مرحوم کہا کرتے تھے خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یہ جنت نصیب ہونا بھی آج کل ایک محاورہ بن گیا ہے۔ ▼▼

ہمارے منصوبوں کو کامیاب ہونا چاہیئے

ہمارے پانچسالہ منصوبوں کا مقصد فیصلہ کن انداز میں ملک کے مستقبل کی تشکیل جدید عمل میں لانا ہے ۔ برسوں سے ہمارے منصوبے ملک کی معاشی ترقی کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرتے آرہے ہیں۔ آندھرا پردیش میں قومی تعمیر کی سرگرمیوں پر ان منصوبوں نے پائیدار اثرات مرتب کیے ہیں۔

معاشی ترقی کے معاملے میں پانچواں منصوبہ سب سے زیادہ امید افزا ثابت ہوا ہے۔ منصوبے کے تحت اخراجات کی گنجائش سال ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۹۳ کروڑ روپے تھی جو بڑھکر ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۱۴۸ کروڑ روپیے - ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۲۰۳ کروڑ روپے - ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۹۸ کروڑ روپے اور ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۳۸۴ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں منصوبے کے تحت فراہم کی جانے والی گنجائش ۵۰۴ کروڑ روپیوں تک پہنچ جائیگی ۔ اسی طرح سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں منصوبہ جاتی اخراجات کی رقم پورے چوتھے منصوبے کی رقم کے تقریباً مساوی ہوجائے گی ۔ جو ۹۹۴ کروڑ روپے تھی۔ پانچویں منصوبے کی پوری مدت کے دوران ۱۴۸۰ کروڑ روپیے سے زائد رقم خرچ ہوگی جو چوتھے منصوبے کے اخراجات سے تین گنا زیادہ ہے۔

ہمارے منصوبوں کی کامیابی کی صورت میں ہی
عوام خوشحالی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

د 8/77-78

غزل

[illegible]

ہر قدم پر اٹک اٹک کے چلتے ہیں
پاؤں اپنے بہک کے چلتے ہیں

جب بھی چلتے ہیں میکدے کی طرف
شیخ صاحب سنک کے چلتے ہیں

ہم نے دیکھا ہے ان کی نظروں میں
سینکڑوں دل لٹک کے چلتے ہیں

دیکھتے ہیں جو ان کی پرچھائیں
راستے سے بھٹک کے چلتے ہیں

جب کہا ان سے گھومنے کے لئے
بولے چاول پھٹک کے چلتے ہیں

چشم دشمن میں خار ہیں بانکے
اس لئے ہم کھٹک کے چلتے ہیں

٭

ھزل

محمد جمال الدین نیاز ، کریم نگر

سینماں یا ہوٹلاں ہیں گھر کو جارا نئیں کتے
دوستوں میں سب لٹارا گھر کو ماشہ نئیں کتے

آج کل کے فیشناں بھی کچھ عجیب ہوگئیں
اچھا خاصہ ہے سو لڑکا وہ بھی لڑکا نئیں کتے

خوب اُگالو بول کر اک چانس دیں اللہ میاں
ہوگی پورے سال بارش گرمی جارا نئیں کتے

لوگرانی کی اسے بھی لگ گئی ہوں گی ذرا
سب پریشاں ہیں کہ بچہ کچھ بھی کھارا نئیں کتے

شاعراں غمگین ہو رئیں کیوں منجے یاں دیکھ کو
شاعراں تو سب ستارئیں میں سنانا نئیں کتے

شاعری کو تو بنالیں اک تماشہ سب نیاز
ناچ رئیں گارئیں سو لوگاں وہ تماشہ نئیں کتے

٭

پیروڈی[۱]

صابر بہاری ، رانچی

حسرت آتی ہے وطن کے زباں پر میری
سبز قدمی سے میری سب کا گھٹالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
زندگی ہو میری خود غرضوں کی صورت مولا
ہو مرا کام غریبوں کو مصیبت دینا
اے تعفن میرے برائی پہ لگانا مجھ کو

زیست نیتاؤں کی صورت ہو سراسر میری
قوم کا میری نحوست سے دیوالا ہو جائے
جس طرح ہوتی ہے کانٹوں سے چمن کی زینت
حق سے ہو بیر، صداقت سے ہو نفرت مولا
اپنی کرتوت سے جنتا کو اذیت دینا
راہ شیطان پہ ہر وقت چلانا مجھ کو

٭

[۱] روحِ علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ

نظام الدین نظام دہلوی

آپ کے ستارے

مورخہ ۲۴ سے ۳۱ تک

اپنے نام کا پہلا حرف تلاش کیجئے اور دیکھئے کہ ہفتہ کیسے گذرے گا؟

ستارہ مریخ - ا - ل - ع

جمعہ کی صبح سے اتوار کی شام تک سفر کے امکانات ہیں۔ کوشش کیجئے کہ ٹکٹ کی رقم جمع ہو جائے، ان دنوں امریکہ پر زحل سوار ہے اس لئے ٹکٹ چیکر بھی وقت بے وقت ڈبے میں سوار ہو سکتے ہیں۔ پیر کی صبح سے بدھ کی دوپہر تک پہلی محبوبہ کے پانچویں لڑکے سے ملاقات ہو سکتی ہے، محتاط رہیں۔ بدھ کی دوپہر سے جمعرات کی شام تک غیر مساوی گذرے گا۔

ستارۂ عطارد - ق - ک - چھ

جمعہ کی صبح سے اتوار کی دوپہر تک کام (دوسروں کے کام) چلتا رہے گا۔ اتوار سے منگل تک عطارد پر مریخ غالب ہے اس لئے آپ پر بیماری کا غلبہ ہو جائے گا، علاج بھی فائدہ نہ دے گا۔ مگر موت بھی نہ آئے گی۔ منگل کی شام سے جمعرات کی شام تک اگر موت کی دعا مانگو تو مراد بر آئے گی۔

ستارہ زہرہ - ب - د - او

جمعہ کی صبح سے پیر کی شام تک جتنی آمدنی ہوگی پیر کی شام سے بدھ کی شام تک اُس سے دگنا خرچ ہوگا، اس لئے ابھی سے قرض حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دیجئے۔ بدھ کی شام سے جمعرات کی شام تک بیوی سے جھگڑے کے امکانات ہیں پڑوسی پر نظر رکھیے۔

ستارۂ قمر - خ - ھ - ڈھ

جمعہ کی صبح سے پیر کی شام تک دل کی دھڑکن تیز رہے گی، حسینوں سے دور رہیں۔ پیر کی شام سے بدھ کی صبح تک کہیں سے بُری خبر آئے گی۔ تکلیف ہو سکتی آجائے۔ بدھ کی دوپہر سے جمعرات کی شام تک راجع قمر کا دماغ پر گہرا اثر پڑے گا۔ احتیاط لازم ہے صحت مند لوگوں سے الگ رہا جائے۔

ستارۂ شمس - م - ٹ

جمعہ کی صبح سے اتوار کی شام تک لین دین میں کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے - لین کسی حد تک مناسب بھی ہے مگر دینے سے احتراز کریں - پیر کی صبح سے جمعرات کی شام تک دوست کو دل کی بات بتاؤ گے تو آخری دم تک پچھتاؤ گے - اس لئے کسی دشمن سے رابطہ قائم کیا جائے -

ستارۂ مشتری ف، بھ

جمعہ کی صبح سے اتوار کی دوپہر تک نزلہ کا حملہ رہے گا مگر رومال پاس نہ ہونگے، دوستوں کے رومال چُرا کر جمع رکھیئے۔ اتوار کی شام سے جمعرات کی سہ پہر تک بے چینی پیدا کرنے والی خبر آتی ہوگی اسلئے

اس دوران گھر سے باہر رہیئے -

ستارۂ عطارد - پ - ٹھ

جمعہ کی صبح سے سنیچر کی شام تک غیر مساوی گذرے گا اولاد سے پریشانی، بیوی سے لڑائی، دوستوں سے جھگڑا رشتے داروں سے تکرار ہفتہ بھر ساتھ رہیں گے۔ اتوار کی شام سے جمعرات کی شام تک اسپتال میں رہنا ہوگا - کوشش کروگے تو تکلیف پہنچانے والا دوست بھاگ جائے گا یا دشمنی چھوڑ دے گا، مگر حوالات تب بھی نہ جاسکے گا اسی لئے کوشش بیکار ہے-

ستارۂ زحل - ح - ز - خ - غ - گ

جمعہ کی صبح سے اتوار کی شام تک کوشش کرو کہ اپنے دوست کی بیوی سے بات چیت نہ ہو ورنہ دشمنی کے امکانات ہیں - اتوار کی شام سے جمعرات کی سہ پہر تک زحل برسرِ چڑھا رہے گا اس لئے لازم ہے کہ دشمن چڑھائی کرے گا۔

زنگ خوردہ ہتھیاروں کو تیز کرلیں۔

ستارۂ زہرہ - ر - ت - ل - ط - ی

جمعہ کی صبح سے اتوار کی شام تک مفید گذریگا مفت کا مال ہاتھ آنے کے امکانات ہیں، اتوار کی ریس میں ضرور حصہ لیں -

اتوار کی شام سے جمعرات کی دوپہر تک خرچ پر دلالت کرتا ہے مگر خرچ گھر آئے ہوئے مہمانوں کا ہوگا -

ستارۂ شمس - د - ذ - ظ - ص - ش - ...

جمعہ کی صبح سے اتوار کی شام مہمانوں کی آمد متوقع ہے اس لئے بہتر ہے کہ سفر کریں۔ اتوار کی شام سے جمعرات کی شام تک گھر کی چھت گرنے کے امکانات ہیں۔

اس دوران مہمانوں کو خوش آمدید کہہ سکتے

(ختم شد)

حامد ندیم (ٹنک)

ایسی بیوی ملے خدا نہ کرے

اٹھاتی ہیں قیامت جب کہ یہ میکے سے آتی ہیں ❊ نہ جانے کون سی لپسٹک یہ اپنے ساتھ لاتی ہیں
خوشامد کرتے کرتے جبر یہ چولھا جلاتی ہیں ❊ چڑھا کر دیگچی چولھے پہ اکثر بھول جاتی ہیں
سناتی ہیں یہ صلواتیں جو گھر ہم دیر سے لوٹیں ❊ ہمیشہ بدمزاجی کا ہمیں ٹانک پلاتی ہیں
شرارت کھیلتی رہتی ہے آنکھوں میں سدا ان کی ❊ پٹاخہ بن کے پھٹتی ہیں بگولہ بن کے چھاتی ہیں
لئے رہتی ہیں بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس کی ڈگری ❊ جو پوچھو لفظ کے معنی تو اپنے منہ کی کھاتی ہیں
ضروری ہے ہر اک سنڈے کو پکچر ہال میں ہونا ❊ نہ ہو پوری جو فرمائش تو گھر سر پہ اٹھاتی ہیں
فلاں ساڑی دلا دیجئے، فلاں زیور بنا دیجئے ❊ ہماری جیب کی پروا نہیں اپنی سناتی ہیں
کبھی بھی قورمہ میں شوربہ ان کے نہیں ہوتا ❊ یہ بریانی کو فرنی کی طرح پتلا پکاتی ہیں
بھرا رکھا ہوا ہے جب بھی دیکھو ناک میں غصہ ❊ یہ سیدھی بات کا اکثر جواب الٹا سناتی ہیں
جو ٹائی باندھتے ہیں ہم تو لگتا ہے برا ان کو ❊ مگر میک اپ میں گھنٹوں کیا یہ پہروں خود لگاتی ہیں
یہ ہرگز خوش مزاجی سے کبھی ہم سے نہیں ملتیں ❊ ہو جب تاریخ پہلی پیار سے باہوں میں آتی ہیں
عجب ان کا طریقہ ہے عجب ان کا سلیقہ ہے ❊ بتائیں کیا تمہیں حامدؔ! یہ کیا کیا گل کھلاتی ہیں

تلاش میں ہے

قادر کلیم پیلدی

مرا خراب مقدر مری تلاش میں ہے　　کہ روز اک نیا چکر مری تلاش میں ہے
عجیب عقل کا اندھا ہے میرا دشمن بھی　　میں جیل میں ہوں وہ باہر مری تلاش میں ہے
میں جس کی پہنے ہوں پتلون وہ قمیض سے　　سنا ہے اب وہ رفوگر مری تلاش میں ہے
چرا کے پڑھتا ہوں محفل میں جس کی میں غزلیں　　سنا ہے اب وہ سخنور مری تلاش میں ہے
چپت لگا کے میں بھاگا تھا جس کے بچپن میں　　سنا ہے اب بھی وہ ٹیچر مری تلاش میں ہے

اکیسویں صدی

ایم۔ تسلیم
بھوپال

ضرورت رشتہ

ایک قبول صورت خاتون کے لئے ایک (فی الحال) اچھے رشتے کی ضرورت ہے۔ خاتون ڈبل ایم۔اے ہے۔ اور "انجمن بیگمات" کی صدر ہے۔ گھریلو کام کاج میں ماہر ہے۔ امیدوار ذیل کے پتے پر خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

نوٹ:۔ (۱) ہر درخواست مسرت کے ساتھ بیس روپے کا ایک کراسڈ پوسٹل آرڈر آنا ضروری ہے۔

(۲) براہ مہربانی پہلے ہی سے شوہر نظر آنے والے "مرد" اپلائی نہ کریں۔ (۳) ماہر رقص کو ترجیح دی جائے گی۔

انجمن بیگمات
نزد دفتر "طلاق و نجات"۔ تھانہ روڈ، پریم پور

شادی سے پہلے، شادی کے بعد

شوھر: "لیکن شادی سے پہلے "ضرورت رشتہ" کے اشتہار میں تو دیا گیا تھا کہ تم گھریلو کام کاج میں ماہر ہو":

بیوی: "ہاں دیا تو تھا۔ کیا تم کو انگلیوں پر نچانا گھریلو کام نہیں۔ تم سے برتن اور کپڑے دھلوانا، جھاڑو لگوانا اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ہدایتیں دینا یہ سب گھریلو نہیں تو کیا بازاری کام ہیں":

شوھر: "میں کل سے یہ کام بالکل نہیں کروں گا":

بیوی: "تم نہیں کرو گے تو کیا میں کروں گی؟ تمہیں معلوم نہیں میں "انجمن بیگمات" کے علاوہ "طلاق و نجات" انجمن کی سکریٹری بھی بن گئی ہوں۔ میرا دو سہیلیوں کے شوہروں کو گھٹنے ٹکا کر حلق حلق پانی پلوا چکی ہوں۔ ہاں تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔ دو منٹ میں طلاق نامہ ہاتھ میں پکڑا کر تمہاری دنیا و آخرت برباد کر دوں گی":

شوھر: "طلاق نامے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی فرار نامہ مرتب کر رہا ہوں":

تلاشِ گم شدہ

میرے خوہر، نام ..... (فی الحال یاد نہیں آرہا)، رنگ گورا چٹا اور قد ..... میرے ہی برابر۔ صورت سے کئی بچوں کے باپ معلوم ہوتے ہیں (لیکن درحقیقت دونوں بچوں کی صورتیں ان کی صورت سے نہیں ملتیں) سر پر چاندنی (گنج) ہے (جو شادی کے بعد کھلی ہے) ایک ہفتہ سے گھر سے غائب ہیں، جن صاحب کو ملیں ذیل کے پتے پر ارسال فرمائیں یا خود لے کر آئیں۔ لانے والے کو آنے جانے کے کرائے کے علاوہ ان کی لائی ہوئی آیا بھی بطورِ انعام پیش کی جائے گی۔

پیارے !

میرے آرام کے سہارے !

تم جہاں کہیں بھی ہو اور اگر بقیدِ حیات ہو تو یہ اشتہار پڑھ کر فوراً گھر کی طرف کوچ کرو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تم سے کوئی بھی گھریلو کام کرواؤں گی اور نہ اپنے کپڑے دھلواؤں گی۔ یہاں تک ہی نہیں بلکہ تم پر اب ہاتھ بھی نہ اُٹھاؤں گی۔ بے خوف و خطر چلے آؤ، امی بھی واپس جا چکی ہیں۔

نوٹ :- بچوں کا ہوم ورک بہت اکٹھا ہو گیا ہے، فوراً آؤ۔

گھر کے کاموں سے پریشان

تمہاری

"گھروالی"

معید عالم
(متعلم ایم اے پٹنہ)

میں پڑھنا چاہتا ہوں

آیا ہمارے دیش میں ایک خوشنوا فقیہہ
آیا اور اپنی دھن میں غزلخواں گذر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدہ کا نصیبہ سنور گیا

"واقعی فیض احمد فیض نے اقبال کی شان میں کیا خوب کہا ہے۔ شاعرِ مشرق، ترجمان حقیقت، علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ کے یہاں تخیل کی بلندی، تصوّر کا انوکھا پن، تنوع فکر، فصاحت بیانی، معنی آفرینی اور فلسفہ بے مثال ہے۔ ابھی اتنا ہی پڑھ پایا ہوں کہ نگاہیں کتاب سے جمی ہوئی ہیں اور دماغ اڑ کر کلاس میں پہنچ گیا ہے۔

کلاس میں تو ساری لڑکیوں کی جسامت قریب قریب ٹھیک ہی ہے۔ لیکن یہ ایک موٹی لڑکی کہاں سے چلی آئی ہے! سنا ہے فرسٹ کلاس ہے۔ ہاں بھئی اب تو سامنا اس سے بھی ہے۔ بہت پڑھنا پڑے گا۔ وہ تو جسم کے لحاظ سے دماغ بھی رکھتی ہوگی۔ خیر کچھ بھی ہو میں تو اس سے مسابقت میں پڑھوں گا۔ اور ہاں اسلم آزاد صاحب کہہ رہے تھے کہ روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ وقت لائبریری میں دیا کرو۔ واہ! آج تو مزا ہی آگیا لائبریری میں۔ نہ جانے کہاں سے آئی تھی۔ ایک لال پیرہن تھا اور ایک چمکیلی سی ڈائری۔ نہ جانے "روبی" کا کونسا شعر انہیں پسند آگیا تھا بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھ رہی تھی۔ ارے ہاں پٹنہ مارکیٹ میں بھی تو انہی سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ ایک بار جب کہ وہ ایک گھڑی کی دکان میں "ثریا" گھڑی کی قیمت پوچھ رہی تھی۔ میں اس انداز سے اس کی طرف گھور رہا تھا کہ وہ سمجھ نہ پائے۔ یکایک میری طرف دیکھ کر مسکرا دی غضب کی مسکراہٹ تھی اس کی۔ قیامت تھی قیامت۔

چھی۔ تو یہ کیا سوچ رہا ہوں۔ لے صاحب کل تو یف خورشیدی صاحب سے سامنا ہے۔ پڑھ کر تو جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ بقول ان کے میرے لئے قیامت صغریٰ آ ہی جائے گی۔ آج ہی تو بور ہوئے تھے کلاس میں۔ ایسا نہ ہو کہ کل بھی بور ہونا پڑے۔ اسلم آزاد صاحب نے پوچھا بھی تو جگر کا شعر جو مجھے یاد ہی نہیں۔ غچہ دینے کے طور پر ہکلاتے ہوئے میں نے انھیں یہ شعر سنایا۔

زرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی ہے

سوچا تھا نشانہ ٹھیک ہوگا۔ لیکن بدقسمتی میری کہ شعر فراق گورکھپوری کا نکلا۔ خیر بھئی شعر کسی کا بھی ہو اندازِ بیان تو میرا تھا شاندار تھا کہ وہ میری داد دینے لگے۔ انھوں نے کہا تھا کہ تم نے کباڑا ہی نکال دیا شعر کا۔ خیر جو بھی ہو شرم سے تو میری نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ مڑ کر لڑکی کو دیکھنا شروع ہی کر دیا۔ کسی نے کہہ دیا کہ کلام وارے تشبیہ دی تو کسی نے اس پر بھی آگے کہہ دیا۔ اب جو نگاہ ہوا سے لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ خیر ان لوگوں کی مسکراہٹ تو ہونٹوں تک محدود تھی۔ پر یہاں جان کی لاکھوں پڑے۔ ارے بھئی اب تو جگر کا مطالعہ کر کے ہی جاؤں گا ورنہ جب اعظم آنند صاحب آنے لگیں گے تو یہ شعر گنگنانے لگوں گا۔ وہ سمجھ لیں گے کہ آج جگر صاحب ہی تشریف لائے

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ارے یہ کونسی کتاب ہے "بالِ جبریل"۔ یہ تو اقبال کی کتاب ہے۔ صد کے دوسرے صفحہ پر تو یہ شعر لکھا ہوا ہے۔ پھر شعر تو پھر ترمیم ہی ہوئی بات اور انھوں نے اقبال کی شان میں لکھا ہے گئے آج بھی کام ہے۔ خیر بھئی ابھی انہیں سوچنے سے کیا فائدہ۔ اقبال کا مطالعہ کر رہا ہوں اسے ہی پہلے پڑھ لوں۔

"ہاں شاعری کا شوق ان کو ابتدائی عمر ہی سے تھا۔ چنانچہ جب ۲۲ سال کے تھے تو لاہور کے ایک مشاعرے میں آپ نے ایک غزل پڑھی۔ مرزا ارشد گورگانی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ جب اقبال نے یہ شعر پڑھا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

مرزا ارشد تڑپ اٹھے اور کہنے لگے۔ "میاں صاحبزادے سبحان اللہ اس عمر میں یہ شعر"

ارے بھئی کلاس میں تو ایک لڑکی شہناز بھی ہے۔ پھر نہ جانے شہناز نام سبھوں کو کیوں پیارا ہے۔ جس کلاس میں بلکہ جس ڈپارٹمنٹ میں دیکھئے شہناز نام کی ایک لڑکی ضرور ملے گی۔ ففتھ ایر میں شہناز سکنتھ ایر میں شہناز وداع ہونے والی جماعت میں شہناز۔ میرے محلے میں ایک لڑکی فورتھ ایر کی ہے۔ میں نے اس کا نام پوچھا جھٹ سے اس نے بتایا۔ شہناز۔ میرے روم پاٹنر بلکہ اچھی انگریزی میں CHAMBER FELLOW کہئے۔ سکنڈ ایر میں پڑھتے ہیں۔ میں نے پوچھا اپنی کسی ایک گرل فرینڈ کا نام بتلائیے۔ کہا شہناز۔

شہناز — شہناز — شہناز —

نہ جانے لوگ شہناز نام کیوں رکھتے ہیں۔ مجھے تو اس نام سے سخت نفرت ہے۔ جب سے شہناز نے میرے زخموں کو کرید کر انہیں کی طرح نمک پاشی کی ہے مجھے اس نام سے نفرت سی ہونے لگی ہے۔ صاحب یہ لڑکی مجھ سے عشق کا ڈھونگ رچاتی تھی۔ جب بھی شادی کے متعلق بات کی یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اتنی بھی کیا جلدی ہے میں تو آپ ہی کی ہوں۔

اور پھر ایک دن شہناز نے مجھے ایک لفافہ بھیجا۔ سوچا تھا کہ شاید محبت نامہ ہوگا لیکن نکلا دعوت نامہ۔ لکھا تھا —

"افسوس میں ایک کوزے میں بند تھی۔ مجھے معاف کر دینا۔ اور ہاں میری شادی میں ضرور آنا۔ ورنہ تمہارے بغیر شادی کا لطف ہی جاتا رہے گا۔ پلیز آؤ گے نا؟"

اوہ! کیا سوچ رہا ہوں — تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی!

ارے ہاں! ابھی تک تو میں نے دو صفحے بھی نہیں ختم کئے۔

اقبال کا بہت مشہور شعر ہے۔ فرماتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انور صاحب۔ انور صاحب۔ مونشو پکار رہا ہے۔ کھانا کھائیے گا نہیں ؟

اور میں DINNER پر جا رہا ہوں ___

روشن مستقبل

آندھرا پردیش سٹیڈ ولڈ ٹرائبس کارپوریشن ۔ گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن ۔ گریجن ڈولپمنٹ ایجنسی اور انٹگریٹیڈ ٹرائبل ڈولپمنٹ ایجنسی کی تشکیل کی بدولت ریاست آندھرا پردیش جائز طور پر یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ قبائلیوں کی ترقی کے لیے ایک مستحکم ادارجاتی بندوبست فراہم کرنے کے معاملے میں وہ ملک کی اولین ریاست ہے۔

یہ ریاست اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اس نے پہاڑوں کی آغوش میں پرورش پانے والے اپنے باشندوں کو ایک نیا معاشی نظام عطا کیا ہے۔ تیسرے منصوبے میں قبائلی بہبود کے لیے اخراجات کی گنجائش ۱۰۸۰ کروڑ روپے تھی جو بڑھکر پانچویں منصوبے میں ۱۵۶۵ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔

منصوبہ جاتی اسکیمات ۔ زراعت ۔ افزائش مویشیاں ۔ برقی ۔ چھوٹی آبپاشی اور تعلیم سے متعلق سرگرمیوں پر مرکوز ہیں۔ آج ایسی طاقتیں فتحمند ہیں جو ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ قبائلیوں کو ان کی اپنی دقیانوسی دنیا سے نکالکر تابناک ماحول میں لایا جارہا ہے۔

ایک روشن مستقبل
ان کے انتظار میں ہے

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

37/77-78

انصاری اصغر جمیل
(ناگپور)

شاعر اور ہوٹل

شاعر اور ہوٹل دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ ہمارا تجربہ کہتا ہے کہ ہوٹل شاعروں کی جاگیر ہوتی ہے کیوں کہ وہ صبح سے شام تک وہیں براجمان رہتے ہیں۔ بیشتر شعراء ہوٹل میں ہی جنم لیتے ہیں (یہاں جنم لینے سے مراد شاعری کی دنیا میں جنم لینے سے ہے) ایک بھلا چنگا انسان ہوٹل میں ہی شعروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور "نتیجتاً" ایک مدت کے بعد وہ خود بھی شاعر بن جاتا ہے جس کی زندہ مثالیں پنچر شاہ کمال، علامہ چینڈو، پیاز فاختی، کھنکار بلغمی وغیرہ ہیں جو اسی ہوٹل کے طفیلی ہیں ——— ہم نے دیکھا ہے کہ کچھ بدمعاش قسم کے ہوٹل مالکان شاعروں کو اپنی ہوٹلوں میں گھسنے نہیں دیتے اس کے برعکس کچھ شریف قسم کے مالکین انہیں دیکھتے ہی ادب سے سر جھکا لیتے ہیں اور انہیں اپنی ہوٹلوں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے اندر آنے پر اپنی جانب سے چالو چائے پیش کرتے ہیں (یہ بات الگ ہے کہ وہ چائے کے پیسے شاعروں سے کسی نہ کسی طرح وصول کر ہی لیتے ہیں) شعراء کی خدمت کے دوران وہ بار بار سڑک کی جانب دیکھیں گے آیا کوئی انہیں دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی دیکھ نہیں رہا ہو تو کسی بھی بہانے وہ گذرتے ہوئے کسی بھی شخص کو بلا ضرورت آواز دے کر اپنے پاس بلائیں گے بعد باتوں کے دوران شعراء کی جانب اشارہ کر کے کہیں گے کہ یہ صاحب فلاں شاعر ہیں۔ شاعروں کو ہوٹل میں بٹھانا وہ باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ہوٹل ہی وہ جگہ ہے جہاں شعراء کلاسیکی شعراء کے کلام سے فیضیاب ہوتے ہیں ہوٹل ہی میں اساتذہ پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ یہیں نومشق شعراء کہنہ مشقوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہوٹل ہی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں آل انڈیا مشاعروں کے پلان بنتے ہیں۔

(یہ ضروری نہیں کہ اس پر عمل بھی کیا جائے) ۔ چند شعراء جیب میں صرف دس پیسے ڈال کر ہوٹل کا رخ کرتے ہیں جہاں وہ دس پیسے میں تین شکار کرتے ہیں۔ پہلا چائے پینا، دوسرا اخبار بینی اور تیسرا وہاں موجود لوگوں کو اشعار سنانا (خواہ وہ غزل کسی اور کی ہو اسے اپنی ہی کہیں گے)

ہم ایک ایسے ہی شاعر سے واقف ہیں جن کا نام ہے بنجر شاہ کمالؔ (حالانکہ یہ نام انہیں زیب نہیں دیتا، ان کا نام تو ہونا چاہیئے تھا برسٹ شاہ کیونکہ ادب کی سنگلاخ زمین پر دوڑتے دوڑتے وہ سب برسٹ ہوگئے ہیں)

بنجر شاہ کمال علی الصبح بیدار ہو جاتے ہیں (شاید صبح ہونے کی خوشی میں رات بھر سوتے ہی نہیں ہیں) ضروریات سے فارغ ہوکر چوک کا راستہ ناپتے ہیں اور اپنے شکار کی گھات میں موٹن پورہ چوک سے محمد علی سرائے کے تقریباً سات پھیرے (دودھ اور وودھو کی طرح) لگاتے ہیں۔ اس وقت آپ ان کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں تو بے اختیار جی چاہے گا کہ انہیں اُٹھاکر کارپوریشن کی گنٹر میں ڈال دیں۔ " شکنوں سے پُر قمیض، لنگی، دھول میں اٹی ہوئی، اُلجھے ہوئے بال، خیر چپل تو پیروں میں ہوتی ہی نہیں۔ " ہاتھوں میں ایک ڈائری (جسے یہ اپنا دیوان کہتے ہیں) لئے بے قراری کے عالم میں اس ہوٹل کے کھلنے کے انتظار میں ٹہلتے نظر آئینگے جہاں ان کی بیٹھک ہے۔

ان کی بیٹھک چوک کی ایک بوسیدہ سی ہوٹل ہے۔ مالک ہوٹل کو دور سے دیکھتے ہی یہ ان کی جانب لپکتے ہیں اور اس طرح بغلگیر ہوتے ہیں۔ جیسے ایک مدت بعد ان سے ملاقات ہوئی ہو۔ پھر ان کے ساتھ ساتھ یہ ہوٹل تک آتے ہیں اور تالا کھولنے میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ہوٹل کھلنے پر یہ اپنے مخصوص ٹیبل پر یوں لپکتے ہیں جیسے ان کے فوراً نہ پہونچنے سے کوئی اور اس پر قابض ہو جائے گا (جس طرح سینما کے تیسرے درجہ میں ہوتا ہے) ٹیبل تک پہونچنے کے بعد یہ اپنی لنگی سے ٹیبل کو صاف کرکے اپنی ڈائری رکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی اور اس پر قابض نہ ہو جائے۔ اس کے بعد اپنا سینہ ۲ ½ انچ پھیلاتے ہوئے ہوٹل کے گیٹ پہ اپنے شکار کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں وزیر سلطان کی چار مینار لگی ہوتی ہے (جو کسی اور کے پیسوں کی ہوتی ہے) جب تک کوئی شکار ہاتھ نہ آجائے یہ وہاں سے نہیں ہٹتے۔ شکار کو اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسا کر کہتے ہیں کہ بھئی باہر کھڑے کھڑے کیا باتیں کریں چلئے اندر چل کر آرام سے بیٹھیں گے۔ اب بے چارے معصوم شکار کو کیا معلوم کہ اندر کیا ہونے والا ہے؟ شکار کے ہمراہ اپنے ٹیبل تک آتے آتے یہ دو عدد چالو چائے کا آرڈر دیتے ہیں۔ ان کے آرڈر سے ایسا لگتا ہے کہ یہ چالو چائے نہیں بلکہ ڈنر کا آرڈر دے رہے ہیں اور شکار کو یوں تکتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں بیٹا ہماری سخاوت پر مت جاؤ ہم حاتم طائی کی چھوٹی اولاد ہیں۔ باتوں کے دوران آپ سگریٹ کا دھواں ایک شان بے نیازی کے ساتھ اپنے شکار کے چہرہ پر چھوڑتے ہیں۔ ٹیبل پہ ڈائری دیکھ کر شکار یہ سمجھتا ہے کہ شاید کسی اور کی ڈائری ٹیبل پہ چھوٹ گئی ہے اور مالک ہوٹل کو آواز دیتا ہے لیکن اسی بیچ بنجر شاہ کمال شرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ صاحب یہ کسی کی ڈائری نہیں بلکہ خاکسار کا دیوان ہے۔ اب تو شکار کا ماتھا ٹھنکتا ہے کہ " برے پھنسے " لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" کے مصداق انہیں مجبوراً دو چار غزلیں چائے آنے تک برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ یہاں تک کہ مرزا غالب کا یہ شعر

قرض کی پیتے تھے مئے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پر بھی ضبط سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کا دعوٰی ہے کہ یہ شعر خالص ان ہی کا ہے اور انھوں نے مرزا غالب کو اس بحر میں پوری غزل کہہ کے دی تھی کیونکہ غالب صاحب اس بحر میں غزل کہنے سے قاصر تھے۔ اگر شکار ان سے اس قسم کے اشعار پر اُلجھ گیا تو سمجھئے کہ پورے تین گھنٹے برباد اور شکار کو یہ سب کچھ صرف ایک عدد چالو چائے کے لئے برداشت کرنا پڑتا ہے جس کی قیمت صرف دس پیسے ہے۔

انھیں سیاست پر بھی پوری طرح عبور حاصل ہے۔ سیاست میں اُلجھ کر آپ نے ہوٹل کے کئی ٹیبل توڑ ڈالے ہیں۔ سیاسی مسئلہ چاہے جس نوعیت کا ہو آپ بلا عذر اس میں دخل اندازی کریں گے چاہے آپ کی باتوں کا کوئی سر پیر ہو یا نہ ہو آپ سیاسی معاملات پر جس وقت بحث کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ نہرو گاندھی ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔

بعض شکار جنھیں ان کی حرکات کا علم ہے۔ پنجر شاہ کمالؔ کو ہوٹل کے گیٹ پر دیکھتے ہی دور سے راستہ کاٹ کر نکل جاتے ہیں۔ بعض ٹیبل پر پہنچنے کے بعد حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور پیچھا چھڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ بہت جلدی میں ہیں۔ یہ سن کر پنجر شاہ کمالؔ ان کی چائے منسوخ کروا دیتے ہیں اور اس طرح گھورتے ہیں جیسے انھیں اپنی جائداد سے محروم کر دیا ہو۔ مالکِ ہوٹل بھی ان سے ملے ہوئے ہیں جب تک یہ اپنے شکار کو کم از کم دو غزلیں نہ سُنا لیں چائے ٹیبل تک نہیں پہونچتی۔ شکار چاہے جتنی بھی جلدی کرے جواب یہی ملتا ہے کہ چائے تیار نہیں ہے (حالانکہ چائے ہر وقت تیار رہتی ہے) جیسے ہی پنجر شاہ کمالؔ ایک مخصوص قسم کا سگنل دیتے، چائے ٹیبل پر حاضر ہو جاتی ہے۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہم صرف لن ترانی ہانک رہے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم پنجر شاہ کمالؔ کے شکار رہ چکے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ ہوٹل میں نصف گھنٹہ گذار لیں تو سمجھئے کہ تیر مار لیا۔ ہمارا دعوٰی ہے کہ تین گھنٹے ان کے ساتھ گذارنے کے بعد آپ ہوٹل سے نصف شاعر بن کر باہر نکلیں گے۔

اگر آپ کبھی ناگپور تشریف لائیں اور پنجر شاہ کمال سے اس ہوٹل میں ملاقات نہ کی تو سمجھئے کہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ آپ نے نہیں دیکھا۔

۲۲

حیدر بیابانی

تاج محل ہوٹل

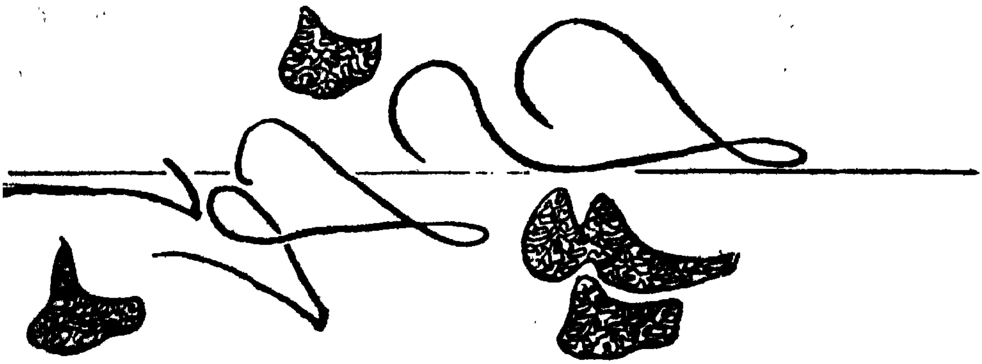
(پیروڈی)

(محترم ساحر لدھیانوی سے معذرت کے ساتھ)

تاج کی ساری غذائیں تجھے مرغوب سہی   اس کے مشروب بہت خوب بہت خوب سہی
میری محبوب کہیں اور بلا کر مجھ سے
مرغ و ماہی سے غریبوں کا ملن کیا معنی   زندگی جن کی ہے بے لطف ازل سے اب تک
لذتِ کام و دہن، سیر چمن کیا معنی!
مری محبوب فلک بوس عمارت سے پرے   مفلسوں کے کچے مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
لذت آمیز غذاؤں سے بہلنے والی   بھوک کے مارے کسانوں کو تو دیکھا ہوتا
ان گنت لوگ جو کھاتے رہے چٹنی روٹی
کون کہتا ہے مزعفر کو نہیں ترسے ہیں
ان کی قسمت میں مگر تاج کی دہلیز کہاں
کیونکہ وہ لوگ بھی میری ہی طرح کڑکے ہیں
یہ مٹھائی، یہ پلاؤ، یہ مزعفر، یہ کباب   کتنے سیٹھوں کے لئے اور بڑے پیٹوں کے لئے
فیرنی، قورمے، بادام کے حلوے، مانڈے   ایسے پکوان کہاں اپنی پلیٹوں کے لئے
میری محبوب انھیں بھوک نے مارا ہوگا
"جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل"
کتنی اینٹوں کو سجایا تو ملی اک روٹی
فن تھا فیاض مگر اُس کی دُنیا تھی بخیل
انڈیا گیٹ، سمندر کا کنارہ، یہ محل   مخملی فرش شفق رنگ، یہ پرنور چھتیں
چند زردار امارت کا سہارا لے کر   ہم غریبوں کی غریبی کو حقارت سے تکیں

میری محبوب کہیں اور بلا کر مجھ سے

پرویز یداللہ مہدی



۲۲

اس سے پہلے کہ طوطا پری کی تلوار ہمارے جغرافیے کو زخمی کر کے آئندہ تاریخ میں اپنے لئے جگہ بناتی ہم نے جھکائی دے کر وار خالی دیا۔ گویا
رہ تاریخ کے اس صفحے کو سادہ ہی رہنے دیا جس پر ہمارے خون سے ظالم طوطا پری کی موذی تلوار کا نام لکھا جاتا، اپنی اس تاریخی ناکامی پر طوطا پری
بلا نا فطری تھا۔ چنانچہ اس کا اگلا وار بالکل ہی اندھا دھند قسم کا تھا۔ لیکن ہماری آنکھیں بھی کھلی تھیں اور ذہن بھی پوری طرح جاگ رہا تھا
گھٹنا فرش پر ٹکا کر اس وار کو اپنی تلوار پر روک لیا۔ ہماری طرف سے ایسی جچی تلی مدافعت کی شاید طوطا پری کو توقع نہیں تھی۔ اسکے
اسکے کہ تلواروں کا یہ "معانقہ" "معانقہ" کی حدود میں داخل ہوتا، طوطا پری اپنی تلوار سمیت پورے چار قدم پیچھے ہٹ گیا، شاید اپنی اس
ت سے وہ ہمیں اس مغالطے میں مبتلا کرنا چاہتا تھا کہ اسکے اس اقدام کو ہم اسکے میدان چھوڑنے کی علامت سمجھ کر اسکی طرف سے غافل ہو جائیں اور
اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر وہ ہمیں بہ آسانی زیر کر لے گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ہم یقیناً غچہ کھا جاتے لیکن اس وقت ہم پوری طرح چوکنے
ہماری چھٹی حس پوری طرح بیدار تھی بلکہ بقیہ پانچوں حسیں "چھٹی حس" میں ضم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ طوطا پری کے مغالطے کو حقیقت ثابت
نے کے لئے جان بوجھ کر غفلت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ادھر طوطا پری نے یہ سمجھا کہ اسکی چال کامیاب ہو گئی اور پھر پوری قوت سے اپنے پیروں پر ا
ہم پر وار کر دیا۔ جواباً ہم نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خود کو ایک جانب کر لیا اور طوطا پری اپنے ہی جھونک میں کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح
فرام سے فرش نشین ہو گیا —— یہ منظر کچھ اسقدر مضحکہ خیز تھا کہ تماشائی جو اب تک دم سادھے سانس کھینچے تلواروں کے ٹکراؤ کو پھٹی پھٹی
آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہنسی سے دہرے ہو گئے، کچھ دل والوں نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ہماری ہمت افزائی بھی فرمائی۔ اس سے پہلے
طوطا پری دوبارہ سنبھلتا، ہم نے تصور کی "دوست نوازی" سے "یادداشت" کی ڈائری میں محفوظ مار دھاڑ اور تلوار بازی سے بھرپور فلموں کے مناظر کھینچ کر پھیلا
کے پردے پہ لانے کی کوشش کی شاید کوئی منظر کوئی پینترا آئندہ وقت ہمارے کام آ جائے لیکن اس "فلمی آموختے" نے بتا دیا کہ اس کی فلمی تلوار
اور آج کے مقابلے میں بنیادی فرق یہ تھا کہ فلموں میں ہمیشہ تلوار کا نقلی ایڈیشن استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ہمارے اور طوطا پری کے ہاتھوں میں تلوا

اصلی اڈیشن تھا ———— علاوہ ازیں صرف تلوار کے ہاتھ میں آجانے سے کوئی فاتح نہیں ہو جاتا' تلوار کسی کوڑی والے فقیر کا مورچھل تو نہیں کہ ہر آتے جاتے کے سر پر پھیر کر دادِ تحسین وصول کی جائے یا پھر تلوار کوئی بجلی کا پنکھا' نہیں کہ ادھر بٹن دبایا اور ادھر شروع ہو گئی۔ تلوار چلانے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور طوطا پری لاکھ بے ادب ہونے کے باوجود تلوار چلانے کے معاملہ میں بہت آداب یقیناً جانتا تھا۔ جبکہ ہم شخصی طور پر بے حد با ادب اور با ملاحظہ ہونے کے باوجود اس معاملے میں نرے گاؤدی تھے۔ البتہ غصے کی وجہ سے اور طیش اور غضب کی وجہ سے طوطا پری تلوار بازی کے آداب سے واقفیت کے باوجود اناڑی پن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کا یہ اناڑی پن ہی ہماری خیریت اور سلامتی کی ضمانت تھا۔ سوئے اتفاق کہ اس خونساز ڈرامے میں اچانک ایک مزاحیہ پہلو خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔ اب بھی صرف کرتا یہ تھا کہ اس پہلو کو برقرار رکھتے ہوئے' طوطا پری کے غیض و غضب کو جتنی ہو سکے ہوا دیتے رہیں اُدھر طوطا پری دوبارہ حملہ کرنے کے موقف میں آ چکا تھا۔ اسکی فرش نشینی غالباً خاصی خفت کا باعث ہوئی تھی۔ تب ہی تو اسکی جھلاہٹ عروج پر تھی۔ ایسے عالم میں اس سے لوہا لینے کی کوشش خودکشی کے مترادف ہوتی جسم کا سارا لوہا پانی بن کر بہہ جاتا۔ ایسی صورت میں اسکی تلوار کے حلقۂ اثر سے بھاپ بن کر اڑ جانے میں ہی عافیت تھی' چنانچہ جیسے ہی اس نے وار کیا ہم نے پہلے ہی سے بچے بچائے اندازے کے مطابق الٹی چھلانگ لگائی اور اُس کا ونشر ناطریں دیگر میوزیکل ٹیبل پر پہنچ گئے جو اسٹیج کی عقبی دیوار سے لگا ہوا تھا اور اسٹیج ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ غالباً موسیقی کے آئیٹم کے دوران ساز وغیرہ رکھنے کے کام آتا ہوگا۔ بہرحال اس وقت ہمارا وجود اس جلسی ساز ہی کی طرح متحرک رہا تھا۔ ہماری اس اڑان' اور طوطا پری کی جھلائی ہوئی خفت پر سامعین کی جانب سے ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ہم نے تلوار ہوا میں لہرا کر گویا سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ طوطا پری ہمیں پھٹی پھٹی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُسے سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کی ذرا سی بھی مہلت کا ملنا ہماری عافیت' اور اسکی عافیت' دونوں کے لیے خطرناک تھا اسلئے ہم نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے پارسی تھیٹریکل کمپنی کے مشہور زمانہ اسٹیج ڈرامے "خونی تلوار عرف البیلی نار" کے گرجتے برستے مکالموں کو اپنی اطلا فتوں کیساتھ دہرانا شروع کر دیا ———— "او ناداں انساں اب بھی وقت ہے سنبھل جا' اپنے فاسد ارادے سے ٹل جا' کیوں اپنی موت کو دعوتِ تناول طعام دیتا ہے' اس بھر پور جوانی میں کیوں موت کا نام لیتا ہے' ———— ہوش کو سمجھ سے کام لے' جگر کو تھام لے' خدا کا نام لے' گھر جا' ٹھنڈا پانی پی' چادر اوڑھ کے لمبا سو جا' پھر بھی اگر دل نہ مانے تو شادی بنا' آبادی بڑھا ———— ظاہر ہے ان مکالموں پر قہقہے ضرور بلند ہوئے ہوں گے البتہ جس ہستی سے یہ تخاطب تھا اسکے حق میں یہ زبانی وار' تلوار کی کاٹ سے زیادہ کاری تھا' لہٰذا پچھلی اڑان کے خمیازے کو یکسر بھول کر طوطا پری نے پھر ہماری جانب چھلانگ لگائی ————

ہم تو کسی متحرک ساز کی طرح متحرک ہی رہے تھے لیکن بے چارے طوطا پری کے کون کون ساز بج اٹھے یہ یا تو وہی بہتر جانتا ہے۔۔۔۔ یا پھر اُس کا خدا۔ اس کے اسٹیج سے اڑ کر میوزیکل ٹیبل سے پیچھے "لینڈ" کرنے کے بعد جو دھڑام دھڑام بلند ہوئی یوں لگا جیسے ایکدم کئی ساز بج اٹھے ہوں۔ خاص طور سے "طبلے" کی تھاپ نمایاں تھی۔ مختلف سازوں کی اس جگل بندی پر دیکھتے ہی دیکھتے حاضرین کے قہقہوں کی بلند بانگ آواز غالب آ گئی۔ اس شور سے فائدہ اٹھا کر ہم نے پیچھے کی طرف جھک کر ازراہِ ہمدردی طوطا پری سے پوچھا۔ برادر! کچھ زیادہ ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی۔؟ لیکن جواب میں اس برادر کم ظرف نے جو حرکت کی اس سے یہی لگے ازبرادری یوسف ثابت ہوا یعنی ظالم نے قربان ہوجانے کے بجائے پوری قوت سے تلوار گھمائی۔ اگر ہم ذرا سے بھی غافل ہوتے تو ہمارا سر تن سے جدا ہو چکا ہوتا اور دھڑ "بغیرِ نیت" کے فاتحِ حمین" کی طرح اسٹیج پر دم توڑتا نظر آ رہا تھا۔ ہمارے فرشتوں کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ طوطا پری اس قدر خطرناک ہو سکتا ہے جو نکہ کھیل بہت خطرناک موڑ اختیار کر چکا تھا اب ہماری عافیت راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں تھی۔ کا نپتی آنکھوں نے راہِ فرار کی تلاش شروع کی سارا اسٹیج کھنگال چکنے کے بعد آنکھیں جب اس پر ٹھیریں تو اچانک راہِ فرار نظر آ گئی جو بغل میں ہی تھی۔ اسٹیج کی عقبی دیوار سے میوزیکل ٹیبل کی بغل میں

ایسے نشانات نظر آئے جو صرف دروازے کے ہی ہو سکتے تھے جہاں کہ اسٹیج کی پچھلی طرف جانے کا یہ بھی ایک راستہ ہو۔ ہم پر عرصۂ حیات کچھ اس طرح تنگ ہو چلا تھا کہ ہمیں دروازے کے بجائے دروازے کے آثار ہی غنیمت نظر آئے۔ اگر ہم ایسے نازک وقت دروازے کے باب میں تحقیق کا کوئی باب کھول لئے بیٹھتے تو اپنی "ہستی" کے آثار معدوم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اللہ کا نام لے کر ایک ہی جست میں دروازے کے آثار تک پہنچ گئے۔ لیکن ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے، دروازے کے آثار ایک خونخوار انسان کے پھنکارتے" وجود میں تبدیل ہو چکے تھے۔ چونکہ ہماری بہ نسبت طوطا پری دروازے سے نزدیک تر تھا اس لیے ہمارے دروازے کو جا پہنچنے سے ہم سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ اور اب اپنی تمام تر دہشت اور وحشت کے ساتھ ہمارے اور راہ فرار کے درمیان حائل تھا۔ اس سے پہلے کہ وار کرتے ہیں وہ پہل کرتا ہم نے اپنی تلوار پھرتی سے اسکی تلوار سے یوں ٹکرائی جیسے کوئی عمر آدمی کسی بچے کے گلے سے چپت رسید کرتا ہے۔ اور پھر اچک کر میوزیکل ٹیبل پر چڑھ گئے اور دوبارہ مکالمہ بازی بھی شروع کر دی —— آ چڑی یہاں بیٹھ، دانہ کھا، پانی پی پھر سے اڑ جا —— اس زبانی گستاخی پر طوطا پری اس بار اس قدر جھلایا کہ تلوار بازی کے اصول آداب سب کچھ بالائے طاق رکھ کر یوں وار پر وار کرنے لگا جیسے ہاتھ میں تلوار نہیں جانوروں کو ہنکانے کا ڈنڈا ہو —— ہم بھی جھکائی دے دے کر اسے اسٹیج پر دوڑاتے رہے۔ یہ بے بلا کا تماشہ، حاضرین کے لیے تفریح کا اچھا سامان مہیا کر رہا تھا لیکن اس سامان کو مہیا کرتے کرتے ہمارے سر و ساماں کی حالت خاصی پتلی ہو گئی۔ طوطا پری کا بستہ در جواب "اچھل کود اور ڈنڈا گھماؤ" تلوار بازی سے آخر کب تک خود کو بچاتے۔ کہتے ہیں بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی اور یہاں تو جائے واردات پر دو بکرے کی ماں موجود تھی ڈھولک اور دہشت دار۔ چنانچہ تلوار تلے آ ہی گئے۔ اور جیسے ہی خنجر نما دانت کا پھاٹک پیچھے ہوتا ہے، طوطا پری نے ہمیں اس بری طرح گھسیٹا کہ آنکھوں کے آگے اپنی موت نے کیمرے کا منظر دکھا دیا۔ موت کے اس رقص کے دوران

محسوس ہوا کہ اتفاق سے ہم اسٹیج کی عقبی دیوار کے اس حصے کے پاس پہنچ گئے ہیں جس پر دروازے کا گمان ہوا تھا۔ گویا زندگی اور موت کے درمیان اگر نجات کا کوئی راستہ تھا تو یہی دروازہ تھا بلکہ صرف آثار تھے۔ ہم نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ سوچا کہ خود کو آثار قدیمہ میں شمار کروانے سے بہتر تو یہ ہے کہ دروازے کے آثار سے دروازہ پیدا کیا جائے۔ اس خیال کا اجاگر ہونا تھا کہ دم توڑتی ہوئی قوت جیسے عود کر آئی "معمولی چراغ بھی بجھنے سے پہلے ایک بار ضرور بھڑکتا ہے" پھر ہم تو آدمی ٹھہرے، ہماری از سر نو قوت مدافعت نے طوطا پری کو ایک بار پھر ڈگمگا دیا۔ اور اسکی اس ڈگمگاہٹ سے بھرپور فائدہ اٹھا کر ہم نے دروازے کے آثار پر زور آزمائی شروع کر دی اور بالآخر ایک عدد دروازہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہماری وہی مثل تھی اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، اور دونوں آنکھیں مل چکی تھیں بلکہ کھل چکی تھیں، ایک ہی جست میں موت کے بھیانک جبڑے سے زندگی کی حسین باہوں میں پہنچ گئے —— زندگی کی حسین آغوش میں پہنچ کر پتہ چلا کہ یہاں تو پہلے ہی سے حسن کا ایک میلہ لگا ہوا ہے، شہزادی بدستور مغل شہزادی کے قربہ شکن، روپ میں اپنی سہیلیوں کے ہمراہ عقبی کمرے پر تعمیر شدہ مچان پر کھڑی نظر آئیں۔ یہ مچان اصلی چھت سے کافی نیچے تھی اور مضبوط لکڑی سے تعمیر کی گئی تھی۔ یہاں سے اسٹیج کے تماشے کا بآسانی نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی شہزادی اور ان کی سہیلیوں نے گرم جوشی مسکراہٹ سے نوازا۔ ہم اشارے سے اوپر بلا لیے گئے زندگی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمیں بلا رہی تھی اور پیچھے موت کا ہرکارہ دروازہ پیٹے جا رہا تھا۔ کیونکہ عقبی کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم نے نجات کا یہ راستہ بند کر دیا تھا —— زندگی کے بلاوے پہ ہم لکڑی کی سیڑھیوں کے ذریعہ اترتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ ہمارے اوپر پہنچنے کی دیر تھی جیسے ہم سب کی متلاشی نظریں ہم پر پڑیں تو قہقہوں اور تالیوں سے ہماری ہمت افزائی کی گئی۔ البتہ طوطا پری نے جلا کر ایک گالی سی دی کیا کر رہا ہے ڈرپوک نیچے آ —— ہم طوطا پری کے اس نئے حملے پر دو تو طیش میں آئے نہ ہی جواب دینا مناسب سمجھا لیکن جب اس نے

اپنا یہ طرحی مصرعہ دوبارہ ارشاد فرمایا تو شبو اور ان کی سہیلیوں نے تالیاں بجا کر اس جوابی کارروائی پر داد دی۔ ہم چونکہ دوبارہ موت کے منہ میں جانے کے موقف میں ہرگز نہیں تھے اس لیے ان اذکار رفتہ کلیوں کو مطمئن کرنے کی غرض سے بات بنائی۔ بے چارے کی بہت ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے' بازار میں بھی اسکے سائز کے اسپیئر پارٹس (SPARE PARTS) مشکل ہی سے ملیں گے اس لئے غریب کو اسکے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ ہمیں حسن کو اژدہا لہروں سے اٹکھیلیاں کرتے دیکھ کر طوطا پری کے اور مرچیاں لگ گئیں اس بار کسی لڑاکا عورت کی طرح جلے کٹے لہجے میں بولا۔ لڑکیوں کے آگے کیا شیخی بگھار رہا ہے مکار —! مرد ہے تو نیچے آ ....."

کمبخت کی اس چوٹ کو بھی ہم سنی ان سنی کر دیتے اگر حسن کے جمگھٹے میں نہ گھرے ہوتے' جواب دینا ضروری تھا ورنہ مردانگی پر حرف آ جاتا چنانچہ چبا چبا کر اسی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے دہاڑ کر کہا — اسپے او مونگ کی دال کے بگھار' نیچے کھڑا باسی کڑی کے ابال کی طرح کیوں اچھل رہا ہے' گھڑی بھر چھری تلے دم تو لے ....." ہمارا یہ ترکی بہ ترکی جواب یقیناً داد کا مستحق تھا' لیکن جب حسن کے جھرمٹ کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہاں نہ داد تھی نہ بیداد بلکہ نہ اشارہ تھا نہ کنایا نہ تبسم نہ کلام' زبانی داد و تحسین سے ان کی تشفی اب مشکل ہی نظر آتی تھی شاید' ہماری جانب سے "عمل اور پیہم عمل" کے متمنی تھے۔ شہر حسن والوں کی تشفی کی خاطر اپنی زندگی پر منشی ڈلوانے سے پہلے ہم نے آخری کوشش کر دیکھی یعنی پھر باتونی چرخہ چلایا یہ بات نہیں کہ ناچیز لڑنے سے گھبراتا ہو' ہرگز نہیں ہاں بے مقصد جھگڑنے کا قائل نہیں۔ اور پھر دیکھئے ذرا کم بخت بحری قزاق کس قدر خونخوار ہو رہا ہے' اگلی بار اگر خادم اسکے ہتھے چڑھ گیا تو پھر اس کی ...ان الیقین ہے بغداد کا چودھری صرف عبدالرزاق کی خیر نہیں۔"

حالانکہ وہ بحری قزاق ہے' اور آپ عبدالرزاق۔ شبو نے پرجوش لہجے میں ہماری لٹیا ڈبونے کی کوشش کی۔ لیکن یہ مت بھولئے کہ آپ کوئی معمولی عبدالرزاق نہیں بلکہ عبدالرزاق اردی ہیں جس نے گولکنڈہ قلعہ پر عالمگیری فوجوں کی چڑھائی کے دوران اپنے سینے پر بہتر زخم کھا کر عالمگیری فوجوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے — ہم نے اپنی ڈوبتی ہوئی لٹیا کو ابھارنے کی ایک اور کوشش کی۔ یہ بھی تو دیکھئے کہ دست برد زمانہ نے غریب اردی کو آج "چھکڑہ" بنا رکھا ہے' ویسے زخموں سے خدا گواہ ہے ہم ہرگز نہیں گھبراتے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ زخم تلوار کے ہی ہوں' نظر کے تیر ہوں' زبان کے نیزے ہوں' ابرو کی کٹاری ہو' پھر دیکھئے آپ بہتر زخم کہتی ہیں ہم انیس سو بہتر زخم اور ان زخم کھا کر بھی اف نہیں کریں گے بلکہ انشاءاللہ یہی کہتے نظر آئیں گے کہ —

کیا تیر نظر تیر نظر تیر نظر ہے۔

ادھر طوطا پری کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹ چکا تھا اب کی بار وہ مجمع کی طرف مخاطب ہو کر اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا — میری ہر للکار کے جواب میں بغداد کے چودھری کا عورتوں کی طرح منہ چھپانا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ میں ہی مرد میدان ہوں۔ ہپ ہپ ہرے فار بحری قزاق ..."

کم بخت نے اپنی جیت کا ڈھنڈورہ بھی خود ہی پیٹ ڈالا لیکن اسکے "ہپ ہپ ہرے" میں کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا سوائے ہمارے' یعنی بے ساختہ ہپ ہپ ہرے کا نعرہ ہمارے منہ سے نکل گیا شاید اسی وجہ سے کہ ہم اس خطرناک کھیل کو جلد سے جلد ختم کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے اس بے ساختہ نعرے کو بھی لوگوں نے طنز کے معنوں میں لیا اور بازو پھیلا پھیلا کر میدان میں کود پڑنے کے اشارے کرنے لگے۔ شبو اور ان کی سہیلیوں نے تو باقاعدہ ٹھٹھے لگانے شروع کر دیئے تھے۔ اب میدان میں کود پڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن پہلے سے بات میدان میں چھلانگ لگانے پر اس بات کی ضمانت مشکل تھی کہ گھٹنا پھر چارپائی کے قابل رہے گا۔ اور جس راستے سے یہاں تک پہنچے تھے اس سے واپسی کا ایک طرح کا سبکی تھی۔ عجیب گومگو کے عالم میں تھے کہ اچانک کونے پر لٹکتی رسی پر نظر پڑی جو اوپر چھت کی کڑی سے مضبوطی سے بندھی ہوئی

تھی' جس کی مدد سے شاید اوپر نصب کردہ سرچ لائیٹوں تک پہنچا جاتا ہوگا ہم نے بڑی روانی سے تلوار کی نوک سے رسی کو اپنی طرف کھینچا' پھر اسی کو جھٹکے دے کر اسکی مضبوطی کا اندازہ لگایا پھر طوطا پری کو خواہ مخواہ دہلنے کی غرض سے ایک مکالمہ اسکی طرف اچھالا ——— ابے او شیخ چلی کے بھتیجے! تیرے جیسے رن چھوڑ داس "اگر مرد میدان" ہوسنے لگے تو پھر پانی پت کا میدان شرم سے پانی پانی ہوجائے گا۔ خوش فہمیوں کے جال سے نکل اور دیکھ تیری موت تیرے سر پر منڈلانے والی ہے ——"

جواب میں طوطا پری بھنا کر چلایا —— ابے جا او تیس مار خاں کے بھانجے! بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے ڈینگ باز' تو تو بس عورتوں کے دامن میں منہ چھپا —— سمجھا ——"

ابے او دُم بے دال! میں تو تیرے ہی بھلے کی بات کر رہا تھا ان پریوں سے' تیرے لیے ہلدی چونے کا لیپ تیار کرنے کیلیے کہہ رہا ہوں ملاحظہ ——" ہماری اس چوٹ پر وہ تلملا کر بولا

"ابے نیچے تو آ کم بخت' پھر معلوم ہوگا تجھے کہ ہلدی چونے کے لیپ کی ضرورت کیسے پڑتی ہے -؟"

ہم نے الوداعی نظروں سے حسینوں کے جھرمٹ کی طرف دیکھا پھر یہ شعر پڑھا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل "محل" ہم تو سفر کرتے ہیں

پھر طوطا پری کی طرف یہ شعر اچھالا ؎

غافل تجھے "تلوار" یہ دیتی ہے منادی
خود تو نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

اور پھر تلوار منہ میں پکڑ کر "ٹارزن" کی طرح رسی تھام کر اڑان بھری

(باقی باقی)

ہمارا سبز انقلاب

آندھرا پردیش میں ظہور پذیر ہونے والا سبز انقلاب، نئی سرحدوں کی سمت ہندوستان کی پیش رفت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سال ۷۶-۱۹۷۵ء ایک ایسا یادگار سال ہے جس میں ہم نے ۲۷ء۹۴ لاکھ ٹن کی ریکارڈ پیداوار حاصل کی یعنی فی ہیکٹر ۳۴ کنٹل پیداوار۔

بہتر تدابیر جیسے کھیتوں تک پانی لیجانے والے بہتر آبپاشی نالوں کی تعمیر۔ زراعت سے متعلق عصری طریقوں کی کاشتکاروں کو تعلیم۔ زمین کی موزونیت کے لحاظ سے فصلوں کی کاشت کی ترغیب اور کھیتوں کی سیرابی میں ترقی یافتہ ذرائع سے استفادے کی بدولت آندھرا پردیش میں پیداوار کی فی ہیکٹر اوسط بڑھانے میں بڑی مدد ملی ہے۔

کسانوں کو دیئے جانے والے قلیل مدتی قرضوں کی رقم جو ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۴۳ء۲۶ کروڑ روپے تھی بڑھکر ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۹۰ کروڑ ہوگئی۔ اسی طرح طویل مدتی قرضوں کی رقم میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ان قرضوں کے تحت ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۹۰ء۱۸ کروڑ روپے تقسیم کیے گئے تھے بلکہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ان قرضوں میں دی جانے والی رقم کی مقدار بڑھکر ۴۵ کروڑ روپیوں تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ریاست کے جیالے کسانوں کی جن پر پورے ملک کو ناز ہے، ہر طرح سے بہت امداد کی گئی ہے۔

آفریں مادر ارض کے فرزندو..... آفریں!

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No. 40/77-78

خرافات

مراسلے

●

مکرمی : تسلیم ! اب یہ بات بے جھجک کہی جا سکتی ہے کہ ماہنامہ شگوفہ نے اردو طنز و مزاح کے میدان میں اپنا ایک منفرد اور نمایاں ترین مقام بنا لیا ہے ۔ اس کے شعری اور نثری دونوں حصے دلکش ہی نہیں ہوتے بلکہ دعوتِ غور و فکر بھی دیتے ہیں ۔ خدا اسے نظرِ بد سے بچائے ۔

نیاز کیش
ظفر چکدوزی

●

مکرمی ، تسلیم ، شگوفہ برابر ملتا رہا غنچۂ دل کھلتا رہا ۔ جو نمبر ہے بے مثال ہے ، سب آپکے نام کا کمال ہے ۔ یوں تو مرجھا کے بیٹھ جاتا ہوں آپ کی بدولت مسکراتا ہوں

بہت دن سے غائب خواجہ عبد الغفور صاحب ہیں
کیا اپنے ملک سے یہ دور صاحب ہیں
دل پڑھنے کا آرزو مند ہے
ان کی تحریر بہت پسند ہے
شگوفہ کا نقشہ نرالا رہے
طنز و مزاح کا بول بالا رہے
ایک نظم و چند قطعات ارسال ہیں
سب غیر مطبوعہ مال ہیں
خدا کرے صد اچھے ہوں آپ کی

آپ کا اپنا اشرف مالوی

●

حروف ... شگوفہ مارچ ۱۹۸۸ء ناظر قارئین

اور روایتی شگفتگیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ۔ اس دور کرب و ابتلا میں جبکہ انسان ایک خفیف سے تبسم کے لیے ترستا ہے آپ ہر ماہ قہقہوں کی ایک تازہ کھیپ لے کر وارد ہو جاتے ہیں ۔ عذاب و ثواب کے زعم خود ٹھیکیدار بھلے ہی اس حقیقت کو تسلیم نہ کریں لیکن صاحب واقعی بڑا ثواب کما رہے ہیں آپ لوگ ۔ آج کا رونا روتا ہوا عصری ادب ذہن انسانی میں کرب ، تشکیک ، یاس ، محرومی ، گھٹن ، المیۂ ذات ، احساس شکستگی اور جذبۂ شکست خوردگی کی تخم ریزی کر رہا ہے ۔ ایسے میں آپ چند شائقین کے لیے سہی ان ہولناک تاریکیوں سے انسان کو نکال کر زندگی کی تابناکیوں کا احساس دلانے میں کامیاب ہیں ۔ زندہ دلانِ حیدرآباد اس اعتبار سے بھی داد و تحسین کے مستحق ہیں کہ وہ ہر ماہ نہ صرف ہندوستان کے تمام جغادری قسم کے ہنسوڑوں کو ایک محفل میں اکٹھا کر دیتے ہیں بلکہ بیرونِ ہند سے بھی اس نوع کی نعمتیں امپورٹ کر کے لوگوں کی ضیافتِ طبع کے اسباب فراہم کرتے ہیں ۔

شگوفہ میں مقدار اور معیار و مزاج کے اعتبار سے جس قدر مواد ہوتا ہے ۔ قیمت کے اعتبار سے اسے سستی ڈول کہا جاتا ہے ۔ اور پھر اس میں ہر مضمون ایسا ہوتا ہے جسکے لئے ہمارے اکثر ہنسنے ہنسانے سے خصوصی شغف رکھنے والوں کو بیسیوں ادبی اور صحافتی مذہبی رسالے خریدنے دیکھا ہے ۔ مثال کے لئے بیسویں صدی اور تجلی کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں علی الترتیب فکر تونسوی اور ملا ابن العرب مکی کے مستقل کالم اور فیچر ہوا کرتے ہیں ۔ شگوفہ کے آسمانِ صحافت پر طلوع ہونے کے بعد صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ اس قسم کے بیسیوں مضامین نظم و نثر بیک وقت ایک ہی رسالے میں مل جاتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ شگوفہ کی خاطر خواہ پبلسٹی نہیں ہو پائی ہے ورنہ یہ اس قابل ہے کہ ہندوستان کے اردو رسائل میں سب سے زیادہ چھپے اور ہر اس شہر اور قصبے تک اس کی رسائی ہو جہاں کہ اردو جاننے والے بستے ہوں ۔ گزشتہ دنوں دسویں سالگرہ کے مشہور و معروف مبارکباد جشن کا تذکرہ ہوا ۔ یہ جانکر [illegible] کے نام سے بھی آشنا نہیں ۔ محبوب راہی ، بارسی ٹاکلی (اکولہ)

●

مارچ ۱۹۷۸ء کا شگوفہ موصول ہوا۔ ماشاءاللہ ہمارا یہ محبوب رسالہ آپ جیسے اعلیٰ ذوق کی زیرِ سایہ بہت اچھا شائع ہو رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ "شگوفہ" کے حسن میں دن بدن نکھار آ رہا ہے اللہ میاں اسے نظرِ بد سے بچائے۔ آمین۔ جناب لئیق صلاح صاحب کا مضمون "اگر میں" اور جناب ڈی۔ کے۔ کنول صاحب کا مضمون "ماڈرن آپریشن" بہت پسند آیا۔ اس کے برعکس جناب ارشد علی خان نے اپنے مضمون "شادی کا ہنگامہ" میں قاضی کی جو درگت بنائی ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ ہاشم صاحب کی غزل نہایت خوبصورت ہے۔ میری دعا ہے کہ شگوفہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے

م۔ ا۔ انصاری بھوپال

●

مکرمی، تسلیم! شگوفہ کا تازہ شمارہ پڑھا، خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہے۔ نثر و شعری دونوں حصے لاجواب ہیں۔ "ابراہیم جلیس نمبر" اور "ڈرامہ نمبر" کا انتظار ہے

سیّد احمد قادری ۔ گیا

●

مکرمی سلام مسنون: میرے عزیز شاگرد، قادر کلیم پوری نے آپ کا ماہنامہ "شگوفہ" نظر سے گزارا، دیکھکر خوشی ہوئی۔ خدا آپ کو اپنی مساعی میں کامیاب کرے۔

میرے خیال میں ملک بھر میں اس وقت کوئی خالص مزاحیہ پرچہ نہیں نکل رہا ہے اسلیے آپ کے ماہنامہ کی ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ البتہ آپکو اس کے مضامین، نظم و نثر پر ذرا زیادہ توجہ دینا پڑے گا۔

مرزا مشتاق علی بیگ
لکھیم پور، کھیری

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اداریہ

اعلان کے مطابق یہ شمارہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے گیارہویں سالانہ اجتماع کے سوونیر کے طور پر شائع ہونا چاہیے تھا لیکن حیدرآباد میں ایک ہفتہ تک ہنگاموں کا سلسلہ چلتا رہا۔ جس کی تان تین روزہ کرفیو پر ٹوٹی۔ چنانچہ زندہ دلان کی سالانہ تقاریب ۱۴ر اور ۱۵ر اپریل کی بجائے ۲۸ر اور ۲۹ر اپریل ۱۹۷۸ء کو منعقد ہو رہی ہیں۔ اپریل کا شمارہ اس وقت تک روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے فوری طور پر عام شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب مئی کا شمارہ سوونیر ہوگا۔ اور جون کا "ابراھیم جلیس نمبر"

۲۸ر اپریل کو ساڑھے ۵ بجے شام زندہ دلان کی گیارھویں سالانہ تقاریب کا آغاز ہوگا۔ جناب گنگا ریڈی صاحب وزیر اکسائز حکومت آندھرا پردیش ان تقریبات کی مجلس استقبالیہ کے صدر ہیں۔ ۲۸ر اپریل کو ساڑھے ۵ بجے شام نامور مزاح نگار جناب فکر تونسوی کی صدارت میں ادبی اجلاس ہوگا جس میں مشہور و مقبول مزاح نگار جناب یوسف ناظم، جناب مجتبیٰ حسین، جناب فضل جاوید، جناب پرویز یداللہ مہدی کے علاوہ حیدرآباد کے ممتاز مزاح نگار اپنے مضامین سنائیں گے۔ جناب ایم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج حکومت آندھرا پردیش مہمانِ خصوصی ہونگے ۲۹ر کو نمائش میدان پر منعقد ہونے والے کل ہند مزاحیہ مشاعرہ میں جن مزاح نگاروں کی شرکت ہوگی ان میں جناب دلاور فگار بطور خاص شریک ہو رہے ہیں۔ مہمان شعراء میں کا ہاشمی، آفتاب بلکٹی، ناظم انصاری، ساغر لکھنوی، ظہیر ابن قدسی شامل ہیں

امید ہے کہ مزاح نگاروں کا یہ تہذیبی جشن جناب بھارت چند کھنہ اور جناب نریندر لوتھر کی، ہنگامی صاحب کی ہدایت کامیابی و اہتمام کے ساتھ منعقد ہوگا۔

جلد ۱۱
شمارہ ۶

جون ۱۹۷۸ء

قیمت
۱/۵۰
سالانہ
۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے
۳۵ شلنگ

مُدیر :
سید مصطفٰے کمال

مجلسِ ادارت :
منظور احمد، حمایت اللہ، مسیح انجم

مجلسِ مشاورت :
راجندر سنگھ بیدی، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

طباعت لیتھو :
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان۔ حیدرآباد ۲ کے لئے دائرہ پریس، چتہ بازار، حیدرآباد ۲
طباعت ٹائٹل :
اسٹینڈرڈ ایکوپمنٹس، شانتی نگر، حیدرآباد
بائینڈنگ :
محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو دربار حسینی، پرانی حویلی، حیدرآباد ۲

خط و کتابت اور
ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ شگوفہ
۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱
فون : 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

مجتبیٰ حسین

ڈائرکٹر کا کُتّا

وہ ڈائرکٹر کا کُتّا تھا۔ ڈائرکٹر کی طرح ہی خونخوار اور رعب داب والا، کیوں نہ ہو آخر کو وہ ڈائرکٹر کی صحبت میں جو رہتا تھا۔ اس کا نام کیا تھا یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ لوگوں کو بس اس کا عہدہ معلوم تھا یعنی ڈائرکٹر کا کتا۔ ایک تو کتا اور اوپر سے ڈائرکٹر کا کتا گویا کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا بقول پطرس بخاری "بہت ہی کتا" تھا۔ ڈائرکٹر جب اپنی کار میں دفتر آتا تو یہ اس کی پچھلی نشست پر بیٹھا دفتر کی خاتون کلرکوں کو دیکھ دیکھ کر رال ٹپکایا کرتا تھا۔ کار ڈائرکٹر کو چھوڑتی اور کتے کو لے کر واپس چلی جاتی تھی۔ ڈائرکٹر اپنے ساتھ کتے کو کیوں لاتا تھا اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈائرکٹر اپنی شخصیت میں "کتے" کی ملاوٹ کر کے اپنے رعب اور دبدبہ میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مگر ہمارا خیال اس معاملہ میں بالکل دوسرا تھا۔ ہم یہ کہتے تھے کہ اس کتے میں بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر اس کی شخصیت میں سے ڈائرکٹر کو منہا کر دیا جائے تو اس کتے میں صرف دُم باقی رہ جائے گی۔ جو ہم جیسے ایرے غیروں کے آگے بھی ہلتی رہے گی۔ اس کتے میں دُم کے بعد جو کچھ ہے وہ صرف "ڈائرکٹر شپ" ہے۔ اس استدلال کو ثابت کرنے کے لئے ہم ڈائرکٹر کے پرسنل اسسٹنٹ کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ کبھی کبھی تو وہ ہمیں نہ صرف اس کتے سے بھی زیادہ خونخوار نظر آتا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس کے نکیلے دانت اور ضرر رساں پنجوں کے علاوہ اس کی دُم بھی دکھائی دینے لگتی ہے پھر ہم اس دعوی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لئے خود اپنے کتے کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ ایسا اسپیشل کتا ہے جس کی ولدیت میں شاید ہی شبہ کیا جا سکتا لیکن چونکہ ایک معمولی عہدہ دار کا کتا ہے اس لئے محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے تک سارا سارا دن اس کی دُم سے لٹکتے رہتے ہیں۔ کتا پالنے کے معاملے میں صرف کتے کی نسل ہی نہیں دیکھی جانی چاہیئے بلکہ جو آدمی کتا پالتا ہے اس کے سلسلۂ حسب نسب کی بھی چھان بین ضروری ہے۔ دُنیا میں ہر شئے اضافی ہے۔ اگر ہمارا کتا کسی نجیب الطرفین

عہدیدار کا کُتّا ہوتا تو آپ دیکھتے کہ اس کی کیسی عزت و توقیر ہوتی۔ انسانوں کی اونچ نیچ بعد میں کتّوں کی اونچ نیچ کا سبب بن جاتی ہے۔

بات اصل میں ڈائرکٹر کے کُتّے کی ہو رہی تھی اور ہم دوسرے کتّوں پر بھونکنے لگے۔ ایک دن یوں ہوا کہ ڈائرکٹر جب اپنی کار سے اُتر کر اپنے آفس میں چلا گیا تو یہ کتا کسی طرح کار سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیور جوزف نے واپس آکر دیکھا تو کتا غائب تھا۔ ڈرائیور کے پسینے چھوٹ گئے۔ اگر کتا غائب ہو گیا تو اس کی نوکری بھی غائب ہو جائیگی اتفاق سے وہاں اس وقت دفتر میں داخل ہو رہے تھے۔ اس نے پکار کر کہا "بھئی ڈائرکٹر صاحب کا کتا چھوٹ گیا ہے اُسے پکڑنے کی کوشش کرو" ماجی ادھیڑ عمر کے آدمی۔ کم۔ کلرک تھے۔ دس برسوں سے انھیں کوئی پروموشن نہیں ملی تھی۔ اس میں قصور اُن کی کانفیڈنشیل رپورٹ کا تھا۔ ہر عہدیدار نے یہی لکھا تھا کہ یہ کوئی کام کرنا نہیں جانتے۔ بڑی پیروی اور کوشش کے بعد اب انھوں نے اپنی ترقی کے سلسلہ میں اپنی فائیل ڈائرکٹر کے پاس بھجوائی تھی اور اب یہ فائیل اسکی میز پر زیر تصفیہ تھی۔ جیسے ہی انھیں ڈائرکٹر کے کتّے کے غائب ہونے کی اطلاع ملی ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے سوچا اپنی ترقی کے معاملہ کو پکا کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہے۔ پہلے ہی ہر عہدہ دار نے یہ لکھا کہ وہ کوئی کام کرنا نہیں جانتے لیکن وہ ڈائرکٹر کے کتّے کو پکڑ کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ ایک کام تو کر سکتے ہیں۔ یکلخت انھوں نے سوچا یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ کتّے کا کار سے بھاگنا، ترقی کی فائیل کا ڈائرکٹر کے پاس پہونچنا اور عین وقت پر اُن کا دفتر میں داخل ہونا یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی ترقی کے مشورے آسمانوں میں ہو رہے ہیں۔

ڈائرکٹر کے ڈرائیور نے پھر ایک بار پکار کر کہا "بھائیو! ڈائرکٹر صاحب کا کتا بھاگ گیا ہے تم لوگ اُسے پکڑنے کی کوشش کرو ورنہ میری نوکری خطرہ میں پڑ جائے گی۔"

ماجی نے جواباً پکار کر کہا "جوزف! اب اس بات کا زیادہ اعلان کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں اکیلا ہی اس کتّے کو پکڑوں گا۔ سوال تمہاری نوکری کا ہی نہیں میری پروموشن کا بھی ہے۔" مگر اس وقت تک جوزف کی آواز نٹراجن کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ نٹراجن دفتر کا اکاؤنٹنٹ تھا اور بعض حسابی دھاندلیوں کے سلسلہ میں اس کے خلاف تحقیقات چل رہی تھیں اور فائیل اس وقت ڈائرکٹر کے میز پر زیر تصفیہ تھی۔

نٹراجن نے پکار کر کہا "جوزف تم فکر نہ کرو۔ میں اس کتّے کو پکڑونگا۔ ڈائرکٹر صاحب کے کتّے کے لئے میں اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔ میں اس کے لئے اپنا آخری قطرۂ خون بھی بہا سکتا ہوں۔ جہاں جہاں اس کا پسینہ گرے گا وہاں وہاں اپنا خون بہا دوں گا۔" اس نے اپنا تھیلا نیچے رکھا اور کمپاؤنڈ میں بھاگنے لگا۔

ماجی نے پکار کر کہا "نٹراجن! حساب میں دھاندلی کرتے ہو تو ضرور کرو مگر کتّے کو پکڑنے کے معاملے میں دھاندلی نہ کرو۔ جوزف نے پہلے مجھ سے اس کتّے کو پکڑنے کے لئے کہا تھا تو بیچ میں کیوں آتے ہو؟"

نٹراجن نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تمہاری ترقی کی فائیل ڈائرکٹر کی میز پر ہے لیکن تمہیں یہ بھی جاننا چاہئے کہ میرے خلاف جو تحقیقات چل رہی ہیں اس کی فائیل بھی ڈائرکٹر کی میز پر ہے۔ اس کتّے کو پکڑنے کا حق مجھ

اتنا ہی حق پہونچتا ہے جتنا کہ تمہیں پہونچتا ہے۔ پھر کیا تم نے کتوں کو پکڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟"

اور پھر تینوں کمپاؤنڈ میں بھاگنے لگے۔ کتا کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد کمپاؤنڈ کے ایک گوشہ میں انھیں کتا نظر آگیا۔ کتے کی حرکتوں اور بے چینی سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے ایک کھمبے کی تلاش ہے۔"

ورماجی جوش سے بولے " لگتا ہے بیچارا کتا پیشاب کرنا چاہتا ہے اور اُسے کوئی کھمبا نہیں مل رہا ہے تم اور نٹراجن یہیں ٹھیرے رہو، میں اپنی ٹانگ کھمبے کے بطور اس کے سامنے رکھ دونگا۔"

نٹراجن بولا " نہیں! یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اسے پیشاب کرنے کا موقع دیئے بغیر پکڑوں گا۔"

ورماجی بولے " تم تو قصائیوں سے زیادہ بے رحم نکلے۔ قصائی تک کسی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے تو اسے پانی پلا دیتا ہے۔ اگر تم نے اُسے پیشاب نہیں کرنے دیا تو میں ڈائرکٹر صاحب سے شکایت کر دوں گا۔ یہ کہہ کر ورماجی اپنی ٹانگ کتے کے آگے رکھنے چلے۔ نٹراجن نے پیچھے سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے اور اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کتا اُن کی حرکتوں سے چوکنا ہوکر بھاگ کھڑا ہوا۔ تینوں کتے کے پیچھے بھاگے۔ اس دوڑ میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب نٹراجن اس کتے کو آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ اُس کا ہاتھ اس کے گلے میں پڑے ہوئے پٹے تک پہونچنے ہی والا تھا کہ ورماجی نے اس کی ٹانگ میں اپنی ٹانگ کچھ اس طرح پھنسا دی کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

ورماجی طالب علمی کے زمانے میں فٹ بال کے بہترین کھلاڑی رہ چکے تھے۔ بچپن کا تجربہ کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ نٹراجن کے منہ سے اچانک خون نکلنے لگا۔ اس نے پکار کر کہا " ورماجی! آپ کتے کو پکڑ رہے ہیں یا فٹ بال کھیل رہے ہیں۔ پھر فٹ بال کھیلتے ہوئے آپ فاول ضرور کریں لیکن کتے کو پکڑنے کے معاملہ میں فاول بالکل نہیں چلے گی۔"

نٹراجن کے منہ سے نکلتے ہوئے خون کو دیکھ کر ورماجی نے کہا " نٹراجن۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم اس کتے کو پکڑنے کے لئے آخری قطرۂ خون بھی بہا سکتے ہو لیکن لگتا ہے۔ تم پہلے ہی قطرۂ خون پہ سٹپٹا گئے ہو۔"

نٹراجن بولا " ورماجی! میں یوں آسانی سے ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔ میرے آبا و اجداد نے سری رنگاپٹنم کی لڑائی میں انگریزوں کے خلاف اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ میری رگوں میں خالص خون دوڑ رہا ہے' میں اس کتے کو پکڑ کر ہی دم لوں گا۔"

اس اثنا میں سارے دفتر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ڈائرکٹر کا کتا چھوٹ گیا ہے۔ سارے عہدیدار اور کلرک اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے اور اپنی اپنی مجبوری کے مطابق اُسے پکڑنے کے لئے بھاگنے لگے لیکن اس جستجو میں ورماجی سب سے پیش پیش تھے۔ لگتا تھا وہ ترقی کے موقع کو کسی بھی قیمت پر ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے انھوں نے ایک لمبی جست لگا کر اُسے پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر کتا بڑا چالاک تھا۔ اس نے اچانک ان کی پتلون کا سیدھا پائنچہ اپنے دانتوں میں پکڑ لیا۔ کتا خونخوار تو تھا ہی اس نے ایک ہی جھٹکے میں ورماجی کی پتلون کے سالم پائنچے کا رشتہ بقیہ پتلون سے توڑ دیا۔ مگر ورماجی تب بھی ہراساں نہ ہوئے۔ یا نادم نہیں ہوئے بولے " ذرا اس کتے کی ہوشیاری تو دیکھو، کیسا سمجھدار کتا ہے۔ اس نے میری پتلون کا دایاں پائنچہ کھینچا ہے

جس میں چار پانچ پیوند لگے تھے "ہائے کیا ذہین کتا ہے ۔ میں تو قربان جاؤں اس کی ذہانت کے" اور وہ باجماعت واقعی اس کتے کی ذہنی بلائیں لیں ۔

کتے کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ اچانک کمپاؤنڈ سے بھاگ کر ریسپشنسٹ کے کمرے میں چلا گیا۔ دفتر کی ریسپشنسٹ بڑی خوبصورت تھی ۔ وہ سارا دن اپنے چہرے کا میک اپ بنانے میں لگی رہتی تھی ۔ جب بھی کوئی اس کے کاؤنٹر پر آتا تو وہ اچانک ٹوتھ پیسٹ بنانے والی کمپنیوں کا جیتا جاگتا اشتہار بن جاتی تھی ۔ وہ جب ہنس کر کسی کا استقبال کرتی تھی تو لوگ یہ تک بھول جاتے تھے کہ وہ آخر کس کام سے دفتر میں آئے تھے ۔ دفتر اور اہلِ غرض کے درمیان ریسپشنسٹ کی مسکراہٹ کی دیوار حائل تھی ۔ بہت سے کیس تو وہ اپنی مسکراہٹ سے ہی ڈسپوز کر دیا کرتی تھی ۔

دفتر کے باب الداخلہ پر اس کی مسکراہٹ یوں تھی جیسے گولکنڈہ کے قلعہ کے دروازہ پر عبدالرزاق لاری ۔
اس مسکراہٹ کو عبور کرنا بڑا دشوار کام تھا ۔ جب کتا اس کے کاؤنٹر پر پہونچا تو وہ حسبِ دستور اپنی ابروؤں کو مزید سیاہ بنانے کے بعد لپ اسٹک کی مدد سے اپنے ہونٹوں کو مزید سرخ کرنے میں مصروف تھی ۔ کتے کو دیکھتے ہی اس کی تاریخی مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی اور آنکھیں دھیرے دھیرے باہر کو نکلنے لگیں ۔ وہ گھبرا کر کاؤنٹر پر چڑھ گئی ۔ کتے کے پیچھے پیچھے دفتر کے دوسرے لوگ بھی کاؤنٹر پر پہونچے ۔ ریسپشنسٹ کی گھبراہٹ کو دیکھ کر سیکشن آفیسر جمال الدین نے کہا " میڈم ! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ یہ ڈائرکٹر صاحب کا کتا ہے ۔ تم اپنی مسکراہٹ کا آغاز کرو تاکہ یہ کتا مسحور ہو جائے اور ہمیں اس کو پکڑنے میں آسانی ہو " مگر وہ مسکراہٹ جو فی البدیہہ شعر کی طرح اس کے ہونٹوں پر آتی تھی کہیں غائب ہو گئی ۔

مگر کتا شاید عورتوں کے لئے "سافٹ کارنر" رکھتا تھا یا پھر شاید اس خیال سے کہ ان دنوں عورتوں کا بین الاقوامی سال منایا جا رہا تھا ، وہ وہاں سے اچانک بھاگ کھڑا ہوا اور کھڑکی کو پھلانگتے ہوئے ایڈمنسٹریشن سکشن کے کمرہ میں پہونچ گیا ۔ سیکشن آفیسر کلکرنی کو ڈائرکٹر صاحب کے کتے کے بھاگنے کی اطلاع تو مل چکی تھی مگر وہ اسے پکڑنے میں عملاً حصہ لینے سے مجبور تھے کیونکہ انھیں ایک ضروری فائیل ٹھیک بارہ بجے ڈائرکٹر کے پاس پیش کرنی تھی اور بارہ بجنے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا ۔ کتا کلکرنی کے کمرہ میں آیا تو وہ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے ۔ کتے نے پہلے تو میز پر چھلانگ لگائی اور پھر اُن کی میز پر پڑی ہوئی وہ فائیل اپنے دانتوں سے اٹھائی جس پر بظاہر TOP PRIORITY لکھا ہوا تھا ۔ کمرہ کے باہر اور اندر جمع لوگ کتے کی اس حرکت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے ۔ لوگوں نے کہا " دیکھو ! کیسا ہوشیار کتا ہے ۔ دفتر کے اصولوں سے کتنا واقف ہے ۔ اس لئے صرف وہی فائیل اٹھائی جس پر TOP PRIORITY لکھا ہوا تھا ۔ کلکرنی نے چیخ کر کہا " ارے ! یہ کیا مجھے تو یہ فائیل ٹھیک بارہ بجے ڈائرکٹر کے پاس پیش کرنی ہے ۔ کتے کو پکڑو یا نہ پکڑو اس فائیل کو تو اس کے منہ سے چھڑوا " کتے نے اس بار پھر ذہانت کا ثبوت دیا ۔ ڈائرکٹر کا نام سنتے ہی کتے نے فائیل اپنے منہ سے چھوڑ دی اور سیناریٹی کلرک سبھاش بلانی کا ٹفن باکس لے کر بھاگ گیا ۔ سبھاش بلانی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اس نے چیخ کر کہا " دوستو ! یہ ٹفن باکس اس کے منہ سے چھینو ۔ یہ میری عزت کا سوال ہے ۔ اگر کتے نے اس ٹفن باکس

کر کھول لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن باکس میں ڈال کر لاتا ہوں۔ پھر یہ اکلوتی چپاتی بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ڈائرکٹر صاحب کا کتّا کھاسکے۔

اتنے میں کتّا بھاگ کر محافظ خانہ میں پہونچا۔ محافظ خانہ کا انچارج رحمت علی سارا دن سونے میں مصروف رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سونے میں مصروف تھا۔ لوگوں نے پکار کر کہا "بھئی ڈائرکٹر صاحب کا کتّا تمہارے محافظ خانہ میں آگیا ہے کم از کم اب تو جاگو۔"

رحمت علی نے ایک جماہی لیتے ہوئے کہا "کتّا محافظ خانہ میں آگیا ہے تو تم کیوں فکر کرتے ہو وہ یہاں محفوظ رہے گا۔ بھلا آج تک محافظ خانہ سے کوئی چیز غائب ہوئی ہے؟"

ورما جی نے کہا "یار! تم اس کتّے کو پکڑنے میں ہماری مدد کرو۔"

رحمت علی نے کہا "اب بہت دیر ہوچکی، میں ڈائرکٹر کے کتّے کو نہیں پکڑوں گا کیوں کہ میں تو کل سے ریٹائر ہورہا ہوں میری قسمت اب اس کتّے سے بہت آگے نکل گئی ہے۔

ورما جی نے اپنی پروموشن کے لئے آخری کوشش کرنا چاہی مگر نٹراجن نے پھر انھیں پیچھے سے کھینچ لیا۔

دفتر میں شوروغل سن کر ڈائرکٹر باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ سارا دفتر اس کے کتّے کو پکڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس نے اپنے کتّے کو پیار سے پکارا۔ کتّے نے ڈائرکٹر کو دیکھ کر فوراً اپنی دم ہلانی شروع کردی اور اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ ڈائرکٹر نے بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنے کتّے کو پکڑا اور اُسے گاڑی میں بٹھا دیا۔ ہم نے دیکھا اس وقت دفتر کے سارے عہدیداروں کی دُمیں ہل رہی تھیں۔ ڈائرکٹر چپ چاپ اپنے کمرہ میں واپس ہوگیا۔

ورما جی اپنی پھٹی ہوئی پتلون کو سنبھال کر اپنی سیٹ پر پہونچے تو اُن کے ساتھی نے انھیں بتایا کہ ان کی پروموشن کے سلسلے میں جو فائیل ڈائرکٹر کی میز پر زیر تصفیہ تھی اب واپس آگئی ہے۔

انھوں نے پوچھا "کیا تصفیہ ہوا!"

ساتھی نے جواب دیا "اب تمہیں اپنی پرانی تنخواہ میں ہی نئی پتلون سلوانی ہوگی۔"

اُدھر نٹراجن جب اپنی میز پر پہونچا تو اُسے بتایا گیا کہ اُس کے خلاف الزامات ثابت ہوچکے ہیں اور نٹراجن کو یوں لگا جیسے سری رنگا پٹنم کی لڑائی میں اس کا آخری قطرۂ خون اب ٹپکنے ہی والا ہے۔

دوپہر میں دفتر کی کینٹین میں ورما جی اور نٹراجن ملے تو دونوں گلے سے لگ گئے اس لئے کہ اب ڈائرکٹر کا کتّا ان دونوں کے بیچ سے غائب تھا۔

٭٭

......کون پوچھے گا کنواروں کو

اسماعیل ظریف

سرِ بازار چل کر دیکھ لو پرہیز گاروں کو
بچا کر دیکھ لیتے ہیں نظر رنگین کاروں کو
کسی کی پارسائی قابلِ تسلیم تب ہوگی
قسم کھا کر وہ چھو لے ہاتھ سے بجلی کے تاروں کو
نہ دوگے داد تو پھر دیکھ لو آئندہ محفل میں
میں اپنے ساتھ لیکر آؤں گا فوجی سواروں کو
رقم جوڑنے کی لیکر بک رہے ہیں نوجواں اکثر
دکھاؤ آئینۂ عبرت کا ان قسمت کے ماروں کو
سنہرے دن گزر جائینگے اس جوڑے کے چکر میں
جوانی ڈھل گئی تو کون پوچھے گا کنواروں کو
کسی دن چل کے پبلک گارڈن میں دیکھ لو منظر
شکاری تاکتے پھرتے ہیں گلشن میں چکاروں کو
کسی کی چشم پوشی نے بڑھائے حوصلے انکے
پکڑ کر بھیج دے بند کر ڈالیے ان پردہ داروں کو
سڑک پہ جاؤ گے مجنوں کی طرح پٹ کے دیکھا نول
تصور میں بلانا چھوڑ دو فلمی ستاروں کو
یہ دیکھا جا رہا ہے لوگ بیٹے کے ولیمہ میں
خصوصاً بھول جاتے ہیں قریبی رشتہ داروں کو
اگر کچھ کار جو بی کام کرواتا ہو دفتر میں
بلا کر چائے پر دیدو لفافے پیش کاروں کو
کسی رہبر کی لچھے دار باتوں میں نہ آ جانا
نئے عنوان سے دیتا ہے چکر وہ ہزاروں کو
اڑاتے ہیں ڈنر جن کی بدولت آپ یہ پوچھو
دلیا ہے آپ نے کیا آج تک روٹی کے ماروں کو
مجھے بھی عارضی اعزاز گر مل جائے گر کرسی
بٹھا دوں گا میں دلماد وں اپنے رشتہ داروں کو

اگر شہرت کی خواہش ہے تو میرا مشورہ سن لو
بڑی ہوٹل میں بلوایا کرو نامہ نگاروں کو
ظریفؔ اپنا بھرم بھاری بتانا چھوڑ دو کیونکہ
سمجھ لیتا ہے ہر اہلِ نظر خالی پٹاروں کو

○

"ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے"
کالی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
جب سے لیڈر میاں بشیر ہوئے
روز کھیلے بھی بے نظیر ہوئے
عیب جوئی میں پائی وہ شہرت
اس محکمہ کے ہم وزیر ہوئے
جتنے احباب کو ملے پرمٹ
سال بھر میں وہ سب امیر ہوئے
ہم کو معشوق اس قدر ہے پسند
اس کے نخرے بھی دل پذیر ہوئے
اس ادارہ کا اب خدا حافظ
جس ادارے کے ہم مشیر ہوئے
ہم تو پڑھ لکھ کے ہو گئے بے کار
ہم سے بہتر تو ماہی گیر ہوئے
وہ محکمہ ہی ہو گیا کنگال
جس محکمے کے ہم وزیر ہوئے
اے بی سی بھی جنھیں نہیں آتی
جا کے لندن میں وہ سفیر ہوئے
کیسا آیا ہے انقلاب نظرؔ
کل بھکاری تھے اب فقیر ہوئے

نظر برنی

ڈاکٹر سید حامد حسین
بھوپال

قصّہ منہ بولی بھاوجوں کا

بلا دوستوں کے بھلا کون زندہ رہ سکتا ہے۔ پرانی یونانی کہانیوں سے نئی ہندوستانی فلموں تک سب دوستوں کی قربانیوں اور وفاداریوں میں ہمارے ایمان کو پختہ کرتے رہے ہیں ہمارا تجربہ بھی یہی کہتا ہے۔ اب دیکھیے تو کرنل شمشیر بہادر کے باغ سے کچے آموں کی چوری کرنے، دیر سے گھر لوٹنے کے لیے بہانہ سجھانے۔ غیر حاضر ہونے کے باوجود بھی کلاس میں حاضری لگوانے اور امتحان میں نقل کروانے میں آخر دوستوں ہی نے تو ہماری مدد کی ہے، ان دنوں واقعی زندہ رہنے کا مزہ تھا۔ جب ہم تھے اور دوست تھے۔ لیکن تب میں اور اب میں بڑا فرق ہے۔ تب نہ ان کی بیویاں تھیں اور نہ ہماری (صیغۂ واحد میں) اب بھی ہمیں اپنے دوستوں سے کوئی شکایت نہیں۔ ہمارے منہ کی رونق پر اثر تو ہماری منہ بولی بھاوجوں کی وجہ سے پڑتا ہے۔ ان معزز خواتین کی وجہ سے ہمیں وقتاً فوقتاً جو کرتب دکھانے پڑے ہیں ان کے طفیل ہمیں یقین ہے کہ ہم کسی وقت اپنی ساری ڈگریاں جلا کر کسی نہ کسی سرکس میں کوئی نہایت منافع بخش عہدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اب یہی دیکھیے پچھلے اتوار ہمارے دل میں ترنگ اٹھی کہ گوئل کے یہاں جا کر شطرنج کھیلی جائے۔ چنانچہ بیوی سے ایک اہم دفتری کام میں مشورے کا بہانہ کر کے ہم دوپہر کی گرمی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ گوئل کے دروازے پر پہنچ کر بڑے اشتیاق کے ساتھ دستک دینے ہی والے تھے کہ اندر سے گوئل اور مسز گوئل کی آوازیں ایسے خوفناک کورس میں بلند ہوتی ہوئی سنائی دیں جس سے ہمیں فوراً احساس ہو گیا کہ وہ باہمی خلوص کے امتحان کے ہفتہ وارانہ فریضے کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نازک موقع پر عمل اندازی نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ چنانچہ عافیت اسی میں سمجھی کہ بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن اسی وقت اچانک کھڑکی کھلی اور اس میں سے مسز گوئل کا چنگاریاں اگلتا چہرہ نمودار ہوا۔ ہم پر انھوں نے ایک چور کی طرح گرفت کی۔

"ہاشمی صاحب، واپس لوٹیے۔ آج آپ کو ایک اہم فیصلہ کرنا ہے" وہ گرجتی ہوئی بولیں۔

ہم چاہے اپنی بیوی کے تابعدار ہوں یا نہیں لیکن دوسروں کی بیویوں کی تابعداری اپنا اخلاقی فرض سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ جھینپتے ہوئے لوٹے۔ ڈرائنگ روم میں قدم نہ رکھا تھا کہ مسز گوئل نے گوئل کی ایک سو ایک زیادتیوں کی فہرست ایک سانس میں اس طرح دہرا [illegible] ہی تمام عمر اسی سے اب تک صرف اسی فہرست کو دہراتی رہی ہوں۔ اس کے ساتھ

بہ انھوں نے یہ حکم دیا کہ ہم گوئل سے کہہ دیں کہ وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ ہم کچھ کہنے پائے تھے کہ گوئل نے اس سے زیادہ لمبی فہرست اُس بدکردار بھرائے ہوئے لہجے میں پیش کردی جو الکشن کے آخری دنوں میں مقررین کی آوازوں میں پیدا ہو جایا کرتا ہے ابھی ہم گوئل کے حملے سے سنبھل نہ پائے تھے کہ مسز گوئل فرش کی طرف جھکیں۔ آخری سالم طشتری کو اٹھایا اور ڈانٹ کی ضرورت سمجھے بغیر اسے زور سے پھینکا۔ طشتری ہماری عینک کے شیشوں کے سامنے سے سن سے گزرتی ہوئی کھڑکی سے ٹکرائی اور اس کا شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہمارے قدموں میں آگرا۔ تقریباً دس منٹ تک یہ اسٹنٹ مکالمے جاری رہے اور اسی دوران گوئل اور مسز گوئل ایک دوسرے سے زیادہ بلند آواز میں ہمیں مخاطب کر کے کہتے رہے۔ ہم فریق ثانی کو ان کے انتہائی سنگین ارادوں سے واقف کرادیں۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس ناگوار موقع کی نزاکت سے بچائے رکھا۔ جب ہمیں کسی کی موافقت یا مخالفت میں کچھ کہنا پڑتا۔ دس منٹ بعد مسز گوئل نے پینترا بدلا۔ وہ حلق کی گہرائی سے گرجتے ہوئے اور ٹھوکر سے اسٹول کو دور پھینکتے ہوئے بولیں :

" ہاشمی صاحب! مجھے معلوم ہے آپ گوئل کے دوست ہیں۔ آپ نے نہ اس سے کچھ کہا ہے اور نہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ کو بلایا۔ آپ تو جا رہے تھے۔ جائیے۔ اٹھیے۔ جائیے"

یہ کہتے ہوئے وہ اس انداز میں ہماری جانب بڑھیں گویا ہمیں اٹھا کر پھینک دیں گی۔ ہم تیزی سے دروازے کے باہر پلٹے۔ پیچھے سے مسز گوئل نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ دھماکے سے قریب کا ایک گملا اٹھا اور ہمارے ٹخنے پر آکر لگا۔ موقع اتنا نازک تھا کہ ہم بلا ٹخنہ سہلائے بلکہ یوں کہیے اپنا ٹخنہ سر پر رکھ کر بھاگ نکلے۔ اس دن سے پھر ہم گوئل کے یہاں کبھی نہیں گئے۔ گوئل بھی جب کبھی ملتا ہے تو کترا کر نکل جاتا ہے۔

مسز گوئل کی برکت سے گوئل سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن مسز رستوگی کا حال بالکل برعکس ہے۔ رستوگی انتہائی خاموش طبع انسان ہے۔ اسے دنیا کے جھگڑوں سے کوئی مطلب نہیں۔ مجبوری نہ ہو تو شاید دفتر بھی نہ جائے۔ مسز رستوگی کی فرصت کا مشغلہ تعلقات پیدا کرنا ہے۔ چند ماہ پہلے شادی کے بعد نجمہ کو اپنے ساتھ لایا تب سے سرتھیں۔ مسز ہاشمی کو کیوں نہیں لاتے۔ مسز ہاشمی کو کیوں چھپائے رکھا ہے کیا مسز ہاشمی سوسائٹی پسند نہیں کرتیں۔ لاکھ سمجھایا ' نئی جگہ ہے ، نیا ماحول ہے۔ گھر کی ذمہ داریاں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک دن گھر پہنچے۔ اندازہ ہوا معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ضرورت سے زیادہ خاموشی ہے۔ کچھ کرید کی۔ معلوم ہوا مسز رستوگی خود آئی تھیں اور نجمہ کو یہ باور کرا گئی ہیں کہ ہم انھیں سوسائٹی کے قابل نہیں سمجھتے۔ ایک بچوری کی شکل میں نقد ساڑھے بائیس روپے کا صدقہ کر کے کسی طرح اس غم کو دھویا۔ اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا کہ مسز رستوگی گھر میں قوم دیر کے گدوں کی کمی کا اشارہ کر گئی ہیں۔ کبھی معلوم ہوتا کہ پردے کمرے کے رنگ سے میچ نہیں کرتے۔ کبھی نجمہ اس وجہ سے خفا ہیں کہ گھر میں فریج نہیں۔ کبھی اس پر اصرار ہے کہ ہینڈلوم کی نمائش سے نئے پرنٹس کیوں نہیں خریدے گئے ہیں۔ الغرض مسز رستوگی نے نجمہ کو سوشیل بنانے کی دشوار ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے اور وہ پابندی کے ساتھ سر میں اپنا کلاس لے رہی ہیں۔ ادھر ہمارا حلیہ اور ہماری جیب دونوں دن بدن تنگ سے تنگ تر ہو رہے ہیں۔ اور ابھی تک ہم فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ مدعی مقام کس کی کریں۔ مسز رستوگی کی ' نجمہ کی یا خود اپنی۔

نجمہ کی سوشیل عادتیں جس تیزی کے ساتھ ترقی پا رہی ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ خیال ہوا کہ فرمائشیں سننے کے لیے کم موقعے دیے جائیں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ چنانچہ یہ پروگرام بنایا کہ فرصت کا وقت کسی دوست

گھر گزارا جائے۔

گلکریجا سے عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ کالج چھوڑنے کے بعد ایک دواؤں کی کمپنی میں ایجنٹ ہو گیا تھا۔ اور اسی شہر میں مقیم تھا۔ شہر کے ایک فیشن ایبل حصے میں ایک خوب صورت فلیٹ میں رہتا تھا۔ جاکر دروازے کی گھنٹی بجانے اندر سے ایک حسین سی ڈنگ ڈانگ کی آواز آئی۔ جی چاہا ایک بار پھر بجائیں۔ لیکن دروازہ کھلا اور سامنے مودی کارٹون کا مجسم شباب بنی مسز گلکریجا کھڑی تھیں۔

"ہائے ہاشمی صاحب" انھوں نے ۱۲۰ ڈگری زاویے والی مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔

"گلکریجا ہیں" ہم نے سانس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"دورے پر گئے ہیں سنڈے پھر لوٹ کر آئیں گے ہیں" تارکی زبان میں جواب ملا۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں" ہم نے پلٹتے ہوئے کہا۔

"کہاں جائیں گے۔ کچھ لے کر جائیے" وہ سراپا اصرار بن کر بولیں۔

"ذرا مارکٹنگ کے لیے جانا ہے" ہم نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔

"آہا۔ آپ نے خوب یاد دلایا" وہ چہک کر بولیں "مجھے بھی مارکٹنگ کے لیے جانا تھا۔ اب آپ آگئے ہیں تو اچھی کمپنی رہے گی"

"لیکن.... لیکن...... میں تو...." اس ناگہانی مصیبت سے نجات پانے کے لیے ہمارے کسی عذر کرنے سے پہلے ہی وہ چھپاک سے دوسرے کمرے میں غوطہ لگا گئیں۔

"ملبوس چینج کرکے ابھی آئی" وہ اونچی آواز میں بولیں۔

بشرٹ کے دامن پر پسینے کی جو آٹھ دس بوندیں ایک ساتھ گر پڑی تھیں۔ ہم نے انھیں آہستگی سے رومال سے صاف کیا اور صوفے سے ٹیک لگا کر عینک کے دھندلائے شیشوں کو رگڑنے لگے۔

ابھی سانس قابو میں نہ آئی تھی کہ مسز گلکریجا تیزی سے کمرے سے برآمد ہوئیں۔

"چلیے"۔ وہ عجلت سے بولیں۔

انھیں دیکھ کر ہم یہ بھول گئے کہ ہمیں زمین پر قدم جماکر کھڑے ہو جانا ہے۔ کسی دوسری دنیا سے ابھرتی ہوئی ہمیں اپنی بے بس سی آواز سنائی دی۔

"چلیں—؟"

"جی ہاں۔ میں تو تیار ہوں" وہ اشتیاق کی کھنک کے ساتھ بولیں۔

"اسی طرح؟" ہم نے لرزتے ہوئے گلے سے ان کا لباس دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" انھوں نے اپنی مختصر سی ناک کو اس طرح حرکت دی گویا غصے میں ہمارے اوپر گھونسہ تان رہی ہوں۔

دراصل وہ ہمارے سامنے سرخ ریشمی تنگ پاجامے۔ ایک تنگ چمکدار ریشمی کرتے۔ گرتا گلے لمبے دوپٹے اور ناک میں بڑی سی تھرتھری پہنے۔ جوڑے میں ایک موٹا سا پھولوں کا ہار لپیٹے اور ہاتھ میں ایک بڑا سا سرخ ریشمی رومال لیے کھڑی تھیں۔ اس لباس کی اصل کے بارے میں ہم فاروقی سے دو دن قبل سن چکے تھے۔

مسز گلکریجا ان خواتین میں سے ہیں جو وقت کو ماڈرن ہونے کے آداب سکھاتی ہیں۔ ان کی بھنوؤں کی مصنوعی کمانوں سے ان

کہ ایک [illegible] والے 'نامے' تک ہر اجا فیشن کی لطافتوں سے خراج وصول کرتی ہے۔ ان کا محبوب مشغلہ تھیٹر ہے۔ دیکھنا نہیں اداکاری کرنا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جو رول کوئی نہ کر سکتا ہو، وہ کر سکتی ہیں۔ چنانچہ آج کل بھی وہ ایک ڈرامے میں کام کر رہی ہیں جسے دو دن قبل فاروقی نے دیکھا تھا جس میں اس کے بیان کے مطابق موصوفہ نے بڑے سلیقے کے ساتھ ایک طوائف کا رول ادا کیا تھا۔

ہمارے حواس شاید اسی وجہ سے قابو میں نہیں تھے کہ ان کا لباس ان کے ڈرامائی کردار کی یاد دلا رہا تھا۔ ہم نے جھینپتے ہوئے ان سے سوال کیا۔

"آپ کا یہ ڈرامے کا کاسٹیوم تو راستے میں خراب نہیں ہوگا؟"

"اوہ" وہ بڑے زور سے ہنسیں "تو جناب اس وجہ سے پریشان ہیں۔ تو سنیے ہاشمی صاحب۔ یہ کاسٹیوم میں نے پہنا ہے آپ نے نہیں۔ آپ کو کیا فکر؟" ——— پھر رازدارانہ لہجے میں بولیں،

"بات یہ ہے کہ وہ مسز ملجانی ہے نا۔ اس کے گھر کے سامنے سے گزرنا ہوگا اور وہ کم بخت میری ساری ساڑیاں مجھے پہنے دیکھ چکی ہے۔ اس وقت سوائے اس کاسٹیوم کے اور کوئی نئی چیز ہی نہیں تھی۔ میرے پاس، اس لیے پہن لی۔ چلے گا۔ یہ بھی چلے گا" وہ بڑے پیشہ ورانہ اعتماد کے ساتھ بولیں۔

اسی وقت برابر والے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔

"دیکھیے وہ مینکی اٹھ آئی" ہم نے کہا۔

"پنکی نہیں چنکی" انھوں نے صحیح کیا۔

آس پاس ٹنکی، پنکی، چنکی اتنے ہو چکے تھے کہ اب ہمیں ان ناموں میں کوئی تمیز نہیں رہ گئی تھی۔

"اب تو چنکی اٹھ ہی آئی ہے۔ بازار پھر چلیں گے" ہم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"واہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چنکی کو بھی ساتھ لیے چلتے ہیں" وہ لپکیں اور جلد ہی اپنی ایک سالہ بچی کو بچہ گاڑی میں لیے آموجود ہوئیں۔

"چلیے۔" انھوں نے پھر نعرہ لگایا۔

ابھی دروازہ کھول کر باہر قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ ایک سفید بالوں والی بڑی سی گلہری بجلی کی تیزی سے لپکی اور ہمارے بیل باٹم کے پائنچے میں داخل ہو کر اوپر چڑھنے لگی۔ ہمارے معدے کی گہرائی سے ایک چیخ ابھری جسے بڑی کوشش سے ہم نے حلق کے آخری سرے پر دبایا۔ لیکن ہمارے جسم میں کلاسیکی رقص کے بھاؤ دیکھ کر مسز ٹکر بیجا صورت حال تاڑ گئیں اور انھوں نے اپنی پیشانی پر ڈیڑھ انچ اور سوا دو انچ کی دو خفیف شکنیں ڈال کر زور سے آواز لگائی،

"ڈمپل"

اور دوسرے ہی لمحے وہ خوب صورت گلہری ان کے قدموں میں لوٹ رہی تھی۔

"اچھا تو اسے بھی ساتھ لے چلیں۔" وہ اپنے نازک سے کتے کو مادرانہ شفقت کے ساتھ گود میں اٹھائے بولیں ایک بار پھر اندر لپکیں۔ اس بار وہ کتے کو ایک لمبے تسمے میں باندھ کر لائیں۔ اور میرے ہاتھ میں تسمے کو تھما دیا۔

"بہت شریر ہے" وہ لاڈ سے بولیں "لیکن اب پریشان نہیں کرے گا"

ان پے در پے حادثوں میں ہم کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بھول چکے تھے۔ اتفاقاً سر پر ہاتھ پھیرا تو سر کے سارے بال نادیدہ قائمہ بنائے کھڑے تھے۔ تھپک تھپک کر انہیں برابر کیا۔ گھر سے نکل کر سڑک پر آئے۔ زیادہ ہجوم نہ تھا۔ لیکن ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے آج ہر شخص دو ایکسٹرا آنکھیں اپنے ساتھ لے کر نکلا ہے۔ دو سے وہ مسز گگریجا کو دیکھ رہا ہے اور باقی دو سے ہمیں۔ کبھی کبھی تو کوئی اسکوٹر یا کار تیزی کے ساتھ قریب سے نکل جاتی اور اپنی آنکھیں وہیں خلا میں تیرتی چھوڑ جاتی۔

سڑک کے موڑ پر پان والے کی دوکان کے گرد پتہ نہیں کب سے لوگ اکٹھا تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو کسی نے زور سے سیٹی بجائی سڑک کے پار کسی اور نے سیٹی سے جواب دیا۔ مسز گگریجا سڑک کے بیچ پہنچ چکی تھیں۔ ایک اسکوٹر والے نے سیٹی کا غلط مطلب سمجھ کر زور سے بریک لگائی وہ اچھل کر مسز گگریجا کے آغوش میں آگرا اس کا اسکوٹر گلہری نما کتے کے پٹے سے ٹکرایا اور چشم زدن میں کتا ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر غائب ہو چکا تھا۔ لیکن اسی لمحے ایک ٹرک کے زور سے بریک لگانے کی آواز آئی۔

ٹریفک پولیس والے سمیت سب اُدھر دوڑ پڑے۔ بھیڑ کی کشش ہمیں بھی ادھر دوڑا لے گئی۔ ٹرک ڈرائیور کچھ کتے کی بات کر رہا تھا۔ اب ہماری سمجھ میں کچھ صورت حال آئی۔ لیکن اِدھر اُدھر نظر ڈالنے کے باوجود کتا بحالت زندہ یا مردہ نظر نہ آیا۔

سپاہی نے ڈانٹ کر پوچھا "کتا کس کا تھا"

ہم نے بے بسی سے کہا "ہمارا"

"کہاں گیا وہ"۔ اس نے پھر سوال داغا۔

"ہمیں نہیں معلوم" ہم نے سہم کر جواب دیا۔

"دیکھو!" اس نے ٹرک پر ایک گھونسا جماتے ہوئے حکم دیا۔

ہم نے ٹرک کے پہیوں کا جائزہ لیا۔ اس کے اردگرد نظر ڈالی۔ کتا کہیں نظر نہ آیا۔

اسی درمیان مسز گگریجا "ہائے میرا ڈمپل" کہہ کر فٹ پاتھ پر بے ہوش ہو چکی تھیں۔

اچانک ہمیں ٹرک کے نیچے ایک جگہ کچھ تسمہ سا نظر آیا۔ جھک کر دیکھا۔ ٹرک کی باڈی کے نیچے ایک موٹی سلاخ پکڑے کتے صاحب لٹک رہے تھے۔ بلا سوچے سمجھے ہم سڑک پر دوزانو ہوئے۔ جھک کر تسمہ پکڑا اور اسے کھینچنے لگے۔ کتے نے اپنی پناہ گاہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے زور لگایا۔ جھٹکے کے ساتھ کتا تو باہر نکل آیا لیکن کسی آنکڑے سے اٹک کر ہماری بش شرٹ کی ایک آستین ٹرک کے نیچے ہی جھنڈی کی طرح لٹکی رہ گئی۔ موقع ایسا تھا کہ آستین تو کیا اگر ہمارا ہاتھ بھی وہاں رہ جاتا تو ہم اس کی پرواہ نہ کرتے۔ بڑی عجلت سے ہم کتا لیے فٹ پاتھ کی طرف فاتحانہ انداز سے لپکے جہاں پان والے کی دکان کی پوری بھیڑ مسز گگریجا کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔ کتے کو دیکھتے ہی وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکیں اسے گود میں اٹھا کر بے تحاشا پیار کرنے لگیں۔ چاروں طرف رقت کا سماں تھا۔ فرشتے بھی آسمان پر اڑتے اڑتے تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر گئے تھے۔

لیکن صحیح ہے وقت ہر زخم پر مرہم رکھ دیتا ہے۔ چند منٹوں میں تھمی ہوئی دنیا میں حرکت آگئی اور ہم لوگ بھی بازار میں پہنچ گئے مسز گگریجا بڑے انہماک سے شوکیسوں میں سجی چیزوں کو دیکھ رہی تھیں کہ اچانک سامنے والی دکان سے "ہائے" کے نعرے کے ساتھ ایک زلزلہ نمودار ہوا اور دوڑ کر مسز گگریجا سے لپٹ گیا۔

"ہائے سیما" مسز گگر بجا بھی اپنی پوری ڈرامائی فنکاری کے ساتھ کہتی ہوئی اس سے بغل گیر ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے وہ پنکی، جی نہیں چنکی کی گاڑی کا ہینڈل ہماری طرف گھمانا نہ بھولیں۔ ہم نے انتہائی سعادت مندی سے ایک ہاتھ سے گاڑی سنبھالی اور دوسرے میں گٹھری بنا کتے کا پٹہ اور نو وارد خاتون کے مچھر مار کریم کی بو والے سینٹ اور کولگیٹ ڈینٹل کریم کی مہک کی حد سے باہر سرک آئے۔

"ہائے تو نے شادی بھی کر لی اور مجھے پوچھا بھی نہیں" ان خاتون نے مسز گگر بجا کے شانے کے اوپر سے ہمیں چالان کر کے بحق سرکار ضبط کر لینے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ہمیں اپنی دریدہ آستین اور گھٹنوں پہ کیچڑ کے نشانوں کے احساس سے پسینہ آگیا۔ ان خواتین کے درمیان اس کے بعد کیا مکالمہ ہوا ہمیں پتہ نہیں۔ ہوش تب آیا جب مسز گگر بجا نے ہماری طرف دیکھ کر کہا "چنکی کا دھیان رکھئے گا۔ میں ابھی آئی" اور وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی دوست کے ساتھ دکان میں داخل ہو گئیں۔

ان کے جاتے ہی بنکی یا چنکی یا جو بھی ہو اس نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا اور قریب سے گزرتے ہوئے لوگوں نے ہمیں اس طرح گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا گویا ہم کسی کا بچہ چرا کر بھاگ رہے ہیں۔ صورت حال اتنی سنگین ہو رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی حل نکالنا نہایت ضروری تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے کبھی بچے نہیں بہلائے تھے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے بچوں کو دیکھا تھا اور خود بھی بچہ رہنے کا تجربہ تھا۔ خیال آیا کہ بچی بھوکی ہو گی لیکن اس کی بھوک کے ازالے کے لیے ہمارے پاس کوئی وسیلہ نہ تھا یاد آیا کہ ایسی صورت میں بچے کے منہ میں نپل لگا دیا جاتا ہے۔ وہ بھی موجود نہ تھا۔ سوچا کہ بجائے نپل کے بعض بچے انگوٹھا بھی چوس لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے کتے کے پٹے کو اپنی پینٹ کی بیلٹ میں الجھایا اور گاڑی کے قریب بیٹھ کر آہستگی سے بچی کا ہاتھ اٹھا کر اس کا انگوٹھا اس کے منہ میں دینا چاہا لیکن بچی بھی ہمارا ارادہ بھانپ کر اکڑ گئی اور جب ہم نے زور لگایا تو اور زور سے چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ ان چیخوں کو سن کر ہم اتنے بدحواس ہو گئے کہ اور کچھ نہ بن پڑا تو اپنا ہی انگوٹھا جھٹکے کے ساتھ بچی کے منہ میں دیدیا لیکن اسکے منہ میں انگوٹھا دینے اور جھٹکے کے ساتھ بچی کے منہ سے نکال کر اپنے منہ میں لگانے کے وقفے کو شاید کوئی اچھی سے اچھی اسٹاپ واچ بھی نہیں ناپ سکتی تھی۔ ہمیں آج تک نہیں معلوم تھا کہ اتنے چھوٹے بچوں کے ایک یا دو دانت بھی اتنے خوف ناک حد تک تیز ہو سکتے ہیں۔

ابھی ہم اپنا انگوٹھا چوس کر اس کا درد رفع کر ہی پائے تھے کہ مسز گگر بجا دکان سے اس حالت میں برآمد ہوئیں کہ ان کی آغوش میں آٹھ دس پیکٹ اور بنڈل تھے۔ بچی کو روتا دیکھ کر وہ بھی بے تاب ہو گئیں۔ ہمارے قریب پہنچ کر انھوں نے سارے بنڈل ہمارے سر اوپر چھوڑ دیئے۔ ہم نے کالج کے زمانے میں کرکٹ کے میدان میں حاصل کی گئی ساری مہارت کو کام میں لیتے ہوئے ان بنڈلوں کو تیزی سے دبوچا۔ مسز گگر بجا نے بچی کو گود میں اٹھایا، گاڑی کو ایک ہاتھ میں سنبھالا اور چل دیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا کیوں کہ یہ سب بنڈل ہماری ناک سے بھی اوپر پہنچے تھے۔ اب ہمارے لیے صرف مسز گگر بجا کے جوڑے کا پیکوڈا قطب نما کا کام کر رہا تھا۔ کتا ہماری بیلٹ میں بندھا ہوا تھا اور ہم اندھوں کی طرح اس کے اشارے پر قدم بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ کسی شخص سے ٹکر ہوئی۔ اس نے بنڈلوں کے بیچ میں سے جھانکتے ہوئے نعرہ لگایا

"ارے یار ہاشمی! یہ تم ہو۔"

"ہاں بھئی۔ اچھا کل ملیں گے" ہم نے کڑھتے ہوئے اگر والے کے بچے کو ٹالا

اس نے ایک بار پھر ہم پہ نظر ڈالی پھر آگے بڑھتی مسز گگر بجا پر اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "اچھا مسز کے ساتھ ہو!"

ہم بلا جواب دیئے آگے بڑھ گئے۔

مسز لکڑیجا کے گھر جیسے تیسے بنڈلوں اور کتے سے نجات پاکر سیدھے گھر بھاگے۔ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ دیکھا اوپر سے مسز رستوگی اپنی ڈیڑھ فٹی ایڑیوں پر جھولتی جھومتی چلی آرہی ہیں۔ خلاف معمول انھوں نے بڑی رکھائی سے "نمستے" کہا اور پہلو بچا کر نیچے اتر گئیں۔

حسب عادت ہم نے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے گھنٹی کا بٹن دبانا چاہا۔ لیکن اس وقت تک انگوٹھا دوگنا ہو چکا تھا۔ چنانچہ دوسرے ہاتھ کی مدد لینا پڑی۔ گھنٹی کچھ زیادہ زور سے بجی اور اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ دروازہ کھلا۔ دروازہ بند کر کے جو پیچھے مڑے تو نجمہ نہ صرف غائب تھیں بلکہ پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ وہ شاید اسکول میں لانگ جمپ کے ریکارڈ قائم کرتی رہی ہوں گی۔ کیوں کہ انھوں نے دروازے سے جو چھلانگ لگائی تھی تو سیدھے اپنے بستر میں۔ بستر میں پہنچ کر ان کے پورے جسم میں ایسی جنبش ہو رہی تھی جیسی کہ ۱۲۵ میل چل لینے کے بعد جنگ عظیم سے قبل کی کسی شیورلیٹ گاڑی کے ریڈی ایٹر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی آتش فشاں لاوا اگلنے کی ابتدائی مشق کر رہا ہے۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تاکہ معلوم کریں کہ کیا بات ہے۔ لیکن اس کے بعد حالات اتنی تیزی کے ساتھ پلٹے کہ ہمیں ٹھیک یاد نہیں کہ سب کچھ کس ترتیب میں ہوا۔ لیکن پیالوں اور فرنیچر پر پڑے نشانات اب بھی اس واقعے کو اکثر یاد دلاتے ہیں۔

جب حالات پرسکون ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسز رستوگی نجمہ کو بتا گئی تھیں کہ ہمیں بھرے بازار میں کسی بازاری عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

یہ ہماری دکھ بھری کہانی ہے اور اسی لیے ہم دوستوں سے زیادہ دوستوں کی بیویوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ ●

سرتاج

(زمانہ حال میں)

مجھ پہ اس طرح سے دیدے نہ نکالو سرتاج
ہاں ابھی دیتی ہوں منہ اپنا سنبھالو سرتاج
اچھا کھانا ہو تو ہاتھوں سے پکالو سرتاج
ورنہ جو وقت پہ مل جائے وہ کھالو سرتاج
ڈاکٹر کہتے ہیں جس طرح کرالو سرتاج
مجھ کو ہر سال کی جھنجھٹ سے بچالو سرتاج
میری جوتی کو پڑی ہے جو سنبھالے گھر بار
گھر تمہارا ہے تمہی اس کو سنبھالو سرتاج
ٹال کر دیدہ و دانستہ میری باتوں کو
خود کو نادیدہ مصیبت میں نہ ڈالو سرتاج
آج جی سیر سپاٹے کو بہت چاہے ہے
خیر اب جیب و گریباں کی منالو سرتاج
میں غسل خانے سے ہو آؤں ذرا اتنے میں
ایک کپ میرے لیے چائے بنالو سرتاج
پان بھی کھاتے ہو سگریٹ بھی پیے جاتے ہو
چونچلے اتنے یہ یک وقت نہ پالو سرتاج
وقت بے وقت میرے طیش کو دعوت دے کر
اپنی عزت نہ سر راہ اچھالو سرتاج
جاؤ پھر آج تمہیں معاف کیے دیتی ہوں
اپنا سر اب میرے پیروں سے اٹھالو سرتاج
بور مجھ کو نہ کرو جاؤ مجھے سونے دو
اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگالو سرتاج
طنز کرتے ہو جو آشفتہ مزاجی پہ میری
منہ ذرا اپنے گریباں میں بھی ڈالو سرتاج
چھوڑ آؤ کسی صحرا میں اب اپنی ماں کو
میری ممی کو میرے پاس بلالو سرتاج
میں بھی بن جاؤں گی پھر ایک مکمل بیوی
خود کو ایک شوہر کامل تو بنالو سرتاج
مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہ پھر رہ پائے
سر کے بالوں کو ذرا اور بڑھالو سرتاج
تم ہو کس کھیت کی مولی کہ تمہیں چاہا جائے
پیار اور تم سے کروں؟ نام خدا لو سرتاج
تم کسی طرح سے شوہر تو نہیں لگتے ہو
خود کو بیوی مجھے خاوند بنالو سرتاج
تم بھی راہی کی طرح سیکھو سعادت مندی
تم ابھی ہر ناز میرا ہنس کے اٹھالو سرتاج

محبوب راہی

جنٹلمین

فادر کو ڈانٹ دیتے ہیں فادر کے سامنے
بیگم پہ جان دیتے ہیں مادر کے سامنے
کرتے نہیں یہ قدر پرانے لباس کی
بش شرٹ، پینٹ، کوٹ، سوئٹر کے سامنے
گھر پر تو ڈانٹ بیوی کی سنتے ہیں رات دن
غصہ حضور کرتے ہیں نوکر کے سامنے
چپراسیوں کے سامنے جن کی زباں ہو بند
وہ بات کیا کریں گے گورنر کے سامنے؟

مسیح صہبائی بند

فرید سحر

بیروزگاری سے چپراسی تک

"قصہ نوکری کا" دراصل ہماری چار روزہ زندگی کا ایک اہم، یادگار اور خطرناک قصہ ہے۔ اس اہم قصہ کی تاریخ ولادت کا ہمیں صحیح علم تو نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب یونیورسٹی نے بالآخر ہمیں گریجویٹ تسلیم کرلیا اور آگے پڑھنے کی مزید سکت باقی نہ رہی تو ہم نے فیصلہ کرلیا کہ جلد از جلد نوکری تلاش کرلی جائے تاکہ اس کے فوری بعد "قصہ چھوکری کا" شروع کیا جاسکے!

حضرت انسان کو جب کوئی نیا کام سوجھتا ہے تو وہ اس کام کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہے کہ کس طرح اس کام میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے؟ اور چونکہ اکثر لوگوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ ناچیز بھی ایک "انسان" ہے۔ لہذا ہم نے بھی چند خاص پہلوؤں پر غور کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے چند اہم محکموں کی ایک فہرست تیار کی تاکہ ان محکموں میں گھسنے کی کوشش کی جائے۔ ان تمام محکموں میں "محکمۂ مال" کو سرفہرست رکھا گیا تاکہ "غریبی ہٹاؤ" پروگرام کو کامیاب بنایا جاسکے۔ اس کے بعد "محکمہ آبکاری" کو موقع دیا گیا تاکہ ایک بہتر اور تابناک مستقبل کی آبیاری کی جاسکے۔ پھر "بنک" کو جگہ دی گئی۔ تاکہ آئندہ سسرال سے ملنے والی رقم کو محفوظ کیا جاسکے۔ "صحافت" کو بھی پیش نظر رکھا گیا تاکہ اہم سیاسی لیڈروں کی "پرائیوٹ لائف" کو بلیک میل کرتے ہوئے خود اپنی پرائیوٹ لائف کو مزیدار بنایا جاسکے۔ ہمارے آخری ٹارگٹ کے طور پر (کہیں بھی نوکری نہ ملنے کی صورت میں) "محکمہ تعلیمات" کو بھی فہرست میں شامل کیا گیا تاکہ آئندہ ہندوستان کی صدارت پر کمند ڈالا جاسکے (یاد رہے کہ جمہوریہ ہندوستان کے دو سابق صدور نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت مدرس ہی کیا تھا)

فہرست کو مکمل کرنے کے بعد ہم نے روزانہ پابندی سے اخبارات کا مطالعہ شروع کردیا۔ اخبار میں ہماری چیل سی نگاہیں صرف ان اشتہارات کو ڈھونڈتیں

جن کا عنوان ہوتا ہے "ضرورت ہے"۔ روزانہ اخبار میں چھپنے والی اہم سُرخیاں ہمارے لئے بے معنی ہوتیں۔ اہم شخصیتوں کے بیانات ہمارے لئے لغو تھے اس کے سوا کچھ نہ ہوتے اور اہم ملکوں کے درمیان چھیڑ چھاڑ محض ایک مسخرہ پن دکھائی دیتا ہم اخبار میں صرف اور صرف یہ دیکھتے کہ کہاں ــــ کس کو ــــ کس کی ــــ اور کیوں ضرورت ہے؟ اور پھر فوری ان مقامات کو اپنے ذہن میں نوٹ کرکے گھر لوٹتے۔

گھر لوٹنے پر جب بھائی صاحب دریافت کرتے کہ آج کی اہم خبریں کیا ہیں؟ ہم فوری ایک فرماں بردار طوطے کی طرح یوں شروع ہو جاتے! آج کی اہم خبریں یہ ہیں ــــ "ضرورت ہے ایک معمر تجربہ کار ڈرائیور کی جو ہیلمن کار چلانا جانتا ہو۔ تنخواہ ۔/150 روپے ماہانہ معہ کھانے کا خرچ اور روزانہ ۔/ 5 روپے بھتہ۔ درخواستیں پتہ ذیل پر روانہ کریں مینجر کلاسیپ میڈیکل ہال۔ حیدرآباد" ــــ ضرورت ہے ایک کلرک کی جو انگریزی میں مہارت رکھتا ہو۔ تنخواہ کا تصفیہ بالمشافہ ــــ ربط پیدا کیجئے "انگس اینڈ انگس نامپلی حیدرآباد" ــــ ضرورت ہے چند لیڈی ٹیچرس کی جو انگریزی میڈیم کے بچوں کو پڑھا سکیں۔ ٹرینڈ ٹیچرس کو ترجیح دی جائے گی۔ ہاتھ سے لکھی درخواستوں کے ساتھ پتہ ذیل پر حاضر ہوں ــــ "نہرو میموریل کنڈرگارٹن اسکول۔ کاچی گوڑہ حیدرآباد" "ضرورت ہے چند معمولی پڑھے لکھے نوجوانوں کی جن کو روزانہ ڈھائی روپے اجرت کے ساتھ بٹن بنانے کا کام سکھایا جائے گا ــــ ذاتی سیکل رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ درخواستوں کے ساتھ پتہ ذیل پر حاضر ہوں۔ "ڈومینین بٹن فیکٹری سلطان شاہی ــــ حیدرآباد"!! جب خبریں ختم ہو جاتیں تو بھائی صاحب غصہ سے آگ بگولہ ہو کر پوچھتے "کیا بکتے ہو ـــ نالائق؟ کیا یہی آج کی اہم خبریں ہیں؟ ہم نہایت معصوم بن کر دانتوں سے ناخن کاٹتے ہوئے جواب دیتے "جی ہاں بھائی صاحب کم از کم ہمارے لئے تو یہی اہم خبریں ہیں۔ کیا آپکے یہ اہم خبریں نہیں لگتیں؟ اس پر وہ جھلا اُٹھتے اور ممی جان سے کہتے کہ اس ناخلف کے دماغ کے سبھی پُرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اگر بروقت انھیں ٹائٹ نہیں کیا گیا تو پھر یہ ضرور پاگلوں کی انجمن میں پہونچ جائیگا۔ ایک دفعہ تو سچ مچ مزہ آگیا۔ ایک دن ایک صاحب نے جب ہم سے اہم خبریں دریافت کیں تو ہم نے وہی "ضرورت ہے" والی خبروں کا ورد شروع کر دیا۔ وہ صاحب بوکھلا کر کہنے لگے "ارے نہیں بابا ــــ آج کی اہم خبر تو یہ ہے کہ اندرا گاندھی عدالت میں مقدمہ ہار گئی ہیں۔ ہم نے فوری پوچھا "کون اندرا گاندھی؟ ــــ کیسا مقدمہ ـــ؟ کہاں کی عدالت؟ اچھا ہوا کہ ہم فوری وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ ورنہ پتہ نہیں وہ صاحب ہمارا کیا حشر کرتے! کیونکہ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اندرا گاندھی دراصل ہمارے ملک کی وزیر اعظم تھیں!

جب اخبارات کے اشتہارات ہمیں نوکری نہ دلا سکے تو ہمیں اخباروں سے سخت نفرت ہو گئی۔ اخبار کے ایڈیٹر ہمیں "دشمن حقیقی" دکھائی دینے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اخبار بینی سے قطع تعلق کر لیا۔ پھر ہم نے دفتر روزگار کے چکّر کاٹنے شروع کر دیئے۔ اس دفتر کے چکّر کاٹتے کاٹتے خود ہمیں چکّر کی بیماری لاحق ہو گئی ـــ پیر کی ایڑھیاں اسقدر گھس گئیں کہ اُن پہ پنجوں کا گماں ہونے لگا ــــ اور سر کے بال اتنے زیادہ کم ہو گئے کہ ہم "شادی شدہ" دکھائی دینے لگے! آخرکار قدرت کو ہماری دن بدن بگڑتی ہوئی حالت پہ رحم آ ہی گیا۔ تقدیر نے سوال کیا "ٹیچر بنوگے؟" ہم نے فوری 'ہاں' کہہ دی کیونکہ مثل مشہور ہے کہ "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی!" ــــ چنانچہ اس ٹیچری کو ہم نے لنگوٹی سمجھ کر قبول کر لیا لیکن افسوس

کہ اس لنگوٹی کی وجہ سے ہم پہ "بڑھاپا" طاری ہوگیا۔ پہلے تو ہم صرف شادی شدہ دکھائی دیتے تھے لیکن جب سے ٹیچر بنے ہیں یقین مانئے چار عدد ناخلف بچوں کے "باپ" دکھائی دے رہے ہیں۔ حالانکہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ کہہ رہے ہیں کہ ہم تا دمِ تحریر اصلی کنوارے موجود ہیں۔!!

کیا کہیں صاحب اس ٹیچری نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا یا یوں کہیئے کہ اب ہم دو کوڑی کے کام کے بھی نہ رہے۔ سستی اور کاہلی ہماری رگ رگ میں سما گئی ہے۔ مسلسل چیخنا اور چلانا ہماری عادت بن گئی ہے اور احساس کمتری ہماری "گھٹی" میں مل گئی ہے کیونکہ جب سے ہم ٹیچر بنے ہیں ہمارے احباب ہم سے یوں کترانے لگے ہیں جیسے خدانخواستہ ہمیں "بڑی بیماری" لاحق ہو گئی ہو۔ تعارف کے طور پر جب ہم کسی اجنبی سے یہ کہتے ہیں 'I AM A TEACHER' تو وہ یوں منہ پھیر لیتا ہے جیسے اس نے کوئی بہت بڑی اور گندی گالی سن لی ہو۔ ہم نے تو یہ بھی سن رکھا ہے کہ لوگ ہماری "اسم نویسی" کو ہاتھ تک نہیں لگاتے اگر یوں ہی ہماری اسم نویسی واپس ہوتی رہی تو پھر یقین جانئے کہ اس جنم میں تو ہم کنوارے ہی مر جائیں گے ـــــ خدا نہ کرے ایسا ہو ـــــ

ٹیچری نے ہم کو نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے "بڑے کام" کے

اس ٹیچری نے ہمیں قرض مانگنے کا اچھے سے اچھا طریقہ بھی سکھایا کیونکہ تنخواہ اگر وقت پر نہ ملے تو انسان سوائے قرض مانگنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ ایک دفعہ تو بڑا غضب ہوگیا یعنی مسلسل نو ماہ ہم تنخواہ سے محروم رہے انسانی زندگی میں (۹) ماہ کی مدت کس قدر اہم ہوتی ہے یہ تو آج کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ مسلسل (۹) ماہ ہمیں تنخواہ نہ ملی اور ہم کچھ نہ کر سکے جبکہ لوگ اس دوران کیا سے کیا کر دیتے ہیں! اگر خدانخواستہ اس دوران ہماری شادی ہو جاتی تو یقیناً ایک "نیا خیال" جنم لیتا ـــــ آج ہمارا "لختِ جگر" ہماری باہوں میں کھیل رہا ہوتا ـــــ اور ہم بڑے شوق سے یہ گیت گا رہے ہوتے!!

تجھے سورج کہوں یا چندا ـــــ تجھے دیپ کہوں یا تارا؟
میرا نام کرے گا روشن ـــــ جگ میں میرا راج دلارا!!"

کاش ایسا ہوتا ـــــ کاش!!

بہرکیف آج ہمیں قدرت کی ستم ظریفی پر بے حد غصہ آرہا ہے کہ کیا ہمارے لئے یہی ایک "ٹیچری" رہ گئی تھی؟ خشک ـــــ لاچار ـــــ اور لاوارث!! "محکمہ مال" میں اگر ملازمت ملتی تو قدرت کا کیا بگڑتا؟ زیادہ نہیں صرف ایک بنگلہ ہی تو بنا لیتے! "آبکاری" میں اگر نوکری ملتی تو قدرت کا کیا نقصان ہوتا؟ ـــــ زیادہ نہیں صرف ایک کار ہی تو خرید لیتے اور یہ ٹیچری بھی عجیب نوکری ہے کہ تین سال میں ایک معمولی سکنڈ ہینڈ SECOND HAND سیکل تک نہ خرید سکے۔!!

"باز آئے بھئی ایسی نوکری سے ـــــ باز آئے بھئی ایسی ٹیچری سے!!"

غزل

کیا کوئی چانس کبھی چھوٹ گیا ہے مجھ سے
کیا محلے کا کوئی مرغ بچا ہے مجھ سے

فیض سے اس کے برائی میں ہوا میں کامل
میرا استاد ہے وہ جو بھی برا ہے مجھ سے

کارفرما ہے یہ ہر سمت مری غنڈہ گری
عرصۂ دہر میں ہنگامہ بپا ہے مجھ سے

مجھ سے پہلے نہ تھا مکاری کو اس درجہ فروغ
فن یہ دنیا میں بہت عام ہوا ہے مجھ سے

فسٹ ان فسٹ ہمیشہ میں خیانت میں رہا
کیا خیانت کا کوئی راز چھپا ہے مجھ سے

دم قدم سے تو مرے حرص و ہوس کی ہے بقا
عشق کا نام بھی بدنام ہوا ہے مجھ سے

جس نے بھٹکایا مجھے راہ سے میرے گھر کی
اپنے گھر کا وہ پتہ پوچھ رہا ہے مجھ سے

جان جس کی بھی گئی میری دوا کھانے سے
اس کو تکلیفوں سے آرام ملا ہے مجھ سے

جس نے چاہا مجھے میں نے اسے دھتکار دیا
مایۂ ناز یہی کام ہوا ہے مجھ سے

سرقۂ شعر تو پیشہ مرا آبائی ہے
متشاعر کہیں کیا کوئی بڑا ہے مجھ سے

میرے ہی سر رہا ہر دوڑ میں سرہٹ سہرا
کیا کبھی کوئی کہیں جیت سکا ہے مجھ سے

سرہٹ حیدرآبادی

انمل جوڑا

لے ڈیڈی تیرا باہر کو جانا۔ کام آنے کے قابل نہیں ہے
وہ تو ہیں عیش و عشرت کے قائل گھر بسانے کے قابل نہیں ہے
تم ہو سترہ برس کی وہ بوڑھے۔ کیسے پھولے پھلے گا یہ گلشن
سوکھی ڈالی پہ قبلہ ہمارے۔ گل کھلانے کے قابل نہیں ہے
روٹی کھائیں گے یا وہ منجن۔ میں نے پوچھا تو شرما کے بولے
ان کا جبڑا کہیں رہ گیا ہے کچھ بھی کھانے کے قابل نہیں ہے
جب بھی آتے ہیں موٹر میں آئیں۔ میں نے پوچھا تو ہنس کر وہ بولے
ان کے پیروں میں لرزہ ہے طاری پیدل آنے کے قابل نہیں ہے
ناز نخرا اٹھائیں گے کب تک۔ میں نے پوچھا تو بل کھا کے بولے
دل بھی کمبخت اصلی کہاں ہے۔ ٹوٹ جانے کے قابل نہیں ہے
جلد علی بعد ہی چھوٹیں گے۔ یہ سمجھ کر ذرا ساتھ دینا
عاقلوں کو اشارہ ہے کافی سب بتانے کے قابل نہیں ہے

رؤف رحیم الدین

اقبال واجد
نظر یہ

مطلب

مطرب معروف شہنشاہِ ترنم، مغنی عروس البلاد حضرت محمد رفیع کے کسی گانے کے بول تھے.....

ع مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں

لائق داد و ستائش تو وہ نابغہ شاعر تھا جس کی زبان خوش بیان سے یہ مصرع وارد ہوا، پر شومیٔ قسمت دیکھیے کہ اس شاعر باکمال و صاحب جمال کا اسم اقدس و نکو نام اس چیز کے ذہن ناتواں میں قیام پذیر نہ ہوا اور نہ اس خاکسار کو اسے یاد فرمانے کا کبھی خیال بھی آیا کہ آم سے ہم کو مطلب گٹھلی سے کیا لینا!

اس ہجوم آدم خاکی میں شاید ہی کوئی فلم کا مارا، خوب رو، فیشن پرست ایسا ہو جو فلموں سے ذوق رکھے شناسائے صورت اداکار ہو، اور کہانی کار و مکالمہ نگار کا اسم مبارک بھی صورت ایکٹرلیس کی طرح دیدہ و دل میں محفوظ رکھے!

موت ہی دے دیجیے اگر زندگی ممکن نہیں
لیکن اس سنسار میں مجھ کو نہ عریاں کیجیے

یہ شعر ان اہل نظر کی نذر ہے جو مطالب و معانی کے تجسس سے بے خبر، مکالمہ و کہانی کے تجربے سے بے بہرہ، ہیرو ہیروئن کی ایکٹنگ اور ویلن کی خبثیت و شریت کی بحث میں پڑ کر اپنے وجود و ہستی اور ذہنی و جذباتی ابال کی سطح نا ہموار کا اظہار ارادتاً نہیں کر گزرتے اور اپنی کاملاتی و کار فرمائی کے بل بوتے پر مطلب پرست اور ناشناس معاشرہ میں اپنا مقام بلند پاتے ہیں۔

ادب میں بھی ایک سے ایک　　شاطر و اٹھائی گیرے، چور، اُچکے، ڈاکٹر، حکیم، شرابی، کبابی، مفلس و امیر، قوی و ناتواں، شہ و فقیر، سپہ و وزیر، معلم و عالم، مغنی و مطرب پیدا ہوئے اور شاعری و نقادی میں مقام حاصل کیا۔ مشاعرے کا شاعر دوسرا ہوتا ہے اور ادب کا دوسرا، جو مقام محمد رفیع کا عالم ترنم میں ہے، اس سے شاید کہ ایک بحر ہیکل انساہی کا مقام کم ہو اور اگر ایک بحر کے بجائے ایک سیر کی کمی ہو تو بھی کوئی تردد نہیں کہ آپ سے جوتے لگانے کی شرط منظور نہ ہوئی۔ ایک پیسے کی چاٹ اور خود غرضی و جذبہ انسانی کے کردار نیک کو زندہ در گور کر دیتی ہے۔ فن کار ہو تو فنی صلاحیت دفن ہو جاتی ہے۔ فلمی دنیا سے ملوث شعراء کی مثال سامنے ہے۔

افلاطون زماں، ارسطوئے دوراں، نقاد ادب حضرت کلیم الدین احمد نے فرمایا ہے:

"ہمیں روٹی نہ ملے تو شعر نہیں کہہ سکتے، لیکن ہمیں روٹی ملے تو بھی ہم شعر نہیں کہہ سکتے۔"
لیکن فلم سنسار میں کسی چالاک اور سمجھ دار چوپائے کو گانے لکھنے کا چانس ملے تو وہ شاعر ہوجاتا ہے کہ اسے شعر ارفع مطلوب ہے نہ اس کے صد ہزار عاشقوں کو۔

کہتے ہیں ہر سمت تیرا جلوہ ہر رنگ دیکھیں تو! اللہ بچائے جھوٹ سے کہ یہ صفت تو مالک دو جہاں و دشت امکاں اللہ تبارک و تعالیٰ جل شانہ عم نوالہٗ کی ہے، اور اس آدم خاکی کی حرکات و تحریکات کا نتیجہ یہ تہذیب انسانی، رسوم انسانی، اخلاق و اطوار انسانی کے ہر شعبہ نفسیات و اخلاقیات میں ایک نظریہ یہ ہے کہ مطلب پوشیدہ ہوتا ہے۔ میں اس نظریہ سے اپنی معیت یا مخالفت کا اظہار نہیں کروں گا کہ نظریہ "نظریہ" ہوتا ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ہر آدمی دھوتی پتلون اور پاجامے کے اندر ننگا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے مگر کہنے والے کی زبان غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے اور یہی وہ مطلب ہے جو آدمی کے سر مبارک کے پچھلے خانے میں (جہاں حرام مغز استور ہے اور جسے لاشعور کا نام دیا گیا ہے) موجود ہوتا ہے۔ اس کے انعکاس سے کام ارتقا پاتا ہے، حد تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ملک ملک، فوج فوج، آدمی آدمی، بھائی بھائی، عورت، عورت اور بہن بہن کے تعلقات کی جڑ بھی وہی مطلب ہے۔ سبزی منڈی ہو یا عشق منڈی، حسن کا بازار ہو یا دولت کا، ہر جگہ ہر سمت یہ اغراض و مطالب بہ درجہ اتم موجود رہتے ہیں۔ یہ انتشار اور تشکیک پسندی از خود نہ آئی ہے۔ تلخ تر تجربات اٹھائے صید گہہ مطالب میں صید بنا تب کہیں یہ برائی میرے حصے میں آئی

جسے چاہے جیسا بنائے تو!

زبان و الفاظ کے صوتی تغیرات کے نمونے محاظرات و لطائف کا سبب بنتے ہیں۔ میر غیاث الدین چک سے مرغ چک ہو جاتا ہے تو کہیں انگریزی کا ~~[illegible]~~ ہندی ہندی کا "لوکٹ" بن جاتا ہے۔ جسم انسانی کا صوتی تغیر وہ آواز ہے جو عمر کے ارتقا کے ساتھ بھاری و سالم ہو جاتی ہے۔ لیکن جسم کا جو حصہ سب سے زیادہ تغیر پذیر واقع ہوا ہے وہ کمر ہے، جس کے اتار چڑھاؤ اور چپاندگی ماہانہ رفتار کا حساب یاد نہ رکھنے سے اکثر دھوکہ ہو جاتا ہے اور یہ کمر کا ہیئتی تغیر دیور بھابی، نند بھابی کی ہنسی مذاق کا سبب بنتا ہے۔ لیکن ایک نابالغ ذہن ان تغیراتی اثرات کا مشاہدہ کرکے جو نتیجہ اخذ کرتا ہے وہ سر لڑکے کے اس دور کی بات ہے، جب وہ اس کشش و پیچ میں پڑ کر ممی، ڈیڈی سے ان سوالات کے جواب کا مطالبہ کر لیتا ہے۔ گویا کمر کی ظاہری ساخت کی تبدیلی میں ایک مطلب ضرور پوشیدہ ہے۔
لڑکیاں آج کل بیل باٹم پتلون پہنتی ہیں۔ لیکن اس وقت تک جب وہ قید شریعت میں نہ آجاتی ہیں ؎

لیلیٰ پہن رہی ہے پتلون قیس کا
مجنوں کے تن پہ لیلےٰ کا جمپر ہے آج کل

لیکن ادھر عاشقی یا پاکیزگی قید شریعت میں آئی ادھر پتلون چھوٹا۔ ملاحظہ ہو ؎

عاشقی قید شریعت میں جو آجاتی ہے
جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

پھر پتلون کمر کو طاق مفارقت دے جاتی ہے اور اس کا مطلب کوئی ایسا ابہام نہیں کہ آپ سے دریافت کرکے آپ کی شناخت مطلوب ہے

جسم انسانی کا ایک بیش بہا اور قیمتی حصہ و نعمت چشمِ بینا ہے۔ اس کی حفاظت کو قدرت پاک نے دو پلکیں مقرر کر رکھی ہیں یہ دونوں آنکھیں کھلتی اور بند ہوتی رہیں۔ اگر کوئی عشق کا مارا دل کا پیاہا فطرت میں دخل اندازی کرکے ایک کھولتا اور دوسرے کو بند رکھتا ہے تو اس ایک آنکھ کے بند اور دوسرے کے کھلے رہنے کا سلسلہ ایک پاؤں سے سینڈل کھلنے اور دوسرے میں موجود رہنے تک کا دلچسپ تماشا دکھا جاتا ہے۔ جیسے چاہے جیسا بنائے تو!

خدا جانے یہ آہوانِ چشم اپنے چاہنے والوں کی ایک چشم بینا کے کھلے اور دوسرے کے بند رہنے کا کیا مطلب لگاتے ہیں ہو سکتا ہے جو آنکھ بند ہو اس میں گرد پڑ گئی ہو اور پھر آج تک یہ طے نہ پایا کہ آہوانِ چشم کے غصہ و جلال کا سبب وہ بند آنکھ ہوتی ہے یا وہ جو کھلی ہوتی ہے۔

"غصہ کھلی آنکھ سے ہوتا ہے" ——— ایک خیال

"غصہ بند آنکھ سے ہوتا ہے" ——— ایک خیال کی تردید۔

"غصہ دونوں آنکھ سے ہوتا ہے" ——— ایک حقیقت

کھلی آنکھ کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے جلوۂ حسن کی تاب سے دونوں آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ ایک بہ مشکل کھول رکھا۔
بند آنکھ کا مطلب یہ ہے کہ دونوں آنکھیں پہلے سے بند تھیں، آپ کا گذر ہوا آنکھیں کھلیں۔ جلوۂ حسن کی تاب نہ لا کر ایک آنکھ بند کرلی کہ ایک تو بے نور نہ ہوگی ———

شوہر کی خدمت بیوی کا اولین فرض ہے۔ خدمت کی وضاحت کی جائے تو کئی عناصر سامنے آئیں گے۔ پاؤں دبانے کی حیثیت ان میں مسلّم ہے۔ تو پاؤں دبانے کا مطلب نہایت ہی خلوص و محبت ہمدردی و خدمت گذاری ہے ———

شادی سے پہلے کنواروں کے خیالات عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔

"بیوی سے پاؤں دبوانا ایک بھونڈا اور بے لطف فعل ہے" ——— ایک کنوارا خیال

"جی نہیں غلط ارشاد فرمایا' میاں بیوی میں اتنی واقفیت ہوتی ہے کہ پاؤں دبوانے میں کوئی بوریت نہیں ہوتی" ———

درج بالا خیال کی تردید۔

"بیوی شوہر کے پاؤں دباتی ہے نہ کہ شوہر بیوی کا" ——— ایک خیال

"نہیں! شوہر بھی بیوی کے اکثر پاؤں دباتا ہے" ——— ایک خیال کی تردید

"غور فرمائیں کہ پاؤں دبانے میں بھی مطلب پوشیدہ ہوتا ہے۔ آپ نے ترقی پسند بیگمات کو گھر کے نوکر چاکر چھیل چھبیلوں سے پاؤں دبواتے نہیں دیکھا تو واجدہ تبسم کا افسانہ "ذرا ہور اوپر" پڑھ ڈالیے۔ اس عمل و ناعمل کے مطلب سے آشنائی ضرور ہو جائے گی۔

●●

غزل

جی میں آئے تو نکالیتے ہیں کابل کی طرح
پھر مسل دیتے ہیں مجھ کو کسی کھٹمل کی طرح

شیپ تو آپ نے گیسو کا بدلا ہے مگر
چال سے اپنی نظر آتے ہیں تو کل کی طرح

بچہ بچہ بھی پہلوان ہے گویا میرا
گھر نظر آتا ہے مجھ کو کسی دنگل کی طرح

لے کے ہاتھوں میں گھڑے بھرتی ہے پبلک پانی
اشک بہتے ہیں غم یار میں جیسے نل کی طرح

ہائے کچھ لوگ سمجھ کر اسے فیشن تازہ
منہ پہ کالک بھی لگا لیتے ہیں صندل کی طرح

چھینٹ کے کپڑوں کا یہ بھی تو کرشمہ دیکھو
اب تو مجنوں بھی نظر آتا ہے چیتل کی طرح

جب سے رکھا ہے سیاست میں قدم شیخ گھڑو
بیڑی پیتا ہے مرا شیر بھی "چرچل" کی طرح

شوہروں کی نہیں بیروں سے زیادہ وقعت
بیویاں گھر کو سمجھنے لگیں ہوٹل کی طرح

پیار کا جب کبھی اظہار کیا ہے میں نے
اُن کی صورت نظر آئی مجھے چیل کی طرح

کس طرح ان کو وفا کا مری آئے گا یقیں
میری ہر بات سمجھتے ہیں وہ بنڈل کی طرح

آزما کر تو ذرا دیکھئے اک روز اسے
کوئی دم دار نہیں آپ کے پاگل کی طرح

پاگل عادل آبادی

میاں نہیں

اک پاس ہونے دیتی ہیں مجبوریاں نہیں
بیوی اگر ہے گھر میں تو حاضر میاں نہیں

ایسا نہیں کہ اور کوئی نوجواں نہیں
ان کے مقابلے کا مگر پہلواں نہیں

وہ رہ کے اپنا جسم کھجاتا ہوں رات دن
کیا پوچھتے ہو درد کہاں ہے کہاں نہیں

جی چاہے جس جگہ سے بھی کنٹریکٹ کیجئے
ہے احمقوں کی کھان، جہاں میں کہاں نہیں

تعریف تو یہی ہے کہ بے بھاؤ کے پڑے
لیکن مرے بدن پہ کہیں بھی نشاں نہیں

قوال گاتے پھرتے ہیں ہر ہفتہ قبر پر
تیرے کرم کی دھوم جہاں میں کہاں نہیں

کرتے رہے ہو میری پٹائی تمام رات
اور پوچھتے ہو درد کہاں ہے کہاں نہیں

جلاد بولا پھانسی پہ چڑھ جاؤ بے خطر
اس امتحاں کے بعد کوئی امتحاں نہیں

شادی ہو یا غمی ہو، وہ پکچر ہو یا مزار
میوزک کی دھوم کونسی جا ہے جہاں نہیں

حقانی کلیم پوری

باقر مرزا
حیدرآباد

کتّے کی دُم

اکثر لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں کہ آخر ایسی کونسی آفت آن پڑی تھی کہ ہم نے جدید شاعری شروع کر دی ۔ اور یہ کہ اپنی اکلوتی نظم کا عنوان "کتّے کی دم" ہی کیوں رکھا ۔ گدھے کی دم یا اُلّو کی دم کیوں نہیں رکھا ۔ واقعات سننے سے تعلق رکھتے ہیں ۔

ایک دن اچانک ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم میں کچھ بننے کے آثار بالکل ختم ہو چکے ہیں ۔ لہٰذا ہمیں شاعر بن جانا چاہئے ۔ کہتے ہیں کہ کچھ بننے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے ۔ مثلاً یہ کہ اگر ردّی کی دکان کھولی جائے تو اس کے لیے ردّی کاغذ کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اسمگلنگ کا دھندہ شروع کرنے کے لیے "لوک نائک" کا آشیرواد ۔ اگر تیل بیچنا ہو تو صرف فارسی پڑھنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ تیل کا ہونا ضروری ہے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم شاعری کے معاملہ میں بالکل اناڑی تھے ۔ یوں کہئے کہ ہم شاعری کے معاملہ میں بالکل راج نارائن تھے ۔ لہٰذا اس سلسلہ میں کسی کے زرّین مشورے حاصل کرنا ضروری تھا ۔ تلاشِ بسیار کے بعد ہمیں زرین مشورے دینے والی ایک بزرگ قسم کی شخصیت دستیاب ہوئی ۔ یہ ایک ایکسپرٹ شاعر تھے ۔ شاعری کے معاملے میں دیرینہ تجربہ رکھتے تھے ۔ دیکھنے میں یہ بالکل مرثیہ معلوم ہوتے تھے ۔

ان کی ناک رباعی کی طرح تھی ۔ آنکھیں چھوٹی بحر کی غزل لگ رہی تھیں جبکہ کان غزل کی بڑی بحر تھے ۔ مختصر یہ کہ وہ پیکرِ شاعری تھے ۔ ان کا اوڑھنا اور بچھونا دونوں ہی شاعری تھا ۔ پیکرِ شاعری کی خدمت میں حاضر ہو کر ہم نے ان سے اپنا حالِ دل کہہ سنایا کہ ہم اس جہانِ فانی میں کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے لہٰذا شاعری کرنا چاہتے ہیں جبکہ شاعری کے معاملہ میں ہماری معلومات ناقص سے بھی گئی گزری ہیں ۔ بولے "ابھی تم کم سن ہو ، نادان ہو ۔ شاعری کیا کرو گے ؟" ہم نے برجستہ جواب دیا "کمسن اور نادان لوگ ہی تو شاعری کرتے ہیں ۔ ورنہ دانا اور تجربہ کار قسم کے لوگ تو بلیک مارکٹنگ قسم کا کوئی اوچھا دھندہ کرتے ہیں" ۔ جواب سے خوش ہو کر پھولے نہ سماتے ہوئے بولے ۔

"شاعری شروع کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر تمہیں ایک ناٹک منانی ہوگی" ۔ ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے ایک ناٹک منا ڈالی ۔ ناٹک منانے کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ ہم راتوں رات ہی شاعر کہلانے لگے ہیں ۔ چند عرصے بعد گزر لوگ اٹھتے بیٹھتے وقت بے وقت (بعض دفعہ پیر کے اشاروں سے بھی) یہ کہتے نظر آتے کہ دیکھو وہ عظیم شاعر

جارہا ہے جس نے نائٹ منانے کے پچھلے تمام لانگ پلیڈ ریکارڈس توڑ دیئے۔ دن اسی طرح گزرنے لگے جس طرح گزرا کرتے ہیں۔ شاعر تو ہم ضرور کہلاتے جارہے تھے لیکن ہمارا شعری سرمایہ دو ایک کمزور اور ناتوان اشعار تک ہی محدود تھا۔ گویا کہ شاعری کے معاملے میں فیملی پلاننگ کو اپنا رہے تھے۔ جب بھی شاعری کا بخار چڑھتا قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتے لیکن دو چار چھینکیں اور چار چھ ڈکاروں کے بعد طبیعت بالکل صاف ہو جاتی اور شاعری کا بخار بھی اتر جاتا۔ صحت مند اور توانا قسم کے اشعار لکھنے کی بہتیرے کوشش کی لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ ایک بابائے شاعری کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور سارا حال کہہ سنایا تمام واقعات سننے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے ہماری نبض ٹٹولی اور دل کی دھڑکن کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ منہ کھلوا کر مسوڑھوں اور جبڑوں کو دیکھا۔ ٹخنوں اور کہنیوں کو بھی بجا بجا کر دیکھا پھر بولے۔ تمہارے کل پرزے تو سب ٹھیک ہیں صرف تمہیں کسی سے متاثر ہونے کی ضرورت ہے۔" اس زمانے میں ہم متاثر کرنے یا ہونے کے عمل سے بالکل ناواقف تھے۔ لہٰذا ان سے عرض کیا۔

"محترم اگر آپ اجازت دیں تو اسی لمحہ آپ سے متاثر ہو جاؤں، کیوں کہ بیٹھے بٹھائے متاثر ہونے کا ایسا نادر موقع ہاتھ آنا مشکل ہے۔"

اس پر پیکر شاعری نے ایک جدید ترین قہقہہ لگایا اور بولے "متاثر ہونے کے موقعے بار بار آیا نہیں کرتے، یہ تمہارا پہلا موقع ہے اس کو غنیمت جانو اور کچھ کارہائے نمایاں انجام دو۔"

یہ سن کر پیکر شاعری سے آشیرواد لیا اور متاثر ہونے کی مہم سر کرنے کے لیے قریبی ریلوے اسٹیشن روانہ ہوئے۔

سب سے پہلے خیال ہوا کہ کیوں نہ صنف نازک سے متاثر ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ آج کل کی عورتیں مردوں کو میک اپ کی طرح استعمال کرتی ہیں کہ جب جی چاہا تھوپ لیا اور جب جی چاہا اتار پھینکا۔ اس ڈر سے کہ کہیں کسی عورت کے ہاتھوں لپ اسٹک یا پوڈر نہ بن جائیں ہم نے متاثر ہونے کے پلان کو ٹائم کیپسول کی طرح دفنا دیا۔ بعد ازاں۔ اطراف و اکناف کی ہر چیز پر نظر دوڑائی کہ شاید متاثر ہونے کا کوئی اچھا اور سستا سا موقعہ ہاتھ آجائے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ آج کل لیڈروں کا موسم چل رہا ہے اور یہ اوپن مارکٹ میں کیلو کے حساب سے دستیاب ہیں۔ لیڈروں سے متاثر ہونے کے لیے جب ہم نکلے تو اندازہ ہوا کہ کسی لیڈر سے متاثر ہونے سے بہتر ہے کہ کسی گیدڑ سے متاثر ہو جائیں (افسوس کہ لیڈروں کے برخلاف گیدڑ بلیک میں مل رہے تھے) یہاں سے بھی مایوس ہو کر خاک چھانتے پھرنے لگے۔ خاک چھانتے پھرنے کے دوران، ہماری نظر ایک الو پر پڑی جو دین اور دنیا سے بے خبر کسی گہری سوچ میں غرق نظر آیا۔ سوچا کہ متاثر ہونے کا اچھا موقعہ جنتا حکومت میں تو ہاتھ آنے والا نہیں۔ یہ سوچ کر اس الو کی جانب بڑھے اور الو کے قریب پہنچ کر بولے۔

"محترم الو صاحب! خیالات کے تانے بانے کو توڑنے کی معافی چاہنے کے بعد یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ کس سلجھی ہوئی گتھی سے الجھنے میں مصروف ہیں۔"

فلسفیانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی اور بھویں سکیڑ کر بولے۔

"او نابکار انسان! تو نے ہمارے خیالات کا ستیاناس کر دیا۔ ہم اس وقت اس سوچ میں غرق تھے کہ ہمیں کیا سوچنا چاہیے۔"

جواب سن کر ہمارا دل خوشی سے اچھل اچھل کر منہ میں آنے لگا۔ واقعی بڑوں نے کیا خوب کہا تھا۔ ڈھونڈھنے سے ہر چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ ہم نے پورے طور پر تہیہ کر لیا کہ بس اب ان ہی الو صاحب سے متاثر ہو جائیں

اور اپنی بقیہ زندگی گزاریں گے ــــ الو صاحب سے متاثر ہونے میں مشکل سے چار پانچ منٹ باقی تھے، دیکھتے کیا ہیں ایک چیل نہ جانے کہاں سے اڑ کر آئی اور جناب الو کو منہ میں دبوچ کر جھاڑ پر جا بیٹھی اور انہیں نوچ نوچ کر کھانے لگی۔ چشم زدن میں ہمارے ہیرو کو ہم چیل کا لنچ بنتے دیکھ رہے تھے۔ متاثر ہونے کا آخری چانس بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اب صرف اور صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ پچھلی زندگی کا کوئی اچھا سا واقعہ یاد کریں اور اس کا تاثر قبول کریں۔ یاد آیا کہ ہم بچپن ہی سے لفظ ماڈرن کے شیدائی رہے ہیں۔ ماڈرن نامی ہر چیز سے ہمیں خواہ مخواہ انس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دن ہمارے ہاں ایک ماڈرن بلڈاگ لایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماڈرن بل ڈاگ سے ہماری دوستی ہو گئی۔ دونوں ایک ساتھ کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے اور سویا کرتے۔ کچھ دنوں میں بل ڈاگ ہم میں اور ہم بل ڈاگ میں سما گئے۔ پھر ایک مقام ایسا بھی آیا کہ دونوں میں کوئی دوئی باقی نہ رہی۔ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر سما گئے تھے کہ ہم میں اور بل ڈاگ میں تمیز مشکل ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایسا بارہا اتفاق ہوا کہ لوگ ہمیں آتا دیکھ کر ہمارے آگے ہڈی ڈال کر زنجیر سے باندھ دیا کرتے تھے تو بعض لوگ بل ڈاگ کے منہ میں پنسل ٹھونس کر اسے مچولے میں لٹا دیا کرتے تھے۔ دونوں کی دوستی میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی جب ذرا بڑے ہوئے تو احساس ہوا کہ ہم میں اور بلڈاگ میں صرف ایک فرق باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ بل ڈاگ کو ایک عدد ٹیڑھی دم سے نوازا گیا ہے اور ہم اس سے بے نیاز ہیں۔ دم کے نہ ہونے کا ہمیں اکثر و بیشتر ملال رہا کرتا۔ آہستہ آہستہ ہم میں احساس کمتری اور بلڈاگ میں احساس برتری پیدا ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وفادار قسم کے جان داروں کو دم دی جاتی ہے)

پھر ایک وقت ایسا بھی آن پہنچا کہ بل ڈاگ ہمیں چھوڑ کر اپنی دم سے اٹھکھیلیاں کرنے لگا۔ یہ ہماری برداشت سے باہر تھا ہمارا اور بلڈاگ کے درمیان جو رول ادا کرنے لگی ایک دن طیش میں آ کر ہم نے بلڈاگ کو معہ دم کے گھر سے باہر نکلوا دیا۔ غصے میں ہم نے یہ قدم تو اٹھا لیا تھا لیکن اس کا جس قدر افسوس رہا اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو کہ طیش میں آ کر حکومتوں کو بدل دیتے ہیں، اور پانچ سال تک دونوں ہاتھ ملا کرتے ہیں۔

بیکر شاعری سے جب ہم نے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح متاثر ہونے کی کارروائی میں خلل پڑتا گیا۔ بعد ازاں انہیں کتے کی دم والا واقعہ بھی کہہ سنایا۔ واقعہ کو سن کر وہ اچھل پڑے اور اچھلنے کی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد بولے۔

"تم کتے کی دم کو اپنے سینے سے لگائے رکھو اور ماڈرن بلڈاگ کی جگہ ماڈرن شاعری سے پُر کرو"

ماڈرن شاعری کا نام سنتے ہی ہماری روح مادّے میں تبدیل ہو گئی۔ ہم نے گڑگڑاتے ہوئے ان سے عرض کیا "آپ مجھے ماڈرن شاعری کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں جبکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ماڈرن غزل کا ایک مصرعہ ایک انچ کا ہو تو دوسرا ایک گز کا ہوا کرتا ہے۔" بولے:

"یہ انچوں یا گزوں کا زمانہ نہیں ہے بلکہ میٹر اور سینٹی میٹر کا زمانہ ہے۔ اس قسم کے آؤٹ آف ڈیٹ اعتراضات کرنا گویا جدید شاعری کو نقصان پہنچانا ہے"

اس پر بھی ہم نے ہمت نہیں ہاری اور بولے:

"آپ اس بات پر بھی تو غور کیجیے کہ شاعری کو پاک و صاف کرنے کے نام پر قافیہ اور ردیف پر بغیر کسی نوٹس کے بلڈوزر چلوا دیے گئے۔ گویا کہ شاعری نہ ہوئی ترکمان گیٹ کا علاقہ ہوا۔ بولے

"بلڈوزر کس کے حکم سے چلائے گئے یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی جانچ پڑتال کے لیے ایک کمیٹی اور کئی کمیٹی تحقیقاتی کمیشن قائم کیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ کمیشن کی رپورٹ آئندہ پچیس تیس سال میں ضرور نکل جائے گی۔"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"کمیشن کی رپورٹ آنے تک تو تم جدید شاعری شروع کرسکتے ہو"۔

مرتا کیا نہ کرتا والا معاملہ درپیش تھا۔ ہم نے جدید شاعری شروع کردی اور اپنی پہلی نظم (جو آخری بھی ہے) کا عنوان رکھا "کتے کی دم"

روزے ایسے بھی اب روزے سے ہیں

دو مومن بیٹھے روزوں پہ تبصرہ کر رہے تھے ایک مومن نے کہا:

جاڑوں کے روزے بہت سہل ہوتے ہیں صرف گرمیوں کے روزے سخت ہوتے ہیں۔ دوسرے مومن نے کہا۔

ایک اور موسم کے روزے تو گرمیوں کے روزوں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔

پہلے مومن نے حیرت سے پوچھا۔ بھائی کیا آج ہمیں کچھ زیادہ ہی روزہ لگ رہا ہے موسم تو صرف دو ہی ہوتے ہیں گرمی بشمول برسات اور سردی۔ یہ تیسرا موسم صرف اپنے وطن پاکستان میں آتا ہے جو ہر سال تو نہیں البتہ اوسطاً دس سال کے بعد آتا ہے ذرا بوجھو تو وہ کون موسم ہے پہلا مومن سمجھدار تھا فوراً سمجھ گیا اور بولا،

مارشل لا ۔ مارشل لا"

دوسرے مومن نے اس پر یوں تحسین آفرین کی:

ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ

ابراہیم جلیس

باپ دادا کی کمائی ہے اڑاتے رہیے
بزم دنیا میں یونہی نام کماتے رہیے
مرد سمجھے کوئی یا آپ کو سمجھے عورت
شوق سے بال بہرحال بڑھاتے رہیے
عقل کے کورے جو بگڑے ہیں رئیسوں کی سیتے
انگلیوں پہ انہیں دن رات نچاتے رہیے
رنگ گرگٹ کی طرح بدلیں گے احباب اک دن
مرغیاں چاہے شب و روز کھلاتے رہیے
رقص کرتے ہوئے ہاتھوں میں لیے چنگ و رباب
قصے اسلاف کے بچوں کو سناتے رہیے
جھاڑو جب تک نہ پھرے گھر کے ہر اک گوشے میں
آپ ان کے ہیں یہ احساس دلاتے رہیے
ذہن سے دور تعصب کی سیاہی ہوگی
گنگا سے آپ اگر روز نہاتے رہیے
آہی جائے گا یقیناً کبھی غزلوں پہ شباب
شعر دیوان سے غیروں کے چراتے رہیے
کھا کے افیون جو سوتے ہیں نہ اٹھیں گے کبھی
مارتے ٹھوکتے، یا ان کو جگاتے رہیے
درس اخلاق ملے گا انہیں دیواروں سے
ننگی تصویروں سے کمروں کو سجاتے رہیے
آج لاک اپ میں تو کل کوئی جوا خانے میں
گل شب و روز متانت یوں کھلاتے رہیے

متانت ریاضی
مالیگاؤں

خالد رحیم

...کھو گیا ہے

پریشاں ہوں میں کس قدر کیا بتاؤں
جو گذرا ہے مجھ پر تمہیں کیا سناؤں
یہ اک حادثہ مجھ پہ گذرا ہے یارو
سرِ بزم وہ مجھ سے بچھڑا ہے یارو
محبت کا تحفہ وفا کی نشانی
بڑی خوب صورت تھی اس کی کہانی
نشانی میں بھیجا تھا اک نازنیں نے
محبت میں بخشا تھا اک مہ جبیں نے
بہت قیمتی تھا، بہت تھا وہ پیارا
میری زندگانی کا واحد سہارا
سجا کر قرینے سے پھرتا تھا اس کو
لگا کر میں سینے سے پھرتا تھا اس کو
مرے دل کی دنیا بھی آباد اس سے
پڑی تھی محبت کی بنیاد اس سے
سیہ رات میں ایک مہتاب تھا وہ
وہ میرا تصور تھا اک خواب تھا وہ
وہ مونس تھا، غم خوار تھا، ہم نوا تھا
وہ میرا صنم تھا، وہ میرا خدا تھا
تصور تخیل کی پرواز تھا وہ
میرے دل کی دھڑکن کی آواز تھا وہ
اسی کی بدولت میری شاعری تھی
مری شاعری تھی مری زندگی تھی
طبیعت میں رنگیں بیانی تھی اس سے
غزل میں سلاست روانی تھی اس سے
مہکتی تھی کاغذ کی تقدیر اس سے
محبت میں ڈوبی تھی تحریر اس سے
وہ نازوں کا پالا مرا لاڈلا تھا
یہ سچ ہے کہ میں اس پہ جاں سے فدا تھا
پریشاں بہت اب مری زندگی ہے
کسی بد نظر کی نظر لگ گئی ہے
اِدھر ڈھونڈتا ہوں اُدھر ڈھونڈتا ہوں
کہ جا جا کے یاروں کے گھر ڈھونڈتا ہوں
وہ داغِ جدائی مجھے دے گیا ہے
وہ مجھ سے سکوں چھین کر لے گیا ہے
وہ کھو یا کہ میرا جہاں کھو گیا ہے
زمیں کھو گئی آسماں کھو گیا ہے
خدا کھو گیا ہے صنم کھو گیا ہے
یہ غم ہے کہ میرا قلم کھو گیا ہے
قلم کھو گیا ہے قلم کھو گیا ہے

○

قطعات

آیا تھا "دیوبند" کا پڑھنے مشاعرہ
موٹر میں ایک ہیپی حسینہ لپٹ گئی
ایسا مزے میں مست ہوا کچھ نہ پوچھیے
عقدہ یہ پھر کھلا کہ مری جیب کٹ گئی

○

جو غزل پڑھتا ہوں اس پہ جھوم جاتے ہیں سبھی
شعر کو اپنے کہوں میں شعر یا ایٹم کہوں
ہاتھ میرے لگ گئی ہے ایک شاعر کی بیاض
کیوں نہ اپنے آپ کو اب شاعرِ اعظم کہوں

نرگس سہوانی

طاہرہ بیگم

ہم نے بھی پرچے جانچے

ہم ہر روز کی طرح جب اپنی ڈیوٹی پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف ایک عجیب قسم کی گہما گہمی ہے۔ ہر ایک پر بے خودی کا عالم طاری ہے اور چہرے خوشی کی غمازی کر رہے ہیں۔

ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ــــ مگر ہم اپنے ایک ساتھی سے وجہ پوچھنے میں کامیاب ہو گئے ــــ پتہ چلا کہ پبلک سروس کمیشن کا جو امتحان ہوا تھا، اس کے پرچے جانچنے کے لیے ان کو بلایا گیا ہے ــــ اب ہم سمجھے کہ ان چہروں پر آئی ہوئی خوشی و مسرت کے جذبات ان روپیوں کے تصور کے پیدا کردہ ہیں جو پرچوں کے جانچنے کے بعد انھیں ملیں گے ــــ ہم پر اداسی چھا گئی، ہم کو خاموش دیکھ کر ہمارے ایک ساتھی نے ہمدردی جتائی۔ تم بھی چاہو تو تمہیں یہ موقع مل سکتا ہے اور یہ موقع اب بھی ہے۔

یہ سن کر ہمارے چہرے پر بھی خوشی و مسرت کے جذبات امنڈ آئے۔ ہم خوشی سے پھول کر کپّا ہو گئے۔ یوں لگا جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو ــــ

ہم نے اپنے ساتھی سے پتہ دریافت کیا۔ خوشی خوشی رخصت کی درخواست دی اور تیر کی طرح نکل پڑے۔

پرچے جانچنے کے کام کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے بھی وہ پاپڑ بیلے کہ آخر کار متعلقہ آفیسر انچارج کو ہم پر رحم آ گیا اور ہم [illegible] فاخرانہ انداز میں دوسرے دن جب اپنی مفوضہ ڈیوٹی پر پہنچے تو ہر شخص حیران ــــ کہ اے اللہ آخر انھیں یہ موقع کیسے مل گیا ــــ؟ آخر یہ کیا ماجرا ہے!

خدا خدا کر کے پرچے جانچنے کا دن آ پہنچا۔ ہم کو ایک ہال میں لے جایا گیا ــــ ایک ایسے ہال میں، جو سگریٹ اور سینٹ کی ملی جلی خوشبو سے اٹا ہوا تھا۔ ہر طرف آنچل لہرا رہے تھے، چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور ان چہروں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی اسی ہال میں ہماری چشم گنہگار نے بہشتی صورتیں بھی دیکھیں ــــ روہانسے چہرے بھی دیکھے ــــ غرض ہال میں ایسا لگتا تھا کہ اس قوس قزح کو ریزہ ریزہ کر دینے والے رنگ ہر طرف بکھیر دیے گئے ہیں۔

مضمون نویسی اور عام معلومات کے جوابی پرچہ جات جانچنے کے لیے ہماری میز پر رکھ دیے گئے۔ یہ پرچے پا کر ہم اتنے خوش ہوئے کہ لکھ نہیں سکتے

پیپر پرچے کا ایک ورق الٹا تو سوال نظر سے گذرا۔

"موجودہ سیاسی دور کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیجئے"

اس سوال کا جواب اس طرح درج تھا۔

"ہم ایک عام شہری ہیں گذر بسر ہی مشکل سے ہوتی ہے۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ کنواں کھودو، پانی پیو، ورنہ پیاسے ہی مرو ——— پھر گھر کے بکھیڑے الگ ہم کو فرصت کہاں ملتی ہے کہ موجودہ سیاسی دور کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے ——— ہمارے لیے غم جاناں ہی کیا کم ہے کہ غم دوراں کو گلے لگائیں۔

——— ہم تو مختصر اور مفید کے اصولوں پر کاربند ہیں۔"

جواب کو مختصر اور جامع پاکر تو ہماری طبیعت خوش ہوگئی اور ہم نے پورے کے پورے نمبر دے ڈالے

"شبلی نعمانی کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں لکھیے۔؟"

جواب تھا ———

"شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ وہ سب سے بڑے انشا پرداز تھے۔ اگر وہ انشا پرداز نہ ہوتے تو مصور ضرور ہوتے۔ ان کا علم، ان کی بصیرت، ان کی پرواز فرشتوں سے لاگ نہیں کھاتی اور یہی ان کی بڑی خوبی تھی ——— اگر وہ فرشتہ ہوتے تو ان کی سوانح حیات بہت مختصر ہوتی۔ ایک انقلاب میں پیدا ہوئے ——— اور دوسرے انقلاب میں مر گئے۔!؟"

شبلی رومان پسند تھے۔ ان کے مزاج میں رومانیت تھی۔ وہ ماضی کو زندہ قوت جان کر حال پر فتح چاہتے تھے، شبلی کے بہترین کارنامے، ان بزرگ ہستیوں کے متعلق ہیں جن کے سامنے جبرئیل بھی ادب سے پیشانی جھکا دیں، شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر لکھا، جن کے مرثیوں کا موضوع ان کے مزاج سے لاگ کھاتا تھا۔ ان میں رومانیت پائی جاتی ہے ——— مرثیوں میں خاک اور خون ہے، ان میں جلال بھی ہے اور جمال بھی۔ اگر شبلی مولوی نہ ہوتے تو کافی ترقی پسند ہوتے۔"

یقین کیجیے۔ اس مضمون کا ایک لفظ بھی ہماری سمجھ میں آیا ہو؟ ہم حیران تھے ایسے لوگوں کو امتحان میں کیسے بیٹھنے دیا گیا جن کی قابلیت کچھ نہیں ہوتی۔ جو صرف زیبِ داستان کے لیے الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔

ہم تو صرف ایک شبلی صاحب کو جانتے ہیں جو چار مینار دواخانے کے مہتمم رہ چکے ہیں۔ ——— نہ جانے یہ کون شبلی ہیں جن کے متعلق اتنا لمبا چوڑا تعارف لکھا گیا ہے۔ اس لیے ہم نے جواب لکھنے والے کو انٹا کھلایا ——— قسم لے لو جو ایک نمبر بھی دیا ہو۔

"جہیز ایک لعنت ہے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے!"

جواب آپ بھی پڑھیے۔

"جہیز ایک نحوست ہے۔ ایک بڑی لعنت۔ ایسا ہلاکت خیز دباؤ جس کے نیچے نہ جانے کتنے لوگ دب کر فنا ہو گئے ——— نہ جانے کتنے ماں باپ ایسے ہوں گے جو اپنی بیٹیوں کی مانگ میں سہاگ کا سیندور نہ بھر سکے ———

——— کتنے ایسے ہوں گے جو اپنی اولاد کی خاطر جہیز کے مطالبے کو پورا کرنے کے بعد تباہ و برباد ہو گئے ——— کتنی ایسی معصوم تمناؤں نے جہیز کی جان لیوا اذیتوں کا شکار ہو کر سسک سسک کر دم توڑا ہوگا ——— کون جانے آج بھی کتنے والدین قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہوں گے۔ بہرحال جہیز ——— سماج کے لیے ایک ایسا ناسور ہے جس کا اگر بروقت علاج نہ کروایا جائے تو سارا سماج تباہ و برباد ہو جائے گا۔

ہم کو جواب پڑھ کر اتنا غصہ آیا کہ ہمارے الفاظ کے ذریعے بیان

کرنے سے قاصر ہیں — جواب پڑھ کر آپ نے بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ لکھنے والا لاولد ہے یا نرا بے وقوف ہے — "
"اجی صاحب — ہم سے سنئے۔ جہیز لعنت نہیں، رحمت ہے۔ اگر نوشہ کے لیے گھوڑے جوڑے کی رقم نہ لی جائے تو آپ ہی بتائیے شادی کا شاہانہ خرچ کہاں سے نکلے — ؟ اگر دولھا کے لیے جہیز نہ مانگا جائے تو پھر اس کی بہنوں کا جہیز کہاں سے لایا جائے — ؟ یہ تو اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والی سیدھی سادھی بات ہے۔
ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ لڑکوں کی قیمت مقرر کی جائے۔ — اگر دولھا ڈاکٹر ہو تو اسے گھوڑے، جوڑے کے بیس ہزار دیجیے — پچاس ہزار کا جہیز دیجیے — غرض ڈاکٹر دولھا کو تقریباً ایک لاکھ روپیے میں خریدیئے — کم ڈگری اور غیر منفعت بخش والا دولھا ہو تو اس کے دام کم لگائیے۔ اس طرح کی منصفانہ تقسیم اور طریقۂ کار جہیز کو دولھا کے حق میں رحمت بنا دیتا ہے" جہیز کے متعلق ان کے مفصلاً خیالات جان کر ہم نے انھیں فیل کر دیا — ابھی ہمارا بس چلتا تو ہم ان کے جوابی بیاض کو آگ لگا دیتے۔

"غالب کی ابتدائی شاعری کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ لکھو۔"
جواب پڑھتے پڑھتے آپ بھی دردِ سر میں مبتلا ہو جائیں گے۔
لکھا تھا:—
"غالب کے آباؤ اجداد اس زمانے میں ہندوستان آئے جب کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہو چکا تھا۔ غالب کے لڑکپن میں ہی دلی اپنا جاہ و جلال کھو چکی تھی — نادر شاہ کے حملوں اور پھر احمد شاہ ابدالی — پھر اس کے بعد مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حکومت کم زور ہو چلی تھی دلی کا اقتدار سمٹ کر "از دلی تا پالم" محدود ہو چکا تھا۔ فرمان شاہ کا تھا اور عمل داری انگریزوں کی۔ ایسے پر آشوب زمانے میں آنکھ کھولی، خود غالب کے خاندان میں کوئی مغلیہ دربار سے متوسل تھا تو کوئی انگریزوں کی جانب سے مامور کیا گیا تھا — غرض غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی — وہ زمانہ حرکت و قوت سے محروم تھا۔

غالب نے گیارہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی، ان کی ابتدائی شاعری میں تصوف فلسفہ اور منطق کے مضامین ملتے ہیں — اس لیے ان کی شاعری میں استدلالی انداز بھی ملتا ہے — اور ان کی شاعری پر بیدل کے اثرات نظر آتے ہیں —
ہم جواب پڑھتے جاتے تھے اور سوچتے جاتے تھے — یا اللہ — ہم کس مصیبت میں پھنس گئے — ہم کو کن گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے۔ سوال ایک تو جواب دوسرا۔ پڑھتے پڑھتے تو ہمارے سر میں درد شروع ہو گیا — ہم فیصلہ ہی نہیں کر پائے کہ یہ جواب غالب کی ابتدائی شاعری کے متعلق ہے یا اس زمانے کی تاریخ اور جغرافیے کے متعلق — !؟
سنتے آئے تھے کہ بغیر دل کے آدمی زندہ نہیں رہتا — تو پھر یہ بیدل بزرگوار کون ہیں — زندہ کیسے رہ گئے؟ شاعری کے بیان میں یہ کہاں سے آ ٹپکے — اور پھر یہ غالب صاحب — ہم نے بہت سوچا — دماغ کی گہرائیوں میں تک تلاش کر آئے۔ سمجھ ہی نہیں پائے کہ آخر یہ غالب صاحب کون ہیں۔ تھک کر ذہن کو جھنجھوڑا، بہت دیر تک قلم منہ میں دبائے سوچا کئے اور پھر جب ہمارے دماغ کے اجزائے ترکیبی حرکت میں آئے تو پتا

کھلا کہ بہت پہلے ہم نے جو فلم "مرزا غالب" دیکھی تھی، اس میں مرزا غالب ہی بھارت بھوشن تھا تو پھر یہ غالب صاحب کون ہیں؟

ایک اور پرچے میں "علامہ اقبال کی شخصیت کے متعلق تم کیا جانتے ہو ——؟ وضاحت کیجیے ——!" کے جواب کا اندراج اس طرح تھا۔

"علامہ اقبال کی طبیعت ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جو تھی اور ان کی شخصیت میں ایسے مختلف عناصر جمع ہو گئے تھے جو عام طور پر ایک آدمی کی زندگی میں شاذ ہی ملتے ہیں —— یہ عطیۂ خداوندی تھا جو صرف علامہ اقبال ہی کے لیے اتارا گیا تھا۔ ان کے خیالات اور ان کی زندگی میں بلا کی وسعت تھی —— ہم آہنگی تھی —— ان کے جمال پرست اور عشق پرور دل نے اپنی دنیا الگ بنائی تھی۔

علامہ اقبال کے جسم خاکی میں ایک مصلح حیات کی صداقت پسند اور نظم آفریں روح تھی۔ وہ شاعر، حکیم، نکتہ داں سب ہی کچھ تھے۔ یوں سمجھیے کہ علامہ مجمع البحرین تھے —— جن کی زندگی میں مشرق اور مغرب کے دھارے آکر مل گئے تھے۔ وہ شاعر ماضی بھی تھے، حال بھی اور شاعر مستقبل بھی —— ان کی زندگی اور شاعری کا ہر پہلو اپنے اندر بے پایاں دل کشی رکھتا ہے۔ بقول نظیری۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ——"

یقین کیجیے —— ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور نہ ہی آپ سمجھ پائے —— بھلا ایسی جناتی زبان کس کے پلے پڑتی جو ہماری سمجھ میں آتی، ایک ایک لفظ ہمارے فہم سے بالاتر تھا۔ ہمارے ادراک سے کوسوں دور ——

"ہم تو علامہ اقبال کو مطلق نہیں جانتے جن کا جواب میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہم تو بس ایک ہی اقبال کو جانتے ہیں —— اقبال قریشی کو جو بمبئی میں فلموں میں گاتے ہیں جو فلموں کے لیے میوزک ڈائرکٹ کرتے ہیں اور جن کا کبھی حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے تعلق رہا ہے —— ہم ان غیر معروف علامہ اقبال کے متعلق کچھ اور سوچنا نہیں چاہتے تھے، کہ ایک نامعلوم علامہ کے لیے اپنے سر میں درد پیدا کریں ——"

اس لیے ہم نے بور ہو کر پرچہ پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔

ب ختم ہونے پر ہم کافی بور ہو چکے تھے اس لیے پرچے جانچنے کا کام فی الوقت ملتوی کر چکے تھے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو جواب ہمیں پسند آیا اسے ہم نے ایمانداری سے امتیازی نمبرات دیے تھے اور جو جواب ہماری فہم سے بالاتر تھے انہیں ہم نے خوش اسلوبی کے ساتھ فیل کر دیا۔

ہم تو اس عقیدے کے قائل ہیں کہ انسان ہمیشہ حال پر ہی نظر رکھے —— نہ ماضی کی یاد کو گلے لگائے اور نہ مستقبل کے چکر میں رہے۔

ہمیں یقین ہے کہ پرچے جانچنے کا یہ ہمارا انداز اور طریقہ کار آپ نے بھی پسند کیا ہوگا۔ آپ بھی ہماری قابلیت کی داد دیے بغیر نہیں رہیں گے —— اور جو فیل ہوں گے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ یہی hard correction بڑا ہے۔

∞

شیخ رحمان آکولوی

بیچارے مرزا صاحب

نمازِ عید ادا کرنے کے لیے عید گاہ جانا تھا۔ ہم نے سوچا کیوں نہ آج بھوپال کی لوکل بس کا لطف اٹھایا جائے اور ہم فوراً پارک کے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑے۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ہم نے دیکھا آگے کی طرف ایک صاحب ۵ یا ۶ فرلانگ کے فاصلے پر اپنے مخصوص انداز میں چلے جا رہے ہیں یہ فاصلہ ۱۰ یا ۱۲ فرلانگ کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ جیومٹری میں ہم ازل سے کمزور ہیں کا زاویہ کھینچنے میں آج تک کامیابی حاصل نہ ہو سکی (کل کا اللہ مالک ہے) پستہ قد۔ گندمی رنگت، تنگ شیروانی۔ چست پاجامہ۔ سر پر جناح کیاپ، سفید جوتے۔ لال موزے ہم نے فوراً پہچان لیا کہ یہ ہمارے عزیز ترین دوست مرزا صاحب ہیں۔ اور کیوں نہ پہچانتے برسوں کا یارانہ جو ہے!

"مرزا صاحب" ہم نے آواز دی

مرزا صاحب ہیں کہ چلے جا رہے ہیں۔

"مرزا صاحب" ہم نے پکارا۔

مرزا صاحب پر ہماری اس پکار کا بھی مطلق اثر نہیں ہوا۔ بدستور چلتے جا رہے تھے جبکہ دوسرے راہ گیر پیچھے مڑ مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ مرزا صاحب اب پرانے قبرستان کے پاس سے گذر رہے تھے۔

"اماں مرزا صاحب" ہم نے نعرہ دار ہانک لگائی۔

اس آواز پر تو قبرستان کا کوئی نیا مردہ اٹھ بیٹھا ہوگا۔

لیکن ہمارے رفیقِ عزیز تھے کہ چلے جا رہے تھے۔ بغیر بریک کی کار کی طرح۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی کہ مرزا صاحب کی یہ بے اعتنائی یا بے رخی کسی ناراضگی کا ردِّ عمل تو نہیں۔؟

جب ہم نے دیکھا کہ بار بار کوشش کرنے کے باوجود ہماری چیخیں ان کے پیروں کے لیے بریک ثابت نہ ہو سکیں تو ہم نے تیز چل کر ان تک پہنچنے کی ٹھانی اور تیزی سے قدم بڑھانے لگے۔ دس منٹ کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد آخر کار ہم نے انھیں جا لیا اور سلام کے بعد ان سے اس طرح مخاطب ہوئے۔

"بہت خوب مرزا صاحب! ہم ہیں کہ بار بار آواز دیئے جا رہے ہیں اور گلا پھاڑ رہے ہیں اور آپ ہیں کہ بے دلی سے چلے جا رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے؟"

ہماری شکایت کے جواب میں وہ کہنے لگے۔

"کیوں بے وقوف بناتے ہو ..."

دی اور ہم نہیں رُکے ! بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے ؟

اور وہ مسکرا دیئے مسکرانا تو اسے ہم نہیں کہہ سکتے اور قہقہہ وہ تھا نہیں۔ اب مرزا صاحب کے اس فعل مخصوص کو ہم کیا نام دیں ؟ خیر بات کو پیچیدہ کرنے سے کیا فائدہ۔ بس یوں سمجھ لیجیے وہ مسکراہٹ اور قہقہہ کے درمیان کی کوئی چیز تھی ہو لوی عبدالحق زندہ ہوتے تو مرزا صاحب کے اس فعل مخصوص کے لیے کوئی اصطلاح ضرور تجویز کرتے۔

اب ہم دونوں بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگے۔ چند منٹ گزرے تھے کہ ایک بس جس میں مسافر بُری طرح ٹھسے ہوئے تھے آکر رکی۔ یہ سوچ کر کہ دوسری بس نہ جانے کب آئے ہم اس بس میں سوار ہونے لگے تو باہری دروازے میں کھڑے ہوئے مسافروں نے ہمیں ڈھکیل دیا۔ اگر ہم نے دروازے کی باہری سلاخ اور مرزا صاحب نے ہماری کمر مضبوطی سے نہ پکڑی ہوتی تو ہم دونوں زمین پر آ گئے ہوتے۔ اندر بیٹھے ہوئے مسافر کنڈکٹر کو صلواتیں سنا رہے تھے کہ اس نے بس کیوں رکوائی جبکہ بس میں بالکل گنجائش نہیں تھی۔ کچھ مسافر ڈرائیور کو گھور رہے تھے۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہم نے دروازے میں کھڑے ہوئے مسافروں کو نماز کا واسطہ دیا تب وہ نرم ہوئے۔ چلیے صاحب ہم بس میں داخل ہوئے۔ داخل کیا ہوئے بس یوں سمجھیے اندر کی طرف دھکیل دیئے گئے۔

بس میں کھڑے ہوئے مسافروں کی تعداد بیٹھے ہوئے مسافروں سے زیادہ تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میں ایک پیر کے بل کھڑا ہوا آس پاس جگہ تلاش کر رہا تھا جیسے بگلا پانی میں کھڑا ہو کر مچھلی تلاش کرتا ہے۔

اب بس دوڑنے لگی تھی، میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو یہ تکلیف دہ لمحات جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔ لیکن میرا یہ قیاس قیاس ہی رہا۔ ہر اسٹاپ پر بس میں سوار ہونے والے مسافروں کی تعداد اترنے والے مسافروں سے دگنی رہی اور میری حالت میں فرق نہ آیا۔ مرزا صاحب مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک محترمہ کے پاس اس طرح ٹھس گئے تھے کہ ان کی گود میں بیٹھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ بس کو عیدگاہ پہنچنے کے لیے ۱۵ منٹ کا وقت درکار تھا میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی فہرست ذہن نشین کرنے لگا۔ جن کے دولت کدوں پر عید کا سلام کرنے جانا تھا بس دوڑتی اور رُکتی رہی اور میں نماز عید کے بعد کے پروگراموں کو ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ پھر کنڈکٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"عیدگاہ کا اسٹاپ آگیا ہے۔ عیدگاہ جانے والے اتر جائیے۔"

دوسرے مسافروں کے ساتھ ہم بھی اُتر آئے اور مرزا صاحب کے اترنے کا انتظار کرنے لگے۔ جب کچھ دیر بعد بھی مرزا صاحب نمودار نہ ہوئے تو ہم نے یہ سوچ کر کہ شاید وہ بس میں سو گئے ہوں گے دو تین آوازیں بھی لگا دیں لیکن جواب ندارد۔ پھر ہم نے چاروں طرف سے بس میں جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب بس میں ہیں ہی نہیں۔

ایسا لگتا تھا کہ بس سے اترنے والوں کا ریلا انھیں کسی دوسرے اسٹاپ پر اپنے ساتھ بہا لے گیا ہے۔

سوپن

ترجمہ کالی کا پرشاد

چھٹّی

چھٹّی سب چاہتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے بھی ہر ساتویں دن (اتوار کو) چھٹی دی جاتی ہے اور کہیں کہیں ہفتہ کو بھی آدھی چھٹی ہوتی ہے۔ لیکن کم بخت یہ دونوں چھٹیاں بے کار چلی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہفتہ بھر کے رُکے کام اسی ایک یا ڈیڑھ دن میں تکمیل پانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے باقی کام کے چھ یا ساڑھے پانچ دنوں میں بھی کبھی کبھی چھٹی لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ خوشی، غمی، کسی کی آمد یا کسی کی روانگی وغیرہ قسم کے حادثے بھی اتوار یا ہفتہ کو واقع نہیں ہوتے جیسے باقی دن انہی کے لئے بنے ہوں۔

اسی لئے سرکار کی جانب سے ملنے والی مقررہ چھٹی یا چھٹیوں کے علاوہ CASUAL ، EARNED ، MEDICAL وغیرہ کئی طرح کی چھٹیاں ملتی ہیں۔ چھٹی منانے میں جتنا مزہ آتا ہے اتنا ہی اس کو لینے میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ کہ چھٹی لینے میں زمین و آسمان ایک کرنا پڑتا ہے۔ ہاتھ پاؤں پٹکنے پڑتے ہیں، دنیا بھر کے سچے جھوٹے بہانے بنانے پڑتے ہیں اور "یا بدعنوانی تیرا ہی سہارا" جیسے حربوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے کبھی کبھی تو چھٹی لینے کے لئے ایسے ایسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جیسے ساری دنیا کی بادشاہت حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

ایمرجنسی کیا لگی کہ سرکاری، غیر سرکاری افسروں کی تو چاندی ہی ہو گئی۔ چھوٹے بڑے سبھی افسروں کے ہاتھ میں چھٹی اور کانفیڈنشل (CONFIDENTIAL) رپورٹ ہی تو ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کے تحت کام کرنے والے ملازمین کا مستقبل انہی پر منحصر ہے۔ اچھی یا بُری کانفیڈنشل رپورٹ کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے

کیونکہ یہ نہ ہوگا تو پروموشن بند نہ ہوگا۔ لیکن چھٹی کا نہ ملنا تو ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ چھٹی کے نہ ملنے پر کبھی کبھی کوئی ایسا کام نہیں ہوسکتا جس پر خاندان کا سکون غارت ہو یا کوئی ایسا کام غیر حاضری کا فائدہ اُٹھاکر اپنے آپ ہوجاتا ہے جو نقصان کا باعث ہوجاتا ہے ــــ اسی لئے چھٹی لینے کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

نیا ملازم تو اپنے افسر کے سامنے ناک رگڑتا رہ جاتا ہے پھر بھی چھٹی نہیں ملتی جب کہ پرانا تجربہ کار ملازم گھر بیٹھے صرف ایک یا دو روپے خرچ کرکے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج کر چھٹی کا پورا پورا لطف اُٹھاتا ہے۔ رجسٹرڈ ڈاکٹروں کی قلم میں کچھ ایسی طاقت ہوتی ہے کہ ان کے لکھے کو فرشتے تک کاٹ نہیں سکتے۔

اسی لئے ڈاکٹر آج اپنی قسلم کی طاقت کو پہچان کر دونوں ہاتھوں سے جم کر دولت اکٹھی کر رہے ہیں۔

اگر افسروں کے گھر پانی بھرا جائے، ان کی ساگ سبزی لادی جائے، ان کے لئے راشن کی دکان پر شکر کے لئے کیو لگانے کا انتظام کر دیا جائے یا ایسے ہی سینکڑوں گھریلو کام کر دیئے جائیں تو چھٹی بڑی آسانی سے مل سکتی ہے۔ کسی دوسرے ملازم کے اعتراض کرنے پر افسر صاف کہتا ہے "I am incharge. It is in my hand ــــ میں جو کچھ چاہوں گا وہ کروں گا" لیکن ایسا کتنے لوگ کرسکتے ہیں؟

مجھے کئی سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین سے ملنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ان میں کئی ایسے ہیں جو وقت پر چھٹی نہ ملنے کے سبب جو نقصان ہوا ہے اس کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے افسروں کی ڈٹ کر برائی کرتے ہیں۔ لیکن کئی ایسا نہیں کرتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج کر چھٹی کا لطف اُٹھا لیتے ہیں۔ انھیں چکی میں گندم پسانا ہوتا ہے تو ڈاکٹر بڑی خوبی سے ایک دن کے آرام کرنے کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے۔ سرٹیفکیٹ پر انھیں زکام ہوگیا ہوتا ہے۔

کہیں اگر انھیں راشن کے لئے کیو لگانی ہوتی ہے یا شاپنگ کرنے جانا ہوتا ہے تو ڈاکٹر انھیں سردی سے متاثر ہوجانے کا اعلان کرکے ایک دن کے آرام کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے۔ کسی دوست یا رشتہ دار کی آمد یا روانگی پر انھیں ہلکا سا بخار آجاتا ہے۔ اور ڈاکٹر انھیں ایک دن کے مکمل آرام کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے۔

اگر ایسے لوگوں کو اپنی سسرال میں کسی سبب جانا ہوتا ہے تو مقامی ڈاکٹر انھیں بڑے آرام سے پیچش کا مریض بناکر من مانی چھٹی کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے۔ حالاں کہ سسرال میں ربڑی ملائی وغیرہ کا پورا پورا لطف اُٹھایا جاتا ہے۔

پکنک یا بیوی کے ساتھ خوش گپیوں میں وقت گزارنے کا پروگرام بن جاتا ہے تو ڈاکٹر انھیں "کف کولڈ اینڈ فیور" کا مریض بتلاکر ایک دن کے آرام کرنے کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے جبکہ پکنک وغیرہ میں سوئمنگ کا پورا لطف اُٹھایا جاتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ کہ رجسٹرڈ ڈاکٹروں کے قلم کی طاقت کسی بھی جھٹکے کو جتنی مدت کے لئے چاہے بیمار بتلاکر آرام کرنے کا سرٹیفکیٹ دے سکتی ہے۔ اور خوبی یہ کہ یہ سب روپیوں کا کھیل ہوتا ہے۔ آپ کو جتنی لمبی چھٹی کی ضرورت ہو اتنے ہی زیادہ روپیوں سے آپ کو ڈاکٹر کی "خدمت" کرنی پڑتی ہے۔ ویسے میں سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین کی بھلائی کے لئے بتلا رہا ہوں کہ اب تک کے سروے سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دو دن تک کی چھٹی کے لئے دو روپیوں سے، پانچ دن کی چھٹی کے لئے تین روپیوں سے اور اس سے زائد دنوں کی چھٹی کے لئے عموماً پانچ روپیوں سے آپ کو ڈاکٹر دیوتا کو نذرانہ دینا ہوگا۔ لیکن یہ نذرانہ اپنے کام کی

اہمیت کے پیشِ نظر ابھرتا نہیں۔

اس قسم کے کام کو بدعنوانی کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی بدعنوانی سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا۔ افسر کی اپنی ضد پوری ہوتی ہے کہ مانگنے پر وہ چھٹی نہیں دے گا۔ ملازم کو چھٹی مل جاتی ہے اور ہر سال میڈیکل کالج سے نکلنے والے ڈاکٹروں کو روزی کا راستہ کھل جاتا ہے۔ کم از کم ان ڈاکٹروں کا تو بھلا ہو جاتا ہے جو برائے نام FORMALITY نبھانے کے لئے کچھ PATENT ادویات دکان میں رکھ کر اور میڈیکل سرٹیفکیٹ دے کر اپنا اور اپنے افرادِ خاندان کا پیٹ پال رہے ہیں۔

کرنل محمد خاں

بصرہ اور شائبہ کیمپ

بصرہ اگرچہ پہلے نہ دیکھا تھا، تاہم ذہن اس کے تصور سے یکسر خالی نہ تھا۔ مثلاً بچپن میں جغرافیہ کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا۔ اس سے بصرے کا تصور سرخ میٹھی کھجوروں کی شکل میں ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ انہی دنوں کے امتحانوں کے گھوٹے[لہ] کی بدولت یہ بھی یاد تھی کہ بصرہ لندن یا ٹمبکٹو کے رستے میں ایک بحری یا ہوائی اڈہ ہے۔ اگرچہ اس اڈے کا تصور فرنگ کے ٹانگوں کے اڈے سے مختلف نہ تھا، پھر بڑے ہو کر ان فوجیوں سے بصرہ کے قصے سنے تھے جو پہلی جنگ عظیم میں اس بندرگاہ پر اتر کر میسوپوٹیمیا کے میدان میں کام آئے تھے یا لیول کہیں کہ بے کار رہ گئے تھے۔ کام آنے والے نے آکر کیا قصے سنانے تھے! اور بعد میں شاید ان ہی فوجیوں کے طفیل بصرہ ہمارے لوک گیتوں میں بھی گھس گیا تھا۔ مثلاً وہ پنجابی گانا:

چھٹی رل گئی، بصرے نون گئی
تے موڑیں یا واڈانگ دالیا سرارا

اگرچہ گیت کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود خاتون نے بصرہ میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ اللہ جانے کیوں؟)

جہاز سے اترے تو معلوم ہوا کہ ہماری منزل بصرہ نہیں، بلکہ بصرہ سے کوئی پندرہ میل مغرب میں ایک بہت بڑا کیمپ ہے جسے شائبہ کیمپ کہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مقام کا نام تو شعیبیہ ہے لیکن اس کا "ع" انگریزوں کے حلق میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ ناموں کے سلسلے میں ہم انگریزوں کی زیادتی سے اپنے ملک میں بھی آشنا تھے۔ مثلاً حیدرآباد کا انگریزی نام ہیدرابیڈ تھا اور کشمیر کا کیشمیر۔ لیکن عراقی ناموں کے ساتھ تو انگریزوں نے اچھی خاصی سکھا شاہی مچا رکھی تھی۔ مثلاً فلاذبک ڈیڈ تھا۔ موصل کو موزل کہتے تھے اور معقل کو مارگل بنا دیا تھا۔ انگریز تو خیر اپنے حلق کی بے بضاعتی کی وجہ سے شاید غلط تلفظ پر مجبور تھے، لیکن حیرت بلکہ رحم ان ہندوستانیوں پر آتا تھا جنہیں اپنی فلاخ بیک ڈیڈ کہنے میں ہی فلاح نظر آتی تھی۔

سرزمین عراق کے وہ پندرہ میل جو بصرہ اور شائبہ کیمپ کے درمیان تھے ہماری زندگی میں ایک انوکھا تجربہ

لہ [illegible]

تھے۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی ایسا اصلی ریگستان نہ دیکھا تھا۔ خود بصرہ تو دجلہ کی گزرگاہ کے طفیل سے بہت سرسبز اور شاداب اور کھجوروں کے درخت تو وہاں انسانوں سے بھی زیادہ تھے، لیکن بصرہ سے باہر نکلنا تھا کہ سبزہ یک قلم غائب ہوگیا اور انسان تقریباً غائب۔ حدِ نگاہ تک لق و دق اور ہموار ریگ زار تھا جس میں کسی عمودی شے کا وجود نہ تھا سوائے کسی بھٹکے ہوئے گدھے یا اونٹ کے جو دور افق پر نظر آتے تھے۔ اگرچہ ان کے وہاں ہونے کی بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ پانی تھا نہ نباتات۔ بقول حالیؔ زمیں ہو چکی سربسر تھی۔ ممکن ہے کہ اس ضمن میں گدھوں اور اونٹوں کا کوئی اپنا زاویہ نگاہ ہو، لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان کے تاثرات معلوم کرسکتے کیونکہ قافلہ رواں تھا اور ہم بار بار دیدے پھاڑے دیکھ رہے تھے کہ کہیں گھاس کی واحد پتی ہی نظر آ جائے لیکن نظر نہ آئی۔ سعدیؔ کا شعر یاد آیا ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار[1]
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اور محسوس ہوا کہ ہم کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں، شائبہ کے نواح میں ہمیں معرفتِ کردگار ذرا مشکل سے ہی میسر ہوگی۔ ہمارے ساتھی جو سید تھے، بولے:

"بجا کہتے ہو دوست، شائبہ کردگار سے زیادہ کربلا کے نزدیک ہے۔ یہاں پتّے دیکھ کر نہیں بلکہ سر دے کر معرفت حاصل کی جاتی ہے۔"

سوچا کہ اگر سعدیؔ شیراز کی بجائے شائبہ میں پیدا ہوتے تو معرفت کا ایسا آسان نسخہ تجویز نہ کرپاتے۔

شائبہ کیمپ میں پہنچے تو پہلی مرتبہ انسان نظر آئے یعنی ہندوستانی اور برطانوی فوجوں کے سپاہی۔ شائبہ ایک reinforcement camp تھا۔ یعنی اس میں فوجی لوگ محاذِ جنگ پر بھیجنے کے لیے ہتوک کے طور پر رکھے جاتے تھے۔ اس وقت ہمارے دو ڈویژن محاذ پر تھے اور ان دونوں کو کمک شائبہ سے ہی جاتی تھی۔ کیا سپاہی، کیا افسر، کیمپ میں مسافر تصور ہوتے تھے اور کیمپ میں آنے کے بعد چند دنوں میں آگے محاذ پر بھیج دیئے جاتے تھے۔ لیکن یہاں خدا کے کچھ پراسرار بندے ایسے بھی تھے جنہیں فطرت نے مفت خوری کا لازوال شوق بخشا تھا اور جنہوں نے تمام تر جنگ شائبہ کے لنگر خانوں اور شراب خانوں میں گزار دی تھی۔ فوج میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ جو لڑ کر جنگ جیتتے اور وہ جو کھا کر جیتتے ہیں۔ شائبہ کیمپ میں دونوں قسمیں پائی جاتی تھیں۔ جگرگداز منظر اس گھڑی ہوتا تھا جب ایک کھا کر جیتنے والے کو محاذِ جنگ پر جانے کا حکم ملتا تھا۔ اور غش نہ پاتا تھا۔ ہم نے چند ایسے مناظر بھی دیکھے اور ہر مرتبہ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

ایک کپتان صاحب کا وقت سفر کبھی نہ بھولے گا۔ یہ حضرت شائبہ کے بانیوں میں سے تھے۔ اور آپ نے اپنا تمام تر وقت اس چھوٹے سے دائرے میں گزار دیا جس کا مرکز کیمپ کا میس تھا۔ حضور کا بڑا ثقیل سا نام تھا جو چھوٹی "ی" پر ختم ہوتا تھا۔ مزاج رنگیلا تھا اور اکثر اپنی شجاعت اور عشق کی داستانیں سنایا کرتے تھے اور ان دنوں اپنی مرادآبادی معشوقہ کو بصرہ میں لانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اچانک ایک دن آپ کو محاذ پر جانے کا فدا اٹل سا حکم مل گیا۔ کیا بتائیں کہ اس مجاہد نے اس مہم کے لیے کیا کیا بہانے تراشے؟ آپ نے جلّا انگریز افسروں کو بآوازِ بلند خبردار کیا کہ یاد رکھو اگر ہمیں محاذ پر بھیجا تو شائبہ دیران، ہندوستانی فوج کا مورال تباہ ہو جائے گا۔ پیچھے مرادآباد کا [redacted] برباد ہو جائے گا اور ادھر سلطنت

---

[1] ایک عقلمند آدمی کی نگاہ میں درختوں کے پتے بھی خدا کی معرفت کا دفتر ہیں۔ [2] امدادی لشکرگاہ [3] جنگ کا میدان

کا مستقبل تاریک ہوجائے گا ــــــ دلائل بے شک وزنی تھے ۔ لیکن ظالموں نے ان کا مذاق کرنے سے ہی انکار کر دیا لہٰذا آپ کو ہی [illegible] پر سوار ہونا ہی پڑا جو ایک میسج محاذ کو لنک لے کر جارہی تھی ۔ اس قیامت خیز ساعت میں آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے [illegible] دیکھ کر سلمٰے شاتبہ پر رقت طاری ہوگئی ۔ لیکن لاری کا حرکت کرنا تھا کہ حاضرین میں ایک بے پناہ قہقہہ گونج اٹھا ۔ ایک [illegible] نے مرادآبادی معشوقہ کو پکار کر کہا :

" تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ایست "

اس وسیع کیمپ کے دو حصے تھے جنہیں ونگ (Wings) کہتے تھے یعنی برٹش ونگ اور انڈین ونگ ۔ برٹش ونگ [illegible] فقط گورا افواج تھیں اور ان کے افسر ۔ یہ ونگ کیمپ کے غربی سرے پر تھا ۔ شرقی حصہ انڈین ونگ تھا ۔ اس میں ہمارے ہندوستا[نی] سپاہی اور ان کے افسر رہتے تھے ۔ ان دنوں انڈین آرمی کے افسر بھی زیادہ تر انگریز ہی ہوتے تھے ، لیکن رفتہ رفتہ دیسی افسر بھی [illegible] تعداد میں آنے لگے تھے ۔ ان میں ہندو ، مسلمان ، سکھ ، پارسی سب تھے جو باہم شیر و شکر تھے ۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستانی [illegible] فوج کو چھوڑ کر زندگی ایک مسلسل ہندو مسلم دنگل تھا جس میں اکثر سکھ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شامل ہوجایا کرتے تھے اور فقط [illegible] ہی اس بزمِ خیر و شر کو ساحل سے دیکھتے تھے ، لیکن فوج میں تمام دیسی افسر ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور اگر خدا واسطے کا بیر تھا تو [illegible] انگریز افسروں سے ۔ ہندوستان کی محکومی کی وجہ سے شاید ہم لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ حساس بھی تھے اور خواہ مخواہ انگریز [illegible] سے الجھنے کو جی چاہتا تھا ۔ لیکن جنگ چھڑ جانے کے بعد بظاہر برٹش افسروں میں بھی قصابوں اور کنجڑوں کی بھرتی ممنوع نہ [illegible] ہم عہدے کے لحاظ سے یہ لوگ ان دنوں ہم سے تقریباً ہمیشہ سینیر ہوتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ دیسی اور انگریز افسروں میں اچھ[ی] خاصی فرقہ وارانہ کشیدگی رہتی تھی اور اسی وجہ سے افسروں کے میسوں میں بارہا نقضِ امن کی وارداتیں ہوئیں ۔

شاتبہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ انڈین ونگ میں اگرچہ اکثریت انگریز افسروں کی ہے ، تاہم ہندوستانی افسروں کی تعداد بھی خاصی ہے ۔ چنانچہ خوشی ہوئی کہ شاتبے کا چند روزہ قیام خوب گزرے گا ، مگر ابھی بستر بھی نہ کھلا تھا کہ حکم ملا : تم برٹش ونگ [میں] قیام کروگے ۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کیمپ میں صرف رائل سگنلز کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے ۔

انڈین سگنلز کا کوئی آدمی یا ٹھکانا نہ تھا ۔

چار ماہ کے تاپختہ سکنڈ لفٹننٹ کو اپنی برادری سے ادھیڑ کر اجنبی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا سامراج[ی] تشدد کی ایک اور مثال تھی ، لیکن کانگریسی تو تھا نہیں کہ لاری کے آگے لیٹ جاتا ۔ بس دانت پیس کر زیرِ لب ہی اپنے جذبات کا اظہار کرلیا ۔ دل ہلکا ہوا ، تو بوریا بستر اٹھایا اور برٹش ونگ جا پہنچا ۔ وہاں ہر طرف گورے ہی گورے تھے ۔ کیا افسر کیا سپاہی ، بلکہ بیرے خانساماں تک انگلستان ساختہ تھے ۔

ایک گورا سپاہی ہمیں بطور اردلی ملا ۔ اس نے آتے ہی ہمیں سلیوٹ کیا اور بغیر بات کئے ہمارا بستر لگایا ۔ سامان قرینے سے رکھا ۔ جوتے پالش کئے اور چائے لایا ۔ ایک انگریز کو یوں دن دھاڑے اپنی خدمت کرتے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے سچ مچ ہمار[ی] صاحبقرانی کی ابتدا ہو رہی ہے ۔ معاً ہمارے خسروانہ ذہن میں خیال آیا کہ سب انگریزوں کو بددماغ سمجھنا مناسب نہیں ہوتا چنانچہ ہم اس گورے غلام کے لیے ایک سراپا شفقت تھے ۔

جب گورا کارِ خدمت سے فارغ ہوچکا تو پہلی مرتبہ ہم سے ہم کلام ہوا ، لیکن کلام کیا تھا ایک لہراتی سی انگریزی نما آواز ہمارے سامنے سے گزر گئی ، لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابلِ فہم نقش نہ چھوڑا ۔ ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات پھر دہرائی ، لیکن اب کے حروف کے نقش بدستور دھندلے اور تجریدی قسم کے تھے ۔ گورا اب خاموش کھڑا تھا ۔ سوچا کہ [illegible] ہم ہی کچھ کہیں چنانچہ [illegible] صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اظہارِ مدعا کیا ۔ گورے اردلی نے ہماری انگریزی کی داد میں ایک مخلصانہ مسکراہٹ [illegible]

پیش کی لیکن جہاں تک اس انگریزی کے ادراک کا تعلق تھا۔ ظاہر تھا کہ غریب سراسر معصوم ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی گفتگو میں کوئی نقطۂ اتصال نہیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشق سخن جاری رکھی تو ہماری انگریزیاں بالکل متوازی پگڈنڈیوں پر ایک دوسرے کو چھوئے بغیر چلتی رہیں گی۔ چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ بقول داغ:

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے

شام کو برٹش ونگ کے افسروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ گورے اردلی سے بھی زیادہ تواضع اور احترام سے پیش آئے پہلے تو حیران ہوا کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو، لیکن فوری معلوم ہو گیا کہ ان کی شرافت کی وجہ کچھ اور ہے۔ یعنی یہ کہ ان انگریزوں نے ابھی تک ہندوستان نہیں دیکھا اور فرعونیت کا انہیں عملی تجربہ نہیں ہوا۔ وہ لوگ سیدھے ولایت سے شائبہ آئے تھے اور ایک غیر ملکی کو انگریزوں کی خاطر لڑتا دیکھ کر اسی طرح ممنون ہوتے تھے جیسے دنیا بھر کے مسلمان محمد علی کلے کے قبول اسلام پر مسرور ہوتے ہیں۔ آج محمد علی کسی اسلامی ملک میں آنکلیں تو لوگ دیدہ و دل فرش راہ کر دیں۔ انگریزوں نے اس قسم کے اعضائے رئیسہ تو ہمارے رستے میں نہ بچھائے۔ لیکن ان کا انگریزی بدل ضرور پیش کیا یعنی تپاک سے مصافحہ کیا۔ چائے پلائی۔ لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا انداز ملاقات تھا۔ جو بھی ملتا اس کے چہرے پر شگفتگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی گفتگو سے سرپرستی اور بے نیازی نہ ٹپکتی تھی جو ہندوستان کے انگریز حاکموں کا ٹریڈ مارک تھا۔ وہ اپنے مخاطب کو اپنے برابر بھی سمجھتے تھے اور قابل عزت بھی

یہ سب کچھ تھا، لیکن میں طبعاً اتنا شامی مزاج بھی نہ تھا کہ میں ان لوگوں میں گھل مل جاتا محض مصافحوں اور مسکراہٹوں پہ مستقل گزارا مشکل تھا۔ برٹش ونگ میں آرام ضرور تھا لیکن گوشۂ قفس کے آرام سے ملتا جلتا اور پھر زندگی فقط آرام کی زیادتی سے ہی عبارت نہیں، بلکہ اگر آتش جواں ہو جیسا کہ وہ تھا تو فالتو آرام ایک عجیب بدنی کوفت اور ذہنی فساد کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر کیمپ کے ہندوستانی حصے میں جاؤں اور اپنے ہم وطن دوستوں کے ساتھ مل کر اودھم مچاؤں۔ اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن انڈین ونگ میں گورکھا سپاہیوں کو سگنل کی تربیت دینے کے لیے ایک افسر کی ضرورت محسوس کی گئی اور نظر انتخاب ہم پر پڑی: چنانچہ لبظاہر کسی قدر وقار کے ساتھ لیکن بباطن بے تابی سے انڈین ونگ میں پہنچے اور دو نفل شکرانے پڑھے

برٹش ونگ کی دھیمی دھیمی بے آواز سی فضا سے نکل کر انڈین ونگ کی رنگ رنگیلی دنیا میں پہنچا تو یوں محسوس ہوا جیسے انار کلی میں آنکلا ہوں۔ وہی انار کلی کا رنگ و صوت اور وہی گہما گہمی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ عین اس وقت کوئی دیسی افسر نظر نہ آتا تھا۔ البتہ ایک قریب کے خیمے سے قہقہے بلند ہو رہے تھے جو لاریب افسرانہ تھے۔ پردہ اٹھا کر داخل ہوا تو سبھی کو یکجا پایا۔ مختار، قاضی، اصغر، بتالیہ، بھاٹیہ، کیانی، امیر، سماعی، نیلنے، نادر اور کئی دوسرے جن سے ابھی تعارف نہیں تھا۔ ہماری آمد کو حسب معمول ایک ایسے نعرے سے منایا گیا جس کا اثر شائبے کے دیگر خیموں میں ایک ہلکے سے زلزلے کے طور پر محسوس کیا گیا۔ پوچھا کہ فرزندان ہند اس بند تمبو میں بیٹھے کیا سازش کر رہے ہیں، تو بتایا گیا کہ کونسل آف ایکشن کا اجلاس ہے۔

ہوا یہ تھا کہ ایک انگریز میجر بنام مڈوے (MEDWAY) نے کیپٹن اجندر سنگھ بتالیہ کے خلاف ایک کیس فٹ کر دیا تھا۔ بزبان فوج انہیں چارج پر رکھ دیا تھا۔ فرد جرم میں مذکور تھا کہ ملزم کو کیبرے دیکھنے کے لیے شائبے سے بصرہ جانا تھا کوئی اور سواری نہ ملی، تو آرمرڈ کار یعنی بکتر بند گاڑی لے کر ہی تماشہ دیکھنے چلا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اب ملزم ان کے سامنے سوال

یہ تھا کہ بتالیہ کی صفائی پیش کرے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ ملزم ارتکاب جرم سے صاف انکار کرے اور ثبوت میں نائک پیتما خاں ڈرائیور سے شہادت دلوائی جائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ملزم ڈٹ کر اقبال جرم کرے لیکن ٹریننگ کا بہانہ کرے۔ اگر پوچھا جائے کہ یہ حرکت سرِشام کیوں کی گئی تو عدالت کی توجہ نائٹ ٹریننگ کی اہمیت کی طرف دلائی جائے۔ یہ سوال کہ ٹریننگ کیبرے پر کیوں جا ختم ہوئی تو اس کی وجہ COMPASS ERROR یعنی قطب نما کی غلطی بتائی جائے۔

مجھے یہ دوسری تجویز کچھ مذاق سا معلوم ہوئی۔ لیکن دوسرے روز بتالیہ نے کورٹ کے سامنے یہی صفائی لفظاً بلفظ پیش کردی۔ عدالت نے جس کے ارکان یقیناً اہل دل تھے — اپنے فاضلانہ فیصلے میں لکھا کہ کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ کیپٹن بتالیہ کو ایک بہترین قطب نما مہیا کیا جائے!

قصہ مختصر اگلی مرتبہ بتالیہ صاحب کیبرے دیکھنے گئے، تو ٹینک میں تشریف لے گئے۔ ہرچند کہ انھیں ایسی سواری کی ضرورت نہ تھی، یہ حرکت محض میجر مڈوے کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے کی گئی تھی۔ مڈوے نے جب یہ خبر سنی تو اس سے زیادہ بےبس اور مضحکہ انگیز برطانوی سلطنت میں اور کوئی نہ تھا۔ بےبس اس لئے کہ ابھی ابھی ایک نیا قطب نما بتالیہ کو دے چکا تھا۔ زبان کھولتا تو نیا ٹینک بھی پیدا کرنا پڑتا۔

کیپٹن بتالیہ کی مہم نے میجر مڈوے کی شکایتوں کا تو تقریباً قلع قمع کردیا، لیکن اس کی بدتمیزی کا انسداد مشکل تھا۔ سر مڈوے کی بدتمیزی کچھ خداداد سی چیز تھی اور اس باب میں وہ خاصا برگزیدہ شخص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس جنس کی تقسیم کے وقت اسے قرب خاص حاصل تھا۔ اور کسی مغالطے کے تحت اس نے اپنا دامن ذرا زیادہ پھیلا دیا تھا۔ اور اب اس بےکراں دولت کو اس آزادی سے استعمال کرتا تھا کہ اس کی ترکیب استعمال پر داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً مرتبہ مجھے میجر صاحب سے کام پڑ گیا۔ ان کے دفتر میں حاضر ہوا اور دروازے پر کھڑے ہو کر معروف انگریزی طریقے سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔

"میں ایک سکینڈ کے لیے اندر آسکتا ہوں؟"

میجر صاحب بولے "ہاں آؤ۔"

اندر داخل ہوا اور ابتدائے کلام کرنے لگا، تو گھڑی دیکھ کر بولے۔

"ایک سکنڈ ہو گیا ہے، آپ جا سکتے ہیں!"

بات تو ٹھیک تھی۔ ایک چھوڑ ڈیڑھ سکنڈ ہو گیا تھا۔ مؤدبانہ سلیوٹ کیا اور باہر آگیا اور سچ تو یہ ہے کہ میجر صاحب کی بدتمیزی پہ پیار بھی آیا، لیکن بدقسمتی سے یہ بدتمیزی کسی قدر ان کی پریشانی کا باعث بنی۔ ہوا یہ تھا کہ میں میجر صاحب کے پاس ان کی ہم کلامی کا فخر حاصل کرنے کے علاوہ سرکاری کام سے گیا تھا۔ مجھے کیمپ کے کمانڈنٹ صاحب نے چند ضروری کاغذات دے کر بھیجا تھا کہ میجر مڈوے کو پہنچا دینا۔ ایک سکنڈ کی مہلت میں یہ کاغذات پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ چنانچہ دوپہر کو جب کرنل صاحب لنچ پہ ملے تو انہیں واپس کردیئے اور ساتھ ہی وجہ بھی عرض کردی۔ یہ معلوم نہیں بعد میں میجر مڈوے اور کرنل صاحب کے درمیان کیا گزری۔ البتہ بعدازاں جب کبھی ہم نے میجر مڈوے کے دروازے پر دستک دی تو وہ یہ نہیں پوچھتے تھے کہ کیا چاہتے ہو اور جی کڑا کر کے ایک باکفایت سی مسکراہٹ کا انتظام بھی فرما دیتے۔

سچ تو یہ ہے کہ میجر مڈوے کی بدتمیزیاں ہماری زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔ لیکن ایک دو ناموافق حادثوں کے بعد میجر صاحب خوش تمیزی پر اتر آئے جس کا ہماری صحت پر خاصا ناگوار اثر پڑا یعنی ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا اور خالی مسلمان ہی ہو نہیں لیتا [illegible]

لیکن جس چیز نے قصبۂ شاہیہ کو رنگین کر دیا وہ غریب مدعے کا لہو نہ تھا بلکہ خوبانِ بصرہ کے لب و رخسار کا غازہ تھا۔ بصرہ شاہیہ سے بہت دور تھا۔ یہی کوئی چودہ پندرہ میل۔ چنانچہ ہماری ہر شام بصرہ میں گزرتی تھی۔ پہلی مرتبہ ہم ایک اتوار کی صبح کو وہاں گئے اور یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ عراقی مرد تو ہم ہندیوں کی طرح گورے بھی ہیں اور کالے بھی۔ لیکن خواتین عراق سب کی سب لالہ رخ اور سیمن بر ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لالہ و سمن کسی قدر افلاس کے خس و خاشاک سے آلودہ تھا، لیکن ہم آملہ درجہ دوم کے متوسط ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بصرہ کے بازاروں کی بھکارنیں بھی اگر کسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں پہنچ جائیں تو بغیر تعارف کے جونیر مہارانیاں بن جائیں۔ اس قدر بے حجابا حسن کو یوں چیتھڑوں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھ کر دل دکھنے سا لگا بلکہ ہمارے ایک دوست نے تو جب پہلی عراقی حسینہ کو ننگے پاؤں دیکھا تو تڑاق سے اسے جوتے خرید دیے۔ فرمانے لگے:

"کیا ستم ہے یار، پھولوں جیسے نازک پاؤں اور انگاروں کی سی زمین پر چلیں، میری حمیت کو گوارا نہیں"

لیکن بعد میں جب ایسی ہی گل اندام وں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے جو بلا تکلف بصرہ کے بازاروں میں ننگے پاؤں پھر رہی تھیں تو کسی قدر سراسیمہ ہو گئے۔ غالباً دل ہی دل میں آپ نے اپنی پونجی کو ان برہنہ پا حسیناؤں کی تعداد پر تقسیم کیا اور دیکھا کہ حاصل قسمت اتنا بھی نہیں کہ فی حسینہ ایک انگلی بھی ڈھک سکے۔ اس سادہ تقسیم کے سوال نے انہیں گہری رومانی دنیا سے نکال کر بصرہ کے تپتے چوک میں لا کھڑا کیا؛ چنانچہ اب وہ بے پاپوش دوشیزاؤں کو دیکھتے تو ان کی حمیت کو کوئی دانع ٹھیس نہ لگتی۔

لیکن بصرہ میں پاپوش خواتین بھی تھیں اور قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بالآخر ہمارے دوست کو پالا پڑا، تو ایک ایسی خاتون سے جس کے جوتے کی نوک میں ایک ننھا سا، پیارا سا اٹھی دار ہیڈ نصب تھا۔ ساتھ ہی اس سراپا ناز کو وصل و صہباسے بھی خاص پرہیز نہ تھا، چنانچہ ایک روز ہمارے دوست پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی اور غریب کسی پیش دستی کے بغیر اس خاتون کے دو بغل حملے کا شکار ہو گئے اور ہفتہ بھر کسی کو منہ بلکہ سر دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جوتے کا جارحانہ استعمال ہندوستانی خواتین کا ہی اجارہ نہیں، بلکہ یہ حوا کی بیٹی کا عالمگیر ہتھیار ہے —— بہر حال محض جوتے کا بپا کردہ حشر ایسی چیز نہ تھی جس سے ہمارے دوست سے جنونِ عشق کے اندر چھپ جاتے،

چنانچہ چند ہی دنوں میں آپ کے نہ صرف بال اگ آئے بلکہ اس زود پشیماں خاتون کے دل میں مہر و محبت کے چشمے بھی ابلنے لگے۔ آج کل جب کبھی یہ میاں بیوی ہمیں پاکستان میں ملتے ہیں تو ہم شرارتاً اسکول کے دنوں کا مصرع گنگناتے ہیں کہ

المدد پاپوشِ جاناں سر مرا کھجلائے ہے!

لیکن حسینانِ بصرہ کے ساتھ ہمارے تمام معاملے شادی پر ہی ختم نہ ہوئے بلکہ بعض اوقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔

(باقی آئندہ)

جوہر سیوانی

"حسن گلشن نہیں تو کچھ بھی نہیں"

گوری دلہن نہیں، تو کچھ بھی نہیں
حسن کا دھن نہیں تو کچھ بھی نہیں

آپ ہیں شاعرِ عظیم مگر
گانے کا فن نہیں تو کچھ بھی نہیں

زندگی کی حسین لنکا میں
غم کا راون نہیں تو کچھ بھی نہیں

تاش کا کھیل خوب ہے لیکن
پتے باون نہیں تو کچھ بھی نہیں

آٹھ کمرے سہی کسی گھر میں
ایک آنگن نہیں تو کچھ بھی نہیں

بیسؔ ڈبے ہوں ریل گاڑی میں
ایک انجن نہیں تو کچھ بھی نہیں

لڑتی ہو رات بھر جو شوہر سے
وہ پڑوسن نہیں تو کچھ بھی نہیں

لاکھ سجنی کرے سنگار بہار
اس کا ساجن نہیں تو کچھ بھی نہیں

آپ ہپّی بنے تو ہیں لیکن
نعرۂ زن نہیں تو کچھ بھی نہیں

لاکھ پوجا میں غرق ہوں پنڈت
"دل برہمن" نہیں تو کچھ بھی نہیں

جو ہو نیتا کے واسطے پکوان
وہ مرغن نہیں تو کچھ بھی نہیں

شیخ کی چالبازیاں تسلیم
لوگ بدظن نہیں تو کچھ بھی نہیں

لاکھ سلجھی ہو زندگی لیکن
اس میں الجھن نہیں تو کچھ بھی نہیں

میں جو دیکھوں تو وہ نظر آئیں
ایسا درپن نہیں تو کچھ بھی نہیں

عشق کے کاروبار میں جوہرؔ
دل جو پُرفن نہیں تو کچھ بھی نہیں

قطعہ

حکومت قوم سے غافل نہیں ہے
علاجِ دل کوئی مشکل نہیں ہے
بنا "پیشاب" "جل جیون" تو یارو
مرض کوئی بھی اب قاتل نہیں ہے

ایک نئے دور کی

دہلیز پر

ہمارے سماج کے کمزور طبقات جنھیں ہماری برادری نے ایک عرصۂ دراز سے فراموش کر دیا تھا اب کچھ مدت سے ان کی ہمہ گیر ترقی کے لیے تیار کی ہوئی بہت سی خصوصی اسکیموں کے مفید اثرات کی بدولت اپنے لیے ایک مقام بنا رہے ہیں۔

آندھرا پردیش ان چند ریاستوں میں ایک ہے جہاں درج فہرست اقوام۔ درج فہرست قبائل اور ساتھ ہی ساتھ پسماندہ طبقات کی معاشی امداد کے لیے پروگرام آغاز کرنے کی خاطر مالیاتی اداروں کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔

تین بااختیار کارپوریشنس یعنی شیڈولڈ کاسٹس کوآپریٹیو فینانس کارپوریشن۔ بیاک ورڈ کلاسز کوآپریٹیو فینانس کارپوریشن اور شیڈولڈ ٹرائبس کوآپریٹیو فینانس کارپوریشن گزشتہ تین برسوں سے کمزور طبقات کو وسیع اور مختلف اقسام کے فوائد سے ہمکنار کرنے کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے ہیں۔

۷۹-۱۹۷۸ء کے سالانہ منصوبے میں کمزور طبقوں کی بہبود کے لیے ۸ء۳۲ کروڑ روپیوں کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش

حیدرآباد NO. 6/78-79

پرویز یداللہ مہدی

قسط وار ناول

چہ خوب - ۲۴

آخری ایکٹ پر سے پردہ اٹھنے میں خاصی تاخیر ہوگئی۔ حاضرین کی بے تابی، بے چینی میں بدل گئی۔ ہم میاں چھیڑ کر دوبارہ ہال میں پہنچ چکے تھے اور اسٹیج سے نزدیک ہی ایک کرسی پر قبضہ جما لیا تھا۔ ادھر اسٹیج پر سے پردہ ہٹا اور ادھر جملہ حاضرین معہ خاکسار کے دم بخود رہ گئے۔ اسٹیج کیا تھا قلوپطرہ کے زمانے کے شہر مصر کا پاکٹ اڈیشن معلوم ہوتا تھا۔ اسٹیج کی عقبی دیوار پر "اہرام مصر" کی عجب صورت پینٹنگس اس ترتیب سے سجائی گئی تھیں کہ اصل کا گمان ہوتا تھا۔ اسٹیج کا احاطہ کی ہوئی مدھم روشنی اور بار بار گردش کرتا ہوا تیز روشنی کا دائرہ پس منظر سے ابھرتی ہوئی مصری موسیقی نے ماحول کو خواب آگیں بھی بنا دیا تھا۔ اور پراسرار بھی۔ اسٹیج کی اس خواب ناک پراسراریت نے تمام حاضرین پر جیسے سحر سا طاری کر دیا تھا۔ اچانک موسیقی کی لے کسی قدر دب سی گئی۔ پھر ایک نسوانی آواز ابھری۔ "حاضرین اسٹیج کے ماحول نے ہمیں یقین ہے آپ کو آج سے ہزاروں برس پہلے مصر میں پہنچا دیا ہوگا۔ وہ مصر جو آج بھی قتالۂ عالم "قلوپطرہ" کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ آج کے جشن کی اس آخری پیش کش میں ہم "قلوپطرہ" کی زندگی کا وہ حصہ پیش کرتے ہیں جب وہ اپنا سب کچھ ہار چکی ہوتی ہے۔ اس کا محبوب "مارک انتونی" دشمنوں کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ دشمن فوج مصر کے چپے چپے پر اپنا چیت کے پرچم گاڑھتی ہوئی محل کی جانب بڑھتی چلی آ رہی ہے ——— ایسے عالم میں قلوپطرہ بہادری سے موت کو گلے لگا کر دشمن کی فتح کو شکست میں بدل دیتی ہے ... ملاحظہ کیجئے۔ قلوپطرہ کی زندگی کا اہم ترین اور آخری منظر ...!"

مائک کی آواز کے ڈوبتے ہی اسٹیج کی روشنیاں بھی گل ہوگئیں۔ اور پھر اندھیرے کے اسی مکمل سکوت کو چیرتے ہوئے ایسی موسیقی نشر ہونے لگی جو میدان جنگ کی معرکہ آرائیوں کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی ...... یوں لگ رہا تھا جیسے سامنے اسٹیج نہیں بلکہ واقعی میدان کارزار ہے۔ پھر اچانک کسی کی دل دہلا دینے والی مردانہ چیخ ابھری جیسے زہر میں بجھی ہوئی تلوار نے مارک انتونی کا کلیجہ کاٹ کر رکھ دیا ہو۔ پھر اچانک اسٹیج مدھم روشنی میں آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا۔ ہلکی روشنی سے اسٹیج کی ہر چیز کو جیسے دھندلے سے کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ پھر اچانک ایک نسوانی اور دلخراش چیخ ابھری ——— نہیں ——— نہیں ——— نہیں ——— اور پھر اچانک تیز روشنی کے دائرے نے [illegible] کے عین وسط میں نظر آنے والے دھندلے سے ہیولے کو ایک دم واضح کر دیا۔ قلوپطرہ [illegible] کے عالم میں اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپاتی نظر آئی۔ قریب ہی ایک نیگرو ملازمہ مجرم کی بنی کھڑی تھی [illegible] کی موت کی خبر سنا کر اس نے بہت بڑا جرم کیا ہو ——— روشنی کا دائرہ قلوپطرہ کو سامنے پیر تکتا ہوا آ [illegible]

ں لیے ہوئے تھا۔ تماش بینوں کی متحیر آنکھیں ابھی تک غالباً یہ شناخت کرنے میں ناکام رہی تھیں کہ "قلوپطرہ" کے روپ میں خود قلوپطرہ کو چیلنج کرنے والی یہ ہستی کون ہے۔؟ ہم نے بھی اگر کچھ دیر مچان پر سے مسٹر اینڈ مسز جیہ خوب کے مابین ہونے والے زبانی مذاکرہ کا نظارہ نہ کیا ہوتا تو اس شناختی پریڈ میں دیگر تماش بینوں کی طرح ناکام ہی رہتے۔ ادھر قلوپطرہ نے دھیمے دھیمے قدموں سے اسٹیج پر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ روشنی کا دائرہ بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ پھر قلوپطرہ کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری ـــــ میرے محبوب! آخر تم بھی مجھے بے یار و مددگار چھوڑ گئے ـــــ زندگی بھر ساتھ نبھانے کی وہ قسمیں وہ وعدے سب بھلا دیے تم نے۔ بے وفا! تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اپنی قلوپطرہ کو اپنے ہمراہ لے جاتے۔ تمہارے بغیر اب میری زندگی میں کیا رکھا ہے، آج پہلی مرتبہ یہ محسوس ہو رہا ہے کہ زندگی کتنی بے معنی بے رس اور بے وجہ ہے اور موت کتنی حسین، کتنی رحم دل اور کتنی شفیق ہے ـــــ" اتنا کہہ کر قلوپطرہ چپ ہو جاتی ہے پھر اپنی خاص ملازمہ کی طرف دیکھ کر کہتی ہے ـــــ "اے میری رازدار، غم گسار ساتھی! آج حق نمک ادا کرنے کا وقت آگیا ہے، جاؤ اور اس نجات دہندہ کو لے آؤ، جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے دودھ پلا پلا کر اسی دن کے لیے پالا تھا ـــــ" ملازمہ اس حکم پر سر جھکا کر سسکتی ہوئی اسٹیج کے ایک طرف بڑھتی ہے، روشنی کا تیز دائرہ اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ اسٹیج پر پھر مدھم سی روشنی پھیلی ہوتی ہے۔ پس منظر میں موسیقی تیز ہو جاتی ہے۔ جس میں اس مرتبہ گھوڑے کی ٹاپیں اور فاتح فوج کی سعف کا وہ چیخ و پکار غالب ہے جس سے یہ کامیاب تاثر پیدا ہوتا ہے کہ فاتح فوجیں قلوپطرہ کے خاص محل کے دروازے تک پہنچ چکی ہیں ـــــ کچھ دیر بعد یہ شور دب جاتا ہے۔ اسٹیج پر پھر ایک بار تیز روشنی کا دائرہ نمودار ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ملازمہ بھی ہاتھوں میں ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ پس منظر میں موسیقی میں وقفہ وقفہ سے سانپ کی پھنکار سنائی دیتی ہے۔ ملازمہ، قلوپطرہ کے پاس پہنچتی ہے۔ قلوپطرہ اسٹیج کے وسط میں اپنے بیش قیمت تخت پر بڑی شان اور تمکنت کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔ ملازمہ سانپ کی ٹوکری قلوپطرہ کی طرف بڑھاتی ہے۔ قلوپطرہ ٹوکری کو غور سے دیکھتی ہے۔ پھر ایک دلیرانہ شان کے ساتھ اپنا داہنا ہاتھ ٹوکری کی طرف بڑھاتی ہے۔ روشنی کا تیز دائرہ آہستہ آہستہ گھٹنے لگتا ہے۔ قلوپطرہ کی آواز ابھرتی ہے ـــــ "الوداع! اے مصر الوداع! الوداع اے دنیا الوداع! الوداع اے بے رحم وقت الوداع ـــــ" ٹوکری کا اوپری حصہ ایک طرف سے آہستگی کے ساتھ اٹھتا ہے قلوپطرہ کا ہاتھ اندر داخل ہوتا ہے ـــــ روشنی کا دائرہ ایک دم غائب ہو جاتا ہے۔ قلوپطرہ کی آخری سسکی جس میں لامتناہی کرب ہے۔ بے اندازہ درد ہے ـــــ اس قدر فطری سسکی کہ دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوا جیسے انہیں کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو ـــــ اسٹیج کی مدھم روشنیاں بھی گل ہو جاتی ہیں پردہ گر جاتا ہے۔ لوگ اس طرح دم بخود بیٹھے ہیں جیسے کسی نے ان کی رگوں سے سارا لہو نچوڑ کر انہیں پتھر کا بنا دیا ہو ـــــ!

● بت بنے ہوئے دم بخود مجمع میں حرکت اسی وقت پیدا ہوئی جب اچانک اسٹیج کے پردے کے پیچھے سے ایک گھٹی گھٹی سی خوف زدہ نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ آگے کی قطار میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ اسٹیج کی طرف دوڑ پڑے۔ تجسس، تحیر اور خوف کی ایک لہر نے سارے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ لہر ہمیں بھی کھینچ کر پردے کے پیچھے لے گئی اور پھر ایک ایسے دل خراش منظر سے آنکھیں دو چار ہوئیں کہ لوگوں میں دوڑنے پھرنے والا گرم لہو بھی منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس اندوہناک منظر کا بیان سے باہر تھی ـــــ قلوپطرہ کا تازہ ایڈیشن یعنی مسز جیہ خوب عرف نادرہ خانم، کا مردہ جسم جو ابھی کچھ دیر پہلے تک اپنی ہر حرکت سے دیکھنے والوں کے لہو کو گرما رہا تھا، کسی یخ بستہ برف کے تودے کی طرح سرد اسٹیج پر پڑا تھا، چہرہ نیلا پڑ چکا تھا،

ہونٹوں سے کف اس طرح ابل رہا تھا جیسے صابن کا بھرپور جھاگ، اگر کہیں زندگی کی ہلکی سی رمق باقی تھی گرمی کی دم توڑتی ہوئی لہر سسک رہی تھی تو موصوفہ کی آنکھوں میں ——— ہمیں دیکھتے ہی ان دم توڑتی ہوئی آنکھوں میں، ڈوبتی ہوئی سانسوں میں پتہ نہیں کہاں سے کچھ جان آگئی۔ بے جان ہاتھ میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اس اشارے نے ہمیں تڑپا دیا لرزا دیا۔ جھپٹ کر ان کے نزدیک پہنچ گئے اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی وقت اس الم ناک حادثے کی خبر سارے کلب میں پھیل چکی تھی، ایک ہجوم تھا جو اسٹیج پر ٹوٹا پڑ رہا تھا، کلب کے ممبر بے قابو لوگوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس دوران میں قبلہ چہ خوب، شبتو، پھوپھی اماں اور بے دھڑک اسٹیج پہ پہنچ چکے تھے۔ سب کی زبانیں گنگ تھیں جیسے کسی غیبی طاقت نے ان سب کی قوت گویائی سلب کر لی ہو۔ اچانک خان فولادی عرف طوطا پری دوڑتا ہوا اسٹیج پہ پہنچا اور پھر مسز چہ خوب کے قریب پہنچ کر دوزانو ہو گیا اور موصوفہ کے داہنے ہاتھ کے اس حصہ کا معائنہ کرنے لگا جہاں سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے ایک سیاہ دھبہ نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے موصوفہ کے ہونٹوں سے بہنے والے نیلے کف کو بغور دیکھا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ غیر اضطراری طور پر ملتے ہوئے مایوس لہجے میں بولا اب کچھ نہیں ہو سکتا ——— کچھ نہیں ہو سکتا ——— میرے خدا...." خان فولادی اپنا جملہ مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ اچانک بے دھڑک کسی شکاری کتے کی طرح چلاتا ہوا اس پر پل پڑا ——— "یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے کمینے.... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا......" بے دھڑک کسی خون خوار بھیڑیے کی طرح خان فولادی کو نوچنے کھسوٹنے لگا۔ بچاؤ کے لیے آٹھ دس مضبوط ہاتھ پاؤں والے نوجوان ان دونوں سے لپٹ گئے۔ لیکن اس وقت اس اچانک صدمے اور شاک نے بے دھڑک کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا تھا۔ خان فولادی جیسا فولادی انسان بھی بے دھڑک کے آگے اس بندر کی طرح بے بس نظر آ رہا تھا جو شیر کی صرف آواز ہی سن کر تھر تھر کانپنے لگتا ہے گویا بے دھڑک کو اس وقت نہ تو موقع کی نزاکت کا خیال ہے اور نہ علاقے کی سربرآوردہ ہستیوں کی موجودگی کا احساس۔ اگر کسی بات کا خیال تھا تو اسی بات کا کہ مسز چہ خوب کے اس دردناک انجام کا ذمہ دار صرف اور صرف خان فولادی ہے اور قاتل کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانے کی ذمہ داری صرف بے دھڑک پر عائد ہوتی ہے ——— غالباً یہی وجہ تھی کہ اس نے لوگوں کی مداخلت کے باوجود بے دھڑک خان فولادی سے گتھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں پولس بھی آگئی اور پولیس کی آمد ہی بے دھڑک کو خان فولادی سے الگ کر سکی ——— پولیس کے ساتھ ہی دواخانے کی ایمبولنس اور مقامی ہسپتال کے سیول سرجن بھی تشریف لے آئے تھے۔ شاید یہاں سے کسی نے ہسپتال کو فون کر دیا تھا۔ تمام ہی دوست، احباب کے دماغ اس اچانک حادثے سے اس قدر ماؤف ہو چکے تھے کہ کسی کو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ شبو اور قبلہ چہ خوب یوں گم سم کھڑے تھے جیسے یہ سب کچھ ایک خواب ہو، ایک بھیانک خواب! ادھر اچانک ہمارے ہاتھ کو ایک جھٹکا سا لگا جسے مسز چہ خوب نے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس اچانک جھٹکے نے سر سے پیر تک ہمارے جسم میں ایک سرد لہر دوڑا دی، مسز چہ خوب کی گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ سیول سرجن نے جھک کر موصوفہ کی نبض دیکھی پھر انہیں "مردہ" قرار دیا۔ عورتوں کی دبی ہوئی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔ دو ایک باہمت عورتیں جی کڑا کر کے آگے بڑھیں ہم ایک طرف ہٹ گئے۔ ان عورتوں نے مسز چہ خوب کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے ——— ہسپتال کے عملے نے آگے بڑھ کر مرحومہ کو اسٹریچر پر منتقل کیا۔ اور پھر ایک سفید بے داغ چادر سے مرحومہ کے سراپا کو ڈھانک دیا ——— مرحومہ کو ہسپتال کا عملہ غالباً پوسٹ مارٹم کی غرض سے لے جانے لگا ——— بے دھڑک جو اب کسی حد تک اپنے غم و غصے پر قابو پا چکا تھا آگے بڑھ کر مرحومہ کی لاش سے مخاطب ہوا ——— "تم اکثر کہا کرتی تھیں کہ زندگی چاہے کیسی بھی گزرے لیکن موت شاندار ہونی چاہیے ——— دیکھو تمہاری شاندار

عورت بھولی ہے تمہاری — ایک دم یادگار تاریخی موت — قلوپطرہ کی موت ہر عورت کا مقدر نہیں ہوتی — اور تمہارا مقدر کتنا شاندار ہے دیکھو تمام خواتین تمہاری اس شاندار موت پر رشک کر رہی ہیں —" اس صدمے نے یقیناً بے دھڑک کے دماغ کو اتھل پتھل کر دیا تھا اور اس کا سبھی کو احساس تھا اس لیے کسی نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا — اچانک انسپکٹر نے سانپ کی ٹوکری کے بارے میں دریافت کیا جس کی طرف صدمے کی وجہ سے ابھی تک کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ سارا اسٹیج چھان ڈالا گیا لیکن نہ تو ٹوکری کا پتہ چلا اور نہ ہی سانپ کا۔ پھر کیا تھا ایک بھگدڑ مچ گئی لوگ خوف اور دہشت کے مارے دوڑنے لگے کہ یقیناً وہ موذی یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہے اور اچانک نمودار ہو کر کسی نہ کسی کو ضرور چپیٹ لے گا۔ کلب کے ممبران اور پولیس والے لوگوں سے صبر و تحمل سے کام لینے کی اپیلیں کرتے رہ گئے مگر کسی پر اس کا اثر نہ ہوا آنِ واحد میں سارا ہال خالی ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس نے سارا کلب چھان لیا نہ تو ٹوکری ملی نہ سانپ کا پتہ چلا۔ پولیس کی اس ناکامی پر بے دھڑک پھر تاؤ میں آگیا اور پھر طوطا پری پر ٹوٹ پڑا۔

(باقی باقی) ●●

غزل

سراج زملی

اب میں مزید ضبط کا حامل نہیں رہا
بیگم کے ظلم سہنے کے قابل نہیں رہا

دیکھا ہے "ڈریم لینڈ" میں جب سے تمہیں ڈیرا
قابو میں میرے تب سے مرا دل نہیں رہا

اُن کے پتا سے پٹ کے ہوا سیریس بہت
بستر سے اب وہ اُٹھنے کے قابل نہیں رہا

کنگ کانگ' دارا' اُنگاما' محمد علی کلے
کوئی بھی ٹک کے میرے مقابل نہیں رہا

کرنے لگا ہے جب سے میاں اتو یہ شاعری
تب سے کسی بھی کام کے قابل نہیں رہا

○

خرافات

(مراسلے)

★ جلیس نمبر مل گیا ہے۔ حسب معمول بہت بھرپور ہے آپ نے خاص نمبر نکالنے میں جو انفرادیت پیدا کرلی ہے اس کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔

رضا نقوی واہی، پٹنہ

★ جلیس نمبر ملا۔ تم نے اچھا نمبر نکالا ہے مگر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ اس بار چھپائی اور کتابت اچھی نہیں ہوئی۔ بہر حال نمبر مجھے پسند آیا یہاں اور لوگوں نے بھی بہت پسند کیا۔

مجتبیٰ حسین، دہلی

[حیدرآباد میں یوں تو بے شمار لیتھو پریس ہیں۔ لیکن سنگ ساز دو تین ہی پریسوں میں ہیں۔ اتفاق سے جلیس نمبر جن دنوں چھپ رہا تھا، اس پریس کے سنگ ساز اچانک غائب ہوگئے پرچہ روکنا ممکن نہ تھا چنانچہ جلیس نمبر "باضابطہ" سنگ سازی کے بغیر شائع ہوگیا جس کی وجہ سے طباعت کا معیار متاثر ہوا۔

"مدیر"]

★ ابراہیم جلیس نمبر ملا۔ آپ نے شگوفہ کا یہ نمبر نکال کر ہندوستانی صحافت کے وقار کو بلند کیا ہے اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی صحافت کی آبرو رکھ لی۔ مضامین کے لحاظ سے یہ نمبر اپنی جگہ مکمل ہے۔ خط لکھنے میں دو چار منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ معذرت خواہ ہوں۔

(الحاج) برقی آشیانوی حیدرآباد

★ شگوفہ کا ابراہیم جلیس نمبر شائع کرکے آپ نے اہلِ دکن کی لاج رکھ لی۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں جلیس کے انتقال کے بعد بہت کم اہلِ قلم نے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی کے سوائے اور کچھ نہیں کہ ایک بے باک ادیب کو ہم کچھ نہ دے سکے جو ساری عمر ہماری زندگی کو جیا بخشتا رہا۔

لیق الرحمٰن، بسرواد (کرناٹک)

★ شگوفہ کا ابراہیم جلیس نمبر پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ واقعی آپ نے خوب شاندار نمبر نکالا ہے جتنی داد دی جائے کم ہے اور اس کی قیمت صرف ڈھائی روپیے! بڑے دل گردہ سے کام لیا ہے آپ نے۔ بک ایمپوریم سے ساری کاپیاں کٹ گئیں۔ آپ کی لگن، محنت اور محبت قابل تعریف ہے سابقہ خصوصی نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی کافی معیاری ہے۔

جاوید حیات، باقر گنج۔ پٹنہ

★ شگوفہ کا ابراہیم جلیس نمبر ملا۔ فہرست مضامین کی ترتیب بذاتِ خود نشانِ عظمت بنی ہوئی ہے۔ ہر کس و ناکس لفافہ دیکھتے ہی مضمون بھانپ لے سکتا ہے۔ سرورق کی دلکشی الگ حُسنِ طباعت الگ ــــ سو الگ الگ مبارکباد قبول فرمایئے۔

اسمٰعیل آذر، سکک

★ محترم مدیر شگوفہ، سلام مسنون

دیارِ بندہ نواز" گلبرگہ میں جب میں نے اپنے ہوش سنبھالے تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یہاں سے ایک تاریخی دَور دبے پاؤں چلا گیا لیکن زمانہ کی تیز و تند ہوائیں ہمارے اُردو کا ایک شگوفہ بھی اڑا لے گئیں، کیسے پتہ تھا کہ وہ شگوفہ سرزمینِ پاک پر اپنی شگفتگی اور مہک بکھیر دیگا جس کی تازگی سے برِّ صغیر معطر ہوجائیں گے۔ جلیس کے ہجرت کرجانے کے بعد ہم اہلِ وطن ان کی آمد کے لئے برسوں نگاہیں فرشِ راہ کئے ہوئے تھے لیکن پتہ نہیں جانے والے کے زخم کس قدر گہرے تھے کہ انھوں نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

ارضِ وطن کے بچھڑے ہوئے اس قلمکار کی جس کا اَن دیکھا دھندلا سا خاکہ ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا۔ "شگوفہ" نے

اصلی تصویریں دکھادی ہیں۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اب میں جلیس کو ڈھونڈوں تو کہاں ڈھونڈوں۔ اے وطن کی ہواؤ! مجھے بتاؤ کہ جلیس نے کہاں کہاں شگوفے بکھیرے ہیں۔ کدھر کدھر زخم کھایا ہے۔ 'شگوفہ' کے شمارہ کا ایک ایک مضمون "اشک ہائے خون جگر" ہے۔ بس کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر۔ بالخصوص "ہائے جلیس" ایک نوحہ ہے پُر اثر مرثیہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے خراجِ آنسو وصول کرتا ہے۔

ضیا مجاہد متوطن گلبرگہ، حال مقیم راچپور۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ (اداریہ)

'ابراہیم جلیس نمبر' کو توقعات سے کچھ زیادہ ہی پسند کیا گیا۔ ملک کے مشاہیر، ادیبوں اور شاعروں نے اس خصوصی اشاعت پر مبارکباد دی۔ اور چند ہی دنوں میں اس کی ساری کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ یہ دراصل مرحوم ابراہیم جلیس کی مقبولیت کا ثبوت ہے کہ اس نمبر کو سارے ملک میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری کوششیں بارآور ثابت ہوئیں ـــــ شگوفہ کی ایک اور یادگار خصوصی اشاعت 'ڈرامہ نمبر' اب یکم ستمبر کو شائع ہوگا۔ 'ڈرامہ نمبر' کے مہمان مدیر ان دنوں لندن گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی کے فوری بعد 'ڈرامہ نمبر' کو قطعیت دیدی جائے گی۔ یقین ہے کہ قارئین کرام کا تعاون حسب سابق حاصل رہے گا۔

ـــــــــ اردو رسالوں کے ساتھ جنتا حکومت نے جو رویّہ اختیار کر رکھا ہے اس پر اکثر اُردو اخباروں میں لکھا جا چکا ہے۔ جنتا حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے ساتھ ہی چھوٹے اخبارات اور خاص طور سے اُردو اخباروں کو اشتہارات مسدود کر دیئے گئے۔ یہ کہا جاتا رہا کہ اشتہارات کی پالیسی میں تبدیلی کی جا رہی ہے کئی مہینوں کے انتظار کے بعد نئی پالیسی بنائی گئی۔ شرح اشتہارات میں من مانی کمی کر دی گئی اور ایک ہزار سے زائد اشاعت والے اُردو اخبارات و رسائل کو اشتہار دینا طے ہوا۔ لیکن ڈی اے وی پی کا محکمہ نئی پالیسی کے مطابق بھی اشتہارات جاری کرنے میں بخل سے کام لے رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری اڈوانی شخصی طور پر دلچسپی لیں اور اُردو رسائل و جرائد کو اشتہارات کے اجراء کے طریقۂ کار کی تحقیق کریں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ

مدیر

سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت

منظور احمد ✣ حمایت اللہ ✣ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت

راجندر سنگھ بیدی، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین

جلد (۱۱) ______ جولائی ۱۹۷۸ء ______ شمارہ (۷)

فی پرچہ: ۵۰/۱ روپیہ ✣ سالانہ (۲۰) روپے ✣ بیرونی ممالک سے (۳۵) شلنگ

طباعت لیتھو: اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد ۲ (برائے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

طباعت ٹائٹل: اسٹینڈرڈ ایکویمنٹس، شانتی نگر، حیدرآباد (اے پی)

پائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس نزد بہادر پورہ، چھتہ بازار حسینی، پرانی حویلی حیدرآباد ۲

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

شگوفہ

۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱

فون: 57716

کتابت تحریر اور ابتدائی صفحات: مسلم خوشنویس، نزد مسجد کیلا، یاقوت پورہ حیدرآباد ۲۳

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)



کرنل محمد خان
(بسلسلہ گذشتہ)

بصرہ اور شائبہ کیمپ

لسکین کچھ کہنے کو بھی تھے کہ کیپی نے اُن کے سر کو ہاتھ سے دبا کر کرسی پر بٹھا بلکہ چپکا دیا۔ کیونکہ اس کے بعد مسز الیاس نے اُٹھنے کی کوشش ہی نہ کی۔
اب ان میں آگ باقی تھی نہ بگولا۔ بس ایک قبل شدہ خاوندیت سے کر حالاتِ حاضرہ کا ٹکڑ چڑھاؤ دیکھنے لگے۔ ینان بصرہ کے ساتھ ہمارے
اب معاملہ مسز الیاس اور کیپی کے درمیان تھا۔ مسز الیاس نے موقع کا جائزہ لیا۔ کیپی کو ایک واجبی نظر سے دیکھا معاملے شادی پر ہی ختم نہ ہوئے، بلکہ
پھر اُٹھی اور اُٹھ کر اس کے رخسار پر ایک ہلکا سا تھپڑ لگایا۔ یہی تھپڑ جو مردانہ بدتمیزیوں کا روایتی نسوانی ملاقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں
جواب ہوتا ہے۔ اس سے کوئی جسمانی گزند پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، البتہ اس کا اخلاقی گھاؤ خاصا نہ دیکھنا پڑا۔ مثلاً مسعودیہ ہوٹل کی وہ رنگین شام کہ اُس کا
گہرا ہوتا ہے۔ اس تھپڑ کو کیپی نے ایک گونہ اطمینان سے برداشت کیا۔ بظاہر ان کی دالان حسینوں سے پُر تھا اور لفٹنٹ کیپی ییلا یک ایک فتنہ روزگار
کی زندگی میں بھی یہ پہلا حادثہ نہ تھا ـــــ اگلے لمحے میں مسز الیاس کا رد عمل ہر چند کہ وہ کافرہ اس خراجِ عظیم کی مستحق سے کلڑے دل لٹانے کو آمادہ ہو گئے۔
اس چیز کی طرف تھا جس کا خاوند کہلاتا تھا۔ اس قابلِ احترام خاتو تاہم اس کا انتخاب اس اعتبار سے ناموزوں تھا کہ بیاہتا تھی اور اپنے دولہا کے
نے پہلے تو اُسے گہری حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر پہلو میں بیٹھی تھی۔ معلوم ہوا کہ عراقی نصرانیوں میں سے ہے اور مسز الیاس کہلاتی ہے۔ اسکے دولہا
اُس کے بائیں گال پر ایک سنا تا تھپڑ جما کر میاں قدرے واضح طور پر بےضرر اور تہ دل سے یتیم نظر آتے تھے کہ کیپی نے اُنہیں ایک نظر دیکھا اور
حق زوجیت ادا کیا۔ تھپڑ کی گونج اور ناراضگی کردیا، پھر اپنی جگہ سے اٹھے او ساتھ کر مسز الیاس کے قدم جا لیے اور اُس سے تخلیے میں بات کرنے کی
کی۔

معشوق کی حق سے واضح

مسز الیاس کی زندگی میں کیپی غالباً پہلے پجاری نہ تھے۔ جنہوں نے اُس کے قدموں پر دل کی بھینٹ چڑھائی ہو چنانچہ تھا کہ موصوفہ نے
تمکنت اور وقار کے ساتھ اجنبی کی التماس سنی اور پھر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ گویا کہتی ہو کہ یہ مقام وہ ہے جہاں جواب خاوند تھپڑ
دینا ہو کتنا ہی بے جان خاوند کیوں نہ ہو یہ آگ بگولا ہونے کا وقت ہوتا ہے، چنانچہ خاوند موصوف حسب توقع آگ بگولا ہو کر اٹھے اور

ذ تھا۔ یہ پوچھا تو مسز الیاس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک تمکنت کے ساتھ تنہا ہوٹل سے باہر چل دی۔

حسینانِ بصرہ کا ذکر جتنا جمیل ہے اتنا ہی طویل ہے لیکن اس کی تفصیل سے احتراز ہی مناسب ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں کی زندگی تھپیڑوں اور بوسوں کا ایک کھٹ مٹھا مرکب تھی اور اس میں شک نہیں کہ شاید کے بے معنی اور بے رنگ دن محض اس لئے قابلِ برداشت تھے کہ ہر دن کے انجام پر بصرے کی بامعنی اور رنگین شام تھی لیکن ظاہر تھا کہ بصرے کے لذائذ ہمارے قوائے عسکری پر بتدریج غالب آ رہے ہیں اور اگر ہم سے کوئی جنگی خدمت لینا مقصود تھا، تو یہ وقت تھا کہ ہمیں بصرہ سے نکال کر کارزار میں ڈال دیا جاتا اور یہ دن دور نہیں تھا۔

اواخر اکتوبر میں ہمیں اچانک حکم ملا کہ فی الفور ہیڈ کوارٹرس دسویں ڈویژن میں پہنچو۔ یہ جنگ آزما ڈویژن اس وقت حبانیہ میں تھا۔ وہی حبانیہ جہاں مشہور برطانوی ہوائی اڈہ تھا۔ چنانچہ دوسرے روز شاہدہ اور بصرہ کو حسرتناک سی الوداع کہی اور بصرہ کے سٹیشن سے بغداد کی گاڑی لی۔ اس سفر میں ہمارے ساتھی لفٹنٹ سپنس (SPENCE) تھے۔

گاڑی کے ڈبے میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ خلد کا در کھل گیا ہے۔ ڈبہ کیا تھا، ایک رواں دواں دیوانِ خاص تھا۔ نفیس اور نرم صوفے، نازک ریشمی پردے، ملائم اور گداز قالین۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی قلوپطرہ داخل ہوگی اور کہے گی:۔

"معاف رکھیے، آپ غلطی سے آگئے ہیں! یہ کمرہ میرے لئے ریزرو ہے۔"

ہم نے پچھلے دنوں میں بھی پہلی مرتبہ فسٹ کلاس میں سفر کرتے وقت نما عیش سا محسوس کیا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ وہ احساس سراسر غلط تھا اور اب کہ حقیقی عیش سے ہمکنار تھے، ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کیں اور اپنے آپ کو کھو دیا ——

یہ سوچا تو ہمیں حیرت ہوئی کہ عین جنگ کے زمانے میں کہ عراق کو پاؤں ڈھکنے کے لئے جوتے میسر نہیں، ان سنہری روپہلی ڈبوں کی عیاشی کیا معنی؟ اور تفتیش پر یہ معنی نکلے کہ یہ مجلا و مطلا ڈبے حکومت ایران کی ملکیت ہیں یا تھے جو خاندانِ کے خوش مذاق بادشاہوں نے جرمنی سے منگوائے تھے کہ سفر کرتے وقت آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلےٰ کی کمی محسوس نہ ہو لیکن گزشتہ قسمت کہ چند ماہ جنگ میں یہ مالِ غنیمت جرمنی سے آتے ہوئے انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اور بصرے میں آ ملا۔ نتیجہ یہ کہ وہ عیش جو فقط تجمل حسین خاں کے لیے بنا تھا سپنس اور محمد خاں کے حصہ میں آگیا —— یہ سفر اگرچہ گھڑیوں میں کٹ گیا، لیکن جو گھڑیاں قلوپطرہ کے آغوش میں کٹیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غنیمت ہوں گی۔

دوپہر کے قریب ہماری گاڑی بغداد پہنچی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے لیے پندرہ ہنڈرڈ ویٹ کا ایک فوجی ٹرک کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ سنا تو یوں محسوس ہوا جیسے قلوپطرہ نے آغوش سے نکال کر پلیٹ فارم پر دے مارا ہو۔ بہرحال اس ٹرک نے ہمیں اور سپنس کو حبانیہ لے جانا تھا۔ (حبانیہ بغداد سے مغرب میں کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے) سپنس بولے، "آؤ ذرا حبانیہ جانے سے پہلے بغداد میں تو جھانک لیں۔" دجلہ کے پل سے گزر کر شارع رشید میں داخل ہوئے یہی بغداد کا دل تھا اور ہے۔ وہی بصرہ کے سے تیور۔ اگرچہ ذرا زیادہ تیکھے دخترانِ بغداد سے نگاہ لڑائی، تو محسوس ہوا کہ مقابلے میں نگاہ نہیں تیغِ نگاہ تھی، بڑا غیر مساوی مقابلہ تھا، چنانچہ پیشتر اس کے کہ کوئی سنگین واردات ظہور پذیر ہوتی، ہمارا ٹرک حبانیہ کی شاہراہ پر تھا۔

یہ وہی سڑک تھی جس پر چند ہفتے پہلے رشید علی کی ساری عراقی فوج کو انگریزوں کے ایک بریگیڈ نے ایک دن میں شکست دی تھی۔ یہ خیال آیا اور دل میں پھر وہی کرب کا احساس اٹھا کہ کاش یہ لوگ جیتتے یا کم از کم کچھ لڑ کر ہارتے۔ حبانیہ کیمپ میں پہنچے جہاں ایک سمندر نما جھیل کے کنارے ہمارا انڈین انفنٹری ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر مقیم تھا، یعنی ہماری منزلِ مقصود۔ ادھر اور گرد و پیش کا جائزہ لیا لیکن اس جائزے میں جھیل کے سوا کچھ بھی نہ پایا جدھر دیکھو جھیل ہی جھیل۔ یہ باور کرنے کے لئے کہ زمین پر کھڑے ہیں ہمیں جھک کر پاؤں کو دیکھنا پڑتا تھا [illegible] پیچھے چلے گئی یہ احساس ہونے لگا

یل کے کھرے نیلے پانی میں ایک ہیبت ناک سی کشش تھی اور
بے اختیار اس میں کود پڑنے کو جی چاہتا تھا یعنی اپنے آپ سے
نورہ کئے بغیر۔ اور اس زنگار نگین جھیل میں کود جانا شاید
بالکل بخش ثابت نہ ہوتا۔ چنانچہ ہم نے اپنے آپ کو مضبوطی
سے پکڑ لیا اور لب آب ہی سے جھیل کا تماشہ کر کے گزر گئے۔

چند قدم ہی گئے تھے کہ وہ خیمے آ گئے جو ہمیں قیام کے
لئے ملے تھے یہ پستہ قامت خیمے اپنے وزن کے لحاظ
سے (FORTY POUNDERS) یعنی "چالیس سیرے"
کہلاتے تھے بمشکل ایک آدمی ان میں رہ سکتا تھا اور آدمی سے
مراد آدمی ہے۔ وہ حضرات جو بیشتر پیٹ پر مشتمل ہوتے ہیں ان
کے لئے آدمی سے زائد ثابت ہوتے۔ خوش قسمتی سے ایسے لوگ
یہاں نہیں پہنچے تھے۔ سب شاید کے لنگر خانوں میں رہ گئے تھے۔

بالآخر ہمیں ایک خیمہ ملا۔ بستر کھولا، ہاتھ منہ دھویا۔
"لباس" واش کیا۔ کپڑے بدلے، اگرچہ ایک خالی جوڑا اتار
کر دوسرا خاکی جوڑا پہننا کپڑے بدلنے سے مختلف فعل ہے۔
— اور جبانیہ کے سینما میں فلم دیکھنے چل دیئے۔ جی ہاں!
فلمیں بھی تھیں، یعنی باقی تمام خرافات کے علاوہ، اس لئے
کہ ان جنگ کا زمانہ تو تھا۔ صرف جنگ نہ تھی۔ انگریزوں نے
جبانیہ میں ایک طویل زمانہ امن گزارا تھا، چنانچہ
تفریحات و آسائش کے اعتبار سے برطانیہ کا لخت جگر
نظر آتا تھا۔ جبانیہ کی سڑکوں پر انگریز لڑکیاں
اس ٹھاٹ سے پھر رہی تھیں گویا پکاڈلی میں گھوم رہی ہوں۔
حقیقت تو یہ کہ جتنا جبانیہ برطانیہ کی نسبت گرم تھا اتنا ہی
ان کا لباس پاس کی آلائش سے پاک تھا یعنی بہ چند
لباس نہیں تھا۔ جو لڑکے اس اشتعال کو بلا شبہ
دیکھے بغیر جانے کی ضرورت تھی۔ ہماری بے خبری کے

متعلق کوئی (CASUALTY) وغیرہ تو نہ چھپی، لیکن تاریخ
گواہ ہے کہ یہ اشتعال ہم نے کمال صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں ہمارا قیام مسافرانہ تھا کہ ایک
خیمے میں کی دو ہی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہماری اصلی منزل بریگیڈ تھی
چنانچہ صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو ہمیں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر
میں طلب کیا گیا۔ میجر سٹیڈ نے ہمیں ۲۰ بریگیڈ کے سگنل سیکشن میں
"سکنڈ ان کمانڈ" ہونے کی نوید دی۔ ساتھ ہی تقرر کے کاغذات
دیئے اور دعا اور پیار کے ساتھ ٹرک میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔

سمیعُ الحق
رانچی

جدید غزل

بند دروازے سے جب یوں گھنٹیاں چلائیں گی
خواب آور گولیاں بھی بے اثر ہو جائیں گی

پانیوں سے ڈھانک کے دودھوں کو رکھا کیجئے
ورنہ بچے گھر کے تو یہ بلیاں پی جائیں گی

راستوں کو جب کروں گا اپنے جادو سے چراغ
بتیاں در بتیاں سب بتیاں پچھتائیں گی

فلم میں کچھ ناچتی آوارہ تصویریں تو ہیں
آنکھیں باقی ہیں تو کتنی صورتیں دکھلائیں گی

عکس ٹھہرانا بھی ہے کیسی نظر بندی کا کھیل
توڑنے کو اس عمل کے آندھیاں اب آئیں گی

ناپ لو صحرائے اعظم اپنے گلے چھوڑ دو
پنجروں میں ورنہ کلیاں سوکھ کے مرجھائیں گی

نمک پارے

خلوص کی قیمت؟

ادب ہو یا ہو سیاست کہ ذکر فلموں کا
کہیں پہ بیٹھ کے کچھ دیر کیجئے گپ شپ
بتاؤ وقت کہاں لے آیا ہے وہاں مونس!
جہاں خلوص کی قیمت ہے چائے کا اِک کپ!

علّامہ؟

چین نے تبت پہ جب قبضہ کیا
بھاگ کر بیچارے بھارت آ گئے
اِس طرح لاما سے علّامہ بنے!
اچھے اچھے لوگ دھوکا کھا گئے

غالب کا پدر!

کھیل بچوں کا نہیں اہلِ ہنر ہو جانا
میر تو میر ہیں فانی یا جگر ہو جانا
اپنے بیٹے کو مگر دے کے تخلص غالب
کتنا آسان ہے غالب کا پدر ہو جانا

تھانے دار!

قریب گاؤں کا تھانہ ہے تم نہ ساتھ چلو
وہ تھانے دار بلا ہے تم نہ ساتھ چلو
جو تم بھی ساتھ گئے [illegible]
[illegible] تم نہ ساتھ چلو

موفق بریلوی

سہیل عظیم آبادی

پیش لفظ

"آداب عرض ہے"

آواز آئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک سنجیدہ صورت خوش پوش صاحب سامنے کھڑے تھے۔ میں ان کو نہیں جانتا تھا۔ اخلاقاً میں نے جواب دیا۔ "آداب عرض ہے"

وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"معاف فرمائیے آپ بے حد مشغول نظر آتے ہیں۔ میں غلط انداز ہوا"

میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔ تشریف رکھئے"

انھوں نے مسکرا کر کرسی کھینچی اور ہاتھ ملانے کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"واقعی میں شرمندہ ہوں اور معذرت چاہتا ہوں۔ آپ کچھ لکھنے میں منہمک تھے"

میں نے ان کو سراپا اخلاق اور سراپا معذرت دیکھ کر کہا۔

"کام تو انسان کی زندگی کے ساتھ ہے لیکن اسی میں سے دوسرے کاموں کے لئے بھی وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔ فرمائیے بے تکلیف فرمائی آپ نے؟"

وہ بڑے جوش کے ساتھ بولے

"صاحب آپ کے شہر میں آنے کا اتفاق ہوا تو آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ کی زیارت کے بغیر چلا جاتا"

عجیب حکایات تھی۔ وہ میری زیارت کے لئے تشریف لائے تھے۔ میں ان سے کبھی نہیں ملا تھا۔ ان کو نہیں جانتا تھا۔ میری ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ میں نے سراپا اخلاق بن کر کہا۔

"شکریہ! آپ کا اسم گرامی؟"

وہ خاص انداز میں مسکرائے اور بولے

"خاکسار کو غلام حسین خاتم کہتے ہیں۔ غریب خانہ ویسے تو اسی ضلع کے ایک گاؤں میں تھا لیکن اب تو دوسرے ضلع میں رہتا ہوں۔ وہاں ایک چھوٹی سی دکان ہے ـــــ آپ جانتے ہیں۔ انسان کو روزی روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔ وہاں چھوٹی سی ایک دکان ہے۔ اللہ پاک کا شکر ہے۔ بچہ جوان ہوگیا ہے۔ وہی کاروبار کو سنبھالتا ہے۔ میں آزاد ہوں۔ گھومتا پھرتا رہتا اور اہل قلم اور اہل علم حضرات سے ملتا جلتا رہتا ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ادبی ذوق بھی ایک بیماری ہے اور ایسی کہ ایک بار لگ جانے کے بعد زندگی بھر نہیں چھوڑتی۔"

وہ بولتے چلے گئے اور میں سنتا رہا۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا۔ مگر انھوں نے اس کا موقع دیا ہی نہیں۔ بولتے گئے۔

"جی ہاں۔ کیا عرض کروں۔ جی ہاں ایسی جگہ رہتا ہوں جہاں روٹی تو مل جاتی ہے۔ لیکن کوئی ادبی ماحول نہیں۔ کبھی شعر موزوں ہوگیا تو کوئی ایسا آدمی نہیں ملتا جسے سناؤں اور دل ہلکا ہو۔ مسلسل گھٹن سی رہتی ہے۔ بس یہ سمجھئے کہ روٹی کی خاطر وہاں اتنے دن صبر اور شکر کے ساتھ گذار دیئے۔ اب اللہ نے باہر قدم نکالنے کا موقع عطا فرمایا ہے۔ تین ضخیم دیوان مرتب ہوگئے ہیں یقین فرمائیے۔ جگر کا خون جلا دیا ہے تو یہ تین دیوان مرتب ہوئے ہیں لیکن اب ان کی اشاعت کا سوال درپیش ہے۔ ورنہ زندگی کی ساری کمائی کے ضائع ہوجانے کا خطرہ ہے۔ آپ اندازہ فرما سکتے ہیں۔ یہ خیال ایک شاعر کے لئے جان لیوا ہے۔ بس یہی ایک خلش ـــــ"

میں نے دیکھا کہ خاتم صاحب اپنی بات ختم کرتے نظر نہیں آتے اور مجھے الجھن ہونے لگی لیکن اپنے گھر پر کسی آئے ہوئے آدمی کے ساتھ بداخلاقی میرے بس کی بات نہیں۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا اور موقع کی تلاش میں رہا کہ وہ ذرا چپ ہو جائیں تو ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت سوچوں۔ لیکن ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہی نہیں تھا۔ میں اکتانے لگا تو ان کی بات کاٹ کر بولا ـــــ "جی درست ہے۔ لیکن اس وقت آپ نے کیسے تکلیف فرمائی؟"

وہ خوش ہو کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"جی۔ میں جانتا تھا کہ آپ یہ سوال ضرور کریں گے اور بندہ نواز۔ میں خود ہی عرض کرنے والا تھا اور یہ عرض اس لئے کرنے والا تھا کہ آپ کے اخلاق کریمانہ کی تعریف ہر اس آدمی سے سنی ہے جو آپ سے مل چکا ہے جو کچھ میں نے دوسروں سے سنا تھا اس سے زیادہ پا رہا ہوں۔ ورنہ آپ یقین جانیں میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کا عادی ہوں۔ اب تک کسی کے پاس اپنی غرض لے کر نہیں گیا ـــــ"

میں نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا۔

"آپ چائے تو ضرور پئیں گے؟"

"شکریہ"

وہ سراپا احسان مند ہو کر بولے۔

"آپ چائے کے لئے پوچھیں اور میں انکار کر دوں۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟"

مجھے محسوس ہوا کہ سویرے سویرے بُرا پھنسا لیکن کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سوچا کہ انھیں چائے پلادوں اور کوئی بہانا بنا کر ان سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔ لکھنے کا موڈ ختم ہو چکا تھا۔ ان سے اور کوئی بات کرنا لاحاصل تھا۔ میں نے ملازم کو آواز دی اور چائے لانے کو کہا ــــ انھوں نے فرمایا۔

"صاحب جیسا سُنا تھا اس سے زیادہ آپ کو پایا۔ واقعی میری یہ خوش نصیبی ہے کہ آپ سے نیاز حاصل ہو گیا۔ صد آپ تو روشن ضمیر معلوم ہوتے ہیں۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والوں کو اور بھی کوئی بڑی لت ضرور لگ جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے مجھے شراب یا کسی نشہ آور چیز کی لت نہیں۔ بس چائے اور سگریٹ۔ سچ جانئے شراب سے تو مجھے دلی نفرت ہے۔ جو لوگ شاعر بننے کے لئے شراب پیتے ہیں وہ ملک اور قوم کے اور اپنے گھر والوں کے بھی دشمن ہیں۔ عام طور پر ہندوستانی شعراء کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ شراب جیسی قیمتی چیز کا استعمال کریں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شراب پینا گناہ ہے۔

میری اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ واقعی یہ حضرت حاتم ثابت ہوئے میرا لکھنے کا موڈ ختم ہو چکا تھا۔ دماغ میں کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی اور اُن سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف ایک صورت رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ ان سے صاف لفظوں میں کہہ دوں۔ بہت ہوا۔ اب آپ تشریف لے جائیں لیکن ایک شریف صورت آدمی کے ساتھ یہ بداخلاقی ہوتی۔ سوچا کہ اب چائے کے آنے تک برداشت کرلو اور ان سے سوال کردیا۔

"صرف شاعری اور ادبی سرگرمیوں کے سہارے آپ ۲۴ گھنٹے نہیں کاٹ سکتے۔ کاروبار آپ کے بچے نے سنبھال لیا ہے اور بھی کوئی مشغلہ ضرور ہوگا"

وہ خوش ہو کے بولے،

"جی ہاں ! آپ نے سچ فرمایا، چوبیس گھنٹے صرف شعر و شاعری میں کیسے گذار سکتا ہے۔ کوئی ــــ جناب کچھ سماجی خدمت اور کچھ سیاست ــــ"

میرا سر چکراتا سا محسوس ہوا۔ یہ شاعری ہی کیا کم مصیبت تھی کہ سماجی خدمت بھی اور سیاست کی بیماری بھی ان کو لاحق ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولے :

"اللہ کا احسان ہے۔ اپنے علاقے میں کافی شہرت اور مقبولیت مجھے حاصل ہے اور سچ جانئے کہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں سماجی خدمت اور سیاست میں حصّہ لینا ضروری ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان علاقوں میں کوئلے کی کانیں ہیں۔ ان کے مالکوں کی تعداد کم اور مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے۔ کانوں کے مالک مزدوروں کی غریبی اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مزدوروں کو دن بھر محنت کرنے کے بعد بھی دونوں وقت کی روٹی نہیں ملتی اور کانوں کے مالک گھر میں بیٹھ کر عیش کرتے ہیں۔ کوئی پڑھا لکھا سماجی شعور رکھنے والا انسان کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں مزدوروں کا حق دلانے کی جدوجہد کرتا رہتا ہوں۔ اگر آپ اِدھر تشریف لائیں تو کسی سے پوچھ لیں۔ خاکسار کا پتہ بتا دے گا۔"

وہ اتنی تیزی کے ساتھ بول رہے تھے کہ ان کو روکنا ناممکن تھا۔ میں ان کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ چہک رہے تھے اور میں بہت خوب بہت خوب کہہ رہا تھا اور دل میں نجات حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ ملازم چائے لے آیا۔ تو میں نے ایک پیالی ان کی طرف بڑھائی۔ انھوں نے شکریہ ادا کرکے پیالی اٹھائی اور ایک گھونٹ پی کر بولے۔

"اتنی باتیں ہوگئیں۔ لیکن جس غرض سے حاضر ہوا تھا وہ اب تک نہیں عرض کرسکا۔"

میں ان کا منہ تکنے لگا۔ اب بھی بات باقی رہی ہے۔ میں نے کہا۔ "فرمائیے۔"

وہ خوش ہوکر بولے۔

"دراصل میں اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں آیا ہوں اور آپ سے عرض ہے کہ اس کا پیش لفظ لکھ دیں۔ آپ سے بہتر اور کون آدمی ہے جو اُس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرسکے۔"

میرا سارا بدن جھنجھنا اُٹھا اور میں نے کہا۔

"آپ خود استاد وقت ہیں۔ آپ کے کلام کو پیش لفظ اور تعارف کی کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ جلدی سے بولے۔

"حضرت ہے۔ جب تک کوئی دوسرا تعریف نہیں کرتا۔ لوگ کسی کے خونِ جگر کی طرف توجہ بھی نہیں دیتے۔ بڑا بدذوق زمانہ ہے۔"

میں نے کہا:

"میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ ابھی باہر جانا ہے۔"

وہ بولے:

"کل حاضر ہو جاؤں گا۔ سارا مسودہ لے کر ـــــ"

میں نے کہا:

"کل تو میں سارا دن ایک دوسرے کام کے سلسلے میں باہر رہوں گا۔"

وہ بولے: "اچھا تو اگلے روز حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں نے جلدی سے کہا: "کل رات کو میں ایک مہینے کے لئے بمبئی جا رہا ہوں۔ آپ کا تکلیف کرنا بیکار ہوگا۔"

وہ چائے کی پیالی ختم کرکے بولے:

"مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ جان کر ـــــ"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور گھڑی دیکھ کر بولا: "ارے دیر ہوگئی۔"

اور مصافحہ کے لئے ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا

"اچھا خدا حافظ ـــــ"

وہ کچھ خفا سے چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

●●

رام لعل نابھوی

صلائے عام ہے!

مَیں گیا اِک شاعرِ اعظم کے پاس
دیکھ کر مجھ کو ہوئے کچھ بدحواس
تیوری ماتھے پر چڑھی تیکھی نظر
سیخ پا کچھ ہو گئے وہ دیکھ کر
پھر کہا، ہو کس لئے آئے یہاں
گھر سمجھ رکھا ہے بادا کا میاں
دست بستہ مَیں نے کی یوں اِلتماس
شعر ہیں کچھ ٹوٹے پھوٹے میرے پاس
آپ ٹھہرے شاعرِ شیریں مقال
اِک اکیلے آپ ہی ہیں باکمال
آپ ہیں عالی نظر عالی مقام
علم و ہیئت کرتے ہیں جُھک کر سلام
رنگ میں ہیں آپ سب سے مُنفرد
مانتے ہیں لوہا سب اہلِ خرد
رمز اور نکتے کے ماہر آپ ہیں
اچھے اچھے شاعروں کے باپ ہیں
ہنس کے فرمانے لگے ٹھہرو ذرا
پھر سے اپنی بات دُھراؤ ذرا
بیٹھ جاؤ تم ابھی آتا ہوں میں
ڈال بھجیا، چائے بھجواتا ہوں میں
خوب کھِلوا کر کہا فرمایئے
کیا لکھا ہے کچھ ہمیں بتلایئے
موڈ ان کا دیکھ کر مَیں نے کہا
شاعری کی کر رہا ہوں ابتدا
مرچ ہے اور چٹک ہے شعروں میں
نمکین ہے اور نمک ہے شعروں میں
کچھ لطافت ہے شعریت بھی ہے
کچھ شرافت ہے شیلنت بھی ہے
استعارے بھی ہیں علامت بھی
تھوڑی جدّت ہے کچھ روایت بھی
تجربے کچھ کیئے ہیں ہیئت کے
کچھ ہیں رُجحان پیکریت کے
لوگ کہتے ہیں مجھکو جانِ غزل
اور کہتے ہیں مجھکو سانِ ہزل
طنز ہے اور کچھ ظرافت بھی
عقل ہے اور کچھ حماقت بھی
نغمگی ہے شگفتگی بھی ہے
چھیڑ خانی ہے دل لگی بھی ہے
مثنوی ہو رُباعی ہو یا ہجو!
یاوہ گو بھی ہوں اور قصیدہ گو
نظم آزاد میں، ہو بندش میں
بکتا پڑھتا ہوں میں غل وغش میں
مرثیہ ہو، قطعہ ہو یا ہو سوخت
کہتا ہوں، ہوں اگرچہ نوآموز
کرنی آتی ہے مجھ کو شاعری کی بات
سیکھے ہیں مَیں نے شاعری کے نکات
رنگ اس میں جدیدیت کا ہے
اِک نیا طرز بشریت کا ہے
صبح سے شام تک یہی ہے کام
مجھ پہ آرام ہو گیا ہے حرام
مَیں ابھی کچھ اور کہنے ہی کو تھا
شاعرِ اعظم نے غرّا کر کہا

یوں، تو یہ ہے شاعری کی ابتدا
سُن اے ادیب و غالب کے چچا
اس قدر جب تجھ میں جوہر ہیں عیاں
کس لئے جھک مارنے آیا یہاں
باندھ کر میری ثنا خوانی کے پل
اب میں سمجھا رہا تھا، مجھ کو چل
آیا تھا یاں اصلاح پانے کے لئے
یا مجھے اُلّو بنانے کے لئے

بند کر بکواس اپنی راہ لگ
ورنہ کر دوں گا میں سر دھڑ سے الگ
سُن کے ان کے مُنہ سے یہ خونی دہاڑ
میں نے جھٹ پٹ کھولے بیٹھک کے کواڑ
اور بھاگا مثلِ شُترِ بے مہار
پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا ایک بار
آ کے بس اڈّے پہ چکرا کے گرا
عالمِ غشّی میں مجھے کچھ یوں لگا

یوں نہ مدحت سے جو بہکاتا مجھے
کون بھگڑوا چائے پلواتا تجھے

شاعرِ اعظم کا تھا گردن پہ ہات
فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات

حلیم افسر

مہارانی

— ۱ —

او، رانی، مہارانی! اوگرانی!
کیا غضب کی ہے تیری جوانی
او، رانی! مہارانی! اوگرانی!
او، رانی! مہارانی! اوگرانی!

— ۲ —

تیری رفتار سے برق شرما گئی
تیری قاتل ادا تیر برسا گئی
دیکھ اچھی نہیں یہ مَن مانی!
او، رانی! مہارانی! اوگرانی!

— ۳ —

دل بھی زخمی ہیں پاکٹ بھی گھائل یہاں
ہو گئے اب تو نگر بھی سائل یہاں
روک دے رقص او میری رانی
او، رانی! مہارانی! او، گرانی!

— ۴ —

ذکر تیرا رہا ہم جہاں بھی گئے
تیرے افسانوں میں سب ہی گم ہو گئے
ہر زباں پر ہے تیری کہانی
او، رانی! مہارانی! او، گرانی!

— ۵ —

تجھ کو تابُو میں کیسے کریں ہم یہاں
سوچتے ہیں جشن کریں ہم یہاں
بن گئی ہے تُو دشمنِ جانی
او، رانی!
مہارانی!
او، گرانی!

ادیبوں کی دنیا کے غیر مرقوم، غیر منظورہ، لیکن مروجہ نصاب کا گائیڈ

از: بھارت چند کھنہ

ناک والی

[جو پرانی فلموں کی ہنٹر والی سے کسی طرح کم نہیں]

دیکھا کس شانِ خداوندی سے، اِٹھلاتی، اکڑتی مغرور مورنی کی طرح چلی آرہی ہے۔ جیسے اس کے گل پر نعل میں برسوں سے لوبریکیشن نہ ہوا ہو۔ ناک اس طرح چڑھا رکھی ہے جیسے وہ ہی ساری کائنات کی ناک ہو۔ جب سے اس نے معمولی سی شہرت پائی ہے۔ ہر دم ناک پہ دیا جلائے رکھتی ہے۔ گردن اس طرح اکڑائی ہے جیسے اس میں بل پڑ گیا ہو۔ ہر بات ناک پہ انگلی رکھ کر ناک کے پھیرسے کرتی ہے۔ دُنیا جائے بھاڑ میں، اس کی بلا سے۔ وہ اپنے ہی بکھیڑوں میں بندھی، بنی ٹھنی اور تنی اپنی ہی ناک چوٹی میں گرفتار رہتی ہے۔

جی ہاں! یہ وہی ہے جو خصلتاً ناک پر کی مکھی نہ اُڑا سکتی تھی۔ اس کی ناک ذرا اونچی کیا ہوئی، ناک بھوئیں چڑھ گئیں اور اب تو ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ ناک سکوڑے، اینٹھتی، بل کھاتی، ناک پر غصّہ لیے رہتی ہے۔ بات بات پر ناک چڑھاتی اور ناک چیر کاتی ہے۔

اس کوشش میں کہ اس کی ناک اونچی ہو جائے، اس نے اونچ نیچ کا فرق مٹا دیا اور ناک گھسنے اور ناک رگڑنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ جس نے ناک کاٹ لی ایسی ایسی نے دیکھ چھوڑی ہو، اس کے بعد باقی کیا رہا؟ ناک کٹی مبارک [illegible] لیے سے ماتھے کی جستجو میں ناک سے لکیریں کھینچیں اور ناکوں چنے چبانے پڑ گئے۔ جب منزل مقصود تک [illegible] رسائی نہ پائی تو ناک کی سیدھ چلکر اس کی ناک کے بال کے قدموں پر ناک رکھ دی اور اسے رام کیا۔ مگر جب بال جھکڑوں میں پھنس گیا تو اس کی ناک میں تیر دیدیا۔ پھر وہ ایسی بری کہ اس دیجانے کی ناک میں دم اور دم میں ناک کر دیا۔ مگر ناک والی ہوتی تو اس [illegible] ناک کٹوانے کو [illegible] بے غیرت کہنے [illegible] مگر کچھ فرق نہیں پڑا۔ جس نے اوڑھ لی [illegible] اسے کیا کرے کا کوئی۔

ناک والی ناک بڑی نعمت ہے۔ اس لئے یہ کبھی نہ بھولنا کہ ناک اونچی کرنے کے لئے کبھی ناک نہیں کٹوانی چاہیے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ اس دو روزہ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ حیات فانی اور انسان بُلبلا پانی ہے۔ کون جانتا ہے کہ کب کس کی ناک کا بانسہ پھر جائے!

چند لا فانی سوالات :

۱۔۔۔ اِس مضمون کی تردید میں ایک طویل مضمون لکھو اور اس کے مصنف کو گالیاں دو۔ گالیوں کے انتخاب میں تہذیب اور اخلاق کو بالائے طاق رکھو مثلاً۔ کمینہ۔ رذیل۔ تخم فلفل۔ جاہل مطلق۔ احمق اعظم۔ نمز خراں۔ چغد وغیرہ

۲۔۔۔ ناک پر دیا ہی کیوں جلایا جائے۔ جیب میں بیٹری رکھ کر زیرو نمبر کا بلب کیوں نہیں؟ اور پھر ناک پہ دیا کیسے ٹک سکتا ہے۔ محاورہ گھڑنے والے کی جہالت اور بے وقوفی ظاہر کرو۔ اور دلائل اس کی ناک پر رکھدو۔

۳۔۔۔ مندرجہ بالا سبق میں ناکوں ناک بھر جانا کا محاورہ استعمال نہیں کیا گیا اس کی وجہ بتلاؤ؟ اگر کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئے تو مصنف کو نااہل، اَن پڑھ اور جاہل کہو اور اس کی اچھی طرح مٹی پلید کرو [ایسا موقعہ پھر نہیں آئے گا]

۴۔۔۔ موم کی ناک اور تھالی کے بینگن میں کیا فرق ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔

۵۔۔۔ قوم کی ناک کب کٹتی ہے؟ یہ قوم کے نیتاؤں کے جاہلانہ بلکہ بعض اوقات طفلانہ بیانات، جن سے جگ ہنسائی ہو، کبھی نہیں کٹتی۔ یہ صرف اس وقت کٹتی ہے جب مُلک کی نمایت کمزور اور فرتوت ہاکی ٹیم کسی اور مُلک کے اعلیٰ اور بہتر کھلاڑیوں سے مسلسل شکست فاش کھاتی ہے۔

۶۔۔۔ اگر تمہاری ناک اونچی ہو جائے تو اس کے کیا فائدے ہو سکتے ہیں؟ ایک فائدہ تو ظاہر ہے۔ اونچی ناک پر عینک ٹھیک بیٹھے گی اور صف مژگاں سے بچی رہے گی۔

۷۔۔۔ چھوٹی، بڑی، چڑھی، گھڑی، بیٹھی، موٹی، چپٹی اور کٹی ناک کی تصویریں سلیٹ پر بناؤ۔ غلط لکیریں مٹانے کے لئے تھوک کا استعمال منع ہے۔ البتہ اگر آپ معتدی کرتے ہوئے پان کھا رہے ہوں تو گھر سے باہر جاکر دیواروں پر بڑے شوق سے پان کی پیک مار سکتے ہیں۔ اگر کسی اور کے گھر بیٹھے ہیں تو پان کی پیک اس گھر کے واش بیسن میں بھی مارنے کی اجازت ہے، بلکہ پان کا بے مزہ حصّہ بھی واش بیسن میں تھوکا دیا جا سکتا ہے تاکہ بیسن کی نکاسی کی نالی بند ہو جائے اور میزبان آپکے جانے کے بعد سر پیٹتا رہ جائے۔ اس سے ثابت ہو جائے گا کہ آپ مہذب ہیں اور پان کھانے، چبانے اور تھوکنے کے آداب سے کما حقہ، واقف ہیں!

۸۔۔۔ ناک گھسنے کے کیا فائدے ہیں؟ ایک فائدہ یہ ہے کہ فرش کی وہ جگہ جہاں ناک گھسی جائے صاف ہو جاتی ہے۔

۲۲

○

ظفر چکدیوی

صدر صاحب

نام تو اُن کا کچھ اور ہے مگر جب سے وہ ہمارے اسکول کی نائب صدارت کی کرسی سے اُچک کر خالص صدارت کی بلند تر کرسی پر جا دھمکے ہیں ان کا یہ نیا نام ہی ان کی شخصیت کے ساتھ چپک کر رہ گیا ہے۔ ویسے تو اُن کو صرف صدر بھی کہا جا سکتا ہے لیکن ان کے تن و توش کی صحیح عکاسی صرف ایک لفظ سے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تعظیماً ہی نہیں بلکہ ضرورتاً بھی "صاحب" کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ پھلوں کا کم از کم اٹھارہ گھنٹے کا کاروبار اور استعمال کرنے کی وجہ سے جتنے زیادہ تندرست ہیں، اتنا ہی تندرست ان کا لباس بھی ہوتا ہے۔ وہ عام طور سے کرتا اور پاجامہ زیب تن کرتے ہیں جن کا پھیلاؤ اتنا کافی ہوتا ہے کہ کوئی دُبلا پتلا آدمی چاہے تو بچے ہوئے حصے میں بلا تکلف داخل ہو سکتا ہے۔

مذہبی اعتبار سے وہ مسلمان ہیں اور کٹر قسم کے مسلمان کیونکہ نماز وہ بھلے نہ پڑھتے ہوں مگر لمبی لمبی دعائیں مانگتے ہوئے اکثر دیکھے جاتے ہیں اور نماز بذاتِ خود دُعا ہی تو ہے۔ اتنا ہی نہیں کسی پیر کے باضابطہ مرید بھی ہیں اور ان کی ہدایت پر جھاڑ پھونک بھی کرتے ہیں اور تعویذ بھی دیتے ہیں جن کا عملی اشتہار ان کے گلے اور بازوؤں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے گھر میں جب کبھی کوئی تقریب ہوتی ہے یا کوئی مشکل پیش آتی ہے پیر صاحب بہ نفسِ نفیس تشریف لے آتے ہیں اور چند دن قیام فرما کر اور خاطر خواہ مشکل کشائی کر کے ہی واپس ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت انہیں معرفت کے کچھ ایسے اسرار و رموز حاصل ہو گئے ہیں کہ ان کو رسمی عبادات کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ شاید یہ پیر صاحب کی ہدایت ہی کا اثر تھا کہ انھوں نے اپنے والد صاحب کی برسی بڑی دھوم دھام سے منائی بلکہ باضابطہ عرس کر دیا۔ چونکہ لوگوں کو پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ مرحوم صرف مرحوم ہی نہیں بلکہ مغفور اور [illegible] ٹھہرے بھی تھے، لوگ محفلِ سماع میں جوق در جوق پہونچے تھے اور بریانی پلاؤ کھا کھا کر چائے پیتے اور قوالیاں سنتے رہے تھے اسی مجلس میں مجھ پر صحیح معنوں میں شاعر اور گوئیے کا فرق واضح ہوا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ کچھ تو ان سے دیرینہ تعلقات اور کچھ اپنی خاکسارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ان کی مبالغہ آمیز ستائش سے مجبور ہو کر میں نے ان کے والد صاحب کا قطعۂ تاریخ کہہ دیا تھا جو ان کی فرمائش اور منشا کے عین مطابق تھا۔ اور جب قوال نے اس قطعۂ تاریخ کو لہک لہک کر گایا تو اُسے چند منٹوں کے

اندر ہی پچاس روپے کے قریب چھوٹ یا بخشش کے طور پر مل گئے اور میں احمقوں کی طرح منہ دیکھتا اور سوچتا رہ گیا کہ کاش میں نے شاعری کے بجائے قوالی سیکھی ہوتی لیکن شکر ہے کہ تین سال بعد عرس کا یہ جھگڑا انہیں چند ذاتی اسباب کی بنا پر بند کرنا پڑا اور میں مسلسل جلتے اور کڑھتے رہنے سے محفوظ رہ گیا

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس قدر کٹر خالصتاً ہی مسلمان ہونے کے باوجود وہ سیاسی طور پر مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرگرم رکن ہیں اور شاید انھیں گرفتاری سے بچنے کے لئے کئی بار انڈر گراونڈ ہو جانا پڑا تھا۔ "شاید" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں اس کا ثبوت نہیں ملا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ بات خود بتائی ہے اور جب خود بتائی ہے تو ثبوت کی چنداں ضرورت نہیں۔

صدر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کوئی بھی ملنے والا ان سے پہلی ہی ملاقات میں بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے۔ بھاری بھرکم جسم کے ساتھ تیز و طرار آواز لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہاتھوں، گردن اور آنکھوں کو بھی اس طرح متحرک رکھتی ہے کہ سامنے کے آدمی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ انھیں دیکھتا رہے اور جہاں تک بس چلے سنتا چلا جائے کیونکہ صدر صاحب نجی محفلوں میں بھی صدر ہی رہتے ہیں اور ان کی ہر گفتگو خطبۂ صدارت ہوتی ہے۔ طویل، لچھے دار، گرم، جوشیلی اور کڑکتی ہوئی۔ ان کے کسی جملے میں فل اسٹاپ کیا کوما تک نہیں ہوتا۔ اور اگر سامع خود بھی کچھ کہنا چاہتا ہو تو اسے دوسری، تیسری یا چوتھی نشست کا انتظار کرنا ہوگا پھر ایک لفظ کا بھی موقع ملنے پر اُسے ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہنی پڑیں گی۔ تاہم اس احتیاط کے باوجود اگر اس دوران وہ خود بھی شروع ہو جائیں تو پروا نہ کی جائے اور ساری باتیں کہہ چکنے کے بعد ہی رکا جائے۔ ورنہ ممکن ہے ساری عمر انتظار ہی میں گزار دینی پڑے ـــــ دو گاڑیوں کو بیک وقت دو پٹریوں پر دوڑتے ہوئے آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ لیکن صدر صاحب کی گفتگو کی ٹرین ہمیشہ ایک ہی پٹری پر کبھی نہیں دوڑتی ہے بلکہ بار بار پٹریاں بدلتی رہتی ہے بلکہ دوسری ٹرین کو چلتے دیکھ کر وہ اکثر چلتے چلتے رک جاتی ہے پھر رک رک کر چل پڑتی ہے۔ کبھی سامنے کی لائن چھوڑ کر پیچھے کی طرف بھی دوڑ جاتی ہے جتنے انہماک سے آپ ان کی باتیں سن رہے ہوں گے جواب میں آپ بھی اتنے ہی انہماک کی توقع رکھتے ہوں تو یہ آپ کی سادگی ہوگی مثلاً اگر طلبا میں پھیلی ہوئی عام بے چینی کو روکنے کی تدابیر پر بحث ہو رہی ہوگی تو وہ اچانک قہقہہ لگانے لگیں گے کیونکہ ٹھیک اسی وقت انہیں اپنے کسی سالے کی بات یاد آجائے گی جسے وہ فوری طور پر سنانا ضروری سمجھیں گے یا دفعتاً ان کی نگاہ لیموں کے پیڑ کی طرف اٹھ جائے گی اور وہ فوراً پوچھ بیٹھیں گے کہ اس بار اس میں اتنے مختصر پھل کیوں لگے ہیں۔

جس طرح ہر شاعر اپنے آخری شعر میں اپنا تخلص ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے اسی طرح صدر صاحب بھی اپنی ہر گفتگو میں بطور تخلص اپنے صدر ہونے کا اعلان ضرور کریں گے، خواہ یہ اعلان آپ کے لئے کتنا ہی غیر ضروری کیوں نہ ہو گیا ہو۔

چونکہ وہ ایک ہائی اسکول کے صدر ہیں جہاں انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے اس لئے وہ اُردو کے صدر کے بجائے انگریزی کا پریسیڈنٹ کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر انگریزی جملے یا انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کر بیٹھتے ہیں اور چونکہ یہ انگریزی وہ اُردو میں بولتے ہیں اس لئے ہمیں بڑی الجھن سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر مشکل الفاظ چونکہ SPELLING ہمیں آتے نہیں اس لئے ان کا معنیٰ و مفہوم تو درکنار خود وہ الفاظ بھی ڈکشنری میں تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل پاتے۔ انھیں موجودہ زمانے کا اگر حاتم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، بلکہ میں تو انھیں حاتم سے زیادہ سخی سمجھتا ہوں کیونکہ حاتم

ے جس دنیا نے میں اپنی سخاوت کا جھنڈا گاڑا تھا وہ بے پناہ ارزانی کا دور تھا لیکن ہمارے ممدوح صاحب جب تفریحی
ے موڈ میں آجاتے ہیں تو پچاس ساٹھ روپے کی رقم جھٹ چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔ وہ جب بھی شہر سے چھٹیاں منا کر اپنی
دنس کر کے گھر آتے ہوئے ریلوے اسٹیشن سے بس اسٹینڈ کا رخ کرتے ہیں اور کوئی ٹیکسی والا ان کی توند کی طرح ابھرے
ہوئے پرس اور پھولی ہوئی جیب کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انہیں سلام کرتا ہے تو وہ بڑے شاہانہ انداز سے
ہدی ٹیکسی ریزرو کر لیتے ہیں کیونکہ گھر تو بس کے ذریعہ ساڑھے تین روپے میں بھی پہنچا جا سکتا ہے لیکن سخاوت کا پرچم پچاس روپے
خرچ کئے بغیر بلند نہیں کیا جا سکتا لیکن جیسا کہ آپ نے وہ مثل سنی ہوگی "بن مانگے موتی ملے، مانگے ملے نہ بھیک" وہ اپنی فیاضانہ
روش کے باوجود قرض دینے کے معاملے میں بہت سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ قرض محبت کی قینچی ہے اس لئے
نہیں چاہتے کہ قرض دے کر آپسی تعلقات میں بگاڑ کا باعث بنیں اور اگر کبھی بھولے سے اس حرکت کے مرتکب ہو بھی گئے تو
اور سمجھئے وہ رات ہوتے ہی پچھتانے اور رقم کی بازیابی کے لئے طرح طرح کے حیلے حوالے سوچنے لگ جائیں گے پھر مقررہ میعاد
سے دنوں یا ہفتوں پہلے ان کا تقاضہ شروع ہو جائے گا اور اگر آپ نے خاطر خواہ دھیان نہیں دیا تو ایک کونے سے دوسرے
کونے تک آپ کی نا دہندگی، بدنیتی اور احسان فراموشی کی ایسی ایسی داستانیں جنم لینے لگیں گی اور اتنے سارے گڑے مردے
اکھیڑ کر آپ کے آگے ڈھیر کر دیئے جائیں گے کہ ان کی بدبو سے آپ کا دماغ پھٹنے لگے گا اور آپ گھبرا کر بیوی کے زیورات
گروی رکھ کر بھی ساری رقم ادا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اپنے اثاث البیت میں طرح طرح کی چیزیں جمع کرنا اور انھیں ہر کس و ناکس کو بار بار دکھلانا ان کا محبوب مشغلہ ہے
شیر کی کھال، برتنوں کے سیٹ، قالین، فوٹو کیمرہ، مختلف قسم کے البم، ٹیپ ریکارڈر اور بندوق۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں دیکھ
کر آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اور اگر اس وقت نہ بھی کھلیں تو قیمت سن کر ضرور کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ کیونکہ کوئی بھی
چیز ایک ہزار روپے سے کم مالیت کی نہیں ہوگی۔

حسینوں سے زیادہ انھیں بیماروں اور زخمیوں کا فوٹو لینا بہت پسند ہے اور جب وہ ان کا فوٹو لیتے ہیں تو ایسا لگتا
ہے جیسے ان کا فوٹو نہیں بلکہ ایکس رے (X-RAY) لے رہے ہیں۔ قمیص اور بنیان تک اتروا لیں گے اور بس چلے تو پاجامہ
اور پتلون بھی۔ کیونکہ انھیں ایک ایک زخم کی ایک ایک چوٹ کی تصویر لینی ہوتی ہے
لیکن اگر آپ ان تصویروں کی کاپی چاہیں گے تو مایوسی ہوگی کیونکہ وہ تصویریں لیتے ضرور ہیں لیکن دیتے نہیں ہیں۔ اس لئے
کیمرے کی کارکردگی کے بارے کچھ کہہ نہیں سکتے۔

ان کے مزاج میں پہلے غصہ بہت تھا اور اسی غصے کے عالم میں ایک دن انھوں نے ایک بندوق بھی خرید لی لیکن حیرت
کی بات یہ ہے کہ بندوق خریدنے کے بعد سے انھیں ایک دن بھی غصہ نہیں آیا۔ اگر آیا بھی ہوگا تو صرف ٹال پر آیا ہوگا۔
اس لئے کہ آج تک کسی پر بندوق چلانے کی نوبت ہی نہیں آئی ہے۔ چور چکاروں نے ان کے گھر کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے
اور دشمنوں میں سے کس کی ہمت ہے کہ انھیں اشتعال دلا کر اپنی شامت کو دعوت دے۔ دو چار بار وہ پرندوں کے
شکار کے لئے نکلے بھی مگر ہر بار گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے باوجود خالی ہاتھ لوٹ آنا پڑا۔ نہ جانے چڑیاں کہاں کی نیت

کمایت نہ کچھ چل جاتا تھا کہ جیسے ہی انھوں نے نشست باندھی اور جھٹ اڑ کر یہ جا وہ جا ہو گئیں اور ان کے مداحین کی یہ حسرت آج تک پوری نہ ہو سکی کہ ان کی نشانہ بازی کا کمال دیکھ سکیں۔

انھیں لباس کی طرح پرانے دوست بدلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مسلسل تجربات کی بنیاد پر کوئی بھی دوست ان کے معیار پہ برقرار نہیں رہ پاتا یا ان کی تلون مزاجی کے باعث خود دوست ہی ان سے علیحدگی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے کہ جب ان سے کوئی سنجیدہ بات کیجیے تو وہ مذاق و ظرافت بلکہ ابتذال و رکاکت پہ اتر آتے ہیں اور اگر مذاق کی بات ہو رہی ہو تو سقراط و افلاطون کی روح ان میں حلول کر جاتی ہے اور ڈانٹنے پھٹکارنے پر بھی کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ خیریت یہی ہے کہ انھوں نے آج تک بیوی نہیں بدلی ہے۔ میرا مطلب قانونی بیوی کا ہے' ویسے غیر قانونی کی بات میں نہیں کرتا۔

اگر آپ اتفاق سے شاعر ہیں اور صدر صاحب آپ سے قصیدہ یا سہرا لکھنے کی فرمائش کریں تو آپ با معاوضہ یا بلا معاوضہ ضرور لکھ دیجیے کیونکہ وہ بڑے اچھے قدردان ثابت ہوں گے۔ وہ اُسے یا تو بڑی نفاست کے ساتھ چھپوا کر اہلِ محفل کے درمیان تقسیم کروائیں گے اور اچھے معاوضے دے کر کسی ریڈیو آرٹسٹ سے پڑھوائیں گے یا کسی خوشنویس سے بہترین کاغذ پر کتابت کروا کر اور خوبصورت فریم میں جڑوا کر کسی نمایاں جگہ پہ آویزاں کرائیں گے لیکن تب یہ دیکھ کر شاید آپ کو مایوسی ہوگی کہ ایک تخلص کے سوا آپ کا کہیں نام بھی نہ ہوگا۔ اس کے برعکس صاحب فرمائش کا نام ولدیت، خطابات اور پتہ سمیت اوپر نیچے ہر جگہ مندرج ہوگا۔ اس لئے اس مایوسی سے بچنے کے لئے ہر شعر بلکہ ہر مصرع میں اپنا نام، استعداد، ولدیت اور پتہ تک اس طرح شامل کر دیجیے کہ کوئی جگہ بھی حذف کرتے نہ بنے۔

بہر حال یہ ہے ہمارے صدر صاحب کا ایک مختصر سا خاکہ' اور ہماری دعا ہے کہ جب تک ہمارا اسکول قائم ہے اس کی اینٹ اینٹ پہ اور ہم سب کے دلوں پہ اُن کے لیٹر پیڈ کی طرح ان کا نام نامی تمام اوصاف و القاب کے ساتھ ہمیشہ مرتسم رہے۔ آمین!

●●

پاگل عادل آبادی

ایسا بھی ہوگا ہم نے نہ سوچا تھا خواب میں
ٹھنڈے وہ لیکے آئیں گے خط کے جواب میں

جو لوگ آفتاب تھے عہدِ شباب میں
بوڑھے ہوئے تو بن گئے ٹھنڈی کباب میں

خادم میں کیا ہوا ہوں برادر کا آپ کے
بیٹھے بٹھائے جان پھنسی ہے عذاب میں

ہو جائے سستیاناس غمِ روزگار کا
بوڑھا دکھائی دیتا ہوں عہدِ شباب میں

گن گن کے ہجرِ یار میں تارے تمام رات
ماہر میں ہوگیا ہوں حساب و کتاب میں

بیٹی جوان جاتی ہے بے پردہ سینما
اماں ہے ساٹھ سال کی پر ہے نقاب میں

عاشق مزاج طلبہ کا ہے یہ مطالبہ
مضمون عاشقی بھی ہو شاملِ نصاب میں

تعبیر پوچھیں آئیے پاگل سے آپ کی
شیطان میں نے رات کو دیکھا ہے خواب میں

غزلیات

ادریس بابکے

عجب اُلٹی تمہاری کھوپڑی معلوم ہوتی ہے
کہ بلڈنگ میری تم کو جھونپڑی معلوم ہوتی ہے

نگر میں سے کوئی مطلب نہ جاڑے سے غرض ان کو
جنہیں ہر وقت ساون کی جھڑی معلوم ہوتی ہے

مریضِ عشق کا ہر جوڑ گن سکتے ہو اُنگلی سے
کہ ہر رگ اُس کی اُبھری اودھڑی معلوم ہوتی ہے

سُنا ہے والدِ ماجد بھی اُن کے ساتھ آئیں گے
شبِ وعدہ قیامت کی گھڑی معلوم ہوتی ہے

مجھے اُلّو سمجھ کر تو جوتے دیتا ہے اے ساقی
کہیں بکے ہو نہ جائے یہ سسڑی معلوم ہوتی ہے

نہیں ہے تاڑ سے کچھ کم تمہارے قد کی لمبائی
مگر چوٹی تو اس سے بھی بڑی معلوم ہوتی ہے

حسینوں مہ جبینوں نے پٹک کر مار ڈالا ہے
کسی دل پھینک کی میت پڑی معلوم ہوتی ہے

پرانی یاد کا چیتا آ گیا ہوں بابکے
مجھے شمشان کی لاش بے کفن پڑی معلوم ہوتی ہے

ظہیر ابنِ قدسی

دلہن کی رخصتی

بیسویں صدی میں

سہیلیاں :

ہمارے ساتھ گزرا تیرا بچپن کر کے سب کو تنگ
کچھ ایسی آئی رخصت کی گھڑی کہ ہو گئے ہیں دنگ
ہماری آنکھ پُرنم ہے یہی اب سوچ کر پیاری
کوئی تیار ہی ہوتا نہیں جانے کو تیرے سنگ
اری سلمہ! ذرا جلدی وداعی گیت کوئی گا
کسی بھی فلم کا، 'بابل'، 'گھرانہ' یا کہ 'دو بیگھا'
ارے وہ رخصتی کا فریم اب سے پھینک بھی جلدی
نصیحت اور رونے کے سوا ہے اِس میں کیا لکھا
مری بنّو! بڑا قسمت سے تجھ کو ایک اچھا گھر
ہے تیری زندگی میں آگیا ہے آج اِک جوکر
نگوں سے زندگی گزرے تری اس کیلئے ہر دم
تو شوہر کو سمجھنا زندگی کا کارِ ساز شوفر!
تجھے آج الوداع کرتے ہیں یہ دے کر دعا پیاری
بڑھائے نہ خدا ہر سال تیرے گھر کی آبادی
اضافہ گر ہو آبادی میں تیرے گھر پہ سالانہ
تو شوہر کو خدا دے عقل کہ کروائے نسبندی

بھائی : مری بہنا! کبھی سسرال والوں سے جو کچھ اَن بَن
کوئی تکلیف ہو رہنے میں یا آئے کوئی اڑچن
مجھے آواز دے دینا کہ پیکے چھٹا غنڈہ میں جب بھی
مدد کو تیری فوراً آؤں گا میں بن کے شترو گھن

ماں :

مری بیٹی نصیحت یہ مری اِک غور سے سُننا
جہیز ہم دے رہے ہیں جو تو اس سے کام یہ لینا
جتا کر وات دن احسان دولت اور امارت کا
دبا کر اپنے شوہر کو بری ہی طرح تو رکھنا
تجھے سسرال میں اب زندگی بھر جا کے رہنا ہے
مصیبت، رنج، کلفت، ظلم کو ہنس ہنس کے سہنا ہے
خسر اور ساس سے ہر بات پر لڑنا کہ بیٹی اب
"یہی عورت کا زیور ہے، یہی عورت کا گہنا ہے"

باپ :

مری نورِ نظر، دل کا سکوں، اے پیاری رُخسانا
نصیحت یہ مری اپنی گرہ میں باندھ لیجانا
خسر کی اور میری ناک ہے احباب میں اونچی
نہ ان کی ناک کٹوانا، نہ میری ناک کٹوانا!

میر جمال۔
شاہی۔ حیدرآباد

نوکری، شادی اور مکان

اچھی زندگی گزارنے کے لئے روٹی، کپڑا اور مکان، تینوں چیزوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے پیٹ بھرنے کے لئے تو مجھے روز آنہ صبح صبح گرم گرم روٹی کے ساتھ ایک عدد مرغی کا انڈا بھی مل جایا کرتا تھا اور پہننے کے لئے اعلیٰ قسم کے نفیس کپڑے۔ اس طرح روٹی اور کپڑے کی فکر سے میں آزاد تھا۔ لیکن ہمارے پاس کمی تھی تو ایک مکان کی۔ مکان میں رہ کر بھی ایک مکان کی تلاش میں تھے اور بڑی تیزی کے ساتھ مکان کی تلاش جاری تھی آخر ایک دن ہمارے ایک دوست نے یہ مشورہ دیا کہ جناب جتنے دن سے آپ یہاں مکان تلاش کر رہے ہیں اتنے ہی دن اگر باہر جا کر کما لیتے اور کرایہ کے مکان کی تلاش کے بجائے ایک ذاتی مکان خرید نے کے موقف میں ہوتے۔

بڑی کار آمد تجویز تھی ہمارے ذہن پر اس کی بات سے ... حقیقت تھی کہ ہم تین چار سال سے ایک اچھے مکان کی تلاش میں تھے کیوں کہ ہمارے ابا جان کا ارشاد تھا کہ اچھے محلے میں اچھا مکان ملے تو اسے کرایہ پر حاصل کر لیا جائے گا۔ مگر واقعات کچھ اس طرح کے پیش آئے کہ کبھی محلہ اچھا تو مکان کی صورت اچھی ہوتی تو مکان کی شکل بگڑی ہوتی اور کبھی مکان اچھی شکل کا ہوتا تو مالک مکان کی شکل بگڑی ہوتی اور پھر اس پر مکان کے مالکوں کا یہ حال تھا کہ وہ کسی شریف آدمی پر بھروسہ کر سکتے ہی نہ تھے جب کبھی ہم ان کے پاس مکان حاصل کرنے کی غرض سے پہنچتے تو وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتے "یہ بیچارے کیا خاک کرایہ دیں گے ان کی شکل دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے یہ مہینے میں پندرہ دن کھاتے ہوں گے اور پندرہ دن بھوکے رہتے ہوں گے۔" پھر وہ اپنے مکان پر ایک اعلان لگوا کر اور کرایہ دار پر یوں ہی ایک نظر پھینک کر مخاطب ہوتے "ہاں جناب! ماہانہ دو سو پچاس روپے کرایہ دے سکتے ہیں آپ۔" اور جب کرایہ کی بات

طے ہو جاتی تو کرایہ دار کی خاندانی شرافت کو جانچنے کے لئے مختلف قسم کے سوالات کرتے اور خاندانی شرافت کی لب سٹر چیڑ پھاڑ کرتے " تو ہاں جناب آپ کے دادا جان فوج میں ملازم تھے " ہم اذنا عرض کرتے " جی ہاں فوج میں ملازم تھے۔ ملازمت ختم ہونے پر انھیں وظیفہ ہوا اور آٹھ دس برس تک وظیفہ کھاتے رہے اور پھر انتقال فرما گئے :

" کس قبرستان میں تدفین ہوئی تھی ان کی — ؟:

" شاہ صاحب کے دائرہ میں :

" اچھا تو پھر ٹھیک ہے ہمارے دادا بھی وہیں لیٹے ہوئے ہیں آپ کے دادا بھی جا کر انہیں کے پاس کرایہ سے ٹھہرے ہونگے :

اس طرح مالک مکان نے مرحومین کو اپنے مرحوموں کے کرایہ دار بتلا کر یہ ثابت کر دیا کہ ہمارے آباو اجداد ان پشتوں سے نہ صرف زندگی میں ان کے کرایہ دار رہ چکے ہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی انہیں کی قبروں میں کرایہ سے ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جب بے چارہ.. کرایہ دار مالک مکان کے سامنے نفسیاتی طور پر دب سا جاتا ہے تو اسے اور مرعوب کرنے کے لئے بڑے عجیب عجیب غرض سوالات کئے جاتے ہیں۔ مثلاً کل کتنے افراد خاندان ہیں۔ آپ کے کتنے بڑے ہیں، کتنے بچے ہیں ؟ کتنے پڑھے لکھے ہیں۔ کتنے جاہل ہیں۔ کیا سب کی شادی ہو گئی ؟ اگر کوئی غیر شادی شدہ ہو تو شادی کے وقت مالک مکان سے تحریری.. اجازت لینا ضروری ہے ورنہ عین وقت پر رکوا دی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مالک مکان کے سوالات پر ہم نے اعتراض کیا کہ کیوں صاحب آپ کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ تو ہمیں مثالیں دے کر کہا گیا کہ پچھلے جو کرایہ دار یہاں رہے ان کے ہاں روزانہ کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوا کرتا تھا۔

کبھی کوئی خالہ آکر کہتیں۔ یاد رکھو مجھلے میاں تم نے اپنے لڑکے کی شادی خاندان سے باہر کر کے ہمارے خاندان کی ناک کٹوا دی مرنے کے بعد میدان حشر میں تمہارا دامن پکڑ کر میں تم سے ضرور جواب طلب کروں گی۔ کبھی کسی چچا سے جائداد کی تقسیم کے جھگڑے ہو رہے تھے کبھی پرانی خاندانی لڑائیوں کی یاد تازہ کی جاتی خصوصاً جب عورتوں کے درمیان زور زور سے گالیوں کا تبادلہ ہونے لگتا تو مکان کے باہر کچھ راہگیر اس طرح جمع ہو جاتے جیسے ریڈیو پر ہنگامی حالات کی خبریں سن رہے ہوں۔ بس ان ہی باتوں کی وجہ سے میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے خاندانی حالات کیسے ہیں اور جب ہم نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ ہمارا خاندان اور ہماری زندگی بالکل ہی مختصر ہے تو پھر سوالات کی بوچھاڑ کچھ یوں شروع ہوئی۔ آپ کے والد کیا کرتے ہیں ؟ آپ کو نیند میں چلنے کا تو مرض نہیں ؟ آپ کس محکمہ میں ملازم ہیں ؟

ہم نے عرض کیا۔ جی میں پولیس کے محکمہ میں ملازم ہوں "

" کیا کہا۔ پولیس کے محکمہ میں۔ نہیں صاحب نہیں معاف کیجئے میں آپ کو یہ مکان نہیں دے سکتا۔ میں معافی چاہتا ہوں آپ سے :

اب ہم نے مالک مکان کو لاکھ سمجھایا۔ ان کے ہاتھ جوڑے کہ محکمے سے کرایہ کا کیا تعلق ؟ وہ بولے نہیں صاحب میں پولیس والوں کو مکان دیتا ہی نہیں حالانکہ میرے ایک رشتہ دار خود پولیس کے محکمہ میں ملازم ہیں

ہم اس مالک مکان سے مایوس ہو کر شہر کے دوسرے ایک سنسان علاقے میں جا پہنچے اور مستقل کرایہ

د نہ ہے سو نہ تے آنکھیں بند کر لیں تو میرے کانوں میں
آئی۔

زندگی گذر رہی ہے فٹ پاتھ پر سو سو کے
بڑی مشکل سے ملتا ہے محلے میں مکان اچھا

ہم نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی بھی آدمی۔
نظر نہیں آیا جو مجھ سے مخاطب تھا۔ مجھے محسوس ہوا یہ
اپنی ہی آواز تھی۔ میری ہی آواز خود مجھ سے مخاطب
تھی۔ بات بالکل صحیح تھی بڑی مشکل سے تلاش کرنے پر
اچھا سا مکان مل جاتا ہے۔ لیکن ابا جان کا حکم تھا کہ محلہ
ہو اور مکان بھی اچھا ہو۔ اڑوس پڑوس میں اچھے افراد
تے ہوں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ نہ ہو۔ کوؤں کی کائیں کائیں
۔ یہ بات سمجھنے کے قابل تھی کہ شہر میں کوئی بھی
ن ایسا نہیں ہوگا جس میں چڑیاں نہ چہچہاتی ہوں گی کوّے
ائیں کائیں کرتے نہ ہوں گے مگر ابا جان کا حکم بجا لانا
فرض تھا اس لئے مکان کی تلاش میں نہ خود معروف تھا
جو دوست احباب بے روزگار تھے انہیں پچیس روپے
کا لالچ دے کر شہر کے نئے نئے محلوں سے واقفیت
حاصل کر رہا تھا۔

اور خود میرا یہ عالم تھا کہ لوگ مجھے کوئی پرانا عاشق
زار داستانی سمجھ رہے تھے۔ مجھے تلاش تھی مکان کی، پر لوگوں
گمان تھا کہ میں اپنی کھوئی ہوئی محبوبہ کی تلاش میں مارا مارا
پھر رہا ہوں۔ میرے بکھرے ہوئے بال دیکھ کر کہنے لگے
لڑکا تو گیا ہاتھ سے .... لیکن میں تو کسی کے ہاتھ
نہ تھا تو ہاتھ سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور
میرا خود اپنے بارے میں یہ خیال تھا کہ میں عشق کرنے
قابل ہی نہیں ہوں اس لئے بجائے لڑکیوں کی خوبصورتی
[illegible] کو [illegible] مکانوں کے خوبصورت دروازوں

پر نظر رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک مکان کے دروازے پر نظر
پڑی جس پر لکھا تھا: "یہ مکان کرایہ پر دیا جاتا ہے"
میں نے مالک مکان سے ربط پیدا کیا اور تفصیلات
دریافت کیں۔ "کیا یہ مکان خالی ہے؟" بات مالک
مکان نے کہا "جی ہاں خالی ہے اور کرایہ پر دیا جانے
والا ہے۔ مکان بہت اچھا ہے دو کمرے ہیں ایک
دیوان خانہ ہے ایک دالان ہے ایک بڑا سا ہال
ہے صحن ہے صحن میں آم جام جامن کے درخت لگے
ہوئے ہیں۔ باورچی خانہ، حمام، نل لائٹ، ڈرینج وغیرہ
سب ہی چیزیں موجود ہیں۔ مکان کھلا ہوا دار ہے۔
مکان میں جملہ دس دروازے پانچ کھڑکیاں، تین روشن دان
ہیں۔ مکان لب سڑک واقع ہے بازار قریب ہے دواخانہ
نل لائٹ کا دفتر اور پولیس اسٹیشن بھی زیادہ دور نہیں
ہے ہر چیز کی سہولت موجود ہے تمام ضروریات
سے آراستہ و پیراستہ اس مکان کا کرایہ صرف
ڈھائی سو یعنی دو سو پچاس روپیہ ہے" اتنا کہہ کر
مالک مکان نے سانس اندر کھینچی اور میں نے سانس باہر چھوڑ
کر کہا: "دو سو پچاس روپے!" "جی ہاں۔ مکان کا
کرایہ دو سو پچاس روپیہ ہے اور اس کا سب سے بڑا
فائدہ یہ ہے کہ آپ اس مکان میں رہ کر ہر ماہ سو روپے
آسانی سے کما سکتے ہیں۔ مکان کے قریب ہی ایک دکان
ہے "ماڈرن لانڈری ورکس"۔ وہ لوگ پیسے [illegible]
عورتوں سے کام کرواتے ہیں آپ وہاں سے کپڑے لا
کے آپ اور اپنی بیوی صاحبہ [illegible]
کام کرواتے ہیں اس طرح [illegible]
[illegible] آدمی [illegible]

ں نے پھر کہا: "یعنی بیوی کو نوکری کے نام سے واقف ہونا ضروری ہے؟" "ہاں جناب ضروری ہے بلکہ آج کے دور میں ایک شریف شوہر کی شریف بیوی کو نوکری کے اصول سے واقفیت رکھنا لازمی ہے ورنہ زندگی کی گاڑی معاشی مصروفیتوں کا بوجھ لاد کر آگے بڑھ نہیں سکتی:

"اور اگر بیوی نہ ہو تو ——— ؟"

"تو پہلے آمدنی کا ذریعہ تلاش کیجئے تو پہلے شادی کیجئے اور اس کے بعد مکان تلاش کیجئے: مالک مکان کے اس سلسلے کوشش کر میری آنکھوں میں رنگ برنگی ساڑیاں لہرانے لگیں اور میں ساڑیوں پر بنے خوبصورت پھولوں کے تصور میں کھویا ہوا آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"شادی کرنے کے لئے کیا کرنا پڑتا ہے ——— ؟"

"شادی کرنے کے لئے نوکری کرنی پڑتی ہے۔ یعنی پہلے نوکری پھر شادی پھر اس کے بعد مکان" نوکری، شادی اور مکان کے اس مثلث کو اٹھائے ہوئے میں بوجھل قدموں کے ساتھ ایک گلی میں سے گذر رہا تھا کہ ایک صاحب نے میرا راستہ روک دیا۔

"کیوں میاں ——— یہ آپ کی چوتھی چکر ہے اس گلی میں۔ اور آپ اس طرح مکانوں کے دروازوں کو گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔ صورت سے تو شریف معلوم ہوتے ہو۔ آخر کیا چکر ہے ——— !؟"

میں نے کہا جناب میں اس وقت تو ایک بیروزگار آدمی ہوں لیکن مجھے پوسٹ مین کی نوکری ملنے والی ہے۔ اس لئے میں ابھی سے گھوم پھر کر مکانوں کے نمبر ذہن نشین کر رہا ہوں تاکہ نوکری ملنے کے بعد خطوط تقسیم کرنے میں آسانی ہو۔"

دن بھر سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہنے سے میری عادت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ اکثر رات کو سونے کے بعد بھی مجھے پیروں میں گدگدی سی محسوس ہونے لگی تھی اور میں مجبوراً آدھی رات کے وقت گھر سے باہر نکل کر محلے کی سڑک پر چہل قدمی کرنے لگتا تھا۔ میری اس عادت سے آہستہ آہستہ محلہ کے دوسرے افراد بھی واقف ہوتے گئے۔ کسی نے کہا کہ مجھے نیند میں چلنے کی بیماری ہو گئی ہے کسی نے کہا کہ شاید میں کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر نیم پاگل ہو گیا ہوں۔ کچھ دن پہلے تقریباً رات کے ایک بجے میں اپنی عادت کے مطابق ٹہل رہا تھا کہ ایک پڑوسی نے آہستہ سے اپنے مکان کی کھڑکی کھولی اور ہاتھ کے اشارہ سے اپنی طرف بلا کر کہا "صاحب! مجھے تمہاری جوانی پر بڑا ترس آتا ہے۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو۔ راتوں کی نیند بڑی قیمتی شئے ہے اسے اس طرح برباد نہیں کرنا چاہیئے۔ میری نظر میں ایک لڑکی ہے کہو تو رشتہ پکا کر دوں"......

پڑوسی کی اس بات پر مجھے بڑا غصہ آیا مجھے تلاش تھی ایک مکان کی اور یہ مجھے ایک لڑکی کا پتہ دے رہے تھے ان کی بے وقوفی پر مجھے ہنسی آگئی اور میں بے اختیار میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ خوفزدہ ہو کر فوراً انھوں نے کھڑکی بند کر لی اور میں ان کی حرکت پر دیوانوں کی طرح لگاتار قہقہے لگانے لگا۔ قہقہوں کی آواز سن کر کچھ پڑوسیوں کی نیند ہوشیار ہو گئی اور وہ لوگ بھی اپنے مکان کے دروازوں میں سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھنے لگے۔ کچھ لوگوں نے ہمت کر کے گھر سے باہر نکالا اور مجھے زبردستی پکڑ کر ہمارے مکان کے اندر دیا۔ ابا جان کو بلا کر اسی وقت وہ ارشاد فرمائیں کہ حضرت یا تو آپ اپنے لڑکے کی کر دیجئے یا پھر اس محلے سے جلد از جلد مکان منتقل کر دیجئے:

▲ ▲ ▲

جوہر سیوانی

"مولانا آپ جشنِ حماقت منائیے"!

کچھ عقل اپنی آپ بھی بڑھ کر دکھائیے
"مولانا" آپ جشنِ حماقت منائیے
"ایں کار از تو آید و ابلہ چنیں کنند"
اس سے زیادہ شوق نہ اپنا بڑھائیے
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"
غالب کے اِس خیال کو جامہ پہنائیے
بے شک تو آپ ہیں ہی، مگر یہ حجاب کیوں!
ہم محرموں سے چہرہ نہ اپنا چھپائیے
کیوں سوئے جیبِ غیر، حریصانہ ہے نظر
کیوں دوسروں کے اوج پہ آنسو بہائیے
اب چھوڑیئے بھی جشنِ ظرافت کے سوگ کو
بغض و حسد کی آگ میں دل کیوں جلائیے
میدانِ شاعری میں "تقیہ" ہے بے محل
ٹک چھپ کے یوں نہ مرغ کی "پالی" لڑائیے
ہم پر عیاں ہے آپ کی کوتاہ قامتی
غازی میاں کا لاکھ لبادہ چڑھائیے
وہ کاسۂ گدائی وہ "القابِ آپ کا
جو مر چکا ہے اُس کو دوبارہ جِلائیے
اِس بار اس کا نام "حسد پنچ" رکھ کے آپ
چندے کے کاروبار کو پھر سے چلائیے
چار آنہ فی شمارہ کے اوسط حساب سے
اس چیتھڑے کو بیچ کے کچھ کھا کمائیے
آ بیل، مجھ کو مار، سے اب کیجئے حذر
کیوں آپ اپنی خود ہی حماقت بتائیے

موچ آئے گی کلائی میں مولانا آپ کی
جوہر سے بھول کر بھی نہ پنجہ لڑائیے

قطعات

دبلا پتلا سا اکھڑ پن وہی پہلا سا چھچھورا پن!
بڑی بدھو کی بدصورت گئیں تم تو جواں ہو کر
ہمیں سے پوچھتی رہتی ہو سب باتیں محبت کی
تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم دس بچوں کی ماں ہو کر

روز پیتا ہوں کہ پینے میں یہ مال اچھا ہے
"ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے"
قوت پینے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"

○

تنہائی زنداں میں بھی پریشاں نہیں دیکھا
ہنگامِ سرِ دار بھی حیراں نہیں دیکھا
ہر غم یہ نگل لیتا ہے تحفہ سمجھ کر
عاشق کو کبھی غم سے گریزاں نہیں دیکھا

ساغر جکوری

لئیق صلاح
(حیدرآباد)

خان صاحب

خاں صاحب کے حسب نسب کے متعلق صحیح معلومات پیش کرنا "جوئے شیر" لانے سے واقعی کم نہیں۔ اس لئے کہ نام ہی کے متعلق ابھی شبہات باقی ہیں وہ تو اس بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ ہم اگر دریافت کریں کہ خاں صاحب تمہارا نام پہلے فلاں تھا اور اب تم نے بدل کر یہ نام رکھ لیا تو وہ مسکراتے رہ جاتے ہیں خواہ ہمارا شبہ، شبہ ہی رہے یا شکوک کی منزلوں سے گذر کر یقین کی سرحد پار کرلے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ وہ معنی خیز مسکراہٹ، ان کے چہرے پہ بدستور باقی رہے گی۔ اب دوسرا معتبر ذریعہ ان کی بیگم صاحبہ ہیں۔ سونچا کہ چلیئے کہ ہاتھوں ان سے کچھ چھان بین کی جائے تو وہ بھی سیر کو سوا سیر واقع ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ میاں جتنے ہنس مکھ ہیں یہ اتنی ہی ضد ہیں۔ بات بات میں رونا آجاتا ہے۔ بیوی کے حصے کی ہنسی اللہ میاں نے شوہر کی قسمت میں لکھ دی اور ان کی قسمت کا رونا اس نصیبوں جلی کو ملا۔ جب بھی کوئی ہمدردانہ انداز میں ان سے خیریت دریافت کرتا تو چھاجوں آنسوؤں کی رفتار تیز ہوجاتی۔ کبھی بیماری کا بگڑ تو کبھی میاں کی شکایت کہ خرچ کو پیسے نہ ملے یا کبھی میاں کے "شمیر" کی قصیدہ خوانی [illegible] کم زبان پر لاتی ہیں غالباً انھیں غالب نے چپکے سے کان میں کہدیا ہوگا ع

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

لیکن محلے والے ان کی کسی بات پہ یقین نہیں رکھتے۔ وہ لاکھ خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر اپنی بات کا [illegible] کرانا چاہتی ہیں مگر سب میاں کی تعریف ہی کرتے نظر آتے ہیں [illegible] تو سب دستور سب خاموش رہتے ہیں [illegible] ہو [illegible] کہیں گے کہ [illegible] بیوی کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ایسے مرد کم ہی [illegible] ہاں! تو ہم نے ایک دن موقع پاکر ان کی بیگم سے پوچھ ہی لیا کہ خاں صاحب کا اصلی نام کیا ہے تو [illegible] بتلایا کہ پہلے وہ "عبدالحکیم" (عبدالقیوم) کہلاتے تھے اور [illegible] تھے۔ جب سے نوکری چھوٹی [illegible] کہتے ہیں [illegible] نام کی بحث میں پڑنے سے بہتر ہے [illegible] خاں صاحب [illegible]

کہ جو خوبیاں خانوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب شکر ہے کہ ان میں موجود ہیں۔ بات کے کھرے، ایماندار اور ذرا سر پھرے۔ جب غصہ آتا ہے تو واقعی کسی کے باپ کو نہیں سمجھتے۔ جان دینے اور جان لینے پر آمادہ۔ پتہ نہیں یہ افغانی ہیں یا پشاوری اس لئے کہ ان کا ورود ہندوستان کے جنوب یعنی حیدرآباد کے ایک موضع بیدر میں ہوا لہٰذا جو بھی سمجھیں مناسب ہے۔ پنجاب میں جو پٹھان بستے ہیں ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ "ق" کا تلفظ برابر ادا نہیں کر سکتے اور "ک" کہتے ہیں تو ہمارے "خاں صاحب" تو ان سے بھی بازی لے گئے۔ یہ "خ" کو بھی "ک" ہی کی آواز میں ادا کرتے ہیں جیسے "اخبار" کو "اکبار" "خبر" کو "کھبر" وغیرہ۔

فوج کی ملازمت ترک کرنے کے بعد انھوں نے رکشا سنبھالا۔ کئی سالوں تک یہی ان کی معاش کا ذریعہ بنا رہا۔ روزانہ مکتب کی سواریاں بھی لیجاتے اور درمیانی وقفے میں دوسری سواریاں بھی کر لیتے۔ آمدنی معقول تھی۔ گھر میں کھانے والا کوئی نہ تھا۔ بالآخر اس کے صحیح مصرف کے لئے ایک عدد لڑکی کو گود لے لیا گیا۔ اس کے باوجود آمدنی زیادہ اور خرچ کم محسوس ہونے لگا تو ایک بلی اور کتے کے بھی کفیل ہو گئے۔ ہفتہ میں چھ دن تو بہت معروف رہتے ساتویں دن یعنی اتوار کو مدرسہ یا کالج کی چھٹی ہونے کے سبب وقت کی پابندی نہ رہتی۔ اس لئے نیند سے بیدار ہوتے ہی خیال آتا کہ آج گاڑی کو ٹھیک ٹھاک کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہتھوڑی ملبسولا لے کر میدان میں آ جاتے گاڑی کی مرمت سے شاید دور کا بھی تعلق نہ ہوگا لیکن اپنی دانست میں اپنے آپ کو "ماہر فن" سمجھتے۔ آغاز تو ٹھیک ہی ہوتا۔ مختلف نٹ اور اسکریوس کھول کر ادھر ادھر بکھیر دیتے۔ کچھ دیر OILING ہوتی۔ آئیلنگ کے بعد جب انھیں صحیح مقام پر بٹھانا ہوتا تو سامنے کا نٹ پیچھے اور پیچھے کا نٹ سامنے لگانا چاہتے۔ ظاہر ہے کہ نٹ ان کی مرضی کے تابع کیسے ہوگا۔ دوبارہ کوشش کرتے۔ بار بار کوشش کے باوجود نتیجہ وہی صفر۔ ادھر بھوک زور و شور سے لگتی۔ غصہ دو آتشہ ہو جاتا۔ اب ضد میں آ کر اور غصہ سے ٹھونک کر بٹھانا چاہتے تو غصہ کا زور سارا نٹ پر صرف ہونے کے بجائے ہاتھ پر ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھ لہولہان ہو جاتا۔ بھلا خاں صاحب کب خاموش بیٹھنے والے، غصہ کا بدلہ نہ نکالیں تو ان کی بہادری کو ٹھیس پہونچے گی۔ لہٰذا دوسرے ہاتھ سے رکشا پر اتنی کاری ضرب لگتی کہ سوائے WORK SHOP کے وہ کہیں ٹھیک نہیں ہوتا۔ بیوی کو زوردار ڈانٹ ہوتی۔ پھر اس کے بعد کھانے سے فراغت پا کر حسب عادت ہنستے مسکراتے وہ رکشا گھسیٹتے ہوئے لیجاتے اور بنوائی کے لئے دے دیتے۔ غلطی کا اعتراف کرنا گویا احساس شکست ہے۔ اس لئے آج تک ہم نے ان سے نہیں سنا کہ واقعی میری غلطی تھی۔ ایسا نہ کرنا چاہئے تھا دلچسپ

اس زمانے میں فلم "مغل اعظم" کی بہت دھوم تھی چنانچہ خاں صاحب بھی "مغل اعظم" دیکھ آئے STORY تو کچھ پلے پڑی یا نہیں بہرحال! بزرگوں کی کہاوت کی طرح یہ بھی اور لوگوں کی طرح تعریف میں شریک ہو گئے۔ نمازی اور متقی لوگوں سے کہتے۔ بہت بڑے بڑے مولانا تسبیحی (تسبیح) لے کر فلم دیکھنے آرہے ہیں۔ آپ بھی دیکھئے۔ "تاریخی" فلم ہے۔ اس کا ایک "سلے مبت زندہ" انھیں "ورد زبان" یاد ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی بیگم سے جب لڑائی ہوتی تو وہ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے پالتو کتے کو باز و بٹھا کر سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں "سلے موہبت زندہ باد" "سلے موہبت زندہ باد" کی صدا سے فضا کو معمور کر دیتے۔

کمپونڈری کی باضابطہ تعلیم تو انھوں نے نہیں پائی لیکن کسی بھلے مانس نے انھیں انجکشن لگانا سکھا دیا۔ بیوی چونکہ دمہ کی مریض تھیں اس لئے ان پہ ہاتھ صاف کیا، ہاتھ صاف کیا ہوا، یہ کہئے کہ وہ سخت جان تھیں ورنہ بچنا مشکل ہو جاتا جبکہ رکشا جیسی بے جان چیز ان کے ضربات کی تاب نہ لا سکی بالکل رکشا کے ضربات کی طرح انجکشن بھی کبھی آہستہ اور کبھی زور سے لگایا جاتا۔

ایک دن محلہ کے ایک بوڑھے حضرت جنھیں ان کے اُستاد محترم ہونے کا شرف حاصل تھا۔ کھانسی کی وجہ سے بے حال ہو رہے تھے۔ اتفاقاً شاگرد صاحب آپہونچے، نانا، نانا کی صدا لگانے پر اُنھوں نے نہایت نحیف وکمزور آواز میں جواب دیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہے، شاید نہ بچ سکوں۔ ایسی نااُمیدی کی باتیں وہ کہاں سننے جاتا کہا نانا! پریشان مت ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا مزاج بھی خراب ہو گیا تھا۔" بس جمین آسمان ایک ہو گئے تھے "ٹھیرو! ابھی انجکشن لگاتا ہوں" غنیمت ہوا کہ نانا سنبھل گئے ورنہ ہمیں خدشہ تھا کہ نانا کی پیشن قیاسی کہیں پوری نہ ہو جائے۔

ہمارے محلہ میں ہر قسم کے دانا بینا لوگ موجود ہیں۔ ایک صاحب پیشے کے اعتبار سے کچھ اور واقع ہوئے ہیں لیکن "سائیڈ بزنس" کے طور پر "جھوجھا" بھی کرتے ہیں۔ ان کی سواری کرتے ہوئے یہ اثر خاں صاحب میں بھی سرایت کر گیا۔ اب یہ بھی اپنے آپ کو ملا سمجھنے لگے۔ کوئی بھی انھیں جمعرات کے روز کہتا کہ " خاں صاحب! سواری کروگے تو کہتے ہیں! آج مجھے حلقے (حلقہ) میں جانا ہے۔ لوگوں پر رعب جمانے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ "مجھے حضرت کھلیفہ (خلیفہ) بنا دیئے ہیں۔ تھوڑے بہت عملیات میں بھی سیکھ گیا ہوں۔

یہ رنگ زیادہ دن تک جما نہیں۔ اب آٹو رکشا سیکھنے کا شوق چرایا۔ دو دو دن گھر سے غائب راتوں میں خوب ریاضت ہوتی۔ پھر شام کا بھولا صبح گھر آجاتا۔ رکشا بر ائے نام چلانے لگے۔ آمدنی کا فیصد کم اور خرچ کا فیصد بڑھ گیا۔ جمع شدہ پونجی ختم ہونے لگی لیکن عزائم بلند، پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔ روزانہ کی مشق نے رنگ جو کھایا۔ بالآخر چلانا آہی گیا مگر مالکوں کو شاید ان پر ابھی اعتماد نہیں ہوا تھا اس لئے گاڑی روزانہ نہیں ملا کرتی تھی۔ بعض اوقات تو چار چار دن سوکھے گذر جاتے مگر ڈرائیور صاحب رکشا کو ہاتھ لگانا کسر شان سمجھتے۔ جب گاڑی نہیں ملتی تو خاں صاحب مسجد میں نظر آتے۔ اذان بھی دیتے۔ نماز بھی پڑھتے اور وقت گذاری کے لئے "الف ب" کی کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ برسوں سے وہی ایک کتاب پڑھتے آرہے ہیں بلکہ خدا جھوٹ نہ بلائے سفر بھی وہی ہوتا۔ پھر اچانک جو کسی آٹو کی آواز آتی تو فوری کتاب طاق میں رکھ دوڑ پڑتے۔

ان کے اس شوق کو مہمیز لگانے ایک صاحب خیر نے آٹو رکشا خریدا اور "خاں صاحب" کے ذمہ کیا۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ آدمی کھرا ہے، کچھ دھوکا نہ دے گا کیونکہ یہ وہ قوم ہے جو اپنا مونچھ کا بال رکھا کر قرض لیتی ہے اور دینے والے کو اس کی مونچھ کے ایک بال ہی کی ضمانت کسی بڑی سے بڑی ضمانت کے مقابلے زیادہ باوزن ہوتی ہے۔ ہاں! تو موصوف نے اپنا آٹو ان کے حوالے کیا۔ نئی گاڑی تھی۔ خوشی خوشی چلے جاتے۔ وہ اب تک جتنی گاڑیاں چلا چکے تھے وہ اس سے زیادہ خوب تھیں اور چلتی کم تھیں۔ انھیں اعتراض تھا تو بس یہی کہ ہارن بدلا جائے۔ اس میں "بابو" "بابو" بولنے والا ہارن نہیں۔ فوراً ان کی خواہش کی تکمیل کر دی گئی۔

اب روزانہ پابندی سے وہ آٹو لے کر صبح روانہ ہو جاتے اور رات میں گیارہ بجے تک گھر لوٹتے۔ اس عرصہ میں

نئے نئے تجربات اور مشاہدات ہونے لگے۔ عموماً آٹو والوں سے سواریاں ڈرا کرتی ہیں لیکن خاں صاحب سے کچھ نئی باتیں سننے میں آئی ہیں۔ ایک روز جلد ہی واپس آگئے لیکن بڑے پریشان حال۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پولیس اسٹیشن کی سیر کر آئے ہیں۔ سنا کہ ایک موٹی تازی عورت رکشا سے اتر کر آٹو کی طرف آئی اور ان سے کہا کہ وہ رکشا کا کرایہ ادا کریں۔ انھوں نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی۔ اب وہ دھماکے کے ساتھ آٹو میں داخل ہوگئی۔ اس کے بعد دوسرا حکم یہ صادر ہوا کہ فلاں محلہ کی اس گلی میں چلو۔ انھوں نے کہا کہ گلی میں اندر نہیں لے جاتا۔ راستہ خراب رہتا ہے۔ گاڑی خراب ہو جائے گی یہ سن کر آگ بگولہ ہوئی اور پولیس اسٹیشن چلنے کے لئے کہا۔ خاں صاحب نے احتجاج تک نہیں کیا اور تھانہ چلے۔ وہاں گاڑی روک کر اس نے انسپکٹر صاحب سے شکایت کی کہ یہ آٹو والا ستا رہا ہے جہاں میں چلنے کہتی ہوں وہاں نہیں لے جاتا۔ انسپکٹر صاحب نے حکم دیا کہ فوراً آٹو چھوڑ کر ادھر آؤ۔ اچانک خاں صاحب کی ایک حس جاگ اٹھی انھوں نے کہا کہ اس رکشا کے مالک وکیل صاحب ہیں انھوں نے مجھے منع کیا ہے۔ وکیل صاحب کا نام سن کر انسپکٹر صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ بجائے ان کے اس عورت پر برس پڑے اور ان کے میٹر کے پیسے دلوا کر انھیں چلتا کیا۔ آٹو چلاتے ہوئے کبھی یہ قصہ یاد آجاتا تو دہراتے کہ اس روز اس نے یہ کہا تھا، وہ کہا تھا وغیرہ۔ بچے انھیں چھیڑنے کے لئے کہتے کہ وہ عورت دبلی تھی تو خاں صاحب اس کی جسامت اور ہیئت کا جائزہ لینے کے لئے دونوں ہاتھ ہینڈل پر سے اٹھا لیتے اور ہاتھوں کے اشارے سے بتلانے لگتے کہ وہ اس قدر موٹی تھی۔

ایک دفعہ نیا یونیفارم چوری گیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ آٹو میں رکھ کر چائے خانہ گئے تھے۔ خود ہی حیرت سے کہہ رہے ہیں کہ نہ جانے کیسے غائب ہوگیا۔ سب کے سامنے رکھ کر گیا تھا۔ وہاں کئی رکشا والے بیٹھے ہوئے تھے چائے پی کر جب آیا تو یونیفارم ندارد۔

بارش کا زمانہ تھا، دن بھر کی کمائی جیب میں تھی۔ بارش کے سبب نوٹ بھیگ گئے تھے۔ ڈر یہ ہوا کہ کہیں وہ نوٹ پھٹ نہ جائیں اس لئے اس کو سکھانے کے لئے ایک ترکیب خاں صاحب کے دماغ میں آئی کہ SILENCER پر رکھ دیں۔ شہر سے دور عنبر پیٹ سے آ رہے تھے۔ سلے پلی پہونچنے پر خیال آیا کہ نوٹوں کی خبر لیں تو پتہ چلا کہ سارے نوٹ ہرا ہوگئے۔

موجودہ فلموں میں "شعلے" بہت پسند ہے جب بھی موڈ آجاتا سبزہ زار پر بیٹھ جاتے اور تمام بچے ان کو گھیر لیتے۔ "خالو" ذرا "شعلے" کی اسٹوری تو سناؤ۔ اب خالو "گبر سنگھ" کی طرح سارے مکالمے سناتے اور آخر میں کہتے کہ فلم بہت اچھی ہے۔ اس کا تانگہ چلانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بچے پوچھتے کہ خالو کتنی دفعہ دیکھے؟ تو کہتے کہ چار دفعہ۔ پھر کب دیکھوں گا۔ ان کے بچوں میں سے ایک کا نام نواب ہے۔ رمضان کا بہت چھوٹا سا بچہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک روز اس کو بجائے [illegible] لے جانے کے اور محلہ میں لے گئے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کون ہے؟ تو جواب دیا [illegible] "بیٹا نواب" (نواب) وہ حیرت سے ہو کر پوچھنے لگے کون نواب؟ [illegible]

[illegible] آٹو رکشا نہیں چلا کرتا تھا۔ اس عرصے میں وہ مختلف بیوپار کرنے لگے۔ آموں کا موسم تھا تو ایک بنڈی لے کر آم بیچنے لگے۔ ایک روز سڑک سے گزرتے ہوئے مختلف آموں کے نام [illegible] بے نشان، چھوٹا رسال، ملغوبہ، [illegible] وغیرہ۔ ہم نے سوچا کر چلو ایک وقت سب ہی آم مل جائیں گے۔ [illegible] انھیں قریب [illegible] پتہ چلا کہ سوائے رسال [illegible]

کے کچھ نہیں ۔ نہایت تعجب سے جب ان سے دریافت کیا گیا کہ تم نے اتنے آموں کے نام لیے، یہاں تو صرف ایک ہی قسم کے ہیں تو کہنے لگے۔ ایسا ہی بولنا پڑتا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام تو بک ہی رہے تھے ۔ اب تو ترازو اور باٹ بھی غائب ہو گئے ۔ غنیمت ہوا کہ بنڈہ بچ گئی جو آج تک پلنگ کا کام دے رہی ہے ۔

اب نئے بیوپار کی سوجھی سوچا کہ نہاری بیچیں اس میں ترازو باٹ کی ضرورت نہیں ۔ دس روپے کی نہاری لے کر نکلے تھوڑی دیر میں نہاری برخاست اور خاں صاحب چار روپے جیب میں لئے گھر واپس آ گئے ۔ سب نے دریافت کیا کہ کچھ فائدہ ہوا یا نقصان ؟ کہنے لگے " ماشاء اللہ بچ ہوا ۔ چار روپے ملے ۔ سب لوگ تاریپ کئے ۔ بہت مزے کی ہے کہہ ۔ ایک ڈونگا ڈالا تو اور ، اور ڈالو کہتے ۔ تھوڑی دیر میں سب ختم ہو گئی " وہ جو محنت کی کمائی چار روپے ملی تھی وہ بھی سب بچوں میں تقسیم ہو گئی ۔

عمر تو خاں صاحب کی بس ایک مقام پر آ کر رک سی گئی ہے جب ان سے دریافت کریں یہی کہتے ہیں کہ ہوگی کوئی یہی چالیس سال یعنی سنتے سنتے تیس سال گذر گئے ۔ لیکن خاں صاحب کی عمر ایک لمحہ نہ بڑھی ـــــ ایک دفعہ CENSUS والے گھر پر آئے ۔ پتہ نہیں خاں صاحب نے اپنی عمر کتنی بتلائی ۔ البتہ ان کی بیگم جو خاں صاحب کے ہم پلہ بھی ہیں ۔ انھوں نے بڑے اچھے جوابات دیئے ۔ اس نے سوال کیا کہ آپ کی عمر کیا ہے ؟ جواباً انھوں نے کہا کہ پچیس سال ۔ تب اس لڑکے نے دوسرا سوال اپنی حیرت کو کم کرنے کے لئے کیا کہ شادی کب ہوئی ؟ (اس لئے کہ خاں صاحب کی بیوی، پچاس سے کم نہیں لگ رہی تھیں) تو انھوں نے جواب دیا ایکشن کے وقت (پولیس ایکشن) وہ بھی بڑا بچ تھا کہنے لگا یوں کیوں نہیں کہتے ؟ پیدائش سے قبل ہی شادی ہو گئی ۔ اب خاں صاحب کی بہن کی باری آئی ۔ یہاں تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی ۔ اس نے شائستگی سے پوچھا آپ کا نام تو خاں صاحب کی بہن نے بہت ہی مہذب انداز میں کہا " آپ کا صغریٰ بی ۔ یہ اس پر ایسی کاری ضرب تھی کہ مزید کی جرات نہ کر سکا ۔ بہر حال ! ہمہ خاندان آفتاب است ۔

۷۷

انوار انصاری
(رانچی)

بیچارہ کنوینر

شہر حیدرآباد تین چیزوں کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ایک "بریانی" دوسرے "شیروانی" اور تیسری "پریشانی"۔ اسی طرح شہر رانچی بھی تین چیزوں کے لئے ہندوستان گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس میں اول کانکے کا "پاگل خانہ" دوسرے ہیوی انجینیرنگ ہٹیا کا کارخانہ اور تیسرے دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل بہار کا مشہور زمانہ "مشاعرہ" یوں تو انفرادی طور پر ان سب کا الگ الگ مقام ہے مگر دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل بہار کے مشاعرے کا کیا کہنا۔ یہاں کے مشاعرے کی بات ہی کچھ انوکھی اور نرالی ہے۔ مثلاً ۱۹۷۸ء کا مشاعرہ پہلی بار دن کے ساڑھے دس بجے منعقد ہوا اور ۴ بجے دن تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ دن کو مشاعرہ منعقد کرنے کا انوکھا تجربہ بھی "فسادیوں" کی وجہ سے میسّر آیا۔ خدا بھلا کرے ان شرپسندوں کا جنھوں نے پہلی بار دن میں مشاعرہ منعقد کرانے کے مواقع فراہم کئے۔ بہرحال دفتر سلے جا۔ بہار کے مشاعرے میں شریک ہونے والے شاعروں کو یہ تعلّی ثابت نہیں کرنا پڑتا کہ کون شاعر "قوال" ہے یا کون "قوال شاعر"۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ سامعین کبھی کبھی اچھے "خوش گلو" شاعر کو قوال کا درجہ دینے میں ہچکچاتے نہیں اور تحت اللفظ میں پڑھنے والے شاعر کو "جدید شاعر" کے خطاب سے نوازتے ہیں۔ لیجئے میں تو تمہید ہی میں نفسِ مضمون سے بھٹک گیا۔

کسی مشاعرے کا کنوینر چُنا جانا یقیناً معمولی کارنامہ نہیں۔ لیکن کنوینر کا انتخاب عمل میں آنے کے بعد وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اوّل تو اسے شاعروں کے انتخاب میں پریشانی ہوتی ہے کیونکہ زمانہ کا مذاق تیزی سے بدل رہا ہے اور آپ جانتے ہیں ان دنوں شاعروں کی بہت سی قسمیں عالمِ وجود میں آ رہی ہیں جیسے قدیم، جدید، جدید تر، ترقی پسند، خوش گلو، جادو دہ مسخرہ نیم گرم، گرمگ، نیم مجنون اور قوال نما شاعروں کے درمیان اسے صرف چند شاعروں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ پھر کنوینر بھی شاعروں کے انتخاب کے لئے حالات کے تحت مجبور ہے کیونکہ اسے [illegible] سامعین کے جذبات اور ذوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ [illegible]

اسی لئے کنوینر اگر سامعین کے مذاق کا لحاظ ایک حقیقت ہے کہ سامعین کا مذاق بھی سیاسی پارٹیوں کی طرح تیزی سے بدل رہا ہے۔
ذکر سے اور شاعروں کا انتخاب ادبی حیثیت سے کرلے تو بہت ممکن ہے کہ مشاعرے میں کنوینر اور کچھ "ادبی" شاعروں کا قافیہ تنگ ہوتا نظر آئے گا۔

کنوینر کی دوسری پریشانی مشاعرے کو کامیاب بنانے کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی ہوتی ہے۔ غالباً یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں نظام عالم کا شیرازہ سرمایہ ہی پر منحصر ہے۔ پیسہ گرچہ خدا نہیں ہے مگر پھر بھی خدا کی بہت سا صفتیں پیسہ میں موجود ہیں۔ آئے دن تہذیب و تمدن اور قلت کا شیرازہ پیسہ کی وجہ سے سر بازار بکھر جاتا ہے۔ آج کا کاروبار ادب کا ہو یا شاعری کا۔ سماجی ہو یا سیاسی سب سرمایہ ہی پر منحصر ہے۔ چندہ دینے والے حضرات چندہ دیتے وقت کنوینر پر فرد نصیحت کرتے ہیں کہ کنوینر صاحب اس سال "فلاں شاعر" کو بلوائے گا۔ سچ کہتا ہوں وہ مشاعرہ لوٹ لیں گے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چندہ دینے والے ایک نہیں کئی ہوتے ہیں۔ لہٰذا سبھوں کی پسند کا شاعر "آرڈر" دے کر بلوانا کنوینر کے کتنا مشکل کام ہے۔

کنوینر کی تیسری پریشانی شاعروں کے انتخاب کے بعد ایڈوانس کی رقم بھیجنے کے وقت ہوتی ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ شاعر جو بزعم خود "شاعر اعظم" سمجھتے ہیں ایڈوانس کی رقم وصول کرنے کے بعد مشاعرہ میں شریک نہیں ہوتے اور ایک خوبصورت بہانہ "بیماری" کا سہارا لیتے ہیں۔

کنوینر کی چوتھی پریشانی اس وقت بڑھ جاتی ہے جب مختلف گروہ کے شاعر ایک اسٹیج پر جمع ہوتے ہیں اور ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ کنوینر چونکہ سامعین کے جذبات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اس لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ "شاعر" سے زیادہ "سامعین" خوش ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کبھی کبھی "خوش گلو" شاعر مشاعرہ لوٹ لیتا ہے کیونکہ سامعین بار بار اسی شعر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی "خوش گلو" شاعر کے گلے میں خراش آگئی ہے پھر سامعین کی ضد ہے کہ وہی مائک پہ تشریف لائے اور کسی شاعر کو تحت اللفظ پڑھنے کا موقعہ نہ دے۔

کنوینر کی پانچویں پریشانی شعراء کرام کو آگے اور پیچھے پڑھنے والوں کے مرتبہ کا خیال رکھتے ہوئے ان سے شعر سنانے کی فرمائش کرنے کے وقت ہوتی ہے۔ اگر حسن اتفاق سے کوئی "قدیم" یعنی کہنہ مشق [illegible] اپنے سے [illegible] گوارا نہیں کرے گا کہ وہ پہلے اول اپنا کلام سنائے۔

کنوینر کی چھٹی پریشانی اس وقت زیادہ بڑھ جاتی ہے جب شاعروں کے طعام و قیام کا بندوبست کرنا پڑتا ہے مختلف مزاج کے شاعر مختلف جگہوں سے آئے ہوئے مختلف جگہ قیام کرنا پسند کرتے [illegible] اور مختلف کھانا مع "پینا" اپنا کا چاہتے ہیں۔

غرض کہ کنوینر کی پریشانیاں کہاں تک گنواؤں۔ بس یوں سمجھئے کہ مشاعرے کے [illegible] سے اختتام تک کنوینر صرف یہ کرتا ہے اور اس بچارے کو چو طرفہ وار سہنا پڑتا ہے۔ مشاعرہ کے اختتام کے بعد شاعروں کو "نذرانہ" دے کر خوش خوشی روانہ کرنا بھی کنوینر کے لئے ایک کٹھن مسئلہ ہوتا ہے۔

انصاری اصغر جمیل
(ناگپور)

محبوباؤں کی ہڑتال

آپ کتنی عدد محبوباؤں کے عاشق ہیں؟ صرف ایک یا ایک سے زیادہ؟ آپ کو ہمارے اس سوال سے خوفزدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم نہ تو کوئی عشق ٹیکس آفیسر ہیں اور نہ محبوباؤں کی مردم شماری کے محکمے سے ہمارا کوئی تعلق ہے بلکہ ہم ایک سچے ہمدرد ہونے کے ناطے آپ سے یہ سوال کر رہے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ ملک سے ایمرجنسی ختم ہوتے ہی ہر سمت ہڑتالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔ اسکولوں میں ہڑتالیں، کالجوں میں ہڑتالیں، دفتروں میں ہڑتالیں، ریلوے میں ہڑتالیں، غرض کہ ہر سمت ہڑتالوں کا شور ہے۔ یہ ہڑتالیں اس قدر زور پکڑ چکی ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب آپ کی محبوبہ بھی اس دوڑ میں شامل ہو جائے یعنی ہڑتال کر کے آپ کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دے کیونکہ اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے آپ نے جو پاپڑ بیلے ہیں اسے صرف آپ اور خدا ہی جانتا ہے۔

آیئے! آج ہم آپ کو ایک راز کی بات بتا رہے ہیں لیکن خیال رہے کہ یہ بات ہمارے اور آپ کے علاوہ کسی اور کو معلوم نہ ہو۔ وہ راز یہ ہے کہ ہماری محبوبہ نمبر ۳ نے خفیہ اطلاع دی ہے کہ چند روز پیشتر دہلی کی ایک محبوبہ جو انڈین محبوبیٹس ایسوسی ایشن کی چیئرمین ہیں ہمارے محلہ میں قیام پذیر تھیں۔ انھوں نے ایک رات ہمارے محلہ کی تمام محبوباؤں کو اکٹھا کر کے انڈین محبوبیٹس ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد بیان کئے جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عاشقوں کو سبق سکھانے کی بجائے سینڈل کا استعمال کیا جائے۔ قصہ یہ کہ انھوں نے محلہ کی تمام محبوباؤں کو ان کے عاشقوں کے خلاف خوب بھڑکایا، ان کی غیرت کو للکارا، ان کی [illegible] اتنا ہی نہیں بلکہ محلہ میں انڈین محبوبیٹس ایسوسی ایشن کی ایک شاخ بھی قائم کر دی جس کی صدر ہماری محبوبہ نمبر ۱ اور سکریٹری محبوبہ نمبر ۳ ہیں ——

اسوسی[illegible] کی چیئرمین شاخ قائم کرکے دہلی واپس روانہ ہوگئیں لیکن یہاں کی اراکین محبوبائیں خصوصاً ہماری محبوبہ نمبرا اور بر ۳ گھر میں چوہیا پھونکنی بجائے سر جوڑ کر چوٹیاں کھول کر اس ایسوسی ایشن کو فروغ دینے کی فکر میں لگ گئیں۔ گزشتہ ہفتہ ان کی ایک اہم میٹنگ ہوئی جسے ہم نے اپنی محبوبہ نمبرا کے بیڈ روم میں اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا (اس کیلئے ہمیں مسلسل ۲ گھنٹے ان کی پلنگ کے نیچے سانس روکے لیٹنا پڑا تھا) اس میٹنگ میں ہڑتال کا اعلان کیا گیا ہے جو پہلے علاقائی پھر صوبائی اور بعد میں عالمی پیمانے پر کی جائے گی۔ ان کی یہ ہڑتال جلد ہی شروع ہونے والی ہے۔ ان کی اس میٹنگ میں قرار دادیں بھی منظور کی گئیں۔ جن پر عمل در آمد دوران ہڑتال کیا جائے گا۔

۱۔ آپ کے لاکھ منانے اور بلانے کے باوجود محبوبہ آپکی جانب متوجہ نہیں ہوگی۔ اگر ہوئی اور کسی نے اُسے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو اس پر چار سو بیس روپے جرمانہ کیا جائے گا۔ نیز اس کا نام محبوباؤں کے رجسٹر میں سے کاٹ کر بیگموں کے رجسٹر میں لکھ دیا جائے گا۔

۲۔ آپ کو کھولانے کے لئے محبوبہ آپ کو دیکھتے ہی ایک نعرہ لگائے گی "ہماری مانگیں" آپ کہیں گے "سیندور سے بھر دو" (آپ سے اس کے سوا توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے) یہ سن کر آپ کی محبوبہ بھڑک اُٹھے گی اور پہلے سے بھی زوردار آواز میں کہے گی "جو ہم سے ٹکرائے گا" آپ کہیں گے "وہ شوہر بن جائے گا" (جو نہایت ہی غیر مناسب بات ہے) آپ اس کے جواب سے آپ کی محبوبہ (جو واقعی آپ ہی کی محبوبہ ہے) کے دل میں گدگدی ضرور ہوگی لیکن چونکہ اُسے اپنا بھرم قائم رکھنا ہے اس لئے دانت پیستی نظر آئے گی۔ اور آپ کو یہ سب خاموشی سے برداشت کرنا ہوگا۔ کیونکہ آپ اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتے۔

۳۔ آپ کا تھوبڑا نظر آتے ہی وہ ایک طویل انگڑائی لے گی۔ آپ اس کی انگڑائی دیکھ کر بے قابو ہو جائیں گے۔ اور اُسے اپنی بانہوں میں بھرنے کے لئے لپکیں گے لیکن آن واحد میں وہ ڈراپ کک (DROP KICK) کے ذریعہ آپ کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیگی (آج کل کی محبوبائیں جوڈو کراٹے میں ماہر ہیں)

۴۔ آپ کی محبوبہ اپنے ہمراہ آپ کے چھ عدد رقیبوں کو لئے پھرا کرے گی۔ جو اس کے ایک ہی اشارے پر آپ کے چہرہ کو "لنکا" بنا دیں گے اور اگر رحم دل ہوئے تو صرف ناگپور کا ہی نقشہ بنا کر چھوڑ دیں گے۔ (اس مقصد میں انھوں نے اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی رعایت بھی دی ہے لیکن آج کل کی محبوباؤں سے رعایت کی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔

۵۔ آپ کو دیکھتے ہی آپ کی محبوبہ سینما ہال کا رُخ کرے گی اور آپ سدھائے ہوئے بیل کی طرح اس کا پیچھا کریں گے۔ وہ مہیلاؤں کی بھیڑ میں کھڑی ہو جائے گی۔ آپ اُسے لاکھ کہیں گے کہ ایک ٹکٹ آپ کے لئے بھی نکال لے لیکن وہ آپ کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیگی مجبوراً آپ بھی پُرشوں کی بھیڑ میں کھڑے ہو جائیں گے جہاں پہلے ہی دھکم پیل جاری ہے۔ آپ کی محبوبہ اپنا ٹکٹ نکال کر آپ کو چڑانے آپ کے سامنے سے یہ کہتی گذرے گی۔

ہم شریفوں کو تو پہلو میں بٹھائے رکھئے   نمبری لوگوں کو نمبر سے لگائے رکھئے۔

آپ صرف دانت پیستے ہی رہ جائیں گے اور اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے اور جیسے ہی آپ کا نمبر آئے گا کمرہ پر ہاؤس فُل کا بورڈ لٹکا دیا جائے گا اور آپ اس وقت اپنے آپ کو کسی یتیم بچے کی طرح محسوس کریں گے۔

۷۔ آپ کے گھر ٹیلیفون کر کے آپ کی بیگم صاحبہ کے کان بھر دیگی کہ آپ کسی کالی کلوٹی لڑکی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ بیگم صاحبہ اس کی باتوں کا اعتبار کرتے ہوئے آپ سے مشورہ لئے بغیر" میں میکے چلی جاؤں گی تم دیکھتے رہیو" کہتی ہوئی منے کو ساتھ لئے رفوچکر ہو جائے گی۔ اور آپ" رک جا او جانے والی رک جا" ہی گاتے رہ جائیں گے۔

(اگر آپ کے گھر ٹیلیفون نہ ہو تو محبوبہ آپ کی بیگم صاحبہ کے نام ایک پرائیوٹ خط روانہ کرے گی جسے آپ کسی بھی طرح کھول کر پڑھ نہیں سکیں گے۔)

اب بتائیے ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے؟ کیا اپنی محبوبہ کا اغوا کریں گے؟ کیا آپ اس سے شادی کر لیں گے (ناممکن سی بات) اگر نہیں تو پھر کیا کریں گے؟ کیا ہنستے کھیلتے یہ سب برداشت کر لیں گے؟ کیا ان کی ہڑتال کو کامیاب بنا کر عاشقوں کے نام پہ بٹہ لگائیں گے؟

●●

غزلیں

فیض افسوس

کیوں نہ ہوں لطف جگر سڑے ہوئے
جب کہ ہیں مادر پدر سڑے ہوئے

ہم سڑتے جا رہے ہیں آجکل
پل رہے ہیں اسقدر سڑے ہوئے

ہم کو تھی نہ آپ سے ایسی امید
اتنا پڑھ کر اسقدر سڑے ہوئے

راہرو پہلے ہی کورے عقل کے
خیر سے ہیں راہبر سڑے ہوئے

جنگ رکتی ہی نہیں سسرال میں
کچھ اُدھر ہیں کچھ اِدھر سڑے ہوئے

کیا کہیں افسوس ہم جائیں کہاں
شہر پاگل ہیں نگر سڑے ہوئے

عظمت بھلاواں

ذائقہ تو ٹٹول کر دیکھو
بڑکی منہ میں گھول کر دیکھو

سڑ کے کدو کا پیٹ خالی ہے
اس کو کانٹے پہ تول کر دیکھو

لکڑوں کو نکالنا فن ہے
کبھی چاول بھی ڈھول کر دیکھو

شائد اس میں دفینہ مل جائے
کوئی ویرانہ مول کر دیکھو

وہ نہ مانے تو اس کے گھر جاکر
اماں باوا کو بول کر دیکھو

جسم میں بجلیاں سی چمکیں گی
میری بانہوں میں ڈول کر دیکھو

لطف میری سے بڑھ کے آئیگا
میرے مصرعے کو رول کر دیکھو

کیوں بھلاواں نظر نہیں آتا
گھر کے کونے ٹٹول کر دیکھو

چچا نظام آبادی

بابا کا ہے لحاظ نہ اماں کا پاس ہے
جو کچھ ہے اُس کے واسطے سسرا ہی پاس ہے

منحوس تم نہیں ہو مگر اسکو کیا کروں
جب سے ملا ہوں تم سے بڑا ستیاناس ہے

تم میرے دوست ہو تو تمہارا ہے فرض یہ
کچھ بھی دکھاؤ مجھ کو مرا دل اداس ہے

[illegible] رقیب کو
[illegible] کی پیاس ہے

دکھنے [illegible] آنکھیں مار مار کر
پھر بھی [illegible] دل میں ابھی کچھ [illegible] ہے

[illegible] بیگم جلال میں
دفتر میں جاکے دیکھا تو غصہ میں باس ہے

مجھے کسی سے کیا گلہ اپنے نصیب کا
ترشی [illegible] سسرال ہے [illegible] ہے

عادت نہیں ہے اس لئے چچا کی جیب میں
سگریٹ ہے نہ پان نہ بیڑی نہ ناس ہے

ارشد علی خان

دوڑو کہ زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یہ بات تو فی الحال ڈھکی چھپی نہ رہی کہ انسانی اعضاء مثلاً آنکھ گردے اور ہڈیوں کو مرنے والے جسم سے نکال کر زندہ آدمی میں پیوند کاری کی جانے لگی ہے لیکن حال ہی میں اس تیز کوشش کر ہمارے چھکے چھوٹ گئے کہ اب سرجری کا اسقدر ترقی کر گئی ہے کہ انسان کے تمام اعضاء کو قابل استعمال بنا لیا گیا ہے حتیٰ کہ۔ پلاسٹک کے مصنوعی اعضاء دھڑا دھڑ کمپنیوں میں تیار کئے جانے لگے ہیں ۔۔۔ وہ زمانہ قریب آگیا ہے کہ اسپیر پارٹس (SPARE PARTS) کی دوکان سے جب چاہا پسند اعضاء خرید کر فٹ کر دیا جا سکے گا ۔۔۔ جہاں تک ہماری سمجھ کا تعلق ہے پلاسٹک کے اعضاء اتنے سہولت بخش نہ ہوں گے جس طرح کہ قدرتی اعضاء ۔۔۔

لہٰذا جس طرح لوگ اپنا خون فروخت کرتے ہیں اسی طرح اپنے اپنے اعضاء بھی فروخت کرنے لگیں گے۔ ادھر ڈاکٹروں نے مریض کے بارے میں موت کی پیشین گوئی کی کہ ادھر ورثاء اسے حقیقی معنوں میں ٹھکانے لگانے دھیکا مشتی شروع کر دیں گے۔ اخباروں میں کچھ اس طرح کے اشتہار نظر آئیں گے

خواہشمند حضرات ۔۔۔ توجہ اول

یہاں آپ حضرات کو اطلاع دیتے ہوئے ایک گونہ مسرت حاصل ہو رہی ہے کہ ہمارے خالو جان دواخانہ میں اب تک جان کنی میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ موصوف کل دن کے دو یا تین بجے کے درمیان داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ لہٰذا ہم ورثاء متفقہ طور پر اعلان کرتے ہیں کہ موصوف کا ۷ بجے تا ۸ بجے درمیانی معائنہ کیا جا کر ان کی قیمت مشخص کی جا سکتی ہے ۔ پھر نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی۔ موصوف کا جسمانی جغرافیہ [illegible]

رنگ : کھلتا ہوا گندمی — عمر :- چالیس سال

قد : پانچ فٹ دو انچ — [illegible] (OTHER) [illegible]

پاؤں : کسی قدر فربہ لیکن چلنے میں کافی تیز
ہر اہم اور غیر اہم مقامات پر چلنے
کے عادی۔

آنکھ : عینک کی بیماری سے دُور، نزدیک
اور دور کی ہر شئے کو آج چالیس سال
سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اکثر کم عمر
لڑکیوں پہ ٹھیر جاتی ہے۔

ناک :- بہت اونچی، قوت شامہ کتے کی
سے بھی تیز

کان : دونوں مساوی اور کسی قدر مجھ جیسا پر کبھی کوئی
چھل دریدگی نہ ہو سکی۔

سر : آگے سے بڑا پیچھے سے چھوٹا، یوں لگتا ہے جیسے فوجی
کان ٹوپ پہنے ہوئے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی
ثابت رہا۔

دماغ : تر و تازہ، ہر قسم کے پرانے گانے ٹیپ کئے ہوئے
فلم کے عمدہ ڈائیلاگ کے ساتھ شطرنج کا ماہر اور
چالیس محفوظ

باقی اعضاء کا بالمشافہ معائنہ کیا جا سکتا ہے۔

شرائط : اگر کوئی شخص پورا ملبہ یعنی مردہ جسم خریدنا چاہتا ہے تو دس فیصد رعایت کی جائے گی۔ ویسے الگ الگ اعضاء بھی واجبی داموں پر کاٹ کر دیئے جائیں گے۔

نوٹ : کسی دلال کمپنی کو کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا صرف خوش خریدار والے حضرات آفر دے سکتے ہیں۔ البتہ غریب حضرات کسی معتبر سے ہراج کرائیں گے۔ ادھر ملک الموت مریض کا دم قبض کر رہے ہوں گے۔ ادھر دلال عام گھر کے سامنے مجمع کو یوں مخاطب کیا کریں گے۔

" آئیے حضرات ! ایک جواں سال شخص کا منٹوں میں دم نکلنا باقی ہے صرف دو منٹ باقی ہیں۔ آئیے بولی لگائیے اس کا ہر عضو ثابت و سالم ہے، اتنا جوان جسم برسوں ملنا دشوار ہے، لے جائیے اور جوانی کا مزہ لوٹئے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ اس کی سرکاری بولی " پانچ ہزار روپے ـــ صرف اس کی کھال ہی چار ہزار کی ہوگی، اتنی نرم اور ملائم کھال بہت ہی کمیاب ہے ـــ آئیے اس کے تمام اعضاء کو ٹھوک بجا کر دیکھیے، یہ تمام کے تمام آہنی اور چالو کنڈیشن میں ہیں ـــ یہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر چڑھ سکتا ہے، کود سکتا ہے۔ قفلوں کو توڑ سکتا ہے، اجڑ سکتا ہے، ہیوی بائیکر رہا ہے۔ اور ہیوی موٹر کا لائسنس کے علاوہ اس کا دماغ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی جانتا ہے آئیے اس کا دماغ لگائیے اور منٹوں میں پورے اوصاف حاصل کر لیجئے اس کا سارٹیفکیٹ (CERTIFICATE) بھی ساتھ دیا جائے گا ـــ عجلت کیجئے۔ پل بھر مہمان کو تسلی بخش قیمت کا مژدہ سن کر مرنے کا موقع دیجئے۔

بعض لوگ کچھ اس قسم کی وصیتیں کریں گے۔ میرے مرنے کے بعد مجھے فروخت کر کے میری جوان بیٹی کی شادی کر دینا۔ کچھ لوگ اس طرح دل بہلایا کریں گے " ہاں بھئی جیتے جی ہم کچھ نہ کر سکے لیکن ہمارے مرنے کے بعد ہمیں فروخت کر کے اچھا سا گھر لینا، کار لے لینا وغیرہ وغیرہ۔

لاوارث مُردوں کو بلدیہ دم نکلنے سے پہلے ہی اپنے گودام میں لے جاکر ان نے پر سے "ٹھکانے لگانے کی کوشش کریگی
، سرکاری ٹھنڈر کا اعلان کچھ اس طرح کا ہوگا۔

حکومت کا اہم اعلان

ٹھنڈ دینے والے حضرات سالِ جاریہ کے لئے تیار ہوجائیں ۔گزشتہ بلدیہ کا ریکارڈ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اموات
فیصد ہی رہے لیکن اس سال اس کی رفتار چار فی صد رہے گی۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے ویسے پڑوس کا ملک بھی
، اہم نیوکلیر تجربہ کرنے والا ہے جو مزید طوفانوں کو لائے گا اور یوں اموات کی شرح کو کئی گنا بڑھا دے گا ۔ دوسری
ب طبقات الارض کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ایک عظیم الشان زلزلہ لب بام آچکا ہے جو بے اندازہ تباہی پھیلائے
۔ ان تمام پیش گوئیوں کی بناء پر یہ بڑا اسود مند دھندہ رہے گا۔

نوٹ : لاشوں کو انہیں مقامات سے ٹھنڈ صاحبان کو اٹھانا پڑے گا جہاں ان کا دم نکلے گا ۔ یہ نئی تبدیلی
ا سال سے روبہ عمل لائی گئی ہے ۔ فقط

چیئرمین تحفظ مردہ اجسام لاوارثان

اس کے علاوہ دنیا کا عجیب نقشہ ہوجائے گا ہر طرف افراتفری کا عالم برپا ہوگا ، لوگ ایک دوسرے کی جان
دشمن ہو جائیں گے ۔ اعلیٰ پیمانہ پر اسمگلر مردہ اجسام کو ایک ملک سے دوسرے ملک اسمگل کرنے لگیں گے ۔ قاتل حضرات
پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی ۔ ادھر کسی کا قتل ہوا اور ادھر اعضاء کو اسپیر پارٹس کی دکانوں پر فروخت کردیا ۔
یس کی ناک میں دم آجائے گا ۔ شب و روز ان کی ٹوہ میں رہنا پڑے گا ۔ بعض پولیس کے کارنامے یوں اخباروں میں
نظر آئیں گے ۔ " قاتل مردہ اجسام کو لے فرار ہوتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار" ۔ کبھی اس طرح کی خبریں بھی نظر
ں گی ۔ " پولیس نے یکا یک ایک مشتبہ گھر پر چھاپہ مارا لیکن چند مردہ اعضاء لے کر چمپت ہوگئے سوائے بالوں اور
ناخنوں کے کوئی چیز پولیس کے ہاتھ نہ لگ سکی ۔"

بعض دوکانوں کے اشتہار یوں نظر آئیں گے " ہمارے ہاں امپورٹیڈ اعلیٰ قسم کے تمام اعضاء تیار ہیں "
" آیئے اپنے من پسند اعضاء خریدیئے اور اپنا مرمر ایڈیشن نکالیئے "
کچھ میک اپ کرنے والی کمپنیاں لوگوں کو اس طرح کے مشورے دیا کریں گی
" محترمہ آپ کے لئے جاپانی ناک موزوں رہے گی "
" جناب آپ ترکی ناک حاصل کیجئے " سہیلیوں کی آپسی گفتگو اس قسم کی ہوگی ۔ " ارے تم کبھی اپنی ناک کیوں نہیں
ا لیتیں ۔ جانتی ہو کل میرا ہیرو آیا تھا اس نے مجھے ایک امپورٹیڈ امریکی لیڈی کی ناک تحفتاً لا کر دی ۔ وہ
ر آئی ہوں ۔ "

جب لوگ اس طرح تیز رفتاری سے اپنے اعضاء بدلنے لگیں گے تو پولیس کا دم نکل جائے گا ۔ کرمنلوں کی تعداد میں
اں کا ریکارڈ بھی بے سود ہوگا ۔ فرض کیجئے انسپکٹر صاحب ایک اونچی ناک والے کی کھوج میں ہیں ، اونچی ناک والا

رہا پیش کی دکان سے چپٹی ناک کے علاوہ دوسرے پارٹس لگا کر اکڑتا پھرے گا۔

آنے والے کچھ اس قسم کے اشتہارات بھی اخباروں میں نظر آئیں گے مثلاً :-

ایک ضروری اعلان : کل رات، بس ڈپو کے قریب ایک ہینڈ بیگ دستیاب ہوا ہے جس میں کچھ اعلیٰ قسم کی ناکیں، چند کان اور آنکھیں پائی گئی ہیں — برائے مہربانی جس کسی کے بھی ہوں صحیح نشاندہی فرما کر انھیں حاصل فرمالیں۔

دوسرا اشتہار یوں ہوگا : گمشدہ ناک : مجھ غریب کی مدد کیجئے۔ پرسوں شب ٹرین میں چڑھتے وقت میری ناک یہیں گم ہو گئی ہے۔ برائے مہربانی جس کسی کو وہ مل جائے بذریعہ رجسٹری یا وی پی روانہ فرمادیں۔ تحفتاً انھیں ایک عدد چینی پاؤڈر دیا جائے گا۔

اس مضمون کو ختم کر دینے سے پہلے اس بات کو بھی گوش گزار کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ جب ہم نے اپنے ایک سائنس داں دوست کو سنایا تو وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے "جناب آپ نے کوئی نئی بات نہیں فرمائی۔ وہ گھڑی تو بس آن پہنچی ہے لیکن میں آپ کو اس سے بڑھ کر ایک اور بات بتا دوں کہ سرجری اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ انسانی دماغ کو حیوانوں میں منتقل کیا جائے گا۔ اس اطلاع پر ہمارے ہوش و حواس کے پرخچے اڑ گئے۔ ہم خوفزدہ انداز میں بولے "مثلاً یہ کہ ہاتھی کا جسم ہوگا اور کسی سائنس داں کا دماغ اس میں لگا دیا جائے گا یا اونٹ کا جسم ہوگا اور کسی ڈاکٹر کا دماغ لگا دیا جائے گا۔"

"ہائیں — !" ہم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی ہاں — اسی طرح بیچھو کا جسم ہوگا اور کسی فلسفی یا شاعر کا دماغ لگا دیا جائے گا۔

بس بس ... ! ہم بے تحاشہ وہاں سے یہ کہتے ہوئے بھاگ پڑے " دوڑو کہ زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ ●

پرویز یداللہ مہدی

قسط وار ناول

سولہویں قسط

چہ خوب

اس مرتبہ بے دھڑک کا بپھرا ہوا انداز اس قدر غضبناک تھا کہ طوطا پری خود کو یک دم بے بس محسوس کر رہا تھا۔ تمام حاضرین بھی بشمول عہدیداران پولیس لاچار نظر آ رہے تھے۔ پلک جھپکتے میں بے دھڑک نے طوطا پری کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد بے دھڑک پولیس کے ایک عہدیدار سے مخاطب ہو کر بولا ــــ " نادرہ کی موت اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اسی کمینے کی سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ ہے۔ یہ قاتل ہے خونی ہے۔ اسے گرفتار کر لیجئے۔ اس سنگین الزام کے جواب میں طوطا پری بجائے اس کے کہ اپنی صفائی میں کچھ کہتا بے دھڑک کے ہاتھوں ہونے والی اپنی تذلیل اور درگت کے "شاک" اور شرمندگی کے دائرے میں جھوند اُلجھا نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ کہ بے دھڑک کے نسبتاً چھوٹے مگر موٹے بھدے اور مضبوط ہاتھوں کی کاریگری کا جیتا جاگتا نمونہ بنا تھا بے چارہ طوطا پری لیکن ہم اس عمل پیہم سے گذرے بغیر حیرت کا نمونہ بن گئے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ طوطا پری کے فولادی مکوں سے ہمیں پالا پڑ چکا اور باکسنگ کے میدان میں اس کی مہارت بھی دیکھ چکے تھے۔ اب ایسے ماہر فن کو کسی بھدے شاعر کی "پھسپھسی غزل" کی طرح "پٹا" ہوا دیکھ کر ہمیں اپنی حیرت پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس حیرت کا سبب یہ بات نہیں تھی کہ طوطا پری اتنی آسانی سے پٹ گیا بلکہ حیرت اس پر تھی کہ ایک ایسے شخص کے ہاتھوں پٹ گیا جو کسی زاویے سے اس کا ہم پلہ نہیں تھا۔ تاہم جب اس ناقابل یقین شاک اور ناقابل ہضم واقعہ کا موجودہ حالات کی روشنی میں نفسیاتی تجزیہ کیا تو اپنا تاثر؟ بات کچھ کچھ نظر آنے کا ایک پہلو سامنے آیا کہ ہو سکتا ہے بے دھڑک کے مقتول چوٹیں اور طوطا پری کی [illegible]

سفاکی سے بازی اُٹھائی اور پھر بے دھڑک کے اسی "وقتی جوش" کے پیچھے ایک عرصہ سے اندر ہی اندر آتش فشاں کی طرح اُبلنے والے "غیرت اور حمیت" کے لاوے کی کارفرمائی بھی ... رہی ہوگی۔ ایک انسان کب تک اپنی غیرت اور حمیت پہ رسوائی کے چرکے سہہ سکتا ہے ایک نہ ایک دن یہ لاوا تمام بند توڑ کر اُبل پڑتا ہے اور پھر بڑے بڑے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ بے دھڑک کے سینے میں پنپنے والا آتش فشاں اب تک صرف اس لئے اپنی راہ نہیں بنا سکا کہ مسز چہ خوب کا زندہ وجود اس کی راہ میں چٹان کی طرح حائل تھا جیسے ہی موت کے مضبوط چنگل نے اس چٹان کو راستے سے ہٹا دیا۔ یہ آتش فشاں اسی قوت سے باہر نکلا کہ طوطا پری جیسے فولادی انسان کو بھی خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا ___ اس نفسیاتی تجزیہ کے نتیجے میں ہماری ہمدردیوں کا پلڑہ بے دھڑک کی طرف جھک گیا اور پھر شر پسندی اور فتنہ پردازی کے معاملے میں طوطا پری پہلے ہی ہماری نظر میں معتوب ہو چکا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے "بجری فراق" کے روپ میں اس نے ہمارا کام تمام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا تھا۔ نقلی تلواروں جگہ اصلی تلواریں یقیناً اسی شر پسند نے رکھوائی ہوں گی تا کہ کھیل کھیل میں اس کا پچھلا حساب بھی صاف ہو جائے اور دامن بھی بچا رہے۔ طوطا پری کے خلاف زہر اُگل کر "انسانی فطرت" کے عین مطابق بدلے کی آگ کو ٹھنڈا کرتے۔ پولیس آفیسر نے بے دھڑک کو نارمل کرنے کے لئے ٹھوس لہجے میں کہا: "ایسے اندوہناک حادثات عموماً انسانی دماغ کو ماؤف کر کے جذباتی بنا دیتے ہیں اور جذبات کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن حقائق اور ثبوت کے بغیر کسی کے خلاف قانونی کارروائی کرنا زیادتی ہے ویسے مرحومہ کے اصلی وارث نواب صاحب قبلہ ہیں ___" اتنا کہہ کر پولیس آفیسر نے نواب صاحب کو مخاطب کیا ___ "کیا آپ کو اس سلسلہ میں کسی پر شبہ ہے۔ جواب میں اس سے پہلے کہ قبلہ چہ خوب کچھ کہتے بے دھڑک نے جھلاتے ہوئے لہجے میں مداخلت کی "نواب صاحب کا تعلق" نادرہ کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اب کسی کا کوئی حق اس پر نہیں رہا۔ کوئی اس کا والی وارث نہیں۔ ہاں ایک تعلق اگر کسی سے اب بھی باقی ہے تو وہ میں ہوں صرف میں اور اُسی تعلق کے واسطے سے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اس کے قاتل کو فوراً گرفتار کریں۔" پولیس آفیسر بدستور قبلہ چہ خوب کی طرف دیکھتا رہا اور وہ یوں نظریں چرائے مجرم سے کھڑے تھے جیسے وہی مسز چہ خوب کے قاتل ہوں قبلہ چہ خوب کی اس گُم سُم حالت اور پولیس آفیسر کی بے بسی پر بے دھڑک نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا ___ اسی قہقہہ نے ہمارے ہمارے ذہن میں مسز چہ خوب کے ان قہقہوں کی یاد تازہ کر دی جن کی کرب آمیز کھکھلاہٹ ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیا کرتی تھی ___ بے دھڑک کا یہ قہقہہ بھی کچھ اسی کیفیت کا حامل تھا اور اس کا ردعمل بھی ہم پر کچھ ویسا ہی ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آہستہ آہستہ بے دھڑک کا دماغی توازن بگڑتا جا رہا ہے۔ پولیس آفیسر کی آنکھوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی چمکدار مگر زہریلی آنکھیں گاڑتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولا "کیا آج انصاف اور قانون اس قدر بے بس اور لاچار ہو گئے کہ ایک قاتل کے خلاف ثبوت مانگ بھی رہے ہیں تو قاتل ہی سے ...!" پولیس آفیسر جو ابھی تک بے دھڑک کو ایک طرح سے 'طرح' دے رہا تھا غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے سخت اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا "آپ اپنی حد سے آگے بڑھ رہے ہیں مسٹر، کسی پر جھوٹے الزام لگانے سے پہلے اس کی حیثیت اور عزت و وقار کو ملحوظ رکھئے ___"

حیثیت، عزت، وقار ... " یہ پُر وقار مگر کتابی الفاظ بے دھڑک نے اس قدر حقارت سے دہرائے کہ موقع واردات پر موجود تمام ذی حیثیت سفید پوشوں کے چہرے سیاہی مائل سرخ ہو گئے لیکن بے دھڑک کے لہجے میں حقارت کے ساتھ ایک

لیا کرتا ہے جو ہمیشہ حق کے لئے سوچنے سے حسین جھوٹ کی ایک نہیں چلتی۔ جھوٹ کی مٹھاس کے عادی سچ کی کڑواہٹ کا ایک گھونٹ بھی نہیں سہہ سکتے۔ دستگیر صاحب جیسی چھوٹی سی گول مٹول مضحکہ خیز شخصیت کے آگے سوما گٹی کے بڑے بڑے قد آور جیتے بھی بونے نظر آ رہے تھے ۔۔۔ حتیٰ کہ پولیس آفیسر بھی اپنی وردی اور اس کے وسیع اختیارات کے باوجود بے دھڑک کے آگے یقیناً خود کو بڑا بونا اور چھوٹا محسوس کر رہے تھے ۔۔۔ بے دھڑک نے اس بار پولیس آفیسروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے ہی مخاطب کیا ۔۔ "جب جب بھی قانون اور انصاف کے محافظوں نے قانون کی حیثیت عزت اور وقار کی آڑ لے کر اچھالے ہیں ۔۔ اور مجبوری کا مرثیہ پڑھا ہے، انصاف پسند جیالوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر بھٹکے ہوئے قانون اور انصاف کو دوبارہ سیدھا اور سچا راستہ دکھایا ہے ۔۔" بے دھڑک اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک پولیس آفیسر نے ہمت کر کے اسے ٹوکنے کی کوشش کی۔ "مسٹر آپ بار بار قانون اور انصاف کی توہین کر رہے ہیں اور بغیر کسی ثبوت کے بستی کے نامور اور شریف لوگوں کو قاتل کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں ۔۔۔ یہ ایک قابل تعزیر جرم ہے" پولیس افسر کی اس دھمکی پر بے دھڑک نے پھر ہذیانی قہقہہ لگایا اور بولا "کسی ذی حیثیت سفید پوش کی شان میں ایک آدھ توہین آمیز جملہ کہہ دینا آپ کے قانون کی نظر میں تعزیری جرم؟ دوسروں کی جان لینا، ہنسی کھیل دل لگی تماشہ" اتنا کہہ کر بے دھڑک نے باری باری تمام پولیس افسروں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ "انصاف اور قانون کی نظر میں نہ کوئی باحیثیت ہے نہ کوئی بے حیثیت ۔۔۔" ایک معمر پولیس افسر نے کہا جو دوسرے افسروں کی بہ نسبت حالات کی نزاکت کو قدرے بہتر طور پر بھانپ چکا تھا، پھر نرم لہجے میں مزید بولا "یہ غیر متوقع اور افسوسناک حادثہ آپ کے لئے ایک عظیم سانحہ ایک ناقابل برداشت صدمہ ہے لیکن اس طرح قانون اور انصاف پر کیچڑ اچھالنے سے آپ کے دل و دماغ میں کھلبلی مچانے والے شکوک و شبہات کا حل تو نہیں مل سکتا ۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ حادثہ ایک اتفاقی حادثہ ہو یا ..."
"خودکشی ۔۔۔ زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فرار ۔۔۔" بے دھڑک پولیس افسر کی بات اچک کر بولا اور پھر ایک بھیانک قہقہہ اس کے حلق سے نکلا اور ماحول پر پھیلی ہوئی تناؤ کی کیفیت کو چیر کر فضاؤں میں تحلیل ہو گیا .... "ایک ذمہ دار پولیس افسر کو یہ سانحہ ایک اتفاقی حادثہ یا خودکشی کا ایک معمولی کیس نظر آتا ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں ۔۔ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا ۔۔۔" کلب کے اس گوشے میں موجود ہر متنفس کو گھورتے ہوئے بے دھڑک نے آگے کہا۔ "کسی کو کچھ نظر آئے گا بھی تو کیسے، ان میں سے کوئی بھی تو میری طرح کرب کی اسی بھٹی میں نہیں جلا۔ کسی کا کلیجہ میری طرح نہیں کٹا، کسی کی آنکھ سے میری طرح خون کا آنسو نہیں ٹپکا۔ ۔ ۔

ان میں سے کوئی بھی میری طرح جیتے جی نہیں مرا ۔۔۔" اس کا گلا پہلے ہی رندھا ہوا تھا بات ختم کرتے کرتے اس قدر بھرا گیا کہ تمام تر ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ ایک ایسے معصوم بچے کی طرح نظر آنے لگا جس کی ماں ابھی ابھی مر گئی ہو ۔۔۔ ادھر پولیس افسروں نے آپس میں طے کر لیا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے تک اس کیس کے بارے میں کسی قسم کا اظہار رائے نہ کیا جائے لیکن ہمیں جانے کیوں یہ یقین ہو چلا تھا کہ حادثے کو خودکشی ہی ثابت کر کے اس کیس کی فائل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داخل دفتر کر دیا جائے گا۔

● وہی بات ہوئی جس کا ہمیں پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا۔

قابل ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے مرحوم کی ناگہانی موت "کو قتل از خود کشی" مشکوک "قرار دیتے ہوئے اس کیس کو کلیئہً "خودکشی" کیس ثابت کر کے "پوسٹ مارٹم" شدہ نعش ورثاء کے حوالے کر دی جن کی تعداد صرف دو نفوس پر مشتمل تھی ایک بے دھڑک دوسرے ہم انہیں بے دھڑک کی دوستی حالات کو بھی مشتبہ سمجھ کر اس موقع پر وہ احباب بھی دامن بچائے ہوئے تھے جو "مرحوم" کے اس قیام کے باوجود "مرحوم" کے لئے اب بھی اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے تھے ۔ ایسے احباب سے ہم نے شبو کے ہمراہ فرداً فرداً ملاقات کی اور انہیں کم از کم "مرحوم کے آخری رسوم" کی ادائیگی کے وقت شامل ہونے کے لئے راضی کر لیا ۔ ہمارے اس اقدام کا جیسے ہی بے دھڑک کو علم ہوا وہ بھڑک اٹھا ۔ "یہی تو وہ لوگ ہیں جو اپنے تعیش کی خاطر غربت و افلاس کے صحرا میں کھلے ان پھولوں کو اپنے گلدستۂ رنگین بنانے کے لئے سنہرے خواب دکھا کر سوسائٹی کی مشترکہ ملکیت بننے پر مجبور کر دیتے ہیں پھر یہ پھول مختلف الرسومات کی زینت بنتے ہیں اور جب ان کی تازگی ختم ہو جاتی ہے رنگ اڑ جاتا ہے بو باس کھو دیتے ہیں تو پھر انہیں اتنی آسانی سے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی انسانی وجود نہیں بلکہ راستے کا ایک حقیر پتھر ہوں ۔" بے دھڑک کا استدلال اگرچہ کہ غیر معقول تو نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو پتہ تھا کہ سماج کو نظر انداز کر کے سماج میں نہیں رہا جا سکتا ۔ بعض فیصلے انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور جو اس بڑی عدالت میں فیصل ہوتے ہیں جہاں نہ سرکاری وکیل کی یک طرفہ کارروائی ہوتی ہے نہ وکیل صفائی کی جھوٹی دلیلیں اس بڑی عدالت میں انصاف کی کرسی پر وہ منصف جلوہ افروز ہوتا ہے جس کی نظر میں چھوٹے بڑے ، بلند و پست میں کوئی امتیاز نہیں ۔

اس قسم کی دلیلوں کی مدد سے ہم بے دھڑک کو بڑی حد تک نارمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ نتیجتاً "مرحومہ" کے آخری رسوم کے موقع پر احباب کی قابل لحاظ تعداد جمع ہو سکی لیکن طوطا پری نے شرکت نہیں کی ہو سکتا ہے بے دھڑک کے خوف یا پھر اپنے ضمیر کی ملامت یا احساس جرم نے اس کے پیروں میں بیڑی ڈالدی ہو اگرچہ کہ قانون اور انصاف نے خود مرحومہ کو ہی اقدام کا ذمہ دار قرار دیا تھا لیکن طوطا پری کی عدم شرکت سے اس کے خلاف ابھرنے والے شک کو اور بھی تقویت پہونچائی اس معاملے میں ہم آہستہ آہستہ بے دھڑک کے ہم خیال ہوتے جا رہے تھے ۔ اس میں ایک تو ان دنوں رونما ہونے والے حالات کا دخل تھا دوسرے ہمارے دل میں بھی اس نام نہاد سوسائٹی کے خلاف نفرت کی ایک چنگاری سلگ رہی تھی اور بے دھڑک اس سوسائٹی کا ستایا ہوا تھا ۔ مرحومہ کی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد بے دھڑک ہمارے روکنے کے باوجود اپنے مختصر سے سامان سمیت ایک متوسط درجے کی ہوٹل میں منتقل ہو گیا ۔ اس ناگہانی حادثے کے بعد سے ہم خود کو بے دھڑک کے بہت قریب محسوس کر رہے تھے اور جواباً اس کا رویہ بھی کافی دوستانہ تھا ۔ ہمارے علاوہ اب وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہا تھا ۔ ہم نے ان دو تین دنوں میں اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ناگہانی حادثے کے اصلی ذمہ دار کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانے میں بے دھڑک کا پورا پورا ساتھ دیں گے ۔ چنانچہ اس مصمم ارادے کے بعد سے تنہائی کا ہر پل اس واقعے کے ہر پہلو کا باریک بینی سے جائزہ لینے میں گذرنے لگا ۔ اس سانحے کے وقت موقع واردات پر موجود ان احباب کے نام اور چہرے بار بار یادداشت کی نوٹ بک کی مدد سے ذہن کے اسکرین پر کسی سلائیڈ کی طرح روشن کرتے جن سے مرحومہ کے تعلقات کبھی بھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے ۔ اس تجزیئے کے نتیجے میں ہمیشہ ایک ہی نام اور شکل ذہن کے اسکرین پر واضح ہوتی ۔

خاں فرہادی فرض طوطا پری کی — لیکن اس کے اس خطرناک بلکہ قاتلانہ اقدام کی کوئی محسوس وجہ سمجھ میں نہیں آتی
بت کے معاملے میں قتل و خون عموماً رقابت کے نتیجے میں ہوتے آئے ہیں۔ باوفا محبوبہ کی بے وفائی عاشق کو ایسے اقدام پر مجبور
لہے لیکن محبوبہ اگر پہلے ہی ہرجائی ہو تو پھر رقابت کے جذبے کا اُبھرنا ہی مشکل ہے اگر کسی وجہ سے یہ جذبہ ابھرتا بھی ہے
ادمی اس حد تک کبھی نہیں چاہتا کہ محبوبہ کا قصہ ہی پاک کردے — یہی وہ گتھی تھی جو نہ تو حل ہوتی تھی نہ ہی طوطا پری
خلاف کوئی اقدام اُٹھانے کی ہمت ہوتی تھی — اس طرف سے تھک ہار کر جب دوسری نزدیکی ہستیوں کو اس کسوٹی پر پرکھتے
ہرف تین نام اور شکلیں آنکھوں کے آگے پھرتیں قبلہ جیہ خوب، شبّو اور پھوپھی اماں — جب جب بھی ہم اپنے ذہن
تشکیل کردہ " تحقیقاتی کمیشن " کے سامنے، ان تینوں ہستیوں کو بلا غرض جائزہ پیش کرتے، خود پر کم از کم سو دفعہ لعنت
دہ بھیجتے لیکن اس کے باوجود ذہن سے کسی طرح یہ بات محسوس نہیں ہوتی تھی کہ بعض اوقات شریف النفس بے ضرر قسم کے
، جو عام حالات میں معمولی چیونٹی تک کو گزند نہیں پہنچاتے۔ اپنے 'عزت و ناموس' کی خاطر اس صفائی سے اپنے دامن
کے دھبّوں کو صاف کرتے ہیں کہ بیشہ ور قاتل بھی اپنی جگہ ششدر رہ جاتے ہیں — ہماری اس خود ساختہ دلیل نے
ستہ آہستہ اثر دکھانا شروع کیا اور ہم غیر شعوری طور پر قبلہ جیہ خوب، شبّو اور پھوپھی اماں کو اپنے اختراع کردہ ملزموں کے
رے میں کھڑا کر کے خود ہی ان کی تائید اور مخالفت میں جرح بحث کرنے لگے — قبلہ جیہ خوب ویسے بھی کافی عرصے سے
رنشین قسم کے بزرگ ہو گئے تھے۔ اس ناگہانی حادثے کے بعد سے ان کی یہ گوشہ نشینی، تہہ خانہ نشینی میں تبدیل ہو گئی
۔ اب تو وہ کھانے کی میز پر بھی کم ہی دکھائی دینے لگے تھے۔ اس حادثے کے بعد سے پھوپھی اماں اور شبّو اور ہم یعنی
ں کا تکون ہی اکثر کھانے کی میز پر دکھائی دیتا اور پھر جب سے شبّو اور پھوپھی اماں ہمارے شک و شبہ کے دائرے
ئے تھے ان کے درمیان ہم خود کو دو نوکیلے کانٹوں کے بیچ پھنسی ایک بے بس " مچھلی " کی طرح محسوس کرنے لگے تھے جب
بھی پھوپھی اماں کا سامنا ہوتا ہمیں فوراً ان کے ہاتھوں انجام کو پہنچنے والی ان کی چہیتی بلی " تالا " کی یاد آجاتی، جب ایک
چوپایہ ان کے سفّاک ہاتھوں سے نہ بچ سکا جس کے بارے میں عام طور سے مشہور ہے کہ ایک بلی نو مرتبہ مر کر بھی نہیں مرتی
رہم " دو پائے " بھلا کس شمار قطار میں آسکتے ہیں جنہیں ایک مرتبہ بھی سلیقے سے مرنا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ احساس ہوتے ہی
ہماری " کھٹیا " کھڑی کر دیتا تو اُسے بٹھانے کے لئے ہم گھبرا کر شبّو کی طرف دیکھنے لگتے لیکن یہاں بھی ہماری " کھٹیا " کے
کچھ ہمدردانہ سلوک ہوتا نہیں محسوس ہوتا بلکہ ہماری کھڑی ہوئی " کھٹیا " کچھ اور اوپر اُٹھ کر ہوا میں معلق ہو جاتی اور ہم کسی طرح
ع یا تو نگلے ہوئے نوالے کو کسی طرح دوبارہ حلق تک کھینچ لاتے اور جگالی شروع کر دیتے یا پھر کسی نہ کسی بہانے میز سے اُٹھ جاتے
پھوپھی اماں کے سلسلے میں ہمارا شک آہستہ آہستہ یقین میں بدل رہا تھا، اب شبّو بھی ہماری نظر میں معصوم اور بے گناہ نہیں
تھا، کسی نہ کسی شکل میں پھوپھی اماں کے اس قاتلانہ اقدام میں شبّو کی شرکت نظر آ رہی تھی — [illegible]
کہ [illegible] " [illegible] " [illegible]
[illegible] " ترشے گئی " کے [illegible] ہم [illegible] اچھے [illegible]
اس [illegible] شبّو نے کسی [illegible] " [illegible] ہم پر [illegible]
[illegible]

از عاشق ہرگانوی

پیکرانِ بے سخن

مشہور ادیب ایچ جی ویلس ایک دوست کو لندن میں اپنا مکان دکھا رہے تھے۔ تیسری منزل پر ایک چھوٹے سے کمرے کو دکھاتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ میری خواب گاہ ہے۔"

"لیکن آپ نچلی منزل میں شاندار کمروں کو اپنی خواب گاہ کے لیے کیوں نہیں استعمال کرتے ۔۔۔؟" دوست نے سوال کیا۔

"وہ کمرے میری نوکرانی اور باورچی کے لیے ہیں۔ دونوں پچھلے بیس سال سے میرے ساتھ رہتے آرہے ہیں۔"

"دوسری جگہوں پر تو چھوٹے کمرے نوکروں کو دیئے جاتے ہیں۔" دوست نے کہا۔

"اسی لیے میرے مکان میں ویسا انتظام نہیں ہے۔ میری ماں کبھی لندن میں کسی کے یہاں نوکرانی تھیں۔" ویلس نے بتا دیا۔

(۲)

نوبل انعام یافتہ امریکی ڈرامہ نویس یوجین اونیل ایک بار سمندری سفر کے دوران جہاز میں کپتان کے ایک ڈیک پر پہنچ گئے اور وہاں لگی ہوئی دوربین سے جھانکنے لگے۔ تبھی پیچھے سے آواز آئی "جناب یہ کپتان کا ڈیک ہے۔ یہاں اور کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

اونیل نے پیچھے مڑ کر بڑی سنجیدگی سے کہا: "آپ کو شاید علم نہیں کہ آپ دنیا کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار سے بات کر رہے ہیں۔"

جواب ملا "آپ کی بات صحیح ہو سکتی ہے مسٹر برنارڈ شا، مگر جہاز کے قانون کی بجا آوری آپ پر بھی فرض ہے۔"

(۳)

سمرسٹ ماہم کی کتابوں کی رائلٹی کی کافی بڑی رقم اسپین میں جمع ہو گئی تھی۔ مگر رائلٹی کے پیسے ملک کے باہر نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس لیے سمرسٹ ماہم اسپین پہنچ گئے تاکہ وہیں اس رقم کا مصرف لے سکیں۔ وہ وہاں کے سب سے مہنگے اور مشہور ہوٹل میں ٹھہرے اور کھلے ہاتھوں خرچ شروع کیا۔ جب انہیں محسوس ہوا کہ اب رائلٹی کا زیادہ حصہ خرچ ہو چکا ہے تو اسپین سے روانہ ہونے کی سوچی اور ہوٹل کے منیجر سے بل مانگا۔ منیجر نے جواب دیا۔

"سر آپ جیسا قابل اور مشہور شخص آکر ہمارے ہوٹل میں ٹھہرے، یہ ہمارے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ آپ کے قیام سے ہماری بڑی پبلسٹی ہوئی ہے اس لیے آپ کا بل کچھ بھی نہیں ہے۔"

مشہور جاسوسی ناول نویس اور Perry Mason کے خالق Erle Stanley Gardener نے جب شروع شروع میں لکھنا شروع کیا تو ہر لفظ پر انہیں تین پینی معاوضہ ملتا تھا مگر ان کے ابتدائی ناولوں میں ہر مجرم چھٹی گولی پر ہلاک ہوتا تھا۔ ایک بار ان کے ناشر نے پوچھا "جناب، آپ کا مجرم چھٹی گولی ہی پر کیوں ہلاک ہوتا ہے؟ پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں گولی پر بھی تو ہلاک ہو سکتا ہے۔"

گارڈنر نے جواباً کہا "جناب، اگر میں اپنے مجرم کو پہلی گولی میں ہلاک کر دوں تو پندرہ پینی کا گھاٹا پڑے گا۔ اس لیے میں زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کے لیے اپنے مجرم کو چھٹی گولی میں ہلاک کرتا ہوں۔"

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا خبرنامہ

اردو مطبوعات پر انعامات

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ اردو کی کتابوں پر ایوارڈ دینے کی اسکیم کے تحت آندھرا پردیش سے تعلق رکھنے والے اردو کے.. اہلِ قلم حضرات سے خواہش کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۷ء کے دوران میں یکم جنوری ۱۹۷۷ء سے ۳۱ر ڈسمبر ۱۹۷۷ء تک اشاعت ہونے والی اپنی اردو مطبوعات ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش حیدرآباد کے پتے پر روانہ فرمائیں۔ مختلف اصنافِ ادب اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں نیز معیاری ترجموں کی کتابوں پر انعامات دینے کیلئے غور کیا جائے گا۔ البتہ کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن و درسی کتابیں اور ان کی شرحیں قابلِ قبول نہیں ہوں گی۔

۱۹۷۷ء کے دوران میں چھپنے والی ایسی کتابیں بھی بھیجی جاسکتی ہیں جنہیں ملک کے کسی سرکاری نیم سرکاری یا خانگی ادارے کی جانب سے یکم جنوری ۱۹۷۷ء تا ۳۱ر ڈسمبر ۱۹۷۷ء کے دوران نقد انعام یا ان کی اشاعت کیلئے مالی امداد ملی ہو۔

درخواست کے ساتھ ہر کتاب کے پانچ نسخے روانہ کئے جائیں۔ اکیڈیمی کے دفتر پر کتابوں کی وصولی کی آخری تاریخ ۳۱ر جولائی ۱۹۷۸ء مقرر کی گئی ہے۔

درخواست کے مقررہ فارم اکیڈیمی کے دفتر سے کام کے اوقات میں روزانہ دن کے گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک دست بدست یا بذریعہ ڈاک حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اردو مدارس کے بارے میں معلومات

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کے منظورہ اردو میڈیم کے پرائمری (ابتدائی) اور سکنڈری (ثانوی) خانگی مدارس کے بارے میں اکیڈیمی کو حسبِ ذیل معلومات درکار ہیں۔

اسکول کا نام، اسکول کا محل وقوع، اسکول کی نوعیت، جماعتوں کی تعداد، طلبہ کی تعداد، اساتذہ کی تعداد اور قابلیت، نصابی کتابیں، انتظامی بورڈ اگر ہو تو اس کے ارکان کے نام، پچھلے سال کے سالانہ ... امتحانی جماعتوں کے نتائج اور مالی وسائل وغیرہ۔

اردو اکیڈیمی نے ایسے تمام مدارس کے ہیڈ ماسٹروں ...

ادیا نسے طلبہ اردو کی مقامی انجمنوں یا کل آندھرا پردیش انجمنوں کی مقامی شاخوں کے کارگذار اصحاب اور اردو کے کاز سے دلچسپی رکھنے والے تمام دوسرے متعلقہ یا غیر متعلقہ اصحاب سے خواہش کی جاتی ہے کہ مذکورہ بالا امور سے متعلق تفصیل اعداد و شمار اور ضروری معلومات جلد از جلد بہم پہنچا کر اکیڈیمی کے ساتھ تعاون فرمائیں۔

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش اپنے طور پر بھی اس ضمن میں متحرک اور کوشاں ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ ریاست آندھرا پردیش میں واقع اردو میڈیم کے ابتدائی اور ثانوی مدارس کی حقیقی صورت حال سے واقفیت حاصل کی جائے اور ان کے تعلیمی معیار اور رہائی حالت کے استحکام کی تدابیر پر غور کرنے کے بعد ضروری اقدامات کئے جائیں۔

اس سلسلہ میں تمام خط و کتابت ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی لے سی گارڈ کے پتے پر کی جائے۔

غیر مطبوعہ نگارشات کی طباعت کیلئے امداد

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ آندھرا پردیش سے تعلق رکھنے والے اردو کے اہل قلم اپنے غیر مطبوعہ اردو نگارشات کی طباعت کے لئے اکیڈیمی کی گرانٹ حاصل کرنے کی غرض سے مقررہ فارم پر درخواستیں بھیج سکتے ہیں۔

اکیڈیمی کے دفتر پر درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۱ر اگسٹ مقرر کی گئی ہے۔ درخواست کے مقررہ فارم اکیڈیمی کے دفتر سے بذریعہ ڈاک طلب کئے جا سکتے ہیں یا کام کے دنوں دست بدست حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

کسی بھی صنف ادب یا علوم و فنون کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والی کتاب کا مسودہ روانہ کیا جا سکتا ہے۔ مسودہ کسی

صورت میں ... نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اہل قلم اپنے مسودے کی نقل روانہ فرمائیں۔

درسی کتابوں یا ان کی شرحوں کے مسودے قبول نہیں کئے جائیں گے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات مطلوب ہوں تو ڈاک یا فون نمبر ۳۳۲۸۰۱ کے ذریعہ یا براہ راست اکیڈیمی کے ارباب کار سے ربط پیدا کیا جا سکتا ہے۔

بک ڈپو اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش حیدرآباد

آندھرا پردیش میں اردو اکیڈیمی کے قیام کے کچھ عرصہ بعد اکیڈیمی کے ایک کاروباری شعبے کی حیثیت سے اردو کتابوں کی نکاسی کے لئے ایک عصری بک ڈپو قائم کیا گیا۔ جس کا افتتاح سابق صدر جمہوریہ ہند عالیجناب فخر الدین علی احمد صاحب مرحوم کی اہلیہ بیگم عابدہ احمد کے ہاتھوں ۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو عمل میں آیا۔

ہندوستان کے تمام ناشرین اور کتب فروشوں سے اردو کی منتخب اور معیاری کتابیں فراہم کی گئیں اور یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء سے باقاعدہ بک ڈپو کے کاروبار کا آغاز ہوا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد اور حیدرآباد کی کل ہند نمائش ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں بک ڈپو کے اسٹالز قائم کئے گئے اور بک ڈپو کی ایک تفصیلی فہرست چھپوا کر آندھرا پردیش کے مختلف تعلیمی اداروں کتب خانوں اور کتابوں کے شائقین کو بھیجی گئیں۔ مقامی اخباروں میں بھی بک ڈپو کی تشہیر کی گئی۔

پچھلے ڈھائی سال کی مدت میں اکیڈیمی کے بک ڈپو سے ستر ہزار روپے کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں اس طرح اکیڈیمی کا یہ شعبہ نہ صرف خود مکتفی بلکہ ایک منافع بخش شعبہ بن گیا۔

اس وقت بک ڈپو میں مختلف اصناف ادب اور علوم

فنون پر مشتمل کوئی ایک ہزار عنوانات پر مشتمل دس ہزار سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی گوشے سے شائع ہونے والی اردو کی کوئی کتاب آرڈر دے کر ایک ہفتے کے اندر بکڈپو سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈھائی سال کے اندر اکیڈمی کا یہ شعبہ اردو کتابوں کی نکاسی کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ پاکستان، ایران، سعودی عرب اور مغربی ملکوں سے حیدرآباد آنے والے اردو داں احباب اکیڈمی کے بک ڈپو سے منتخب کتابیں اپنے احباب اور اعزہ کو تحفتاً پیش کرنے کے لئے خرید کر لے جاتے ہیں۔

اس بکڈپو کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو کی معیاری کتابیں رکھی جاتی ہیں اور ان کی نکاسی کی بطور خاص کوشش کی جاتی ہے۔ بیک وقت ایک سو روپے سے زائد کی کتابیں خریدنے والوں نیز کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

کوئی کتاب اگر کسی وجہ سے موجود نہ ہو تو آرڈر دینے پر ایک ہفتے کے اندر فراہم کردی جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ آوٹ آف پرنٹ نہو۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ آندھرا پردیش کی اردو اکیڈمی کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے حال ہی میں اتر پردیش اردو اکیڈمی نے بھی بڑے پیمانے پر ایک بکڈپو قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہندوستان کے ہر شہر میں اردو کی معیاری کتابوں کی فروخت کے ایسے عصری مراکز کا قیام جن کا مقصد محض نفع اندوزی نہو وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

اکیڈمی کے پریس نوٹ میں آندھرا پردیش کے تمام تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کے کارفرماؤں نیز اردو کتابوں کے شائقین سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ اکیڈمی کے بکڈپو سے رجوع ہوں اور بکڈپو کی تازہ ترین فہرست طلب فرمائیں۔

اعجاز عارفی

تیرنگیِ زمانہ

گھاس کے کپڑوں کو دنیا ریشمی کہنے لگی
گھاسلیٹ پر لطف فرمایا تو گھی کہنے لگی
گاؤ تکیے کے کور کو بیل باٹم کا خطاب
پائینچے کے اک شلٹ کو کل کہنے لگی

دودھ اور مکھن

مفلسی کے دن گذر جانے کے بعد
مفلسوں سے پھر بشر ملتا نہیں
دودھ سے مکھن نکل آتا تو ہے
دودھ میں مکھن مگر ملتا نہیں

مرزا ٹھلی

غزل

بلدیہ والوں کی عنایت سے
گندگی گنگنا رہی ہے میاں
چولھا جلتا نہیں کئی دن سے
شاعری رنگ لا رہی ہے میاں
مفلسی میرے گھر سے جاکر بھی
اپنی دستی ہلا رہی ہے میاں
ساری دنیا کو میں دباتا ہوں
مجھکو بیوی دبا رہی ہے میاں
ہوگا انڈوں کے درمیان مرنا
مرغی پھر گڑگڑا رہی ہے میاں

مراسلات

محترم ! 'ابراہیم جلیس نمبر' کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ جلیس صاحب کا جو حیدرآباد سے تعلق تھا اس تعلق کا حق شگوفہ نے ادا کر دیا ہے۔ دُنیائے ادب نہ صرف ابراہیم جلیس پر ہمیشہ فخر کرے گی بلکہ شگوفہ کی بھی مشکور رہوگی۔

شفیقہ فرحت ۔ بھوپال

محترم کمال بھائی ۔ سلام مسنون ! ابراہیم جلیس نمبر بے حد دقیع ' معلوماتی اور شایانِ شان نمبر ہے ۔ یقیناً مرحوم کی رُوح خوش ہوگئی ہوگی ۔ مَیں نے پورا نمبر پڑھ ڈالا ہے ' اس کے بعد آپ کو دلی مبارکباد دے رہا ہوں ۔

مناظر عاشق ہرگانوی

بھائی مصطفےٰ کمال صاحب ۔ سلام وخلوص ! آپ کے حالیہ شماروں کے بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ رسالہ کامیابی کی طرف تیزی سے گامزن ہے ۔ خاص کر 'جلیس نمبر' ابراہیم جلیس مرحوم کی رُوح کے لئے اظہارِ عقیدت کا ایک بہترین عملی نمونہ تھا ۔ شاندار اور بھرپور ۔

ظفر کچلیونوی

بھائی ۔ سلام و نیاز ! شگوفہ برابر مل رہا ہے ' شکریہ ابراہیم جلیس نمبر آپ لوگوں نے شائع کر کے اچھا کیا ' آخر کچھ تو خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہیے تھا ۔ جلیس صاحب کا ایک قول میں نے 'اقوالِ زریں' کے تحت نوٹ کر رکھا ہے جو "تمنا پیج" میں شامل ہے

تمنا مظفر پوری ۔ گیا

محترم ۔ جون کا شمارہ بھی ملا ۔ مجتبیٰ حسین اور ڈاکٹر سید حامد حسین کے انشائیے لاجواب ہیں ۔ باقر مرزا سے کچھ اور لکھوا لیجئے ۔ مضمون کا خاتمہ انہوں نے جلد بازی میں کر دیا ہے ۔

انور انصاری ۔ رانچی

کمال بھائی ۔ جون کا شمارہ دیکھا ' بہت پسند آیا ۔ خصوصاً حصّہ نظم اس بار بہت خوب تھا ۔ کتابت بھی بہت عمدہ تھی ' میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے ۔

پاگل عادل آبادی

محترم ! شگوفہ ایک عرصہ سے میری توجہ کا مرکز ہے اور بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں ۔ عمدہ مضامین اور اچھی سیٹنگ کے علاوہ جو بات میں نے بھانپ لی ' وہ یہ ہے کہ آپ بغیر کسی اثر و رسوخ کے صرف مضمون کے معیار کو دیکھ کر اُسے شائع کرتے ہیں اس طرح نئے لکھنے والوں کے حوصلے بڑھتے ہیں ۔

شکیل اعجاز ۔ اکولہ

محترمی مصطفےٰ کمال صاحب ۔ السلام علیکم
امید کہ مزاج بخیر ہوں گے ۔ کل ہی آپ کا ارسال کردہ شگوفہ (فروری) ملا ۔ پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی خاص طور پر منظر الزماں کا "آہ سوشلزم" خوب ہے گذشتہ مہینے اکتوبر کا شمارہ کو تاخیر سے ملا ' پھر بھی شکر ہے کہ مل گیا ۔ ورنہ ڈاک کی نذر ہو جاتا ۔ شگوفہ پڑھ کر میرے پاکستانی احباب بہت محظوظ ہوئے ۔ خصوصاً دکنی شاعری کا بہت چرچا رہا ۔ اگر کسی طرح شگوفہ کو مستقلاً بھیجنے کا انتظام ہو جائے تو اچھا ہے ۔ کافی عرصہ کے بعد ایک مضمون لکھ رہا ہوں ' مکمل ہوتے ہی بھیج دوں گا ۔ باقی یہاں کے حالات ٹھیک ہیں ۔ فالتو وقت میں وزن کم کرنے کی تدبیریں پڑھتا ہوں مگر عمل کرنا نہیں ہوتا ۔ میری طرف سے مسیح انجم صاحب ' اور لوفر صاحب کی خدمت میں سلام خلوص ' باقی تمام حضرات بشمول حضرت طالب خوندمیری سب کو سلام ۔

ہر ماہ کا ٹائٹل بہت عمدہ [illegible]

[illegible] ۔ مقیم

صنعتی ادارے اور کارخانہ جات

خصوصی توجہ دیں

قانون کارخانہ جات کے دفعہ ۱۱ - جی کے مطابق کارخانوں کے تحت کے علاقوں میں درختوں کا لگانا لازمی ہے

درخت فضائی آلودگی اور
گرمی کی شدت کو کم کرتے ہیں

اس موسم (جولائی - اگست اور ستمبر) میں درخت لگا کر مزدوروں کو خوشگوار سایہ فراہم کیجئے
اور
اپنے علاقوں کو خوبصورت بنائیے
پودوں کی مفت سربراہی اور مشورے کے لیے
درج ذیل دفاتر سے ربط پیدا کیجئے

دونوں شہروں میں

ڈویژنل فارسٹ آفیسر
اکسٹنشن ڈویژن
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴
فون نمبر - ۳۰۵۳۱ (اکسٹنشن ۲۵)

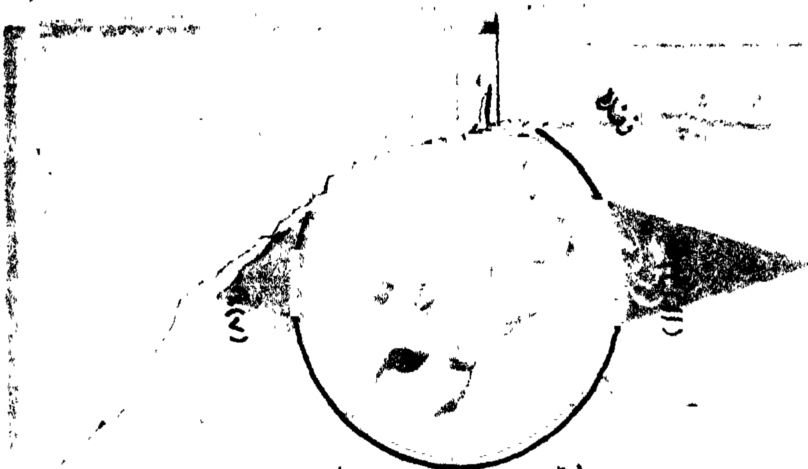
اضلاع میں

ضلع متعلقہ
پر واقع
دفتر ڈویژنل فارسٹ
آفیسر

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

NA 12/78-79.



ایڈیٹر : سیّد مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت

راجندر سنگھ بیدی

خواجہ عبد الغفور

نریندر لوتھر

بھارت چند کھنہ

مجتبیٰ حسین

مجلس ادارت

★

منظور احمد

حمایت اللہ

مسیح انجم

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ ۵۰ پیسے

سالانہ ـــ ۲۰ ـــ روپے

غیر ممالک سے ۳۵ شلنگ

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۲...۵ (اے پی)
بائنڈنگ : محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو عبادت خانہ حسینی، پرانی حویلی، حیدرآباد ۲

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۱۳۱ر مجرد گاہ، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۱
فون: 57716

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے

شگوفہ کے دس سال کی تکمیل پر

یادگار خصوصی اشاعت

ڈرامہ نمبر

اکتوبر ۷۸ء میں شائع ہوگا

مہمان مدیر

ساگر سرحدی مشہور ڈرامہ نگار و فلم اسکرین پلے رائٹر و مکالمہ نویس

- اُردو کے مزاحیہ ڈرامے
- مرہٹی، تلگو، گجراتی، کنڑی، بنگلہ اور انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں کے شاہکار ڈراموں کے تراجم اور کئی دوسری دلچسپیاں

۴۰۰ سے زائد صفحات ○ خوبصورت رنگا رنگ ڈسٹ کور کے ساتھ

قیمت: (۱۲) روپے ؛ مجلد (۱۵) روپے

سالانہ خریداروں کو یہ خصوصی نمبر ریکارڈڈ ڈلیوری کے ذریعہ دس روپے میں ارسال کیا جائے گا

مشتہرین حضرات اور سالانہ خریداروں سے درخواست ہے کہ قبل از وقت اپنے آرڈر بک کرالیں

مشتاق احمد یوسفی

ناٹک

بے در و دیوار ناٹک گھر بنایا چاہئیے

صحیح نام اور پتہ بتانے سے ہم قاصر ہیں، اس لیئے کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ سردست اتنا اشارہ کافی رہگا کہ اس تھیٹر کو اداکاروں کی ایک کوآپریٹیو سوسائٹی نقصان باہمی کی بنیاد پر چلا رہی تھی۔ پہلی تاریخ کو بڑی پابندی سے مہینے بھر کا خسارہ تمام ممبران کو بحصہ مساوی بانٹ دیا جاتا تھا۔ صرف ٹکٹ گھر پختہ تھا کہ اس پر کھیل کے بعد اکثر حملے ہوتے رہتے تھے۔ ہال کی دیواریں اور چھت ٹاٹ کی تھیں، جن میں خلاف محاورہ پیوند بھی ٹاٹ ہی کے لگے تھے۔ چھت تھرمی کیلنڈر کا کام دیتی تھی۔ ٹاٹ کی دیواروں میں بھی جا بجا سر کے برابر سوراخ ہو گئے تھے۔ کھیل کے شروع میں ان میں سر گھسا کر باہر والے اندر کا تماشہ دیکھتے، آخر میں اندر والے گردن نکال کر باہر کی رونق دیکھ لیتے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ پونے نو آنے کا ہوتا تھا۔ اس میں صوفوں کا تکلف تھا جن کے فولادی اسپرنگ لباسِ مجاز پھاڑ کر چھ چھ انچ باہر نکل آئے تھے۔ انھیں رانوں کے بیچ میں لے کر بیٹھنا پڑتا تھا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ چھ آنے کا تھا۔ اس میں سرکنڈوں اور لوہے کے پتریوں کے مونڈھے، مونجھ کی پیڑھیاں اور چینیوٹی کھٹولیاں پڑی تھیں۔ تیسرے درجے میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ فرشی سے ہماری مراد فرشِ خاکی ہے۔ اس کلاس میں جو ناظرین بالکل زیادہ نک چڑھے واقع ہوئے تھے۔ وہ گھر سے انگوچھے کے کونے میں ریزگاری باندھ کر لاتے کسی گانے یا ناز و ادا پر طبیعت بہت بے قابو ہو جاتی تو نیفے سے نکال کر گوپھن کی طرح گھماتے اور اسٹیج پر فادک انگوچھے برساتے۔ چند ادھاری ناظرین نے کٹے پاؤں کی پیڑھیاں ڈال رکھی تھیں جن پر بیٹھ کر وہ مہینے بھر مزے سے مونگ پھلیاں اور پیچھے بیٹھنے والوں کی گالیاں کھاتے رہتے تھے۔ معاملہ ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ پیچھے بیٹھنے والوں کی سہولت کے لئے ہال میں "نشستی" ڈھلوان اس طرح پیدا کیا گیا تھا کہ اگلے اسٹیج سے ملحق حصے میں دو ڈھائی فٹ گہری زمین کھود کر ایک اکھاڑا سا بنا دیا گیا تھا۔ اس میں فرسٹ کلاس والے خاک پھانکتے اور سکنڈ کلاس والے ٹیلوں پر تھے۔ اکھاڑے کے دائیں بائیں منڈیر پر "تیلیئے" پیر لٹکائے بیٹھے رہتے تھے۔ اسے گیلری کہہ لیجئے۔ آرکسٹرا اور فرسٹ کلاس کے بیچ میں ہم نے ہمیشہ ایک پھاوڑا پڑا دیکھا۔ اور کبھی کبھار یہ بھی دیکھا کہ پیچھے بیٹھنے والے کسی "ناظرین بانکپن" تماشائی کے لئے ہمیشہ ...

کا استعمال ہوتا تھا کہ کسی دوسرے "ناظرین" کی ٹوپی یا کلف دار طرہ نظر آنے لگے تو وہ انٹرول میں خود پھاوڑے سے ایک دو بالشت گہرا کھود کر سرکش صوفے کو شمع سرپُر غرور زمین میں دھنسا دیتا تھا۔ اسی آلے کے پاس ایک آدھ کھڈی قبر میں منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کھٹیا پڑی رہتی تھی۔ ان کا صرف چہرہ اور ململ کی چوگوشیہ ٹوپی بمشکل نظر آتی تھی۔

مصوّرِ درد منشی ریاضت علی سوختہ

یہ بزرگ جو ستر کے پیٹے میں ہوں گے، اسی کھٹیا پر گاؤ تکیہ لگائے صاحبِ فراش رہتے تھے۔ ایک پاؤں قبر میں، دوسرا اسٹیج پر۔ سید میدہ رنگ جو جوانی میں ہی نہیں، اب بھی شہابی تھا۔ تیکھے تیکھے نقوش۔ غلافی آنکھیں بے شکن پیشانی۔ انھیں اس بڑھاپے میں بھی حسین کہا جاسکتا تھا۔ بر میں سپید ململ کا چُنا ہوا کُرتا۔ کُرتے پر کشیدے سے کڑھے ہوئے چنبیلی کے سپید پھول۔ پھولوں میں تازہ پان رنگ بھرا ہوا۔ پھنسا پھنسا چوڑی دار پاجامہ۔ ڈھال ڈھال سے رہتے تھے۔ پاجامے کے علاوہ کسی چیز میں چُستی نہیں پائی جاتی تھی پہننے کے بعد پائنچے کس کے سیتے تھے) سرخ ریشمی ازار بند میں ٹرنک کی چابی جھولتی رہتی۔ ازار بند بھی اتنا چھوٹا کہ اکڑوں بیٹھنا کا لاکھولنے سے پہلے خود اُسے کھونا پڑتا تھا۔ گرمیوں میں ہلالی عینک کی چاندی کی کمانیاں جلنے لگتیں تو ان پر سائیکل کا VALVE TUBE چڑھا لیتے تھے۔ تھیٹر کے رسیا تھے۔ چالیس برس پہلے انھوں نے موجودہ ہیروئن کی نانی کو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے اسٹیج پر پہلے پہل لکھنؤ میں دیکھا تو ظروں کی ٹھال (جسے وہ ہمیشہ بزمِ سوختگی کہتے تھے) کو ٹھکانے لگا کے، ایک مونڈھا منڈپ میں ڈال گئے۔ جیسے بیتی۔ وہ مہ جبیں تو ایک مدت ہوئی اس بزم سے اُٹھ گئی، مگر یہ یہیں کے ہو رہے کہ آسودگی کی جان اسی انجمن میں تھی۔ اس بی بی کے لب و رخسار اور آنکھوں کے گلابی ڈوروں کو یاد کر کے تو ہمیشہ آبدیدہ ہو ہی جاتے تھے لیکن آخر آخر میں اتنے رقیق القلب ہو گئے کہ اپنے محبوبہ کے گلابی نسوں والے پان کی بھی یاد آجاتی تو گلا رُندھ جاتا جیسے کسی حسبِ حال شعر سے صاف کرتے۔ تھیٹریکل کمپنی نے انھیں روئی کپڑے پر اداکاروں کا شین قاف درست کرنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ پہلی تاریخ کو سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار گھاٹا ان کے نام کھاتے میں درج کر کے بھرپائی کے دستخط لے لئے جاتے تھے۔ یہ منشی دل کے مکالموں میں جہاں تہاں سوز و گداز کے پیوند لگاتے جو بسا اوقات اصل سے بھی بڑے ہوتے تھے۔ مصوّرِ درد کہلاتے تھے۔ ہمارے سر میں بھی ان کے مکالموں سے کئی دفعہ وہ ہوا جس کے یہ مصوّر کہلاتے جاتے تھے۔ کسی سین میں کوئی بول، بھاؤ یا اپنا ہی کوئی پیوندی فقرہ پسند آجاتا تو اُچھل پڑتے۔ گویا بجلی کا شاک لگا ہو۔ دو زانو ہو کر اپنی اعضاء کو زور زور سے پیٹتے۔ کمالِ فن کے اعتراف میں اپنے دونوں کان پکڑتے اور زبان کو باہر نکال کر مصنوعی دانتوں تلے دبا لیتے۔ گردن دائیں بائیں ہلا کر زبان نکالے نکالے گونگی داد دیتے۔ آخر کے تین چار سین جب ناظرین کی نگاہیں اسٹیج سے ہٹ کر ان پر مرکوز ہو جاتیں تو ککڑی پر ایک روپے کا نوٹ لپیٹ کر اسٹیج پر پھینک دیتے۔ ان کی دیکھا دیکھی تماشائی بھی سامنے کے دانت والی ہیروئن پر نوٹوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ ایک دن کسی نے ہمیں بتایا کہ تھیٹر والے انھیں سوا پانچ روپے یومیہ دیتے ہیں جن میں ان کے پھینکے ہوئے پانچ روپے بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس تھیٹر میں کوئی کسی کا آقا یا ملازم نہیں تھا۔ سب مل جُل کر کام بگاڑتے اور ایک دوسرے کے سر درد اور مسائل میں اضافہ

کرتے رہتے تھے۔ مکالمے تو بالعموم منشی دل کے جوڑتے تھے، لیکن ناظرین کی اکثریت اور ہال کے ماحول کے پیشِ نظر اداکار بھی ان میں فی البدیہہ تضمین اور گنگا اضافہ کرتے رہتے تھے مثلاً کسی دن ہال میں پٹھان ناظرین کی اکثریت ہو تو سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کے منظر میں سر سے کفن باندھ کے گھمسان کا خٹک رقص ہوتا۔ ورنہ ہم جیسوں کو تو کتھک ناچ پر ہی ٹرخا دیا جاتا تھا اور اگر کسی دن فرسٹ کلاس میں کوئی بڑا کاٹھیاواڑی سیٹھ نظر آجائے تو ماسٹر عنّاد یعنی فرہاد، اپنا گنڈاسا یعنی تیشہ، کوہ بے ستون کے دامن میں پھینک دیتا اور گجراتی مناجات کے ذریعے غیبی طاقتوں سے فوری تعاون اور ہنگامی امداد طلب کرتا۔

سیٹ ڈیزائن

سیٹ اور پردے بھی سب کی اصلاح و مشورے سے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ سینری کے ہر رنگ سے مشورہ ٹپکتا تھا۔ ایک پردے پر گاؤں کا روح پرور منظر کچھ اس طرح دکھایا گیا تھا کہ ایک البیلی مٹیار آرزو اور تہذیب، دونوں سے کمتر لاچا باندھے، سر پر ایک پیپنی رنگ کا گول مٹکا رکھے، بالکل اسی رنگ اور سائز کے دو کو لھے مٹکاتی پنگھٹ جا رہی ہے، جہاں حضرت امیر خسرو کے حلیے کے ایک بزرگ بغل میں ننگی تلوار دابے اوک سے پانی پلا رہے ہیں۔ سارا ڈول خالی ہوگیا مگر نظریں کہہ رہی ہیں کہ "گوری! پردیسی کی پیاس نہیں بجھی اور!" دور پس منظر میں گاؤں کے جوہڑ میں ایک اسٹیمر کھڑا ہے جس کی چمنی کے دھوئیں سے آسمان پر "اللہ" رقم ہوگیا ہے۔ سامنے کھلیا گھاس پر ایک سبز رنگ کی گائے چر رہی ہے۔ کونے میں گملا رکھا ہے جس میں گلاب کے پھول میں چنار کے پتے لگے ہیں دائیں جانب ایک کتا دُم سے سوالیہ نشان بنائے کھڑا ہے۔ کھیل کے آخری سین سے پہلے منیجر ہٰذا اسٹیج کے کنارے پر کھڑے ہوکر اعلان کرتا کہ پبلک کے پُرزور اصرار پر اور "کومپنی کی مشہوری کے لئے" کل بھی یہی کھیل نئی سین سینری کے ساتھ دکھلایا جائے گا۔ سین میں نیاپن اس طرح پیدا کیا جاتا تھا کہ انہی پردوں کی ترتیب اُلٹ دی جاتی تھی۔ مثلاً اسٹیج پر گھمسان کی لڑائی میں کسی کا دم واپسیں ہوتا ہے تو پیچھے پنگھٹ والے پردے پر دو چھپٹی پر لٹکے مٹک رہے ہیں ۔۔۔ پوچھ رہا ہے "کون سی چال ہے یہ آگ لگاتے نہ چلو" ایسے میں آنکھوں کا جو ہم نکلے تو کیوں کر نکلے۔

نکاح رُو برُو، باادب، باملاحظہ

ہر کھیل میں غزلیں داغ دہلوی اور نعتیں امیر مینائی کی گائی جاتی تھیں۔ غالب، اقبال، حسرت موہانی اور فیض کے وجود کی کمپنی ہٰذا کو ہنوز اطلاع نہیں ملی تھی۔ داغ کا سکہ جس مزید چلتا تھا مگر کھوٹا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس صدی کی تیسری دہائی تک تو یہ حال تھا کہ اگر داغ کے کلام کے مجموعوں کی تمام کاپیاں تلف ہو جائیں تو طوائفیں پوری کلیات املا کرا سکتی تھیں۔ جو غزل پڑھتے تھے ایک ہفتے میں سینہ بہ سینہ یعنی صحیفہ بہ صحیفہ، اور سلسلے دلّی و لکھنؤ و رامپور تک پہنچ جاتی تھی (آج کل کی طرح اس زمانے میں ریڈیو اور ٹی وی تو تھے نہیں۔ لہٰذا شعر و شاعری سے بیزار کرانے کا کام صرف قوالوں اور طوائفوں ہی کو انجام دینا پڑتا تھا) داغ کے الفاظ میں سارے جہاں، یعنی ہندوستان، میں ان کی زبان کی دھوم تھی۔ چنانچہ اس تھیٹر میں اکبر کے دربار میں، فیضی کی موجودگی میں بھی، تان سین داغ ہی کی غزل الاپتا تھا۔ قرائن سے تو یہی لگتا تھا کہ اکبر دربار کا ڈھونگ رچا ہی اس لیے غزل سننے کے

ہو جاتا تھا۔ کیا شوکت و دبدبہ تھا اس دربار کا! جب طرحدار کنیزوں، چوب بردار جسولنیوں، قلماقنیوں، اور وہ بیگنیوں اور راجستانی پاتروں کی دو رویہ قطار سے مغل اعظم کا فرضی کاغذی سونگھتے ہوئے نزول اجلال فرماتے تو ایک جاہل نقیب چوب نقرئی زمین پر ٹھونک کر صدا دیتا:

"نکارج روبرو! با ادب، با ملاحظہ ہوشیار!"

سارے اسٹیج کی لکڑیاں اور لڑکیاں لرز اٹھتیں۔ خدا جانے اس میں اس کے تلفظ و نیت کا خلل تھا یا ہمارے اپنے حسن سماعت کا خلل۔ نکارج کی شرعی دھمکی کے علاوہ "ہوشیار"! بھی اس گھن گرج سے ادا کرتا جیسے اندھیری راتوں کو چوکیدار سیٹی بجا بجا کر چوروں اور نقب زنوں کو خلق خدا سے ہوشیار خبردار کرتے ہیں۔

اس زمانے میں ہال میں سگریٹ بیڑی پینے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ البتہ اسٹیج کے دائیں چوبی ستون یعنی بلّی پہ ایک نوٹس آویزاں تھا "شراب پی کر ڈنڈ مچانا، دنگا کرنا منع ہے۔" حالات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ناظرین نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ بغیر شراب پیے، دنگا فساد کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔

"وَنس مور!"

یہ ہمیں مرزا عبدالودود بیگ ہی نے بتایا کہ اسٹیج کے پہلے پردے کے اوپر جو جھالر ہوتی ہے اس کی اوٹ میں خالی مٹکوں کی ایک قطار تھی جن کے پیندے ناظرین کی طرف اور منہ ایکٹر کی طرف۔ مقصد ان کا ایکٹر کی آواز میں گونج اور گرج پیدا کرنا تھا۔ یہ مائیکروفون کا نعم البدل تھے۔ مرزا ہی سے مروی ہے کہ ان کی موجودگی کا انھیں اس وقت علم ہوا جب ایک گھڑا سہراب کے سر پر عین اس وقت گرا جب وہ ناخلف اپنے باپ رستم سے ہاتھ چلا چلا کر نہایت مقفیٰ و مسجع اردو میں گستاخانہ گفتگو کر رہا تھا۔ پردہ کھینچنے کے فرائض خود منیجر کمپنی بزا سیاہ "بو" لگائے اپنے دست خاص سے انجام دیتے تھے۔ وہ نگ میں دوہرے ہو کر اس طرح کھینچتے تھے جیسے گہرے کنوئیں کے ڈول کو پنہاری۔ پردہ گرانے میں بھی بعض اوقات اتنی دیر لگتی کہ اسٹیج پر پڑی ہوئی فنا شدہ تصلین (لہو رنگ جو چند منٹ میں اڑ جاتا ہے) کے خون میں لت پت لاش میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ شائقین کو موت یا قتل کا کوئی سین بطور خاص پسند آتا اور "ونس مور! ونس مور!" کی صدائیں آتیں تو اُسے بار بار دکھایا جاتا۔ مقتول اُٹھ اُٹھ کر حیدر آبادی انداز سے ہاتھ کا اوک بنائے سب کو آداب تسلیمات بجا لاتا اور پھر انتقال فرما کے دکھاتا۔ دیکھنے والے بالعموم ٹریجڈی پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بعض ڈرامے ہی ایسے ہوتے تھے جن میں اصل مجرم یعنی مصنف کے علاوہ سب قتل کر دیئے جاتے تھے۔ ہر کردار کو چُن چُن کر کیفر کردار کو پہنچا دیا جاتا۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے پردے کے پیچھے سے کوئی صاحب گھڑے میں منہ ڈال کر گرجدار آواز میں لاکھ بُرا چاہنے والے عدو کو مطلع کرتے:

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

لیکن اگر اس سے ان کی مراد وہ تھی، جو کچھ اسٹیج پہ ہوتا تھا تو اس کی منظوری کا الزام خدا پہ رکھنا، منشی رحمت علی سوختہ سندیلوی کی صریحاً حق تلفی ہوگی۔ (باقی آئندہ)

رفعت نقوی دہلی

میرے چمچو!

میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر
ناؤ منجدھار میں جیسے ہی ہوئی زیر وزبر
جیسے ہی عام ہوئی میری ہزیمت کی خبر
دفعتاً بھاگ گئے چھوڑ کے تم مجھ کو کدھر
میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر

صبح سے چلتی رہی ووٹ شماری جب تک
ساکھ گھٹتی نظر آئی نہ ہماری جب تک
میرا پلّہ نظر آتا رہا بھاری جب تک
تم مرے چاروں طرف آتے رہے صاف نظر
میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر

اور جب پانسہ پلٹنے لگا خوابوں کا مرے
مثلِ کہرے کے مرے گرد سے تم چھٹنے لگے
دیکھتے دیکھتے ہی بھیڑ میں تحلیل ہوئے
آنکھیں مل مل کے بہتیں ڈھونڈا ادھر اور اُدھر
میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر

ہار تو ہار، ہوئی ضبط ضمانت کی رقم
دفعتاً ٹوٹ گیا میری سیاست کا بھرم
اس بُرے وقت میں تم بھاگ گئے اُلٹے قدم
اس نئے زخم سے کچھ اور بڑھا زخمِ جگر
میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر

مجھے کچھ شکوۂ بے مہریِ اغیار نہیں
وہ مرے یار نہیں میرے نمک خوار نہیں
ہمنوا ہو کوئی دشمن کا تو غدار نہیں
تم سے شکوہ ہے، کیا پاسِ نمک کا نہ مگر
میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر

وہ کیا تم نے جو کرتا ہے کوئی ہرجائی
یہ طوائف صفتی تم میں کہاں سے آئی
طوطا چشمی کی بھی حد ہوتی ہے میرے بھائی
تعزیت کے لئے بھی آئے نہ تم سب مرے گھر
میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر

میری قسمت میں تو اب ذلت و رسوائی ہے
وضعداری بھی کوئی چیز مگر، بھائی ہے
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
جانے کس قاب میں تم ڈال کے اب بیٹھے ہو سر
میرے چمچو! مرے دیرینہ رفیقانِ سفر

نجیب واصف

قصہ بیوی کی ایک فرمائش کا

یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد کا دل پہلے محبوبہ کے قبضے میں جاتا ہے اور پھر شادی کے بعد بیچارہ مرد اس دلِ شکستہ
بڑی احتیاط کے ساتھ بیوی کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر بیوی اپنے "دلِ خواہش زدہ اور شوہر کے دلِ شکستہ" کو ملا کر ایک
ا مرکب بناتی ہے اور پھر اس سے ایسی ایسی خواہشات پیدا کرتی ہے کہ بیچارہ شوہر اپنی جی جان کی بازی لگا کر بھی ان کو پورا نہیں کر سکتا
ایک حقیقت ہے کہ طبقۂ اناث کے عادات و اطوار اکثر ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہماری بیوی نے بھی ایک دن عورت ہونے کا ثبوت
ں طرح دیا کہ صبح جب وہ اخبار اٹھائیں تو بیرونی و اندرونی خبریں یا "آج کے نرخ" جیسے اہم کالم چھوڑ کر سیدھے ایک ریڈیو کے
شتہار پر نظریں گاڑ دیں۔ ساری تفصیلات پڑھنے کے بعد ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہماری جانب متوجہ ہوئیں۔ ہم کچھ حیرت، کچھ
وشی اور کبھی بدگمانی کے نمایاں تصورات کے ساتھ انھیں گھورنے لگے۔ پھر ہم نے اپنے دماغ سے پوچھا کہ آج تاریخ کیا ہے؟
ماغ نے اداس لہجے میں جواب دیا کہ آج سے مہینے کا آخری دہا شروع ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور سوچتے بیگم صاحبہ
ی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"گھورتے کیا ہو؟"

"گھور کہاں رہا ہوں، پوچھتا ہوں کہ کیا بات ہے؟" ہم نے بڑے فدویانہ انداز میں جواب دیا۔

حکم ہوا کہ ہم بھی ایک ریڈیو خرید لیں گے اور وہ بھی اسی مہینے کی پہلی تاریخ کو۔"

دفتر میں افسروں کے باس از بسکہ ہم کچھ اس قدر مانوس ہوگئے تھے کہ ہر حکم کے آگے "جی ہاں" یا "یس سر" کہہ دینا
ہماری فطرت ثانیہ بن گیا تھا لیکن افسروں کے حکم کو تو ہم کبھی کبھار ٹال بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن بیوی کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ
ممکن نہیں تھا۔ یہاں تو جب ضد پہ بات آجاتی ہے، کرو یا مرو کا معاملہ درپیش ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ہم نے ہمت کر کے کچھ موجودہ
معاشی مسائل پیش کیے۔ بیگم نے بحث کے اس پہلو کو بہانہ تراشی کا نام دیا اور جب بات کچھ اور بڑھی تو برہم ہو کر کہنے لگیں اس

ماہ کی پہلی تاریخ کو آپ گھر آئیں گے تو ریڈیو کے ساتھ ہی ورنہ ......!

ہمیں اپنے شوہر ہونے پہ افسوس ہوا سوچنے لگے کاش ہم خود ہی ریڈیو ہوتے طوہاً وکرہاً ہم نے "یس سر" کہدیا اور سوچنے لگے کہ نیا نہ سہی کم از کم ایک SECOND HAND (سکنڈ ہینڈ) ریڈیو کا بندوبست کرنا ہی ہوگا۔

ہماری ایک ہفتے کی بے لوث محنت رنگ لاکر ہی رہی۔ صبح جب آفس پہنچے تو ایک صاحب نے اطلاع دی کہ کہیں اک پرانا ریڈیو بکنے والا ہے؟ ہم نے فوراً ربطہ پیدا کیا اور بات پکی کرلی۔

پہلی تاریخ کو بڑے فاتحانہ انداز میں ایک بھاری ریڈیو بلحاظ سائز (SIZE) لے کر گھر پہنچے۔ بیگم نے بڑی خندہ مزاجی سے ریڈیو کے طفیل میں ہمارا سواگت کیا۔ حکم ہوا کہ اسے میز پہ رکھ کر فوراً چالو کر دیا جائے تاکہ اڑوس پڑوس والوں کو اس طرح فوراً وارننگ مل جائے کہ ہمارے ہاں بھی ریڈیو آگیا ہے۔ لیکن شاید ہمارے ہاتھ میں وہ لکیر ہی نہیں تھی جس سے ہم بیوی کو زیادہ دیر خوش دیکھ سکیں۔ جیسے ہی ہم نے ریڈیو آن کیا ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ریڈیو اسٹیشن کے بجائے ہوائی اسٹیشن سے جا ملا ہے ہم نے چاروں طرف سوئی گھمائی ہر طرف سے چیخ و پکار، رونے بلبلانے کی آوازیں اور کہیں کہیں تو بلیوں کے لڑنے کی آوازیں ہی اُٹھ رہی تھیں ہم نے کافی دیر اس کمبخت ریڈیو کے پیچھے سر کھپایا اور پھر دوسرے دن کی زور آزمائی کے ارادے سے اسے آف کر دیا۔ صبح جب ریڈیو پھر سے آن کیا تو وہی آوازیں بدستور ہماری سماعت پہ گراں تھیں۔

کچھ دیر بعد ہم نے اسی شور و ہنگامے میں ایک زور دار دستک سنی۔ فوراً باہر دوڑے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے پڑوسی کچھ مغموم چہرہ لئے دروازے پر کھڑے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کی گردن کچھ اور خم ہوگئی اور بڑے ہی غم زدہ لہجے میں کہنے لگے " کل رات سے مسلسل آپ کے گھر سے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ خیر تو ہے ؟" ہم حیرانی سے ان کا منہ تکنے لگے۔ انھوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا " دیکھئے صاحب اللہ پاک جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ انسان کی بھلائی کے لئے ہوتا ہے وہ ہر چیز کے بہتر جاننے والے ہیں ان کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور الفاظ عنایت کرتے ہم نے ان کی غلط فہمی دور کر دی اور پھر اندر جاکر اپنی کوشش میں جٹ گئے لیکن کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ ریڈیو کے ڈائیل سے جو روشنی امید کی کرن کی طرح پھوٹ رہی تھی وہ بھی اب باقی نہ رہی تھی۔ وہ آوازیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ ہم نے سوچا شاید کوئی تار نکل گیا ہے اس لئے روشنی نہیں آرہی ہے۔ ہم نے فوراً اُسے کھولنا شروع کیا۔ جیسے ہی اس کا پچھلا کور کھولا، کئی چھوٹے بڑے چوہے نکل کر بھاگنے لگے اور پھر بھاگ بھاگ کر سارے کمرے میں پھیل گئے۔ ہماری بیوی کی آرزوؤں کی طرح بے شمار ـــــ بے ترتیب ! ہم نے نظریں اوپر کیں۔ بیوی نے ہماری طرف گھور کر دیکھا تو ہم ایک بڑے چوہے کے پیچھے بھاگتے بھاگتے گھر سے نکل گئے۔

سالانہ خریدار اور کتابیں خریدنے کے خواہشمند منی آرڈر ارسال نہ کریں تو وی پی کی صورت میں پیکنگ کا خرچ ادارہ برداشت نہیں کرے گا۔

15 اگست

خوشیوں کا دن ——— قربانیوں اور صبر کے امتحان کا دن

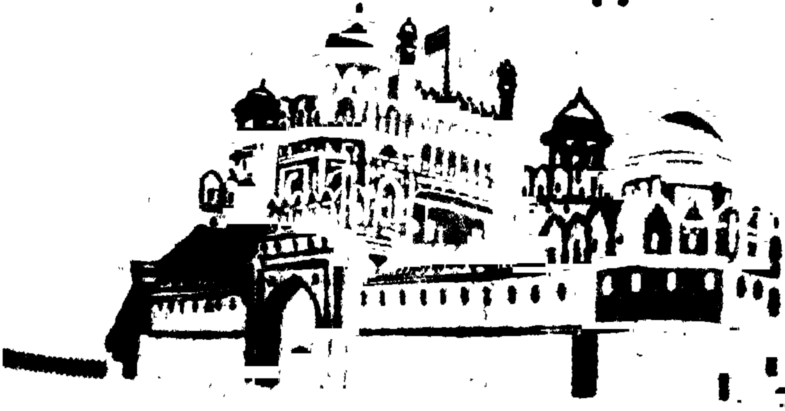
آج کے دن ہم یاد کرتے ہیں:

— باپو گاندھی کی قیادت میں آزادی کی تحریک کو
— جن لوگوں نے آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں
— آزادی کے بعد ہم نے جو اقتصادی ترقی کی ہے

آج ہم عہد کرتے ہیں:

— ہم ملک کی یکجہتی اور قومی اتحاد کو مضبوط کریں گے
— ہم ہر 5 سے 76 سال تک کے بچوں کو تعلیم دلائیں گے اور صحت، تعلیم اور ترقی کے کاموں میں مدد کریں گے
— ہم سماج کے کمزور طبقوں کو اپنے ساتھ برابر کا حصہ دار بنا کر سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر آگے بڑھیں گے

آزادی کی اس چھبیسویں سالگرہ پر آئیے ہم عہد کریں کہ ہم مہاتما گاندھی کے سپنوں کا بھارت تعمیر کریں گے ——— آئیے ہم ہر آنکھ سے آنسو پونچھنے کی کوشش کریں۔



کے. ہنکٹ وٹھل راؤ
ایم. ایس سی

امتحان

حاملہ ہونے کے بعد زچگی کا ہونا ضروری ہے۔ بچہ ہوگا یا بچی ایک انتظار کی گھڑی ہوتی ہے خاوند کے واسطے۔ لیکن بیوی کے واسطے کا امتحان ہوتا ہے۔ نبض، خون کا دباؤ، دل کی دھڑکن، خون میں شکر کا تناسب، دماغ کا توازن کیا نہیں ہر چیز جسم کی ٹھیک رہے تو ت مند بچہ تولد ہوتا ہے۔ سیزرین بھی ہو تو حیرت کی بات نہیں وہ امتحان کی گھڑی امید کی کرن ہوتی ہے جو پھوٹ پڑتی ہے۔ فوراً مٹھائی بانٹی ہے۔ فاتحہ بھی دیتے ہیں۔ درگاہ، مزار پر پھول چڑھاتے ہیں۔ مندر، گرجا میں گھنٹیاں بجتی ہیں۔ مسجد میں دعا کرتے ہیں۔ نام رکھنے کا وقت آتا ہے کے لئے گویا امتحان کا وقت ہے۔ رقعے بانٹے جاتے ہیں۔ تار دیئے جاتے ہیں۔ بلاوے کے لئے لمبا سفر بھی کر لیتے ہیں۔ دور دراز سے دوست ب بھی چلے آتے ہیں۔ اچھے پکوانوں کی کمی نہیں۔ کئی قسم کے تبصرے کرتے ہیں۔ نام رکھا امتحان ختم ہو گیا۔ بچہ یا بچی گھر کے چراغ ہیں۔ نتیجہ تو مصہ ہے۔ خوشی کے سامان تو ہیں۔ ماں باپ دفتر سے گھر لوٹتے ہی لاڈ، پیار کرتے ہیں۔ خوش ہیں سے ماں باپ کہیں لیکن یہاں پپا تو یا ممی استعمال کریں گے۔ پانچ سال کا عرصہ ہوتے ہی اسکولس کے اطراف ماں باپ چکر لگاتے ہیں۔ سنا ہے کہ چند مدرسوں میں بچوں کے ہوتے ہی نام درج کرا دیتے ہیں تاکہ بعد میں داخلہ آسانی سے مل جائے۔ انگریزی میڈیم کا جادو تو الگ ہی ہے۔ فیس کی کوئی پرواہ نہیں۔ لتے ہی والدین کا امتحان ختم ہو جاتا ہے۔ اب دیکھئے بچوں کی کیفیت ہاتھ کی انگلیاں دس تو بوجھ کی کتابیں پندرہ۔ وہ بھی قیمتی بعض ت کالے بازار میں خریدنا پڑتا ہے۔ سنا ہے کہ ارباب مقتدر کتابوں کا بوجھ ہلکا کرنے والے ہیں۔ چھوٹی جماعتوں میں امتحان تو بے صبری کا ن ہے۔ جیتنا محال ہے۔ ماں باپ نوکری کو جائیں تو بچے پیٹیوں کے ساتھ گھر کے دروازے پر حاضری دیتے ہیں۔ کبھی شہر میں ہڑتال ہو جائے ر ہو جائے، مار پیٹ ہو جائے تو پہلے بسیں رک جاتی ہیں۔ آٹو والے، رکشا والے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بچوں کا روا پس آنا ایک بڑا امتحان ہو جاتا ہے۔ ماں باپ تو فکر کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں۔

بچوں کے ذرا بڑا ہوتے ہی اہم مضامین جیسے تاریخ، جغرافیہ، ریاضی پیچھا چھوڑتے نہیں۔ انگریزی کے تو عجب چکر ہیں۔ جغرافیہ نقشہ جات بازار سے خرید کر لاتے ہیں۔ رنگ بھرتے ہیں۔ غلطی ہو جائے تو مار پیٹ سے جسم سوج جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ سنتے آئے کہ چھوٹی سی غلطی پر بھی ابا جان کو یا امی جان کو، ارباب مدارس سے معافی مانگنا ضروری ہو جاتا ہے۔ واہ رے تعلیم! بلکہ اول جماعت سے بھی کتابوں کی شرحیں ملتی ہیں۔ شرح کے بغیر نصابی کتاب چند دوکاندار دیتے نہیں۔ بچے خوشی میں کتابیں مدرسہ

لے جاتے ہیں۔ چند استادوں کی نظریں شرح پر پڑتی ہیں تو ڈانٹ ڈپٹ کر کے رکھ لیتے ہیں جو ان کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ کاپیوں کی گم یں اگر ضرورت ہو جائے تو فوراً مدرسہ میں امتحان کی ضرورت نکل پڑتی ہے۔ دو صفحے مشکل سے امتحان کے لیۓ باقی سب خالی استعمال کے لیۓ۔

ساتویں جماعت، دسویں اور اعلیٰ تعلیم کے امتحانات معیاری قرار دیۓ گئے ہیں۔ سوالات کا ڈھنگ ہی الگ۔ لانبے سوالات، چھوٹے سوالات، ہاں یا نہیں، غلط یا درست، خانہ پری سے مضامین بھرپور ہیں۔ بچے گھر میں رات بھر پڑھتے رہتے ہیں چند لوگ آکر ستاتے ہیں سوالات لاکر دیتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ پہلے حصہ میں تین ہٹ پڑھ لو مزے میں پاس ہو جائیں گے، بچوں کے ساتھ ماں باپ کی نیند بھی حرام ہو جاتی ہے۔ چور، ڈاکو کا خوف نہیں امتحان کے زمانے میں کیونکہ ہر ایک "جاگتے رہو" بن جاتا ہے۔ امتحان کے لیۓ کیا نہیں کرتے۔ اچھی طرح پڑتے ہیں۔ چند لوگ تو نقل کی چٹھیاں بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک چیٹھی نکالو تو ساتھ ہی سات عدد حاشل چٹھیاں مل جاتی ہیں۔ ڈرانے، دھمکانے کی خبریں تو اخبار میں عام طور پر آتی ہی رہتی ہیں۔ دوران امتحان استاد اگر زندگی کا بیمہ کرالے تو مفید ہے۔ خیر پولیس کی بھی تھوڑی بہت نگرانی ہو جاتی ہے۔

شیروانی، کوٹ، دامن کوٹ کے استر کے نیچے نقل کی چٹھیاں ملتی ہیں۔ پائجامے یا موزے، بل بالم کے حاشیے، بلٹ کے پہلو آستینوں میں نقل کا مال بھرپور رہتا ہے۔ امتحان دینے سے پہلے تو تلاشی ضروری ہے تاکہ معیار رہے۔ کافی رقم بھی تو نگہداشت پر خرچ کی جاتی ہے۔ اور وہ رقم بھی تو ماں باپ سے وصول کردہ ہے۔

تعلیم کا امتحان اگر ختم ہو گیا تو زندگی میں نوکری اور خوشی حاصل کرنے کے لیۓ الگ الگ امتحانات ہیں۔ اچھی بیوی کا ملنا بھی امتحان ہے۔ پی۔ ایس سی کا امتحان بھی مشکل ہے۔ بنک کا امتحان اور ایک عجیب و غریب مسئلہ ہے۔ ان تمام امتحانوں کے ساتھ انسان آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ زندگی کا آخری امتحان تو موت ہے۔ ولی لوگ کہتے ہیں کہ نووارد زمین کی صورت دیکھتے ہی روتا ہے گویا افسوس کرتا ہے کہ میں زمین پر کیوں آیا ہوں۔ مجھے تو مرنا ہے۔ خدا کے امتحان سے کوئی بری نہیں۔ جو کس رہنے پر بھی جو الزام قرار دیۓ جاتے ہیں۔ دنیا کے مایا جال کا امتحان تو خدا لیتا ہے۔ ممتحنِ اعلیٰ تو پروردگار ہے۔ خدا کے امتحان میں تو ہر ایک سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ چاہے ہٹلر ہو یا نہرو۔ اسٹالن ہو یا گاندھی۔ نپولین ہو یا نائٹ انگیل۔ ٹیگور ہو یا شیوٹنزر۔ جمہوریت کا انسانی کا، بندگی کا، وفاداری کا، جاذبیت کا، مشغولیت کا، ہمدردی کا غرض ہر چیز کا خدا کے دربار میں امتحان اعلیٰ منعقد ہوتا اشرف المخلوقات اس امتحان سے مستثنیٰ نہیں۔

رؤف خوشتر
(گلبرگہ)

فلمیریا

ہمارے ایک عزیز ہیں جو آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کی زبانی یہ سن کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کے شفا خانے میں کئی نوجوان یہ شکایت لے کر آتے ہیں کہ آنکھیں جل رہی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہتا ہے۔ پوچھنے پر یہ نوجوان یہ سبب بتلاتے ہیں کہ ہفتہ بھر سے انھوں نے کوئی فلم نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مروجہ اصول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان فلم زدہ اندھوں کی آنکھوں کا معائنہ کرنے کے لئے تعداد حروف تہجی کی بجائے فلمی ستاروں کی تصویروں کی نشان دہی کرنے کے لئے کہتے ہیں۔

ہم بچپن میں لوگوں سے یہ سنا کرتے تھے کہ "صبح میں تو فجر کی نماز سے قبل ہی جاگتا ہوں۔ ظہر کے بعد کھاتا ہوں۔ بعد مغرب مکان سے نکلتا ہوں بازار میں سودا لے کر عشاء سے پیشتر مکان واپس آتا ہوں۔"

لیکن بُرا ہو اس فلم بینی کا کہ آج کل کا نوجوان اپنے دن بھر کے پروگرام کے متعلق یوں کہے گا کہ — "یارو میں تو مارننگ شو سے پہلے جاگتا ہوں۔ میٹنی شو شروع ہونے سے پہلے کھانا کھا کر مکان سے نکلتا ہوں۔ پہلے شو کے وقت بازار میں گھومتا ہوں اور آخری شو کے بعد مکان واپس آتا ہوں۔"

ہماری فلموں میں زندگی کا عکس آئے یا نہ آئے لیکن ہماری زندگی میں جا بجا فلموں کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ فلم مغلِ اعظم جب ریلیز ہوئی تو اس فلم سے متاثر ہو کر ایک حسینہ اپنے مکان سے نقدی و زیورات لے کر فرار ہو گئی جاتے ہوئے مکان میں ایک پرچی چھوڑ گئی جس میں مغلِ اعظم کے ایک گیت کا ٹکڑا تھا۔

"پیار کیا تو ڈرنا کیا"

میاں عاشق اسٹیشن پر اپنی محبوبہ کو زیورات و نقدی کے ساتھ دیکھ کر خوشی سے چلّانے لگے اور اپنے جذبات کے اظہار کے لئے مغلِ اعظم کے گیت کا سہارا لیا:

زندہ باد! زندہ باد! اے محبت زندہ باد!

ادھر لڑکی کے والدین روتے بسورتے پولیس اسٹیشن جاکر اپنا مدعا بیان کرکے یوں نغمہ سرا ہوئے۔

تیری محفل میں قسمت آزما کہ ہم بھی دیکھیں گے

جب نقدی و زیورات ختم ہو گئے تو طوطا چشم عاشق نے اپنی قلاش محبوبہ کو دھتکار دیا۔ بیچاری روتی ہوئی گھر آئی اور صحن میں ایک پرچی پھینک کر اپنے کمرے میں پناہ لی۔ پرچی میں ساری روداد کو ایک ٹکڑے میں بیان تھا کہ :

محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے

کئی نوجوان فلمی اداکار کی ہر طرح سے تقلید کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ ہم ایک دوست کو جانتے ہیں یہ گمان ہے کہ ان کی صورت ایک مشہور ہیرو سے ملتی جلتی ہے۔ بس وہ دن رات اس اداکار کی نقل کرتے ہیں۔ کبھی دھوتی کبھی سوٹ۔ کبھی مونچھیں تو کبھی داڑھی۔ بات چیت سے لے کر اٹھنا بیٹھنا تک اس اداکار کے مطابق ہوتا ہے۔ جب تک اداکار کنوارا رہا۔ یہ صاحب بھی کنوارے رہے لیکن جیسے ہی اداکار کی شادی رچی فوراً اپنا بھی عقد پڑھوالیا۔ چونکہ اداکار اب تک صاحب اولاد نہیں اس لئے آپ بھی ضبطِ تولید پہ بند ہیں۔ ان کی بوڑھی ماں چاہتی ہیں کہ پوتے پوتیاں ہوں۔ تو ارمان مٹیں لیکن یہ ٹس سے مس نہیں ہوتے ہر ہفتہ بے تابی سے فلمی رسالوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں کہ کہیں اس اداکار کے باپ بننے کی خبر تو نہیں آئی ؟

اس اندھی تقلید کا ایک خوشگوار پہلو ہمارے سامنے آیا۔ محلہ کا مشہور غنڈہ اچانک شریف آدمی بن گیا۔ ہم نے اس انقلاب و تبدیلی کا راز پوچھا تو کہنے لگا "پران صاحب میرے ہمیشہ سے گرو رہے ہیں۔ جن دنوں وہ بڑے بڑے آدمی کا رول ادا کرتے تھے۔ میں بھی زندگی میں بُرا آدمی تھا۔ اب وہ اچھے رول کر رہے ہیں تو شاگرد کیسے پیچھے رہ سکتا ہے۔

ماہر اقتصادیات چلاتے ہیں کہ ہندوستانی عوام غریب ہیں۔ یہ غلط ہے۔ وہ ایسا اس لئے کہتے ہیں کہ کبھی وہ نہیں دیکھتے ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ سینما گھروں کے سامنے لمبی لمبی قطاریں ہماری خوشحالی و امیری کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ فلم بینی کا شوق اب جنون کی حد تک بڑھ گیا ہے اور ملیریا کی طرح یہ مرض بھی پھیل رہا ہے۔ اس لئے اس کو فلمیریا کہنا نہایت مناسب ہے۔

محمد برہان حسین

عنوان لگائیے

آخر شرفو میاں نے ہمیں راضی کر ہی لیا کہ وہ اور ہم محکمہ سمکیات حسین ساگر کے گودام سے مچھلی خریدنے جائیں گے۔ مچھلی کے بارے میں ہمارے خیالات اور جذبات نفرت اور محبت پر مشتمل تھے کیونکہ والدہ کو مچھلی کے نام سے نفرت تھی اور والد صاحب نے مچھلی کے شکار کے لئے جتنا وقت مچھلی ڈال کر ندی کے بیچ کی چٹان پر بیٹھ کر گذارا ہے اگر وہ صرف چادر اوڑھ کر اتنا عرصہ وہاں بیٹھے رہتے تو آج شہر کے سب سے بڑے بزرگ مانے جاتے۔ وہ اپنا ایک بیتا ہوا قصہ سناتے کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی ایک دن صبح انھوں نے والدہ سے پوچھا "بھئی آج ناشتہ میں کیا بنا ہے؟"

والدہ نے کہا تھا "کھچڑی اور قیمہ اور گھی ہے۔"

والد صاحب نے کہا "بھئی ہم تو آج کھچڑی بغیر چٹنی کے نہیں کھائیں گے۔"

والدہ نے کہا "تو پھر جلدی سے ہری مرچیں، کوتمیر (ہرا دھنیا) اور پودینہ لے آیئے۔"

وہ تیزی سے بازار کی طرف روانہ ہوئے کہ کھچڑی ٹھنڈی ہو جائے تو مزہ خراب ہو جاتا ہے۔

ادھر شرفو میاں کے والد سیکل پر مچھلی پکڑنے کا پورا سامان لئے آ پہونچے تھے۔ والد صاحب نے ان کو کہا کہ کھچڑی کھا کر جاتا ہوں" مگر وہ بولے "ارے میاں نالہ زوروں پر چل رہا ہے چند گھنٹوں میں اتر جائے گا۔ سنا، مچھلی بہت آ رہی ہے پنڈالے میں تھیلی بھر کر لے جاؤ اور بھابی کو خوش کر دو۔"

والد صاحب جو ان کے ساتھ ہوئے تو شام ہی کو لوٹے تھے۔ پتہ نہیں والد صاحب شرفو میاں کے والد کی بات کو کیوں ٹال نہ سکتے تھے۔ ویسے میں بھی شرفو میاں کی بات نہیں ٹال سکتا مگر والد صاحب اور مجھ میں صرف اتنا فرق ہوا کہ شرفو میاں کے والد ان کو مچھلی پکڑنے لے جاتے تھے اور شرفو میاں ہمیں خریدنے کے لئے راضی کر چکے ہیں لیکن مچھلی کے معاملے میں والد صاحب اور شرفو میاں کے خاندانوں کے "بار بھگپ" میں کوئی فرق نہ آ سکا جس کا اندازہ آگے پیش آنے والے واقعات سے

جائے گا۔

رمضان کا کوئی دن تھا۔ شام کے چار بجے تھے۔ ہم اور شرفو میاں موٹر سیکل پر سوار حسین ساگر کی طرف چلے رہے تھے۔ خیال تھا افطار سے ایک گھنٹہ قبل مچھلی لے کر گھر پہونچ سکیں گے۔ حسب پروگرام مچھلی جلدی ہی خرید لی رکھوا کر اس کے ٹکڑے تھیلی میں بھر لیے۔ شرفو میاں مچھلی کی پوٹلی تھامے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ دفعتاً بادل ایسے آگئے جیسے خندقوں میں چھپے بیٹھے تھے اور آن کی آن میں زوردار بارش شروع ہوئی اور یہی ہماری مصیبتوں کا نقطۂ آغاز تھا۔ مشکل یہ ہوئی کہ بارش سے بچنے کے لئے کوئی موزوں جگہ بھی نہ مل سکی۔ آخر ایک چھوٹی سی ہوٹل کے پیچھے نیچے جا کھڑے ہوئے موٹر سیکل کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔ وہ شاید برہمن ہوٹل تھی۔ پکوان اور بگھار کی تیز بو ناک میں گھسی تو زوردار ٹھسکہ لگا۔ شرفو میاں کو اس قدر زوردار ہچکی لگی کہ وہ گرتے گرتے بچے۔ ہم نے ڈانٹا کہ یہ ہچکی آنے کا بھی کوئی وقت ہے۔ شرفو میاں بولے "اگر میں ناگ بھوشنم کا نیا قمیض نہ پہنا ہوتا تو پانی کی پرواہ کئے بغیر گھر چلا جاتا مگر کیا کروں اگر قمیض بھیگ کر سکڑ گیا تو اس موٹے کے لئے بیکار ہو جائے گا۔"

ہم نے کہا "ویسے ہمیں بھی نزلہ کا خوف نہ ہوتا تو ہم کب رُکتے۔"

شرفو میاں نے کہا "دیکھو بھائی۔ سڑک پر پانی بڑھ رہا ہے کہیں موٹر سیکل غرق نہ ہو جائے۔"

اتنے میں روزہ کھولنے کا سائرن بجا۔ میں نے غصہ میں مچھلی کی تھیلی شرفو میاں کی طرف اچھال دی۔ شرفو میاں اس کو تھامتے ہوئے سلپس کے فیلڈر کی طرح پانی میں گر پڑے۔ ہم نے کہا "ارے اسقدر گر پڑ کر تھامنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ معصومیت سے بولے "پانی میں گر رہی تھی۔"

"یعنی مچھلی پانی میں گر پڑتی ...." یار تم بھی کمال کے آدمی ہو۔ خیر اب یہ پوٹلی مجھے دیدو اور ہوٹل میں جا کر پوری کچوری سے روزہ کھول آؤ۔ میں یہ پوٹلی تھامتا ہوں۔ پھر میں چلا جاؤنگا۔"

شرفو میاں کو خیال پسند آیا اور وہ اندر چلے گئے۔ یہ دیکھ کر ہوٹل کا منیجر باہر آیا اور ہم سے بولا "آپ بھی آجائیے صاحب جگہ نکال دوں گا۔ آپ کے لئے بھی۔"

ہم نے کہا "جی شکریہ۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

وہ بولا "اس تھیلی میں کیا ہے۔"

"جی مچھلی۔"

وہ چیخا "مچھلی!؟ .... آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے۔"

"آپ ذرا ہمارے دوست کو بلا دیجئے۔"

وہ چیخ کر بولا "پہلے آپ یہاں سے چلے جائیے۔ فوراً.... چلئے چلئے۔"

اب تو شرفو میاں سے ہم الگ ہو گئے۔ اسقدر غصہ آیا کہ فوراً موٹر سیکل اسٹارٹ کی تھیلی کو پٹرول کی ٹنکی پر رکھ اور پوری رفتار سے گھر کی طرف روانہ ہو گئے چند منٹوں میں گھر پہنچ گئے۔ گیاریج میں اندھیرا تھا۔ ہم نے موٹر سیکل کھڑی کا

ب جو دیکھتے ہیں تو تھیلی غائب۔ اندھیرے میں آس پاس ٹٹولنے کے بعد یقین آگیا کہ راستہ ہی میں گھر کے قریب ہی کہیں گری ہے۔ مر بھی تلاش کرنے کے نقطۂ نظر سے سیکل پہ جانا بہتر ہوتا مگر سیکل وہاں تھی نہیں۔ ہم صحن میں نکل آئے اور بیوی کو آواز دی رے بھئی سیکل کہاں ہے۔ اس بھلی مانس نے سوال کا جواب دینے کی بجائے گویا پنگ پانگ کا گولا "ٹک" سے ہمیں لوٹا دیا "موٹر سائیکل کہاں ہے"

ہم نے کہا "ارے ہم ' پوچھ رہے ہیں سیکل کہاں ہے"

وہ بولی "اور ہم پوچھ رہے ہیں موٹر سیکل کہاں ہے"

"تو تم نہیں بتاؤ گی کہ سیکل کہاں ہے"

وہ بولی "اور آپ نہیں بتائیں گے کہ موٹر سیکل کہاں ہے" اور ساتھ ہی سائیڈ اور کردیا۔

"آخر قصہ کیا ہے"

مگر دفعتاً ہماری نظر ملازم پہ پڑی جو سیکل پہ کہیں سے آ رہا تھا۔ ہم نے جھپٹ کر سیکل لی اور تھیلی کی تلاش میں روانہ ہوگئے۔ فر ایک جگہ پوٹلی جوں کی توں پڑی مل گئی۔ ہم نے لاکر بیوی کے آگے رکھدی "لو سنبھالو اس میں مچھلی ہے"

اتنے میں والد صاحب نمودار ہوئے "میاں مچھلی کے شکار کی لت ایسی ہی ہوتی ہے نہ دھوپ محسوس ہوتی ہے نہ بارش ... ہم بھی ایک دفعہ ....!

میں نے کہا "مگر میں مچھلی خرید کر لایا ہوں"

وہ زور سے ہنسے "ہاں۔ ہاں۔ جب دن بھر میں ایک بھی نہ پھنسے تو خرید کر ہی لایا جاتا ہے۔ میں خود ایکدفعہ..

میں نے پھر انھیں قصہ سنانے سے روکا "میں روزہ کھول لوں تو پھر بات کروں"

اتنے میں بیوی نے کھلی پوٹلی لاکر سامنے رکھدی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ "مچھلی تھی کہ کوئی بدروح، توبہ ... آخر ئی کہاں اور یہ سب کیا ہے"

بیوی نے کہا "پریشان کیوں ہوتے ہو ایسا لگتا ہے کہ آپ نے اور کسی بڑھا کی نے اپنی اپنی تھیلی ایک ہی جگہ گرائی تھی بڑھئی پہلے آیا۔ اور آپ کی تھیلی لے گیا پھر آپ اس کی تھیلی لے آئے۔ اب ان چیزوں کو بیچ کر مچھلی منگوالیں گے"

والد صاحب نے کہا "اب بہو تم تلی ہوئی مچھلی منگوادو اور یہ جھگڑا ختم کرو .... ایک دفعہ میرے ساتھ بھی یا ہی ہوا کہ ......

میں نے کہا "توبہ! اس سے کہیں کم محنت اٹھاکر تو ہم تالاب سے مچھلی پکڑ لاتے" خدا کی شان کہ اسی وقت شرفو میاں انکا اپنی مچھلی والی تھیلی لے کر تاریکی میں سے نمودار ہوئے۔ "واہ صاحب اتنے جتن سے خریدی ہوئی مچھلی کو آپ شاید تہ میں پھینک آئے تھے"

اس مجموعۂ سانحات عرف "مچھلی" کو کس عنوان کے تحت لکھا اور پڑھا جائے گا ہمیں نہیں معلوم۔

ایم اے نعیم
(حیدرآباد)

ہم زلف

جیسے ہی ہم نے میٹرک کا امتحان اقساط میں پاس کیا، ہماری شادی کی تیاریاں جنگی پیمانے پر شروع ہوگئیں۔ بالآخر عقد کا دن بھی آپہنچا۔ ہم مقررہ وقت پر گھوڑے پر سوار، کمر میں لکڑی کی تلوار باندھے باجوں کی گھن گرج میں دلہن کے گھر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ گھوڑے سے اتارا گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے دہی کا مٹکا سر سے اتارا جاتا ہے۔

ہمیں کھادی کی شیروانی پہنے دیکھ کر سب کو پریشانی ہونے لگی۔ چنانچہ دلہن والوں نے بہت شور مچایا اور چند انتہا پسندوں نے واک آؤٹ کی بھی دھمکی دی۔ لیکن اسپیکر یعنی خسر صاحب نے تھوڑی سی ہاتھا پائی کے بعد پبلک کو چپ کرا دیا اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ حضرات حُبّ الوطنی کی اتنی اچھی، خوبصورت اور جیتی جاگتی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ لوگ تو خوشی کے موقع پر اپنے خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ لیکن نوشاہ کو دیکھو کہ اس نے اپنے وطن کو سینے کو شادی کے موقع پر بھی بھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب ہنگامے کی رسم پوری ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں بیت الخسر کے باب الداخلہ پر سب سے چھوٹے سالے نے چند شرپسند عناصر کا سہارا لے کر ہمارا مذاق اُڑانے کی کوشش کی اور یہ کہہ کر داداگری کرنے لگے کہ پچاس روپیہ دیں تو اندر جانے کی اجازت دی جائے گی۔ کافی بحث و تکرار کے بعد طے پایا کہ سو روپے میں کام چل جائے گا۔

خیر سے داخلے کی فیس ادا کئے جانے کے بعد ہم اندر داخل ہو گئے یا یوں سمجھئے کہ ہم زبردستی اندر داخل کر دئیے گئے۔

اندر پہنچنے کے بعد ہال کی سجاوٹ دیکھ کر ہم ہکا بکا رہ گئے۔ دلہن والوں سے زیادہ دلہن کا رعب ہمارے دل و دماغ پر ایٹم اسپیشل کی طرح جم کر رہ گیا تھا (یہ راز اس وقت کھلا جب بعد میں ہم پہلی جمگی کے موقع پر ایک مرتبہ پھر دلہن کے گھر جا پہنچے۔ اب جو غور سے دیکھتے ہیں تو وہی سجا سجایا ہال مغلیہ دور کے کسی ویران قلعہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ شادی کے روز سارا اہتمام دھوکا کا ایسا تھا۔ یہاں تک کہ دیواروں کا پلستر بھی)۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اب ہم آپ کو پھر روز نکاح میں لئے چلتے ہیں۔ چنانچہ پورے ساڑھے تین گھنٹہ انتظار کے بعد رسمت کی پوسنا آمد نہیں وہ جس جلوہ افروز ہوئی جس کی آمد سے

شادی "شادی لت" سے منادی ہو جاتی ہے۔ یعنی قاضی صاحب بڑے ہی طنطنے سے موتیوں جیسے سیاہ ناموں اور ایک دوچند کی
رسید کے ساتھ نازل ہوئے۔ قاضی صاحب نے ہمیں چند قرآنی آیتیں اس طرح پڑھائیں جس طرح کوئی بوڑھے طوطے کو بولنا
سے بولنا سکھاتا ہے۔ یوں بھی ہم عقد سے پہلے عربی پڑھنے کی مشق کافی کر چکے تھے۔ لیکن عادت جو نہیں تھی تا اس لئے ہمیں
تھوڑا سا ہکلانا پڑا۔

گیارہ ہزار گیارہ سو گیارہ روپے سکے رائج الوقت اور دو دینار سرخ مہر معجل کے عوض ہم نے اپنی چاند سی دلہن کو
اپنی "جائداد منقولہ" میں شامل کر لیا۔ خدا خدا کر کے عقد کی کاروائی ختم ہوئی۔ اب مبارکبادیاں وصول کرنا۔ گلے ملنا اور ہماری
قسمت کو کوسنا باقی تھا۔ ایک بہدرد تھے جو ہمارے اور دلہن والوں کے درمیان باضابطہ رابطہ کا کام کر چکے تھے اور جنھیں دونوں
جانب سے مکمل اختیارات بھی عطا کئے جا چکے تھے، ہماری اس مشکل کو آسان کر دیا۔ پہلے تو انھوں نے میزبان خصوصی کی
طرح اور ہمیں بلاشبہ دھوتیوں کو ایک لائن میں کھڑا کر کے ہم سے ان کا تعارف کروانا شروع کیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وزیر اعظم کی
ہوائی اڈہ پر آمد کے بعد ریاست کے چیف منسٹر معزز شخصیتوں اور اعلیٰ عہدہ داروں سے تعارف کرواتے ہیں۔ تعارف کے دوران
انھوں نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان سے ملو یہ ہیں تمہارے "ہم زلف" یہ سنتے ہی ہم چونک اٹھے ہاتھ پر
گرے ہوئے بے دم پھولوں کی لڑیوں کو پرے ہٹایا اور سامنے کھڑے شخص کو حیرت سے گھورنے لگے۔ کیونکہ ہم آج تک
"ہم زلف" کو "محبوبہ" کے معنوں میں استعمال کرتے آئے تھے۔ لیکن یہاں تو ایک اچھے خاصے مسٹنڈے سے تعارف ہو رہا تھا۔ جو
ہی ملے ہم نے ہوش و حواس کو یکجا کیا اور سوچنے لگے آخر یہ ہم زلف کس کھیت کی مولی ہے۔ پھر ہم نے اپنے بالوں پر ہاتھ
پھیرا کہ شاید ہم زلف کے معنی ہم جیسے بال رکھنے والوں کے ہوتے ہوں لیکن ہمارے بال تو ریشم کی طرح ملائم گھنے اور چمکدار تھے
جب کہ ہمارے "ہم زلف" کے سر پر بالوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا اور کافی کوشش کے باوجود ہمیں یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا
کہ ان کی پیشانی کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے۔ کافی غور و خوض کے بعد بھی ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نظر
نہیں آئی۔ ہم ان صاحب سے مل کر بھی اجنبی کی طرح رہے۔ اس اجنبیت کو دور کرنے کے لئے ہمیں "ہم زلف" کا مطلب جاننا
ضروری ہو گیا تھا۔ اس لئے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ ہم نے
اپنے LIAISON OFFICER سے آزادانہ انداز میں دریافت کیا کہ یہ ہم زلف کیا ہوتا ہے۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا
"ارے بدھو! تجھے اتنا بھی نہیں معلوم کہ ہم زلف کیا ہوتا ہے ارے ہم زلف تو ہم زلف ہوتا ہے۔"

"آخر یہ کیا بات ہوئی" ہم نے تلملا کر پوچھا۔

"میاں! ہم زلف کے معنی ہیں تمہاری زوجہ کے ہمشیرہ کے شوہر"

ابھی ہم "ہم زلف" ہی سے نپٹ رہے تھے کہ مینڈک کی طرح بدوضع اور بدنما لفظ "زوجہ" ہمارے گلے میں اٹک گیا۔
بہرحال شکر ہے اب ہمیں دو الفاظ کا مفہوم جاننا ضروری ہو گیا تھا۔ ہمارے دوست نے ہمارے چہرہ سے دل کی حالت
کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "کیا سوچ رہے ہو میاں! ابھی نہیں سمجھے؟ "ہم زلف" یعنی کہ تم اور وہ صاحب ایک ہی زلف کے

اسیر ہیں۔ اس سے پہلے کہ رقیبانہ جذبے کے تحت طیش میں آکر اس کے طمانچہ رسید کرتے اس نے سنبھل کر کہا" میرا مطلب ہے کہ یہ صاحب تمہاری سالی یعنی آدھی بیوی کے پورے شوہر ہیں۔

ہم نے کچھ" ہاں" اور کچھ" ناں" میں سر ہلایا۔ بالکل اسی طالب علم کی طرح جو الجبرا کا سوال نہ سمجھ کر بھی سمجھنے انداز میں سر ہلاتا ہو۔ آخر میں ہمارے دوست نے مکمل تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ارے بھئی" ہم زلف" اور" زوجہ" ۔ گجورکہ "سالوں" اور" بیوی" کے ادبی ایڈیشن ہیں۔

اس تشریح کے بعد ہمارا دماغ ہلکا ہوگیا اور ہم " زوجہ کے تصور میں کھو گئے۔ • • •

مطبوعات زندہ دلانِ حیدر آباد و دیگر مزاحیہ کتب

نشتر و مرہم۔ رضا نقوی واہی	مجموعۂ کلام	۳/۵۰ روپے
تیرِ نیم کش ۔ بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰ "
مزاح شریف۔ رشید قریشی	"	۳/۵۰ "
چھیڑ چھاڑ۔ پروفیسر اللہ مہدی	"	۶/- "
سائے اور ہمسائے۔ یوسف ناظم	"	۶/- "
مکرر ارشاد۔ برق آشیانوی	مجموعۂ کلام	۴/- "
لالہ زار۔ خواجہ عبد الغفور	مضامین	۵/- "
قطع کلام۔ مجتبیٰ حسین	مضامین	۳/۵۰ روپے
بہرحال۔ مجتبیٰ حسین	"	۷/- "
قصہ مختصر۔ مجتبیٰ حسین	"	۶/- "
گل و گلنار۔ خواجہ عبد الغفور	"	۶/- "
در پردہ۔ مسیح انجم	"	۶/- "
فقط۔ یوسف ناظم	"	۶/- "
کیا نام نہ ہوگا۔ بھارت چند کھنہ	"	۶/- "

پتہ:۔ شگوفہ۔ ۳۱۔ مجرد گاہ۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدر آباد ۱

شیخ بشیر احمد
(کشمیر)

یاد ماضی....!

میں تارکول کی سڑک
پر بے تحاشہ اپنے گھر کی طرف یوں دوڑ رہا تھا۔
جیسے دن بھر کا تھکا گھوڑا یکے کو اپنے ٹھکانے کی جانب
کھینچتا ہے۔ میرے بغل میں کتابوں کا بستہ کسی پرانی گھڑیال کے
پنڈولم کی طرح لٹک رہا تھا۔ تپتی شاہراہ اور سورج کی جھلستی کرنیں میرے
پیروں اور ڈبل جین بشرٹ سے ہاتھا پائی کر رہی تھیں۔ جو میری نازک
اور ملائم شریانوں سے بچا ہوا پسینہ کی آخری بوند کو دیکھنے کی متمنی لگ
رہی تھی۔ ڈگمگاتے قدم، پھولتی ہوئی سانسیں عرق آلودہ بدن کو سمیٹتے
ہوئے جب گھر کی دہلیز پر اپنے آپ کو گھسیٹنے لگا تو الحمد للہ کی بجائے
سبحان اللہ کے اسم مبارک سے شکر بجالایا۔ ابھی میں نے چند قدم ہی
آگے بڑھائے تھے کہ کسی بھدی کرخت آواز نے میری روح کو دو حصوں میں
تقسیم کردیا۔ ایک حصہ حلق میں گولے کی طرح اٹک کر رہ گیا، دوسرا حصہ سوکھے
ہونٹوں پر! میں نے کسی شرمیلے دلہا کی طرح گردن اوپر اٹھائی تو میرے
سامنے ابا حضور مجھے متجسس نظروں سے گھور رہے تھے۔ لڑکھڑاتے
قدم۔ بے ہنگم دل کی دھڑکن کا ساز اور پسینہ سے تر بھوت جیسے
چہرے کو دیکھتے ہی انھوں نے اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لیں
ان ناگہانی آفت نے میرے خیالات سلب کر دیئے اور
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے زمانہ کے

لڑکپن کی بوسیدہ کتاب کے بکھرے
اوراق پر مٹی جمانا چاہتے ہیں۔ موقع و محل کو نظر انداز
کئے بغیر انھوں نے میرے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔
پھر بدستور برہم گرتے رہے، جس سے چہرے کی سرزمین کو لالی رنگت
میں بدل دیا۔ کانوں میں استاد بڑے غلام علی خان مرحوم کے طبلے کی
سنگت شروع ہوئی۔ آنا فانا یہ خبر ذہن کے تاریک اور اجالے گوشوں
تک پہنچ گئی اور انھوں نے بغیر کوئی ریزولیوشن پاس کئے آنکھوں کو برسنے
کا حکم صادر کردیا۔ ابا حضور نے میرے چہرے پر اپنی انگلیوں کے نشانات
کی شناخت کرتے ہی اطمینان کی سانس لی، جیسے اُن کے خشم ناک چہرے
کی کتاب پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ وہ رکنے کے لفظ سے لاعلم ہیں۔ اگرچہ انھوں
نے فارسی کے کئی دیوان حفظ کر لئے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ فارسی لغات میں
لفظ " رکنا " شامل نہ کردیا گیا ہو۔ مگر ہاتھ کی سلامتی کے لئے کچھ دیر تک
چپ سادھ لینے میں ہی عافیت سمجھی ہو۔
چند لمحے بعد وہ بادلوں کی طرح گرج پڑے۔
۔ " نامراد! تم سکول سے بھاگ کر آئے ہو ؟ "
قدرے ہوش کو سنبھالتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ
شاید میرا کلاس فیلو مراد بھی میرے تعاقب میں آیا ہے لیکن
دن کے اُجالے میں مجھے تاریکیوں کے سوا کچھ بھی

نظر آیا تو میں بلکہا ہٹ کے جواب دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

"وہ اسکول میں ہے۔ میں اکیلا ہی آیا ہوں۔"

"کم بخت! ادلہ نہ کیا تو سارے لڑکوں کو اپنے ساتھ لے آتا۔"

یک لخت میرے ہوش ہوا ہیں چڑھ سے اڑ گئے۔ اُن کی بات سنتے ہی میری سانسوں کا زیر و بم شروع ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ پہلے مرآداب نیک بخت (جسے ہم ہی کیا اساتذہ صاحبان بھی کم بخت کہا کرتے تھے) میری چغلی کھانے آیا ہے۔ ایک بار پھر ہم نے پیچھے دیکھا تو ناامید اور بے بس ہو کر اپنی آنکھوں سے رواں آنسوؤں کو پونچھ ڈالا کہ کہیں یہی تو مجھے دھوکہ نہیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ سوکھا ہیر اتمام شک و شبہ اس وقت برف کی طرح پگھل گیا جب اباحضور نے میرے گالوں پر طمانچوں کی ایک ادھ بوچھاڑ سیل کر دی۔

کہتے ہیں جب بڑے دن آتے ہیں تو گھڑی برس جیسی لگتی ہے۔

دوما ہے کی بوچھاڑ سیل کا اختتام اس وقت ہوا جب میری والدہ محترمہ نے بیچ بچاؤ کر کے اپنی ماں کی چوڑیوں کی قسم بانی دے کر یکطرفہ گوریلا جنگ میں مداخلت کی۔ میں نیم جان کٹے ہوئے چاند کی طرح زندگی کی آخری سانسوں کو چھپا کر والدہ محترمہ کی گود میں بلکتا اور روتا رہا۔ میں سوچنے لگا شاید اب محشر کے وہ تمام گر آزما جائیں گے جو مولوی صاحب اسکول میں آزما چکے تھے۔ اب میں بھائی اور شکر میں جھگڑے ہوئے بستے کا انتظار کرنے لگا کہ کب والدہ محترمہ اس نعمت سے فیض یاب کریں۔ خوشی سے سرشار ہو کر میں نے کشمیر سے کنیا کماری تک ایک لمبی سی سانس لینے کی کوشش کی لیکن امرتسر کے سکھوں نے بانگڑہ، دہلی کے قطب مینار کی لوک بیٹی کی ہیجان اور بے شرمی کے ساتھ آتم سے دکن اور یورپ سے پچھم تک ریلوں کے دھوئیں۔ غربت افلاس نے سارا مزہ کرکرا کر دیا اور مجھے سانس لینے میں بڑی کوفت اٹھانی پڑی۔

اس بات نے میری ہمت بڑھائی کہ ابھی میاں بیوی یعنی اباحضور اور والدہ محترمہ کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہونے ہی چند لمحوں کے لئے راحت میسر ہوئی کہ اس نامعقول جملے نے میری خوشیوں کو مارآن کھڑا کر دیا: "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" آخر وہی ہوا جو تقدیر کے حاشیے پہ لکھا ہوا تھا۔ والدہ محترمہ ساڑھی کے پلو سے میرے بجائے اپنی ناک بار بار رگڑنے لگیں۔ شاید میری شامت نے ان کی تڑپ کے عوض فرجنگی دسام کی لائسنس اجاگر کی۔ انھوں نے بلا جھجک اور بلا دار تنگ مجھے کسی گندہ رومال کی طرح فرش پر پھینک دیا۔ چند لمحوں تک میں فرش پر اونگھتا رہا۔ ہزاروں نیک دعائیں ہوں عرش سے فرش پر پھینکنے والی پر — !

جب میں دیوار پر آویزاں آئینے پر نظر جمادی تو سڑک پر اس لولی لنگڑی اندھی بھکارن کے شیر خوار بچے کی یاد آئی۔ جس کے کپڑے پھٹے اور میلے تھے۔

"یہ حالت تمہاری کس نے بنا دی؟" والدہ محترمہ پوری قوت سے چیخ پڑیں۔ کچھ دیر تک غلط فہمی میں رہا کہ اباحضور مجھ سے مخاطب ہیں۔ بعد میں اس وقت پتہ چلا جب والدہ محترمہ نے سر کے بال کھینچے۔

"ٹھوکر لگ گئی اور گندی نالی میں گر پڑا۔" میں نے سفید جھوٹ کے بجائے سیاہ جھوٹ پر ہی اکتفا کر لیا۔ راستے میں لوگوں نے بادیکھے اپنی کھڑکیوں سے گندے انڈے اور سڑی ترکاریاں پھینک دی تھیں۔

"اسکول سے بھاگ کر کیوں آئے۔"

"ماسٹر جی نے کہا کہ اس گرم موسم میں گرم کپڑے پہن کر کیوں آئے۔ لڑی لین یا ریشمی قمیص پہن کر آؤ۔"

میں بالترتیبی کی طرح اپنے منہ کو صاف کرنے لگا۔

"ٹھیک ہی کہتا ہے میرا لال۔ کس کپڑے کو زیب سے

بعد والدہ محترمہ کی آواز سنائی دی۔ جسے [illegible] اپنی ٹانگوں کی [illegible] آخر
ان سے گیا۔

"ہاں۔ ہاں" تمہارے ہی لاڈ و پیار نے اسے بڑا
دیا۔ ہمارے زمانے میں ایک ہی وردی دونوں موسموں میں
آتی تھی لیکن اب سردی میں ...... وہ کچھ توقف کے بعد
کرلے "جاؤ اسے اپنی کوئی ریشمی ساڑی پہنا کر سکول بھیج دو"
کر ابا حضور آپے سے یوں باہر ہو گئے کہ مزید کچھ بغیر خود ہی
سے نکل گئے۔

ابا حضور کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنی بے وقوفی
اتم کرنے لگا۔ کاش! پہلے ہی سارا ماجرا بتا دیا ہوتا تو ایسی
کت نہ ہوتی۔

اب میں والدہ محترمہ کے رحم و کرم کے انتظار میں فرش پر
ارا منظر دیکھتا رہا۔ مگر جلد ہی مجھے باتھ روم میں ڈھکیل دیا گیا۔
ر دادر ٹھنڈے پانی سے میرے دانت بجنے لگے۔ کیونکہ وہ سابقہ
ادثہ پر و بیٹو میں تھے۔ دیسی صابن کو رگڑنے سے بدن پر تراش
راش کے خوشنما کے بن گئے۔

نہانے کے بعد نئے کپڑے زیب تن کر کے مجھے ابا حضور
کے ساتھ نئی وردی خریدنے کے لئے بازار جانے کا مشورہ دیا۔
یا تاکہ اپنے سکول کی وردی خریدنے میں شریک رہوں۔ راستے
میں ابا جان اپنی دھن میں تیز تیز آگے بڑھتے جا رہے تھے۔
یری رفتار کافی سست تھی۔ میں راہگیروں کی ٹھوکروں سے بڑھکتا
ہوا آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار کسی نہ کسی آدمی کی
دی توند یا برہنہ ٹانگوں کی زد میں چلا آتا میں اپنے سر میں پیا نخ
پھٹنے کی آوازیں محسوس کرتا تاکہ کسی طرح ابا حضور سے پہلو بہ پہلو چلنے
لگوں۔ [illegible]
[illegible]

[illegible] بڑی ولا
بڑی دو گھنٹ کے بعد جب ہم ریڈی میڈ دکان میں گھس
گئے تو اپنے سامنے نرالی لین اور حسین کپڑوں کے ڈھیروں
پر ڈھیر سے کپڑے دیکھ کر میرے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ اس
بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ابا حضور نے دکاندار
کی غیر حاضری میں ایک گیلے کپڑے کو سیٹتے ہوئے اس راز کو
افشاں کر دیا اور میں ندامت کے بجائے بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگا۔

میرے بدن پر نرالی لین کی شرٹ زیب تن کر دی گئی۔
بالوں کے اسٹائیل میں نمایاں تبدیلی کے ساتھ میرے ٹانگوں میں
ایک حسین نیکر نے جگہ لے لی۔ جب مجھے قد آدم آئینے کے پاس
کھڑا ہونے کا حکم صادر ہوا تو آئینے پر نظر پڑتے ہی میرے ہوش
۳۶۰ ڈگری کے محور پر گھومنے لگے۔ میں دوکان سے غبارے کی
طرح باہر آیا تو ایک نئی دنیا میں جیسے قدم رکھا۔ نیا چہرہ۔ نئی
بستی، نئے لوگ اور نئی بلڈنگیں۔ ہر طرف سادگی پر نئی چکا چوند
نیا نکھار نے اپنا ملمع چڑھا دیا تھا۔ لوگوں کو حسین کپڑوں میں
ملبوس کانچ کی چوڑیوں کی طرح چلتے پھرتے محسوس کیا۔ جیسے
کسی دیہات نیکر کی سے ستا مال بازار میں آیا ہو۔ میں
ہر طرف کسی بھولے بھالے دیہاتی کی طرح ہنستے کو استفہامیہ نظر
سے گھورنے لگا۔ اب تنگ کوچوں میں میری کسی سے نہ ٹکر ہوتی
تھی اور نہ ہی کسی کی ٹانگوں تلے کیچر کی طرح روندا جاتا تھا۔ میں
وجود پر شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور راستے میں چھوٹے
بڑے بچوں کو ٹک مارنے پر بھی پیروں میں کسی قسم کی تکلیف نہ
ہوئی تھی۔ میری ٹانگوں میں پھرتی جیسے آ گئی۔ آخر بار میں ابا حضور
سے بھی آگے نکل گیا پر لوگوں کے اژدھام میں مجھے
[illegible] نے ٹوکا اور نہ کوئی الجھا۔!

آج جب میں پندرہ سال کے بعد یہ واقعہ لکھ رہا ہوں [illegible]
وہ بچے کچھ اس طرح لگتے اور ہنس رہے ہیں جیسے وہ زمانہ کی بدلتی ہوئی
حالت پر نہیں بلکہ میری بے وقوفی کی اشرافت پر خندہ زن ہیں۔ • •

محمد اسد اللہ - [illegible]
(مہاراشٹر)

چہرے

چہرے — یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر آپ صحرا نورد نہ واقع ہوئے ہوں تو اس کی تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں بس آنکھیں کھولیے۔ چاروں طرف چہرے ہی چہرے بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن آپ مخصوص قسم کے چہرے (مثلاً پری چہرہ) دیکھنا چاہتے ہیں تو بازار، تھیٹر یا کالج کی طرف جانے والے راستوں کی خاک چھانیے۔ اس عمل کے دوران مرزا غالب کے اس مصرع کا ورد کرنا مفید ثابت ہو سکتا ہے ؎ "خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں"

وہ حضرات جو صبح سویرے کسی مبارک ہستی کے درشن لے کر نئے دن کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے سنائی دیں گے کہ نہ جانے آج کس منحوس کی شکل دیکھی تھی۔ یہ کلمات ادا کرتے وقت وہ لوگ یہ بات یکسر بھلا دیتے ہیں کہ علی الصبح اشنان کے بعد وہ اپنے کمرے میں آویزاں قد آور آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔

ہماری حرکات و سکنات پر چہروں کا عجیب و غریب اثر پڑتا ہے۔ مثلاً شہر کے بھیڑ بھرے صراطِ مستقیم پر میانہ [illegible] چلنے والا شخص کسی خاص چہرے کو دیکھ کر اچانک کسی گلی میں گھس جاتا ہے۔ تو اس وقت ہمیں اُن دونوں کے درمیان قرض خواہ و مقروض کے نازک رشتہ کا پتہ چلتا ہے۔ دور سے آتے ہوئے کسی ہیولے کے رنگین پیرہن پر نظر پڑتے ہی ہمارا ایک ہاتھ فل پینٹ کی جیب میں کنگھے کی تلاش میں گھس جاتا ہے۔ لیکن اس اہتمام کا انجام اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ہم نئے زمانے کے فیشن ایبل لونڈوں کو رنگین مزاجی (یا شاید رنگین لباسی) کی صلواتیں سنانے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی شخص سے برسوں بعد ملتے ہیں جو ہمارا نہایت ہی مقرب دوست یا کسی قسم کا رشتہ دار رہ چکا ہوتا ہے۔ اب جب ایک عرصہ بعد ہم اس کی صورت دیکھتے تو ہمیں یاد آتا ہے کہ برسوں پہلے ایک مرتبہ ہم — انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھنا بھول گئے تھے۔

کسی چہرہ کو دیکھ کر ہم بے انتہا خوش ہو جاتے ہیں تو کسی کو دیکھ کر چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ کوئی صورت اچانک ہمارے سامنے نمودار ہو کر سیٹی بجاتی ہوئی ہونٹوں کی گولائیوں کا دم نکالتی ہے تو کوئی چہرہ ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ جوتوں تلے کچلوا دیتا ہے۔

کسی لیم شحیم آدمی کے فربہ چہرے کو دیکھ کر میٹھا تازہ پیلا پیلا سنگترہ ہمارے تصور کے ٹیبل پر آموجود ہوتا ہے۔ جسے چھیلنے کی لذت ہماری انگلیوں میں کھجلی برپا کر دیتی ہے توجی چاہتا ہے اس سرخ جلد پر بھی انگلیاں آزما کر دیکھیں کہ اس کے اندر سے کتنی پاسٹھی لس قسم کی قاشیں برآمد ہوتی ہیں۔ سنگترے اور چہرے میں فرق ہوتا ہے اسی لئے اس خواہش کو مجبوراً دبا دینا پڑتا ہے۔ چند عورتیں زمانے کے فکر و آلام نا جبڑوں میں رہ کر اپنا رس کھو دیتی ہیں۔ اسی لئے ایسے چہرے چُسی ہوئی گنڈیری کی پھوک معلوم ہوتے ہیں اگر کچھ چہروں کو دیکھ کر بے اختیار منہ میں پانی بھر آتا ہے تو اس کی وجہ ان کا املی یا آم سے مشابہ ہونا نہیں ہے بلکہ ان میں ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے انھیں کھا جائیں۔ اسی طرح موم کی شمع نما چہروں کو دیکھ کر طبیعت لرزنے لگتی ہے کہ دھوپ میں تھوڑی تیزی آتے ہی یہ چہرے پگھلنے لگیں گے۔

بظاہر تمام انسانوں کے چہرے یکساں ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے سر، سینگوں اور منہ باہر نکلے ہوئے نکیلے دانتوں سے عاری ہوتے ہیں یعنی صورت انسانوں کی سی ہوتی ہے۔ مگر انھیں انسانوں میں کچھ لوگ شیطانوں سے کم خوفناک نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کا نام آتے ہی ہم محتاط ہو جاتے ہیں (شاید شیاطین بھی ہماری ہی طرح باادب باملاحظہ ہو جاتے ہوں گے) ہماری یہ سادہ دصالی بے وجہ نہیں۔ بظاہر اس قسم کے لوگوں کے چہروں پر دو ہی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں مگر یہ بات ہمارا گھبرایا ہوا دل ہی جانتا ہے کہ اب کے چہروں پر درجنوں شاطر زمانہ شناس و مردم شناس آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں ایسے چہروں کا دوسرا وصف ان کی زبان ہے جس کے متعلق کوئی بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دو تولے کی شئے کب زبان سے نشتر بن جائے گی اور کب نشتر سے خنجر اور کب ایٹم بم۔ ایسے چہروں کے نیچے اکثر کوئی سن رسیدہ وجود دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر اوقات ایسے چہرے قدرت ان بچوں کی ملکیت میں دے دیتی ہے جنھوں نے ابھی ابھی انڈوں سے سر نکالا ہے۔

اس کے برعکس کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر سجی ہوئی دو آنکھوں کے متعلق ہماری ہوشیار آنکھیں ہمیں یہ باور کرا دیتی ہیں کہ یہ آنکھیں صرف دکھانے کی ہیں۔ اندر، باہر اور اوپر نیچے۔ کہیں بھی کھا جانے والی آنکھیں نہیں ہیں۔ ایسے چہروں کے لئے ہمارے ذہن کے کسی گوشہ میں بڑا مزیدار لفظ چھپا بیٹھا رہتا ہے لہٰذا جب وہ پہلا متکلم واحد غائب بن جاتا ہے تو ہم دوسرے متکلم کے روبرو اس مزیدار لفظ کو زبان پر لے آتے ہیں ــــ "ہاہا! ـ بے وقوف ـ" لیکن اس کا سننے والا یہ نہیں جانتا کہ یہ اسی کی غائبانہ تعریف ہے جو اس کے پیچھے کسی تیسرے آدمی کے سامنے کھلے طور پر کی جائے گی۔ اور یہی کچھ وہ تیسرا آدمی بھی نہیں جانتا۔

تعریف کی مذکورہ بالا قسم جن لوگوں کا مشغلہ ہوتی ہے وہ لوگ بظاہر بڑے بھولے بھالے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے اللہ میاں کی گائے۔ صرف فہیم اور مردم شناس لوگ ہی ان کی گہری اور تجسس بھری آنکھوں سے ان کے چہرے کے پیچھے چھپے ہوئے شرارتی اور پرانے گھاگ قسم کے چہرے کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ جس طرح بچے چھوٹے سے بائی سکوپ میں ایک فلم بدل کر دوسرا لگا لیتے ہیں، یہ لوگ بھی اسی طرح چہرہ بدل لیتے ہیں۔ تب ہم ان کی گل افشانیاں دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کہ جنھیں ہم ابھی دیر سے ودیعت سمجھ رہے تھے وہ سچ مچ کی آنکھیں نکلیں۔

بوتل یا ڈبے پر لگے لیبل کو دیکھ کر اندر کے مال اور اس کی کوالٹی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آنکھیں دیکھ کر بڑی آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ جسم کی بوتل میں کیا کچھ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جن لوگوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں ان کے اندر کی خبر دینے

والے تار غائب ہوتے ہیں۔ بلکہ آنکھوں کی غیر موجودگی ان چیزوں کی موجودگی کی خبر دیتی ہے جو آنکھوں والے چہروں کے پیچھے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے دیکھنے والا واقعی آنکھیں رکھتا ہو۔

چہرے اور آنکھوں کا تعلق بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اگر کسی بات پر آپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو تو چہرہ بھی سرخ ہو جاتا ہے اگر آنکھوں سے خوف جھانک رہا ہو تو چہرہ بھی سہما ہوا نظر آئے گا۔ اگر آپ نے چلتے چلتے بھیڑ میں کسی کو آنکھ ماردی ہے اور اس آنکھ کی چوری کو چھپانا مقصود ہے تو آپ کی آنکھ کچھ اس قسم کی اداکاری کرے گی کہ اس کی پاکبازی کے آگے فرشتوں کی معصومیت بھی پانی بھرنے لگے گی۔ ایسے وقت آپ کا چہرہ بھی اس اداکار آنکھ کا ساتھ دیتا ہے لہٰذا جب کوئی آپ کو دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک نمبر کے اُلّو کے پٹھے ہیں اور یہ جانتے تک نہیں کہ آنکھ مارنا کس چڑیا کا نام ہے۔

چوک پر مستقل طور پر بیٹھنے والے عالموں اور مفتیوں کے ساتھ یہ واقعہ اکثر پیش آتا ہے۔ جس کی ابتدائی نشانیاں دیکھ کر ہم آئندہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ یوں ہوتا ہے کہ گفتگو کے دوران اچانک ان کی پلکیں پھڑپھڑانے لگتی ہیں۔ (یہ عمل مرغی کے انڈا دینے سے قبل پھڑپھڑاہٹ سے مشابہ ہوتا ہے) اور آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آ جاتی ہے چہرے اور آنکھوں کی اس گھن گرج کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کسی پرانے محل کا زنگ خوردہ پھاٹک کھولا جا رہا ہے اور جب یہ کیفیت کسی قدر کم ہوتی ہے تو ہونٹوں کے دہانے سے علم و ہنر کے دریا اُمڈنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے چہرہ کا جاہ و جلال قابلِ دید ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ علم کا سورج اگر کہیں پایا جاتا ہے تو وہ جگہ انھیں کا چہرہ ہے۔

یہ اس وقت کا عالم ہے جب ہماری آنکھیں ہمارے چہروں کے ساتھ ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ہماری آنکھیں ہمارے چہروں کا ساتھ نہیں دے پاتیں۔ جذبات کی سخت بارش میں ہم پلکوں کے کواڑ بند کر کے گھر کی خستگی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن آنکھوں کی چھت تو بہر حال ٹپکتی ہے۔ ●●

محمد بلال مرتضیٰ
جدہ سعودی عرب

قصہ قارورہ کا

پچھلے کئی دنوں سے یہ بات سننے میں آرہی ہے کہ ہندوستان میں اب مکمل طور پر "شراب بندی" ہونے والی ہے۔ جنت نشان ہندوستان میں ——!

شراب بندی کے معاملہ میں، ہندوستان کو سعودی عرب کے بعد دوسرے بڑے ملک کا اعزاز حاصل ہو جائے گا۔ سعودی عرب میں مذہبی احکام کی اتباع میں شراب حرام ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جمہور کے حکم پر ایسا امتناع عائد کیا جا رہا ہے (یہ اور بات ہے کہ ہمارے عوام، اللہ سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی حکومت سے)۔

قانون ساز اصحاب تو نشہ بندی کے سلسلے میں ہزارہا فقروں اور سینکڑوں صفحات پر مشتمل قوانین کا بڑا "پیگ" اور مہلک شراب کی طرح ضابطۂ فوجداری کے تحت مختلف میعاد کی سزائیں دریافت کرنے کا کام شروع کر چکے ہیں۔ لیکن ان میں ہمیشہ کے دستور کی طرح LOOPHOLES کی گنجائش رکھی جاتی ہے تاکہ اعلیٰ طبقہ اس کی زد سے محفوظ رہنے کے طور طریقے اپنا سکے۔

کسی تاریک رات کوئی جمعدار صاحب یا آبکاری کا کوئی جوان کسی شخص کو راہ چلتے دھر لے گا کیونکہ وہ حالت نشہ میں ہوگا۔ ایسے وقت شرابی کے پسینے چھوٹ جائیں گے چاہے اس وقت کڑاکے کی سردی ہی کیوں نہ ہو۔ ویسے تاریکی میں پسینہ نظر آنے سے رہا۔ شرابی کی جان اس وقت تک نہ چھوٹے گی جب تک کہ گنہگار رشوت کے طور پر شکاری کو خفیہ کشید کی ہوئی شراب یا ٹھرّا کی بوتل حوالے نہ کر دے جس سے کہ وہ شغل کے لئے رقص کر رہا تھا۔ پھر شرابی یہ شعر گنگناتا ہوا اپنی راہ لے گا۔

خود بھی پی چوری پی اس کو بھی پلا کر ہم نے   جھگڑا جو تھا بوتل ہی تھما دی ہم نے

جتنا حکومت کا اپنا نعرہ ہوگا ——

توبہ توبہ! شراب سے توبہ

دوسری طرف ملک بھر میں شراب سازی کے بڑے بڑے کارخانوں کے سیٹھ ساہوکاروں کو اپنے بچاؤ کے لئے کئی تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ وہ شراب کے ذخیرہ کو تلف کرنے کی بجائے یہی شراب ناب ان لوگوں کو پیش کریں گے جو ایسی تدابیر ڈھونڈ نکالیں گے جن کے ذریعہ شراب بندی کا نفاذ بھی ہوتا رہے گا اور شراب کے کارخانے بریوریز بند بھی نہ ہونے پائیں گے۔ کافی سوچ بچار ہوگا (مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا حالت شراب میں بھی سوچنے سمجھنے کی گنجائش باقی رہتی ہے !؟) کسی بڑے انسٹی ٹیوٹ یا کسی ریسرچ سنٹر کے اعلیٰ ماہرین کی خدمات سے استفادہ کیا جائے گا تب کہیں کسی جدت طرازی کا موقع فراہم ہوسکے گا۔ چند دن بعد تمام بڑے قومی اخبارات میں شراب کی تیاری سے متعلق کارخانوں کی تنظیم کے اشتہارات جگہ گھیرے ہوئے ہوں گے کہ قومی پالیسی اور مفاد عامہ کے تحت (شخصی مفاد کو زیادہ سے زیادہ پیش نظر رکھتے ہوئے) شراب کے تمام کارخانوں کو تالہ بندی کی نذر ہونے سے بچا لیا جارہا ہے اور بڑے ذہنوں کی اختراع کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہزاروں لاکھوں افراد کو بیروزگاری کا شکار ہونے نہ دیا جائے۔ چنانچہ کیمیائی کھاد یوریا (UREA) کی طرح URINE سازی کے کارخانے بڑے پیمانے پر قائم کئے جائیں گے۔ شراب کے تمام کارخانوں میں خالص URINE اور ولایتی URINE تیار کیا جائے گا اور عوامی مانگ کی مناسبت سے عوامی اور خانگی شعبہ کے تحت بھی ایسے کئی کارخانے قائم کرنے کے سلسلہ میں تیزی سے اقدامات کا آغاز ہوگا۔

اخباری اشتہارات کا زبردست چرچا ہوگا۔ کئی حلقے جو شراب کے عادی ہیں اس پریشان کن اعلان پر ششدر رہ جائیں گے۔ (لیکن صبر کے سوائے چارہ ہی کیا ہے) تنزل پسند جدیدوں، ادیبوں، دانشوروں اور شعراء کا ہنگامہ پرور اجلاس طلب کیا جائے گا اور یہ قرارداد باتفاق سرپھٹول منظور کی جائے گی کہ ؎

یہ اپنا اپنا ظرف ہے ورنہ نلے واغظ   نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل

کارکن صحیفہ نگاروں کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوگا۔ نشہ بندی کی مذمت کی جائے گی اور شراب کے سیٹھوں کو انتباہ دیا جائے گا کہ انھوں نے یہ اہم ترین اطلاع جرنلسٹوں سے کیوں پوشیدہ رکھی۔ فوری طور پر ایک دخانی پریس کانفرنس طلب کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ یہ اعلان سن کر فلمی ستارے شہاب ثاقب بنا کر گرنے لگیں گے۔ سیاست دانوں کا دنگل اکھاڑا ہوگا اور شراب کے ذریعہ خریدے جانے والے ووٹوں سے آئندہ انتخابات میں محرومی پر کف افسوس ملنے کی بجائے شراب کے جام لنڈھائے جائیں گے۔

ایر انڈیا کے مہاراجہ کا اشتہار اخبارات کی زینت بنتا ہے جس میں فضائی مسافرین سے انتہائی خلوص کے ساتھ معذرت چاہی جاتی ہے کہ انھیں فضائی سفر کے دوران شراب مہیا نہیں کی جائے گی البتہ ایر ہوسٹس کی آنکھوں سے نظریں ملا کر کیف و سرور حاصل کرنے کی اجازت ہوگی اس کے بعد بعض دل پھینک مسافر صرف ایک آنکھ سے ہی لطف پائیں کہ دوسری آنکھ گنہگار نہ ہونے پائے۔ خفیہ پریس کانفرنس طلب کی جائے گی اور کہنہ مشق صحیفہ نگاروں کو جی بھر کر شراب پلاتے پلاتے نازک اندام ساقی نما پی آر او اور فرداً فرداً سرگوشیاں بھی کرتی رہے گی۔ سوال و جواب یا کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہ جائے گی مگر رات گئے "پریس کانفرنس برخاست" کروائی جائے گی۔ صحیفہ نگار اس کو آف دی

ریکارڈ (OFF THE RECORD) رکھیں گے اور اخبارات کے کالموں کے ذریعہ کسی خوش کن یا سنسنی خیز خبر کا اظہار نہیں کیا جائے گا۔ بار بار پریس کانفرنسیں طلب کی جائیں گی تاکہ صحافت کا اعتماد حاصل کیا جاسکے (ویسے شراب اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ چلتا ہے۔ مگر آج کل کے فیشن میں نہ چولی کا وجود ہے اور نہ دامن کا صرف SEE THROUGH بلاوز اسکرٹ رہ گئے ہیں)

اخبارات میں یہ خبریں آئیں گی کہ صحت مند اور خوشحال معاشرہ کی تشکیل اور خصوصاً خلیجی ریاستوں اور عرب ممالک میں محنت مزدوری کرنے کے لئے کسرتی بدن والے نوجوانوں کی جفاکشی میں اضافہ کی غرض سے ملک بھر میں شراب کی بجائے قارورہ کو رواج دیا جائے کیونکہ یہی وزیر اعظم بمعہ وزیر صحت، وزیر داخلہ اور کئی نامور ہستیوں کی عادت ہے کہ وہ اپنا قارورہ آپ ہی نوش فرماتے ہیں اور ان کی سدا بہار زندگی کا یہی راز ہے۔

قارورہ رے قارورہ   تیرا رنگ یہ کیسا
تجھے امرت کہوں یا کہوں آبِ حیات!!

سرکاری پالیسی کی مطابقت میں تمام سرکاری پیشاب خانے منہدم کرا دیئے جائیں گے۔ ہر شخص کی جیب میں پلاسٹک کی نلکی اور بوتل ہوگی کیونکہ شخص قارورہ پینے سے دہرا لطف و سرور ملنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ شخص قارورہ ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہوگا چنانچہ ارغوانی شراب اور طبعی جام کی جگہ سنہری قارورہ کی رنگ برنگی قوس قزح کے رنگوں والی بوتلیں فروخت ہونے لگیں گی۔ ملک کے طول و عرض میں شراب کی جگہ قارورہ فروخت ہونے لگے گا۔ نہ ہی کوئی فرد بیروزگار ہوگا۔ اور نہ کسی کو پینے پلانے کی عادت چھوڑنے کا غم ستائے گا۔ وہسکی، برانڈی، رم، جن، شمپین، فینی وغیرہ وغیرہ کی بجائے صرف قارورہ کی بوتلیں دستیاب ہونگی۔ بڑے شوق سے انھیں خرید کر پیا جائے گا۔ CHILLED BEER کی طرح CHILLED URINE موسم گرما میں کسی بھی مشہور کولڈ ڈرنک کا نعم البدل ثابت ہوگا بلکہ بوتھس کی طرح URINE BOOTHS کھل جائیں گے۔ یورین ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کر دی جائے گی۔ اور کسی منسٹر کے سالے یا بہنوئی کو اس کی صدارت سونپ دی جائے گی۔ بس اسٹانڈ، ریلوے اسٹیشن، طیران گاہوں، شاہراہوں، انڈین ایرلائین، ایر انڈیا کے جمبو جیٹس اور بوئنگ طیاروں پر ریلوے کی ڈائننگ کاروں میں قارورہ بآسانی مل سکے گا۔ مسابقت جیسے جیسے بڑھتی جائے گی قیمتیں گرنے لگیں گی۔ INSTANT COFFEE کی طرح INSTANT URINE بازار میں آجائے گا۔ تسکیم تیار ہوگی تو قارورہ سے دیگر مشروبات میں پانچ فیصد الکوحل کی جگہ پانچ فیصد معصوم بچوں کا قارورہ شامل رہے گا۔ انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن میں قارورہ کے افادی فوائد پر تحقیقات شروع ہونگی۔ ریسرچ اسکالرس کو اسکالرشپس ملیں گے۔ جامعات میں نئے سرے سے تحقیقاتی کام شروع ہوگا۔ بیرونی ممالک سے طالبانِ علم اپنے علم کی پیاس قارورہ سے بجھانے چلے آئیں گے۔ اور ہمارے ملک کو پھر ایک بار اہم علمی مرکز کی حیثیت سے شہرت ملے گی۔ اور شاعرِ مشرق کا یہ ترانہ سب کی زبان پہ ہوگا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا!!

دودھ، دہی، چھاچھ، لسی، مسکہ، پنیر کی بجائے خوش ذائقہ دار قارورہ، کسٹرڈ یورین، 'CONDENSED URINE'

BUTTER ملائی' URANE CHEESE وغیرہ کو مقبولیت حاصل ہوگی۔ سڑکوں پہ استنجا کے لئے ڈھیلے استعمال کرنے والے ہوشیار ہو جائیں گے۔ دو استعمال شدہ ڈھیلوں کو پالی تھلین کی تھیلیوں میں محفوظ کرکے اس کے سفوف سے اکسیر کا تاثیر والی دوا بنا کے کو بڑھاپا زائل ہوگا۔ ارباب حکومت قارورہ کی بے پناہ مقبولیت کے باعث ذخیرہ پاشنہ قارورہ کی تعمیر کے منصوبے تیار کریں گے۔

پہلے سرکاری نلوں سے پھر گھریلو نلوں سے قارورہ سربراہ کیا جائے گا۔ فلٹر پلانٹس سے قارورہ کی کراہیت ختم ہو جائیگی۔ ملک میں قارورہ کی نہروں کا "سنہرا جال" بچھا دیا جائے گا۔ جنتا اس بات پہ فخر کرے گی کہ سربراہی آب کی جگہ قارورہ کی فراہمی کا دور پیدا ہو رہا ہے۔ دواخانوں میں بلڈ بنک اور آئی بنک کی طرح "بیریان (BRINE) بنک" قائم ہو جائیں گے۔ فاقہ کش رکشاراں اور جفاکش مزدور اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے "ضرورت سے فارغ" ہونے دواخانے پہنچ جائیں گے۔ گلوکوز کی جگہ قارورہ چڑھایا جائے گا۔ انجکشن لگیں گے تو قارورہ کے۔ کیونکہ یہی ہر مرض کا واحد علاج ہوگا۔ "ایک سیب کھائیے اور ڈاکٹر کو دھتکاریئے" والی کہاوت از کار رفتہ ہو جائے گی "ایک گھونٹ قارورہ پیجئے اور شفا پائیے" کا نعرہ مقبول ہونے لگے گا۔ سنتھٹک ڈرگس پلانٹ کو سنتھٹک یوریا کی تیاری کے لئے کارخانہ میں توسیع کی اجازت دے دی جائے گی۔ بیسویں صدی کے اواخر تک قارورہ کا استعمال عام ہو جائے گا اور ایک اوسط آبادی کی زندگی قارورہ کی رہین منت ہوگی پھر وہ دور آ جائے گا جبکہ قارورہ کو برآمد کرنے کے احکامات کا جائزہ لیا جائیگا کیونکہ جنتا حکومت نے تمام اشیائے مایحتاج کی برآمد پہ پابندی عائد کر رکھی ہوگی۔

اکیسویں صدی کے آغاز سے حکومت کے زوال کا شروعات ہوں گی اس بار عوام وعدہ خلافیوں اور جبر و ستم کی بجائے حکومت کی وعدہ وفائی سے بیزار ہو کر اس کا تختہ الٹ دیں گے اور قارورہ کا شیش محل چکنا چور ہو جائے گا۔ آج کے صحیفہ عمر کے نڈر و بیباک صحافی جو اتنے سال سے کھمبیا ہی کی جگہ قارورہ کا استعمال کرتے آئے تھے۔ کئی سنسنی خیز کتابیں منظر عام پہ لائیں گے اور کئی حیرت انگیز انکشافات پر سے پردہ اٹھے گا۔ جیک اینڈرسن کی سنسنی خیز خبروں کی یاد تازہ ہوگی۔ افسوس اس بات کا ہوگا کہ جیک اینڈرسن اس ہندوستانی امر سے محروم رہ جائے گا۔ اور ساری دنیا خصوصاً اہل ہند کو یہ جان کر سخت حیرت ہوگی کہ دلیسی ساختہ شراب بوتلوں میں بھر کر ان پہ بیرونی ساخت کے لیبل چسپاں کرنے والے منافع خوروں نے ملک میں قارورہ کے پس پردہ شراب کو عام کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر شہری چاہے وہ بچہ ہو یا جوان یا بوڑھا مرد ہو یا عورت سب کے سب بلا تخصیص اس لت کے عادی بن چکے ہوں گے۔ ہندوستانی شہریوں کی صحت گزشتہ ۳۰ برسوں کے مقابلہ میں کافی گر چکی ہوگی اور ہارے ہوئے حکمرانوں کو اس وقت علم ہوگا کہ کیوں قارورہ رنگ نہ لا سکا!!

••

تمنا مظفر پوری

ظہیر غازی پوری
سائنس داں شاعر

بہت سے واقعات یا باتیں ایسی ہوتی ہیں جو زندگی بھر اسی طرح یاد آتی ہیں جیسے کل یا ابھی کی ہیں۔ ان میں سب سے خوشگوار مثال اپنی شادی ہی کو لیجئے۔ اگر آپ اپنے پوتے کی شادی کر رہے ہیں تو بھی آپ کو اپنی شادی کی یاد آئے گی کہ جیسے یہ کل رات کی ہی بات ہے کہ آپ دولہا بنے شادی کرنے گئے ہیں اور اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھا رہے ہیں اور سہاگ رات منا رہے ہیں ظہیر غازی پوری کی شخصیت بھی اسی قسم کی ہے ان سے ملے اگر ایک عرصہ گذر چکا ہو پھر بھی ان کی یاد جب آئے گی تو ایسا محسوس ہوگا کہ ابھی ابھی وہ مل کر گئے ہیں یا آپ خود ان سے مل کر آرہے ہیں۔ اورنگ آباد (بہار) سے ہزاری باغ تک ان کے قیام کو ایک عرصہ بیت چکا ہے اور اتنے دنوں میں ان سے ملاقات کا سلسلہ بہت ہی کم رہا ہے مگر جب ان کی کوئی تخلیق نظر سے گذرتی ہے یا ان کا نام آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سانولا رنگ اونچی پیشانی والا شخص میرے سامنے کھڑا ہے۔

ظہیر غازی پوری سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی یہ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ شاید ان سے میری پہلی ملاقات رسالہ "مریخ" (گیا) کے دفتر میں ہوئی تھی۔ در اصل ان سے ملاقات کوئی تاریخی حادثہ نہیں پھر بھی مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ ان سے میری ملاقات بچپن کی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے گیا آئے ہوئے صرف گیارہ سال ہی ہوئے ہیں اور اتنے دنوں میں میں نے پایا کہ ظہیر صاحب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ سب سے اسی طرح خلوص سے ملتے ہیں جس طرح وہ پہلے ملتے تھے۔ ہاں ایک بات جو میں ان دنوں محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ظہیر صاحب کی پیشانی بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ اونچی پیشانی کے چوڑی ہونے میں ان کی عمر کا تقاضہ ہے یا ان کی بیگم کا ہاتھ۔ یہ کہنا میرے لئے ذرا مشکل ہے کیونکہ مجھے نہ تو ان کی صحیح عمر کا پتہ ہے اور نہ ان کی بیگم کے مزاج سے واقفیت ہے ہاں ان کے پڑوسی بتا سکتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے!

دوسری بات جو ان دنوں، میں دیکھ رہا ہوں وہ ظہیر غازی پوری کا رنگ ہے۔ یعنی ان کے چہرے کا رنگ سانولا

سے کچھ کچھ صاف ہوتا جارہا ہے اور دھر ان کی شاعری کا رنگ بھی نکھر رہا ہے۔ ایک بہت پرانا گھسا پٹا قصہ ہے کہ کسی شخص کو شاعری کی سوجھی اور وہ ایک مشہور شاعر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاعر موصوف نے انھیں مشورہ دیا کہ یا تو کسی سے عشق کر یا ایک ہزار اشعار یاد کرلو۔ شاعری خود بخود آجائے گی۔ ایک ہزار شعر یاد کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے بہ نسبت یہ کہ کسی سے عشق کر لیا جائے جو اس زمانے میں آسان ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ظہیر صاحب کے رنگ جو نکھر رہے ہیں۔ اس میں کسی عشق وشق کا چکر تو نہیں؟ کیونکہ آجکل کا عاشق جنگل کا راستہ نہیں پکڑتا بلکہ چہرے پر خوب غازہ ملتا ہے اور اچھے سُر میں گانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ رنگ نکھرنے کے راز اگر وہ افشاں کردیں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔ کم رنگ والے بیوٹی اکسپرٹ کے چکر سے بچ جائیں گے اور اُردو کو اچھے شاعر مل جائیں گے۔

یہ زمانہ سائنس کا ہے۔ سائنس نے زبردست ترقی کی ہے۔ پہلے انسان پیدل سفر کرتا تھا۔ پھر بیل گاڑی اور گھوڑا گاڑی کا رواج ہوا۔ اس کے بعد سائیکل نکلی پھر موٹر، سائنس نے ترقی کی تو پانی کا جہاز اور ہوائی جہاز بنا جٹ اور نہ جانے تیز رفتار سواریاں بنائی گئیں پھر راکٹ بنا کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا گیا۔ ابھی تک ہم اور آپ بیل گاڑی سے لے کر ہوائی جہاز کا سفر کرتے آرہے ہیں اور اس سفر کی روداد سناتے رہے ہیں لیکن ظہیر غازیپوری اب ہمیں "الفاظ کا سفر" کرائیں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہیر صاحب ایک سائنس داں بھی ہیں۔ ابھی تک تو ہم لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ظہیر صاحب بہار راجیہ ٹرانسپورٹ میں کام کرتے ہیں اور ایک ہی ٹکٹ سے وہ بس اور ریل دونوں کا سفر کراتے ہیں لیکن یہ "الفاظ کا سفر" ان کا ایک سائنسی کارنامہ ہے یعنی گھر بیٹھے ادبی سفر کیجئے۔ راجیہ ٹرانسپورٹ کی بس میں سفر کرنے کا تجربہ سبھی کو ہے۔ اس قدر صعوبت کہ بس چلے تو انسان اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر توبہ کرلے کہ جو سفر بس سے کر چکا سو کر چکا بس اب آئندہ کبھی راجیہ ٹرانسپورٹ کی بس کا منہ نہیں دیکھے گا مگر مجبوری ظہیر غازیپوری ہیں کیوں کہ ان سے ملاقات کے لئے بس کا سفر ضروری ہے۔

جب کسی کی کتاب شائع ہوتی ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کیونکہ اُردو کے ادیب اور شاعر کی حیثیت ہی کیا ہے کہ وہ کچھ حاصل کرسکے اور صاحبِ جائداد کہلا سکے چنانچہ کتاب شائع ہونے کے بعد کم ازکم وہ صاحب کتاب تو کہلاتا ہے۔

دوسرے مجھے اس بات کی بھی خوشی ہوتی ہے کہ میری ذاتی لائبریری میں ایک 'مفت' کی کتاب کا اضافہ ہو جانے کی امید ہو جاتی ہے تیسری اور سب سے بڑی خوشی یہ ہوتی ہے کہ آج کل رسم اجراء کا رواج ہے اور اس موقع پر میں ضرور شرکت کرتا ہوں کیونکہ اس تقریب میں کم ازکم ناشتہ اور چائے کا معقول انتظام ہوتا ہے اور ساتھ ہی فوٹو گرافی بھی ہوتی ہے۔

ظہیر غازیپوری کیسے شاعر ہیں؟ ان کی شاعری پر تنقید کرنا نقاد حضرات کا کام ہے وہی اب آپ کو بتائیں گے۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے ان کی شاعری اعتدال پسند اور میانہ روی کی ہے یعنی انھوں نے جدید اور قدیم کے بیچ کی راہ اپنائی ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ ڈرپوک قسم کے آدمی ہیں اور جھنجھٹ و جھگڑے سے بچنے کے لئے ایسی شاعری کرتے ہیں بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی وہ سائنس داں ہیں اور نئی چیز کی تلاش میں رہتے ہیں۔

مجھے اشعار یاد نہیں رہتے۔ اگر کچھ اشعار ذہن کے کسی گوشہ میں محفوظ رہ گئے تو اُسے صحیح صحیح ہی پڑھ نہیں سکتا اگر بہت اچھے اشعار ہوئے اور میرے ذہن میں صحیح صحیح محفوظ رہ گئے تو مجھے شعر اور شاعر دونوں کی درگت بن گئی یعنی میں ان کی پیروڈی کر دیتا ہوں اور قاری اصل شعر اور شاعر کو بھول کر پیروڈی کو اور مجھے یاد رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے شاعر مجھ سے ناراض ہو جاتے ہیں لہذا میں ظہیر صاحب کی شاعری کے متعلق کچھ نہ کہوں گا کیوں کہ میں ایک اچھے دوست اور شاعر سے بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ "الفاظ کا سفر" کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ ▼▼

"چٹنی"

یہ چٹنی نہ آم کی ہے، نہ املی یا پودینہ کی، نہ کسی فلم کا نام ہے اور نہ ابن صفی کا ناول، بلکہ اسرار جامعی کی ادارت میں شائع ہونے والا طنز و مزاح کا ایک پندرہ روزہ اخبار ہے جسے پڑھتے ہی آپ کا ہاضمہ درست اور دل گارڈن گارڈن ہو جائے گا۔ صرف پانچ روپے بھیج کر چھ ماہ تک گھر بیٹھے چٹخارے لیں۔

● — اخبار پسند نہ آئے تو قیمت واپس ★ سرکولیشن منیجر دی چٹنی پٹنہ – ۴

نامور مزاح نگار

"یوسف ناظم"

کے خاکوں کا دلچسپ مجموعہ

سائے اور ہمسائے

قیمت چھ روپے

بتوسط، شگوفہ

مسیح انجم

کے

مضامین

درپردہ

قیمت چھ روپے

بتوسط، شگوفہ

مزاحیہ طرحی مشاعرہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ۴؍ اگست ۱۹۷۸ء کی شب ـــ جانکی پرشاد ہال انوار العلوم کالج میں پہلی بار مزاحیہ طرحی مشاعرہ کی محفل سجائی گئی۔ مشاعرہ کے لئے ذیل کی دو طرحیں دی گئی تھیں:

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

(غالبؔ)

جو کھلکھلا کے ہنس نہ سکے آدمی نہیں

(طالبؔ)

زندہ دلانِ حیدرآباد کے میر کارواں جناب بھارت چند کھنّہ نے محفلِ شعر کی صدارت کی۔ جناب عابد علی خان مدیر روزنامہ سیاست مہمانِ خصوصی تھے جناب عابد علی خان نے اپنی تقریر میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے طرحی مشاعرہ کے انعقاد پر مبارکباد دی۔ کنوینر بگمشتی حیدرآبادی نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی اور معتمد عمومی زندہ دلانِ حیدرآباد طالبؔ خوندمیری کے شکریہ پر یہ محفل کافی دیر گئے اختتام کو پہونچی۔

طرحی مشاعرہ میں سنایا گیا کلام زیرِ نظر شمارہ میں شریکِ اشاعت ہے۔ امید ہے کہ قارئینِ کرام پسند فرمائیں گے۔

مدیر

ناچیز حیدرآبادی

"اُردو علی"!

ٹھیری ہے اب یہ بات کہ وہ شاعری نہیں
جس میں مزاح تابعِ سنجیدگی نہیں

کل تک تو سُن رہے تھے کہ بیچاری مرگئی
لیٹسٹ نیوز یہ ہے کہ اُردو مری نہیں

زندہ دلانِ شہر کو جب یہ خبر ملی
مارے خوشی کے عقل ٹھکانے رہی نہیں

اُردو کا نام لے کے یہ اعلان کردیا
"جو کھلکھلا کے ہنس نہ سکے، آدمی نہیں"

بزمِ سخن سجائی بہ اندازِ طرحِ نو
انعام جو خبیر کو نیت بُری نہیں

بٹ او ڈیر فرینڈس، لسن، ڈونٹ فارگیٹ[1]
صرف ایک ہاتھ سے کبھی تالی بجی نہیں

اُردو کی زندگی ہے بڑے ڈینجر میں آج
سنگین مسئلہ ہے، ہنسی دل لگی نہیں

اُردو کا اعتبار بہ ہر فن بڑھائیے
اُردو کا انحصار فقط شاعری نہیں

اُردو کے کاروبار کا حال ان سے پوچھئے
سُود و زیاں کی بات بھی ان سے چھپی نہیں

ویری لیٹ

ق

آ: از دے رہے ہیں کہ اُردو کے فنڈ میں
کچھ اور دیجئے ابھی جھولی بھری نہیں

اُردو کا ان سے نام ہے اُردو سے ان کا نام
'اردو علی' کہو انھیں عابد علی[2] نہیں

ق

اُردو پریم رس کے کئی جام پی گئے
بھارت کی پیاس ہے کہ ابھی تک بجھی نہیں

بُوجھو گے یہ پہیلی تو پاؤ گے تم اوارڈ
بھارت میں چند کھنہ[3] ہیں ہیں کی سہی نہیں

کرسی چھٹی ہے جب سے اجیرن ہے زندگی
کوٹھی نہیں ہے، کار نہیں، اردلی نہیں

آجا مری نگارِ وزارت کہ بن ترے
تن کو سکون، روح کو آسودگی نہیں

طلابِ شعر و فن کو سنا دیں جناب صدر!
ناچیز کا کلام ہے یہ پھلجھڑی نہیں

۱ But O, dear friends, listen & don't forget ۲ میر عابد علی خان ایڈیٹر روزنامہ 'سیاست'

۳ بھارت چند کھنہ

اے عشق تحمل زخموں کی جہاں میں کمی نہیں
پھر کیا سبب ہے ایک بھی اب تک ہنسی نہیں
اُردو زباں کی فصل سیاسی زمین میں
بوئی گئی ضرور ہے، لیکن اُگی نہیں

طالب خوندمیری

برق آشیانوی

ڈاکٹر کی شاعری

اک ڈاکٹر نے بھول کے اک شعر کہہ دیا — مطلب ہی جس کا خبط تھا مفہوم بھی نہیں
اور پھر سنایا ایک پرانے مریض کو — سن کر مریض کو کوئی آئی ہنسی نہیں
کیونکہ مریض، شاعرِ طنز و مزاح تھا — اس کی نظر میں شعر کی ہیئت بھی نہیں
تب ڈاکٹر نے شعر کے بارے میں یہ کہا — زندہ دلی نہ ہو تو کوئی زندگی نہیں
دھڑکن ہے اس میں ہارٹ¹ کی، رفتار پلس² کی — اس میں کسی جگہ پہ کوئی رگ دبی نہیں
تھرمامیٹر لگا کے ذرا اس کو دیکھئے — پرفیکٹ نارمل ہے، شک اس میں کوئی نہیں
وین³ اور آرٹیری⁴ کے ہیں افعال معتدل — حالت بھی لنگس⁵ اور لیور⁶ کی بری نہیں
میں نے کیا ہے آپریشن احتیاط سے — غفلت کی میرے فن میں کوئی بات ہی نہیں
تشبیہ و استعارے کے ٹانکے لگائے ہیں — بینڈیج⁷ کوئی زخم پہ باندھی گئی نہیں
گر، پوسٹ مارٹم بھی کرے کوئی اہلِ فن — غلطی کہیں بھی اس کو نظر آئے گی نہیں
گر، آپ چاہیں اس کا نکلوائیں ایکسرے — آئے گی یہ رپورٹ کہ خامی کوئی نہیں
سب کیجئے لیکن اس کو ENIMA نہ دیجئے — STRONG 'DIGESTION ایسی کسی کی نہیں
اور ہاں جناب SEX کی مت بات کیجئے — جائز ہمارے شعر میں یہ "مسخرہ" نہیں
گیارنٹی شعر کی ہے، بہت لانگ لائف ہے — صدیوں میں موت آئے گی اس کو کبھی نہیں
تعریف میرے شعر کی یہ مختصر ہے دوست — "جو کھلکھلا کے ہنس نہ سکے آدمی نہیں"
بولا مریض سن کے یہ تعریف شعر کی — میں جانتا ہوں غلطی کوئی آپ کی نہیں
ہڈی و پسلی توڑ کے رکھ دی ہے شعر کی — اس میں زبان و فن کی کوئی بحث ہی نہیں

بس راستہ ذرا سا بھٹک کر نکل گئے
یہ شاعری ہے .DOC کوئی سرجری نہیں

1. HEART 2. PULSE 3. VEIN 4. ARTERY 5. LUNGS 6. LIVER 7. BANDAGE

ایک مریضہ!

[illegible]

اک ڈاکٹر نے اپنی مریضہ سے یہ کہا — یہ ڈر کیا ہے، آپ کو کچھ بھی ہوا نہیں
پسلی اجابتیں ہیں تو پھر ناف ٹل گئی! — بولی مریضہ، ناف تو میری ٹلی نہیں
پھر کیا تو آپ اٹھتی ہیں راتوں میں چونک کے — بولی مریضہ [illegible] نہیں
میرا خیال ہے کہ ہیں آسیب سے متاثر — [illegible] نہیں
تنگ آکے ڈاکٹر نے کہا سینہ دیکھ لوں
بولی مریضہ دل میں تو تم ہو، کوئی نہیں

اسمٰعیل ظریف

غزل

اب تک یہ بات میں نے کسی سے کہی نہیں
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں غزل آپ کی نہیں

گر مُفت ہاتھ آئے تو وہ شئے بُری نہیں
مرغی کسی کی آئی ہے گھر میں چُھری نہیں

چاہت کا آپ کی انھیں احساس ہی نہیں
یہ دھاندلی ہے اُن کی کوئی بے رُخی نہیں

دس سال بعد وہ نظر آئے کلب میں کل
اب تو میک اَپ کے بعد بھی وہ دلکشی نہیں

ویسے چمک رہا ہے کلر دُور سے مگر!
ماڈل بتا رہا ہے کہ گاڑی نئی نہیں

اب لائن مارنے کا زمانہ گزر گیا
روشن تو ہے چراغ مگر روشنی نہیں

چھوٹے میاں کا دوست تھا پکچر میں اُنکے ساتھ
دھوکہ ہوا ہے آپ کو وہ چھوکری نہیں

نانا کے مال پر بھی نواسے کی ہے نظر
مجبور اس لئے ہے کہ نانی مَری نہیں

کھایا غلیظے، گرد بھی جھٹکی گئی مگر
ہیرو کی دال اُن کی گلی میں گلی نہیں

انگلینڈ جاکے بھائی پریشان ہو گئے
سرکس میں تک ملازمت اُن کو ملی نہیں

جوڑے کی اس کو دے کے رقم کیجئے مدد
لڑکے کو نوکری کہیں اب تک ملی نہیں

مجھلے نے کاروبار کو چھلکے لگا دیا
سسرال میں بھی اب تو کوئی دھنمڑی نہیں

پہلے بھی رہ چکے ہیں کئی بار BAR میں
میرے لئے حضور کوئی اجنبی نہیں

چھوٹے کو لے کے ساتھ وہ میکہ کو چل دیئے
دس دن سے اپنے گھر میں کوئی کرکری نہیں

بے شک منا کے جا کے ہنی مُون ہم نے میں
لیکن مِرے حضور وہاں چاندنی نہیں

خندق میں دوست ہو تو رہو تم فصیل پر
خطرے میں خود کو ڈالنا مردانگی نہیں

ہم کو بھی اپنے دیش کی صنعت پہ ناز ہے
لیکن ہمارے ہاتھ پہ دیسی گھڑی نہیں

واعظ، رقیب، شیخ و برہمن و محتسب
ان سب سے دوستی ہے مِری دشمنی نہیں

ہنس بول کر گزاریئے زندہ دلی کے ساتھ
رو کر گزارنے کے لئے زندگی نہیں

بکواسیت کا نام ظرافت نہیں ظریف
جو دل کو گدگدا نہ سکے شاعری نہیں

چوّا — گرآبڑ حیدرآبادی

کہتا ہے پانچ بھائیوں کی کیسے نبھے گی دوستی
دو بھائیوں میں سوچئے اب تک بنی نہیں

کہتے ہیں جو دھری سے یہ دیہاتی صاف صاف
دُنیا ہے اقتدار سے یاں دوستی نہیں

غزلیں

مُصطفٰے علی بیگ

بندوق ہیٹ گاڈ سے لو، بندگی نہیں
ہیومانٹی سے دُور کی زندگی نہیں

دن کو ٹرافک ہوتی ہے سڑکوں پہ رَش جب
دل بھی تمہارا تنگ ہو یہ لازمی نہیں

مجبوریوں نے چھین لی سب مُرغ اور مَغش
سانبر پہ جو ڈبّی پڑی ہے یہ سادگی نہیں

سرتاپا وائٹ واش ہیں نیچے ہے اُنکی برف
یعنی کہ ٹیوب لائٹ ہے، پر روشنی نہیں

لاکھوں ہوئے ہیں فیل کئی اِف ڈیڈ ہیں
وہ اک اکیلا آدمی ہے، آدمی نہیں

وادِل [illegible] سنا کر یہ کہہ گیا
جو کھلکھلا کے ہنس نہ سکے، آدمی نہیں

میرٹ پہ وہ داخلی ہیں سبجکٹ تو کنڈیشن ہے
ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہیں جو، آرڈی نری نہیں

کوشش ہے اُن کی ہم پہ کریں یہ کلاریفائی
وہ [illegible] ہیں، پر جامنی نہیں

[illegible] حیدرآبادی

اُفتادِ دل، اِسی لئے میں نے کہی نہیں
ہرایک ہے فرشتہ یہاں، آدمی نہیں

بکھرے ہوئے ہیں جام، صُراحی میں خون ہے
پیرِ مُغاں سے رِندوں کی شاید بنی نہیں

جنتا کی لاش پر ہوئی تعمیرِ قصرِ نو
کہتا ہے کون آج ترقی ہوئی نہیں

لیڈر بذاتِ خود رہا عُریاں حجاب میں
میری نگاہِ شوق کی رخنہ گری نہیں

اِس دَورِ حکمرانی کا معیار دیکھنا
تعلیمِ عصرِ نو کا یہ رنگیں خیال ہے
آوارگی نگاہ میں آوارگی نہیں!

سُن کر مرے کلام کو کہتے ہیں سامعین
[illegible] کی باتیں ہیں یہ شاعری نہیں

کچھ شعر کچھ باتیں

سلام خوشنویس

تم نے جو طرح دی ہے، مری جان کی نہیں
رَدیفی ہوئی زمیں ہے، مگر چٹپٹی نہیں

ہنسنے کو ہنس رہا ہوں مگر، یہ ہنسی نہیں
میں خود کو دوں فریب تو یہ زندگی نہیں

کافی ہے زندگی کے لئے زیرِ لب ہنسی
زندہ دِلی کا نام ہنسی، دِل لگی نہیں

مُرغا اُدھر ہے جھاڑیوں میں سورج لیے ہوئے
مُرغی اِدھر ہے جانب میں، انڈا ابھی دی نہیں

ہم نے "متاعِ واہ" پڑھی ہے بعد نیاز
فوراً خرید لیں وہ جنہوں نے پڑھی نہیں

خورشید بھی، ادیب بھی، مخدوم بھی تو تھے
تو بس شاعری کی ابھی تک کمی نہیں

لپٹے ہوئے ہیں آج بھی اپنے بدن سے وہ
چادر تھی ایک میلی سی، اب تک دُھلی نہیں

لیکن اگر کہوں تو سُلگ جائیں گے سبھی
اقبال کی بات یہ ہے کہ پیچھے چلی نہیں

مجروح بھی کھڑے ہیں گنہگار کی طرح
[illegible] لب تک پہنچی نہیں

وہ جاں نثار تھے تو غزل کی بھی آبرو
آنگن میں چاند اب بھی ہے وہ چاندنی نہیں

اُترا سا ہے، بس گئے خیالی مکان میں
[illegible] بھی تو چھپی [illegible] نہیں

رنگوں کے امتزاج سے اک نقش بن گیا
تلوار کی جو کاٹ ہے، وہ شاعری نہیں

آہستہ یہ [illegible] اب جو خیر!
لیکن راستے بدلنا بڑی بات بھی نہیں

ہم بھی تمہاری دید کے طالب ہیں اے شفیق
لو کتاب اچھا جواب تک چھپا نہیں

سرپٹ حیدرآبادی

چوّا

چھچھوں سے دوستی مری اب تک بنی نہیں	اب تک کسی کی مَیں نے خوشامد بھی کی نہیں
کہتے ہیں لوگ سُن کے مرے شعر واہ' واہ	مَیں ہوں اکیلا' کوئی مری پارٹی نہیں

غزل

جو کوئی دُم بُریدہ نہیں' آدمی نہیں
سچّی ہے' ڈاروِن کی غلط تھیوری نہیں

اب تک کبھی خرید کے خود مَیں نے پی نہیں
بالقصد و اختیاری مری میکشی نہیں

ہے ناز بے مثالی پہ اپنی' مرے سوا
زندہ دِلوں میں چکنا گھڑا کوئی بھی نہیں

منڈوے تلے چنبیلی کے جا کر وہ جل گئے
جن دوستوں کی دوستی پھُولی پھَلی نہیں

مَن مانی کرکے' جُوتیاں کھانا تھی جن کی خو
اب کوئی منچلا وہ نہیں' منچلی نہیں

خواہش تھی جس کے وصل کی' اُس کا ہُوا وصال
سب جھگڑے ختم ہو گئے' کچھ کِرکِری نہیں

گھُٹ گھُٹ کے جان دینا کسی کے فراق میں
کہتے ہیں اور کیا اسے گر خودکشی نہیں

بے جوڑ کی وہ جوڑی ہے مہمل' فضول' لغو
پہلو میں بوڑھے کے' کہ اگر بوڑھی نہیں

بجھتا ہے اِک چراغ تو جلتا ہے اِک چراغ
دُنیا میں بے وقوفوں کی کوئی کمی نہیں

بُڈھا ہوں میں تو کیا ہُوا' دل ہے ابھی جوان
اُمّیدِ ترکِ عاشقی' مجھ سے ابھی نہیں

سرپٹ جو زندہ دل ہیں اُنھیں کی ہے زندگی
جو مُردہ دِل ہیں اُن کی کوئی زندگی نہیں

غزل

[illegible]

محفل میں ان کی بات' ہماری چلی نہیں
کُتّے کی دُم ہے جو کبھی سیدھی ہوئی نہیں

یہ فیشنی لباس کا میک اَپ کا ہے کمال
ورنہ کسی کے حُسن میں کچھ دلکشی نہیں

لیتا تھا مال مُفت کا دل باغ باغ تھا
بے موت مر گئے ہیں جو رشوت ملی نہیں

محنت کی ہو کمائی تو پینا حرام ہے
مِل جائے مے جو مُفت کی پھر تو بُری نہیں

دعدے ہیں لیڈروں کے الیکشن میں جیت کر
تکمیل بھی ہو وعدوں کی یہ لازمی نہیں

اُلّو اگر نہیں تو وہ ہوگا گدھا ضرور
جو کھِلکھِلا کے ہنس نہ سکے آدمی نہیں

پوچھو مزہ اسی سے جو مرتا کسی پہ ہو
ہے عشق گرم شوربہ باسی کڑی نہیں

بالکل قری ہے بچوں کا دُنیا میں واقعہ

غزل ——— اشرف خوندمیری

قسمت کی چکنی ہنڈی غموں سے پھٹیچ نئیں
پھٹ گئی اُنے تو پھر کبی جم کر جمیچ نئیں

بدلی کے چاند کی کبی چھنتی پڑ تیچ نئیں
یاں روتی صورتوں کی تو قسمت ایچ نئیں

بندر کے ناد جو بی ہسیا اُس کا گھر بسیا
گرگٹ کے مُوں کی جُل کو بی رونق چڑھیچ نئیں

جس کا بی مُوں پُھلیا اُنے منگس کا بھیٔ کتے
جو کھِلکھلا کو ہنس نہ سکیا آدمیچ نئیں

بلکل اپوٹے کھجلی لگا کو کھکور لیئو !
بلوٹ کی کانچ کوری سے کھجلی اُٹھیچ نئیں

مچھکنی کے نات کیکو تمیں اتّا بھوک رئیں
انگار دل کے چٹلوں میں پھر بی لگیچ نئیں

چمٹی کے نات تم بی ذرا جم کو لوچ لیئو
شرما کو لوچنے سے جلن بی پٹہ تیچ نئیں

چپکے چپیچ کیکو کی مُوں کو گہن لگائے
کیا اُس کی قسمتوں میں ذری روشنیچ نئیں

بودا اگھڑا تو روز بھر تاتے چو طرف
پن کی کھنکتی مٹکی تو بُن بی سکیچ نئیں

اشرف تماری آسل گھڑک ہُوی تو کیا ہُوا
کب بی خوشی کے انڈے اُنے سکیتیچ نئیں!

احوالِ واقعی

رشید عبدالسمیع جلیل

کرسی نہیں ہے، میز نہیں، روشنی نہیں
دفتر میں اپنی حاضری کمپلسری نہیں

ناظم ہے محکمہ کا کوئی ناظم القبور
نازل اگر ہو غصہ نہیں، زندگی نہیں

چپراسی سو رہا سرِ دیوار بنچ پر
صاحب کی تین روز سے کمسنٹری نہیں

تعلق ہے اس صدی کا ہماری نظر میں چیف
شفٹنگ یا آوٹنگ کے ہوا اسٹوری نہیں

اِک دستخط جو مار کے غائب ہے منتظم
پنکشن میں اس کے بعد کوئی آدمی نہیں

صاحب کے نوکروں کے بھی ہم ہیں سبارڈنیٹ
گر یہ نہ ہو تو پھر نوکری نہیں

بیوی سے لڑ جھگڑ کے چلے آتے ہیں جناب
کہتے ہیں زندگی میں کوئی لطف ہی نہیں

بدلے نظام وقت جو آئی ہے وہ گھڑی
تاریخ گر نہ بدلے کسی کام کی نہیں

اِک سر کو نکال کے سو جائیں گے سب
آفس سمجھتے ہیں پہنا کھٹیں کھلی نہیں

ڈنکل کھُلیں گے نیند کے، دفتر میں نت نئے
ریفری رہا کریں گے یہاں دفتری نہیں

کھٹکے خود کرے گی حکومت مقابلے
چپکے ٹنگے رہیں گے ... برائے نیند

ہے دعوتِ سخن تجھے، بجا شن نہ دے جلیل
یہ شاعری ہے پیارے کوئی ... نہیں

غزلیں

بوگس حیدرآبادی

لکھوانا دوسروں سے غزل شاعری نہیں
سچ تو یہی ہے میری غزل بھی ! بری نہیں

سب ڈھلتے چلتے پھرتے ہیں رستوں پہ صبح و شام
چاروں طرف ہے موت کہیں زندگی نہیں

شادی سے پہلے مجھ کو دکھائی گئی تھی جو
جلوہ میں سامنا جو ہوا، تو وہی نہیں

ہم نے اُسے پلائی تھی دو آتشہ شراب
کمبخت اتنی سخت ہے کہ ڈولتی نہیں

تھے چار پیسے پاس تو سسرال سب تھی ساتھ
اب مفلسی میں سالی کوئی پاس بھی نہیں

جاگی لے پہننے پہ بتاتی ہیں یہ بات
سر پٹ ہے اُس کا نام مگر دوڑتی نہیں

مینڈک سے لے کے بینڈ کی بابت ہے حرص کے
دونوں میں کچھ بھی سمجھنے کی بھی دوستی نہیں

سارا کلام ہوتا ہے بوگس کا زر خرید
سب جانتے ہیں بات یہ کچھ راز کی نہیں

[illegible] جونپوری

دولت کی اُن کے پاس اگرچہ کمی نہیں
پھر اُن کے گھر میں یارو کبھی بھی روشنی نہیں

یہ بات عام ہے، یہ کوئی راز کی نہیں
جو رو کا جو غلام ہے وہ آدمی نہیں

ٹی وی، مکان، کار کی گیارنٹی دیجئے
شادی کی بات ورنہ کروں گا کبھی نہیں

گھر میں کیلنڈروں کی ہے بھرمار دوستو
افسوس میرے گھر میں کوئی جنتری نہیں

کاما نہ فل اسٹاپ نہ پیراگراف ہے
تحریرِ عاشقی کوئی تحریر ہی نہیں

ویسے بھی میرا دھندا تو کچھ اور ہے جناب
پاکٹ ملپیر میں کوئی پیدائشی نہیں

ہر اک ستم تو دُنیا کا ہے عارضی مگر
بیوی کے جو ستم ہیں کبھی عارضی نہیں

ہر بار جوتے کھا کے وہ کہتے ہیں عشق میں
کپڑوں پہ دھول جو تھی ابھی تک اُڑی نہیں

اِن پڑھ یہ بات سچ ہے [illegible] ہے وقت کا
جو کھلکھلا کے ہنس نہ سکے، آدمی نہیں

پاگل عادل آبادی

غزلیں

جو دے نہ قرض مجھ کو "بھلا" آدمی نہیں
دشمن ہوں اُس کا اس سے مری دوستی نہیں

مضبوط دوستو یہ مری کھوپڑی نہیں
یہ "میڈ انڈیا" کی ہے جاپان کی نہیں

نرسوں کو گھورنے کے لئے ہوگئے شریک
بیمار ہیں پر اُن کو دوا لازمی نہیں

دعویٰ ہے دوستی کا تو چلیے کسی ہوٹل
ورنہ تمہاری بندے سے اب دوستی نہیں

ڈاڑھی کا میری اور نہ مطلب نکالیے
شاعر ہوں ماڈرن میں کوئی مولوی نہیں

خَر تو کریں گے شوق سے خرمستیاں جناب
سرکار کی سڑک ہے ترے باپ کی نہیں

فوراً خدا کا شکر ادا کیجئے میاں
اولاد نمبری جو اگر آپ کی نہیں

فٹ پاتھ پر ہی پیدا ہوئے اور مرگئے
جنگل میں کھیت گاؤں میں اب جھونپڑی نہیں

پاگل ہے بات پھر بھی یہ کہتا ہے عقل کی
یہ بات دوستو ترے پلے پڑی نہیں

ٹکل ہنڈی

میں ہل چلا رہا ہوں کوئی دل لگی نہیں
میری زمین ہے یہ ترے باپ کی نہیں

جس لیڈری میں دھن کی دھنا دھن تڑی نہیں
کنجوس وہ بیوہ ہے کوئی لیڈری نہیں

پیسہ خرچ کر شعر سنو گھس کو یاں نہ آؤ!
یارو مشاعرہ ہے ٹکٹ سے، فری نہیں

زندہ دلوں کا شہر ہے ہی ہی، ہو ہو، ھاھا
جو کھلکھلا کے ہنس نہ سکے آدمی نہیں

پیتا ہوں روز تم کو بھی پلواؤ دوستو
گاؤں میں میسر جہاں کہیں واڑی نہیں

ہر صبح ناشتے میں سنو تم مری غزل
گر ذائقہ بدلنے کو پالسی کڑی نہیں

بچوں سے کیا ککھیروں سے، دیگوں سے کام لوں
میری کسی غزل میں بھی چیچہ گری نہیں

گلی پر اڑان تھی ڈنڈے کے مارے
ڈنڈے کے بعد پھر کہیں گلی اڑی نہیں

غزل

طالب خوندمیری

جب کسی لڑکی سے رشتہ چاہیئے
تندرستی اپنی دیکھا چاہیئے
نازنینوں کو ستانا ہو اگر
عمر اُن کی پوچھ لینا چاہیئے
ایک گھر میں ہوں اگر دو بیویاں
کم سے کم شوہر تو بہرہ چاہیئے
جو اُجالے میں نظر آتے نہیں
اُن کے چہرہ پر بھی برقعہ چاہیئے
آخرش بیگم نے سٹپٹا کر کہا
اب ہمارے گھر میں جھولا چاہیئے
اوروں کی ڈاڑھی میں تنکا ڈھونڈنے
پہلے اپنا شیو کرنا چاہیئے
ہم سفر ہو چاند سی صورت اگر
راستے میں گھپ اندھیرا چاہیئے
منحصر میک اپ پہ ہو جس کا شباب
اس کو منھ بھی ڈرم سے دھونا چاہیئے
زاد و شیخ ہیں جنھیں تکلیف ہو
ان کو بیٹھی نیند سونا چاہیئے
قیس کی بیڑی جلانے کے لئے
عارضِ لیلیٰ کا شعلہ چاہیئے
مصرعۂ غالبؔ پہ طالبؔ کی گرہ
"آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے"

غزل

مصطفیٰ علی بیگ

ہاتھ میں میرج کی ریکھا چاہیئے
پُرسش یہ ہے جنجال جی کا چاہیئے
چودھویں منزل پہ ہے ان کا فلیٹ
ایک عدد رسّی و چھیکا چاہیئے
موٹے تازے اور ہلتی مرغ کو
کس طرح کاٹیں یہ سیکھا چاہیئے
ان کے تھوڑے سے ATTENTION کے لئے
گاہے کھانسا جائے چھینکا چاہیئے
اِک کلو پاؤڈر و کاجل سو گرام
"آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے"
دیکھ لیتا ہوں خوشی کے کچھ ڈریم
زندگی میں کچھ تو دھوکا چاہیئے
وائف اپنی ہے حسیں مانا مگر
ہم کو AS A CHANGE ریکھا چاہیئے

قطعات

گڑبڑ حیدرآبادی

لیڈروں کے صدر کا ارشاد ہے
آپ کو گر مفت کشتہ چاہیئے
کوئی پابندی نہیں پیشاب پر
پیجئے جس جس کو جتنا چاہیئے

بچہ کا اغوا

ریس آئی جیب خالی ہو گئی
اب کسی صورت سے پیسہ چاہیئے
پھول سا بچہ ہے جھولے میں پڑا
اس کی رکھوالی کو ماما چاہیئے

غزل

گڑبڑ حیدرآبادی

ہم کو رشوت میں نہ پیسا چاہیئے
کام کے بدلے میں بنگلہ چاہیئے

آج کے لیڈر کو کیا کیا چاہیئے
مرغی و وہسکی اور گنجفہ چاہیئے

کیمپ کا جس کو نسخہ چاہیئے
لیڈروں کا چمچہ بننا چاہیئے

لیڈروں کے صدر کا ہے انتخاب
چور قاتل اور غنڈہ چاہیئے

ایسے فالوور کی ان کو ہے تلاش
خاندانی اصلی چمچہ چاہیئے

ہم ہیں لیڈر اور وزیر مستند
چور دروازے سے تحفہ چاہیئے

چائے فرش اور پھل کا پے منٹ کرے
ایسا گڑبڑ صدرِ جلسہ چاہیئے

○

غزل

سرپٹ حیدرآبادی

مجھ کو مرغی اور نہ مرغا چاہیئے
ناشتے میں دودھ انڈا چاہیئے

حسن میک اپ کر چکا ہے عاشقو
قبر ہے تیار، مردہ چاہیئے

خوبصورت ہر حسین ہوتا نہیں
دیکھنے کا بھی سلیقہ چاہیئے

اندھا کر دیتی ہے بے حد روشنی
کچھ اندھیرا کچھ اُجالا چاہیئے

گڈھے، ٹیلے رہروؤں کے واسطے
راستہ بھی اونچا، نیچا چاہیئے

لڑنا بھڑنا ہر جگہ اچھا نہیں
بعض موقعوں پر دبکنا چاہیئے

ریوڑیاں مجھ کو بھی دے گا کچھ نہ کچھ
بانٹنے والا اک اندھا چاہیئے

لت نہیں جن کو نہیں ہے قدرِ مے
لیکن اوروں کو پلانا چاہیئے

وہ خفا ہیں مجھ سے میں ان سے خفا
بیچ میں دونوں کے چمچا چاہیئے

مستقل خاموشی سرپٹ ہے مضر
گاہے گاہے ہنہنانا چاہیئے

○

غزل

اسمٰعیل ظریف

کثرتِ اولاد ہونا چاہیئے
گھر میں کچھ تو شور و غوغا چاہیئے

نہ تو حلوہ نہ پراٹھا چاہیئے
بھائی کو بھجیا سموسہ چاہیئے

مارتے پھرتے ہیں منہ جو بعد پہ
ایسے حیوانوں کو چارا چاہیئے

پھر رہے ہیں شہر میں خرگوش بھی
جال سڑکوں پر بچھانا چاہیئے

بیٹیاں چھ سات ہوں تو غم نہیں
کم سے کم اک پور بچا چاہیئے

سلسلہ صفحہ

لاکھ بااخلاق ہو سالا مگر
اُس کے جھانسے میں نہ آنا چاہیئے
ان سے کچھ کھٹ پٹ بھی چلتی ہی رہتی ہے
گھر میں ایسا بھی تماشا چاہیئے
قدر و قیمت گھٹ گئی اسٹیل کی
آج کل چاندی کا چمچا چاہیئے
اِتنا ہولا پن بھی اب کس کام کا
کچھ تو بھیجے میں اُجالا چاہیئے
آج کل تھالی کے بینگن کی طرح
آدمی کو گول پھرنا چاہیئے
فوٹو اخباروں میں چھپواؤ مگر
دس برس پہلے کا حُلیہ چاہیئے
منہ چڑھانے سے بنے گا کچھ نہیں
بات کرنے کا سلیقہ چاہیئے
زندہ دل شعرا نے کی کوشش بہت
آج ہر شاعر کو تمغہ چاہیئے
جس کو وہ خاطر میں لاتے ہی نہیں
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے
اک رُخی چاہت سے کچھ حاصل نہیں
"کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے"
آپ کب سے بن گئے شاعر ظریف
"آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے"

غزل

رشید عبدالسمیع جلیل

جی اگر چاہے کہ ہنستے ہی چاہیئے
ٹسٹ ٹیوب اک پاس رکھا چاہیئے
گر چکی ہے قیمت ماء اللحم
اب تو شربت "ٹیوب افزا" چاہیئے
استخارے پر گذر اوقات تھی
اب کوئی دھندا انوکھا چاہیئے
ہے مناسب شاعروں کے واسطے
مرتبانوں میں بسیرا چاہیئے
عاشقی کی ہر روایت زندہ باد
میتر سے عاشق کو ڈھونڈا چاہیئے
ایک ریکھا مستقل اور باکمال
ہو ہتھیلی میں تو پھر سے کیا چاہیئے
ہے اُجالے میں سخاوت آپ کی
کچھ اندھیرے میں بھی پھینکا چاہیئے
نا میلی پہ تو بس ملتی نہیں
چل کے اب کوٹھی پہ بیٹھا چاہیئے
عید آتی ہے تو بیگم کے لئے
فسٹول اڈوانس پورا چاہیئے
پیاز، املی، مرچ ثابت، دال مونگ
اے گرانی! ایک تولہ چاہیئے
کس کو کہنی ہے یہاں طرحی غزل
قافلوں سے استفادہ چاہیئے
امتحانی تلیوں میں اب جلیل
اک نئے آدم کو دیکھا چاہیئے

(باقی آئندہ)

دیز یداللہ مہدی

چہ خوب ـــ قسط (۲۶)

آپ کے اس کھنچے کھنچے انداز میں بے تعلقی اس نپے تلے رویے کو کیا نام دوں کہ بُرے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے
آپ بھی صرف سایہ تھے جو ایک معمولی سی جنبش کے لیے بھی محتاج ہوتا ہے۔ خود اپنے ہی وجود کی ایک ایک حرکت کا بستی کے
لوگوں کی طرح کیا آپ کی نظروں میں بھی مشکوک ہو گئے ہیں۔ خدا کے لیے ایسا مت سوچیے ـــ مت سوچیے ایسا ـــ ؟"
اتنا کہہ کر شیو کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا، ہم نے بھی اپنے اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ محسوس کی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں کم از کم شکوک و شبہات کا وہ تار [illegible]
ں کا ایک سرا ہم نے خیالوں ہی خیالوں میں شیو سے جوڑ دیا تھا۔

دل محبت آشنا نے ذہن فتنہ انگیز کو صلواتیں سنانی شروع کر دیں کہ اتنی اچھی، اتنی پیاری، اتنی معصوم دوشیزہ پہ
ـک کرنے چلے تھے جسے دیکھ کر مردے بھی جی اٹھیں ـــ مسیحا بھلا کسی کی جان لے سکتا ہے...... اصاب وہی مسیحا اپنی
آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لئے ہمارے سامنے فریادی کی طرح کھڑا تھا اور ہم کسی "بانجھ بیوہ" کی طرح اپنے لیے اٹھائی
ری کی موت کی دعا مانگ رہے تھے۔ یہ ساری کارستانی دراصل ہمارے دماغ کی تھی، ایک معصوم دوشیزہ کا دل توڑنے کا
و تو سزا ملنی چاہیے کم بخت کو، اور سزا بھی ایسی کہ دنیا دیکھے اور کچھ نہیں تو کم از کم عبرت ہی پکڑے۔ فوراً خیال آیا کہ ان دنوں
دگی ہی میں اپنا اعضائے رئیسہ وغیرہ کے بارے میں وصیت کرنے کا چلن عام ہو گیا ہے، ہم بھی اپنے دماغ کے بارے
ں وصیت کر جائیں گے کہ ہماری موت کے بعد ہمارے شر انگیز و فتنہ خیز دماغ کو کسی مسکین اور بدصورت قسم کی کھوپڑی میں فٹ
کر دیا جائے۔ اس طرح ہمارا انسانی دماغ براہ راست [illegible] پا جائے گا۔ ہماری زندگی میں نہ سہی بعد میں ہی سہی ـــ دماغ کے
[illegible] یہ سوا [illegible] کہ ہم کسی حد تک مطمئن ہو گئے تاہم اطمینان کلی پھر بھی نصیب نہیں ہوا [illegible] شیو کی مد
بھری آنسوؤں کے [illegible] یہ ستم [illegible] ہمیں [illegible]
ر بیٹھا تھا۔

ہم نے کچھ [illegible] شیو کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی [illegible] کی غرض سے [illegible]
[illegible]

شکایتیں داخل دفتر" ہوگئیں۔ جب مطلع صاف ہوا تو یہ بات بھی ذہن میں صاف ہوگئی کہ شبّو پر شک کرنا گویا اپنے آپ پر شک کرنے کے مترادف تھا۔ بات مارے شرم اور خفّت کے شبّو سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن "چپ شاہ" کی طرح گم سم کھڑے ہونا بھی حماقت ہی ثابت ہوتا، اس لیے نظریں جھکائے ہوئے ہی شبّو سے سوالیہ انداز میں پوچھا ——

"کیا تمہارا دل، دماغ اس حادثے کو خودکشی ماننے کو تیار ہے —— ؟"

ہمارے اس اچانک بلکہ بھیانک سوال پر شبّو نے متحیر نظروں سے ہماری جانب دیکھا پھر ہمارے سوال کے جواب میں ایک سوال کر ڈالا۔

"آپ اس حادثے کو خودکشی نہ ماننے پر اس قدر مصر کیوں ہیں —— ؟ اسی سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت ہے آپ کے پاس یا کوئی معقول دلیل ہے —— "

سوال معقول تھا لیکن فی الحال ہمارے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ ہم ابھی تک صرف قیاس آرائیوں میں الجھے ہوئے تھے مصروفیات کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ چنانچہ سنبھل سنبھل کر نپے تلے لہجے میں شروع ہو گئے ——

"ٹھوس ثبوت تک پہنچنے کے لیے، قیاس اور مفروضے کی سنگلاخ وادی سے گزرنا پڑتا ہے جس میں خود اپنے بھٹک جانے کا قدم قدم پر خطرہ لگا رہتا ہے" فی الحال مرا ذہن اسی بھول بھلیاں میں الجھا ہوا ہے، تاہم جن حالات میں یہ اندوہناک واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے، ان حالات کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یقیناً یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ یہ نہ تو اقدام خودکشی ہے نہ اتفاقی حادثہ بلکہ اس میں کسی کے سفاک ہاتھ ضرور ملوث ہیں۔ ایسے ہاتھ جو اس سے پہلے بھی کئی زندگیوں سے کھیل چکے ہیں

ہم نے تمہید تو خاصی کامیابی سے باندھ لی تھی لیکن اصل موضوع پر آتے ہوئے پھر بھی ڈر لگ رہا تھا، کیونکہ جس موضوع پر راست وار کرنا تھا اس کا شبّو سے خونی رشتہ تھا، موضوع اگرچہ کہ کافی بھاری بھرکم تھا لیکن بات بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز تھی۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ایک ترکیب سوجھ گئی موضوع گفتگو کو شال میں لپیٹ کر موضوع کے ساتھ خود کو بھی محفوظ کر لیا اور پھر بات آگے بڑھائی ——

"زہریلے سانپ سے کسی کو ڈسوانا یا پھر انجکشن یا خوراک کی شکل میں زہر دینا یہ خطرناک کام وہی کر سکتا ہے جو اس کے معاملے میں کافی معلومات رکھتا ہو —— " ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ شبّو نے بے صبری سے مداخلت کی —— "آپ کا اشارہ خان فولادی کی طرف تو نہیں —— ؟"

"تم نے ٹھیک پہچانا —— " ہم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا —— "مجھے باوثوق ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ پھوپھی اماں —— "

"پھوپھی اماں —— یعنی کہ —— نہیں نہیں —— " شبّو نے پھر ہماری بات اچک لی۔ اس بار لہجہ اس قدر سخت تھا کہ ہم اندر ہی اندر لرز کر رہ گئے۔ قبل اس کے کہ شبّو آگے کچھ اور کہتی ہم نے انہیں نارمل کرنے کی غرض سے بات پلٹی ——

"پھوپھی اماں کی وہ جو بلی تھی نا —— مالا، اس کی موت بھی زہر خوردنی کی وجہ سے واقع ہوئی تھی —— "

"اوہ نو (——) نہیں —— نہیں —— " اتنا کہہ کر شبّو نے ایسی نظروں سے ہماری طرف دیکھا جیسے انہیں ہماری دماغی حالت پر شبہ ہو —— ہم نے اپنا دامن بچانے کی غرض سے فوراً ایک احتیاطی چال چلی —— "ہو سکتا ہے یہ خبر غلط ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھوپھی اماں کو اس کا سرے سے علم ہی نہ ہو —— ؟" ہماری یہ چال کسی حد تک کارگر

دی۔ شبو کی آنکھیں کسی گمبھیر سوچ میں ڈوب گئیں، ہم نے انہیں ایک اور غوطہ دینے کی کوشش کی ـــ'

"اگر بلی کی موت بھی واقعی زہر خوردنی کی وجہ سے واقع ہوئی ہے تو پھر یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان دونوں قتلوں کے پیچھے ایک ہی شخص کا ہاتھ ہے' اور وہ شخص خان فولادی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے۔

"آپ کے اندازے قرین قیاس ضرور ہیں ـــــ" شبو نے سوچتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ہماری مصروفیات کی تائید کرتے ہوئے کہا ـــ

"لیکن پھوپھی اماں کی بلی کو زہر دے کر خان فولادی کو کیا فائدہ ہوا ہوگا ـــ"

"ہو سکتا ہے' اگلا خطرناک قدم اٹھانے سے پہلے اس نے اپنے بچاؤ کی خاطر یہ حرکت کی ہو' تاکہ جب یہ بات کھل کر سامنے آئے تو پھوپھی اماں اور مرحوم کے کشیدہ تعلقات کی روشنی میں پھوپھی اماں کی ذات زیادہ مشکوک ثابت ہو ـ!"

"ہو سکتا ہے اس طرف تو واقعی میرا دھیان گیا ہی نہیں ـــ" شبو کے اس جملے نے ثابت کر دیا کہ اس معاملے میں وہ پوری طرح ہماری ہم خیال ہو چکی ہیں' تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔ اب ہم نے اصل مقصد کو واضح کرنا شروع کیا ـــ "

"معاملہ چونکہ بے حد نازک بھی ہے اور سنگین بھی' میں خان فولادی کو ٹٹولتا ہوں، تم کسی طرح پھوپھی اماں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ بلی کی موت طبعی تھی یا واقعی زہر خوردنی کا نتیجہ ـــ !" شبو نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم نے اپنی چال کی کامیابی پر دل ہی دل میں ناز کیا اور آگے بات بڑھائی ـــ "آج شام میں کلب میں یا پھر جہاں کہیں بھی خان فولادی سے سامنا ہو سکتا ہو' میں وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں' تم شام تک پھوپھی اماں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو ـــ اور بہت محتاط طریقے سے اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔ پھوپھی اماں کو اصلیت کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ ورنہ ہماری جانب سے خواہ مخواہ ان کا دل میلا ہو جائے گا ـــ"

"آپ مطمئن رہیے' میں پوری احتیاط سے یہ بات معلوم کروں گی" شبو نے ہمیں یقین دلاتے ہوئے آگے کہا ـــ

"ہاں آپ خان فولادی سے ذرا ہوشیار رہیے۔ وہ بڑا مکار اور کائیاں شخص ہے ـــ"

"تم میری فکر مت کرو' وہ اگر ڈال ڈال ہے تو میں پات پات پھدکوں گا۔ ہم نے شبو کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور پھر شبو کے خود سپردگی والے انداز پر ایک ایسی حسین غلطی کا ارتکاب کیا جس کی صاف لفظوں میں وضاحت اس اچھے خاصے ناول کو خواہ مخواہ "سنسر بورڈ" کی طرف سے بالغوں کا سرٹیفکٹ دلوا سکتی ہے۔ تاہم عقل مند کو اشارہ کافی ہے اب رہے "عقل مند" حضرات تو ان کی عقل کو بند ہی رہنے دیجیے ـــ !!!

● شام میں کلب جاتے ہوئے گھڑی بھر کے لئے ہم اس ہوٹل میں گئے جہاں بے دھڑک ٹھہرا ہوا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر ہمیں مایوسی ہوئی، ایک مختصر سا پیغام ہمارے نام چھوڑ کر بے دھڑک شہر جا چکا تھا' اسی مختصر سے پیغام میں اس نے لکھا تھا کہ دو چار روز کے لیے وہ کسی خاص کام کے تحت شہر جا رہا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں اگر اصلی مجرم کے خلاف کچھ ٹھوس ثبوت ہمارے ہاتھ لگیں تو بے صبری کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ اس کی واپسی کا انتظار کریں ـــ پتہ نہیں اس کی اس تاکید میں کون سی مصلحت پوشیدہ تھی' یہ وہی بتا سکتا تھا' ہم نے بھی فی الحال اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی اس گتھی کو موجودہ صورت حال میں سلجھانے کی حماقت کرنا اس مثل کے مصداق ہوتا کہ سوت نہ کپاس جلاہے

سے لیس تھا۔ ابھی تک ایک آدھ ثبوت بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا، بلکہ ثبوت کی بو باس بھی نہیں لگی تھی، بہر حال اپنی قوت شامہ کو بیدار کرتے ہوئے ہم جس وقت کلب پہنچے خاصی شام ہو چلی تھی، آسمان کی چوکی پہ دن کا چوکیدار اپنی ڈیوٹی ختم کر کے رات کے چوکیدار کو "چارج" دینے کے بعد گھر جا چکا تھا۔

ہم نے خان فولادی عرف طوطا پری کو کلب کے مختلف گوشوں میں تلاش کیا اور بالآخر ایک گوشے میں بیٹھے پکڑ لیا۔ ابھی تک صرف نظروں کی پکڑ تھی۔ یہ گوشہ کلب کا میخانہ "تھا" اور طوطا پری ایک نیم تاریک گوشے میں تنہا بیٹھا، شاید وہسکی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہا تھا، ہم بلا تکلف اس کی میز تک پہنچے اور پھر بے جھجک اس کے روبرو والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے، کچھ دیر تک تو وہ خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا، پھر میز پر رکھے ایک خالی گلاس میں تھوڑی سی وہسکی انڈیلی، اس میں سوڈا ملایا اور پھر یہ لبریز جام ہماری طرف بڑے پیار سے دوستانہ انداز سے بڑھایا ——— ہم نے دل ہی دل میں طنز سے مسکرا کر سوچا ——— اچھا بچو! اسکے کی جگہ "وہسکی" لگا رہے ہو ——— لیکن میں تمہیں بخشنے والا نہیں، نرم گدیوں اور آرام دہ کرسیوں پر بہت بیٹھ چکے، اب ذرا بجلی کی کرسی کا مزا بھی چکھو ——— جس قدر پیار اور اپنائیت سے اس نے جام ہماری طرف بڑھایا تھا، ہم نے اسی قدر نفرت اور حقارت سے وہ جام اس کی طرف لوٹا دیا ——— اس نے بڑی عجیب نظروں سے ہمیں گھورا اس کی نیم وا آنکھیں ڈبائی ہوئی تھیں۔ اس کی پیش کش کو ہم نے جس بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا اس سے یقیناً اسے ٹھیس پہنچی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں۔ اس کی آنکھوں کی یہ ڈبڈباہٹ یا تو اس کی شراب نوشی کا نتیجہ تھی پتہ نہیں وہ کتنی دیر سے بیٹھا پی رہا تھا یا پھر ٹوٹتی بکھرتی بنتی بگڑتی یادوں کے سلسلے نے اسے جذباتی بنا دیا تھا۔ بہرحال آج پہلی بار اس کی سانپ جیسی چمکتی، زہریلی آنکھیں، انسانی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں، ہمارے لوٹائے بلکہ ٹھکرائے ہوئے جام سے ایک ہلکی سی چسکی لینے کے بعد اس نے راست ہماری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا مشکوک اشخاص کی فہرست میں آپ نے بھی غالباً میرا ہی نام سر فہرست رکھا ہوگا اتنا کہہ کر وہ مسکرایا ——— ایک ایسی مسکراہٹ جس میں صرف طنز ہی طنز تھا، دوسروں کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے لیے ——— پھر بولا ——— "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسان جس ہستی کو دل و جان سے چاہے، دنیا کی نظر میں اسی ہستی کا قاتل سمجھا جاتا ہے۔ چاہت انسان کو مٹانا نہیں مٹنا سکھاتی ہے، میں ان باتوں کو صرف کتابی باتیں سمجھا کرتا تھا لیکن جب نادرہ کو دیکھا، اس کو چاہا تو ان باتوں پر مجھے یقین آیا ——— وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی ——— تھی ——— ہاہا ——— اس کے حلق سے قہقہہ نکلا ——— جس میں درد کی لہر تھی، کرب کی آگ تھی، پھر اس نے میز پر اپنی کہنیاں ٹکا دیں اور کسی قدر جھک کر اپنا چہرہ ہمارے چہرے کے قریب کرتے ہوئے بولا ——— آپ میرے اور نادرہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کچھ نہیں کوئی بھی نہیں جانتا، ہم بہت جلد شادی کرنے والے تھے، نادرہ نے وکیل سے مل کر "خلع نامہ" بھی تیار کر لیا تھا، وہ صاحب سے علیحدہ ہونا چاہتی تھی اور کسی بے رحم سفاک نے اسے دنیا سے ———"

اس کا گلا اس قدر رندھ گیا تھا کہ بقیہ الفاظ اس کے حلق میں ڈوب کر رہ گئے۔ اس نئی اطلاع نے ہمیں ایسا ذہنی جھٹکا پہنچایا کہ کچھ دیر کے لیے ہماری بھی بولتی بند ہو گئی اور جب بولتی پر لگا "بند" ٹوٹا تو ہم نے طوطا پری سے پوچھا تو گویا آپ کی نظر میں بھی یہ خودکشی کا کیس نہیں بلکہ قتل کی واردات ہے ———!"

"سوفی صد قتل کی واردات ہے ا!" ـــــ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ہم نے گے ہاتھوں اس کے ذہن کی اڑان کا اندازہ لگانے کے لیے یہ خطرناک سوال بھی اس سے پوچھ لیا ـــــ "

"جیسا کہ آپ نے کہا کہ یہ سوفی صد قتل کی واردات ہے تو پھر آپ نے بھی مشکوک اشخاص کی ایک فہرست اپنے ذہن میں ضرور مرتب کی ہوگی، کیا ان اشخاص کے نام بتا سکتے ہیں آپ ـــــ!"

"کیوں نہیں ـــــ!" اس نے فوراً ہماری بات اچک کر کہا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا جام خالی کرنے کے بعد آگے بولا ـــــ "نواب صاحب کے پورے خاندان پر شک ہے مجھے، یہاں تک کہ آپ بھی میری اس فہرست میں شامل ہیں۔"

"م ـــــ م ـــــ میں ـــــ میں ـــــ" ہماری یہ گڑبڑاہٹ اور بوکھلاہٹ فطری ردعمل کا نتیجہ تھی، ہم نے جلد ہی اپنی زبان لڑکھڑاہٹ پر قابو پالیا اور پھر آگے کہا ـــــ

"مجھے اس فہرست میں آپ نے کس حساب سے فٹ کیا ہے، نہ تو میں آپ کی طرح مرحومہ کے امیدواروں کی بھیڑ میں شامل تھا، نہ مرحومہ سے کوئی ذاتی پرخاش رکھتا تھا، اور نہ ہی ـــــ"

"آپ کی ساری تاویلیں اپنی جگہ درست ہیں بجا ہیں ـــــ" طوطا پری ہماری بات ختم ہونے سے پہلے ہی دخل اندازی کرتا ہوا بولا ـــــ

"لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں کہ بے تعلق ہوتے ہوئے بھی نواب صاحب کے گھر سے آپ کا جو تعلق ہے اور خاص طور سے شبو سے آپ کی جس طرح گاڑھی چھنتی ہے اس کے پیش نظر اپنی شخصیت بھی اس واردات میں ملوث نظر آتی ہے ـــــ"

طوطا پری کی اس نئی تاویل نے ایک بار پھر ہماری بولتی بند کر دی۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا جو اتنے کم وقفے میں دو مرتبہ ہماری بولتی بند ہو چکی تھی۔ خود کو بڑا نروس محسوس کر رہے تھے ـــــ اچھے اچھے باہوش و حواس سورما ہمیں آج تک نروس نہیں کر سکے تھے۔ لیکن اس وقت ایک شرابی نے ہمارے "نروس سسٹم" کو خاصا اتھل پتھل کر دیا تھا۔ اپنے اس تکلیف دہ احساس کو کم کرنے کے لیے ہم نے وہی اوچھا وار کیا جو اکثر باہوش و حواس لوگ شرابیوں پہ کیا کرتے ہیں ـــــ "آپ کی ان بے معنی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خاصی چڑھ چکی ہے۔ آپ کو۔۔۔ اب رکھ دیجئے یہ جام و ساغر۔۔۔۔"

ہمارے اس طنز پر ایک زہرناک مسکراہٹ طوطا پری کے ہونٹوں پہ نمودار ہوئی اور پھر وہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا بولا ـــــ "جس نے کسی کی دائمی جدائی کا زہر ہنستے ہنستے پی لیا ہو پھر اسے کوئی اور نشہ نہیں چڑھتا مسٹر ـــــ میں اب بھی پورے ہوش میں ہوں ـــــ اپنی زندگی کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑتا ہوا دیکھ کر جس کے حواس معطل نہ ہوئے ہوں اس کے حواسوں پہ یہ عارضی نشہ کیا اثر انداز ہوگا ـــــ ایک بات کان کھول کر سن لو مسٹر، جس دن کوئی ٹھوس ثبوت میرے ہاتھ لگا وہ دن نادرہ کے قاتلوں کی باعزت زندگی کا آخری دن ہوگا ـــــ !!"

بات ختم کرتے کرتے وہ اس قدر جوشیلا اور جذباتی ہو گیا کہ خود پہ قابو نہ رکھ سکا، نتیجے میں اس کے ہاتھ میں تھما گلاس اس کی فولادی انگلیوں کی تاب نہ لا کر "چٹاخ" سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کرچیں یقیناً اس کی انگلیوں اور ہتھیلی کو بھی زخمی کر گئے تھے۔ ہم نے فوراً اپنا رومال نکالا، اس کی انگلیوں اور ہتھیلی کے ان حصوں کو صاف کیا جو کانچ کی کرچیوں کے چبھ جانے سے زخمی ہو گئے تھے، پھر برف سے ان زخموں کو دھو کر رومال کو اچھی طرح پانی میں بھگو لیا اور پھر اس گیلے رومال کو اس کے ہاتھ پر اس طرح لپیٹ دیا کہ اس نے تمام زخمی حصوں کا احاطہ کر لیا۔ اس سارے عمل کے دوران طوطا پری بالکل بے حس بنا دیکھتا رہا۔ جب ہم نے بھی اس سے ایک

لفظ نہیں کہا۔ البتہ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے رخصت ہونے کے لیے اٹھے اور میز پر اپنی دونوں ہتھیلیاں ٹکا کر کسی قدر جھکے اور پھر طوطا پری کی نیم وا آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نہایت ہی سرد لہجے میں بس اتنا ہی کہا —— "اب جناب سے اسی وقت ملاقات ہوگی جب یا تو میرے خلاف کوئی ثبوت آپ کے ہاتھ لگے گا یا پھر آپ کے خلاف کوئی ثبوت میرے ہاتھ لگے گا یا پھر آپ کے خلاف کوئی ثبوت میرے ہاتھ لگے گا تب تک کے لیے خدا حافظ ——" اور پھر ہمارے اس چیلنج کے جواب میں اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا کسی قسم کا عملی مظاہرہ کرتا، ہم نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگئے ——!

● ہم جس وقت گھر پہنچے، خاصی رات ہوچکی تھی۔

اپنی دھن میں مست چال چلتے ہوئے جیسے ہی بڑے ہال میں داخل ہوئے ایسے منظر سے آنکھیں دو چار ہوئیں کہ چال کی مستی ہوا ہوگئی اور اس کی جگہ چال میں بھونچال آگیا۔ لپک کر نزدیک پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ شبو، پھوپھی اماں، خانساماں اور ایک خاص ملازم کے علاوہ بڑے دنوں بعد قبلہ پیر خوب بھی اپنے تہہ خانے سے نکل کر اس مجمع میں موجود کسی چیز کو گھیرے ہوئے تھے جو چیز ان سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی وہ ایک گٹھڑی نما شے تھی، جب ہم نے ذرا اور نزدیک سے اس گٹھڑی نما شے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی بے جان شے نہیں بلکہ جاندار گٹھڑی ہے جس کے چار ہاتھ پاؤں بھی تھے، کیونکہ اسی گھڑی، اس گٹھڑی میں جنبش ہوئی اور اس کے ہاتھ پاؤں یوں کھلنے لگے جیسے بھوتک مارنے پر بیر بہوٹی "اپنے ہاتھ پاؤں کھول دیتی ہے آہستہ آہستہ خراماں خراماں —— جب گٹھڑی، اچھی طرح کھل گئی تو اس کی صورت بھی بالکل واضح ہوگئی —— وہ گٹھڑی نما شے قبلہ پیر خوب کے سب سے پرانے نمک خوار خاندانی ملازم خاص جناب چھابو خاں ولد بابو خاں، ساکن حیدرآباد المتخلص بہ دکن مرحوم ومغفور ——

پہلے تو موصوف کے حلق سے "خر —— خر —— ذر —— خرزر ——" قسم کی لایعنی آوازیں بلند ہوئیں پھر ان کے نتھنے اس طرح پھڑ پھڑانے لگے، جیسے کسی کی ناک میں "بتی" کرنے پر چھینک کی آمد سے پہلے سگنل کے طور پر نتھنوں میں "پھڑ پھڑاہٹ" پیدا ہوتی ہے ——

موصوف کے پھڑکتے "نتھنوں" نے ہمارے نتھنوں کو گویا مہمیز لگائی اور لاکھ ضبط کے باوجود ایک گرجدار چھینک ہمارے حلق اور ناک سے اس طرح نکل گئی کہ اس کی گونج نے بیدار افراد کو تو چونکایا ہی بے ہوش گٹھڑی بھی "ہوش" میں آگئی۔ چھابو خاں ولد بابو خاں کی آنکھ کھلتے ہی ہم پر پڑی۔ کیونکہ اتفاق سے ہم عین ان کے روبرو کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی موصوف کی آنکھوں کی پتلیاں اس تیزی سے گردش کرنے لگیں جیسے دوبارہ بے ہوشی کا پروگرام ہو۔ پھر ان کی لڑکھڑاتی زبان سے ایک ہی لفظ نکلا۔ —— بھ —— بھ —— بھوت —— !! اور اس کے ساتھ ہی بے چارے دوبارہ "گٹھڑی" میں تبدیل ہوگئے ——!

موصوف خود تو بڑی آسانی سے گٹھڑی بن گئے لیکن ہمیں ایک خوفناک "مخمصے" میں پھنسا گئے۔ قریب میں اگر آئینہ ہوتا تو اپنی شکل دیکھ کر کم از کم یہ اندازہ تو لگا لیتے کہ ہم واقعی ہم ہیں یا بھوت بن چکے ہیں۔ یہ خوف اتنا شدید تھا کہ ہم نے دوسروں کی موجودگی کی پروا کئے بغیر اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ کہیں ہمارے سینگ تو نہیں نکل آئے۔ جب یہ مرحلہ بخیر وخوبی "سر" ہوگیا تو ہم نے اپنے سر کو جھٹک کر گویا اس خوف کو جھٹکنے کی کوشش کی اور پھر یہ بات بھی ہماری طمانیت کے لیے کافی تھی کہ موصوف چھابو خاں ولد بابو خاں کے علاوہ جتنے بھی افراد یہاں موجود تھے ان میں سے کسی نے بھی موصوف کے "قافیہ" پر شعر کہہ کر ہم پر چسپاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ خلل ہماری شخصیت میں نہیں بلکہ دیا بو خاں کے دماغ میں تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہم نے سوالیہ نظروں سے شبو کی طرف دیکھا کہ آخر معاملہ کیا ہے ——!

ماہنامہ

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت: منظور احمد، حمایت اللہ، مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
بھارت چند کھنہ
مجتبیٰ حسین

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

سالانہ (۲۰) روپے

غیر ممالک سے (۳۵) شلنگ

مطبوعہ: دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد ۲
برائے: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۲

بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو عبادت خانہ حسینی، پرانی حویلی۔ حیدرآباد ۲

ترسیلِ زر اور
خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ
۳۱ - مجرد گاہ
معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون: 57716

ستمبر ۱۹۷۸
جلد (۱۱) شمارہ (۹)



RANCHHODDAS & SONS
INDIA
PURANDAS
کشمیری قوام

(فہرست)

شگوفہ کے دس سال کی تکمیل پر

یادگار خصوصی اشاعت

ڈرامہ نمبر

مہمان مدیر :

ساگر سرحدی مشہور ڈرامہ نگار و فلم اسکرین پلے رائٹر اور مکالمہ نویس

- اُردو کے مزاحیہ ڈرامے مرہٹی، تلگو، گجراتی، کنڑی، بنگلہ اور انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں کے شاہکار ڈراموں کے تراجم اور کئی دوسری دلچسپیاں
- ۳۰۰ سے زائد صفحات خوبصورت رنگا رنگ ڈسٹ کور کے ساتھ
- قیمت : ۱۲ روپے
  مجلد : ۱۵ روپے
- سالانہ خریداروں کو یہ خصوصی نمبر

ریکارڈڈ ڈیلیوری کے ذریعہ

دس روپے میں ارسال کیا جائے گا

مشتہرین حضرات اور سالانہ خریداروں سے درخواست ہے کہ قبل از وقت اپنے آرڈر بک کرالیں۔

یوسف ناظم

فیضؔ صاحب کے نام کُھلا خط

[نوٹ : یہ خط مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بمبئی کے استقبالیہ جلسے میں ۲۸۔ اگسٹ ۶۸ء کو راقم الحظ نے خود مکتوب الیہ کو سنایا۔ مکتوب الیہ نے اپنے فی البدیہہ جواب میں فرمایا ، محبوبہ کی خاطر بیوی کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔]

—— یوسف ناظم

بندہ پرور !

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما ، کہوں گا تو بات سچ تو ہو گی لیکن بنے گی نہیں کیونکہ مصرعہ ہٰذا میں دیر پا اور مستقل خوشی کا
ک نہیں ہے اور مجھے کہنا یہ ہے کہ فیضؔ صاحب آپ کا اس طرح ہندوستان آنا ، دو چار دن یہاں "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کی طرح
د پچکے چپلتے واپس ہوجانا بڑا کھلنے لگا ہے۔ اب بہتر یہ ہے کہ اب آپ یہیں رہیں۔ گھومنے پھرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔
پ کافی ہی نہیں ، کافی سے زیادہ گھوم پھر لئے۔ اب بہت ہو چکا اور اگر آپ ہندوستان میں رہ بھی گئے تو آپ کا سیر و سیاحت
شوق یہاں بھی پورا ہو سکتا ہے۔ آپ نے ہندوستان کا نقشہ تو دیکھا ہی ہے۔ یہ کافی بڑا ملک ہے بلکہ برِ صغیر ہے جو اتنا بڑا ہے
خود ہندوستان میں بیسیوں لوگ ایسے ہیں جو باہر تو ہو آئے ہیں لیکن ہندوستان نہیں دیکھ سکے ہیں۔ ہمارے شہر اورنگ آباد
کو لے لیجئے۔ وہاں کتنے ہی لوگ ہیں جنھوں نے ایلورا و اجنتا کے غار نہیں دیکھے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں وجد کی نظمیں پڑھ لیں کافی
ہ۔ اب اس کا کیا علاج۔ آگرے میں بھی ان معزز حضرات کی تعداد کچھ کم نہیں ہے جنھوں نے تاج محل نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ
ان کے کئی لوگوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تاج محل اسی شہر میں رکھا ہوا ہے۔ میں ان نوجوانوں کی بات نہیں کر رہا ہوں جو ساحرؔ
نظم پڑھ کر اُدھر جانے سے احتراز کرتے ہیں۔ اِن لوگوں نے تو اپنے محبوب سے ملنے کا کوئی اور انتظام کر رکھا ہے۔

فیض صاحب! آپ کو کنہیا لال کپور کی وہ بات یاد ہوگی جس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا تھا اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے تو ہندوستان میں سب کچھ موجود ہے۔ اور اس سے تو آپ انکار نہیں کرسکتے کہ آپ بیارے نہیں ہیں۔ آپ ہندوستان میں کچھ دن جم کر رہیئے تو سہی پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ اگرچہ لوگوں کو غم روزگار سے فرصت کم ہے لیکن آپ کے حصے میں وہی "پہلی سی محبت" آئے گی۔ جو محبت آپ کے نام لکھ دی گئی وہ بس لکھ دی گئی۔ آپ ہم سے پوچھتے کیوں ہیں خود ہی یہاں ٹھیر کر دیکھ لیجئے کہ ؎ ان دنوں رسم و رہِ شہر نگاراں کیا ہے۔

مجھے تو چند دن پہلے یہ خبر ملی تھی کہ آپ دلّی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر بھی مقرر ہوگئے ہیں۔ میں نے فوراً درخواست بھیجی کہ مجھے ایم اے میں داخلہ چاہیئے (فیض صاحب، ایم اے تو پہلے ہی سے ہوں لیکن زنگ آلودہ۔ سوچا تھا اس طرح کچھ دن میتر سے محبت رہے گی) لیکن اپنی سرکاری تاریخ پیدائش ۱۹۱۸ء لکھنے میں مجھ سے شاید گڑبڑ ہوگئی۔ یونیورسٹی سے جواب موصول ہوا کہ ہندوستان کی ساری یونیورسٹیوں میں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہونے والے امیدواروں کا داخلہ بند ہوئے ڈیڑھ سو سال ہوگئے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا آپ کے تقرر کی خبر بھی ہمارے ہاں کی عام افواہوں کی طرح کی افواہ تھی۔

ایک بات فائدہ کی اور عرض کروں۔ آپ جس قسم کے شعر کہنے کے عادی ہیں اس قسم کے اشعار کے لئے آپ کو مواد ہمارے ہاں زیادہ مقدار میں ملے گا۔ آپ کی "عرضِ تمنا" کرنے کی عادت یہاں بخیر و خوبی برقرار رہ سکتی ہے۔

اگر آپ کہتے ہیں کہ ؎ "تم آرہی ہو تو بجتی ہیں میری زنجیریں" تو یہاں بھی آپ کو ایسے رفیق ملیں گے جنھیں آپ کا ساتھ دینے کے لئے رقص کرنا ہے تو اپنے پاؤں کی زنجیر کی پرواہ نہیں کریں گے۔ آپ "گلشن لاہور" سے چمن بردوش یہاں آتو جائیے اور دیکھئے کہ "صبح بنارس" آپ کو کس طرح گلے لگاتی ہے۔ فیض صاحب یہ وہی صبح بنارس ہے جو ایک مرتبہ جوش صاحب کو نظر آگئی تھی تو انھوں نے بے ساختہ کہا تھا

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے　　اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

(کہا جاتا ہے کہ جوش صاحب نے بڑے زمانے کے بعد صبح دیکھی تھی۔)

بہرحال ہم قلم، ہم قدم، ہم زبان اور ہم رقص بھی آپ کو یہاں مل جائیں گے۔ رہے ہمدم تو ان کا انتظام ہمارے ہاں مشکل ہے لیکن آپ کو ان کی حاجت بھی کیا ہے۔ آپ کو ان کی عادت ہی نہیں ہے۔ آپ تو ان لوگوں میں سے ہیں جو ؎

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی

"شیشوں کا مسیحا" نہ سہی "شیشے کے آدمی" تو ہم فراہم کر ہی دیں گے جو آپ کی دعا میں شریک ہوں گے۔ اور کہیں گے۔

خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی
نہ کوئی واقعہ گذرا نہ ایسا کام ہوا
زباں سے کلمۂ حق راست کچھ کیا جاتا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحاں ہوتا

بہرحال مطلب دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق کی دُعا سے ہے چاہے وہ کسی طرح مانگی گئی ہو یہاں لوگ اب بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ؏ "ہر 'نہیں' ہاں سے بڑی ہے۔" اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کے بھی قائل کہ ؏ "تہذیب تو شائستگیٔ 'دیدہ' تر ہے"

ڈر رہا ہوں کہ خط طویل نہ ہو جائے اور آپ اسے بغیر پڑھے رکھ دیں۔ کھُلا خط بھی میں نے اس لئے لکھا ہے کہ مرزا ظفرالحسن کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ اپنے نام آئے ہوئے خطوط کھولتے ہی نہیں اور صرف حبیب عنبر دست کے نغموں کی خوشبو سے جی بہلاتے ہیں۔ آپ کے دوست ڈاکٹر باقر مرزا نے البتہ کہیں لکھا ہے کہ آپ آنکھیں ہمیشہ کھُلی رکھتے ہیں اور پہروں رات کے اندھیرے میں خلا میں خدا معلوم کیوں گھورتے رہتے ہیں۔ محترم فیض صاحب! میں کون ہوتا ہوں کہ آپ کو کوئی مشورہ دوں لیکن عرض یہ ہے کہ اندھیرے میں نہ گھورا کیجئے کیونکہ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
وہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

اور اگر آپ خلا میں اس لئے گھورا کرتے ہیں کہ ؎

چلو فیض پھر سے کہیں دل لگائیں　　سُنا ہے ٹھکانے کے دن آرہے ہیں

تو میری رائے ہے یہیں رہ جایئے۔ یہ دن یہاں آنے ہی والے ہیں لیکن آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ اگر آپ نے یہاں رہ کر پھر کبھی یہ سوچا کہ ؏ موسمِ گُل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام تو اِن دنوں بڑی مشکل ہو جائے گی۔ جب آپ نے یہ بات کہی تھی تو وہ زمانہ اور تھا۔ اُن دنوں مکان زیادہ سے زیادہ دو منزلہ ہوا کرتے تھے۔ اب تو عمارتیں ۲۰، ۲۵ منزلہ اونچی بننے لگی ہیں۔ اگر کوئی محبوب اتنے اونچے پر نمودار ہوا بھی تو اس کا ہم جیسے خاک نشینوں اور کمزور بینائی والوں کو نظر آنا تو بالکل ممکن نہ ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں اس قسم کے نازک اندام لوگوں کو دُوربین کی مدد سے دیکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ بائنوکلرس میں اِن لوگوں کے پورے خد و خال ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے موسمِ گُل کا یہیں کہیں قریب میں کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔ اگر آپ میری بات مان کر یہاں ٹھیر گئے تو اس سوال کو بھی کسی دن "موضوعِ سخن" بنائیں گے اور کیا تعجب کسی چارہ گر کی زنبیل میں کوئی نسخۂ کیمیائے محبت مل جائے اور کسی کے آنچل یا رخسار یا پیراہن کے فیض سے کوئی چلمن رنگین ہو جائے چلتے چلتے ایک بات اور۔ آپ سے اس لئے بھی یہاں ٹھیرنے کے لئے کہہ رہا ہوں کہ یہیں چند کم سخن لوگوں کی ضرورت ہے

فقط آپ کا نیازمند

یوسف ناظم

اعجاز وارثی سنبھلی

... ہو گئے

انقلاب آیا تو ایسا ! نقشے اُلٹے ہو گئے
سچے جھوٹے ہو گئے اور جھوٹے سچے ہو گئے

چھچھ گیری کے تقاضے، الاماں والحفیظ
سالا جب ایم۔پی ہوا، بہنوئی سالے ہو گئے

نام جمعہ تھا مگر دورِ ترقی کے نثار
بی جمالو کے میاں مسٹر جمالے ہو گئے

پانچ سو والے بھی مل جاتے ہیں سو کے بھاؤ میں
سنتے ہیں برسات میں شاعر بھی سستے ہو گئے

جن کے دسترخوان پر رہتا تھا چمچوں کا ہجوم
وائے قسمت ایک دن وہ خود بھی چمچے ہو گئے

جمع خوری، نیتا گیری، اسپیچ، اسمگلری
بے شمار اس دور میں عزت کے دھندے ہو گئے

تلخیٔ دوراں میں سبزی کی گرانی کھل گئی
حد یہ ہے، کونین کے داموں کریلے ہو گئے

ارفع و اعلیٰ میں ہوتا تھا جن انڈوں کا شمار
گرمیٔ سیاست! وہ بھی گندے ہو گئے

حضرتِ اعجاز کو جب داد کا چسکا پڑا
شعر تو کیا کہتے البتہ گویّے ہو گئے

ظفر جگدیوی

غزل

ہر بات میں من مانی، لاحول ولا قوۃ
گھر والی ہے دیوانی، لاحول ولا قوۃ

سسرال میں بھی عمدہ کھانوں کو ترستا ہوں
نہ مرغ نہ بریانی، لاحول ولا قوۃ

اک کان کی عورت کو کیوں کہتے نہیں آنکھی
یک چشم ہے جب کانی لاحول ولا قوۃ

جو دودھ پلاتی ہیں مائیں کبھی بچوں کو
وہ دودھ بھی ہے پانی لاحول ولا قوۃ

اک روزہ کبھی اس نے بھولے سے نہیں رکھا
اور نام ہے رمضانی لاحول ولا قوۃ

سمجھا تھا کہ میچی ہے آنکھ اس نے محبت سے
کیا علم تھا، ہے کانی لاحول ولا قوۃ

فٹ پاتھ پہ رہتی ہے، پیشے سے بھکارن ہے
ہے نام مگر رانی، لاحول ولا قوۃ

ہم فلم میں آئے تھے بننے کے لئے ہیرو
اور مل گئی دربانی لاحول ولا قوۃ

ہر شب مرے خوابوں میں آ آ کے ستاتی ہے
شیطان کی اک نانی لاحول ولا قوۃ

پھر وائف کو ڈالا ہے بڑ وائف کے چکر میں
پھر ہو گئی نادانی لاحول ولا قوۃ

فیشن کا ستم دیکھو ہر چیز نمایاں ہے
کپڑوں میں بھی عریانی لاحول ولا قوۃ

بیوی مری مونچھوں سے یوں ڈر کے ظفر بھاگی
صورت بھی نہ پہچانی لاحول ولا قوۃ

مشتاق احمد یوسفی

(بسلسلہ گزشتہ)

ناٹک — ۴

ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدلنے کا نسخہ

اس زمانے کے چلن کے مطابق ٹریجڈی کو کامیڈی کا رنگ دینے کی یہ ترکیب نکالی گئی کہ تمت بالخیر یعنی آخری سین میں عاشق نامراد کی تربت دکھائی جاتی جس پہ ایک ہزار کینڈل پاور کا نور برس رہا ہے۔ سوگوار ہیروئن سیاہ برقع اور سیاہ چوڑیاں پہنے، طباق سا منہ کھولے آتی ہے۔ اسٹیج کے عقب میں خالی کنستروں پہ کود کود کر بجلی کڑکنے کا صوتی تاثر دیا جاتا ہے۔ ہیروئن ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے سے غرارے کے پائنچے اٹھائے ہوئے ہے۔ جس سے بھری برسات کے علاوہ بھرلی بھری پنڈلی کا سماں بھی دکھانا مقصود ہے۔ وہ "السلام علیکم یا اہل القبور!" کہہ کر قبر سے لپٹ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے علاوہ اسٹیج پر بھی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بجلی پھر کڑکتی ہے اور قبر شق ہو جاتی ہے۔ اس میں سے ہیرو مرحوم و مدفون، علیگڑھ کٹ پاجامہ، تہمچا، رامپوری ٹوپی اور عطر سہاگ لگائے، کفن پھاڑ کے برآمد ہوتا ہے۔ ہیروئن قبر پھلانگ کر اہل قبر سے بغلگیر ہوتی ہے اور دونوں قبر پر بیٹھ کر ہلمیٹ میں حمد گاتے اور آفات ارضی و سماجی کو للکارتے ہیں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے یا پھر فردوس بریں کا منظر ہوتا ہے جہاں مُردوں کی سرگرمیاں دکھائی جاتی ہیں۔ مرحومین یعنی شیریں اور فرہاد باغ ارم میں چہلیں کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ متوفی بڑھ کر متوفیہ کو آغوش محبت میں کھینچتا ہے تو وہ بامحاورہ اردو میں یہ کہتی ہوئی کہ "ہٹو! یہاں بھی کانٹوں میں گھسیٹتے ہو!" کانٹوں کو گلے سے لگالیتی ہے۔ ہیرو اس کا جواب عام فہم اور سلیس سسکیوں میں دیتا ہے۔ میت کے پانچ بچے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جن کی عمروں میں صرف ایک ایک مہینے کا فرق ہوگا کہ یہ منشی ریاست علی سوختہ کی ذہنی کوکھ سے جنمے تھے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔

شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ڈرامہ ہوتا تھا جس میں فرض اور محبت کی خونین کشمکش نہ دکھائی جائے مثلاً منشی ریاست علی سوختہ سندیلوی نے پانچوں انگلیاں خون دل میں ڈبو کر ایک رقت انگیز سین لکھا تھا، جس میں شہزادہ سلیم کو اپنے ہی نام کی شاہی جوتی پہنے اسٹیج پہ لمبے لمبے ڈگ مارتا، جذباتی کش مکش میں مبتلا دکھایا جاتا ہے۔ ایک طرف فرض ہے۔ دوسری طرف محبت اور تیسری طرف—

—— جدھر منشی جی کی نظر نہیں گئی —— عقلِ سلیم یعنی COMMON SENSE انارکلی کے گریبان میں مُنہ ڈالے کھڑی ہے۔ آخر میں تینوں لہو لہان ہو جاتے ہیں۔ فتح تینوں میں سے کسی کی نہیں ہوتی۔ فتح ہوتی ہے منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کے ایک ناموزوں مصرع کی، جس پہ کھیل کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اسٹیج کے "آلاتِ کشاورزی"

فرسٹ کلاس میں بیٹھنے والوں کو گرین روم میں جا کر اداکاروں کو مبارکباد کے علاوہ نقدی دینے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ گرین رُوم کی دیواریں چٹائی کی اور ستون بانس کے تھے۔ چھت یاد نہیں کاہے کی تھی۔ غالباً سمنٹ کی نہیں تھی۔ چھت سے ذرا دُور، میک اپ کے لئے ایک کھونٹے پر چیچک زدہ قدِ آدم آئینہ رکھا تھا۔ اس آئینے میں چہرہ نظر آنا تو بعد کی بات ہے۔ خود آئینہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ قدِ آدم ہم نے اس لئے کہہ دیا کہ آدمی کا قد ساڑھے تین فٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس کے پہلو میں تختِ طاؤس پڑا تھا جو پچھلے دِنوں میں ڈینٹسٹ کی کُرسی رہ چکا تھا۔ اب اِس پہ نادر شاہ دُرّانی کے دانت تھے۔ چاروں طرف، بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ناٹک کے آلاتِ کشاورزی بکھرے پڑے تھے:۔

نور جہاں کے دو کبوتر، نظام سقّہ کی مشک، مجنوں کا گریباں، لات گھونسے کھانے والے دِلن کی پیٹھ کا حفاظتی پیڈ سائیڈ ہیروئن کی چولی بھرنے کے لئے گودڑ جو غالباً کسی تیلی کے لحاف میں سے نکالا گیا تھا اور جس سے بقول حضرت جوشؔ ملیح آبادی "جھل جھل کرتی چشت انگیا کی کٹوریوں میں زیرِ تعمیر تاج محل کی ہمکارہ" دکھانی مقصود تھی (معاف کیجئے جوشؔ صاحب کے مشتبہ بالا استعارے کا سہارا ہم نے محض اس رعایت سے لیا کہ دیکھا جائے تو تاج محل کے گنبد تلے آخر دو مُردے ہی تو دفن ہیں) سائیکل کے اگلے بریک کے دو شاخہ سے بنایا ہوا اسٹیتھس کوپ جسے کانوں سے لگا کر ڈاکٹر مریضہ کے گودڑ کا معائنہ کرتا تھا۔ قارورے ٹیسٹ کرنے والی لیبارٹری سے خریدی ہوئی خالی بوتلیں جنھیں رانا سانگا کے ساتھ جنگ کرنے سے پہلے توڑ کر بابر شراب نوشی سے توبہ کرتا تھا۔ باتھ روم فلش کی زنجیر جس پہ سنہری پینٹ کیا ہُوا تھا۔ یہ زنجیرِ عدل تھی جسے کھینچ کر فریادی جہانگیر سے فوری حاجت روائی چاہتے تھے۔ آئینے کے پاس ربر کی ناک پڑی تھی جسے وہ حرّافہ ہر شب کٹواتی تھی۔ اتوار کو دو دفعہ کٹتی تھی، اس لئے کہ میٹنی شو میں بھی اپنی بد ذاتی سے باز نہیں آتی تھی۔

چُوڑی دار پاجامہ

کھیلوں میں زنانہ ملبوسات کی تراش خراش تو ظاہر ہے وہی تھی جو اس زمانے میں الٹرا ماڈرن سمجھی جاتی تھی یعنی وہ جو آج کل ہر گھر میں نانیاں دادیاں پہنتی ہیں لیکن ایک نکتہ آج تک سمجھ میں نہ آیا۔ وہ یہ کہ عورت کو جب پاکباز، پتی ورتا یا باعصمت دکھانا مقصود ہوتا تو اُسے چُنا ہوا دوپٹّہ اور سفید چُوڑی دار پاجامہ پہنایا جاتا۔ تاڑنے والے مہین مہین چُنٹوں اور پاجامے کی چوڑیوں کی تعداد ہی سے عصمت کی شدّت کا اندازہ کر لیتے تھے لیکن جب وہ بدراہ یا مائل بہ بدی ہوتی تو ساری زیبِ تن کر لیتی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی کوئی گُل اندام ساری پہن کر اسٹیج پر نمودار ہوتی، ناظرین کے دل کا کنول کھل جاتا۔ پُر اُمید

نعروں سے تھپتھپاتے۔ دیر تک تالیاں بجتیں۔ جن کے مُنہ میں دانت تھے وہ سیٹیاں بھی بجاتے۔ انتہا یہ کہ انارکلی نے مغلِ اعظم کے سامنے بھی مرہٹی اسٹائیل سے ساری باندھ کر زخمی مورنی کا رقص کیا۔ یہ رقص بے مثال و بے نظیر تھا۔ اس لحاظ سے کہ اوّل تو مورنی کبھی ناچتی نہیں۔ دوّم، اس مورنی کے پَیر خوبصورت ہونے کے علاوہ محاورۃً بھاری بھی تھے اور اس صورتِ حال کی مبینہ ذمہ داری شہزادہ سلیم کے بجائے ایک شرارتی چوب دار پر عائد ہوتی ہے تھی۔ رقص کے لباس کے معاملہ میں انارکلی کی چھوٹی بہن ثریّا اور بھی اختصار پسند واقع ہوئی تھی۔ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا۔

پردہ اُٹھتا ہے

شو کے اوقات میں تھیٹریکل کمپنی گھڑی گھنٹے کی غلام نہ تھی۔ ½ ہال کے ٹکٹ بِک جائیں تو پھر ایک گھنٹہ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ایک چار فٹ لمبی تختی مستقل لگی رہتی :

ہاؤس فل نہیں ہے

پردہ اُٹھنے سے پہلے تین ہلکے داغے جاتے تھے۔ یہ وہی توپیں تھیں جن کے چلتے ہی ایک کھیل میں غنیم کے ہاتھی اس بُری طرح بدکے تھے کہ ایک اپنی چپل اور بیڑی کا بنڈل بھی چھوڑ گیا۔ پلاسی کی جنگ میں جب یہ بوڑھی توپیں چلتی تھیں تو جتنی دُور گولہ جاتا، اس سے دو چار گز آگے اچھل کر یہ خود پہنچ جاتی تھیں جو عیّار فرنگی گولے سے بچ نکلتا وہ ان سے ڈھیر ہو جاتا۔ پردہ اُٹھتے ہی سب مل کر سلامی گاتے۔ تھیٹر کی دُھنوں کے ٹکڑے، کبھی کبھار ریڈیو کی ٹرانسکرپشن سروس سے نشر ہوتے ہیں تو ایک دوسری دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ کسی کی یاد سے وابستہ خوشبو کا جھونکا، کسی بھُولے بِسرے نغمے کی گونج ایک پَل میں اس ہمزاد کو سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے جسے زندگی کے کسی موڑ پر تنہا چھوڑ کر ہم آگے چلے آئے۔

وکیلِ صفائی

ڈھائی تین سال تک تو اتوار بھی بنک میں گزرتا تھا۔ بارے فراغت نصیب ہوئی تو اتوار کی صبح پاک بوہیمین کافی ہاؤس میں مرزا عبدالودود بیگ اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس سے عالمی مسائل پر مناظرہ کرنے جانے لگے۔ اور سہ پہر کو اس تھیٹر میں گنڈے دار حاضری۔ اتوار کا میٹنی شو پابندی سے دیکھنے والوں کو دو آنے رعایت دی جاتی تھی۔ لیکن ہمیں کبھی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا اتفاق نہیں ہوا، اس لئے کہ ہم ہمیشہ طاہر صاحب ایڈوکیٹ کے مہمان ہوتے تھے۔ موصوف کمپنی ہذا کے شبِ اوّل سے وکیلِ صفائی تھے (کمپنی ہذا عدالت، کچہری، میونسپل کارپوریشن اور تھانہ میں ہمیشہ مدعا علیہا اور ملزمہ کی حیثیت ہی سے پیش ہوتی تھی) طاہر صاحب کمپنی سے نقد فیس نہیں لیتے تھے۔ احباب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گھیر گھار کر لے جاتے جس کا بنیادی مقصد تفریح سے زیادہ کمپنی کو مالی نقصان پہنچانا تھا۔ طلاق اور خلع کے مقدموں کے اسپشلسٹ تھے۔ مشہور تھا کہ ان کی پرچھائیں بھی پڑ جائے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ کراچی سٹی کورٹ کو مرکز بنا کر پرکار سے ۲۰ میل کا ایک دائرہ کھینچا جائے تو اس میں خلع کی خواہشمند کوئی عورت بچی ہوگی جس نے اُن سے رجوع کر کے اپنا گوہرِ مُراد یعنی طلاق حاصل

لی ہو۔ ان سے بھی اکثر و بیشتر فیس نقد نہیں لیتے تھے۔ ایک دیہاتی مثل یاد آرہی ہے کہ آسمان کی بجلی، جو گھٹ کی کیل اور رٹ کے وکیل سے خدا بچائے۔ ننگا کر کے چھوڑتے ہیں۔ طاہر صاحب کی باتوں میں بلا کا لوچ تھا۔ وہ جھوٹ بھی بولتے تو جی اہتا کہ خدا کرے یوں ہی ہوا ہو۔ ہمارے مخدوم اور قدر دان تھے۔ دُور کے جلوے کے قائل نہیں تھے۔ دوتین دفعہ ھ پکڑ کر گرین روم میں لے گئے۔ اور اپنی منظورِ نظر سونے کے دانت والی ایکٹرس سے تعارف کرایا۔ میک اپ کے بغیر ہ اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔

ساتھ آٹھ مہینے بعد طاہر صاحب مسٹر اے۔ ٹی۔ نقوی، کمشنر کراچی، کی جنبشِ قلم سے بے خرخشہ معاملت بھی ۔لیتے۔ دل کا دورہ پڑنے کے بعد شراب اور رشوت میں عتدال برتنے لگے تھے۔ پُرانے دوستوں سے ملتے اب بھی تپاک ے مگر، ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں۔ ایک دن سرراہے مڈبھیڑ ہو گئی تو ہم نے شکایت کی، اب آپ مہینوں اپنے نیازمندوں ،خبر نہیں لیتے۔ بُرا مانے بغیر بولے، اگر کسی سے برسوں ملاقات نہ ہو تو سمجھ لیجئے کراچی ہی میں ہے اور بالکل خیریت سے۔

ہم نے مُجرا دیکھا

ان کے بیٹے کے ختنے ہوئے تو احباب نے فرمائش کی کہ زندہ ناچ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ تو پھر ہو جائے چھَن چھنن چھَن! پھن چھنن چھنن! انھوں نے متعلقہ انسپکٹر پولیس تک فرمائش پہنچا دی۔ اشارے کی دیر تھی۔ اس ظالم نے سارے شہر کی طوائفوں کو بجری ڈھونے کے ٹرکوں میں لاد کر لا حاضر کیا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ غالباً پہلی رات تھی کہ شہر میں کہیں مجرا نہیں ہُوا۔ مجرا یہاں بھی نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ناظم آباد کے اس چار سو مربع گز مکان میں طوائفیں ایسی ٹھسا ٹھس بھری تھیں کہ مُجرا تو کُجا، طبلہ دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ جو جہاں بیٹھی تھی وہیں نرت مُدرا دکھا کے بیٹھ رہی۔ ایک منچلی نے بیٹھے بیٹھے ہی طبلے کی تھاپ اور تتکار کے ساتھ ٹھمکا بھی لگایا۔ مگر اس طرح جیسے دفعتاً آنکھ بدشگونی سے پھڑکنے لگے اور سارا جسم دیکھتا رہ جائے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اپنی پاکٹ ڈائری میں حساب لگا کے ہمارے کان میں مژدہ سنایا کہ فی تماشائی پلے ۱٫۷ طوائفیں پڑ رہی ہیں اور ڈھیر ساری نائیکائیں رُونگے میں۔

سونے کے دانت والی لڑکی

افسوس کہ وہ بساطِ عیش چشم زدن میں اُلٹ گئی۔ ایک منحوس صبح طاہر صاحب کے ٹیڈ بوائے نے فون پر اطلاع دی کہ طاہر صاحب صبح پانچ بجے چل بسے۔ آخر وہ خون کی پھٹکی جو ان کی رگوں میں پانچ سال سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی، دماغ تک پہنچ گئی اور وہ ہنستے کھیلتے اس گھاٹی سے گزر گئے جس سے ہر ذی رُوح کو گزرنا ہے۔ زندہ دلوں کی طرح وہ بھرا میلہ چھوڑ کر چل دیئے۔ میلہ بچھڑنے کا انتظار نہیں کیا۔ دو مہینے بعد سُنا کہ اُس سونے کے دانت والی لڑکی نے بھی بندر روڈ کے عقب میں ایک عطائی ڈاکٹر کے مذبح خانے میں اسقاط کے آپریشن کے دوران دم توڑ دیا۔ خون کسی طرح بند نہ ہوا۔ اے بی گروپ کا نایاب خون سڑک کے اس پار سول ہسپتال میں دستیاب تھا مگر اسے وہاں منتقل کرنے کے لئے "ڈاکٹر" کسی طور تیار نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم زرد اور آنکھیں بے نور

ہوتی چلی گئیں۔ کوئی دم کی مہمان تھی کہ منیجر کمپنی ہذا نے صابن لگا کر اس کی انگوٹھی اتاری۔ پھر لنگ اور طاہر صاحب کی دکا ہوئی چوڑیاں اتار کر رکھ لیں۔ دانت پر سے سونے کا پتر اتارنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کی پیشانی پہ بالوں کے قریب ابھی رات کے میک اپ کے نشان باقی تھے۔ منشی ریاضت علی اور چار پانچ ساتھی ریا تون رات اسے میوہ شاہ قبرستان میں طاہر صاحب کی پائنتی گاڑ آئے اس کے جسم نے ہوس کی بہت مار سہی تھی۔ دوزخ میں اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا ؟

اور اس کے بعد وہ تھیٹریکل کمپنی بند ہوگئی۔

اس زمانے میں بھی کراچی میں سینما گھروں کی کمی نہ تھی۔ انگریزی فلمیں بکثرت دکھائی جاتی تھیں اور ہندوستانی فلموں پر بھی کوئی قدغن نہ تھا۔ اس کے باوجود کراچی کی اس پہلی اور غالباً آخری تھیٹریکل کمپنی کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہمارا شمار تو خیر طفیلیوں میں تھا۔ لیکن ہم نے یہاں ایسے ایسے نک چڑھوں کو جاڑے سے آتے دیکھا جو بالی وڈ کی اچھی اچھی فلموں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بات یہ ہے کہ جسے ایک دفعہ اسٹیج کا نشہ ہو جائے پھر جب تک آنکھوں میں دم ہے اس کا اُترنا نہیں جاتا جس نے ایک بار گوشت پوست کا روپ بہروپ دیکھ لیا اس کی تسکین پھر کبھی پرچھائیوں سے نہیں ہوگی۔ یہ اُسی کا جادو نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک بے سروسامان تھیٹر کا نام بر سبیل تذکرہ آیا اور ہم نے بلا قصد و ارادہ دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ کون جانے اسی بہانے اس کا حق غمگساری و چارہ گری ادا ہو جائے جس نے ایک گمنام، بے نوا کے نہ جانے کتنے اُداس لمحوں میں اُجالا کیا۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم

بیس برس اُدھر کی بات ہے۔ ایسا ہی ایک اتوار اور ایسا ہی ایک شو تھا۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے " منیجر کمپنی ہذا " نے ناظرین باتمکین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ " اب مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم کا ڈرامہ رومیو جولیٹ بمعہ چار کتھک رقص پیش کیا جائے گا۔ مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم انگریزی ڈرامہ کے آغا حشر کاشمیری مرحوم ہیں۔ (ہمیں تو آج تک ان دونوں میں مرحوم ہونے کے علاوہ کوئی اور بات مشترک نظر نہ آئی) مصنف و دلنشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی نے مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم کے ڈائیلاگ میں سے بیس مخرب اخلاق فقرے نکال کر مسدس حالی مرحوم کے پچیس اخلاقی شعر ڈال دیئے ہیں۔ گر قبول افتدزہے عز و شرف "

دوسرا ناٹک

لگا ہیں پردہ اُٹھنے کی منتظر تھیں کہ اتنے میں مسٹر اینڈرسن کا ڈرائیور غفار ہمارا کھوج نکال کر ڈھونڈتا ڈھانڈتا یہاں پہنچ گیا۔ یہ نوکر اپنے مالک ہی کے منہ نہیں، اس کی بوتل کے منہ بھی لگا ہوا تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (کہ خود عالم بے بدل و باعمل اور پیر طریقت تھے) نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک ظریف کا قول ہے کہ مولویوں اور کسبیوں کے ملازم کاہل ہوتے ہیں۔ کیونکہ جہاں ان کے منہ سے کچھ نکلا بہت سے حاضر باش کام کرنے کو دوڑ پڑتے ہیں۔ اس لئے ان کے ملازم بے کار، اعدی ہو جاتے ہیں۔ آقاؤں کے اس زمرے میں ہم یہود بنیوں کا بھی اضافہ

کر سکتے ہیں۔ وہ اپنا کام آپ کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اس لئے ان کے نوکر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے زبان چلاتے رہتے ہیں۔ یہ ڈرائیور بھی بگڑ چکا تھا۔ رات کو چودی کی شراب کے نشے میں دُھت نہ ہو تو بنک کی کار چوری چھپے پرائیویٹ ٹیکسی کے طور پہ چلاتا تھا۔ رات گئے شہر سے غیر ملکی ملاحوں اور ٹورسٹوں کو ملیر کے ایک پرائیویٹ قحبہ خانے میں لے جاتا۔ جہاں صرف پونڈ اور ڈالر میں محنتانہ وصول کیا جاتا تھا۔ غفار منہ مانگا کرایہ اور جانبین سے دلّالی کا کمیشن وصول کرتا۔ ایک رات ملیر سے واپسی میں ایک یونانی ملاح مجرمانہ دست درازی کی کوشش میں ناک تڑوا بیٹھا۔ اور کار چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ پھر نہ لوٹا۔ صبح گیارہ بجے ڈرگ روڈ تھانے نے ہمیں فون پہ مطلع کیا کہ کار مشتبہ حالت میں کھڑی ہے۔ نیز کچّے میں اس کی چال سے معلوم ہوتا ہے کہ واردات سے قبل مال مردقہ نے پٹرول کے بجائے وہسکی پی رکھی تھی۔ اسے لے جائیں۔ آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

غفار جودھپور کا رہنے والا تھا۔ اس کے تلفّظ اور مارواڑی لہجے کی نقل بہت دشوار ہے۔ ہر لفظ کے آگے پیچھے دو چشمی ھ لگا کر بولیں تو شاید لہجے میں وہ دھڑ دھڑاہٹ اور ہمہمہ پیدا ہو۔ جو راجستھانی بولی کا ٹھاٹھ اور سنگھار ہے۔ مجھو ٹتے ہی کہنے لگا "آپ کو تماش بینی کی پڑی ہے۔ اُدھر بڑا صاب منہ ہندیرے سے ہڈم مچا رہا ہے۔ دارو کا ادھا چڑھا گیا کر آپ کو تو وہ مرڈر کیس اچھی طریوں یاد ہوگا۔ اس کے یار مسٹر جیمسن کا ننگی حالیت میں قتل۔ جب نچھے لونڈے نے شراب کے گلاس میں تیزاب بھر کے اس کی آنکھوں پہ پھینکا۔ پھر جھٹ ڈبل روٹی کاٹنے کی چھری سے ذبح کر دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ بڑا صاب بوتل سے منہ لگا کے پیتا ہے۔ لطیفی صاب (ایک بڑے افسر جن سے مسٹر اینڈرسن کی ذرا نہیں بنتی تھی) سے آئینے میں کھڑا تو تکار کر رہا ہے بلکہ انگریزی میں فادر مدر کر رہا ہے۔ بڑے بڑوں کی شان میں یکے بعد دیگرے، دیگرے بعد یکے، غستاخی ہو رہی ہے۔ گیارہ بجے اس نے لطیفی صاب کی کنپٹی پہ کس کے ایسا گھونسا مارا کہ آئینہ کرچی کرچی ہو گیا ساری مغروریت خاک میں مل گئی۔ گھونسا بھی خونم خون ہو گیا۔ ابھی ابھی ڈاکٹر بٹر فیلڈ کو بلا کر پٹی کروائی ہے۔ یقین نہ آئے تو جا کے چشم دید دیکھ لینا۔ آپ کو سلام بولتا ہے۔ آرڈر ہے کہ آپ جس حالت میں بھی ہوں، گاڑی میں ڈال کے بنفسِ نفیس حاضر کروں۔ قصّہ کوتاہ، آپ کی انتظاری میں چشم براہ ہے۔ اپن کو تو لگتا ہے آج کچھ دھرم بھرم ہونے والا ہے۔ سویرے سے مالجادی بائیں آنکھ پھڑک کے جا رہی ہے۔

"کیا لطیفی صاحب کو بھی بلایا ہے؟"

"نہیں۔"

••

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر سید حامد حسین

داڑھی کی یاد میں

افسوس، صد افسوس مولانا برکت علی خاں نے خودکشی کرلی اور وہ سیدھے سادے برکت بھائی رہ گئے۔ وہ ڈاڑھی جس کی بنا پر وہ مولانا کہلانے لگے تھے اس کا آنا بھی حادثہ تھا اور جانا بھی حادثہ۔ ہوا یوں کہ جب بھوپال ریاست، ہندیونین میں ضم ہوئی تو برکت بھائی کی اُردو میں تحریر سروس بُک بھی ضم ہو کر ہندی افسروں کی میز پر پہونچی۔ جس وقت یہ سروس بُکیں "مین اسٹریم" میں فٹ کی جا رہی تھیں اس وقت برکت بھائی کی وجہ سے ایک خاص دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کی سروس بک میں شناخت کی جو علامات درج تھیں ان میں کسی شاعر مزاج کلرک نے ایک علامت "سبزہ آغاز" بھی تحریر کردی تھی۔ پنڈتوں کے ایک کمیشن نے اس کا ترجمہ "ڈاڑھی والا" تجویز کیا۔ جب سروس بُک سکشن میں پہونچی تو افسر متعلقہ نے برکت بھائی کے چہرے پر اس شناخت کی کمی پائی۔ برکت بھائی سے فوراً جواب طلب کیا گیا۔ برکت بھائی نے جواب پر غور وخوض کے لئے دو ہفتے کی مہلت طلب کی اور مدت پوری ہونے پر افسر موصوف کو مطلع کیا کہ ان کے لئے جس امر میں جواب طلب کیا گیا ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ دو ہفتے میں انھوں نے کم از کم ضابطے کی خانہ پُری کے لئے اپنے چہرے پر ڈاڑھی کاشت کرلی تھی۔

معاملہ اگر یہیں تک رہتا تو شاید بات ختم ہوجاتی لیکن اسکول میں تعلیم پانے کے زمانے سے، برکت بھائی کو پڑھائی کے علاوہ ہر میدان میں ریکارڈ توڑنے پھوڑنے، بنانے گھٹانے میں نہایت دلچسپی تھی۔ یوں تو ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ انھوں نے آٹھ سال میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرکے بھی اس طرح ریکارڈ قائم کیا تھا کہ اگر الگ الگ برسوں میں مختلف مضامین میں پاس ہونے کا حساب لگایا جاتا تو وہ ہر مضمون میں چار چار بار پاس ہوچکے تھے کیونکہ ان کا معمول یہ تھا کہ ایک سال دو مضامین میں فیل ہوتے۔ اگلے سال ان مضامین میں جی توڑ محنت کرتے۔ ان مضامین میں تو پاس ہوجاتے لیکن دوسرے دو مضامین میں فیل ہوجاتے۔ آٹھ سال بعد جب ان کی کامیابی کا اعلان ہوا تو لوگوں کا خیال تھا کہ بورڈ نے ان کا نام امیدواروں کی فہرست سے نکال کر سرپرستوں کی فہرست میں شامل کرلیا تھا اور اس بنا پر انھیں پاس کردیا گیا تھا۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ برکت بھائی نے ریکارڈ قائم کرلیا تھا اور اب بھی ہر معاملے میں ریکارڈ بنانے کی دھن برقرار تھی۔ ڈاڑھی ان کے لئے ایک خداداد عطیہ تھی اور اب وہ دن رات اسے بڑھانے اور ترقی دینے میں جٹ گئے۔ نئے نئے نسخے تیار ہوتے، تیل منگائے جاتے

حلوے اور معجون بنتے۔ اُن کا کمرہ اچھا خاصہ عطار کی دوکان معلوم ہوتا۔ ایک بار پورے ہفتے بنتے رہے۔ حقیقت کا علم تب ہوا جب ہم ایک دن اچانک اُن کے کمرے میں جا پہنچے۔ حضرت اپنی ڈاڑھی میں دو کلو کا وزن لٹکائے اُسے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلا رہے تھے۔ ہم نے اس حماقت کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ ڈاڑھی بڑھانے کا جنون ہے۔ اس بچکانہ حرکت پر جب مزید باز پرس کی تو انھوں نے بڑے وثوق سے بتایا کہ انھیں بڑا فائدہ ہوا ہے۔ ایک ہفتہ قبل ان کی ڈاڑھی ان کے قمیص کے دوسرے بٹن تک پہنچا کرتی تھی۔ اور اب وہ روز بروز ترقی کرتے کرتے تیسرے بٹن کی جانب آدھا فاصلہ طے کر گئی ہے اور چند دنوں میں وہ تیسرے بٹن تک پہنچا ہی چاہتی ہے۔ ہمیں اپنے پر قابو نہ رہا۔ لپک کر دونوں ہاتھوں سے ان کا جبڑا دبوچ لیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ نچلا جبڑا اوپری جبڑے سے آملا۔ اسی حالت میں انھیں آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ان کی وہ ڈاڑھی جو ان کے دعوے کے مطابق دوسرے بٹن سے نیچے اتر چکی تھی اب دوسرے بٹن سے بھی آدھا اِنچ اوپر اُٹھ آئی تھی۔ برکت بھائی نے ہم کو دھکا دے کر الگ کیا اور کئی دن تک ہماری اس گستاخی پر خفا رہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے وزن لٹکانا چھوڑ دیا اور جبڑے کو اپنی جگہ پر لانے کے لئے کئی ہفتے مالش کرواتے رہے۔

چند ماہ کے بعد ایک تقریب کے سلسلے میں ہمیں دہلی جانا تھا۔ ہم نے برکت بھائی کو بھی ساتھ لے لیا۔ ایک دن پرانی دہلی کے تنگ گلی کوچوں میں سے گزر رہے تھے کہ ایک بورڈ پر ان کی نظر پڑی جس پر تحریر تھا: "ٹونی اینڈ ٹونی بیرڈ ڈیزائنرس اینڈ ٹیکنیشنز"

"Tony and Tony Beard Designers and Technicians ——" برکت بھائی بیتابانہ ایک ساتھ دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر جا پہنچے۔ اندر ایک میز کے سامنے ایک بلا ڈاڑھی مونچھ کا پہلوان نما انسان بیٹھا ہوا تھا۔ برکت بھائی نے بلا تمہید اپنی عرض مدّعا شروع کی۔ پہلوان نے ایک محدّب شیشے سے برکت بھائی کے ہاتھ کی لکیریں، ان کے پیر کے ناخن ان کی آنکھوں کی پلکیں دیکھیں۔ پھر ان کا وزن لیا۔ ناک کے سوراخوں کی پیمائش کی، کانوں کو کھینچ کر دیکھا، بغل میں گدگدی کی۔ پھر اچانک قینچی اُٹھا کر ان کے سر کے بالوں کی ایک لٹ کاٹی۔ چند بالوں کو خوردبین میں لگا کر دیکھا۔ دیکھتے ہی اس نے ایک چھلانگ لگائی اور برکت بھائی کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اس طرح ہلانا شروع کیا گویا اکھاڑ کر دم لے گا۔ پھر اچانک ان سے بغل گیر ہو گیا۔ برکت بھائی کے جسم کی ساری ہڈیاں تڑاخ تڑاخ چٹخ اٹھیں۔ ہم نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بعد جب ہم نے آہستہ سے ایک آنکھ کھول کر کمرے کا جائزہ لیا تو یہ اندیشہ تھا کہ برکت بھائی زمین پر پرزہ، پرزہ ڈھیر نظر آئیں گے۔ لیکن اس وقت وہ ثابت و سالم کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور پہلوان انھیں مبارکباد دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چالیس سال کی عمر تک برکت بھائی کی ڈاڑھی چالیس میٹر کی ہونے کی توقع ہے۔ اور انھیں اپنی ڈاڑھی قالین کی طرح رول کر کے رکھنے کی ضرورت پڑے گی۔ اس نے برکت بھائی کو ڈاڑھی کی خاطر خواہ افزائش کے لئے ایک دوا پیش کی جو دن میں دو بار انڈے کی سفیدی اور سرسوں کے تیل میں ملا کر ڈاڑھی پر ملنے کے لئے تھی۔ برکت بھائی نے خوشی خوشی ترسٹھ روپے چالیس پیسے کا بل ادا کیا اور ربا کچھ کہے سنے چل کھڑے ہوئے۔

بھوپال پہنچنے کے دوسرے دن ہی انھوں نے صبح سویرے حسب ہدایت دوا اپنی ڈاڑھی میں لگائی اور دفتر وقت سے کچھ پہلے جا پہنچے۔ ایک ہفتے کی ڈاک میز پر تھی۔ انہماک کے ساتھ کاغذات نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔ دھیرے دھیرے دوسرے کلرک آنا شروع ہوئے۔ گیارہ بجے تک پورا کمرہ بھر گیا۔ جلد ہی لوگوں نے کمرے میں کسی مردہ چوہے کے سڑ جانے کی شکایت کی۔ جنگی پیمانے پر تلاش شروع ہوئی، الماریوں کے نیچے، میزوں کی درازوں میں بستوں کے اندر۔ کرسیوں کے نیچے۔ لیکن چوہا کہیں نہیں ملا۔ جمعدار کو بلا کر پھر سے صفائی کروائی

گئی، صفائی چھڑکوائی گئی۔ بدبو پھر بھی کم نہیں ہوئی۔ رفتہ رفتہ لوگ اُٹھ کر باہر جانے لگے۔ برکت بھائی کام میں لگے رہے۔ ایک بجے لنچ کا وقت ہوا۔ کینٹین پہنچے۔ دیکھا تو پورا سیکشن پہلے سے موجود تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ سکھ لال جیسا آدمی جس کو شاید کینٹین کے وجود کا علم بھی نہ تھا اور جس نے گذشتہ بیس سالوں سے ہمیشہ دوسروں کی حلال کی کمائی سے چائے پی تھی، آج کینٹین میں موجود تھا۔ برکت بھائی کو بڑی مشکل سے ایک خالی جگہ نظر آئی۔ وہ خالی کرسی پر بیٹھے بھی نہ تھے کہ برابر کی کرسی سے ٹائپسٹ مدھوسدن چیخ مار کر اچھلا اور درمیانی راستہ میں کھڑا ہو کر تھر تھر کانپنے لگا۔ پورے کینٹین والے اس پر ٹوٹ پڑے۔ مرگی، پاگل پن، آسیبی خلل سب کے آزمودہ نسخے بلا فرمائش ہمدردوں نے پیش کرنے شروع کر دیئے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مدھوسدن کا اعصابی تناؤ کم ہوا تو اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "وہ، وہ، وہ ہے . . . ." لوگوں نے توجہ سے پوچھا "کیا؟" اس نے رک رک کر کہا "چو . . . . ہا . . . . ہا" "کہاں؟" سب نے اشتیاق سے دریافت کیا۔

مدھوسدن نے برکت بھائی کی طرف اشارہ کیا اور پھر ایک ہاتھ سے اپنی ناک بند کر لی اور دوسرا ہاتھ اپنی ٹھوڑی سے لگا کر مصنوعی ڈاڑھی کی شکل میں ہلانے لگا۔ لوگ برکت بھائی کی طرف بڑھنے ہی والے تھے کہ برکت بھائی پھر کر کھڑے ہو گئے اور نجی آزادی کے دستوری اور آئینی حقوق کا باآواز بلند اعلان کرتے ہوئے انھوں نے زمانۂ تعلیم کے دوران پہلوانی کے مختلف داؤں میں اپنے ریکارڈوں سے بھی مطلع کیا۔ تقریباً بیس منٹ کی دماغی اور اعصابی ورزش کے بعد یہ مصالحت ہوئی کہ برکت بھائی کمرے میں دروازے کے قریب کی میز پر بیٹھیں اور ان کے پہلو میں ایک پنکھا اس طرح رکھا جائے کہ وہ ہوا دروازے کے باہر پھینکتا رہے گا۔

کمرے میں واپس آنے پر اسی تجویز پر عمل کیا گیا لیکن ابھی پانچ منٹ بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ سامنے والے کمرے میں بلوے کی صورت ظاہر ہوئی اور سب لوگ کمرے سے نکل کر برکت بھائی اور ان کے سیکشن والوں پر حملہ آور ہوئے۔ تیسرے سیکشن والوں نے آکر بیچ بچاؤ کیا اور یہ طے ہوا کہ برکت بھائی کو پکڑ کر جبراً ان کی ڈاڑھی ڈٹمال اور لائف بوائے سے دھلائی جائے۔ تلاشی کرنے پر دفتر میں کہیں ڈٹمال دستیاب نہ ہوا بصورت دیگر فنائل منگوایا گیا اور تینوں سیکشنوں کے چپراسیوں کی خدمات مستعار لے کر برکت بھائی کی ڈاڑھی خوب رگڑ رگڑ کر صاف کروائی گئی۔

شام کو جب ہم گھر پہنچے تو برکت بھائی بیٹھک میں آرام کرسی پر دراز ملے۔ اُن کی ڈاڑھی کا ہر بال اس طرح سلامی دے رہا تھا جیسے انھوں نے ایک ایک بال گنوا کر اس کا انشورنس کروایا ہے۔ ہمارے صاحبزادے نوید میاں بجلی کی استری گرم کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بجلی کی استری کی مدد سے ڈاڑھی کے بال سیدھے کرنے کی تجویز ہے۔ ظاہر ہے اس بیہودہ تجویز پر عمل ہوتا دیکھنا فضول تھا کپڑے وغیرہ بدل کر ہم جب دوبارہ بیٹھک میں آئے تو دیکھا کہ نوید میاں اپنے برکت چچا کی ڈاڑھی پر برش سے کچھ چھینٹ کر رہے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ استری کے ذریعہ گرم کئے ہوئے کپڑے سے ڈاڑھی کے بال بجائے بیٹھنے کے اور مڑنے لگے تھے۔ نوید میاں کو گھر میں کہیں کلف مل گیا تھا انہیں کے مشورے پر ڈاڑھی میں کلف لگ رہا تھا۔ پھر استری ہونی تھی۔ ہم کو پوری طرح احساس ہو گیا کہ ڈاڑھی کے معاملے میں برکت بھائی کی عقل بچوں سے بھی گئی گذری ہے۔

اس میں بہر حال شبہ نہیں کہ برکت بھائی کی ڈاڑھی دن چوگنی اور رات آٹھ گنی ترقی کرتی رہی۔ کچھ عرصے میں ان کی ڈاڑھی اتنی بھرپور ہو گئی کہ وہ تیغے جیسی چوڑی اچکن اور تلوار جیسی لمبی یوروپین ٹائی سے بھی بے نیاز ہو گئے کیونکہ ان کی ڈاڑھی کے غلاف کے نیچے گریبان میں کیا کوئی چیز ہوتی تھی اس کا بھی پتہ چلانا مشکل تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ برکت بھائی جلدی جلدی میں اپنا قلم بجائے اپنی جیب میں رکھنے کے ڈاڑھی میں اٹکا لیا کرتے تھے۔ ڈاڑھی کی اس برق رفتار ترقی کو دیکھتے ہوئے مبصرین کا یہاں تک خیال تھا کہ جلد ہی برکت بھائی

کی ڈاڑھی ان کی ستر پوشی کا کام بھی کرنے لگی۔

اسی دوران برکت بھائی نے اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لئے ایک مینا پال لی تھی۔ اب وہ ان سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ اکثر ان کی ڈاڑھی میں چھپ کر دفتر آجاتی۔ برکت بھائی فائلیں دیکھتے رہتے اور وہ ڈاڑھی سے نکل کر میز پر ادھر ادھر پھدکتی رہتی۔ جب کوئی قریب آتا تو پھر ڈاڑھی میں چڑھ کر غائب ہو جاتی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ مینا میز پر پھدکتے پھدکتے قریب کی کھڑکی کی چوکھٹ پہ جا بیٹھی۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھا۔ کھڑکی سے تھوڑے فاصلے پر ایک امرود کا درخت تھا۔ اس کے پتوں نے اشارہ کر کے مینا کو بلایا۔ مینا اڑ کر درخت پر جا بیٹھی۔ برکت بھائی کا دل دھک سے ہو گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ کھڑکی پر چڑھ گئے۔ درخت کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ شوخ مینا پھدک کر دوسری شاخ پر جا بیٹھی۔ مینا سے جو روحانی رشتہ استوار ہو چکا تھا شاید اسی کی وجہ سے برکت بھائی کو یقین ہو گیا تھا کہ ان میں بھی کچھ مینا کی صفات پیدا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے کھڑکی سے باہر نکال کر پہلے اپنا ایک قدم ہوا میں رکھا اور پھر دوسرا۔ پتہ نہیں ان کا ہی جذبۂ عشق ابھی کچھ خام تھا یا امرود کے درخت میں ہی اس جسامت کے " طائر لاہوتی " کو سنبھالنے کی سکت نہ تھی کہ برکت بھائی بجائے اپنی عزیز مینا کے قریب پہنچنے کے امرود کی قدم بوسی کرتے دکھائی دیئے۔ برکت بھائی کے داہنے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے پلاسٹر لگانے کے بعد ان کے ہاتھ کو سہارا دینے کی غرض سے گلے میں ایک جھولی لٹکانا چاہی۔ برکت بھائی خفا ہو گئے۔ " مجھے گلے میں کوئی طوق ڈالنا گوارا نہیں " وہ تنک کر بولے۔ پھر کیا کیا جائے، یہ سوال تھا۔ آخر برکت بھائی نے ہی حل نکالا۔ ڈاڑھی کے نچلے سرے پر گرہ لگا دی جائے اور ڈاڑھی کے بالوں کو دو حصوں میں منقسم کرنے سے جو خلاء بنے اس میں ہاتھ کو لٹکا دیا جائے۔

برکت بھائی کو اپنی ڈاڑھی کی وجہ سے چھوٹے موٹے اور بھی کئی حادثے پیش آئے۔ ایک بار بھری بس میں فٹ بورڈ پر لٹکنا چاہا ایک پیر رکھا ہی تھا کہ دو طالب علم لپک کر اس پر سوار ہو گئے۔ برکت بھائی نے خیریت اسی میں سمجھی کہ نیچے اتر آئیں۔ اتنے میں کنڈکٹر نے سیٹی دی اور بس روانہ ہو گئی۔ برکت بھائی نے جیسے تیسے اپنا پیر تو چھڑا لیا۔ لیکن لوگوں نے یہ معجزہ دیکھا کہ فٹ بورڈ پر قدم نہ ہوتے ہوئے بھی برکت بھائی بس کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہے تھے۔ اور بدحواسی کے عالم میں کچھ ناقابلِ فہم نعرے لگا رہے تھے۔ بس کے دروازے پر شہد کی مکھیوں کی ٹکنیک سے چپکے ہوئے ان گنت مسافروں کے ہاتھوں کے نیچے برکت بھائی کی ڈاڑھی دبی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے بس کو رکوایا گیا اور کسی طرح برکت بھائی کو نجات ملی۔ اس حادثے کے بعد برکت بھائی خود کو آزمودہ کار خانوردوں میں شمار کرنے لگے تھے۔

ایک دن برکت بھائی پسینے میں تربتر ہمارے یہاں پہنچے۔ ہم بیٹھک میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے ٹیبل فین پوری رفتار سے کھولا اور پنکھے کے قریب کھڑے ہو کر اپنی ڈاڑھی کو ہوا کھلانے لگے۔ ہم بھی اخبار کے درمیانی صفحے کھول کر اندر کی خبریں دیکھنے لگے۔ اچانک ایسی آوازیں آئیں جیسے برکت بھائی کسی بمبار ہوائی جہاز کو سالم نگلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہماری طرف ان کی پشت تھی۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پنکھے کو اپنی آغوش میں لے کر کسی آدم خور قبیلے سے متاثر جدید ولایتی رقص کی مشق کر رہے ہوں۔ ہم گھبرا کر اٹھے دیکھا تو برکت بھائی کی ڈاڑھی پنکھے میں لپٹ چکی تھی اور ان کا حال اس خان کی طرح تھا جو کمبل سے معافی مانگ رہا تھا لیکن کمبل خان کو چھوڑنے پر رضامند نہ تھا۔ ہم نے لپک کر پنکھا بند کیا۔ بجلی بند ہوتے ہی برکت بھائی بھی مع پنکھے کے زمین پر اس طرح آرہے گویا ان کا بھی بجلی سے کوئی سلسلہ جڑا ہوا تھا۔ بچوں کو بلا کر محلے بھر سے آلاتِ مرمت منگوائے اور آدھے گھنٹے تک بچے پنکھے کے پر آگے پیچھے گھما گھما کر برکت بھائی کی ڈاڑھی باہر نکالتے رہے۔

لیکن سب سے زیادہ سنگین حادثہ تو گزشتہ اتوار کو پیش آیا۔ ہم علی الصباح گیارہ بجے اپنے بستر میں بیٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نوید میاں نے آکر خبر دی کہ برکت چچا کے لڑکے آئے ہیں۔ اس خبر پر ہم بھلا کیوں کر یقین کر سکتے تھے کیونکہ برکت بھائی نے جن دو لوگوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی ان میں سے ایک سر ہمارا بھی تھا۔ گوکہ جب سے ہمارے بال بڑی تیزی سے ہمارے سر سے رخصت ہونے لگے تھے تب سے ہمیں برکت بھائی کی نیت پر کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔ بہرحال ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ بچے بڑوں کے بارے میں کوئی بدگمانی رکھیں۔ چنانچہ ہم نے نوید میاں کو ان کی گستاخی پر ڈانٹا تو انھوں نے ذرا اپنا بیان بدلا اور نووارد کو وہ برکت چچا کا چھوٹا بھائی بتانے لگے۔ صورتحال اتنی پر اسرار تھی کہ ہم فوراً دروازے کی جانب لپکے۔ دروازہ کھولنے پر اگر ہمارا کسی بھوت سے بھی سامنا ہو جاتا تو شاید ہماری اس طرح گھگھی نہ بندھتی۔ بچوں کی اطلاع کے مطابق ہم تقریباً دس منٹ تک صرف لفظ "تم، تم" کہتے رہے اور ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے رہے یہاں تک کہ دیوار سے ٹکرا کر گر پڑے۔ نووارد نے آگے بڑھ کر ہمیں اٹھایا۔ آرام کرسی پر لٹایا۔ پنکھا کھولا۔ ہماری عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرکے اسے واپس ہماری آنکھوں پر رکھ دیا۔ اور پھر ہمارے پاس دو زانو بیٹھ کر اس نے تقریباً سرگوشی کے لہجے میں کہا "ارے بھائی رحمت ہوش میں آؤ، میں ہوں برکت، تمہارا برکت بھائی"

یہ سن کر ہم نے بھی آنکھیں کھول لیں، بچے بھی حیران و سراسیمہ آکر اُن کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ہم نے ان سے کچھ پوچھنا چاہا تو انھوں نے آہستہ سے اپنے بیگ میں سے ایک پلاسٹک کی تھیلی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب میں سے ایک گلابی لفافہ نکال کر ہماری گود میں رکھ دیا۔ ہم نے پلاسٹک کی تھیلی پر نظر ڈالی۔ اس میں ان کی ناز و نعم سے پلی ہوئی ڈاڑھی محفوظ تھی۔ گلابی لفافہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھایا۔ کھولا۔ اس میں رکھا ہوا گلابی کاغذ نکالا۔ اس پر صاف اور خوبصورت خط میں صرف یہ الفاظ تحریر تھے "ڈاڑھی کے آڑ میں چالاک شکاری"

بعد میں برکت بھائی نے بتایا کہ ایک دن قبل اُن کے اسٹاف کلب کی سالانہ تقریبات تھیں جن میں ممبران کو خطابات بھی تقسیم کیے گئے تھے اسی موقع پر انھیں اس خطاب سے نوازا گیا تھا۔ برکت بھائی سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن اپنے کردار پر حملہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ چنانچہ انھوں نے طیش میں آکر اس آڑ کو ہی ختم کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان پر چالاک شکاری کی بہتان لگائی گئی تھی۔

اب برکت بھائی کی ڈاڑھی تو اُن سے جدا ہو گئی ہے۔ لیکن ایک ہفتہ سے ہم اس کی قائم مقامی کر رہے ہیں۔ اُن کی ڈاڑھی لیے جگہ جگہ حلفیہ گواہی دیتے پھر رہے ہیں کہ یہی مولانا برکت علی خاں ہیں اور برکت علی خاں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ اُن کے دفتر کا شناختی کارڈ بیکار ہو چکا ہے۔ انھوں نے اس سال قانون کا امتحان دینے کی ٹھان رکھی ہے۔ امتحان ہال میں ڈاڑھی والے امیدوار کی جگہ بلا ڈاڑھی کے امیدوار کے داخلے کی پریشانی آنے والی ہے۔ پھر حضرت نے پاسپورٹ بھی بنوا رکھا ہے اور امتحان کے بعد مشرق وسطیٰ کا چکر لگانے کا عزم رکھتے ہیں۔ خدا معلوم انھیں دیس بدیس کتنی رسوائیوں سے نمٹنا ہے۔

برکت بھائی تو ایڈونچر سے گھبراتے نہیں۔ لیکن ہمارا دل اتنا مضبوط نہیں ہے۔ ہماری دعا تو یہ ہے کہ برکت بھائی کی ڈاڑھی جلد نکل آئے یا پھر اُن کی پرانی ڈاڑھی کو ہی وقت ضرورت چڑھانے اتارنے کا کوئی طریقہ دریافت کر لیا جائے تاکہ ہمیں ناک تنے کی حیثیت سے اُن کے ساتھ منسلک رہنے کی ضرورت سے فرصت ملے۔

●●

گذشتہ شمارہ میں زندہ دلان کے مزاحیہ طرحی شاعری میں سنایا گیا کلام شائع کیا گیا تھا۔ جو غزلیں اگست کے شمارہ میں شریک اشاعت نہ ہو سکی تھیں، اس بار قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ـــــ (مدیر)

روز کا رستہ ہے منگل ہاٹ کا
جاٹ سے مٹے اپنے کو کھینچا چاہیئے'

میٹاں دیتا ہوں چھت سے روز میں
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے'

جانتے ہیں آپ کو بتیسی ہے
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے'

فیشن ایبل لڑکیاں کہتی ہیں آج
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے'

ڈاکٹر جیٹھا کی کوشش رائیگاں
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

بوگس حیدرآبادی

چاہنا دیسے تو ان کا چاہیئے
چاہیں ممی بھی تو پھر کیا چاہیئے

ان سنہری مچھلیوں کے واسطے
جال بھی پیارے سنہرا چاہیئے

گھر کے کُتّے سے بچیں کافی نہیں
اُن کے ابا سے بھی بچنا چاہیئے

وہ پڑوسن ہے مگر کہتا ہے دل
فاصلہ کچھ اور گھٹنا چاہیئے

جوڑنے کو ووٹ سے سیلاب کو
جو گرہ جنتا کا بھیجا چاہیئے

تالو اتنی چکنی ہے بھاٹ کی
جی میں آتا ہے پھسلنا چاہیئے

صبغۃ اللہ بھاٹ

شاعروں کی شان رکھنا چاہیئے
ساتھ بریانی کے میٹھا چاہیئے

کٹ گئی تکرار میں جلوے کی رات
اس کو بیٹی اس کو بیٹا چاہیئے

تیرے پیمانے سے جی بھرتا نہیں
ساقیا مجھ کو تو مٹکا چاہیئے

چھوڑ دیں گے ہم بھی مئے نوشی مگر
شرط بس اتنی ہے کانجہ چاہیئے

جب تواضع کے لئے جوتے اُٹھے
یوں کہا عاشق نے بانٹا چاہیئے

خواب میں نشتر سے غالب نے کہا
مفت کی پیتا ہوں اب کیا چاہیئے

غلام محمود نشتر

ڈاکٹر کمال الدین

تعزیت

۹۰ برس کی عمر میں اگر ملک الموت کسی کی روح قبض کرے تو اسے حق بجانب سمجھا جاتا ہے۔ لوگ یہ سوچ کر تشفی کر لیتے ہیں کہ آخر کوئی کب تک چھوٹ دے۔ خویش و اقربا بھی ہنسی خوشی وداع کر دیتے ہیں یہ سوچ کر کر آخر کوئی کسی کو کب تک ڈھوئے۔ لیکن مولانا مسرت علی کی موت پر شہر کا ہر طبقہ دل گرفتہ تھا اور ہر کتبہ سنجال کے لوگ آہ و زاری میں مصروف تھے اس کی ایک بڑی وجہ دفعتاً ملک الموت کا کامیاب شب خون تھی۔

خبر ملتے ہی میں بھی جائے وقوع کی طرف روانہ ہو گیا۔ کیونکہ مولانا سے میرے بڑے پرانے مراسم تھے۔ رشتہ نسب نامہ کے ساتھ تعلقات احمقانہ بھی تھے۔ جب کبھی مل جاتے تو اس ہمدردی کے ساتھ گفتگو شروع فرماتے:۔

"اے میاں! بڑے ہی جو شیر یا ندر با پیدا ہو سکے ہو۔ قدم سنبھال کر چلو۔ محنت و مشقت کی عادت ڈالو۔ میرے والد بھی عین غدر کے ہنگامے میں پیدا ہوئے مگر اس عالم بے ثبات میں اپنے قدم اس طرح ثابت رکھے کہ طوفان بالاخر بھی انھیں ہلا نہ سکے اور میں ..... میں تو بنگال کا قحط وغیرہ ...."

میں ہمیشہ بزاخفش کی طرح گردن ہلاتا رہا۔ حتی الوسع ان کی ملاقات سے احتراز کرنے لگا مگر جب سے ریسرچ کا کام شروع کیا ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہو گئیں اس لئے مجھے خلوص کے ساتھ آنا جانا شروع کر دیا اور ان کی ہدایاتی پیوندکاری سے اپنے مستقبل کی مرمت میں مصروف ہو گیا۔

مولانا کی لاش دیکھ کر کوئی انھیں مردہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب بول پڑیں گے۔ ذرا سی دیر میں اپنی ریش سفید پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیں گے۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہیں 'ڈاکٹر' ڈاکٹر کشن نہ دینا شروع کر دیں۔ ڈاکٹر کشن کا خیال کرتے ہی میں بہت گھبرا گیا۔ لوگوں نے میری گھبراہٹ اور پریشانی کو صدمہ سمجھا۔

مولانا کے بڑے لڑکے جمیل احمد عرف جمی سے لوگ اس اچانک (جو بہت دیر سے اور پروگرام کے مطابق آئی تھی) اور بے وقت (وقت پر آنے کے باوجود بے وقت اور بے وقت) موت کا سبب پوچھ رہے تھے کیونکہ مولانا مسرت علی شام کے ساڑھے سات بجے تک سڑکوں پر چہل قدمی کرتے دیکھے گئے تھے۔ بعض احباب سے تو انھوں نے گفتگو بھی فرمائی تھی۔

جمی لوگوں سے وجہ بیان کر رہے تھے "ابا حضور رات کے دس بجے تک بالکل اچھے تھے انھوں نے حسب معمول رات کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد اپنے سونے کے کمرے میں تشریف لے گئے۔ صبح کو جب

نوکر پانی لے کر ان کے کمرے میں گیا تو انھیں سوتا دیکھ کر واپس آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں کسی کام سے ان کے کمرے میں گیا۔ یہ دیکھ کر میرے حواس گم ہو گئے کہ ابّا حضور اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ یہی تھے حالات۔ موت کی وجہ بتانی مشکل ہے۔ جب ان کے سامنے موت کی بات ہوتی تھی تو اکثر کہا کرتے تھے۔ میاں میں موت سے نہیں ڈرتا۔ جب خدا کو ضرورت ہوگی خود بلالیں گے۔ اس لئے ان کی موت کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ شاید اللہ کو ان کی ضرورت پیش آگئی۔ اور انھیں بلا تاخیر جانا پڑا۔ ایسے وہ ہر کام میں جلدی کے قابل بھی تھے۔

حاضرین تھوڑی دیر اظہار تاسف کر کے خاموش رہے۔ مگر وہ انسان ہی کیا جو بالکل خاموش رہے۔ آخر خدا نے زبان کس لئے دی ہے؟ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے متاسفین مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور گفتگو چل نکلی۔

"اللہ نے چلتے پھرتے اٹھالیا۔ ہم گنہگاروں کی موت پتہ نہیں کیسے ہوگی۔؟" ایک شخص نے نہایت ہی افسوس کے ساتھ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! ایسی اچانک موتیں بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔ میرے گہرے دوست تھے۔" ایک اور نے فرض تعزیت ادا کی۔

"بھگوان نہ کرے کہ ایسی ہارٹ اٹیک والی موت میری ہو۔ ورنہ بڑا خسارہ ہو جائے گا!" سیٹھ جوڑن داس کھاتہ والا نے بڑے پیار سے اپنی توند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ جی بات دراصل یہ ہے کہ انسان کی جسمانی ساخت بڑی پیچیدہ ہے اس لئے ہمیشہ کسی نہ کسی طبیب سے مشورہ لیتے رہنا چاہیے۔ حکیم شفاء اللہ خان نے ذرا تن کر اپنی گردن ہلاتے ہوئے مشورہ ہی کیا! کسی نہ کسی طبیب کے سامنے ہمیشہ بیٹھے رہنا چاہیے۔ پتہ نہیں کب کون سا عضو دھوکہ دیدے۔" پیچھے سے کسی نے بڑی متانت سے کہا۔

"چوں قضا آید طبیب ابلہ شود" کسی نے چٹکی لی۔

"کون ہو میاں! میری طبابت پر پھبتی کستے ہو۔ بیوقوف!" "چوں قضا آید مریض ابلہ شود" حکیم شفاء اللہ خاں بگڑ کر بولے۔

"ہا ہا ہا ہا!" لا جا قہقہہ ابھرا

"اے بھئی! یہ جھگڑنے کا موقعہ نہیں ہے۔ اس کے بہت سے مواقع ہاتھ آئیں گے" ایک شخص نے موقعہ کی نزاکت کا احساس دلایا۔

دوسری طرف کچھ لوگ مولانا کی ادبی حیثیت متعین کرنے پر آمادۂ پیکار تھے۔ ایک شخص نے کہا "مولانا ادب کی دنیا میں ناقابل فراموش ہو چکے ہیں۔"

"ہاں بھئی! شہر کی علمی اور ادبی مجلسیں ان کی ذات سے پر رونق رہیں!" یہ شخص اپنا خیال ظاہر کرتے وقت گریۂ بے پناہ سے بال بال بچا۔

"اب ایسی شخصیت کہاں ہے شہر میں ان کی شرکت سے مجلسوں میں گرمی آجاتی تھی!"

مولانا کے ایک پرانے حریف نے اظہار تاسف کیا۔

"آپ کی تو عمر بھر مولانا سے چشمک رہی آج بھی تو زبان قابو میں رکھیئے۔ گرمی کی بھی خوب کہی جیسے کہ وہ آدمی نہ تھے۔ تنور تھے یا ہیٹر!" ایک منچلے نے بات میں بات نکالی۔

"اگر بات سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو تو ان ٹیلیکوپس کے نزدیک رہنا ہی نہیں چاہیئے حد ہو گئی بھئی بے ہودگی کی!"

"دیکھیئے! ذرا سی بات کیا کہہ دی کہ جناب پر اولے برس پڑے!"

"اچھا بھئی! جانے بھی دو۔ ہم سب تعزیت کے واسطے جمع ہوئے ہیں۔ جیسا کہ مجھے یاد آرہا ہے۔" ایک شخص نے بآواز بلند فلسفیوں کے سے انداز میں کہا۔

اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔

اس کے بعد ہی حاضرین کو یاد آگیا کہ وہ لوگ تہنیت نہیں، تعزیت کے لئے آئے ہیں۔ سبھوں نے اپنے چہرے لٹکا لئے بعضوں کے چہروں پر آنسوؤں کی نہریں جاری ہو گئیں۔ بعض حضرات ایسی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے کہ گمان ہونے لگا کہیں سائبیریا کا علاقہ انھیں میں پناہ گزیں تو نہیں۔

تجہیز و تکفین کے بعد جھگا پر جلدی کی

تجوری اٹھا کر جانے والے چلے گئے۔ مرحوم کے ڈرائنگ روم میں صرف تین اشخاص رہ گئے۔ جنہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس پرتصنع دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بطور خاص رونے کیلئے بھیجا ہے۔ آنکھیں تھیں کہ واٹرٹنکی کا پائپ اور چہرہ تھا کہ مروڑا ہوا تکیہ۔

پہلا شخص محلہ کا بنیا تھا جس سے مرحوم سودا سلف لیا کرتے تھے۔ جمی نے ابا جان سے کئی دفعہ کہا کہ یہ بنیا بڑا بے ایمان ہے۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیا۔

"جمی! جبکہ تم نے میری تمناؤں میں ہنکنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ اسی وقت سے میں اس سے سودا سلف لیتا آرہا ہوں۔ اس سے ایک قسم کی وابستگی سی ہوگئی ہے۔"

جمی نے سوچا شائد انھیں تعلقات دیرینہ کی وجہ سے بنیا بے تحاشہ گوہر آبدار لٹائے جارہا ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت سوچ رہا تھا۔

"مولانا کی جی حضوری کرکے میں نے ہزاروں روپئے بنائے۔ وہ اخروٹ کی الماری جس کی قیمت ہزار روپیئے آسانی سے مل سکتی تھی میں نے صرف ڈیڑھ من چاول کے عوض اُچک لیا۔ افسوس اب ایسے رئیس ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے ہیں۔ مولانا کی موت سے میری آمدنی کم از کم ہزار روپیئے کم ہوجائے گی۔ میری دکان کی بغل میں ان کی تین کٹھہ زمین ... اُف اب یہ سوچنے سے کیا ہوگا ... بڈھے کو مرنا ہی تھا تو تین مہینہ بعد مرتا ... یہ موت کے فرشتے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کسی کے منصوبے کا ایک ذرا سا خیال نہیں کرتے۔ یہ خیالات اس کے دماغ میں بے چین تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

دوسرا ایک نوجوان تھا۔ وہ سب سے زیادہ بدحواس تھا۔ ایک لازوال افسردگی اور مایوسی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ چپ چاپ کھڑا تھا کبھی سسکیاں آجاتی تھیں۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جمی نے ایک اجنبی کو زار و قطار روتے دیکھ کر بڑی ہمدردی سے صوفے پر بٹھایا اور پوچھا۔

"آپ کا تعارف؟"

"مجھے ایوب کہتے ہیں۔ مرحوم کی موت سے میرا بڑا نقصان ہوا ہے۔ آج انھوں نے وزیر تعمیرات کے نام ایک سفارشی خط دینے کے لئے بلایا تھا مگر افسوس اب کیا ہوگا۔"

"صبر کیجئے اور خدا پر بھروسہ رکھیئے۔" جمی نے ڈھارس بندھائی۔

تیسرا شخص میں ہی تھا۔ میں جان بوجھ کر نہیں رو رہا تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ آنکھیں لاشعوری طور پر رونے کے لئے مصر تھیں۔ میں اس وقت آنکھوں کے ہاتھوں بے بس تھا۔ اپنے بیٹھتے ہوئے دل کو لاکھ کھڑا رہنے کی تاکید کی مگر وہ دل ہی کیا جسے سمجھ سے واسطہ ہو۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہا تھا اور بیٹھ جانے پر مصر تھا۔

جمی نے مجھ سے کچھ استفسار نہیں کیا۔ غالباً اس نے سوچا تعلقات گہرے تھے اس لئے صدمہ بھی گہرا ہوگا۔ میں احتساب میں مشغول تھا کہ آخر میں ایسا ہو کیوں رہا ہوں۔ پختہ آم کی طرح یکایک یہ خیال میرے گلستانِ ذہن میں ٹپک پڑا کہ میری تھیسس کا کیا ہوگا کیونکہ میری تھیسس جس ادیب سے متعلق تھی، مولانا کی موت سے اس کا اینٹی تھیسس ہو رہا تھا۔ میرے موضوع ان کے لنگوٹیا یار رہ چکے تھے وہ اس دورِ بے ثبات کی آخری نشانی تھے بہت سی باتیں سوائے ان کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے مجھے چند نایاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے متعلق بھی بتایا تھا۔ مگر مجھے معلوم کیا تھا کہ وہ اس طرح اچانک رخصت ہوجائیں گے۔ یہ سوچ کر تو میں اور بھی ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان گھر گیا۔ جمی میاں دوڑے آئے میرے خلوص اور گریۂ نالی سے بہت متاثر تھے۔

"موت تو برحق ہے احساس کا وقت متعین ہے اب چپ رہو" اس نے بڑی ہمدردی سے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو اندر چلیں اس لئے کہ عین ممکن ہے کوئی اور آجائے اور مجھے اسے چپ کرانے میں خاصا وقت ضائع کرنا پڑے" اور میں اس کے ہمراہ اندر چلا گیا۔

••

اقبال شیدائی
(ورنگل)

قلابازیاں

قلابازیاں صرف لوٹن کبوتر ہی نہیں کھاتا سب ہی کھاتے ہیں۔ حال ہی کی بات ہے کہ دہلی میں صرف دو منٹ کی آندھی چلی اور ایک بس جس میں دو سو مسافرین ٹھنسے ہوئے تھے پانچ بار قلابازیاں کھا گئی تھی۔ جب بے جان چیزیں قلابازیاں کھا سکتی ہیں تو حضرت انسان قلابازیاں کیوں نہیں کھا سکتے۔ چنانچہ حضرت انسان بھی قلابازیاں کھاتے ہیں اور بڑے ٹھاٹھ سے کھاتے ہیں۔ موت کی سیڑھی سے پانی کے حوض میں چھلانگ لگانے والوں، موت کے گوب میں سیکل موٹر چلانے والوں، سرکسوں میں شعبدہ بازوں اور جوکروں کی قلابازیاں آپ نے بارہا دیکھی ہوں گی۔ آپ بھی خود کبھی نہ کبھی قلابازیاں کھاتے ہی ہوں گے اور آپ کے دل میں قلابازیاں کھانے کی آرزو کبھی نہ کبھی جاگتی ہی ہو گی۔ لیکن قلابازیوں سے ہمارا جہاں تک تعلق ہے، تو ہم عرض کریں کہ ہماری قلابازیاں سب سے الگ اور نرالی ہیں پتہ نہیں ہمارے جدِ امجد نے ہمارا نام کیا سوچ کر نانی قلاباز خاں تجویز فرمایا تھا کہ یہ اسم ہمارے لئے اسم بامسمیٰ ثابت ہوا۔

مختلف اصحاب کی صحت کا راز مختلف چیزوں میں مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً میر زن مرید علی خاں کی صحت کا راز ان کی بیگم کی گالیوں میں پوشیدہ ہے۔ مسٹر رحمت فارابی کی صحت کا راز وٹامن بی کا مپلکس کے انجکشنوں میں نہاں ہے۔ وزیر اعظم ہند کی شاندار صحت کا راز ان کی پیشاب خوری میں مخفی ہے اور ہماری قابل رشک صحت کا راز ہماری قلابازیوں میں چھپا ہوا ہے۔ قلابازی کھانا ہر ہندوستانی کا بنیادی حق ہے اور کمال یہ کہ اس پر کسی قسم کا ٹیکس عاید نہیں کیا گیا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ کا شکر ہے کہ حال ہی میں حکومت آندھرا پردیش نے جو بجٹ پیش کیا ہے اس میں کوئی نیا ٹیکس عاید نہیں کیا گیا۔ ورنہ شاید قلابازیوں پر بھی ٹیکس لگ جاتا۔ اس لئے ہم قلابازیاں کھاتے ہیں اور بڑے اہتمام سے کھاتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح آپ آئس کریم کھاتے ہیں۔

پتہ نہیں ہمارے عالمِ وجود میں آنے کے بعد سب سے پہلی قلابازی ہم نے کب، کیوں اور کیسے کھائی تھی لیکن وہ قلابازی جو ہمیں آج بھی یاد ہے اور ہمارے بچپن کی سب سے بڑی قلابازی کے طور پر اہمیت رکھتی ہے ہم نے اس وقت کھائی تھی جبکہ ہمارے والد بزرگوار ہمیں مدرسہ کی عمارت کی دوسری منزل کے پہلے کمرے یعنی پہلی جماعت میں شریک کرواکے راہِ فرار اختیار کی تھی اور ہم ان کے تعاقب میں دوسری منزل کے فرش سے پہلی منزل کے فرش تک پہنچتے پہنچتے سیڑھیوں پر بائیس بار قلابازیاں کھا گئے تھے اور ایسے ہی صحیح سلامت بچ گئے تھے جیسے ہندوستانی فلموں کا ہیرو اپنے رقیب سے خوفناک ڈول کے بعد بچ جاتا ہے. یعنی ہمارے جسم پر ایک معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی.

یوں محسوس ہوتا ہے کہ قلابازیاں ہمارا مقدر ہو کر رہ گئی ہیں۔ دورانِ تعلیم بھی ہم ہر جماعت میں ایک سال قلابازی کھانے کے نظریے کے حامی رہے۔ لیکن میٹرک کا امتحان ہمارے لئے اس قدر سخت ثابت ہوا کہ ہم اب تک قلابازیوں پر قلابازیاں کھائے جارہے ہیں حتیٰ کہ ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء کا مبارک زمانہ بھی ہمارے لئے منحوس اس لئے ثابت ہوا کہ اس میں ہم سے بھی گئے گزرے طلبا، درجہ اوّل میں کامیاب ہو کر ملک کا نام روشن کرنے میں ہم سے بازی لے گئے۔

ہم محض میدانِ تعلیم ہی کے قلاباز نہیں بلکہ میدانِ سیاست میں بھی ہماری قلابازیاں، قلابازیوں کی دُنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے تمام ممتاز سیاستدانوں کی طرح ہمیں بھی بچپن ہی سے سیاست سے گہری دلچسپی رہی۔ چنانچہ پانچویں جماعت ہی سے ہم گلابی پارٹی سے وابستہ رہے اور اسی کے ٹکٹ پر مجلس طلبا کے انتخابات میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہوا۔ ساتویں جماعت میں آتے آتے ہم نے خود ایک نئی پارٹی زعفرانی پارٹی کی بنیاد ڈالی اور گلابی پارٹی کو قلابازیاں کھانے پر مجبور کر دیا۔ آٹھویں جماعت میں آئے تو بیگنی پارٹی نے ہمارا اغوا کر لیا لیکن ہم جامنی پارٹی کے جاسوسوں کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ نویں جماعت میں آئے ہی تھے کہ الکشن آگیا۔ ہم کالی پارٹی، پیلی پارٹی، لال پارٹی، ہری پارٹی الغرض ہر پارٹی کو ٹکٹ کے لئے درخواست دی اور ہر پارٹی نے جب ہمیں سیاست کے لئے نااہل سمجھ کر ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا تو آزاد امیدوار کی حیثیت سے میدان میں آگئے اور تمام حریف پارٹیوں کو وہ قلابازیاں کھلائیں کہ ضمانتیں بھی ان کے ہاتھ نہ آئیں۔ اب ہم برسرِ اقتدار کیوڑا پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ حال ہی میں ہم نے چیف منسٹر کو الٹی میٹم دیا ہے کہ اگر وہ ہمارے شایانِ شان وزارت فراہم نہ کریں گے تو ریاست گیر اندولن چلایا جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چیف منسٹر صاحب قلابازیاں کھاتے ہیں یا ہم۔

آبائی پیشہ ویسے تو سیکلوں کے پنکچر جوڑنا تھا لیکن سٹے کی ایک قلابازی نے دو مکانوں اور تین مکانوں کا مالک بنا دیا۔ فکرِ معاش سے آزاد ہوئے اور پیٹ بھوک کی قلابازیوں سے محفوظ ہوا تو دل نے ادب میں قلابازیوں کے لئے ورغلایا۔ چنانچہ ایک بھرپور قلابازی کھائی تو خود کو دنیائے شاعری میں

پایا۔ دو غزلیں بنا کے ہم بھی شاعر بن گئے اور اپنے ہی دولت خانے پر ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد عمل میں لایا۔ شہر کے نامور شعرائے کرام و معززین شہر کو شرکت کی دعوت دی۔ صدارت بھی ہم ہی نے کی ' معتمدی کے فرائض بھی ہم ہمیں نے انجام دیئے۔ اپنی ہی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا اور اپنی ہی غزل پر اختتام۔ دیگر مدعو شعرائے کرام کو درمیان میں سنا گیا۔ ہمارے کلام پر شعرائے کرام نے تحسین و ستائش کی مروّت میں کھل کر داد دی لیکن ایک نامعقول قسم کا سامع ہم سے الجھ گیا اور کہا۔

" جناب والا ــــ آپ نے ردیف اور قافیوں میں بے شمار قلابازیاں کھائی ہیں۔"

ہم نے عرض کیا ــ "برخوردار! قلابازیاں کھانا ہماری ہابی ہے۔ یہ انکشاف ہمارے لئے باعثِ طمانیت ہے کہ ہم دوسرے میدانوں میں ہی نہیں اردو شاعری کے میدان میں بھی قلابازیاں کھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس شاعری میں اس قسم کی قلابازیاں کھانے کی گنجائش ہوتی ہے وہ جدید شاعری کہلاتی ہے اور ہم جدید شاعری کے علمبردار ہیں"

دوسرے منچلے نے اٹھ کر کہا: " جناب والا! آپ کی پہلی غزل کے چوتھے شعر کا ــ مصرعہ اولیٰ بحر سے خارج ہے۔"

ہم نے فوراً جواب دیا: "ہماری پہلی غزل کے چوتھے شعر کا مصرعہ' اولیٰ قطعی بحر سے خارج نہیں ہے بلکہ ہم نے خود پہلی غزل کے شعر کے پہلے مصرعہ پر ایک تجربہ کیا ہے۔ اردو ادب ایک تجربہ گاہ ہے۔ اس میں نئے نئے تجربے کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ تجربے ادب کی صحت مندی کی علامت ہیں۔"

تیسرے منچلے نے اٹھ کر ادب سے عرض کیا: "شاعرِ اعظم! آپ کی دوسری غزل کے پانچویں شعر کا مصرعہ بھی بحر سے خارج ہے۔"

ہم نے جھلّا کر فرمایا: " آپ اپوزیشن گروپ کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ انتہائی بد ذوق آدمی ہیں۔ کیوں نہ آپ کو اس شاندار محفل سے خارج کر دیا جائے۔"

ہماری شاعری کو جب فضل جاوید نے سنا تو فرمایا: " یار خان! تم غضب کے شعر کہتے ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم اگر نثر لکھو تو تمہاری ترقی کے امکانات نہایت روشن ہیں۔ بہت جلد صفِ اوّل کے ادیبوں میں گنے جانے لگو گے۔"

چنانچہ ہم نے ایک اور قلابازی کھائی اور نثر کی دنیا میں نازل ہوئے اور کئی راتوں کی عرق ریزی کے بعد ایک عدد کہانی تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنی تازہ ترین الوقی کہانی کو لیکر ہم عاتق شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے گزارش کی کہ وہ ہماری کہانی پر اپنے زرّیں خیالات کا اظہار فرمائیں۔ عاتق شاہ نے ہماری کہانی حرف حرف پڑھی اور فرمایا: " خان! تم بہت فصیح و بلیغ زبان استعمال کرتے ہو۔ بعض الفاظ تو میں نے زندگی میں پہلی بار پڑھے۔ کہانی نہایت جاندار ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس کا نہ سر ہے نہ پیر۔

ایسی غیر معمولی کہانیاں شاذ و نادر ہی مطالعہ میں آتی ہیں۔ آپ یوں کیجیے کہ دس بارہ کہانیاں اور لکھیے اور ان کہانیوں کو کتاب کی شکل میں شائع کروائیے۔ کم از کم اردو اکیڈیمی کا انعام تو آپ کو ضرور مل جائے گا۔ پانچ روپے کا سہی۔ انعام انعام ہی ہوتا ہے۔ اردو کی کتاب کے تعلق سے عرض کروں کہ اس کا چھپ جانا ہی اس کا سب سے بڑا کمال ہوتا ہے۔ ورنہ اردو کے کیسے کیسے ادیب ہیں جو عمر بھر جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے مرگئے۔ لیکن ان کی عمر بھر کا اثاثہ مطبع تک نہ پہنچ سکا۔ میرا مشورہ مانئے خان۔ میری اسکیم پر عمل کیجیے۔ اپنی کتاب کی پیشگی قیمت قارئین سے وصول کر لیجیے۔ بعد میں کتاب چھاپ کر انھیں دے دیجئے۔"

ہم نے کہا: "جناب! ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔ ہم لیڈر ہیں۔ چھ سال میں ایک بار گھر گھر پھر کر ہم ووٹ مانگتے ہیں اپنی کتاب کی پیشگی قیمت نہیں مانگ سکتے۔"

"تو پھر آپ اپنا کالا پیسہ باہر لائیے وہ آخر کس کام آئے گا۔" عاشق شاہ نے کہا۔

"حکومت تو پہلے ہی ہزار روپے کے نوٹ منسوخ کر چکی ہے۔ کیا پتہ کسی حسین سی صبح سو کے نوٹ بھی منسوخ کر دے۔"

مشورہ تو نیک تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہ تھا۔ کیونکہ یہ ایک کہانی ہم نے کئی راتوں کو قربان کر کے لکھی تھی۔ مزید دس کہانیوں کی تخلیق کا مطلب تھا مزید کئی ماہ کی راتوں کا خون۔ ہم نے سوچا کہ شہر سے ایک رسالہ بے ستون شائع ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہم اپنی اس نادر تخلیق کو اسی میں چھپوا لیں۔ چنانچہ ہم معہ اپنی کہانی مدیر بے ستون کے ہاں پہنچ گئے۔ ہماری آمد کے مقصد سے جب مدیر بے ستون واقف ہوا تو اس نے ہمارے آگے اپنے تازہ شمارے کا ایک ورق رکھ دیا۔ جس میں حسب ذیل اعلان تھا۔

"قلمکاروں سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات مزید دو برسوں تک ادارے کو بھیجنے کی زحمت نہ کریں۔ کیونکہ ادارے کو اتنا ادبی مواد فراہم ہو چکا ہے کہ اسے اگلے دو برسوں تک کسی بھی تخلیق کی ضرورت نہیں ہے۔"

مدیر بے ستون نے ہمیں مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ ہم اس کہانی کو ذرا طول دے کر ناولٹ میں تبدیل کر دیں اور ناولٹ کو کسی بھی پریس سے شائع کروالیں۔ چنانچہ ہم نے پھر قلابازی کھائی اور "ناولٹ نگار" بن گئے۔ کئی مہینوں کی کاوشوں کے بعد ہماری ناولٹ تیار ہوئی تو ہم یہ مسودہ لے کر شہر کے سب سے زیادہ مشہور کاتب صاحب سے رجوع ہوئے۔ کاتب صاحب نے ہمیں مسودہ لوٹاتے ہوئے فرمایا: "جناب میں اس کی کتابت نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔ میں اگلے چھ ماہ تک کے لئے بُک ہوں۔"

ہم نے عرض کیا: "ہمیں آپ کم از کم دوسرے کاتب، کاتب صاحب کا پتہ بتلا دیں تاکہ ہم اُن کی خدمات حاصل کر سکیں۔"

کاتب صاحب بولتے: "اللہ ایک اور اس شہر میں اردو کا کاتب ایک خاکسار۔ بہتر ہے کہ آپ خود

کتابت سیکھ لیں۔ کتابت بہت آسان فن ہے۔ آپ اگر حرف "جیم" لکھنا سیکھ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے آدھی کتابت سیکھ لی۔"

چنانچہ ہم نے ایک اور قلابازی کھائی اور کاتب بن گئے۔ ہم حیدرآباد گئے۔ چھتہ بازار سے ہم نے مسطر، کتابت کی روشنائی، پنسلوں اور قلموں کا سیٹ خریدلائے اور حرف "جیم" کی مشق شروع کردی۔ جیم کے دولاکھ ترتالیس ہزار پانچ سو اٹھارہ نمونوں کا البم لے کر جب ہم کاتب صاحب کے ہاں پہنچے تو انھوں نے ہماری محنتوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا: "خان صاحب! ان تمام نمونوں میں سے ایک نمونہ بھی ایسا نہیں جس کو جیم تسلیم کیا جاسکے۔"

ہم نے کہا: "جناب والا ہمیں آپ کتابت سکھایئے۔ ہم آپ کو معقول معاوضہ دیں گے۔"

کاتب صاحب نے فرمایا: "جناب میرے پاس قطعی وقت نہیں ہے۔ یوں کیجئے کہ ایک کتاب "نظم پروین" کا مطالعہ فرمایئے اور اس کی ہدایات پر عمل کیجئے۔ آپ کو کتابت آجائے گی۔"

سارے حیدرآباد میں کہیں بھی یہ کتاب ہمیں نہ مل سکی۔ اتفاق سے ایک خوانچے والے کے ہاں ردّی کاغذات میں ہمیں نظم پروین مل گئی تو ہمارا ایک مسئلہ حل ہوا۔

چنانچہ پانچ ماہ کی عرق ریزی کے بعد ہم نے اپنے ناولٹ کو مسطر پر منتقل کر ہی دیا۔ اور کتابت شدہ مواد کو لے کر ہم پریس پہنچ گئے۔ پریس کے مالک صاحب نے مسطر کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔

"جناب اگلے دو ماہ تک آپ کا کام نہیں ہوسکتا۔ نہایت ارجنٹ قسم کا کام پڑا ہوا ہے۔" انھوں نے کہا۔

ہماری مسلسل تگ ودو کے بعد ایک سو پانچویں دن ہمارے ناولٹ کے چھپنے کی گھڑی آئی۔ لیکن واے رے قسمت! ہماری کتابت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پریس کے مالک نے کہا: "پتہ نہیں کس گدھے سے آپ نے کتابت کروائی ہے۔ اس کی کاپی پتھر پر نہیں بیٹھ سکتی۔ لے جایئے صاحب۔ آپ نے فضول ہمارا وقت ضائع فرمایا۔"

ہمیں یوں محسوس ہوا کہ پریس کا مالک ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہماری ناولٹ اس وقت تک شائع نہ ہوسکے گی جب تک ہم خود ایک عدد پریس کے مالک نہ بن جائیں گے۔ یعنی ہمیں ایک اور قلابازی کھانی پڑے گی۔ اردو کا ادیب آخر کتنی قلابازیاں کھائے گا۔ اردو کا ادیب ادیب نہ ہوا وہ برہمن نہ ہوا جس نے چوہوں سے نجات پانے کے لئے ایک بلّی پالی تھی۔ بلّی کے لئے دودھ درکار تھا دودھ کے لئے ایک گائے خریدنی پڑی تھی۔ گائے کی نگہداشت کے لئے ایک ملازم رکھنا پڑا تھا۔ اس طرح معاملہ بڑھتا ہی گیا تھا۔

■■

اسرار جامعی
پٹنہ

حُسنِ بے پردہ کو پرچون کی دوکان کہئے!

زُلفِ بیگم کو جو زنجیرِ اسیراں کہئے — پھر تو لازم ہے کہ، سسرال کو زنداں کہئے!
جو پڑا رہتا ہے سسرال کے در پہ ہر دَم — اس کو داماد نہیں حاجب و درباں کہئے!
اب تو عام رہ بچا کوئی زمانے میں مگر — ایک بیگم ہیں جنھیں فتنۂ دوراں کہئے!
دیکھتے ہی مری صورت جو بھڑک اُٹھتی ہے — ایسی بیوی کو نہ کیوں شعلہ بہ دنداں کہئے!
گھر میں وہ قید رہیں جائیں جو بیگم پیچھے — ایسے شوہر کو نہ کیوں، یوسفِ کنعاں کہئے!
آئے مہمان کی صورت گئے چپل لے کر — اس ستم کو کرم و لطفِ محبّاں کہئے!
میں نے آداب بجا لایا تو گالی دے دی — سینڈل اُس نے نہ ماری یہی احساں کہئے!
"گھوڑے جوڑے کی رقم" یا کہ تلک اور جہیز — انہیں لعنت نہیں ماں باپ کا ارماں کہئے!
نہ تو مطلب اِنہیں روزے سے نہ ہے فکرِ نماز — ہند کے دَیر نشینوں کو مسلماں کہئے!
طشت از بام ہوئے رُخ سے اُلٹ کر وہ نقاب — حُسنِ بے پردہ کو" پرچون کی دوکاں کہئے!
سوکھی روٹی ہے پڑی پیٹ کی انگنائی میں — ایسی جنتا کو نہ کیوں حاکمِ دوراں کہئے!
پی کے دو گھونٹ بہک جاتے ہیں ہمدم میرے — اور کہتے ہیں مجھے وقت کا سلطاں کہئے!
نقلِ ہپّی میں پھرا کرتے ہیں مارے مارے — ایسے لوگوں کو نہ کیوں وحشیِ دوراں کہئے!
غیر کی حور پہ للچائی نظر رکھتے ہیں — مجھ کو معلوم ہے سب "حضرتِ رضواں" کہئے!
بھاگ کر جان بچائی جو ہُوا لاٹھی چارج — میری ہمّت کو نہ کیوں "ہمّتِ مرداں" کہئے!
مونچھ داڑھی کی صفائی کا ہے شکوہ اُنکو — کون ڈھوتا پھرے چہرے پہ بیاباں کہئے!

رہے اسرارؔ سدا طنز کا معیار بلند
شعر کہئے بھی تو ہرگز نہیں ارزاں کہئے!

سراجؔ نرملی

گرانیٹ کا سفوف نہ ہو مرچ میں مِلا — بدلا ہوا مزہ ہے بتا! کیوں اچار کا؟
میں نے چکھی نہیں ہے کبھی، ہے حرام شئے — بزنس ہے صرف یہ مرا، مالک ہوں بار کا
سسرال چکنی ڈھونڈ رہا ہوں سراجؔ میں — کرنا ہے مجھ کو قرض ادا دس ہزار کا

مظہر الزماں خاں
حیدرآباد

درد لا دوا

آج سبھی کسی نہ کسی درد میں مبتلا ہیں۔ کسی کے کان میں درد ہے تو کسی کے سر میں درد ہے۔ کسی کے پیروں میں درد ہے تو کسی کے گھٹنوں میں درد ہے۔ غرضیکہ سب جسم درد ہی درد ہیں۔ کوئی ہمدرد نہیں (سوائے ہمدرد دواخانہ کے کیونکہ وہاں بھی ہم رہتے ہیں اور درد رہتا ہے) لیکن ایسے درد بلکہ دردوں کو سیاسی یا مصلحتی درد کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دل اور دماغ کی پیداوار ہوتے ہیں اس لئے ان کو ڈاکٹروں یا حکیموں کے علاج کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ آپ اپنا علاج ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ مصلحت سے اُٹھتے ہیں اور پھر مصلحت سے ہی بیٹھ بھی جاتے ہیں یعنی ختم ہو جاتے ہیں اور آج تقریباً سبھی ایسے ہی مصلحت آمیز دردوں میں مبتلا ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کو اپنی بیوی صاحبہ سے یہ شکایت ہے کہ وہ ان سے اکثر اپنے پاؤں دبا لیتی ہیں۔ یہ پاؤں دبا لینے کا عمل دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو گھر دامادی کی وجہ سے اُٹھتا ہے اور دوسرا صرف نام کے داماد ہونے کی وجہ سے اٹھتا ہے پہلا عمل پھر بھی گوارا ہے لیکن دوسرا عمل گھر اور داماد کے درمیان کی چیز ہے مثلاً اگر لفظ درمیان کو الگ کر کے لکھا جائے تو یوں ہوگا در ـــ میان ـــ یعنی میاں کا در ـــ اب وہ صاحب جنہیں یہ شکایت ہے پتہ نہیں در ہیں یا میاں ہیں۔ چنانچہ ایسے درد کو مصلحتی درد کہا جاتا ہے جو موقعہ اور مطلب سے اٹھتا ہے ـــ ایک اور صاحب بھی اسی قسم کے درد میں مبتلا ہیں۔ محلہ میں انھیں شرخے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے سر پر شرخا ہر وقت سوار رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر کسی کو آپس میں ٹکرا دیتے ہیں ورنہ ان کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کسی کو لڑا نہیں دیتے اور جب لڑا دیتے ہیں تو درد خود بخود کم ہو جاتا ہے۔ اور ان کی اس خطرناک عادت کی وجہ سے دو بھائیوں میں برسوں سے رنجشیں چلی آ رہی ہیں۔ اور اگر کبھی اتفاق سے یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو پھر انھیں درد شروع ہو جاتا ہے ـــ اس کے علاوہ دردِ سر کی اور بھی کئی قسمیں ہیں جیسے اسرائیل عربوں کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ تو چین روس کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے چنانچہ درد اور سر ایک دوسرے کے شریک حیات بن کر رہ گئے ہیں۔ نہ سر درد سے جدا ہو سکتا ہے اور نہ درد سر سے الگ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک سر رہے گا تب تک درد رہے گا۔ اسی طرح داڑھ کا درد بھی حقیقی اور غیر حقیقی ہوتا ہے حقیقی درد سے مراد دانتوں کی بیماری ہے۔ اور

دانتوں کی بیماریاں اکثر غلط چیزوں پر منہ مارنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے درد کو ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج سے دور کیا جا سکتا ہے لیکن یہ درد جو غیر حقیقی یعنی وقت کی نزاکت سے اٹھتا ہے۔ ایسے درد کو کسی قسم کے علاج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ مصلحت سے اور پھر اچانک اٹھتا ہے اور پھر اُسی طرح کم بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب کو اپنی بیوی سے یہ شکایت ہے کہ جب بھی وہ اپنی بیوی کو ڈانٹتے ہیں۔ اچانک بیوی کی داڑھ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور وہ بے کھائے پیئے بلکہ پکائے کھلائے بغیر لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتی ہیں اور اسی وقت تک لیٹی رہتی ہیں جب تک کہ وہ جاکر سمجھا نا نہیں لیتے۔ بہر حال اُن صاحب کو عرصہ دراز کے بعد داڑھ کے درد کی اصلیت کا پتہ چلا اور پھر ایک دن جوں ہی بیگم کی داڑھ میں درد اُٹھا انھوں نے اچھی خاصی پٹائی کر ڈالی۔ بقول ان کے اس کے بعد پھر کبھی ان کی بیوی کی داڑھ میں درد نہیں ہوا۔ ایک اور صاحب موصوف کو پیٹ کے درد کی شکایت ہے اور یہ درد اس وقت اٹھتا ہے جب انھیں کوئی راز کی بات بتائی جاتی ہے اور پھر انھیں کسی سے نہ کہنے کی سخت تاکید کی جاتی ہے۔ تب اچانک ان کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ دو چار نہیں بلکہ دس پندرہ لوگوں کے سامنے اس راز کی بات کو اگل نہیں دیتے۔ کچھ اسی قسم کے درد میں ایک لیڈر صاحب بھی مبتلا ہیں (ویسے تقریباً سبھی لیڈر کسی نہ کسی درد میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں) اور یہ درد انہیں پورے پانچ سال کے بعد اچانک اٹھتا ہے اور پوری شدت سے اٹھتا ہے اور وہ شدت درد میں اپنے حریف کو جو ان کے مد مقابل ہوتا ہے خوب خوب گالیاں دے ڈالتے ہیں۔ اگر وہ خوش قسمتی سے الکشن جیت جاتے ہیں تو درد خود بخود پانچ سال کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ عوام کے لیے دردِ سر بن جاتے ہیں یا پھر شکست کھانے کی صورت میں درد ایک نئی کروٹ بدلتا ہے یعنی جس شخص کے خلاف وہ زہر افشانی کرتے تھے اس کے تعلق سے پھول برسانے لگتے ہیں اور یہ پھول اس وقت تک برستے رہتے ہیں جب تک کہ وہ کرسی پر براجمان رہتا ہے۔ مگر جوں ہی کرسی اس کے نیچے سے کھسک جاتی ہے وہ جو اس کی فطرت ہے پھول کی جگہ گالیاں شروع ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ایک افسانہ نگار دوست بھی کچھ اسی قسم کے درد میں مبتلا ہیں۔ دراصل ان کے درد کی وجہ ان کا ایک ہم عصر افسانہ نگار نعیم پرواز ہے۔ جس کے خلاف وہ آئے دن زہر اگلتے رہتے ہیں یعنی جب بھی نعیم پرواز کا کوئی افسانہ کسی پرچہ میں چھپتا ہے ان کے پورے جسم میں درد شروع ہو جاتا ہے اور وہ نعیم پرواز اور اس کی تخلیق، دونوں کے خلاف زہر افشانی شروع کر دیتے ہیں مثلاً وہ کہیں گے کہ جناب "کیا آپ نے نعیم پرواز کا تازہ افسانہ پڑھا ہے؟"۔ اگر آپ نفی میں جواب دیں تو کہیں گے۔

"بہت اچھا کیا۔ ورنہ خواہ مخواہ آپ بور ہو جاتے۔ پتہ نہیں کیا اوٹ پٹانگ لکھتا ہے نہ اسلوب، نہ الفاظ اور نہ کوئی موضوع سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا لکھتا ہے اکیوں لکھتا ہے؟ اور پھر یہ رسائل والے کیا سمجھ کر اُسے چھاپ دیتے ہیں۔ غرضیکہ بیچارہ نعیم پرواز ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا اور وہ ہر کسی کے سامنے اس کے اور اس کی تخلیقات کے خلاف مسلسل زہر اُگلتے رہتے تھے۔ قصہ مختصر بیچارہ نعیم پرواز اللہ کو پیارا ہو گیا تو ایک دن ہم نے موصوف سے جاکر کہا کہ جناب آپ کے دل میں جو کانٹا برسوں سے کھٹک رہا تھا اور جس کی وجہ سے آپ کے دل و دماغ بلکہ پورے جسم میں درد ہوتا تھا وہ کانٹا اب نکل چکا ہے۔ لہذا اب آپ کا درد بھی ختم ہو چکا ہوگا جو نعیم پرواز کی وجہ سے ہوتا تھا۔۔۔۔ بولے "نعیم پرواز کی موت سے ادب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے بلکہ ادب میں ایک ناقابلِ تسخیر خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا "آپ تو نعیم پرواز کو ادب

تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ اور اس کی نخلیقات میں ہزار کیڑے نکالتے تھے اور آج آپ .....

فرمایا " جب تک وہ لکھتا اور چھپتا تھا مجھے اس سے اور اس کی تحریروں سے سخت نفرت تھی اور اب جبکہ وہ مرچکا ہے۔ لکھ نہیں سکتا" مجھے اس سے بے انتہا محبت ہوگئی ہے اور وہ درد جو اس کی موجودگی کی وجہ سے ہوتا تھا اس کی موت کے بعد خود بخود ختم ہوگیا۔ چنانچہ آج اس قسم کے دردوں میں نہ صرف وہ صاحب بلکہ صحافی، شاعر، نقاد، افسانہ نگار، مفکر، سیاست دان، حجام، کارپینٹر، عاشق معشوق سب کے سب مبتلا ہیں۔ اس لئے کہ یہ درد ابن آدم کی ایڑی سے شروع ہوا تھا اور جب سر کے اوپر پہونچ جائے گا تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور تمام درد خود بخود کم ہو جائیں گے۔

نرگس سہوانی

پیشہ ور اُستاد

(اساتذہ سے معذرت کے ساتھ)

کل ایک مارکیٹ سے میرا ہوا گزر — تجّار جس میں آئے نظر مجھ کو بیشتر
کچھ زیورات کی تھیں دکانیں سجی ہوئی — کچھ "شاپیں" پارچے کی وہاں تھیں لگی ہوئی
میوہ فروش سیب دکھاتے تھے چھانٹ کے — آواز گاہکوں کو لگاتے تھے ڈانٹ کے
حلوائی بولتے تھے بڑی جی جناب سے — ہوٹل کھلے ہوئے تھے بڑی آب وتاب سے
ایسی بھی اک دکان پہ میری پڑی نظر — جس پر براجمان تھے اک حضرتِ جگر
چھوٹا سا ایک "بورڈ" بھی لٹکا تھا گیٹ پر — "اصلاح" اب کرائیے آسان ریٹ پر

تھا شاعری کا مجھ کو بھی چسکا لگا ہوا
تازہ غزل میں تھا ذرا کھٹکا لگا ہوا

سوچا! کہ کیوں نہ مشورہ کرلوں جناب سے — اشعار کیوں غزل میں رہیں پھر خراب سے
'اصلاح' ٹھیک ہو تو غزل کامیاب ہے — سامع بھی کہہ اٹھیں گے بڑی لاجواب ہے
گھس کر کہا دکان میں تسلیم محترم — کیا فیس نظم کی ہے غزل کی ہے کیا رقم؟
دو چار غزل و نظم کے پیسے بتائیے — سستا جو ریٹ ہو وہی مجھ پر لگائیے
فدوی جب آگیا ہے تو خالی نہ جائے گا — تازہ غزل جناب کو پوری دکھائے گا

کہنے لگے کہ فکر نہ کیجے مرے عزیز
رکھتا ہوں ایک 'کوئنٹل' اصلاح کی تمیز

جس نے بھی مجھ سے لی ہے غزل کامیاب ہے — سچ پوچھو وہ بزم شعر میں اک ماہتاب ہے
"لوکل" غزل کا ریٹ تو بس پانچ سات ہے — "آل انڈیا" غزل کی مگر اور بات ہے
اچھی غزل کا ریٹ ہے بس تیس روپے — بھرتا ہوں جس میں خوب محبت کے قافیے
کیسے پڑھوگے بزم میں پڑھ کر سناؤ تو — دُھن جو تمہیں رواں ہو ذرا گنگناؤ تو

میں نے گلے کو صاف کیا اور چل پڑا
حضرت کو میری دُھن نے جو مبہوت کردیا

بولے درست شعر تمہارے کروں گا میں — اب تک نہ بھر سکا ہوں جو جادو بھر دنگا میں
مجھ کو یقیں ہے حشر اُٹھاؤ گے خوب تم — "نغمے" سے اپنے فتنے جگاؤ گے خوب تم
جب میرے شعر جھوم کے محفل میں گاؤ گے — سب سے زیادہ بزم میں تم "داد" پاؤ گے

میں نے کہا حضور مجھے فن سکھائیے
کیا 'فاعلن' کا "فع" کا ہے چکر بتائیے

کہنے لگے کہ کان ذرا پاس لائیے تم — رکھو گے "راز" پہلے قسم یہ بھی کھاؤ تم
بولے کہ کیا "عروض" ہے میں جانتا نہیں — فن کی کسی بھی بات کو میں مانتا نہیں
میرے لئے تو فن کی یہ باتیں فضول ہیں — ایطاء، وتد، دولخت یہ سب خاک دھول ہیں
کرگس نیا کلام تمہیں کہہ کر دوں گا میں — "پیسوں" کی بات یہ ہے کہ پہلے ہی لوں گا میں

اسمٰعیل آذر
(دسکتک)

کیا مذاق ہے

شیطان کو ورغلائے بشر کیا مذاق ہے — لاحول بھی پڑھے ہے اِدھر کیا مذاق ہے
آئے ہیں وہ تو اس طرح آنا بھی کیا ہوا — ہیں چوکیدار ان کے پدر کیا مذاق ہے
اپنا تو مال سیٹھ نے رکھا ہے بنک میں — جنتا کی جیب پہ ہے نظر کیا مذاق ہے
بیٹا! مجھی پہ دھونس جمانے لگا ہے تو — میں تیرا باپ ہوں کہ پسر کیا مذاق ہے
کچھوے کی چال چلتی ہے گھنٹے میں آدھ میل — سرکاری بس پہ کرنا سفر کیا مذاق ہے
اسمگلروں کی چال سے سرکار مات ہے — ہو جائے عام ان کا ہنر کیا مذاق ہے
مجھ سے کتاب مانگ کے جانے کہاں گئے — آئی نہ رفتگان کی خبر کیا مذاق ہے
پھٹ جائے رگ دماغ کی سن کر جدید نظم — رکھنا بچا کے اینٹ سے سر کیا مذاق ہے
دیکھیں جو آپ غور سے بندر ہیں آپ بھی — میری ہی دم پہ کیوں نظر کیا مذاق ہے

آذر اسی کلام پہ ہے زعم آذری
پھوڑا ہے سر تو توڑ دی کمر کیا مذاق ہے

○

ہماری جانب سے ہمالیائی مساعی کی ضرورت ہے

بیروزگاری جیسے ہمالیائی مسئلے کے حل کے لئے ہماری جانب سے بھی ہمالیائی مساعی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ درپیش چیلنج سے نمٹنے اور روزگار کے مواقعات کے لئے نئے میدان ہموار کرنے میں قوم ہمہ تن مصروف ہے۔ اس ضمن میں ریاستی حکومت نے خاص طور پر کمزور طبقات کی مدد پر زبردست زور دیا ہے۔

چنانچہ پڑھے لکھے بیروزگاروں کو سودمند پیشوں کی عملی تربیت دی جائے گی۔ پہلے مرحلے میں یہ تربیت کمزور طبقات تک محدود رہے گی۔ ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء سے آغاز کردہ ۵ کروڑ روپیے مالیت کی خصوصی روزگار اسکیم سے درج فہرست اقوام و قبائل کے بیروزگار میٹریکیولیٹس اور گریجویٹس کو نیز پسماندہ اقوام اور معاشی طور پر پسماندہ افراد کے ایک معقول تعداد کو فائدہ پہنچےگا۔ زیر تربیت افراد کو پرکشش نقد وظائف مارجین رقم اور کاروبار کی ترقی کے لئے امداد فراہم کی جائے گی۔

اس طرح آج آندھراپردیش میں بیروزگاروں کیلئے نئے نئے مواقعات کے دروازے کھولے جارہے ہیں۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھراپردیش
حیدرآباد

نمبر: ۸/۸۰-۷۹

اے اے شیخ بی اے بمبئی

تبصرہ

چوڑی کے غلام
مجموعۂ مضامین : پرویز ید اللہ مہدی
صفحات : ۱۲۸
قیمت : ۷ روپیے
ملنے کے پتے : مکتبہ جامعہ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
: شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

"چوڑی کے غلام" پر ایک نظر

جناب پرویز ید اللہ مہدی کی تازہ کتاب "چوڑی کے غلام" پڑھی۔ کتاب کیا ہے چٹ پٹی چورن کی پُڑیا۔ جوں جوں پڑھتے گئے اشتیاق بڑھتا گیا اور پڑھتے گئے۔ گو کہ پہلے مضمون ہی سے فن کار کا نقطۂ نظر سمجھ میں آگیا تھا مگر اندازِ بیان اتنا پُرکشش ہے کہ ؎

توڑیں گے دم مگر تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے

کے مصداق چپک کر رہے اور پوری کر ہی ڈالی۔

مضامین کی ترتیب و تزئین ماشاءاللہ موتیوں کی ایک لڑی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ چمنِ ادب کی جس مالن نے اس لڑی کو نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ پرویا ہے وہ ایک اُبھرتی ہوئی ادیبہ انجم نجمی ہیں جن کے محض FEMININE TOUCH نے اس ہنسی کا گول گپا کرنے والے مگر پوشیدہ نشتروں سے بھرپور مجموعہ کے بے ترتیب انگ کو حسن و خوبی کا جامہ پہنایا۔

پرویز صاحب سے ہماری ایک چانس ملاقات ہوئی۔ لحیم شحیم، ڈیل ڈول سے نہیں لگتا کہ آپ ایک زندہ دل ادیب ہیں، مگر سر پر بکھرے بال اور پھر آپ کا اندازِ نظارہ "ہر فکر کو دھوئیں میں اُڑاتا چلا گیا" والا سگریٹ کا ہر لمبا کش اس کی غمازی

کرتا ہے کہ آپ ایک مفکر یا ادیب ہیں ۔

جس زمین پر پرندہ پرواز کرنا تو کجا پر نہیں مار سکتا وہاں پروین نے نہ صرف پرواز کی ہے بلکہ پروازی کے بھی جوہر دکھائے ہیں۔ شادی بیاہ کی پرانی فرسودہ رسومات نہ صرف ہمارے بزرگوں کے دل و دماغ سے چمگادڑ کی طرح چپکے ہوئے ہیں بلکہ ان کی دقیانوسی زندگی کا جزو لاینفک بن کے رہ گئے ہیں جن کی عدم ادائیگی یا ذراسی غفلت نہ صرف دلوتائے دقیانوس کی ناراضگی کا سبب بن سکتے ہیں بلکہ دلہا دلہن اور بالخصوص دلہن کے باپ ان کے شراپ اور بد دعاؤں کا شکار ہوسکتے ہیں ۔

جہیز اور گھوڑا جوڑ کی یہ منحوس علت سماج کے لئے ناسور بن گئے ہیں یہاں تک کہ ان کے انسداد کے لئے اب حکومت بھی سخت اقدام پر اُتر آئی ہے ۔ فن کار نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ سماج کے ان جہیز نما سود خوروں اور لالچی کتوں کو جھنجوڑ کر کہے کہ اب ہوشیار ہو جاؤ ۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے، سیما ہوتی ہے ۔ وقت قریب آرہا ہے کہ اس علت کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے ۔ یہ لڑکیوں کا بیوپار، یہ جہیز اور جوڑے گھوڑے کی علتِ خونخوار، پیسہ اور زر کے لالچیوں کا بازار اب بند ہونا چاہئے اور غریب مگر شرم وحیا کے زیور سے مزین لڑکیاں نادر شاہی اور تاناشاہی کے دار پر قربان نہ ہوں ۔ کوئی لڑکی اپنے باپ کے لئے بوجھ محسوس نہ ہو ۔ ہر تعلیم یافتہ شریف اور ذی ہوش جوان اس سے پہلے کہ ان بیجا اور ناجائز مانگوں کی پیش کش کرے ۔ اپنے ضمیر سے پوچھے کہ آیا وہ حق بجانب ہے ۔

پرویز صاحب نے ہنستے ہنساتے اور مزاحیہ انداز میں یہ سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔" چندے آفتاب چندے ماہتاب" میں آپ نے جس دھوکہ بازی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اس نوعیت کے کئی واقعات گزرے ہیں جن میں لڑکی "گھی کی بتا کے تیل کی دی" کے مصداق بتائی کوئی اور جاتی ہے اور گھونگھٹ اُلٹنے پر نوشہ میاں کی بدحواسی کا سامان کچھ اور ہوتا ہے ۔

یہ بات بالکل صاف ہے کہ پرویز یداللہ صاحب ہی کی ہمتِ مردانہ ہے کہ انھوں نے اس لعنت کے خلاف آواز اُٹھائی ہے اور مزاحیہ انداز میں دقیانوسیت کے منہ پر" شال میں لپیٹ کر" اس زور سے کس کے مارا ہے کہ سخت سے سخت جان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا بشرطیکہ اس میں جان اور گیان ہو ۔ مگر ان جہیز نما سود خوروں کی جلدیں اتنی موٹی ہوگئی ہیں کہ شاید اس ۶۰۶ کے انجکشن سے بھی زیادہ سخت سوئی کی ضرورت ہے ۔ پھر بھی طنز طنز ہی ہے ۔ ترش ہو یا میٹھا اثر ضرور کرتا ہے ۔

اس سچائی کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ جہیز اور گھوڑے جوڑے کی علت ہمارے ملک کے ہر صوبے میں پائی جاتی ہے ۔ مگر حیدرآباد اور مدراس میں اب بھی اس کا دور دورہ ہے ۔ جہاں رقموں کی اور چیزوں کی فہرست یا SCHEDULE دولہا کی پوزیشن اور دلہن کی بے چارگی کے لحاظ سے بنائے جاتے ہیں جو قارئین کی تفریحِ طبع کے لئے درجِ ذیل ہیں :-

اگر نوشہ ڈاکٹر ہے تو (۲۵۰۰۰) روپے نقد علاوہ جوڑا گھوڑا کی رقم کے ۔
اگر نوشہ وکیل ہے تو " " " " " "
اگر نوشہ انجینیر ہے تو " " " " " "
اگر نوشہ گورنمنٹ افسر ہے تو " " " " " (کچھ ترمیم کے ساتھ) ۔

اگر نوشہ ہیڈ کلرک ہے تو ۱۰۰۰۰ روپے علاوہ گھوڑا جوڑا کی رقم کے
اگر نوشہ کلرک ہے تو ۵۰۰۰ روپے " " " "

دقیانوسی سماج کے ان کھوسٹ (دیرینہ) رسومات کے خلاف فن کار کا TIRADE یا ہلّہ اس جیٹ کے دور میں اگر انھیں رے نہ اڑائے تو کم از کم EXHAUST ضرور کرے گا۔ آپ نے کئی جگہوں پر مزاح کا وہ انداز اپنایا ہے کہ عرش پر مولانا اکبر الٰہ آبادی نے خوشی سے اچھل کر دعائیں دیتے ہوئے برمحل کہا ہوگا ــــ

"خداوندا۔ تیرا شکر ہے کہ تو نے پرویز کو ہمارا جانشین بنا کر ہماری کوششوں کو جاری رکھا۔ جو ہم نظموں میں کہتے آئے تھے انھوں نے نثر کے سانچے میں ڈھال کر نانی اماں، خالہ خان، پھوپی جان اور نہ جانے کتنی جانوں کو بے جان کر دیا ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ ان جانوں کی صلوٰۃ اور بددعاؤں کی بوچھار سے میاں پرویز بچے رہیں تاکہ بے گناہ بے چاری کنواری جانوں کو ان کی نادر شاہی اور تانا شاہی سے نجات دلا سکیں۔"

اندازِ بیان بہت ہی چست اور تیز رفتار ہے اور فن کار کے "چاہے کوئی ہمیں جنگلی کہے" بے فکرے پن سے قاری کو کسی قسم کی بوریت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ پڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور فن کار کے ساتھ اس کی رو میں بہا چلا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مضامین پڑھے جا رہے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی دوست اپنے ساتھیوں کو کوئی واقعہ یا قصہ سنا رہا ہے۔

تحریر میں زندہ دلی ہی نہیں بلکہ سراسر زندگی ہے کہ فکر تونسوی، علامہ پطرس تو کیا میاں چرکین بھی نہ صرف محظوظ ہوں بلکہ جھینپ جائیں۔ جس طرح شاعری کی اصطلاح میں "آمد" اور "آورد" کے دو عناصر ہوتے ہیں۔ جس سے شاعر کے فطری یا غیر فطری یا اصلی نقلی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح مزاح میں بھی جو بہت ہی مشکل صنف ہے اپنی نوعیت کے دو عناصر ہوتے ہیں جیسے مزاح جس میں NATURAL TOUCH ہو جس سے قاری پوری طرح محظوظ ہو اور غیر شعوری طور پر اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ناچے۔ اس کیفیت کو آمد سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جو مزاح یا HUMOUR جبریہ یا FORCED قسم کا ہو تو بجائے مسکراہٹ کے آنکھوں اور منہ کے ذریعہ جمائی کا خود بخود اظہار ہوتا ہے۔ پرویز صاحب کے مزاح اور لطیفے میں آمد ہی آمد ہے جس میں عام محاورں، ضرب المثل اشعار کی PARODY کا بھنداس (بے خوف) استعمال نے کتاب کی مقبولیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

ہر چیز کے دو رُخ ہوتے ہیں اور ہر نظر کو دونوں رُخ پر نظر رکھنی چاہیے تاکہ موازنہ اور مقابلہ کے بعد دونوں سمتوں کا پورا پورا اندازہ ہو سکے اور نتیجہ اخذ کرنے میں دقت نہ ہو۔ اس لئے ہم نے بھی زیر نظر کتاب کے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھنا مناسب سمجھا تاکہ ان کی خوبیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ برابر کا انصاف ہو۔

اکثر مضامین میں ایک ہی اندازِ آغاز ہے۔ وہی مرکزی کیریکٹر کا چکّر جیسے کہ فن کار کا "ہم" بھابی صاحبہ، بی شرفن اور [illegible] "نیچے پڑھ کر" PERRY MASON کی سراغ رسانی والی ناولوں کا تصور سامنے آتا ہے جس میں کہانی مرکزی [illegible] DELLA SHEEL اور PAUL DRAKE — PERRY [illegible] کے اردگرد گھومتی ہے۔

"ایک ملاقات اور مریم کا ساتھ" میں فن کار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال

لڑکی مگر تہذیب کا دامن تھامے ہوئے سماج میں بالخصوص شادی بیاہ اور اس کی رسومات کے سلسلہ میں ایک زبردست - RE FORMATION - یا تغیر یا پریورتن لانا چاہتی ہے ۔ وہ اس انسان سے اپنی زندگی منسلک کرنا چاہتی ہے جو اس مہم میں اس کا ہم خیال ہو اور ان خون چوسنے والے رسومات کے خلاف ہو ۔ اور اتفاق سے اسے ایسا انسان مل بھی جاتا ہے ۔ اصلاحی رجحان (CORRECTIONAL ATTITUDE .) قابلِ تعریف ہے اور ہمارے خیال میں یہ مضمون ترتیب کے لحاظ سے اخیر میں رکھا جاتا جاذبیت میں اضافہ ہوتا ۔ کیونکہ ہر ہلچل کے بعد خاموشی اور سکون متوقع چیز ہے یا ہر بگاڑ کے بعد ہی تو سدھار آتا ہے ۔

بالآخر مجموعی طور پر کتاب " چوڑی کا غلام " بہت ہی شاندار کوشش ہے جس کے لئے نہ صرف فن کار بلکہ پبلیشرز بھی قابلِ صد ستائش ہیں ۔ اُمید ہی نہیں بلکہ دُعا ہے کہ یہ نسخۂ پرویزی اپنا اثر نادر شاہ اور تانا شاہ کے پیروؤں کی رگ و پے میں سرایت کر اکے جہیز اور گھوڑا جوڑا جیسی دلسوز علت کا خاتمہ کر دے تاکہ بے چارے غریب باپوں کے لئے ـــــ BLESSINGS IN DISGIUSE ثابت ہو ۔ آمین ۔

پرویز یداللہ مہدی قسط وار ناول

چہ خوب ہے ۲

شبّو نے ہماری سوالیہ نظروں کے جواب میں بے ہوش چھابو خاں ولد بابو خاں کے بھوت والے شوشے کی تشریح فرمائی — چھابو چاچا کا دل ویسے ہی بڑا کمزور ہے۔ بے خیالی میں خود اپنے ہی سایہ سے ڈر کر کانپ اٹھتے ہیں۔ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے حسب معمول اپنے کمرے کے باہر چبوترے پر بستر بچھا کر لیٹے ہی تھے کہ بقول ان کے ان کے پیچھے والے ویران بنگلے کی چھت پر انھیں کوئی سایہ نظر آیا جسے بھوت سمجھ کر یہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے — شبّو کی اس اطلاع پر ہم نے ایک اور سوال داغ دیا۔ "موصوف غالباً اپنے بستر میں بے ہوش ہوئے ہوں گے لیکن یہاں تک پہنچے کس طرح —" اس بار جواب میں بجائے شبّو کے خانساماں نے دست بستہ فرمایا — "میں اسے اٹھا کر اندر لے آیا سرکار۔" خانساماں کا لہجہ اس قدر فخریہ تھا جیسے چبوترے سے یہاں تک چھابو خاں کو نہیں بلکہ جادو نگری سے پریوں اور دیوؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر "گل بکاؤلی" اڑا لایا ہو۔ ہم نے خانساماں کے اس کارنامے کو نظر انداز کرتے ہوئے مابدولت بھوت کی "جنس" کے تعلق سے وضاحت طلب فرمائی کہ اس مرتبہ پھوپھی اماں نے اپنی موجودگی کا ثبوت فراہم کرنے کی غرض سے جواباً فرمایا۔ "کس کا بھوت ہو سکتا ہے شہزاد میاں سوائے اُس ڈائن کے، کم بخت مر کر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی —!"

پھوپھی اماں نے اگرچہ کہ صاف طور سے نام نہیں لیا تھا، لیکن جس ڈائن کی طرف اشارہ کیا تھا وہ یقیناً مرحومہ ہی تھیں! اس اطلاع نے گھڑی بھر کے لئے ہمارے اوسان قطع کر دیئے۔ ہم نے سوچا صرف سنی سنائی پر ہمارے اوسان کی ایسی خاصی گت بن گئی تو بے چارے چھابو خاں کا جنھوں نے بہ نفس نفیس اپنی آنکھوں سے بھوت کے درشن کئے تھے پتہ نہیں کیا کچھ حشر ہو گیا ہوگا۔ ہم نے مترحم آمیز نظروں سے بے ہوش چھابو خاں کی طرف دیکھا جو اب آہستہ آہستہ کسمسا رہے تھے۔ اگرچہ کہ پھوپھی اماں نے بھوت کی جنس کے تعلق سے تعین فرما دیا تھا لیکن موصوفہ کے اس فیصلے کے پیچھے کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی بلکہ وہ محض بغض اور نفرت کارفرما تھی جو عموماً نند اور بھاوج کے رشتے کا بنیادی خاصہ ہوتی ہے۔ بھوت کی جنس اور اس

کے حسب نسب اور شجرے پر صرف چھابو خاں ہی روشنی ڈال سکتے تھے اور اس کے لئے موصوف کے تاریک میں ڈوبے ہوئے بے ہوش ذہن میں ہوش کی 'پو' پھٹنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس 'پو' کے پھٹنے کے انتظار میں دیگر شرکائے محفل کے ساتھ ہم بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھابو خاں کی طرف دیکھنے لگے جو کی کسمساہٹیں "عالم بے ہوشی" سے "عالم ہوش" کی طرف موصوف کی 'مراجعت' کا مژدہ تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے موصوف نے دو چار نحیف و نزار قسم کی انگڑائیاں لیں اور پھر "پٹ" سے آنکھیں کھول دیں۔ اس مرتبہ اپنے آس پاس دم سادھے کھڑے ہوئے 'معتقدین' کو سرفراز فرمانے کے بجائے چھت کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے یوں دیکھنے لگے جیسے کوئی عاشق سڑک چھاپ کھڑکیوں۔ ننگی تھرکتی قیامتوں کی طرف بوالہوس نظروں سے تاکتا ہے۔ اس نظر بازی کے دوران تمام "معتقد" ایسی ملتجیانہ نظروں سے موصوف کی طرف دیکھتے رہے جیسے موصوف چھابو خاں ایک معمولی ملازم نہیں بلکہ کوئی پہنچے ہوئے بلند مرتبت پیر فقیر ہوں جو ہفت اقلیم کی خبر لانے کے لئے ابھی ابھی مراقبے میں گئے موصوف کا ہفت اقلیم چونکہ زیادہ بلند و بالا نہیں تھا اس لئے ہمیں قوی امید تھی کہ قبلہ کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تاہم جب تک موصوف کی واپسی نہیں ہو جاتی ہمیں اپنے "تجسس کے الاؤ" کو آس اور امید کی آنچ سے گرم رکھنا تھا۔ اور غالباً اطراف میں موجود سبھی افراد کا یہی حال تھا یعنی تماشائی خود تماشا کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ ہر فرد قبلہ چھابو خاں کی ایک ایک حرکت کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہا تھا۔ موصوف کے چہرے پر اگر پل بھر کے لئے بھی ہوش کے آثار نظر آتے تو دیکھنے والوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی اور اگر موصوف دوبارہ ہوش گنوانے نظر آتے تو مشتاقوں کے دلوں میں مایوسی کا کہرا چھا جاتا۔ اس وقت ہم جن 'اذیت ناک' لمحوں سے گزر رہے تھے اگر ایسی گھڑیاں کسی جدید شاعر کو میسر آ جائیں تو تخیل میں اگنے والی گھاس پھوس' شاعری کے گھنے جنگلوں میں تبدیل ہو جائے ——— خدا خدا کر کے یہ اذیت ناک گھڑیاں بیتیں ' موصوف میں دوبارہ زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ لاشعور میں لیٹے ہوئے بھوت صاحب یا ما تخیل کی ڈور سے کسی 'پتنگ' کی طرح باندھ کر کچھ دیر تک چھت کی وسعتوں میں 'ہلانے' کے بعد مسمی چھابو خاں نے اپنے اطراف دست بستہ کھڑے ہوئے 'مرجوع' کی طرف توجہ فرمائی۔ ہر فرد کو بلدی باری کچھ اس طرح گھورنے لگے جیسے اپنے لاشعور میں قیام پذیر بھوت چہلنے سے مماثلت کے ہلکے سے آثار بھی کسی میں نظر آ جائیں تو پھر سے بے ہوشی کی ایک نئی قسط کا آغاز فرمانے میں موصوف کو سہولت ہو گی۔ خدا کا شکر کہ اس بار موصوف کو کسی کے بھی سر پر سینگ نظر نہیں آئے۔ البتہ اپنے اطراف و اکناف کے جائزے کے نتیجے میں ان کی زبان سے یہ تحیّر آمیز کلمہ ضرور نکلا ——— "میں یہاں کیسے پہنچا سرکار؟" جواب میں مشتو نے موصوف کی حیرت رفع کرنے کی غرض سے فرمایا ——— "تم بے ہوش ہو گئے تھے' تمہیں اٹھا کر یہاں لایا گیا" اس اطلاع پر موصوف کو شاید اچانک اپنی بے ہوشی کی 'وجہ تسمیہ' کا خیال آ گیا چنانچہ رقت آمیز لہجہ میں خود

بجوز دشمنوں ہو گئے ـــــ " کیا بتاؤں سرکار ـــــ میری شامت پکاری تھی جو اس بھوت بنگلے کی طرف خود بجوز میری نظر اٹھ گئی، چپاک سے ایسی روشنی ہوئی سرکار جیسے آتش بازی کی طغیانی اُمڈ آئی ہو، ایسی چکاچوند روشنی کہ زمین پر گری ہوئی سوئی نظر آجائے، کیا دیکھتا ہوں کہ اجالے کی اس طغیانی میں وہی چمک چھلاتا لباس پہنے جو آخری وقت پہنا تھا، وہی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے ہوئے وہ وہ .... وہ کھڑی ہے، وہی ناک نقشہ، وہی پیشانی، وہی بال، ہو بہو سرکار ـــــ" اتنا کہہ کر موصوف اس طرح کانپنے اور کپکپانے لگے جیسے یخ لبستہ ہوا کا کوئی کیلا جھونکا انھیں ڈس گیا ہو، موصوف کی اس کپکپاہٹ پر قبلہ چہ خوب جو اب تک خاموش تماشائی کی حیثیت سے کھڑے تھے، غرّا کر بولے ـــــ "پہیلیوں میں باتیں مت کرو صاف صاف بتاؤ کہ وہ چہ خوب تھی کون ـــ ؟

"اب اور کتنا صاف صاف کہے گا بے چارہ ـ" پھوپھی اماں نے چڑ کر مداخلت کی۔ "اُس کم بخت کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

"تم لوگ اپنے اپنے قیافے اپنے اپنے چہ خوب اپنے پاس رکھو۔" قبلہ چہ خوب بدستور غرّا کر بولے اور پھر چھابو خاں کی طرف متوجہ ہوئے "تم اچھی طرح یاد کر کے کہیں کہ وہ ـ وہی تھی۔"

"یاد کرنا کیا معنی سرکار وہ تو ابھی تک میری آنکھوں کے روبرو ہے۔ میری نظر اتنی کمزور نہیں کہ چھوٹی بیگم صاحبہ کو نہیں پہچان سکتیں ـ" چھابو خاں نے گویا پھوپھی اماں کے اندیشے کی بھرپور تائید کر دی۔ پھر کیا تھا۔ قبلہ چہ خوب کے غصّے کے تابوت میں یہ خبر آخری کیل ثابت ہوئی۔ اس بار ان کے لہجے کی غرّاہٹ میں وہ گھن گرج بھی شامل ہو گئی جو ان کی بھاری بھرکم شخصیت کا خاصہ تھی۔ لیکن جب سے مرحومہ گھر میں تھی مسز چہ خوب کی آمد ہوئی تھی ـ موصوف کی گھن گرج گویا رفت ہو گئی تھی۔ اور اب چونکہ آمد و رفت کا پانسہ الٹ گیا تھا۔ یعنی مسز چہ خوب ہمیشہ کے لئے 'رفت' ہو چکی تھیں اس لئے موصوف کی 'گھن گرج' کی دوبارہ آمد یقینی تھی ـ چنانچہ گرجدار لہجے میں بولے: "اس منحوس کے زندہ وجود کو تو میں کوئی چہ خوب نہیں پہنا سکا لیکن اس کے بھوت کا خاتمہ شاید میری ہی چہ خوب میں لکھا ہے ـ" اتنا کہہ کر موصوف تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ پھوپھی اماں بھی ہانپتی کانپتی انھیں آوازیں دیتی ہوئیں ان کے پیچھے دوڑیں۔ اور ان دونوں بھاری بھرکم "جثّوں" کی یہ تیز گامی ہمیں یوں لگی جیسے میدانِ جنگ میں فریقین کے دو عدد دبابے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہوں ـ ان دونوں کے 'سین' سے غائب ہوتے ہی چھابو خاں نے دوبارہ اپنا زبانی 'فرمہ' کاتنا شروع کیا۔ "حیدرآباد کی طغیانی میں ہزاروں لوگ مرے تھے سرکار" لیکن کوئی بھوت نہیں بنا۔ اور چھوٹی بیگم صاحبہ مرتے ہی بھوت بن گئیں ـــــ چل تو جلالی تو آئی بلا کو ٹال تو ـــــ" موصوف پر پھر کپکپاہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ اس بیچ قبلہ چہ خوب دوبارہ نمودار ہوئے ـ ہاتھ میں بندوق تھامے ہوئے۔

جو یقیناً انہی کی طرح 'بھری' ہوئی تھی۔ اپنے والد بزرگوار کے ہاتھ میں بندوق دیکھتے ہی شبّو نے فوراً موقع کی نزاکت کا انداز لگالیا اور دوڑ کر موصوف تک پہونچ گئیں لیکن اس سے پہلے کہ بندوق پر جھپٹا ماریں موصوف کی گھن گرج دوبارہ شروع ہوگئی۔ آج مجھے اپنے چیہ خوب سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا ــــ اگر وہ واقعی اس منحوس کا بھوت ہے تو اُسے میرے ہاتھوں مرنا ہوگا ــــ" اس "گرج چمک" کے ساتھ کسی دھواں دھار تیز رفتار بادل کی طرح موصوف نے غالباً "چھت کا رُخ کیا کیوں کہ ویران بھوت بنگلہ کی چھت اور موصوف کی حویلی کی چھت ایک ہی سطح پر واقع ہوئی تھی۔ قبلہ چیہ خوب جس خطرناک ارادے کے ساتھ چھت کی طرف قدم بڑھائے تھے اُسی نے ہمیں بھی اس قدر لرزا دیا کہ دیگر افراد کے ساتھ ہم بھی ان کے پیچھے چھت کی طرف دوڑے ــــ

ہم جس وقت چھت پر پہونچے، قبلہ بندوق تانے سامنے والے بھوت بنگلہ کی اندھیری چھت کی طرف یوں دیدے گاڑے دم سادھے کھڑے تھے جیسے اگر غلطی سے سانس لینے لگیں تو اس کی آہٹ پاکر روپوش بھوت وہاں سے بھاگ جائے گا ــــ 'میر شکاری' گویا اب "بھوت شکاری" بننے کی کوشش کر رہا تھا ــــ اچانک سامنے والی چھت سے ایسی آواز آنی شروع ہوئیں جیسے کئی خونخوار بلیاں ایک ساتھ لڑ رہی ہوں اور ادھر مارے ہیبت کے ہم سب ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے یہاں تک کہ گھڑی بھر کو قبلہ چیہ خوب کے ہاتھ بھی کانپ کر رہ گئے۔ پھر اچانک آوازیں آنی بند ہوگئیں اور ایسی خاموشی چھا جیسے اطراف کے سارے ماحول پر قبرستان کا پُرہول سناٹا مسلط ہوگیا ہو لیکن یہ کیفیت کچھ ہی دیر رہی پھر سناٹے کے سینے کو چیرتی ہوئی ایک نہایت ہی بھیانک آواز اُبھری۔ کتّے کے رونے کی آواز اور پھر ابھی اس دلخراش آواز کی لے مدھم بھی نہیں پڑی تھی کہ سامنے والی ویران چھت کا ایک گوشہ روشنی میں نہا گیا اس قدر تیز روشنی کہ ہم سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ روشنی کے اس آبشار نے راست ہماری بینائی پر وار کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُجالے کی اسی یلغار کے باوجود ہم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا ــــ اندھیرے اور اُجالے کی اس عجیب و غریب آمیزش کے دوران سامنے والی چھ کی روشنی گوشے میں اچانک ایک ہیولیٰ پتہ نہیں کدھر سے نمودار ہوا جس کے چہرے کے خط و خال تو خیر اس قدر واضح نہیں لیکن قربت، جسامت، جسم کے نشیب و فراز اور لباس کی وضع قطع سے اس ہیولے پر مرحومہ مسز چیہ خوب کا گمان ہوتا تھا یہ گمان اس وقت یقین میں بدل گیا جب اچانک اس ہیولے نے قہقہہ لگایا ــــ وہی ناآسودہ، پیاسا سا قہقہہ اور اس قدر بانگ کہ اس کی دھمک نہ صرف انسانی وجود میں گونج کر رہ گئی بلکہ در و دیوار تک اس گونج سے لرزتے ہوئے محسوس ہو ــــ لیکن اس ہیبت ناک قہقہے کے باوجود قبلہ چیہ خوب نے کسی نہ کسی طرح اپنے ہوش و حواس کو اس حد تک قائم رکھا کہ اندھا دھند نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا ــــ دھائیں کی آواز کے ساتھ، ایک دھماکا ہوا پھر ایک ایسا چھناکا جیسے کسی کانچ کی دیوار کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے ہوں ــــ پھر اچانک ایسی پُر اسرار خاموشی چھا گئی جیسے صدیوں سے خاموشی کا راج رہا ہو ــــ ایسے پُراسرار آسیبی حالات میں قبلہ چیہ خوب کا یہ دلیرانہ اقدام ہمارے لئے باعث حیرت تو تھا لیکن غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ اس دلیری کے پیچھے دراصل بے بسی، مجبوری اور لاچاری کا وہ طوفان کار فرما تھا جو مرحومہ مسز چیہ خوب کی زندگی میں اپنی تمام تر خواہش کے باوجود قبلہ چیہ خوب کے سینے میں گھٹتا رہا لیکن راہ نہیں پا سکا تھا مرو

زندگی میں جو خواہش پوری نہ ہوسکی تھی وہ بعد از مرگ اسی طرح پوری ہوئی کہ موصوف کے سوائے چھت پر موجود تمام افراد کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے لیکن موصوف بدستور بندوق تانے سامنے گھپ اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ایک بار گولی داغی ہے دوسری بار داغنے کی ہوس ہو ـــــ شبّو کے معطل ہوش وحواس نے جیسے ہی دوبارہ ڈیوٹی جوائن کی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آگے بڑھ کر قبلہ چِہ خوب کی بندوق سے اس طرح گتھ گئیں کہ موصوف کو اپنی بندوق جھکانی ہی پڑی اس کامیاب اقدام کے بعد شبّو نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے والد بزرگوار کو اس مشورے سے بھی نوازا دیا " ابّو ذرا سمجھ سے کام لیجئے ۔ یہ بھوتوں کا چکّر ہے " ہوا سے لڑنے سے کیا فائدہ' چلئے نیچے چلیں " " میں نہیں مانتا کسی بھوت ووت کو' یہ سب بزدلوں کے گڑھے ہوئے چِہ خوب ہیں " موصوف بدستور غرّا کر بولے تاہم اس مرتبہ موصوف کی غراہٹ کسی قدر دبی دبی سی تھی ۔ غالباً موصوف کو کسی قدر نرم ہوتا دیکھ کر ہی شبّو نے مزید جیرت کا مظاہرہ کیا اور آگے بولیں " لیکن ابھی اس طرح اندھیرے میں تیر اندازی کرنا بھی تو حماقت ہے ، چلئے نیچے چل کر اطمینان سے اس ناگہانی آفت کے سدباب کا کوئی حل ڈھونڈیں گے ۔ شبّو کے اس مخلصانہ مشورہ پر قبلہ چِہ خوب نے ہماری طرف رائے طلب نظروں سے دیکھا اور ہم گویا جس دن سے یہاں وارد ہوئے تھے بغیر فیس کے رائے مشورے دے کر اپنی گردن کلّی طور پر پھنسا چکے تھے چنانچہ پھر ایک بار مشیر کے فرائض انجام دیتے ہوئے موجودہ صورتحال دیکھتے ہوئے شبّو کا مشورہ ہر لحاظ سے قابلِ قبول ہے اب یہاں مزید ٹھہرنا تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں ' نیچے چل کر کم از کم یکسوئی کے ساتھ اس گتھی کو سلجھایا جاسکتا ہے " ہم نے گویا حرف بہ حرف شبّو کی تائید کردی ۔ قبلہ چِہ خوب نے طوعاً و کرہاً نیچے کا رُخ کیا وہ کسی ہارے ہوئے کمانڈر کی طرح آگے آگے تھے اور دیگر افراد کسی پسپا فوج کی طرح مرے مرے قدموں سے اُن کے پیچھے دست بستہ چل رہے تھے نیچے ہال تک پہنچتے پہنچتے موصوف کے سر میں ایک نیا ہی سودا سمایا فرمایا ـــ" یہ سارا چِہ خوب مجھے بھان متی کا کھیل معلوم ہوتا ہے ابھی سارا بھانڈہ پھوٹ سکتا ہے اگر تھوڑی سی ہمت کرکے اس بھوت بنگلے کا اندر سے اچھی طرح چِہ خوباً کیا جائے ـــــ !" موصوف کی یہ تجویز دیگر افراد کے لئے دھماکے سے کم نہ تھی ۔ اس رات گئے اس بھوت بنگلے کے اندر جانا " آ بھوت مجھے مار " کے مصداق ہوتا جبکہ ابھی کچھ دیر پہلے 'چھت پر سے صرف دُور کا " نظارہ " بلکہ صرف نظارے کا " ٹریلر " ہی دیکھ کر تقریباً سبھی کی دور کی بلکہ نزدیک کی نظر بھی کم وبیش اس شاعرانہ کیفیت سے دوچار تھی کہ

میں بھوتوں کا رقص شرر دیکھتی ہوں ـــ جہاں دیکھتی ہوں جدھر دیکھتی ہوں

جب دور کے نظارے نے نظروں کے ساتھ ایسا " بالجبر " قسم کا سلوک کیا ہو تو پھر " نزدیک سے جائزہ " لینے کے بجائے لوگ یقیناً آپسی آنکھیں کسی قریبی ہسپتال میں بطور عطیہ دینے کو ترجیح دیں گے چنانچہ قبلہ چِہ خوب کی اس خطرناک تجویز پر کسی نے کان نہیں دھرا اور تنہا وہاں جانا خود موصوف کی ہمّت مردانہ و جوشِ دیوانہ کے بس سے باہر کی بات تھی جان بوجھ کر آسیبی بلاؤں کے دسترخوان کی زینت بننا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ دیگر افراد کی طرف سے مایوس ہو کر موصوف نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہماری دلیری و مردانگی کو للکارا کہ اگر مرد بچے ہو تو اس مرحلۂ شوق کو طے کرنے میں میرا ساتھ دو ـــــ موصوف کی ان للکارتی نظروں کے جواب میں ہم نے اپنی خفت اور بزدلی کو چھپانے کی غرض سے

نظریں چرائیں۔ اگر مرحلۂ شوق کی منزل" بھوت بنگلہ" نہ ہوتی تو ہم یقیناً موصوف کا ساتھ دیتے۔ کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملاکر' لیکن مرحلۂ شوق' دراصل "مرحلۂ بھوت" تھا جسے طے کرنے کی کوشش میں خود اپنے قبر کی تہوں میں پہنچ جانے کا خطرہ تھا اس لئے ہم نے قبلہ چہ خوب کی للکارتی ہوئی نظروں کے جواب میں بدستور نظریں چراتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے ساتھ قبلہ چہ خوب کے لئے بھی یہ دعا مانگی کہ اللہ کرے "مرحلۂ شوق" نہ ہو طے! کچھ تو ہماری دعا کا اثر تھا اور کچھ چھابو خاں کی "ادا" کا جو یہ 'مرحلہ شوق' کم از کم رات بھر کے لئے ٹل گیا۔ چھابو خاں نے کسی نئی ادا کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ اُدھر سے لاکھ تکلم' اِدھر سے صرف خموشی کے مصداق بھوت مہاشئے سے شرف ملاقات حاصل کرنے کی قبلہ چہ خوب کی تجویز کی بھنک کے کانوں میں پڑتے ہی موصوف ایک بار پھر 'انٹا غفیل' ہو گئے ___

موصوف کی اس تازہ "بے ہوشی" نے قبلہ چہ خوب کے ولولوں پر پانی پھیر دیا چنانچہ وہ منہ پھلائے منہ پھیر کر معہ اپنی بندوق کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ پھوپی اماں دیگر ملازمین کی مدد سے بے ہوش چھابو خاں کو دوبارہ ہوش میں لانے کی تدابیر میں مصروف ہو گئیں۔ ہم کلب سے واپسی کے بعد سے اکیلے میں شبّو سے اس کارگزاری کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو بے چین تھے جو ___ ہم نے پھوپھی اماں کے تعلق سے انہیں سونپی تھی۔ واپسی کے بعد سے چھابو خاں کی بے ہوشی کے شاخسانے پھر "بھٹکتی روح" کے دخل در نامعقولات نے سب کو اس طرح اُلجھائے رکھا کہ تنہائی کے لمحات ہمیں میسر نہیں آئے۔ اب جبکہ ایک موقع ذرا سا ہاتھ لگا تھا ہم بھلا اس سے "جزیہ" وصول کئے بغیر جانے دیتے۔ آنکھ کے اشارے سے شبّو کو وہاں سے ہٹنے کے لئے کہا اور پھر خود ملاقاتیوں کے کمرے کی طرف بڑھ چلا گئے ___!

ساری رات تقریباً آنکھوں آنکھوں میں کٹی یعنی کہ ہر ایک کی رات خود اس کی اپنی آنکھوں میں کٹی' اس وضاحت کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ تقریباً تمام رات ہم نے شبّو کے ساتھ ضرور گزاری تھی۔ اور آنکھوں آنکھوں میں کاٹی تھی لیکن ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں بتائی تھی بلکہ مرحومہ کی "بھٹکتی روح" کے اس اچانک نزول پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے رات کی سحر کی تھی البتہ پچھلی شام پھوپھی اماں کے تعلق سے جو خفیہ معلومات ہم نے شبّو کو حاصل کرنے کی ہدایت کی تھی اس کے بارے میں شبّو نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ خود انہی کی زبانی سنیئے ___ " کافی رازداری اور ہشیاری سے پھوپھی اماں کو ٹٹولنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مالاّ (یعنی بلّی) طبعی موت مری تھی یا اُسے زہر دیا گیا تھا اس کا پھوپھی اماں کو قطعی علم نہیں ہے ___" شبّو کے اخذ کردہ اس نتیجے سے ہم شاید صد فیصد متفق نہیں ہوتے اگر رات میں مرحومہ مس چہ خوب کی "بھٹکتی روح" دیگر افراد کے ساتھ ہمیں بھی اپنے دیدار سے مشرف نہ فرماتی ___ اب تو اس کھیل کا سارا تانا بانا ہی اُلٹ گیا تھا گتھی سلجھتے سلجھتے اچانک اُلجھ گئی تھی بلکہ موجودہ صورتحال میں تو خاصی "پیچیدہ" ہو گئی تھی۔ اور اب اس 'پیچیدہ گتھی' کے "پیچ" اسی صورت میں کھل سکتے تھے جب پڑوس کے ویران 'بھوت بنگلے' کا ایک ایک 'پیچ و خم' نہ ٹٹولا جائے لیکن اس کے ساتھ یہ خدشہ بدستور لاحق تھا کہ اس طرۂ پیچ و خم کا خم نکلنے تک کہیں ہمارا دم نہ نکل جائے کیونکہ ان آسیبی بلاؤں کی دسترس سے کافی دور ہونے پر بھی شبّو و دیگر افراد کی موجودگی کے باوجود رات بھر ہمارا یہ حال رہا کہ ذرا سی آہٹ پہ اتنی مرتبہ چونکنے کی سعادت حاصل ہوئی کہ کسی کے اس مصرع کی صداقت پہ ایمان لانا ہی پڑا کہ ؎

ع پتہ بھی کھڑکتا ہے تو لگتا ہے کہ تم ہو

(باقی باقی)

خرافات (مراسلے)

★ مکرمی سید صاحب!

"ابراہیم جلیس نمبر کی ترتیب اور اس کے لئے مضامین کی فراہمی میں آپ نے جس کدو کاوش سے کام لیا وہ واقعی قابل ستائش ہے۔ یوں تو ہر شمارہ ہی دلچسپ و دیدہ زیب ہوتا ہے لیکن خاص نمبر تو "خاص" نمبر ہی ہوتے ہیں۔

اعجاز وارثی سنبھلی

★ شگوفہ کا مطالعہ برابر کرتا ہوں اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ یہ دن بدن ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ خدا سے اس کی مزید کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔ اس سنگین اور بحرانی دور میں تھکے ہارے ذہنوں کی آسودگی کے لئے اس قسم کے رسائل کی سخت ضرورت ہے۔ آپ نہ صرف زبان و ادب بلکہ عوام کی بھی زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں۔

شان، پٹنہ

★ شگوفہ جولائی ۷۸ء اپنی روایتی شگفتگیوں اور شادابیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ مال مسروقہ انتہائی معیاری ہے (ویسے بھی ہماری فطرت میں شامل ہے کہ کسی امپورٹڈ چیز پر ہم دیوانہ وار گرتے اور پروانہ وار فدا ہوتے ہیں۔ مال چاہے دیسی ہو بس اس پر لیبل میڈ ان فارین لگا دیجئے اور پھر دیکھئے فریفتگی بھائی لوگوں کی) ویسے انتخاب رکھئے یہ بات" میں آپ کے امپورٹڈ مال کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ سہیل عظیم آبادی کا نام نامی ہی ان کے مضمون کے معیاری ہونے کی ضمانت ہے۔ یہ سہیل صاحب کی آپ بیتی ہے اس لئے کہانی کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ایک تو موضوع دلچسپ اور پھر سہیل صاحب کا پُر بہار انداز تحریر بس مزہ آ گیا۔

اب زندہ دلان حیدرآباد یہ تحریک چلانی چاہیئے کہ بھارت کی کوئی بھی غیر معروف یونیورسٹی بھارت چند کھنہ کو "ناک" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض فرما دے (اور اس کے لئے تمام مروجہ اور غیر مروجہ ہتھکنڈے استعمال میں لانا چاہیئے) ناک والی پڑھ کر لگتا ہے گویا کھنہ صاحب نے اس رنگا رنگ موضوعات سے بھری کائنات میں سوائے "ناک" کے کسی چیز پر آج تک غور ہی نہیں کیا۔ ناک گویا ان کے حواس ظاہری و باطنی پر چھائی ہوئی ہے۔ تمام کائنات انہیں قسم ہا قسم کی ناکوں کی ایک آماجگاہ نظر آتی ہے۔ سوتے جاگتے کھاتے پیتے ہمہ وقت بیچارے کھنہ صاحب کے اعصاب پر ناک سوار ہے۔ راستہ چلتے نہایت احتیاط سے اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہیں اور گھر پہنچ کر سوچتے تو راہ میں ناکوں کو ہم بچا کے چلے تو کہتے ہوئے صوفے میں دھنس جاتے ہیں۔ یقین مانئے ناک پر ایسی بھرپور، مدلل اور مستند معلومات کوئی "ناک والا" ہی ہم پہونچا سکتا ہے۔ اور اس پر لافانی سوالات (جو واقعی لافانی ہیں) نے تو دو آتشہ کا کام دیا ہے بھئی کھنہ صاحب مبارک ہو۔ خدا ہمیشہ آپ کی ناک اونچی رکھے۔ آمین

باقی انشائیوں میں ارشد علی خاں نے بڑی دور کی کوڑی لائی ہے ویسے علامت کی رفتار اور انسانی خیالات کے نشیب و فراز کے پیش نظر یہ سب بعید از امکان بھی نہیں لگتا۔ خدا نہ کرے۔

ظفر چکد یزی۔ نصیر حجالی۔ لیئق صلاح انوار انصاری اور اصغر جمیل کے مضامین بھی قابل قدر ہیں۔ منظومات تقریباً تمام معیاری۔ دلکش اور طنز و مزاح کے تقاضوں پر پوری اترتی ہیں بالخصوص ڈاکٹر سمیع۔ مونس بریلوی۔ پاگل عادل آبادی فیاض افسوس، جوہر سیوانی اور بیگار کھنہ نے بے حد متاثر کیا۔ مکثرین

محبوب راہی
بارسی ٹاکلی (اکولہ)

★ جولائی ۷۸ء کا شگوفہ اپنی تمام خوبصورتی کے ساتھ موصول ہوا۔ شکریہ۔ شمارے کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ جس تیز رفتاری سے یہ کامیابی کے راستے پر ہے۔ اللہ میاں اسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ جناب ارشد علی کا مضمون "دوڑو کہ زمانہ چال قیامت کی چل گیا" بہت اچھا ہے ویسے انوار انصاری کا مضمون "تم کو نیند" جناب انصاری اصغر جمیل کا مضمون "جو کی ہڑتال" بہت ہی پسند آیا۔ نفیس انصاری (بھوپال)

نئے دور کی دہلیز پر

ہمارے ملک سے غربت کے خاتمے کا بڑی حد تک مطلب یہ ہے کہ دیہی عوام خصوصیت کے ساتھ بے زمین مزدوروں، چھوٹے اور حاشیئی کسانوں وغیرہ کے حالات کو بہتر بنایا جائے۔ چنانچہ انھیں دی جانے والی کوئی بھی امداد ہماری معیشت کو بنیادی سطح پر مضبوط بنانے میں مدد و معاون ثابت ہوگی۔

اس وسیع تر پس منظر میں ریاستی حکومت نے ایسے چھوٹے کسانوں کو جن کے پاس ڈھائی ایکر تری اور ۵ ایکر خشکی سے زیادہ اراضی نہیں ہے۔ محصول مالگزاری کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ البتہ اس استثنیٰ میں محصول آب کی ادائی شامل نہیں ہے

اس جدید اور جرأتمندانہ اقدام کا مقصد ان چھوٹے کسانوں اور بے زمینوں کی امانت کرنا ہے جنھیں حال ہی میں سرکاری زمینات حوالے کی گئی ہیں......

آج آندھرا پردیش میں چھوٹا کسان ایک نئے دور کی دہلیز پر ہے۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

نمبر ۔۱۷۸/۷۵-۷۶

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد (۱۱) شمارہ (۱۰)

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

قیمت: فی شمارہ RS. 1/50
سالانہ: ۲۰ روپے
غیر ممالک سے: ۳۵ شلنگ

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان۔ حیدرآباد ۲۰۰۰۰۵ (اے پی)
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو عبادت خانہ حسینی، پرانی حویلی۔ حیدرآباد ۲

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ ۳۱، مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱
فون: 57716

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

حق تو یہ ہے ... (ترجمہ)

خرافات (مراسلے)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

پھوران (نظمیں)

شگوفہ کے [illegible] سال کی تکمیل پر یادگار خصوصی اشاعت

ڈرامہ نمبر

نومبر ۷۸ء میں شائع ہوگا

مرتبہ: ساگر سرحدی مشہور ڈرامہ نگار و فلم اسکرین پلے رائٹر و مکالمہ نویس

۳۰۰ سے زائد صفحات
خوبصورت رنگا رنگ ڈسٹ کور

قیمت : RS. 12/= مجلد RS. 15/=

سالانہ خریداروں کو یہ
خصوصی نمبر رجسٹرڈ ڈ یلیوری کے
ذریعہ RS. 10/= میں
ارسال کیا جائے گا

مشتہرین حضرات اور سالانہ خریداروں سے خواہش کی جاتی ہے کہ قبل از وقت اپنے آرڈر بک کرالیں۔

چند اہم ڈرامہ نگار

نکولائی گوگول (روسی)
برتولت بریخت (جرمن)
وسنت آباجی ڈھاکے (مراٹھی)
ساگر سرحدی (اردو)
رتنا کر مستکری (مراٹھی)
چیلیا داتار (مراٹھی)
ستیش آلیکر (مراٹھی)
زاہد حیدر (بنگلہ)
راجہ بندر وکرم (سنسکرت)
وارا روچی (سنسکرت)
پربودھ جوشی (گجراتی)
بلونت گارگی (پنجابی)
نتن سیٹھی (اردو)
قادر خاں (اردو)
عبدالامانت زویری (گجراتی)
گوپال (اڑیا)

ان حضرات کے علاوہ
فضل الرحمٰن، اظہر افسر
وجاہت علی سندیلوی
مجاہد حسین چندکتہ، شفیقہ فرحت
مقصود علی خاں، برق آشیانوی
[illegible]

سید ضمیر جعفری

شربت دیدار دیتے ہیں

وہ سب کو تھوڑا تھوڑا شربتِ دیدار دیتے ہیں
مگر مصروف ہیں، اتوار کے اتوار دیتے ہیں
محبت میں یہی اک مشورہ سب یار دیتے ہیں
سرِ تسلیم خم کر، ہم انہیں تلوار دیتے ہیں
ابھی وہ ساتویں درجے میں پہنچے ہیں بصد منت
گزشتہ دس برس سے فیس برخوردار دیتے ہیں
وہ کہتے ہیں کہ دنیا امن و آسائش کی جنت ہے
چلو ہم آج اُن کو آج کا اخبار دیتے ہیں
شرافت کی سند پیغام بر لایا تو کیا لایا؟
جو اچھے لوگ ہیں بیٹی کو موٹر کار دیتے ہیں
تیرے کوچے میں دیوانوں کا یہ جمگھٹ؟ تعجب ہے
کہ دیوانے تو دیوانوں کو اکثر مار دیتے ہیں
ہماری سادہ لوحی کو وہ نسبت ہے خسارے سے
کہ مُرغا جیت بھی جائیں تو شاہیں ہار دیتے ہیں
ہوئی ہے تار گھر میں جب سے اُردو کی پذیرائی
انھیں عشاق اب وہ دو غزل کے تار دیتے ہیں

مسٹر کھلا

پن کھلی، ٹائی کھلی، بکلس کھلے، کالر کھلا
کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں مسٹر کھلا
آٹھ دس کی آنکھ پھوٹی، آٹھ دس کا سر کھلا
لو خطیبِ شہر کی تقریر کا جوہر کھلا
سچ ہے مشرق اور مغرب ایک ہو سکتے نہیں
اس طرف بیوی کھلی ہے، اس طرف شوہر کھلا
اُن کا دروازہ تھا مجھ سے بھی سوا مشتاقِ دید
میں نے باہر کھولنا چاہا تو وہ اندر کھلا
طبع شاہانہ ہے میری، وضع درویشانہ ہے
آستیں میں بنگلہ پنہاں، ہاتھ میں چھپّر کھلا!

کام کی ضرورت

قوم کو کام کی ضرورت تھی   اور مجھے نام کی ضرورت تھی
تیرے کوچے میں کل رقیبوں سے   بلوۂ عام کی ضرورت تھی
میں سمجھتا تھا دوستی جس کو   وہ فقط کام کی ضرورت تھی
کون ناصح؟ مگر حضور مجھے   آج آرام کی ضرورت تھی

الیکشن کا بخار

جس کشادہ ڈیوڑھی کی چق اُٹھا کر دیکھئے
باپ ووٹر، ماں "رضاکارن" پسر اُمیدوار
گفتنی ہے، کُو بہ کُو، خدمت گزاری کی حدیث
دیدنی ہے، رُو برُو، امیدواری کا بخار
پھر رہا ہے تنگ گلیوں میں ہوس کی چاندنی
بکھر رہے ہیں خشک کوچوں پر طلب کے آبشار
چوک، چوپال و چمن میں سُونگھتے پھرتے ہیں ووٹ
کُوچہ و برزن کے اندر دوڑتی جاتی ہے کار
اُٹھ رہی ہیں اپنے اپنے من کی سُندر ممتیاں
بن رہے ہیں اپنے اپنے خواب کے نقش و نگار
یہ اچانک سی مروّت، دفعتاً سی دوستی؟
سب ضرورت کے تماشے، سب غرض کے اشتہار

کھلتا نہیں یہ بھید کہ بزمِ سخن میں لوگ
طبلے کے ساتھ ہیں کہ سخنور کے ساتھ ہیں
اُن سے تعلقات پہ اِترا رہا ہوں میں
جن کے تعلقات کہ جہاں بھر کے ساتھ ہیں

شوہر ہوگیا

نعرہ زندہ باد کا سر ہوگیا
کام اپنا بندہ پرور ہوگیا
اک ذرا افسر نے مونچھیں چھوڑ دیں
محکمہ سارا مچھندر ہوگیا
اس کی اُردو میں تھی انگریزی بہت
لوگ یہ سمجھے کہ افسر ہوگیا
مُفلسی میں جس کی داڑھی بڑھ گئی
زینتِ محراب و منبر ہوگیا
میرے شعرِ تر پہ ہنس لینے کے بعد
دیدۂ اہلِ نظر تر ہوگیا
جانِ محفل تھا خدا بخشے، ضمیر
اب تو اِک مدّت سے شوہر ہوگیا

ویرانی نہیں جاتی

نظر کی عیب جوئی دل کی ویرانی نہیں جاتی
یہ دو صدیوں کی عادت ہے بہ آسانی نہیں جاتی
مسلمانوں کے سر پہ خواہ ٹوپی ہو نہ ہو لیکن
مسلمانوں کے سر سے بُوئے سلطانی نہیں جاتی
"خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ پیدا ہوگئے ہیں اور حیرانی نہیں جاتی
جہاں تک کثرتِ اولاد نے پہنچا دیا اس کو
وہاں تک بندہ پرور نسلِ انسانی نہیں جاتی

پیدا کرو

شوق سے لختِ جگر ، نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو
ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ پھولوں کی بجائے
توپ کے دھڑ ، بم کے سر ، راکٹ کے پر پیدا کرو
شیخ ، ناصح ، محتسب ، مُلّا کہو کس کی سنیں؟
یارو کوئی ایک مردِ معتبر پیدا کرو
میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو
جلد تر ، آسان تر اور مختصر پیدا کرو
میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یوروپ کا "پلان"
اہلِ یوروپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو
تیرے شعرِ تر کو یہ اولادِ آدم کیا کرے
نے نوازی ہو چکی اب نیشکر پیدا کرو

"مجھے دعوت پہ بلوایا گیا ہوں
پلیٹیں جھے کے بہلایا گیا ہوں
ضیافت کے بہانے درحقیقت
مشقت کے لئے لایا گیا ہوں

سلہ PLAN

بندر روڈ

اک سے اک تاجر بڑا دعنوان بندر روڈ پر
اک سے اک شاعر عظیم الشان بندر روڈ پر
ہلکی ہلکی ساڑھیاں اور بھاری بھاری داڑھیاں
کفر بندر روڈ پر ایمان بندر روڈ پر
صدر بھی جولا نگاہِ عشق و مستی ہے، مگر
عشق و مستی کا بڑا گھمسان ، بندر روڈ پر
خود الٹ دیتے ہیں اپنے دستِ نازک سے نقاب
چاند سے چہرے ، سرِ میدان ، بندر روڈ پر
واقعہ اک اک جلیل القدر بندر روڈ کا
حادثہ اک اک عظیم الشان ، بندر روڈ پر
زلفِ بنگال و رخِ پنجاب و ریشِ مردِ حُر
مختلف عنوان ہیں یک جان ، بندر روڈ پر
اُجلے ایوانوں میں کالی ڈسنے والی ہنڈیاں
کھا گیا انسان کو انسان ، بندر روڈ پر
زندگی اک دوڑ ، سرپٹ دوڑ ، مرنے کی طرف
آدمی حیران و سرگردان ، بندر روڈ پر
سیٹھ جی! اپنے جگر دکھے سے کبھی تو جھانکئے
سیٹھ جی وہ دیکھئے انسان ، بندر روڈ پر
چھوڑ کر لاہور کی گلیوں کو آخر آ بسے
سالکؔ و حسرتؔ سے نکتہ دان ، بندر روڈ پر

سلہ [illegible] ان کے عظیم الشان [illegible]
سلہ مولانا عبد المجید سالک مرحوم سلہ مولانا [illegible]

سید ضمیر جعفری

......رونے سے ہوں

مجھ سے مت کریار کچھ گفتار، میں رونے سے ہوں
ہو نہ جائے تجھ سے بھی تکرار، میں رونے سے ہوں
ہر کسی سے کرب کا اظہار، میں رونے سے ہوں
دو کسی اخبار کو یہ تار، میں رونے سے ہوں
میرا روزہ اِک بڑا احسان ہے لوگوں کے سر
مجھ کو ڈالو موتیے کے ہار، میں رونے سے ہوں
میں نے ہر فائل کی ڈبیہ پہ یہ مصرع لکھ دیا
کام ہو سکتا نہیں سرکار، میں رونے سے ہوں
اَے مری بیوی! مرے رستے سے کچھ کترا کے چل
اَے مرے بچو! ذرا ہشیار، میں رونے سے ہوں
شام کو بہرِ زیارت آ تو سکتا ہوں ـــــ مگر
نوٹ کر لیں دوست، رشتہ دار، میں رونے سے ہوں
تو یہ کہتا ہے بہ لحنِ تر کوئی تازہ غزل
میں یہ کہتا ہوں کہ برخوردار، میں رونے سے ہوں

آرہے ہیں ہم

صابن دیارِ یار سے منگوا رہے ہیں ہم
لو اب لباسِ فقر کو دھلوا رہے ہیں ہم
میں نے کہا تھا اک خمِ کاکل تو بھیج دو
بولے کہ لو تمام چلے آرہے ہیں ہم
اندازِ ربط و ضبطِ محبت تو دیکھئے
وہ جھوٹ بولتے ہیں قسم کھا رہے ہیں ہم
مانگی ہوئی ہنسی بھی بڑی پوچ چیز تھی
ہنسنے پہ یہ گماں تھا کہ شرما رہے ہیں ہم
واعظ کے ساتھ ہی سرِ منبر لٹک گئے
کیا نعمتیں حیات کی ٹھکرا رہے ہیں ہم
یہ اپنے اپنے عجز و مقدر کی بات ہے
بوتے نہیں اناج مگر کھا رہے ہیں ہم

کام آتا نہیں

ام اگر دیکھو تو کس شجرے میں نام آتا نہیں
ام اگر پوچھو تو کوئی خاص کام آتا نہیں
ن پہ باتیں، ملاقاتوں میں حائل ہو گئیں
سلام آتا ہے وہ ماہِ تمام آتا نہیں
رہ سہا ہوں علم جس میں وہ زباں میری نہیں
رہا ہوں عشق جس سے اس کا نام آتا نہیں

اپنی روٹی خود پکا مسٹر کہ اب بیوی کے ساتھ
حُسن آجاتا ہے حُسنِ انتظام آتا نہیں
بحث ہم دونوں میں جب ہو گی تو جھگڑا کیوں نہ ہو
مجھ کو علم اور آپ کو علمِ کلام آتا نہیں
حُسن جب یکسر نمائش ہو تو اس کو دیکھ کر
جتنا پیار آتا ہے اُتنا احترام آتا نہیں

کچھ ہُنر، کچھ جستجو، کچھ سعی اَے نورِ نظر
صرف اک پتلون کس لینے سے کام آتا نہیں
بھائی مولا بخش کس کس سلسلے کو دوٹ دے
بھائی مولا بخش کو اپنا بھی نام آتا نہیں
میکدے سے بس اب اتنا ہی تعلق ہے ضمیر
مے کی خوشبو مجھ تک آجاتی ہے، جام آتا نہیں

بشیر انور
حیدر آباد

جائیں تو جائیں کہاں

اگر چنو میاں 'فارن' نہ سدھارتے تو ہم اپنے آپ کو اتنے حقیر محسوس نہیں کرتے۔ 'فارن' جانا چنو میاں کا تکیہ کلام تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ 'فارن' جاتے رہتے۔ لفظ 'فارن' کے معنی ممکن ہے اُنھوں نے کسی سے پوچھ بھی لئے ہوں لیکن اس لفظ کی SPELLING یعنی ہجے وہ ہرگز ہرگز نہیں جانتے تھے اس کے باوجود ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ واقعی فارن چلے گئے۔

یوں تو اپنے پیارے وطن سے چل چلاؤ کا سلسلہ زمانے سے جاری ہے۔ گھر، خاندان اور محلے کے کتنے ہی نوجوان ماحول سے بیزار بے روزگار، کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ بندوبست کر کے کہیں نہ کہیں چلے جا رہے ہیں۔ سرد ممالک کے لوگوں نے سرد مہری برتی وہ پٹرول اگلنے والے گرم گرم ملکوں کی آغوش میں چلے گئے۔ لڑکے روزگار کی تلاش میں تو لڑکیاں نکاح کے دو بول پڑھوا کر۔ اپنے یہاں تو لڑکے نوکری کا اور لڑکیاں شادی کا انتظار کرتے کرتے بوڑھے ہو جاتے تھے۔ پڑوسی ملک میں پٹرول کیا نکل آیا کہ ساری قدریں ہی بدل گئیں۔ اب لڑکیاں دلہا کے انتظار میں بوڑھی نہیں ہوتیں بلکہ اپنے بوڑھے دلہا کا انتظار کرتی ہیں۔ بال بچے تو کسی صورت ہو ہی جاتے ہیں۔ البتہ ہوائی جہاز میں اڑنے اور سونے میں لدے رہنے کا چانس دوبارہ نہیں آتا۔ ہوٹلوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں گپ شپ میں وقت ضائع کرنے والے بے کار نوجوانوں نے جھٹ پٹ کوئی فن سیکھ لیا، پاسپورٹ نکلوایا، دینا کے پاپڑ بیلے، رشتہ داروں کے ہاں دعوتیں اڑائیں، ہوائی جہاز کا ٹکٹ کٹوایا اور یہ جا وہ جا۔

چنو میاں کا معاملہ اور بھی عجیب تھا۔ وہ کسی زمرے میں نہیں آتے تھے نہ نوجوان تھے، نہ پڑھے لکھے اور نہ کوئی فن جانتے تھے۔ البتہ بے کار ضرور تھے۔ اس بے کاری میں ان کا اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ گزر بسر کرنا معجزے سے کم نہیں تھا جبکہ یہاں کا پڑھا لکھا پانچ سو روپے کی تنخواہ سے بھی بیوی اور دو بچوں کی کفالت مشکل سے ہی کر پاتا ہے۔ چنو میاں کے

ہم سے کوئی خاص تعلقات بھی نہیں تھے وہ صرف ہمارے پڑوسی تھے ۔ البتہ کبھی کسی ہوٹل میں وہ ہمیں دیکھ کر چائے میں ضرور شریک ہو جاتے ۔ پھر ایک دن جب ہم نے اچانک یہ خوشخبری سنی کہ چھٹو میاں "فارن" کے لئے پرواز کر چکے ہیں تو ہمیں حیرت اور مسرت کے ساتھ رشک بھی ہوا کیونکہ ہم نے ابھی تک کبھی ہوائی جہاز میں سفر نہیں کیا تھا ۔ مسرت اس بات کی ہوئی کہ بے چارے بے کاری سے نجات پاکر اب وہاں کچھ نہ کچھ کام کرنے لگیں گے اور اپنی بیوی اور بچوں کے لئے تھوڑا بہت کمانے لگیں گے ۔ لیکن چھٹو میاں نے آب و ہوا اور غذا کی تبدیلی کے ساتھ ہی بہت زیادہ کمانا شروع کر دیا ۔ چند مہینوں کے بعد ہی چھٹو میاں کی کمائی کا اعجاز دکھائی دیا جس گھر میں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑتے رہتے اسی گھر کے لوگوں نے چھٹو میاں کے بڑے لڑکے کا عقیقہ بڑی دھوم دھام سے کیا ۔ سارے دوستوں ، رشتہ داروں اور محلے والوں کی دعوت اس اہتمام سے کی کہ سبھی لوگ اپنے سروں پہ ہاتھ پھیر کر رہ گئے ۔ دولت کا یہ اعجاز دیکھ کر ایک بار ہمارے بھی جی میں آئی اس بھیڑ چال میں شامل ہو کر کہیں نہ کہیں نکل جائیں ۔ صرف امیر بننے کے لئے نہیں بلکہ اپنی ٹیڑھی میڑھی زندگی کو ایک نئی اور سیدھی راہ پہ ڈالنے کے لئے بھی کیونکہ برسہا برس سے ہماری زندگی ایک ہی ڈھرّے پہ چل رہی ہے اور اس یکسانیت سے ہم اُکتا چکے ہیں ۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ہر صبح جب بھی نل کھولو تو اس میں سے ہوا اور سیٹیاں ہی نکلتی رہیں ۔ پانی البتہ چھت سے برستا رہتا کیونکہ بازو کے بنگلہ کی نالیوں کا یا پھر برسات کا پانی ہماری چھت پہ ہی جمع رہتا ہے ۔ شام میں تھک تھکا کر کسی کتاب سے جی بہلانے کی کوشش کریں تو اچانک لائٹ غائب ' کیروسین لانے جائیں تو گھنٹوں کیو میں ٹھیرنا پڑے ۔ جب بھی کھانا کھاتے ہیں تو پہلے ہی نوالے میں دانتوں پہ کنکریوں کی ایسی مار پڑتی ہے کہ سورۂ فیل یاد آجاتا ہے ۔ ہوٹلوں میں منہ چلاتے ہیں تو ملاوٹ کے نئے نئے فارمولوں کی لذّت سے آشنا ہونا پڑتا ہے پھر اس آشنائی سے جو نت نئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ۔ وہ ڈاکٹروں سے پھر ساہوکاروں سے اس طرح رجوع کرواتی ہیں کہ گھر کا سارا اثاثہ واجبات میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ ان حالات میں "فارن" کا تصور خوشگوار انداز میں ہمارے ذہن پہ چھا جاتا ہے لیکن عین اس موقع پہ ہماری چند کمزوریاں آڑے آجاتی ہیں ۔ ہمارا شاعرانہ مزاج جذباتی ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ فطرت کی نیرنگیاں وہ بہاریں وہ جلوہ سامانیاں ، سرما کی وہ اداس شامیں ، تپتی راتوں میں پروائی کی مستیاں ، آموں سے لدے پیڑ ، کوئل کی مدھ بھری کوک ، برکھا پھوار ، بھیگی مٹّی کی سوندھی مہک ، موروں کے قافلوں کی رنگیں اڑانیں ، جھومتے جھامتے چکنے چکنے پتوں والے نیم اور پیپل کے قد آور درخت ، سرسبز و شاداب میدانوں میں ناگوں کی طرح پھیلی ہوئی پگڈنڈیاں ، سبز مخمل کی طرح لہراتے ہوئے کھیت ، دھان کی خوشبو سے بسی ہوئی شاداب فضا ، ندیوں کا مترنم بہاؤ ، آبشاروں کی نغمہ ریزی ، جھیلوں اور تالابوں کا دائمی سکون ، چاندنی راتوں میں جن کی ننھی منّی لہروں سے چاند اٹھکیلیاں کرتا ہے ' یہ سارے خزانے ، فطرت کی فیاضیاں ، ریگستانوں میں کہاں نصیب ہونگی اور کون ظالم ہوگا جو اس سکون پرور ماحول سے گریزاں ہو ۔

حقیقت اور جذباتیت کی اسی کشمکش میں دن یونہی گزرتے رہے اور کچھ عرصے بعد چھٹو میاں بہ نفسِ نفیس اپنے وطن وارد ہوئے ۔ ان کے گھر پہ دوستوں اور رشتہ داروں کا تانتا بندھ گیا ۔ دوسرے دن ہم اپنے گھر سے نکلے ہی تھے کہ

چنوّ میاں سے ڈبھیڑ ہوگئی۔ سرخ و سفید ہو رہے تھے۔ جاپانی کپڑے کا چم چم کرتا سوٹ، اس کے اندر امریکی شرٹ، ہاتھ پہ سوئٹزرلینڈ کی جگمگاتی گھڑی، فرنچ سینٹ کی خوشبو میں بسے بے اختیار ہم سے لپٹ گئے (ان سارے ممالک کا جغرافیہ خود انھوں نے بڑے اشتیاق سے بعد میں ہمیں بتایا) جب ہمارے کپڑوں نے ان کے سوٹ کی تھوڑی سی خوشبو جذب کرلی تو وہ الگ ہوگئے جیب سے برطانوی سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور دوسرے جیب سے چینی لائٹر نکال کر سگریٹ آفر کیا (سگریٹ اور لائٹر کا جغرافیہ خود ہم نے دریافت کیا) ہم یہ جاننے کے لئے بے چین تھے کہ چنوّ میاں جوتا کس ملک کا پہنے ہوئے ہیں لیکن وہ جوتوں تک آئے ہی نہیں۔ ہم نے بھی جستجو نہیں کی کیونکہ جوتوں کی طرف نظر کرتے ہوئے ہمیں ڈر سا لگتا ہے۔ ہم نے ہمیشہ کی طرح انھیں چائے کی دعوت دی لیکن وہ ہمیشہ کے برخلاف ہمیں خود کھینچ کر اپنے گھر لے گئے۔ چائے پلائی اور اپنے ساتھ لائی ہوئی نئی نئی قیمتی چیزیں دکھلائیں جن میں بعض (TWO-IN-ONE) (THREE - IN-ONE) قسم کی بھی تھیں۔ ہم نے جو اس قبیل کی چیزوں میں صرف آئسکریم سے واقف تھے، سارے سامان کو دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ چنوّ میاں نے نئے ملک، نئے ماحول اور ملازمت کے تعلق سے کچھ باتیں کیں اور چلتے وقت ہانگ کانگ کے موزوں کی ایک جوڑ اور جرمن بلیڈ کے ایک پیکٹ کا تحفہ ہمیں دیا۔

اس "بیرونی" ماحول سے برآمد ہو کر جب ہم اپنے گھر میں درآمد ہوئے تو ہمارا ذہن سینکڑوں سوالات سے بھرا ہوا تھا۔ جن کا کوئی جواب کسی کے پاس نہیں تھا سو ہم نے بھی راضی بہ رضا رہنے کی ٹھان لی اور یہ سوچ کر دل کو بہلا لیا کہ آج نہیں تو کل اپنے پیارے وطن کی غربت بھی دور ہوگی۔ یہاں بھی صلاحیت کے مطابق کام ملے گا۔ ہر ایک کو اس کی محنت کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ ہر چیز کی افراط اور خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ پٹرول تو ہمارے ہاں بھی نکلنا شروع ہوگیا ہے اب کایا پلٹنے زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ اپنے جنت نشاں ملک میں تیل کی کھوج اور سمندر کی تہہ سے تیل کے حصول کی خبروں سے ہمیں یوں بھی دلچسپی رہی ہے۔ خوشحالی کی تمنا میں ہم نے یہاں نکلنے والے پٹرول کے اعداد و شمار کا باقاعدہ مطالعہ بھی شروع کردیا۔ پھر ایک دن ہم خوشی سے اچھل پڑے کیونکہ ہمارے یہاں پٹرول کی پیداوار بیس گنا بڑھ چکی تھی لیکن جب ہم نے اس مقدار کا موازنہ امیر ملکوں کے پٹرول کی پیداوار سے کیا تو مایوسی سے ہمیں یوں لگا کہ جیسے اس سطح تک پہنچتے پہنچتے ہم خود گیس بن کر تحلیل ہو جائیں گے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ چنوّ میاں نے عقلمندی سے کام لیا اور صرف دو سال کی کمائی سے اس قابل ہو گئے کہ اپنے پرانے گھر کے بازو والا نیا اور خوبصورت مکان منہ مانگی قیمت پر خرید لیا جبکہ ہم اپنی ۱۰ سالہ ملازمت میں بھی قرضوں کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکے حالانکہ ہمیں بھی اپنا سر چھپانے کو ایک عدد مکان کی شدید ضرورت رہی ہے۔

عقلمند تو تھوڑے بہت ہم بھی ہیں ورنہ اتنی ساری اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں کیسے رکھتے البتہ ہم نے اپنی عقلمندی کو جذبات اور احساسات کے پھندے میں گرفتار کر رکھا ہے اور اسے مادی آسائشوں کے حصول کے لئے کام میں نہ لاسکے۔ اب جب چنوّ میاں نے ہماری آنکھیں کھول دیں تو ہم نے غور کیا کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہمارے ہاتھ پاؤں ابھی سلامت ہیں، بینائی اور سماعت بھی ساتھ دے رہے ہیں۔ ڈگریوں کے ساتھ تجربہ اور صلاحیتیں بھی اتنی ہیں کہ موقع پڑنے پر ہم ہر وہ کام کرسکتے ہیں جو اپنے وطن میں نہیں کیا جاسکتا اور جو "فارن" جانے والے کبھی کسی کو نہیں بتاتے۔ آنکھیں کھلتے ہی ہم نے پاسپورٹ

کے لئے فوری درخواست بھجوادی۔ یہ بات سارے محلے، رشتہ دار اور دوست احباب میں پھیل گئی کہ ہم نے بھی مستقبل قریب میں "سرمایہ دار" بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس خبر کا ایک خوشگوار پہلو یہ نکلا کہ ہماری دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دعوتیں کھاتے کھاتے دو مہینے گزر گئے، پاسپورٹ کی کارروائی نہ معلوم کس مرحلے میں تھی لیکن دعوتوں سے ان دو مہینوں میں ہماری صحت کافی نکھر گئی۔ اور گھر کے اخراجات میں کچھ کفایت ہوگئی۔ اتنی کم مدت میں اتنی زیادہ نعمتیں کھانے کا ہمارے لئے یہ پہلا اتفاق تھا۔ ہمیں پچھتاوا سا ہوا کہ ہم نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کیوں نہ کیا۔ کم از کم دعوتوں کا سلسلہ تو چلتا رہتا۔ البتہ یہ پہچاننا مشکل ہوگیا کہ ان میں خلوص اور محبت کی دعوتیں کونسی ہیں اور ذاتی مصلحتوں کی کونسی؟ بعض دفعہ یہ بھی احساس ہوتا کہ لوگ ہمارے وجود سے اتنے بیزار تھے کہ ہمارے اخراج کی خبر سے انھیں مسرت ہو رہی ہے جس کی وہ خوشیاں منا رہے ہیں لیکن ہمیں تو آم کھانے سے غرض تھی، پیڑ گننے سے کیا حاصل؟ چنو میاں واپس ڈیوٹی پر جا چکے تھے۔ جاتے وقت انھوں نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ ہمارے ویزا کے لئے ضرور کوشش کریں گے بس پاسپورٹ ملتے ہی اس کی نقل روانہ کرنی تھی۔ ہم نے چنو میاں کا پتہ نوٹ کرکے احتیاط سے رکھ لیا کہ اسی سے ہمارا تابناک مستقبل وابستہ تھا۔

بڑے انتظار کے بعد آخر وہ دن آ ہی گیا جو ہماری آرزوؤں، امنگوں اور دولتمندی کی منزل کا پہلا زینہ تھا۔ دعوتوں کے ہجوم میں ایک دن جب ہم گھر لوٹے تو ہماری بیوی ہاتھ میں ایک لفافہ تھامے ہماری منتظر کھڑی تھیں۔ ہم نے لفافہ دیکھتے ہی جان لیا کہ اس میں ہمارا پاسپورٹ ہے۔ ہم نے بے چینی سے لفافہ کھولا۔ پاسپورٹ نکالا اور بڑے اشتیاق سے اس کا ایک ایک صفحہ دیکھ ڈالا۔ اپنے فوٹو کو بار بار دیکھا۔ پھر ایک فاتحانہ شان سے اپنی بیوی پر نظر ڈالی جو خاموشی سے یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ہم نے اس کے چہرے کو جو غور سے دیکھا تو بھیگی ہوئی مضطرب آنکھیں اور ان میں مایوسی کی جھلک دیکھ کر ہمارے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی جن کی آنکھوں میں ہم روشن مستقبل کے حسین خوابوں کی مسرت آگیں تعبیر کو لہراتے دیکھنا چاہتے تھے وہاں جدائی اور فراق کے اندیشے دھواں بن کر چھائے ہوئے تھے۔ ہم چونک سے پڑے اور ہماری ذہنی کشمکش پھر سے شروع ہوگئی۔ ہماری نظروں میں ایک طرف چنو میاں تھے اور دوسری طرف ہماری بیوی کی ویران آنکھیں۔ درمیان میں ہم پاسپورٹ تھامے خود کو معلق محسوس کرنے لگے۔ ایک طرف اپنی دیرینہ خواہشوں کی تکمیل تھی، محفوظ مستقبل تھا، اعلیٰ غذائیں تھیں۔ ایرکنڈیشنڈ مکان تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی، دنیا کے ہر ملک کا جدید ترین معیاری سامان تھا — اور دوسری طرف بے ڈھنگی زندگی، کرائے کا بوسیدہ مکان، پیٹ بھرنے کو کنکر دن، گھوڑے کی لید اور دیگر بلا بدتر ملی ہوئی چیزیں، بیماریاں، قرضداری، حسرتیں اور مایوسیاں تھیں۔ پھر ایک لمحے کو ہمیں یاد آیا کہ اس طرف مادی آسائشوں کے ساتھ مشینی زندگی، تنہائی، کرب اور اپنے پیاروں سے دوری اور جدائی بھی تو ہے جبکہ اس طرف ہزار خرابیوں کے باوجود فطرت کے وہ نمونے ہیں جو ہمارے شاعرانہ ذوق کی تکمیل کرتے ہیں، اپنے پیاروں کا ساتھ ہے، ذہنی آسودگی اور سکون ہے اور کشاکش زندگی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہے۔ اس کشمکش میں ہم نے دیکھا کہ اندر سے ہماری گڑیا سی بیٹی مسکراتی، ہمکتی ہماری طرف چلی آ رہی ہے ہمارے ہاتھ سے پاسپورٹ گر پڑا۔ ہم نے لپک کر اپنی معصوم بچی کو اٹھالیا۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ "جائیں تو جائیں کہاں؟"

●●

روشناس خلق ہوئے

سمیع الحق
شعبۂ اُردو سائنس کالج

وہ اک ببول کا ٹھوٹھا تھا سارے نجر میں ۔ نمودِ شب تھی جہاں الوؤں کے پیکر میں
وہیں پہ ایک دوا خانہ مرگ آسا تھا ۔ جہاں پہ کتّا بھی ہرگز نہ دُم ہلاتا تھا
غلط کہ بیچ میں کمرہ کے ایک چولہا تھا ۔ وہ ایک کرسی تھی جس کا ازل سے رشتہ تھا
جو ایک پایہ تھا دو بر مجسم سے وابستہ ۔ تو اس کا دوسرا تحت الثریٰ میں پیوستہ
حکیم چند جو زینت تھے اس مکاں کے لئے ۔ نشست گہ تھی انھیں کے علوئے شاں کے لئے
وہ ان کے کام کی کثرت نہیں ہے جن کا شمار ۔ کہ کرتے رہتے تھے دن بھر وہ مکھیوں کا شکار
بچے علاج اگر ہسپتال آتے تھے ۔ مریض ان کے مطب کو بھلا کہاں جاتے تھے
ہوس میں زیست کے اہلِ ہوس بھٹکتے تھے ۔ کبھی نہ بھولے سے ان کے یہاں پھٹکتے تھے
کسی کو فکر نہ عقبیٰ کی زندگی کا ہوا
کسی نے نبض نہ اُن کے کفِ اجل میں دیا

کھلی اگرچہ کبھی بھی نہ ان کی الماری ۔ جو ملے اس کے دواؤں کی تھی نگہداری
دوائیں اس میں تھیں پچپن برس کی کہنہ سال ۔ کہ جن کو پیتے ہی ہوں اہلِ ہجر اہلِ وصال
ہر ایک شیشی سے رنگِ آتشیں دمکتا تھا ۔ کھلے جو کاگ تو سارا مطب گمکتا تھا
سرِ نچ تاوکِ مژگاں تھا چشم لیلیٰ کا ۔ ملا نہ جس کو کوئی دل وفا کے پتلا کا
کبھی وہ کرتے تھے اپنے فشارِ خوں کا حساب ۔ کبھی وہ آلے سے سنتے تھے اپنے دل کا رباب
غرض کہ چارہ گری کے تمام ساماں تھے
مگر زمانے سے چارہ گری کے ارماں تھے

حکیم چند خدا سے دُعا یہ کرتے تھے ۔ (خود اپنے آپ ہی آمین کا دم بھی بھرتے تھے)
کہ جلد سارے علاقے میں اک وبا آئے ۔ ہر اک طرف سے مریضوں کا سوجھا آئے
کسی کو دردِ شکم ہو کسی کو بول و براز ۔ کسی کی کھانسی کسی کا بخار ہو دمساز
گئی فلک پہ جو ان کی فغانِ نیم شبی ۔ تو آیا جوش میں امکانِ امرِ ربِّ نبی
کہیں پہ ہیضہ کہیں پہ ملیریا پھیلا ۔ ہر ایک گاؤں میں یرقاں کا عارضہ پھیلا
غرض حکیم کے دل کا غبار پھیل گیا ۔ ہوا کے ساتھ فلو کا بخار پھیل گیا
کہ تاکہ وہ بھی سمجھ لیں دُعا قبول ہوئی
خود ان کے واسطے بھی اک وبا قبول ہوئی

انھوں نے اپنا مرض کا ملا کیا تجویز ۔ اور اس مرض کے لئے کچھ دوا کیا تجویز
اب ان کے واسطے کھولی گئی اک الماری ۔ شکستہ تختوں کی چھوٹی سی چار دیواری
ہر ایک خانہ میں اس کے تھا شیشیوں کا ہجوم ۔ کہ جیسے شادی کے گھر میں ہو بی بیوں کا ہجوم
وہ گھونٹ گھونٹ انھیں شیشیوں سے پیتے رہے ۔ یہ معجزہ تھا کہ شب بھر وہ یونہی جیتے رہے

اجل کے گھر سے فرشتے جو شام کو ہی چلے — وہ نارسیدہ بیاباں میں راہ بھول گئے
وہ اہلِ تیسہ سا شب بھر وہیں بھٹکتے رہے — حکیم چند بھی بالیں پہ سر پٹکتے رہے

سُنا گیا کہ سحر میں بخار چھوٹ گیا
اسی کے ساتھ خبر تھی کہ دم بھی ٹوٹ گیا

کہ جیسے گرد اڑے اور ہوا پہ جا ٹھہرے — حکیم چند دیر کبریا پہ جا ٹھہرے
کھلا تھی دیرِ اعراف ان کی جا کے لئے — وہیں جگہ تھی مریضانِ کالرا کے لئے
ہوا سوال "تو کیسے اجل کے ہاتھ لگا — نہ امبولنس پہ لیٹا نہ ہسپتال گیا؟"
کہا حکیم نے "میں ہوں قتیلِ نادانی — کہ مر کے بھی ہے مجھے موت سے پشیمانی
جہاں کو اپنی مسیحائی میں دکھاتا تھا — کہ اپنے گھر کی دواؤں کو خود ہی پیتا تھا
خبر نہ تھی کہ دواؤں میں بھنگ رکھتے ہیں — کہ اشتہار میں دھوکے کا رنگ رکھتے ہیں

جو پینا ہی تھا تو قارورہ پی لئے ہوتا
کچھ اور دن تو زمانے میں جی لئے ہوتا"

ندا یہ آئی کہ کیسا ہے گندگی کا خیال — یہی ہے اشرف مخلوق آدمی کا مآل!
نہ شہد و شیر نہ تاڑی نہ اور کوئی شراب — تو چاہتا تھا پئے آب کے عوض پیشاب
ترے خیال سے اعراف میں عفونت ہے — غضب کہ دوزخی تیری یہاں سکونت ہے
اسی کے گھر کے ہی ٹھونٹے ببول پہ بھیجو — یہ بوم ہے اُسے اُلّو بنا کے گھر بھیجو
لکھا ملاکہ قیامت پہ اس کا ایماں تھا — پچاس پشت سے یہ ذات کا مسلماں تھا
یہ تب تو اُلّو کے قالب میں جا نہیں سکتا — کوئی بھی مولوی تاویل لا نہیں سکتا
اُسے تو جسم ملے گا نہ حشر سے پہلے — یہ زندہ ہوگا نہ پھر یوم نشر سے پہلے

اب اس کی روح کو بد روح کرکے لوٹا دو
بنا کے بھوت اسی گھر میں اس کو پلٹا دو

حکیم چند بنے بھوت تو یہ رونق ہے — کہ صبح و شام وہاں اژدہام احمق ہے
نقیر چلے میں دو چار بند رہتے ہیں — سرِ مزار مجاور بھی چند رہتے ہیں
مراد مانگنے لیل و نہار آتے ہیں — چھڑانے بھوت بھی اس جا ہزار آتے ہیں
بکھرتا رہتا ہے لوبان کا دھواں ہر دم — نکلتی رہتی ہے جنات کی فغاں ہر دم
بنے وہ بھوت کہ سر پہ سوار رہتے ہیں — زیادہ تر کسی عورت پہ وار کرتے ہیں
ہر ایک سین میں ہنستے ہیں اور روتے ہیں — ڈرامے فوق بشر کے عجیب ہوتے ہیں
خدا کا فضل ہر اک آن واں جھلکتا ہے — مجاوروں کے مقدر سے ہُن برستا ہے

اسی سے ان کی بزرگی کا پاس رکھتے ہیں
حکیم چند کا ہر سال عرس کرتے ہیں

ارشد علی خاں

مرزا اور کتا

مرزا کی فطرت میں ہر قسم کے کتوں سے ڈرنے کا مادہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ کتا چاہے بالغ ہو کہ نابالغ، پاگل ہو کہ عقلمند، خارش زدہ ہو کہ دمہ کا دائمی مریض، ہٹا کٹا ہو کہ ناتواں و معذور بہر حال بلا تخصیص ہر کتے کے پے بلکہ اس کے سائے سے تک ان کا دم نکلتا تھا۔ ایک لحاظ سے مرزا کا ڈر بھی حق بجانب تھا، کیونکہ انھیں کتوں کی بدولت ان کی گنبد نما توند میں سینکڑوں کی تعداد میں انجکشن کی بڑی بڑی سوئیاں نہایت بے دردی سے ٹھونسی اور چبھوئی گئی تھیں۔ اس حادثہ کے بعد سے مرزا اچھے خاصے کتے کو دیکھ کر بھی دیوانی حرکتیں کرنے لگے تھے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ دوڑ کر کتے کو کاٹ ہی کھائیں گے۔ یہ مجنونانہ حرکتیں اس وقت بام عروج پر پہنچ گئیں جب انھیں پتہ چلا کہ نیا پڑوسی اللہ داد خاں اپنے ساتھ اپنے ہی جثہ کا لیم شیحم کتا بھی ساتھ لایا ہے۔ مرزا اس پڑوسی سے نہایت دوستانہ انداز میں نہ صرف ملے بلکہ بار بار گلے ملے اور پھر اس کو بھگانے کے لئے کئی حربے آزمائے۔ مثلاً انھوں نے نہایت پر اسرار انداز میں خوفناک نقشہ کھینچ کر بتایا کہ جس گھر میں وہ قیام پذیر ہیں، وہاں ایک کنواری کا قتل ہوا تھا اور وہ ہر جمعرات کو چیختی چلاتی رہتی ہے بلکہ اللہ محفوظ رکھے گلا تک گھونٹ دیتی ہے ــــ اللہ داد خاں نے ان کی اس بات پر الٹا اثر لیا۔ نہایت زبردست قہقہہ لگا کر کڑیل آواز میں کہا "مرزا ہم تو کنواریوں کے عاشق ٹھیرے، واللہ کیا مزے کی موت ہوگی جب وہ کنواری اپنے نازک و نرم ہاتھوں سے ہمارا گلا گھونٹ کر جام شہادت نوش کرائے گی ـــ خدا کی قسم اگر وہ اپنے مہم میں کچھ پسپا بھی ہوئی تو ہم اس کا دل رکھنے کی خاطر خود مرجائیں گے ـــ خدا کرے کہ کم از کم زندگی میں ایک بار یوں ہوجائے ـــ کیا سمجھے! مرزا جواب میں اپنا سر پیٹ کر رہ گئے (صرف دل میں) اس کے بعد انھوں نے موضوع کتے کی طرف موڑ دیا۔ کہنے لگے۔ "اس خبیث کو کیوں پال رکھا ہے!"

"کونسا خبیث؟ داد خاں سگار کا گل جھٹک کر سادگی سے بولے "اچھا اس خان ماں کو کہہ رہے ہو! میرا خیال ہے کہ وہ پھر بھی غنیمت ہے!"

"میں اس بدذات کتے کے بارے میں کہہ رہا تھا!" مرزا نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

"بدذات"! خاں صاحب جلال میں آگئے۔ جیسے ان کے والدِ محترم کی شان میں گستاخی کی گئی ہو، دانتوں کو آپس میں پوری قوت سے رگڑتے اور پیستے ہوئے غرّائے۔ "اس لاڈلے کی اپنی ذات کی سنہری تاریخ ہے . . . میں اس کی سوانح لکھ رہا ہوں ـــ! "تم مثل بچے عقل کے کچے اِن کو کیا جان سکو گے ـ! سنو! انھوں نے سگار کا دھواں وافر مقدار میں اندر کھینچ کر اپنے آپ کو مزید گرمالیا اور تڑپ کر بولے "آفریقہ جانتے ہو؟"

"کون؟ جنوبی یا مغربی!" مرزا چونکنّا ہو کر بولے۔

"کیا جنوبی، مغربی لگا رکھی ہے! ارے میں کہہ رہا ہوں۔ آفریقہ . . . . آفریقہ کا مطلب آفریقہ ہوتا ہے . . . . اگر میں یہ کہوں کہ مرزا کو جانتے ہو اور کوئی یہ دریافت کرے، کون سے مرزا جنوبی یا مغربی، مشرقی یا شمالی . . . یہ سب انگریزوں کی ڈپلومیسی ہے!" اور تم تو یار نرے مرزا ہو! اور مرزا کا مطلب میرے نزدیک ہمیشہ نادان دوست سے رہا ہے! خیر میں کہہ یہ رہا تھا کہ دنیا میں ایک ہی افریقہ ہے اور ان کے اندر بڑے مہیب جنگل واقع ہوئے ہیں ـــ ایک جنگل میں ایک آدم خور قبیلہ جوجو نامی رہتا ہے جو اپنے پاس نہایت خونخوار کتے رکھتا ہے۔ ان کتوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی آدم زاد اس جنگل کی حدود میں داخل ہو جائے تو اُسے زندہ یا مردہ پکڑ لائے . . . . کیا سمجھے!

کیا وہ قبیلہ آدم زاد نہیں ہوتا؟ مرزا نے بظاہر تصحیح چاہی لیکن اندر سے لرز کر رہ گئے۔

"آدم زاد سے مراد ترقی یافتہ لوگ ـــ اور ترقی یافتہ قوم انگریز ہوتی ہے جو اپنے ترقی یافتہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں کا کھوج لگانے نکلتی ہے اور اس طرح لقمۂ سگ بن جاتی ہے . . . . . خیر تو اس طرح کئی انگریز پارٹیاں کھا لی گئیں ـــ آخر میں ان خونخوار کتوں کا پتہ چلا ـــ امریکیوں کو اس بیش بہا خزانے کا علم ہوتے ہی ساتویں بحری بیڑے کو حرکت میں لایا گیا ـــ اس طرح چند کتے آفریقہ سے امریکہ لائے گئے۔ زبردستی امریکہ کی سفید کتیوں سے تعلقاتِ ازدواجی قایم کئے گئے اور جب ان کی نسل وجود میں آئی تو انھیں ویٹ نام کے دہریوں کو ڈھیر کرنے روانہ کیا تھا۔ لیکن جانتے ہو کیا ہوا؟

"امریکہ جنگ ہار گیا! مرزا نے جھٹ سے جواب دے دیا۔

"لیکن کیوں؟" دادخاں بے تحاشہ مرزا کو گھور کر بولے۔ جواب میں مرزا سر کھجانے لگے۔

"سر میں ٹڈی ڈی ٹی ٹی ملا کر ـــ! جوئیں ایکدم مرجاتی ہیں . . . . کیا سمجھے! اور مرزا نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان کتوں نے اُن دہریوں کا منہ لگانے کے قابل تک نہ سمجھا ـــ یہی تو خاص بات ہے ان جوجو قبیلہ کے کتوں کی . . . . امریکی کتیوں کے پیٹ میں رہ کر بھی وہ سیپ میں موتی کی مانند خالص نکلے۔ وہی اونچے اخلاق اور اعلیٰ ذوق کے مالک ـــ! میرے لال کو دیکھو ـــ کتنا مہذب واقع ہوا ہے جب کبھی اس محلے کی گری ہوئی نسل کی کتیاں موسم سے گرما کر جب میرے پھاٹک پر آ کر کیبرے ڈانس پیش کرتی ہیں اور اپنی دُمیں نادیدہ نگاہوں سے فحش اشارے کر کے میرے کتے کے عرصے سے جلتے ہوئے جذبات پر پٹرول انڈیلتی ہیں تو میرا لاڈلا ایک مخصوص غراہٹ بلند کرتا ہے۔

—— اس غراہٹ کو صرف جوجو قبیلہ یا اعلیٰ درجہ کا کتا ہی سمجھ سکتا ہے —— کیا سمجھے ...... لہٰذا اس غراہٹ پر میں فوراً اس کی طرف لپکتا ہوں اور ان کتیوں کو مار بھگاتا ہوں —— !"

"آخر یہ آپ کو دستیاب ہوا کہاں سے تھا؟"

"اس کی الگ تاریخ ہے!" مختصر یہ کہ دیٹ نامیوں پر جب ان کتوں نے حملہ کرنے کی قسم کھالی تو امریکیوں نے انہیں سمندر میں غرق کرنا شروع کر دیا —— میں وہاں موجود تھا ایک امریکی نے اپنا کتا میرے حوالے کر دیا۔ جونہی میں نے اس کی زنجیر تھامی —— کتا بے اختیار میرے قدموں پر لوٹنے لگا۔

"غالباً اس کو جوجو قبیلہ کا کوئی فرد یاد آگیا ہوگا" ۔ مرزا نے گرہ لگائی ۔

"ہاں بالکل —— !" "اب ہم دونوں آپس میں نہایت وفادارانہ زندگی گزار رہے ہیں —— وہ بھی کنوارا اور میں بھی کنوارا —— میں اس کو کھنٹوں سمجھاتا ہوں کہ ان کتیوں کی باتوں میں مطلق نہ آنا ورنہ وہ تیری اعلیٰ نسل کو کچرے اور گھوڑ کی نذر کر ڈالیں گی ۔ اور اگر خدا نخواستہ کسی دن اس نے مجھ سے بغاوت کی اور یہ نیچا سے اس لعنت کے دریا میں غوطہ لگا کہ جس کا چلو بھر پانی میں نے آج تک استعمال نہیں کیا۔ تو سب سے پہلے میں وہ شخص رہوں گا جو ریوالور سے سیدھا خود پہ فائر کر لوں گا اور اس کے بعد اس باغی کو ...... کیا سمجھے!" داد خاں کی آواز یکایک بھرا گئی جیسے انہوں نے واقعی اپنا ڈولے پر فائر جھونک دیا ہو اور وہ خون میں لت پت خاک میں پڑا دم توڑ رہا ہو —— !

"بعض وقت تو طبیعت اس بات پر آمادہ ہو جاتی ہے کہ اس شریک زندگی کی زنجیر تھاموں اور سیدھا افریقہ کی راہ لوں اور پھر جوجو قبیلہ میں جا ملوں —— کیا سمجھے —— !" مرزا کھل گئے —— بولے "اگر آپ اپنی اور آپ کا شریک حیات کی تصویریں مرحمت فرما دیں تو خادم اپنے خرچے سے پاسپورٹ بنا لائے گا —— !"

"ابھی نہیں! داد خاں بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر بولے۔ "میں چاہتا ہوں کہ افریقہ کا جنگل خوب پھلے پھولے اور پھیلے یہاں تک کہ دنیا کے اکثر علاقوں تک آجائے ۔

"اس وقت تو آپ کے جانے کا سوال ہی خارج از بحث ہوگا کیونکہ جوجو قبیلہ خود آپ کے گھر تک آجائیگا!"

"کاش کہ وہ دن جلد آجائے !"

مرزا نے موضوع پھر اصل حریف یعنی کتے کی طرف موڑتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا "یہ تو دنیا جانتی ہے کہ کتا ناپاک جانور ہے !"

"کون کہتا ہے کہ وہ ناپاک ہے! داد خاں لال بھبھوکا ہو کر بولے "ارے میں خود روزانہ اپنے ہاتھوں سے اسے غسل دیتا ہوں۔ عمدہ سے عمدہ صابن خوب رگڑ رگڑ کر —— کیا سمجھے !"

"لیکن پھر بھی رحمت کے فرشتے قریب نہیں آتے —— !"

"وہ بیچارے آکر بھی کیا کریں گے؟ ویسے کیا تمہیں میرا گھر کوئی مسجد یا خانقاہ نظر آتا ہے؟" داد خاں نے دھواں دھار پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"میرا ملازم وہ اپنے ساتھ خیر و برکت لے کر آتے ہیں!" مرزا نے نڈھال ہو کر کہا۔
"بہت دیکھ چکا ہوں خیر و برکت!" داد خاں ہتھے سے اکھڑ گئے کہنے لگے "جب کتا نہیں تھا تو دروازہ کھلا رکھ کر
منٹ چین سے بیٹھ نہیں سکتا تھا، چلے آرہے ہیں رحمت کے فرشتے چندے کی رسید بک لئے ہوئے۔ دن کا یہ عالم تھا اور
ت، رات کے کیا کہنے ہر قسم کی چور چکوری بلیوں کے علاوہ چیدہ چیدہ ڈاکو بلا تکلف گھر میں کودتے اور من پسند چیزیں لے جاتے تھے۔
سمجھے!" مرزا ہکا بکا رہ گئے ۔ انھوں نے ہمت کر کے کن انکھیوں سے دیکھا تو اس کالے دیو کو موٹی زنجیر میں جکڑے ہوئے
یا۔ پھر جب وہ دبے قدم اٹھائے واپس جانے لگے تو اس کالے دیو نے انھیں کسی طرح دیکھ لیا بس اس قدر زور زور سے
نا پر جھپٹنے لگا جیسے مرزا نہ ہوئے قصائی کا پھینکا ہوا چھیچھڑا ہوئے۔ ان کا دم اکھڑنے کے قریب آگیا اور وہ سر پر پاؤں
رکھ کر بھاگ نکلے ۔ یہ اور بات تھی کہ وہ اللہ داد خاں کے وحشی قہقہوں کو برابر سن رہے تھے ۔ لہٰذا اس دن سے مرزا کے
ویک اللہ داد خاں اور ان کا کتا دونوں ایک تھے یعنی مشترکہ دشمن ۔ حفظ ماتقدم کے تحت انھوں نے بھولے سے بھی ادھر
دم نہ رکھا۔ "جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں"
اور ایک دن مرزا کو کسی نے گوش گزار کیا کہ داد خاں رات میں کتے کو آزاد چھوڑنے لگے ہیں تو مرزا کی روح فنا ہو گئی۔
لے والوں کو داد خاں کے خلاف کافی ورغلائے لیکن ان لوگوں نے ساتھ نہ دیا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور اس قدر
اپنے تئیں محتاط ہو گئے کہ ادھر شام کا سورج غروب ہوا کہ وہ اپنے گھونسلے میں کسی ننھی سی چڑیا کی طرح گئے اور دبک کر بیٹھ گئے۔
قسمت کا تعزیہ چھوٹ کر رہ گئی تھی۔ لیکن ایک دن احباب مرزا کو ان کے لاکھ حیل و حجت کے باوجود زبردستی مشاعرے میں
گھسیٹ لے گئے۔ مرزا مشاعرہ کیا سنتے ان کے دل و دماغ پر داد خاں کا لاڈلا بری طرح سوار تھا۔ انھیں تو یوں لگا جیسے شاعروں
ں بجائے مختلف النسل کے کتے اسٹیج پر آ آ کر طرح طرح سے بھونک رہے ہوں بلکہ کاٹنے بھی دوڑ رہے ہوں۔ وہ انھیں خیالوں میں غلطاں اندر ہی اندر گھٹتے رہے پھر
جب کافی رات گئے مشاعرہ برخواست ہوا تو وہ اپنی پٹری سیکل پر سوار گھر کی جانب لپکے ۔ راستہ تمام یہی سوچتے رہے کہ
کتا اور انسان میں کیا رشتہ ہے۔ آخر کتا وفادار کیوں ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو صرف اپنے مالک ہی کا کیوں؟ تمام
انسانوں کا کیوں نہیں؟ خود غرض کہیں کا ۔ وفاداری گوشت کے چند چھیچھڑوں کی کرتا ہے نابکار ۔! بدمعاش
مالک دوسروں کے گھروں میں ڈاکے ڈالے، عورتوں کی عصمتوں کو داغ دار کرے۔ اس کتے کی دم پہ کوئی اثر نہیں ہوتا وہ
اس ڈاکے کے مال کی چوکیداری کرتا ہے۔ دم نچا نچا کر مالک کی خوشامد کرتا ہے۔ شریف اور رذیل کی پہچان سے یکسر نابلد۔
کندۂ ناتراش ۔! ان ہی خیالات کے ساتھ وہ اس گلی میں مڑ گئے جہاں سے ہو کر وہ اپنے گھر پہنچتے تھے، لیکن انھیں
پورے بریک لگانے پڑے جس کا اثر یہ ہوا کہ پٹری سیکل کی رفتار ساٹھ کی بجائے بیس میل فی گھنٹہ پر آ گئی۔ ان کی
سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ گلی میں گھپ اندھیرا تھا اور وہاں کوئی جانور تیزی سے اچھل کود میں مصروف تھا۔ مرزا کو
بے ساختہ کالا دیو یاد آ گیا۔ لہٰذا وہ سیکل سے کود کر تیزی سے جدھر سے آئے تھے ادھر ہی بھاگ نکلے۔ ساتھ ہی انھیں
تعاقب میں زبردست ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور دیکھتے ہی دیکھتے دو چار گدھے سنسناتی گولیوں کی مانند ان کے آگے
سے دوڑتے نکل گئے۔ مرزا ششش و پنج میں پڑ گئے کہ آیا جنہیں وہ کالا دیو سمجھ بیٹھے تھے کیا وہ یہی احمق گدھے تو نہیں تھے۔ ابھی

وہ کسی نتیجہ پر پہونچ بھی نہ پائے تھے کہ انھیں مُدغم غراہٹ سنائی دی۔ اس غراہٹ کے ساتھ ہی مرزا ہرن کی طرح چوکڑی مار کر سامنے پارک کا آہنی گیٹ پھلانگ گئے۔ کالا دیوکسی شیر کی طرح دھاڑا پھر دم کو زور زور سے گردش دے کر اچھلا اور پارک میں اتر پڑا۔ مرزا کی عقل مارے گئی تھی۔ وہ پناہ کی خاطر پارک میں لٹکے ہوئے جھولے پر چڑھ دوڑے اور لگے پوری قوت سے اسے اڑن کھٹولہ بنانے ——— کتا پورے وقار اور سنجیدگی سے مرزا کی ان نامعقول حرکت کا کھڑا جائزہ لیتا رہا۔ اس پر مرزا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ——— وہ سامنے سڑک پر نظریں گاڑے کسی راہ گیر کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ یکایک انھیں زبردست جھٹکا لگا۔ وہ کانپ کر رہ گئے اور پوری طرح سے جھولا جھولنے لگے۔ اُدھر کتے کے منہ میں ان کی شیروانی کا پاک دامن آگیا تھا۔ لہٰذا اب مرزا اور کتا دونوں ایک ساتھ جھول رہے تھے ——— کچھ دیر بعد مرزا کو شمشان گھاٹ کی جانب سے ایک سیکل سوار آتا نظر آیا ——— انھوں نے اس کے قریب آتے ہی دہشت ناک انداز میں آواز لگائی "مدد بابو ——— مدد بابو ——— !" سیکل سوار نے پورے بریک لگائے اور اندھیرے میں دو سایوں کو خلا میں جھولتے پایا تو اپنی دانست میں اسے چڑیلوں کا رقص سمجھ بیٹھا۔ لہٰذا اس نے بھی ایک بھرپور کر توڑ نعرہ مار کر جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی نو، دو، گیارہ ہوگیا۔ اس نعرے سے مرزا اور کتے پر جداگانہ اثرات مرتب ہوئے، یعنی مرزا کے رہے سہے اوسان خطا ہوگئے تو دوسری طرف کتے کے استقلال میں صد فی صد اضافہ ہوگیا۔ لہٰذا اس نے وافر مقدار میں شیروانی کا دامن چاک کیا اور اس پر بھرپور غصہ نکالنے لگا ——— ! آگے خدا جانے اور کیا ہوتا کہ پارک میں گھن گرج کی آواز گونجی "میرے لال ——— آجاؤ ——— کب سے تلاش کر رہا ہوں ——— !

کتا شیروانی کا دامن پکڑے آواز کی جانب دوڑ پڑا ——— دوسری آواز ابھری "اور یہ کون احمق ہے۔ گیلے کباب کی طرح آدھی رات گئے جھولے پر ٹنگا ہوا ؟ اس کے ساتھ ہی ٹارچ سے روشنی پھینکی گئی اور غصہ سے کہا گیا" اماں تم ہو مرزا ——— یہ کیا تک ہے ——— لونڈیوں کی طرح جھول رہے ہو ——— اگا نا بھی گا دو نا . . . . آیا ساون کا مہینہ، آؤ جھولا جھولیں ——— !" جھولو لیکن اپنی ننھی منی سہیلیوں کے ساتھ میرے لاڈلے کو کیوں بُری راہ پر ڈال رہے ہو ——— اس قسم کی حبت سے مجھے سخت نفرت ہو رہی ہے جس سے میرا لاڈلہ غلط عادتوں میں پڑ جائے . . . . . اور دم ہے تو آؤ ہم سے کھیلو، پولو کھیلو، اندھا بھینسا کھیلو، پنجہ لڑاؤ ورنہ کم از کم سہیلیوں کے ہمراہ ہندوستانی کھیل کھیلو، یعنی آنکھ مچولی، لونا پارٹ اور جھاڑ بندر !" اس طرح نام روشن کرو مدر انڈیا کا ——— اور ہاں خبردار ایک بار جو میرے لاڈلے کے ساتھ نظر آئے تو یقیناً دونوں کو بے دریغ تہ تیغ کر دوں گا۔ کیا سمجھے !"

جب داد خان اپنے کتے کے ساتھ بہت دور نکل گئے تو مرزا جھولے سے اتر کر نیچے آئے اور دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیے اور گڑگڑائے "اے خالق کائنات اس وحشی بلا یعنی کتے کو معہ . . . . کیا سمجھے کے اُٹھا لے ——— آمین ——— "

●●

ناقابلِ اشاعت مضامین کسی صورت واپس نہیں کیے جائیں گے۔ (ادارہ)

هزلیں

پنج وقت تصوّر میں ہے جو حوُر کہاں ہے
جنّت کا ٹریلر ہے یہیں وفد کہاں ہے

مرجائیں تو غم خوار منالیں گے ابھی جشن
زندہ ہیں تو یہ فکر کہ تندور کہاں ہے

کمپونڈ کے اطراف ملے شہر کے شاعر
لشکر یہ بڑا بھاری ہے وہ تیمور کہاں ہے

دیوان کو فٹ پاتھ پہ آ بلنے دو پہلے
شاعر ہے یہ اچھا، ابھی مشہور کہاں ہے

یہ بزمِ سخن ہے کہ کوئی شہرِ خموشاں
فرمائشِ احباب کا دستور کہاں ہے

پینے کو جلیلؔ اپنے لئے چائے بہت ہے
یہ بھی مرے احباب کو منظور کہاں ہے

رشید عبد السمیع جلیلؔ

ظہیرؔ غازی پوری

اثر وہ کہاں سرد آہوں میں تھا
جو بیگم کی نقلی کراہوں میں تھا
نہ مہلک سے مہلک بموں میں ملا
جو ایٹم تمہاری نگاہوں میں تھا
درِ میکدہ بند جب ہوگیا
تو ہر شخص پیشاب گاہوں میں تھا
کرشمہ تھا بیوی کی کفگیر کا
کئی روز میں خانقاہوں میں تھا
تمنا جلی، گھر جلا، دل جلا
کرنٹ اس قدر گرم آہوں میں تھا
کسی نے نہ دیکھا مگر چل گیا
وہ خنجر کنواری نگاہوں میں تھا
کٹہرے میں عاشق ہی تنہا رہا
زمانہ تو ان کے گواہوں میں تھا
نوازا جسے سینڈل نے تری
وہی وقت کے سربراہوں میں تھا
دوپٹہ اڑا کر وہ جب چل پڑی
تو اک حشر سا شاہراہوں میں تھا

محمد نوئیس مالیگاؤں

کاتب + کاتب + کاتب = ؟

نوٹ : اگر یہ مضمون کاتب نے ہو بہو خوشخط لکھا تو اُسے "خوش نویس" اور خود کو "خوش نصیب"* سمجھوں گا۔

کاتبوں کی تین قسمیں ہیں (۱) کاتب تقدیر (۲) کراماً کاتبین (۳) کاتب اخبار و رسائل

کاتب تقدیر :

کاتب تقدیر خدا کو کہتے ہیں۔ انسان و حیوان ، نباتات و جمادات سب کی تقدیر خدائے تعالیٰ لکھتے ہیں۔ نجومیوں کی تحقیق کے مطابق تقدیر کی کتابت انسانی ہتھیلی پر کی گئی ہے۔ کاتب تقدیر نے ایسی عمدہ روشنائی استعمال کی ہے جو نہ بلیچنگ پاؤڈر سے مٹ سکتی ہے نہ آپریشن سے ، شاید اس روشنائی میں آب حیات کا عنصر موجود ہے اسلئے تاحیات و بادفات بھی یہ لکیریں نہیں مٹتیں جس طرح ڈاکٹر کی کتابت (دوا کا قلمی نسخہ) صرف کمپاؤنڈر اور میڈیکل اسٹور والا ہی پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح ہاتھ کی لکیروں کا راز صرف جیوتشی جانتا ہے تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ جو قومیں ہاتھ کی لکیروں کے فیر عقلے وہ ہر دَور میں تغیر و درویشں رہتی ہیں۔ ان کی تقدیر میں "ترقی" لکھنا منع ہے۔ ہاں اگر کاتب تقدیر کو اچھے اعمال سے خوش رکھا جائے تو وہ بھی اچھی روشنائی سے "خوشخط تقدیر" لکھ دیتاہے۔ اکثر نجومیوں کی پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں کیونکہ وہ کتبۂ تقدیر کی پروف ریڈنگ میں غلطی کر جاتے ہیں۔ لیڈر اور فلم اسٹار ہمیشہ عوام کو بے وقوف بناتے ہیں مگر نجومیوں کا طبقہ نیتا اور 3[illegible] "ابھی نیتا (ایکٹر) دونوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ یہ سلسلہ بے وقفہ ہنوز جاری ہے۔

کراماً کاتبین :

یہ دو فرشتے ہیں۔ جو انسانی کاندھے کو 'بطور میز' استعمال کرتے ہیں۔ نیکی اور بدی کا روزنامچہ لکھنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ انسان کی ہر حرکت کو یہ فرشتے "ریفری" کی نظر سے پرکھتے ہیں جہاں انسان نے گناہ کیا۔ بدی کے کالم

---

* واقعی خوش نصیبی "قسمت والوں" کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ (م۔س)

میں گناہ کا مناسب ہندسہ درج کر دیتے ہیں۔ چونکہ انسان نیکی سے زیادہ بدی کو پسند کرتا ہے اس لئے گناہ کی ضخیم بیاض بہت جلد چھپ کر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ فرشتے ہر سال گناہ کا خاص نمبر شائع کرتے ہیں جس کی دو کاپیاں تبصرہ کے لئے کاتب تقدیر کو بھیج دیتے ہیں۔ کاتب قسمت اپنے رحمت کے قلم سے عموماً خاص نمبر کو عام شمارہ میں تبدیل کر دیتا ہے غالب مرحوم کو ان کاتبوں سے 'شکوہ' ہے۔ اسی لئے "دیوان غالب" میں فرماتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کو ہمارا دم تحریر بھی تھا

بہرحال یہ غالب اور کراماً کاتبین کا 'داخلی معاملہ' ہے ہم اس پر کچھ لکھ کر اپنے "گناہوں" کا "سالنامہ" کیوں نکلوائیں۔ فی کس دو شعر شتے کے حساب سے دنیا میں کراماً کاتبین کی آبادی انسانی آبادی سے دوگنا زیادہ ہے انسان کے مرنے کے بعد یہ فرشتے اپنا فائیل 'منکر نکیر' کو سونپ جاتے ہیں جو مردہ انسان کے "فنا کی بنگلہ" میں خصوصی انٹرویو لینے کے لئے تشریف لاتے ہیں۔

کاتب اخبار و رسائل :

یہ قوم عموماً اردو اور فارسی زبان کے علاقے میں پائی جاتی ہے۔ بہت زندہ دل ہے۔ نقطوں کی ہیرا پھیری سے تحریر میں شگفتہ انقلاب برپا کرتی ہے۔ زندہ دلان پنجاب، زندہ دلان حیدرآباد سے زیادہ زندہ دل اگر کوئی قوم ہے تو کاتبانِ کتب و اخبار و رسائل کی قوم! قلم سے الفاظ کا سر قلم کرنے میں ماہر!

ستم ظریف کاتب حضرات اپنی "ہمہ دانی" کا آئے دن مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ شاعروں کے کلام میں تحریف کرنا، ادیب کے تحریر کردہ الفاظ اور جملے میں ترمیم و تنسیخ کرنا ان کی ہابی (HOBBY) ہے۔ یہود و نصاریٰ نے توریت و انجیل میں ردّ و بدل کرنے کا "فن تحریف" شاید ان ہی سے سیکھا ہے۔ کاتب "لغزش قلم" میں اتنے بدنام ہو چکے ہیں کہ بیشتر غلط شاعر اور غلط ادیب اپنی فنی غلطیاں چھپانے کے لئے کہتے ہیں "صاحب شعر میں سکتہ نہیں تھا۔ عبارت میں نقص نہیں تھا۔ کاتب کی غلطی ہے۔" اس طرح ہمارے کاتب حضرات کتنوں کی "عیب پوشی کا کیپسول (CAPSULE) بن گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔

دلچسپ اغلاط نامہ

اصل تحریر	کاتب کی شرارت
۱۔ وزیر اعظم دورے پر	۱۔ وزیر اعظم پر دورے
۲۔ چور کا بھائی گرہ کٹ	۲۔ حمد کا بھائی گرہ کٹ
۳۔ سرخ رو آفاق ہیں یہ رہنما مینار ہیں	۳۔ سرخ رو آفاق ہیں یہ رہنما منیار ہیں
۴۔ روشنی ہے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں	روشنہ سے جن کی ملّاحی کے بیڑے پان ہیں
۴۔ .... پارٹی کے نامزد امیدوار	۴۔ .... پارٹی کے نامرد امیدوار

کاتب کا کوئی مخصوص حلیہ نہیں ہوتا۔ جو شخص ایک زانو تہہ کئے اور ایک گھٹنا موڑ کر لکھتے ہوئے نظر آئے وہ کاتب ہے اور جو بچہ سلیٹ پر پچاس مرتبہ "غلطیاں" درست لکھ رہا ہو وہ مستقبل کا کاتب ہے اور جو شخص انگلش کا پیانہ لکھ رہا ہو سمجھ لیجئے وہ ماضی کا کاتب ہے۔

کاتب کے FUNCTIONS (کام) حسب ذیل ہیں۔

۱۔ الفاظ کی صف بندی کرنا (سطر کی سڑک پہ ہر لفظ کو قلم سے اسطرح "اٹنشن" کھڑے کرنا کہ جلد ہی جائے)

۲۔ زیادہ مواد کو کم جگہ میں سمونا (ایڈیٹر کی جانب سے یہ سزا عموماً اخبارات کے کاتبوں کو دی جاتی ہے)

۳۔ کم مواد کو زیادہ جگہ پر پھیلانا (شاعروں کی چند غزلوں کو "دیوان" بناتے وقت یہ پالیسی اختیار کی جاتی ہے)

کاتب ہڑتال، گھیراؤ، دھرنا اور مرن برت جیسے الفاظ اخبار میں لکھتا ہے مگر اپنی ٹریڈ یونین نہیں بناتا جلسہ و جلوس سے دور بھاگتا ہے۔ اگر بیوی "دھرنا" دے کر بیٹھ جائے بچے گھیراؤ کر لیں تو کاتب بھی اپنے گھر "بھوک ہڑتال" کر دیتا ہے مگر زیادہ معاوضہ مالک سے نہیں مانگتا۔ چاہے "مرن برت" کی نوبت آجائے۔ کاتب تقدیر کی کتابت پر مکمل یقین رکھتا ہے "جتنا تقدیر میں لکھا ہے مل رہا ہے پھر کیوں فکر کریں" اس کا نظریہ ہے۔ کراماً کاتبین اس کی "سہو کتابت" سے خوفزدہ ہوتے ہوں گے۔ کہیں یہ عادت ان فرشتوں میں بھی نہ آجائے۔

افواہ ہے کہ دوسرے جنم پر یقین رکھنے والوں کا ایمان ہے کہ کاتب مرنے کے بعد "کراماً کاتبین" بن جاتے ہیں۔

غزل

کلیم بیدکی

بچی کو جہیز میں میسری ہر چیز دیا ہوں
بھولے سے میں سمدھی کا کفن بھول گیا ہوں

سمدھن کا تقاضا ہے کہ گھر بن کے نیا دو
موزوں کسی مرگھٹ میں جگہ دیکھ رہا ہوں

موٹر کیلئے بول رہے ہیں وہ مگر میں
ڈولہ کسی مسجد سے منگا بھیج رہا ہوں

سب کچھ دلہن دیکر مجھے دینا ہی پڑا ہے
بیٹی کو جنم دے کے گنہ میں جو کیا ہوں

حسرت ہے کلیم آج بھی اس قوم کا اپنی
آئینہ کردار میں منہ دیکھ رہا ہوں

ہزلیں

ٹھوکر۔ بھدرکی

بچے کو اس لئے کوئی عزت ملی نہیں
برتن نہیں ہے گھر میں مرے دیگچی نہیں

بیٹی کو چھوڑ کر جو چلی جائے اپنے گھر
ایسی بھی میری ساس کی عادت بری نہیں

کل رات مارتی مری بیوی مجھے ضرور
قسمت سے عین وقت پہ بجلی گئی نہیں

دن ہو کے رات تم چلے آتے ہو بے دھڑک
یہ گھر مرا ہے، شہر کی ڈسپنسری نہیں

کیا سو رہا ہے ساقی، میخانہ چین سے
کیوں آج بادہ خوار وں میں آگ لگی نہیں

ٹھوکر یہ رکھ کے دل مرا کہنے لگا ضرور
بیمہ ترا نہیں کہ کوئی پالیسی نہیں

ٹھوکر بھدرکی
معرفت: نادر واحد کو: کچہری بازار۔ بھدرک

روز ہم کو دودھ انڈا چاہیئے
ہر برس بیوی کو بچہ چاہیئے

ہو نہ گر لیلےٰ تو مجھ کو دوستو
کوچۂ لیلےٰ کا کتا چاہیئے

پا بہ سینڈل ہو اگر کوئی حسیں
اس سے پھر آگے نہ بڑھنا چاہیئے

دال روٹی ہو میسر یا نہ ہو
گھومنے پھرنے کو رکشا چاہیئے

عشق بازی لازمی ہے اسلیئے
کچھ نہ کچھ بدنام ہونا چاہیئے

بات ٹھوکر جو نہ آئے راہ پر
اس کو ٹھوکر لات جوتا چاہیئے

بچہ

لڈو، بلی اور نہ پیڑا چاہیئے
شیر، ہاتھی اور نہ گھوڑا چاہیئے
ایک (ٹاٹا) کہہ رہا تھا باپ سے
مجھ کو آتا جان "بیٹا" چاہیئے

اُن ممّہ۔ بیجنگی

م۔ ق۔ انور
جمشید پور

خیالوں کے سائے

اپنے آپ سے سوال کرنا اور پھر اس کا مناسب جواب دینا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن کبھی کبھی انسان خود سے سوال کرنے کے بعد اپنے آپ کو مناسب نہیں تو کم از کم تسلی بخش جواب ضرور دے لیتا ہے۔ لیکن یہ جواب بھی چند لمحے کے لئے تشفی دے سکتا، ہمیشہ کے لئے نہیں۔ اور کبھی کبھی وہ جواب اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ اس میں الجھے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جیسے کیا تم شادی کرو گے — ؟ کیوں نہیں اس میں رکھا ہی کیا ہے، شادی سبھی کرتے ہیں، لیکن کب — ؟ ابھی تو میرے اکیس ہی برس ہوئے ہیں آج کل تو لوگ چالیس برس میں شادی کرنے کو اپنی شان سمجھتے ہیں۔ اچھا تو انیس برس بعد — لیکن کس طرح میں اکیلے تو کھا پی نہیں سکتا کبھی کبھی فاقوں سے بھی دوستی کرنی پڑتی ہے۔ ڈیڑھ سو روپے کما لیتا ہوں۔ جس میں بیس روپے کے کاغذ آجاتے ہیں جس پر کہ میں کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ پچیس روپے رسالوں کو کہانی بھیجنے میں خرچ ہو جاتے ہیں کیونکہ کہانی بذریعہ رجسٹری بھیجی ہوتی ہے اور اس کی دوسری کاپی تو میں کرتا نہیں جس پر کہانی لکھا، وہی بھیج دیتا ہوں خیر یہ تو ہوئی کہانی کی بات، اس کے بعد باقی بچے روپے میں سے پندرہ روپے دھوبی سر پر سوار ہو کر لے جاتا ہے، پانچ روپے کے صابن آجاتے ہیں پانچ روپے کے تیل تین روپے کے منجن، سات روپے کبھی کبھی فلم دیکھنے کے لئے RESERVE رکھنا پڑتا ہے۔ باقی بچے ستر روپے — تو یہ بیوی پر قربان کرنا ہوگا۔ کیا کروں کوئی اچھی نوکری تلاش کروں یا کتاب چھپواؤں — ؟ لیکن میری کتاب پڑھے گا کون۔ رسالے والے تو کہانی واپس بھیج دیتے ہیں ایک تو کاغذ خرچ کروں اور بھیجنے کے لئے لفافے اور جواب کیلئے جوابی لفافہ رکھوں اور کافی انتظار کے بعد جب کوئی لفافہ آئے جس پر میرے ہاتھ کا پتہ لکھا ہو۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ جواب ہوگا لیکن کہانی واپس ہی مل جاتی ہے۔ اب تک قریب قریب ایک بورا کہانی واپس آچکی ہے اب سوچتا رہا ہوں یہ بورا تو جب بھرنے کو ہے دوسرے بورے کی قیمت تین روپے سے کم نہیں تو کیا میں منجن ایک مہینے کے لئے بند کر دوں تو دانت کالے ہو جائیں گے منہ سے بدبو سی آئے گی۔ نہیں یہ سب بیکار کام ہے ایک وقت کھانا بند کر دوں یا چائے پینا بند کر دوں، کیا کروں — ؟ کھانا بند کرنے سے تو پانی پر قناعت کرنا پڑے گا۔ تو کیا ایک مہینہ نہانا بند کر دوں؟

کیا ہرج ہے جاڑا تو ہے ۔ نہیں نہاؤں گا تو کیا ہوگا کالا ہو جاؤں گا ' نہیں کالا بھی کہیں کالا ہو سکتا ہے البتہ گورے کے منہ پر کالک لگ سکتی ہے ' ہاں یہی ٹھیک رہے گا ۔ لیکن میری عادت سی بن گئی ہے ۔ صبح اٹھتے ہی نہانے کو جی چاہتا ہے ' تو کیا کروں ' پورا نہیں خرید وں گا ' لیکن میں اپنی کہانی رکھوں گا کہاں چلو آج دیکھا جائے وہ جو کونے میں کالے رنگ کا بکس پڑا ہے اس میں کیوں نہ رکھ دیئے جائیں ۔ ہاں ہاں یہی ٹھیک رہیگا ۔

لیکن میں تو یہ نہیں سوچا تھا ' تو کیا سوچا تھا ـــ ؟ شادی ' او ہو شادی میں ابھی کتنا عجیب ہوں شادی سوچتے سوچتے بکسے تک پہونچ گیا ـــ ہاں تو ٹھیک ہے شادی بکسے میں بند کر دوں ۔ نہیں میرا مطلب ہے کہانی جو واپس آئے گی اُسے بکسے میں رکھوں ـــ لیکن ابھی سوچنے سے کیا فائدہ ۔ جب کہانی واپس آئیگی تب دیکھا جائے گا ـــ یہ کیا ۔؟ میں نے تو شادی کے متعلق سوچا تھا یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت تھی تو شادی کروں ـــ ؟ اسے دیکھا جائے گا جب وقت آجائیگا اب دیکھئے شادی سوچ رہا تھا کہ بکسے تک پہونچ گیا ۔ اس لئے ناکہتا ہوں سوچنا نہیں چاہیئے ۔ اب کبھی نہ سوچونگا ۔ لیکن نہیں سوچنے سے کہانی کیسے لکھوں گا ۔ بغیر سوچے بھی کہیں کہانی لکھی جاتی ہے ' اچھا تو سوچونگا اس میں ہرج کیا ہے سوچنے میں پیسے تھوڑے ہی لگتے ہیں جو مجھے منجن صابن یا کھانا بند کرنا پڑے اب بتایئے تو کھانا چھوڑا نہیں جا سکتا ' ہاں ایک حالت میں ' کبھی کبھی سردی لگتی ہے تو رضائی سے نکلنے کا دل نہیں کرتا ۔ لگتا ہے سوتے رہوں لیکن جب بھوک نام کی کوئی شئے آواز دیتی ہے تو اس کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑتا ہے ۔ خیر یہ تو ہوئی کھانے کی بات کہ کوئی کھانا چھوڑ نہیں سکتا اور نہ کسی نے کبھی کھانا چھوڑا ہے ایک دن نہیں کھائے تو کوئی بات نہیں لیکن مہینے دو مہینہ کھانا چھوٹنے سے تو اُلٹے دنیا خود چھوڑ دیتی ہے ۔ اچھا تو میں کھانا چھوڑ دوں گا دیکھتا ہوں دنیا مجھے کیسے چھوڑ دے گی میں اس کو پکڑ کر رکھوں گا ۔ کیا ہم سے بھی طاقتور ہے دنیا ـــ ؟ لیکن اتنے پتلے پتلے بازوؤں سے میں دنیا کو کس طرح پکڑ دوں گا ۔ تو کیا کسرت شروع کر دوں ۔ کیوں نہیں ' اس میں کیا بات ہے صبح اٹھنا چاہیئے ' چار بجے اور کر دینا چاہیئے کسرت شروع ۔ لیکن یہ کیسے ہوگا رات ایک بجے تک لکھوں تو صبح چار بجے کیسے اٹھوں گا تو مجھے گھڑی میں الارم لگا دینا چاہیئے ' یہی بہترین علاج ہے ۔ ہمارے نانا کہتے تھے کہ میں صبح تین بجے ہی اٹھ جاتا تھا ۔ الارم کے ذریعہ ۔ جہاں تین بجا ٹران رن ۔ بجنا شروع ۔ ہاں تو یہی ٹھیک رہیگا الارم لگا دوں لیکن میرے پاس گھڑی ہے کہاں ۔ تو آج گھڑی خرید لوں کتنے میں ملتی ہوگی ؟ یہی کوئی پچاس ساٹھ روپے میں ' تو پچاس ساٹھ روپے آئیں گے کہاں سے ـــ ؟ کیا نہانا دھونا ' تیل لگانا سب چھوڑ دوں ' یہ کیسے ہوگا تب تو مجھے خود دنیا چھوڑنا ہوگا ـــ ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ مجھے کیا غرض اٹھنے سے میں تھوڑے ہی کوئی مرغا بانگ دیتا ہوں کہ صبح ہوئی نہیں کہیں سے ڈھینچوں ڈھینچوں ککڑوں کوں اور کائیں کائیں شروع ۔ ارے میں نے ابھی کہا تھا نا کہ اب نہ سوچونگا ۔ قسم خدا کی ـــــــ

یہ قسم بھی کیا چیز ہے کوئی کسی کی بات نہیں مانے تو کہتے ہیں قسم خدا کی ' میں نے یہ کام نہیں کیا اور مخاطب نے یقین کر لیا یا قسم تمہاری ' قسم زمین کی ' قسم تمہارے سر کی ' باپ کی قسم ' بیٹے بیٹی کی قسم ' بیوی کی قسم ' قسم "قسم" کی ۔ آخر یہ قسم ہے کیا ۔ مجھے تو قسم کی قسم ہی نہیں معلوم ۔ تو میں کیوں کھانے لگوں قسم ـــ یہ کوئی کھانے کی چیز تو ہے نہیں اگر کھانے کی چیز ہوتی تو اس کو کھا کر کم از کم پچاس ساٹھ روپے کے خرچ کو بچا لیتا اور اس سے خرید تا ایک الارم گھڑی ـــــ ارے پھر سوچنے لگا میں کہتا ہوں اب نہ سوچوں گا یہ صرف وقت کی بربادی ہے جب دیکھو بغیر مطلب سوچ رہے ہیں میرے خیال میں کوئی سوچنے کا بھی وقت ہوتا ہوگا کیوں کہ وقت تو سب چیز کا ہوتا ہے کھانے کا وقت ' سونے کا وقت ' زندگی کا وقت ' ہنسنے کا

وقت، نماز پڑھنے کا وقت، پوجا کرنے کا وقت، روزہ رکھنے کا وقت، بھوک ہڑتال کا وقت، یہاں تک کہ وقت کے آنے جانے کا بھی وقت ہوتا ہے تو کیا سوچنے کا بھی وقت ہوتا ہے کون سا وقت ہوگا — ؟ صبح پانچ بجے۔ نہیں اگر پانچ بجے سوچنے کا وقت ہوگا تو میرے لئے سوچنا بے کار ہے کیوں کہ میں پانچ بجے اٹھ نہیں سکتا۔ تو کیا اٹھ کر سوچنے کے لئے الارم گھڑی خریدوں، بہت دام ہے پچاس روپے۔ اب پچاس روپے آئیں گے کہاں سے۔ کسی سے سیکنڈ ہینڈ لے لوں۔ میں پھر سوچنے لگا یہ کیا سوچنے کی بیماری ہے۔ واقعی اگر کوئی بیماری ہے تو مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیئے نہیں تو میں اندر اندر کمزور ہو جاؤں گا تو کیا جاؤں ڈاکٹر کے پاس — ؟ لیکن، کیسے ڈاکٹر تو پانچ چھ روپے سے کم لے گا نہیں تو کیا کروں، ایک ہفتہ نہاؤں نہیں اس کے بعد جاؤں ڈاکٹر کے پاس — لیکن تب تک تو میں اور بیمار ہو جاؤں گا تو کیا کروں — ؟ کھانا بند کردوں نہیں کھانا بند کرنے سے تو میں دبلا کمزور ہو جاؤں گا۔ ہڈیاں دکھنے لگیں گی۔ جس کو چھپانے کے لئے ڈاکٹر پچیس روپے مانگے گا تو پچیس روپے کہاں سے لاؤں۔ اس کے لئے تو مجھے دس دن تک کھانا پینا بند کرنا پڑے گا یا پھر کہانی لکھنا اور بھیجنا بند کرنا ہوگا۔ لیکن یہ تو میں بند نہیں کر سکوں گا کیوں کہ یہ ضروری فعل ہے کم از کم میرے لئے — کیا کروں کوئی مفت ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔ لیکن مفت ڈاکٹر ہے کون۔ تو کیا میں بیمار ہوں۔

ایسے میں پھر سوچنے لگا نا میں بیمار کہاں ہوں۔ یہ بے موقع سوچنا ٹھیک نہیں ہے میں وعدہ کرتا ہوں اب نہیں سوچوں گا۔ کم از کم ایک سال کے لئے۔ اور کہانی لکھوں گا۔ لیکن کہانی کیسے لکھوں گا بغیر سوچے — میں تو سوچنا بند نہیں کروں گا — تو — — — — — . .

شادی —— ہاں ہاں شادی میں نے پہلے شادی ہی سوچا تھا کہ شادی کر لوں اور پھر سوچنے کا کام بیوی کو دے دوں۔ اور خود بیٹھ کر کہانی لکھوں۔ لیکن کس طرح وہ سوچے گی اور میں کہانی لکھوں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے — میں بھی کتنا عجیب ہوں اول فول سوچنے لگتا ہوں، اچھا تو شادی نہیں کروں گا۔ ابھی تو میرے اکیس ہی سال ہوئے ہیں اور انیس سال بعد میں شادی کے لائق ہو جاؤں گا۔ تب سوچوں گا — ارے ابھی دو بج گئے ہیں کب سے سوچ رہا تھا اب ڈاکیہ بھی کہانی واپس لے کر آتا ہوگا اور کہانی ڈراپ بھی کرنی ہے اور کہانی لکھنا بھی ہے یہ اتنے سارے کام اور شادی — یا خدا یہ کیسی بلا ہے ابھی تو انیس سال باقی ہیں۔ کم از کم انیس سال تو چین سے جی لیں، پھر کروں گا شادی۔ دیکھا جائے گا۔

▲ ▲ ▲

بے تکلّف مہمان

جوہر سیوانی

بے تکلف جو ہے مہمان وہ ہے دشمن آپ کا
آگیا تو پھر کبھی لے گا نہ وہ جانے کا نام
جیسے دیمک دھیرے دھیرے چاٹ جاتی ہے درخت
آپ کے بستر پہ سو جائے گا اطمینان سے
وضعداری آپ کو خاموش رکھے گی مگر
ناشتے میں آپ تو کھائیں گے سوکھی روٹیاں
اُٹھتے ہی بستر سے پہلے اس کو بیڈ ٹی چاہیئے
تیل، اسنو، پاؤڈر بھی آپ دیں گے بعد غسل
بکس سے لے کر پہن لے گا وہ کپڑے آپ کے
آپ کی بیگم کو خوش رکھنے کی خاطر صبح و شام
آپ کی بیوی سے اکثر وہ کرے گا ہنس کے بات
آپ پکچر دیکھنے جائیں گے جب بیگم کے ساتھ
رشتہ داروں کا بھرے گا کان اس انداز سے
ہے جو ناشکرا تو اس میں چھید بھی کر جائیگا
رہتے رہتے رہ گیا وہ تین ہفتے بھی اگر
آئے دن فرمائشیں اس کی بنیں گی جان کا روگ
آپ ہوتے جائیں گے کنگال پھنس کر جال میں
دُم دبا کر بھاگ جائے گا وہ گھر سے بن کہے
جاتے جاتے ایک دھکا اور دیتا جائے گا
کچھ کتابیں، کچھ رسالے بھی اُڑا لے جائے گا

وہ تو آتے ہی نکالے گا پلیتھن آپ کا
جیسے ہو میراث ہی اُس کی گھر آنگن آپ کا
ویسے ہی وہ صاف کر جائے گا راشن آپ کا
اور لگائے گا وہ مکھن کھل کے مکھن آپ کا
فکر سے پیلا پڑے گا روئے روشن آپ کا
اور وہ کھایا کرے گا حلوہ سوہن آپ کا
پھر اُٹھا لے گا وہ بڑھ کر دانت منجن آپ کا
اُوب جائے گا یہ نخرے دیکھ کر مَن آپ کا
اور منہ دیکھا کرے گا لے کے درپن آپ کا
دیگا جھاڑو گھر میں اور دھوئے گا برتن آپ کا
قہقہوں سے روز ہی گونجے گا آنگن آپ کا
ہو چلے گا وہ بھی شامل پکڑے دامن آپ کا
آپ سے ہو جائے گا بھائی بھی بدظن آپ کا
کھائے گا جس تھال میں کھانا مرغن آپ کا
آپ کے گھر کو بنا دیگا وہ مدفن آپ کا
اور کر ڈالے گا وہ جینا اجیرن آپ کا
گھُن کی صورت چاٹتا جائے گا وہ دھن آپ کا
مفلسی آ جائے گی جب کرنے درشن آپ کا
اینٹھ لے گا کچھ رقم مہمانِ پُرفن آپ کا
الغرض کچھ بھی نہ چھوڑے گا وہ رہزن آپ کا

دُور رہیے حذر ایسے مطلبی مہمان سے
ورنہ جوہر نرک بن جائے گا جیون آپ کا

اصغر امام آروی
آرہ (بہار)

غصہ

ہنسنے اور رونے کی طرح غصہ بھی ایک فطری اور نفسیاتی فعل ہے جس کا فاعل وقتاً فوقتاً اس عالم خاکی کا ہر ذی ہوش بنا رہتا ہے۔ غصے کی دیوی عمر، رنگ، روپ، مذہب، ملک، مسلک اور پیشہ کے بلا تفریق ہر کسی پر مہربان ہوتی رہتی ہے۔ لیڈر ہو یا شاعر ولی ہو یا شیطان، فلسفی ہو یا عالم، پروفیسر ہو یا ماسٹر، کالج کا اسٹوڈنٹ ہو یا کسی اسکول یا مدرسے کا رٹو منو ہو یا چور گرہ کٹ، آفس کا آفیسر ہو یا ملک کا مزدور، پارلیامنٹ کا ممبر ہو یا اسمبلی یا میونسپلٹی کا ۔۔۔ غرض کہ ہر کس و ناکس پر اس کا حملہ کبھی نہ کبھی ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر حملے کی شدت کی نوعیت کے مطابق ہوتا ہے۔

حکمراں لیڈران کو اپوزیشن لیڈروں پر، شاعر کو شاعری سے بے بہرہ لوگوں پر، ادبا کو رسالوں کے ایڈیٹروں پر، چودھری اور پنڈتوں کو بیچاروں پر، گرہ کٹوں کو خالی جیبوں پر، طالب علموں کو امتحان میں سختیوں پر، وکیلوں کو راست گوئی پر، ڈاکٹر کو صحت مندوں پر اکثر و بیشتر غصہ آتا ہے۔

غصہ رشی منی کا ہو یا شیطان و ولی کا ۔۔۔ اس کے اثرات ہمیشہ منفی یا تخریبی ہوتے ہیں۔ ولی، اولیاؤں کا غصہ تو اول درجے کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو ان کو غصہ آتا ہی نہیں ہے اور اگر آتا ہے تو بس ایک نظر جلا کر خاک کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

غصے کی نوعیت کے مطابق اس کا اثر ذاتی، ملکی اور بین الاقوامی ہو سکتا ہے۔ غصے کے اثر کے یہ حدود اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ غصہ کرنے والا کون ہے۔ اگر غصہ کرنے والا کوئی عام شہری انسان ہے تو اس کا اثر اس کے گھر یا احباب کے حلقے سے زیادہ نہیں۔ اگر غصہ اہل سیاست کا ہو تو اس کا اثر بین الاقوامی ہوتا ہے۔ گھر کی مالکن کے غصے کا اثر ایک Chain Reaction کی شکل میں ہوتا ہے بیگم غصہ ہوں تو اس کا اثر سب سے پہلے صاحب پر پڑتا ہے۔ صاحب اس کا بخار آفس میں بڑا بابو پر نکالتے ہیں۔ بڑا بابو اس کا بوجھ کلرک کے اوپر ڈالتے ہیں، کلرک اس بد گمانی کو اپنے ماتحت پر نکالتا ہے، چپراسی اپنے گھر جا کر اپنی بیگم پر برس کر اس کا اثر ختم کر دیتا ہے۔ گھر کے بچے جب غصہ ہوتے ہیں تو اپنا سارا غصہ کتابوں پر اتارتے ہیں۔

گھر کی مالکن کا غصہ نوکروں پر بڑا ہی رنگ لاتا ہے۔ عموماً اس حالت میں وہ دانستہ غارت کر دیے جاتے ہیں۔ گر اکیلے نہیں جلتے

گھر کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے گھر کے کچھ ساز و سامان کو بھی ساتھ لئے جاتے ہیں اور ادھر شوہر بیچارے کو شام کو مارکیٹ کا طواف کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح بیگم کا غصہ خواہ کسی پر ہو ہدف تیر بیچارہ شوہر ہی بنتا ہے۔

غصہ اور پیار میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہ اکثر ایک دوسرے کے آگے پیچھے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے پیار پر غصہ آتا ہے اور کبھی غصے پر پیار۔ کسی کے غصے پر پیار مرد کا طرۂ امتیاز ہے۔ مرد بیچارہ روزِ ازل سے غصے پر پیار کا پہلو تلاش کرتا آرہا ہے۔ جب کہ آخر الذکر صنفِ نازک کے لئے مخصوص ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ غصے کی تعریف کیا ہے؟ عالموں کے مختلف نظریئے کیا ہیں؟ آیئے ملاحظہ فرمایئے۔

"علم مجبوریات" کی ایک تعریف کے مطابق ــ "جب انسان کچھ نہ کر پانے کی حالت میں ہوتا ہے اور اس وقت جو کچھ کر بیٹھتا ہے وہ غصہ ہے۔"

غصے کی ایک اور تعریف یوں ہے ــ "انسان جس لمحہ خود کو کمزور سے کمزور اور بے بس سے بے بس تصور کرنے کی حماقت کرتا ہے پس اسی لمحہ وہ غصے میں ہوتا ہے۔"

علم الصحت میں غصے کی وضاحت کچھ اور دوسرے شکل میں کی گئی ہے۔ اس کا تعلق آنکھوں سے بتلایا گیا ہے آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اور جس کو عقل تسلیم نہیں کرتی تو ذکاوت و بصارت میں جو بھیانک جنگ چھڑتی ہے، غصہ اسی کا ردِ عمل ہے۔

علم الصحت میں غصے کی وضاحت کچھ اور دوسرے شکل میں کی گئی ہے۔ اس کا تعلق آنکھوں سے بتلایا گیا ہے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اور جس کو عقل تسلیم نہیں کرتی تو ذکاوت و بصارت میں جو بھیانک جنگ چھڑتی ہے غصہ اسی کا ردِ عمل ہے۔

غصے کی مختلف تعریف بیان کرنے کے بعد اس کی تشخیص بھی نہایت ضروری ہے۔ کوئی شخص غصے جیسے موذی مرض کا شکار ہو گیا ہے اس کی آپ تمیز کیسے کریں گے؟ ملاحظہ فرمایئے:۔

پلکیں تنی ہوئی ہوں، آنکھوں کے زاویئے بگڑے ہوئے ہوں۔ نتھنے پھولے ہوئے ہوں، منہ سے نرم و نازک الفاظ کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ ہاتھ حرکت میں ہوں اور ساری چیزیں منتشر کی جارہی ہوں۔ تو آپ یقین جانئے کہ اس پر غصے کا دورہ پڑا ہوا ہے۔

غصے کا کوئی سیزن یا وقت نہیں ہوتا۔ دن ہو یا رات، سردی ہو کہ گرمی، سو رہے ہوں یا جاگ رہے ہوں۔ غصہ کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ سب سے دلچسپ غصہ وہ ہے جو خواب میں آتا ہے۔ خوابیدہ حالت میں انسان انہیں ہستیوں پر غصہ کرتا ہے جن پر وہ حالتِ بیداری میں غصہ نہیں کرسکتا شوہر غریب اپنی رفیقہ حیات پر، آفس کا بابو اپنے صاحب، چھوٹے لڑکے اپنے معلموں پر عموماً خواب کی حالت میں ہی غصہ کرتے ہیں۔

وجوہات غصہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جو بہت سارے کلیئے پیش کئے گئے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ غصہ شکم انسانی میں ایک گیس کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ جو اوپر اٹھ کر دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ اس کلیے کو پیش کرنے والے اس کے حق میں یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ روزہ داروں کو روزہ کی حالت میں ہی سب سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ مگر مارکسی قسم کے نقادوں نے اس نظریئے کو باطل قرار دیا ہے اور یہ توضیح پیش کی ہے کہ بل مزدور بھی تو خالی پیٹ ہی رہتے ہیں مگر اُن کو اپنے مالکین پر غصہ شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ اگر غصہ آتا تو پھر یہ دنیا بھر کے لیبر اداروں کی ضرورت ہی کیونکر پڑتی۔

غصہ ڈاروِن کے کلیہ ارتقائے انسانی کو بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ اگر آپ غصے کا تجزیہ کریں یا غصے سے تپتے ہوئے کسی انسان کا مشاہدہ کریں تو نظریۂ ڈاروِن پر آپ کو ایمان لانا پڑے گا۔ غصے کی حالت میں آنکھوں کی وہ چمک، ویدوں کے بگڑے ہوئے زاویئے سکڑے ہوئے ابرو، حرکت کرتے ہوئے وہ دست و پا اور بہ ترتیب اچھل پھاند۔ یہ سب کچھ آپ کو اس دور کی یاد دلاتے ہیں جہاں سے نظریۂ ڈاروِنی کا ارتقائی سفر شروع ہوتا ہے۔

علیم جہانگیر
اورنگ آباد

کتنے بجے؟

"جب لوگ مجھے اومیکس گھڑی باندھے دیکھتے ہیں تو میں خوشی سے پھولا نہیں سماتا" سری لنکا یعنی سابقہ ریڈیو سیلون سے ہر روز اور بار بار اشتہار سن کر ہمیں گھڑی نہ ہونے کا بے حد ملال ہوا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم سستے بازار سے اُتم کاریگری اور صحیح وقت کی انوکھی شان "ریکو" گھڑی خرید ہی لی "ریکو گھڑی کی ٹِک ٹِک ٹِک" ہمارے "دل کی دھڑکن ٹِک ٹِک ٹِک بن گئی۔

عام روش سے ہٹ کر یعنی "بائیں" ہاتھ کی کلائی پہ گھڑی باندھنے کے بجائے ہم "دائیں" ہاتھ کی کلائی پہ باندھنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا خاطر خواہ فائدہ یہ ہوا کہ جب بھی کسی جان پہچان، دوست احباب یا رشتہ دار سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہم علیک سلیک کے بعد بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی آستین کو ذرا سا اوپر کھسکا کر جھٹ مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیتے جس میں گھڑی کی "نمائش" زیادہ اور "مصافحہ" کی اہمیت کم ہوتی۔ ہمارے مہربان گھڑی دیکھ کر اس کی خوب خوب تعریف کرتے اور ہم بقول ریڈیو سری لنکا "خوشی سے پھولے نہیں سماتے"۔

اس پر بھی اکتفا نہ کرتے ہوئے ہم نے گھڑی کی مزید پبلسٹی کے مدِ نظر اس کی چین اس قدر ڈھیلی رکھ چھوڑی کہ گھڑی ہماری کلائی سے "نتھی" رہنے کے بجائے کسی سردار جی کے "کڑے" کی طرح ہمارے ہاتھ کے مخصوص جھٹکوں سے کلائی میں گھومتی رہتی۔ مزید برآں ہم نے "فل آستین" شرٹ کو "ہاف آستین" شرٹ میں بدل دیا۔ غرض ہم نے ریکو گھڑی کی اتنی پبلسٹی کی کہ شاید ہی اس "کمپنی" نے کی ہو۔

آپ تفریح کے موڈ میں ہوں یا شاپنگ کے بہانے بازار میں گھوم پھر رہے ہوں، ہوٹل یا کسی سینما ہال میں بیٹھے ہوں۔ بس کے انتظار میں یا تھیٹر کے ٹکٹ لائن میں ایستادہ ہوں۔ غرض آپ جہاں کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں ہوں آپ پہ "بھیّا" یا "بھائی جان" کتنے بجے کا بم ضرور پھینکا جائے گا۔ خواہ آپ کے ہاتھ میں گھڑی ہو یا نہ ہو۔

ہم دفع حاجات کی عجلت میں ایک قدم گھر کی دہلیز میں اور دوسرا قدم میونسپل نالی کی فرش پر ٹھیک طرح رکھنے بھی نہ پاتے کہ بارِ سماعت سے یہ صدا ٹکراتی "کتنے بجے" ہم اونٹ سی گردن گھما کر جو دیکھتے تو معلوم ہوتا کسی کے نورِ نظر "گولیاں" کھیلنے سے فراغت پا کر ہم سے مخاطب ہیں۔ ہم جھنجھلا کر کہتے " برخوردار بھلا آپ کو وقت سے کیا مطلب؟" بچہ معصوم صورت بنائے جواب دیتا " اماں جان گھر میں بیٹھی وقت پوچھ رہی ہیں۔"

ایک دفعہ ہم جاڑوں کی یخ بستہ رات میں گرم کپڑوں میں ملبوس ہوٹل میں گرم گرم کافی کی چسکیاں لینے بھی نہ پائے کہ دفعتاً کسی نے پوچھا " آپکی گھڑی میں کیا وقت ہے۔" ہم نے کافی کا مزہ کرکرا محسوس کرتے ہوئے اور کچھ کافی کپڑوں پر گراتے ہوئے بے دلی سے کہدیا " اس وقت ہماری گھڑی میں رات کے نو بجے ہیں۔" یہ سن کر وہ ہمارے مقابل خالی کرسی پر بغیر اجازت بیٹھتے ہوئے کہنے لگے " اوہ تو ابھی کافی وقت ہے " ہم گویا ہوئے " کیا سکنڈ شو دیکھنے کا ارادہ ہے۔" وہ کہنے لگے " جی نہیں! مجھے کاچی گوڑہ جانا ہے اور کاچی گوڑہ کی ٹرین ساڑھے نو بجے پلیٹ فارم چھوڑتی ہے۔" ٹرین کا نام سنتے ہی ہڑبڑا کر ہم نے جونہی گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اس سے قبل کہ ہمارا پول کھل جائے اور وہ ہمیں شریف بدمعاش جان کر پٹائی کر دے ہم بنا رکافی پیئے بل ادا کئے پھر ایسے بھاگے کہ پیچھے پلٹ کر دیکھنا تک گوارہ نہ سمجھا۔

کچھ عرصہ بعد ہم پھر اسی ہوٹل میں چائے نوشی کر رہے تھے۔ ایک صاحب جن کے سامنے چائے کا ٹرے رکھا جا چکا تھا ہم سے مخاطب ہوئے " کیا ٹائم ہے " ہم نے سادہ لوحی سے کہدیا " دن کے دو بجے ہیں۔" ان صاحب نے جھٹ برف منگوا چائے میں ڈال ایک ہی گھونٹ میں ساری چائے پی لی۔ ہم آج تک چائے میں برف ملانے کی وجہ سمجھ نہ سکے۔

ہمیں فلم بینی کا بے حد شوق ہے۔ ہر چھٹی میں ساڑھے گیارہ بجے کا مارننگ شو ضرور دیکھتے ہیں۔ میٹنی شو اس لئے نہیں دیکھتے کہ مارننگ شو سے میٹنی شو تک کا انتظار قیامت کے انتظار سے کم نہیں فرسٹ شو میں بالفرضِ محال اگر ٹکٹ نہ ملے تو گھر لوٹ آنے کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ سکنڈ شو سے ہماری نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے جس دن دفتر کو چھٹی ہو اس سے ایک دن قبل ہم ذہن میں کچھ ایسا ہی پروگرام مرتب کر لیتے ہیں۔ کل چھٹی کا دن ہے گھر سے نو بجے نکل کر خلیل خاں سے ملاقات کریں گے۔ چائے پانی گپ شپ میں فلم کا وقت ہو جائے گا۔ فلم دیکھ کر گھر آ کر آرام کریں گے۔ دوسرے دن ترتیب شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی نیت سے ٹھیک نو بجے گھر سے نکل کر خلیل خاں کے گھر کا رُخ لیتے ہیں چونکہ ہمارا پروگرام خود ساختہ ہوتا ہے جس سے ہمارا دوست قطعی طور پر لاعلم ہوتا ہے جب ہم اس کے گھر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بہ نفسِ نفیس ہمارے گھر چائے پانی بلکہ ناشتے کے لئے صبح روانہ ہو چکے ہیں۔ مجبوراً ہمیں وہاں سے تھیٹر کی راہ لینی پڑتی ہے اور ہم تھیٹر اس وقت جا پہنچتے ہیں جبکہ اس کا پھاٹک تک بند رہتا ہے۔ ہم لاچار پھاٹک پر ہی دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس پھر کیا ہر آنے جانے والا پوچھتے رہتا ہے۔ " ٹائم پلیز " "کیا وقت ہے" "کتنے بجے" "کتنے بجے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ ہم وقت کہتے کہتے اُدھ موئے سے ہو جاتے ہیں۔ بعض تو یہ تک کہتے ہیں " فلم شروع ہونے میں ابھی کافی دیر ہے۔" یہ سُن کر ہمارے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ دوست

کر خیر مقولے تیں سمجھتے ہی ہیں لیکن کئی بار یہ خیال آیا کہ ابھی بلکہ اسی وقت یہیں پہ خودکشی کرلیں تاکہ حکومت فلم کی نمائش ہی بند کر دے مگر ہمیں فلم دیکھنا ہوتی ہے۔ بلکہ ڈھیر ساری نئی نئی فلمیں دیکھنے کی تمنا میں خودکشی کے ارادے سے باز آتے اور ہر پوچھنے والے کو وقت بتاتے۔

ایک دن ہم مسرت میں مگن بازار میں گھوم پھر رہے تھے کہ کسی نے پوچھا "کتنے بجے"۔

ہم نے برجستہ کہا "صبح کے، دوپہر کے، شام کے، آج کے یا کل کے"

"کیا مطلب" ان صاحب نے گرجدار آواز میں کہا۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا "گستاخی معاف کتنے بجے میں زمانے کا تعین مشکل ہے۔ اس لئے ہم احتیاطاً پوچھ رہے ہیں تاکہ آپکو صحیح وقت بتلانے میں کسی قسم کی غلطی کا احتمال نہ رہے" وہ صاحب تو ناک بھوں چڑھاتے آگے بڑھ گئے۔ ہم خراماں خراماں ان کے پیچھے چلے جا رہے تھے کہ پھر کسی نے پوچھا "کتنے بجے" ہم نے اپنا وہی پرانا حربہ استعمال کیا۔ موصوف شرمسار ہو کر کہنے لگے "جی ابھی کے" ہم نے کہا "افسوس کہ ہماری گھڑی اس وقت بند ہے"

ہم دس قدم بھی چلنے نہ پائے تھے کہ ہمارے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی "کتنے بجے"

ہم : "کب کے"

وہ : "کل کے"

ہم : "گزرا ہوا کل یا آنے والا"

وہ : "گزرا ہوا"

ہم : "گزرا ہوا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

وہ : "آنے والا"

ہم : "آنے والا وقت کس نے دیکھا ہے"

ایک دن ہم دفتر میں بڑے انہماک سے فائلوں کے مطالعہ میں غرق تھے۔ اچانک سر اٹھا کر جو دیکھا تو محسوس ہوا دوسرے کرمچاری اپنا اپنا کام سمیٹ کر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ہم نے بھی جھٹ کام بند کر کے گھر کی راہ لی۔ دوسرے دن حسب معمول جب دفتر پہنچے تو ہمارے ٹیبل پر میمو پڑا ہوا تھا جسے پڑھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بات یہ ہوئی جس وقت ہماری گھڑی ساڑھے پانچ بجا رہی تھی۔ اس وقت دوسری گھڑیوں میں دن کے ڈھائی بج رہے تھے اور بابو لوگ انٹرول میں مزے اڑانے جا رہے تھے۔

ہم گھڑی کی شرارت کی سرکوبی کے لئے گھڑی ساز کے پاس جا پہنچے۔ وہ اس کا ایک ایک پرزہ الگ کرتا جاتا اور ہمیں دکھاتے ہوئے کہتا "یہ بال کمان ہے جس میں بال آگیا ہے۔ کمان سیدھی ہو گئی ہے۔ چابی گھس گئی ہے گھڑی میں پانی جانے کی وجہ سے اس کے پرزوں پر زنگ آگیا ہے۔ ڈائیل پر دن اور تاریخ کے ڈائیل خراب

ہو گئے ہیں۔ خدا جانے اور کیا کیا گھڑی ساز ہمیں دکھاتا جاتا اور ہم آنکھیں پھاڑے ہوں، ہاں کہتے دیکھے جاتے۔ گھڑی ساز نے مزید بتایا کہ ہماری گھڑی چونکہ بدیسی ہے اور اس کے پارٹس نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جن کی فراہمی کے لئے اسے ہندوستان کے مشہور و معروف شہروں کے دورے کرنا ہوں گے جس کا سفر خرچ اور بھتہ ہمارے ذمے ہوگا نیز دکانوں کے چکر الگ۔

ہم نے موقعہ غنیمت جان کر اور کتنے بجے کی لعنت سے چھٹکارا پانے کے لئے گھڑی ساز کو گھڑی اونے پونے داموں میں فروخت کر دی۔ اس دن سے ہم نے دوسری گھڑی نہ خریدنے کی قسم میں کانوں کو ککر لگائیں۔

وقت سے باخبر رہنے کے لئے ہر روز سری لنکا سے فلمی نغمہ سننا ہمارا معمول بن گیا ہے۔ جب اناؤنسر یہ اناؤنس کرتا ہے " اس سمے دن کے ٹھیک دس بجے ہیں ہماری دوسری سبھا دوپہر ٹھیک بارہ بجے آرمبھ ہوگی تب تک دل ویر سنگھو پرمار کو آگیا دیجئے۔ " ہم ریڈیو کا بٹن آف کر کے پرمار جی کو آگیا دیتے ہیں۔ اور بیگم سے آگیا لیتے ہوئے چھٹی ہو تو تھیٹر ورنہ دفتر کی راہ ناپتے ہیں۔

بدقسمتی سے اگر کسی دن ہمارے گھر کی بجلی فیل بھی ہو تو ہم ہر پانچ دس منٹ بعد گھر کے صدر دروازے پہ کھڑے ہو کر ہر راہ گیر سے پوچھتے ہیں " کتنے بجے ؟ "

●●

ڈھکن رائچوری

برسات!!

چھوٹے بچے:

برسات آئی بھوتیں نالے ایک ہوئے نالیاں پر نالے
چھوڑیں کو کاغذ کی کشتی کو تھاتیں دیکھے بچے بالے

بچیاں:

گھر کچی بالو سے بنا کو گڑیے بنا کو بسنگڑیاں چھپا کو
نام رکھیں اس کا گھمّاں کھیلتیں چھوریاں مُشیاں مُنا کو

طالب علم:

کئی کوئی موڑ ہوا یہ بارش ایسا لگیا ہے جیسے خارش
پڑھنا لکھنا منڈھا ہوتا ئے کروں میں کس سے جاکو نالش

بیمار:

تھا روگی تھی گرمی لگ کو راتاں بیتے تھے جگ جگ کو
جان توی برسات نے ڈالی ٹھنڈک پہنچا کر رگ رگ کو

شرابی:

چھائی کالی کالی بدلی بدلی دیکھو کو نیت بدلی
پی توں میں بھی تم بھی پی لیو کر کو جا مال ادلی بدلی

کسان:

آئی برسات سے جان میں جان پیروں گا میں جو ہور دھان
آؤ سوب مل نعرہ ماریں جئے جوان ہو جئے کسان

محبوبہ:

بادل گھٹے چھا بہ سے تکتا دیکھے نینان ترسے
تم بیتاں برسات آئے میرے گھر کوں اپنے گھر سے

الھڑ لڑکی:

آیا ساون ڈال کو جھولے سہیلیاں کھاریں بھی پکوڑے
تاناں اُڑا کو پینگاں بڑھاکو دکھ سارا جیون کا بھولے

برہن:

بادل کے سنگ نین بھرآئے کوئل کوکے جی للچائے
سوب کے پریتم گھر آکو ہیں پن کی ایکچ تم نہ آئے

غریب آدمی:

برسات آئی ٹپکا پچ ٹپکا چھت جھک کو گرنے کا کھٹکا
شیر سے اِتا ڈرتا نئیں میں جتا ڈرتا تائے مجھے ٹپکا!

غریب اورت:

ہاتھ دھو بارش پڑیا ہے پیچھا لکڑیاں گیلے چولہا کچا
سوب سُکھوں کی ماں ہے دولت ماں جو نہیں تو باپ ہے بچا

مزدور:

سُن دنا نے برسات آیا مزدوراں کی مزدوری گمایا
جورو بھکی بچے بھوکے کیسے کیا جب کچھ نہ کمایا

نخیری:

بجلی چمکی بادل گرجا رِم جھم رِم جھم بارش برسا
دیکھ کو رُت پیتن کی ڈھکن گھر دن بولی گھر سے نہ جا

چھوٹے کسانوں کا بڑا ہاتھ

آج ہماری معیشت کو خوشحالی کی سمت لے جانے میں چھوٹے کسانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی (ایس ایف ڈی اے) مارجینل کسانوں اور زرعی مزدوروں کی اسکیم (ایم ایف اے ایل) ۔ خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کا پروگرام (ڈی پی اے پی) اور افزائش مویشیان کا پروگرام (ایل پی پی) جو فی الوقت آندھرا پردیش میں زیر عمل آرہی ہیں درحقیقت ان کا بنیادی مقصد چھوٹے کسانوں کی فلاح وبہبود ہے جو زیادہ تر سماج کے کمزور طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔

جنوری ۱۹۷۸ء کے ختم تک چھوٹے کسانوں کی ایجنسیوں کی جانب سے بھرپور امداد کے لیے تقریباً ۶.۵ لاکھ کسانوں کی شناخت عمل میں لائی گئی ہے۔ جن اضلاع میں خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کا پروگرام روبہ عمل ہے ان اضلاع میں ۷۵-۱۹۷۴ء اور ۷۸-۱۹۷۷ء کے درمیان ۲۲.۵۳ کروڑ روپیوں کی تاثرکن امداد پیوست ہوئی ہے۔ نتیجتاً ترقی کی جانب مائل ہماری دیہی معیشت میں چھوٹے کسان کو اہم کردار ادا کرنے کے لائق بنانے کے لیے تالابوں کی تعمیر۔ باؤلیوں کی کھدائی۔ درخت اگاؤ مہم اور دودھیاری مویشیوں کی تقسیم وغیرہ کے کاموں میں حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے۔

محکمہ اطلاعات و

تعلقات عامہ

آندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR: NO. 13/79-79

شفیق الرحمٰن

ڈینیوب

ٹرین کی کھڑکی سے ایک دریا نظر آیا جو گھوم کر پہاڑیوں میں چھپ گیا۔ آگے چل کر پھر سامنے آیا۔ کچھ دور ساتھ دے کر پھر مڑ گیا۔

"یہ کون سا دریا ہے؟" مجید بھائی نے "نہ ہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گذرد" گنگناتے ہوئے پوچھا۔

"ڈوناؤ" جرمن لہجے میں جواب ملا۔

"استروس" یونانی بولا۔

"ڈوناریا" ایک طرف سے آواز آئی۔

ہیمل نے عینک اتاری، ریلوے ٹائم ٹیبل بند کر کے وی آنا کا نقشہ دیکھنے لگا۔

جانتے نہیں یہ وہی مشہور بین الاقوامی دریا ہے، کسی کا ڈونا، کسی کا ڈوناؤ اور ہم سب کا بلیو ڈینیوب؟

ہم تینوں [illegible] کی دعوت پر وی آنا جا رہے تھے۔ اس نے تاکید کی تھی کہ ضرور بالضرور آنا، اگر کوئی بہانہ کیا تو [illegible] نہیں ہو گا۔ [illegible] بیالیس کا پلا ہوا نوجوان تھا جس کا پورا نام اتنا مشکل تھا کہ لندن میں مجید بھائی نے اسے ڈلبر کہنا شروع کر دیا۔ وہ کئی برس سے نفسیات کا مطالعہ کر رہا تھا اور بڑی تیزی سے گنجا اور موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح دوسری شادی ہو جائے۔ ورنہ پھر پہلی بیوی ہی سے صلح ہو جائے۔ اخباروں میں [illegible] کی خبریں پڑھتا، تو ٹھنڈی آہ بھرتا۔ "دیکھا، پھر کوئی خوش نصیب اپنے محبوب کو بھگا کر لے گیا [illegible] ایک دفعہ بھی تو یہ خوشگوار تجربہ نصیب نہیں ہوا۔"

مجید بھائی دلجوئی کرتے "ڈلبر، جی برا نہ کرو۔ ہم جو تمہارے ساتھ بھاگنے کو تیار ہیں، بس حکم دو۔"

اپنی پہلی بیوی جو ہانا کے متعلق نہ کبھی اس نے تفصیلاً بتایا، نہ ہم نے پوچھا۔ اتنا سنا تھا کہ دس گیارہ برس پہلے شادی ہوئی تھی اور جو نہی دلبر نے نفسیات کی ڈگریاں لینی شروع کیں دونوں میں علحدگی ہو گئی۔

نفاست پسند، خوش پوشاک، ہنس مکھ مجد ہی کو ہم حیات "مشرقی موسیو" کہا کرتے۔ شاعری، راگ رنگ کا یہ دلدادہ، تفکرات کو قریب نہ آنے دیتا۔ اُلجھنوں پریشانیوں پر کندھے ہلا کر کہتا : "دوستو، زندگی اتنی طویل نہیں کہ اُسے معمولی باتوں پر کڑھنے میں ضائع کیا جا سکے"

کلاس میں جب پہلی مرتبہ ہم دونوں اکٹھے بیٹھے، تو دیکھا کہ جہاں سب بائیں سے دائیں کو لکھ رہے ہیں وہاں مجد ہی بڑی تیزی سے دائیں سے بائیں لکھ رہا ہے۔ لیکچر ختم ہوا، تو میں نے اشارتاً امتحان کا ذکر کیا کہ سوالوں کے جواب بائیں سے دائیں یعنی انگریزی میں دینے ہوں گے۔ ہنس کر بولا :

"میں تو ان عالم فاضل پروفیسروں کے بیش قیمت لیکچر سننے آیا ہوں۔ امتحان تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں!"

چنانچہ ہیمل، دلبر اور میں چند امتحانوں کے بعد اے بی سی ڈی کے مختلف حروف حاصل کر چکے تھے، لیکن مجد ہی کو کوئی ڈگری نہ مل سکی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ برطانوی یونیورسٹیوں کو اس کی قابلیت کا اعتراف نہ تھا۔ اس نے کوئی امتحان ہی نہیں دیا، لہٰذا دوستوں کو مجبوراً ایک اعزازی ڈگری (London) M.R.E.S دینی پڑی۔ وہ اب ماسٹر آف رُمبا اینڈ سامبا (لندن) بن چکا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ رقص گاہوں میں وہ رُمبا اور سامبا اس خوبصورتی سے ناچتا کہ پارٹنروں کی قطار بندھ جاتی۔ یہ ڈگری اس کے نام کے ساتھ لکھی جاتی۔ دی آنا کے ہوٹل میں بکنگ کرانے وقت اس ڈگری کو خاص طور پہ شامل کیا گیا۔

وہ پہلے بھی دی آنا ہو آیا تھا۔ دلبر کے بلاوے پہ کہنے لگا "پیشتر اس کے کہ واپس وطن پہنچ کر دفتروں میں فائیل کر دیا جاؤں، کیوں نہ دی آنا کی پرانی یادیں تازہ کی جائیں"

ہیمل انگریز تھا، لیکن ایسا انگریز جس کا پڑدادا جرمن تھا، دادا سوئیٹزر لینڈ سے انگلستان چلا گیا۔ باپ پھر کچھ جرمن نژاد انگریز رہا، مگر ہیمل دوسری جنگ عظیم میں برطانوی فوج میں شامل ہو کر جرمنوں سے لڑا۔ بقول دلبر، جرمن، سوِس اور انگریز ہیمل ایک طرح کا سہ آتشہ بن چکا تھا۔

ہیمل بڑا پریکٹیکل انسان تھا۔ دی آنا پہنچنے سے پہلے اسے ساری ٹرینوں کے اوقات، وہاں کے ہوٹلوں کے کرائے، مقامی زبان کے عام فقرے — سب زبانی یاد تھے۔ اس کے صندوق میں فالتو عینک تھی، روزمرہ کے استعمال کی دوائیں اور فرسٹ ایڈ کا سامان، سفری چیک کچھ بٹوے میں رکھے، کچھ صندوق میں اور بقیہ تھیلے میں — کہ کہیں سارے چیک اکٹھے ہی نہ کھو جائیں۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتا، ہر گزرنے والے اسٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش کرتا، پھر ٹائم ٹیبل دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتا کہ ٹرین ٹھیک چل رہی ہے۔

(۲)

جرمنی کے سرسبز و شاداب جنگل بلیک فارسٹ سے دو دو چھوٹی چھوٹی ندیاں نکلتی ہیں۔ بویریا کے ملک میں ان سے ایک اور ندی آ ملتی ہے جو زرخیز ڈینیوب کو دریلے رائن سے ملاتی ہے۔ ڈینیوب پیچ کھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے جرمن شہر اُلم اس کے کناروں پہ آباد ہے جہاں آئن سٹائن پیدا ہوا۔ یہیں ڈیڑھ سو سال پہلے انسان نے پرندے کی طرح اڑنے کی پہلی کوشش کی۔ ایک درزی نے کپڑے کے پر بنئے اور انھیں باندھ کر اونچے مینار سے چھلانگ لگا دی۔ سیدھا ڈینیوب میں گیا اور اللہ کو پیارا ہوا جہاں دریا جرمنی

سے آسٹریا میں داخل ہوتا ہے وہاں پاسو ہے جو دنیا کے سات حسین ترین شہروں میں گنا جاتا ہے۔ یہاں کیمرے اور مصوری کے سامان کے بغیر آ جاؤ تو لوگ بُرا مانتے ہیں اور بد مذاق سمجھتے ہیں۔ آسٹریا میں شہتوت اور زیتون کے درختوں، انگور کی بیلوں اور اونچی اونچی پہاڑیوں میں سے گزرتا ہوا ڈینوب آخر وی آنا کو چھوتا ہے جس نے اُسے اتنا مشہور کیا ہے۔ آگے چل کر چیکو سلواکیہ اور ہنگری کی سرحد بناتا ہے، پھر مڑ کر قدیم بوہیمیا کے ہرے بھرے مرغزاروں میں سے ہوتا ہوا دو شہروں بودا اور پسٹ کے بیچ میں سے اس طرح گزرتا ہے کہ دونوں مل کر بوڈاپسٹ بن جاتے ہیں۔ ہنگری میں جگہ جگہ شاخوں میں بٹتا ہے۔ یہ شاخیں دوبارہ ملتی ہیں تو نہایت خوش نما جزیرے بنتے ہیں، پھر یوگوسلاویہ کی سرحد آتی ہے اور بلگراڈ۔

وہاں سے ایک خاصا بڑا دریا ساتھ ملا کر مشرقی سمت میں مڑ جاتا ہے اور یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ رومانیہ میں داخل ہوتے وقت اُسے مشہور آہنی دروازے میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کارپیتھین پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں اتنا بڑا دریا سمٹ کر تُند و تیز ندی بن جاتا ہے اور ساٹھ میل تک بڑی تیزی سے جاتا ہے۔ یہ نام ترکوں کا دیا ہوا ہے کیونکہ یہاں جہاز رانی بہت مشکل ہے۔ کئی چٹانوں پہ کتبے کھدے ہوئے ہیں جن میں رومن بادشاہ ٹراجن کی تعریف ہے (ٹراجن کی نیابی) دُور دُور تک ترکوں کے قلعوں کے کھنڈر ہیں۔ غالباً سب سے اونچی بابا کائی کی چٹان ہے۔ ترکوں کے پانچ سو سالہ دورِ حکومت میں بابا کائی شاید کوئی بزرگ ہوں گے جنھوں نے اس چٹان پہ بسیرا کیا ہوگا۔ یہ ان ہی کی برکت ہے کہ چٹان کی ملکیت پہ رومانیہ اور بلغاریہ والے اب تک جھگڑ رہے ہیں یا پہاڑ ختم ہوتے ہیں تو ایک نئی سرحد آتی ہے۔ ایک طرف رومانیہ، ایک طرف بلغاریہ آہستہ آہستہ منزل قریب آنے لگتی ہے۔ پورٹ اسمیل آتا ہے

اور دریا تھک کر بالکل لیٹ جاتا ہے اس کا پانی چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ سارے علاقے کو دلدل میں تبدیل کر کے اتفاق سے ایسے سمندر میں جا پہنچتا ہے جو ہر طرف سے بند ہے سوائے باسفورس کی طرف سے۔

شاید ہی اتنے موڑ پیچ کسی اور دریا میں ہوں۔ اتنے ملکوں کی سرحدیں بنانے کا کام بھی کسی اور دریا کے حصے میں نہیں آیا۔ ان سب ملکوں کی تقریباً چار سو ندیاں اور دریا ڈینیوب سے آ آ کر ملتے ہیں اور ایک نہر کے ذریعہ یہ بحیرۂ اسود کو بحرِ شمالی سے ملا دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے دریا کو قابو میں لانا کس قدر مشکل ہوگا جہاز رانی کے سلسلے میں برسوں کا نفر نہیں ہوتی رہیں اور متعلقہ ملک ایک دوسرے سے جھگڑتے رہے۔

اس کا طویل سفر بڑا دلچسپ ہے کہیں میلوں تک تنہائی ہے تو کہیں رونق ہی رونق۔ کہیں۔ کہیں اونچی اونچی برفانی چوٹیاں کہیں دور دور تک کنول کے پھول، گلاب اور لالہ کے تختے اور ان کی مہک، کہیں چیڑ کے گھنے جنگل، شاہ بلوط اور سفیدے کے درختوں کے جھرمٹ، انگور کی بیلیں، سبز اور خود رَو پھولوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، ہرے بھرے کھیت، پھر خشک پتھریلی چٹانیں اور آخر میں عریض دلدلوں اور تالابوں میں بسیرا کرنے والے بے شمار پرندے۔

یہ دریا بلقان کی سب ریاستوں کی نمائندگی کرتا ہے سوائے یونان اور ترکی کے لیکن کسی زمانے میں یہ سارا علاقہ ترکیہ کا تھا۔ دو قوں یہ ان کا دریا رہا ہے۔

ڈینیوب سے جتنے جرائم، قتل، سازشیں اور فسادات وابستہ رہے ہیں، اتنے ہی شاید کسی دوسرے دریا سے رہے ہوں۔ اس دریا کے کنارے بڑی بڑی جنگیں دیکھی ہے۔ اس طرف والے دریا عبور کر کے اس طرف جا پہنچے

پھر وہ انہیں واپس ڈھکیلتے ڈھکیلتے اتنی دور لے جاتے ہیں کہ خود کہیں اور چلے جاتے یا اگر لوٹتے بھی تو اتنے عرصے میں ملک کا نام بدل چکا ہوتا، آج رومانیہ، ہنگری پر حملہ کر رہا ہے تو کل بلغاریہ، یوگوسلاویہ پر، پھر سمی فائنلز ہوتے۔ آخر میں فریقین کو برابر چھوڑ دیا جاتا اور چند عہد نامے ظہور میں آتے۔ دو تین برس میں لوگ تازہ دم ہو کر پھر تیار ہو جاتے۔ کوئی کسی کو خوامخواہ قتل کر دیتا اور یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔ جب ٹورنامنٹ سے جی بھر جاتا، تو سب بادشاہ، نواب، ڈیوک اکٹھے ہو کر کانفرنس کرتے کبھی ایک ملک کے دو دو حصے کر دیتے جاتے تو کبھی تین کے دو بنا دیئے جاتے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے موریویا اور بوہیمیا کو بیچ سے غائب کر دیا گیا، مقدونیہ کو یوگوسلاویہ میں شامل کر دیا گیا، اُدھر آسٹریا میں چیکوسلواکیہ کو جمع کر کے پھر تفریق کر دیا گیا۔ جنگ عظیم کے بعد سربیا اور رومانیہ بڑھا دیئے گئے۔ بلغاریہ گھٹتا چلا گیا۔

وہ پہیلی یاد آجاتی ہے کہ دریا کو عبور کرنا ہے۔ ایک طرف شیر، بکری اور پوال ہیں۔ پہلے بکری دریا کے پار جائے گی۔ کیونکہ شیر پوال کو کچھ نہیں کہے گا۔ دوسری دفعہ شیر جائے گا اور بکری واپس آجائے گی، تیسری دفعہ پوال جائیں گے، چوتھی [illegible] وغیرہ وغیرہ۔

(۳)

پیرس میں دلبر، مجید اور میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور رات کو ہم دونوں دلبر کو کھینچ کر ایسے محلّے میں لے گئے جسے برائیوں کی رہائش گاہ کہا جاتا ہے۔ جیب کترے، چور، اُچکے، ایک سے ایک عجیب کیرکٹر وہاں رہتا ہے۔ وہاں جانے کا ہمیں تو شوق تھا، دلبر کو گھسایا۔ [illegible] پُررونق جگہیں اور [illegible] چہروں کو تو سب دیکھتے ہیں، زندگی کا یہ پہلو بھی دیکھنا چاہیئے [illegible] میں فلموں میں دیکھ رکھا ہوتا ہے [illegible]

نے ہاتھ جوڑ دیئے، لیکن ہم زبردستی اُسے لے گئے۔ پہلے ایک موسیو نے جو ہمیں آداب پر مختصر سا لیکچر دیا اور بتایا کہ گھڑی، بٹوہ، پاسپورٹ اور نقدی ہوٹل میں رکھوا دینا۔ دو تین سو فرانک سے زیادہ ساتھ مت لے جانا۔ ٹائی کی جگہ گلے میں رنگین رومال باندھ کر، سگریٹ مُنہ میں دبا کر اندر داخل ہونا۔ وہاں خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو، کسی کی طرف مت دیکھنا۔ کوئی لڑکی تنہا بیٹھی ہو تو اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچنا اور رقص شروع کر دینا بیس پچیس منٹ خیریت سے گزر جائیں، تو ایک طرف بیٹھ جانا، لیکن خبردار جو کسی سے کوئی سوال پوچھا۔

ٹیکسی والے نے ہمیں اندھیری سی گلی میں اُتار کر ایک طرف اشارہ کیا اور غائب ہو گیا۔ وہاں ایک زینہ تھا جو نیچے کسی تہہ خانے میں جاتا تھا۔ دیاسلائی جلا کر ہم سیڑھیاں اُترنے لگے۔ سازوں کی گھُٹی گھُٹی صدائیں آ رہی تھیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا، چھوٹی سی کھڑکی کھُلی، ایک چہرہ جھانکنے لگا۔ مجید ہی نے فوراً سگریٹ کا لمبا کش لگا کر سارا دھواں کھڑکی پر چھوڑ دیا دروازہ کھُل گیا اور ایک سُرخ ہونٹوں اور لمبے بالوں والے مرد نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر جاتے ہوئے غور سے دیکھا تو یہ مرد لڑکی نکلا۔ اندر رقص ہو رہا تھا۔ مدھم سی روشنی تھی اور دھواں ہی دھواں۔ موسیقی بے حد ہیجان خیز تھی، مرد، عورتیں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ناچ رہے تھے۔ کئی تو ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوئے تقریباً سو رہے تھے۔ نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مجید نے ایک اونگھتی ہوئی لڑکی کو بازو سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور دلبر کے اوپر ڈال دیا۔ دلبر نپٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجید بھی فوراً ہی کہیں غائب ہو گیا اور تلاش کرنے پر بھی نہیں ملا۔ چہروں کی طرف دیکھنے کی ممانعت تھی، اس لئے نظریں نیچی کر کے ادھر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ رنگین رومال والی [illegible] داڑھی والا آرٹسٹ نکلا۔ دوسرا ایک سگریٹ

بیتی ہوئی لڑکی کی پشت نظر آ رہی تھی، اُسے زبردستی پکڑ کر رقص شروع کیا۔ ایک جگہ سگریٹ کا دھواں ذرا کم تھا، وہاں اس کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے سے کم از کم پچاس خزائیں دیکھی ہونگی اس پر کوئی آرٹسٹ خاصا وقت صرف کر چکا تھا۔ مصنوعی بھوئیں، مصنوعی پلکیں، مصنوعی تل، اصل خد و خال ندارد تھے۔

آدھ گھنٹہ خیریت سے گزر چکا، تو ہم نے حاضرین کا جائزہ لیا۔ ہر شخص کا لباس نرالا تھا، جن مردوں کی ڈاڑھی نہیں تھی، انہوں نے ہفتے سے حجامت نہیں کرائی تھی، تنکرے کی سی آنکھیں، کلائیوں پر پٹیاں بندھی ہوئیں، شوخ رنگ کی قمیضیں، عورتوں کے لباس بے مد چست تھے جیسے پارسل مضبوطی سے پیک کئے ہوئے ہوں بکھری ہوئی زلفیں، خوابیدہ نگاہیں اور تیز خوشبو کی لپیٹیں۔

"اجنبی ہو؟" غالباً پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو۔ ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ اس برادری میں اجنبیوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ویسے مارکیٹ ایکسچنج اور دفتروں میں لوگ کاروبار کے بہانے ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں، یہ بے چارے سیدھے سادے آدمی دوسروں کی جیب کتر لیتے ہیں یا کسی کو پکڑ کر اس کی پونجی رکھوا لیتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ یہاں پہلی بار آنا بڑا خطرناک ہے۔"

"کسی نہ کسی دن تو پہل کرنی ہی پڑتی ہے تم بھی تو کبھی پہلی مرتبہ آئے ہو گے۔"

"اگر انہیں پتہ چل جائے، تو؟"

"تو ہم بھی تیار ہیں، چار پانچ کو تو دیں گے۔"

بوڑھا ہنسنے لگا "تمہیں اپنی محبوبہ سے ملاؤں؟"

اس نے اشارہ کیا۔ پختہ عمر کی ایک فربہ اندام عورت جھومتی جھامتی آئی۔ کسی زمانے میں بڑی حسین ہوگی۔ ہمارے کندھوں پر زور سے دھپ لگا کر چلی گئی۔ میں نے دلبر کو جھنجوڑا کہ تم بھی بوڑھے سے کچھ کہو۔

"تمہاری بیوی خوش مزاج معلوم ہوتی ہے" وہ ڈرتے ڈرتے بولا

"یہ بیوی نہیں، محبوبہ ہے۔ ہم مدتوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں لیکن شادی نہیں کی۔"

"کیوں؟" دلبر ہدایات بھول چکا تھا۔

"اس لئے کہ ہمیں انسانوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین سے چڑ ہے۔ گرجے میں شادی، دفتر میں ملازمت، کھوکھلی مصنوعی سوسائٹی، دوستی کی آڑ میں ایک دوسرے کو دھوکا دینا — یہ سب رواج ہم جیسے انسانوں نے ہی تو وضع کئے ہیں لیکن ان کے باوجود ایک اُچکا دوسرے اُچکے کو کبھی دھوکا نہیں دیتا، نہ پیٹھ پیچھے برائیاں کرتا ہے۔ یہاں زیادہ عورتیں ایسی ہیں جو شادی کے جھنجھٹ میں پھنسے بغیر اپنی مرضی سے مردوں کے ساتھ رہتی ہیں اور بہت خوش ہیں۔ تم لوگ ہماری بنائی ہوئی تصویروں اور مجسموں سے اپنے ڈرائنگ روم سجا کر اپنے آپ کو آرٹ کا عاشق ظاہر کرتے ہو، لیکن دل ہی دل میں ہم سے نفرت کرتے ہو۔"

آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ دلبر نے بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، بڑی مشکل سے اُسے بٹھایا۔

دوسرے کونے میں دو مرد ایک دوسرے کو دھاڑ دھاڑ پیٹ رہے تھے۔ خوب لڑائی ہو رہی تھی۔

"یہ کیوں لڑ رہے ہیں؟" دلبر پھر سوال پوچھ بیٹھا۔

لڑائی یا تو دولت جائداد پر ہوتی ہے یا عورت پر۔ یہاں سب قلاش ہیں اس لئے ایک حسینہ کے لئے لڑ رہے ہیں۔

اور حسینہ بڑے مزے سے تماشا دیکھ رہی تھی، بلکہ مسکرا رہی تھی۔ باقی لوگ اطمینان سے ناچ رہے تھے۔

مہذب لوگ عورت کے لئے لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں، جلی کٹی باتیں، چغلیاں، گری ہوئی حرکتیں — سب حسد و نفرت کرتے ہیں، لیکن مرد، مکوں سے اس طرح فیصلہ

کیا کرتے ہیں۔ بڑھا بولا

خدا کے لئے یہاں سے چلو" دلبر نے میرے کان میں کہا۔

"تم ضرور اخبار پڑھتے ہوگے؟" بڑھے نے پوچھا

"ہاں" دلبر نے جیسے اقبال جرم کیا

"تبھی تمہارے ماتھے پر سلوٹیں ہیں۔ جاپان میں کیا ہورہا ہے جنوبی امریکہ میں کیا ہونے والا ہے۔ قطب شمالی میں کیا ہونا چاہیئے تھا جو نہ ہو سکا۔ مجھے خبروں کی اتنی بھی پروا نہیں اور میرا چہرہ دیکھو۔"

اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی، ماتھا دمک رہا تھا اور چہرے پہ وہ تازگی تھی جو بچوں کے چہروں پہ ہوتی ہے۔

"جو پیدا ہوا ہے، اُسے فقط ایک زندگی ملی ہے" اس نے دلبر کی کمر میں اتنے زور سے دھپ رسید کیا کہ وہ گرتا گرتا بچا"

عجب لوگ ہو تم بھی ناحق غم لگا رکھے ہیں تم نے"

بوڑھے کے قہقہے میں طوفانوں کی تندی تھی

باہر نکلے تو دلبر تھر تھر کانپ رہا تھا

ہوٹل پہنچے تو مجدی ہی نہیں ملا۔ اگلی صبح دلبر کو منانے کے لئے میں اس کے پسندیدہ سگریٹ ڈھونڈھنے نکلا۔ ایک گلی میں تین پُراسرار شبیہیں نظر آئیں۔ بکھرے بال، کپڑوں پہ سلوٹیں، حجامت بڑھی ہوئی چہروں پہ بیزاری اور افسردگی۔ قریب جاکر دیکھا تو ان میں مجدی بھی تھا جو نظریں بچا رہا تھا۔ پوچھا کہ حلیے کو کیا ہوا؟ تو بہلانے کرنے لگا "یا حبیبی ۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔ کیچڑ میں پاؤں پھسل گیا تھا۔

"مجدی، اصلی وجہ یہ ہے کہ ۔ جمال ہم نشیں بر من اثر کرد۔"

"مرحبا، قربانت شویم" اس نے نعرہ لگایا اور بے ساختہ جھومنے لگا۔ "کباب شدیم، سوختہ شدیم، تمام شدیم"

●●

بیڈھب بناری
مترجم : کالیکا پرشاد

نوکر، رحمت یا زحمت

یہ بتلانا بیحد مشکل ہے کہ سوشلزم کا دور کب آئے گا۔ لیکن سوشلزم کا ایک اصول ہر طرف پھیل گیا ہے۔ آج کل نوکروں کا ملنا ناممکن نہیں تو بیحد مشکل ہوگیا ہے۔ نوکر کا مطلب گھر میں کام کاج کرنے والوں سے ہے۔ یوں تو ایڈیٹر یا استاد یا کلرک اتنے مل جاتے ہیں جتنے شمشان میں کوّے۔

کسی زمانے میں نوکر رکھنا بڑے آدمی ہونا یا رئیسوں کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ آج کل نوکر رکھنا ہوشیاری، سمجھداری، خوش اخلاقی، صبر و تحمل، بھلمنسی وغیرہ صفات کا امتحان ہے۔ جن لوگوں میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں وہی نوکر رکھ سکتے ہیں۔ نوکر رکھنا آرٹ ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ پیسے پاس ہوں تو نوکر رکھ لیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ ابھی اس مغالطہ میں ہیں انھیں چوکنا ہوجانا چاہیے۔

جس طرح علم عروض پڑھ کر کوئی کالیداس نہیں ہوسکتا، بانسری رکھ کر بنسی دھر نہیں ہوسکتا، مونچھ منڈوا کر اندر صدر کا بھی کر جواہرلال نہیں بن سکتا! اسی طرح پاس بک کے بل پر نوکر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس کا تجربہ بہت ساروں کو ہوگا۔

میرے دوست اور ہم جماعت تجمل حسین لکھنؤ میں ڈپٹی کلکٹر ہو کر گئے۔ وہاں نیا نوکر انھیں رکھنا پڑا۔ کوئی نوکر دو دن کے بعد چلا جاتا کوئی تین دن بعد۔ وہ بہت گھبرائے۔ ان کی بیوی کو تمام کام کرنے کی مشق نہ تھی پھر چلم بھرتا، تمباکو چڑھاتا کون کرتا؟ جو آدمی ذرا اس سے ایک آدھ کام سنبھالا لیکن اس کے رنگ ڈھنگ سے پتہ چلا کہ اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ حسین صاحب نے ایک دوست سے شکایت کی ۔۔۔ "ایسا نوکر دلائیے جو ٹک کر کام کر سکے۔" دوست نے دریافت کیا ۔۔۔ "کیا بات ہے؟ کوئی بات ایسی نہ تھی۔" پھر دوست نے کہا ۔۔۔ "آپ نوکر کو کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟" ڈپٹی صاحب نے بتایا ۔۔۔ "نام لے کر پکارتا ہوں۔ اور کیا بابا دادا کہہ کر پکارا جائے؟" دوست نے کہا۔ "یہی سبب ہے۔ لکھنؤ میں نوکروں کو "نواب صاحب" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔" دوست

سے نے ایک نوکر تلاش کرکے بھیجا۔ ڈپٹی صاحب اسے "نواب صاحب" کہہ کر پکارنے لگے۔ "نواب صاحب' جوتا صاف کر دیجئے'۔ نواب صاحب' برتن مانجھ دیجئے'۔ نواب صاحب' بی بی صاحبہ کے پائجامہ میں صابن لگا دیجئے'۔ یہ نوکر کہیں نہیں جائے گا۔ جب تک ڈپٹی صاحب لکھنو میں رہے اس نے ساتھ دیا۔

ایک مرتبہ روٹری کلب میں تجویز پاس ہوئی کہ نوکروں کو "آپ" کہہ کر پکارا جائے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انگریز اپنے بیٹلر کو بھی عزت سے بلاتے ہیں۔

جو لوگ دوبارہ جنم لینے میں ایقان رکھتے ہیں انھیں یہ جاننا چاہیئے کہ پچھلے جنم میں جس نے نیک کام کئے ہیں۔ اسی کو اچھا نوکر مل سکتا ہے۔ میرا ایقان دوبارہ جنم لینے میں ہے اور اسلئے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے جنم میں میں کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ شاید پچھلے جنم میں مرتے وقت بچھیا کی دم بھی نہیں پکڑی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے اس جنم میں کبھی اچھا نوکر نہیں ملا۔ جہاں تک میں نے حساب لگایا ہے آج تک کل ملاکر پینتالیس نوکر میں نے وقفے وقفے سے رکھے۔ علم حساب میں کمزور ہونے کے نلطے دو چار کا فرق اس میں ہو سکتا ہے لیکن زیادہ کا نہیں۔ اس تعداد میں مجھے ہمہ اقسام کے نوکروں کا تجربہ ہوا۔ کسی وقت میں نے سمجھا تھا کہ میں نے کچھ علم ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ تھوڑی عقل بھی ہے معمولی مقدار میں ہی سہی۔ کچھ سمجھنے کی صلاحیت بھی ہے لیکن اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میں سدا غلط فہمی میں رہا۔ اور اس کے اسباب ہیں ـــــ وہ نوکر جو وقفے وقفے سے میرے پاس کام کرتے رہے۔ ان میں کچھ تو ایسے عقلمند تھے جن کا مقابلہ اگر سقراط اور سلیمان کی ہتک نہ ہو تو انھیں سے کیا جا سکتا ہے۔ ان میں کوئی احمق بھی تھا کہنا دشوار ہے ہم لوگوں کے خیال سے احمق ہوں بھی لیکن درحقیقت میں نہیں تھا۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ میری دادی بہ قید حیات تھیں۔ اتوار کا دن تھا۔ اسی دن نیا نوکر آیا۔ پندرہ سال کی عمر رہی ہوگی۔ آتے ہی اس نے بیٹھک میں جھاڑو لگائی۔ پھر رات کے دو پراٹھے تھے اس کا ناشتہ کیا۔ میری دادی کو کسی نجومی نے بتا رکھا تھا کہ اتوار کے دن سورج دیو کو دیکھ کر بارہ لال پھول چڑھایا کیجئے۔ آپ کے بیٹے اور پوتے دراز عمر والے ہوں گے۔ اس نوکر سے انھوں نے کہا ـــــ "جاکر بازار سے بارہ لال پھول لاؤ۔ پیسے گھر میں تھے نہیں۔ ایک روپیہ اسے دے دیا گیا۔ وہ پھول لانے گیا۔ اس دن سے آج تک وہ نہیں لوٹا۔

کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک نوکر آیا۔ ان دنوں میں اپنے آپ اُسترے سے ڈاڑھی بنایا کرتا تھا۔ جرمنی کا اُسترا سارے دنیا میں سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ایک دن صبح جب چہرہ پر صابن لگاکر برش سے رگڑ رگڑ کر کافی مقدار میں صابن کا جھاگ بنا لے کے بعد استرا چلانا شروع کیا۔ ایک انچ کا دسواں حصہ بھی نہیں چلاتا تھا کہ محسوس ہوا کہ آری سے چھیل رہا ہوں۔ نوکر سے پوچھا کہ کیا تم نے اُسترے کو ہاتھ لگایا تھا؟ اس نے جواب دیا ـــــ "نہیں بس دو مسواک ہی اس سے چھیلے تھے۔ میں نے اس سے کہا ـــــ "ڈاڑھی بنانے کے لئے ہے یا مسواک چھیلنے کے لئے؟" اپنی بولی میں اس نے جواب دیا ـــــ میں نے کیا سمجھا تھا کہ آپ کی داڑھی کے بال مسواک سے بھی کڑے ہوں گے۔ جب مسواک چھل گئے "بال نہیں کٹیں گے؟" اس دن سے میں نے سیفٹی ریزر کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دل ہی دل میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ اگر مجھے تو نہیں ہے

ایک اور واقعہ کا تذکرہ کرتا چلوں۔ ایک میرے دوست ہیں۔ اس وقت وہ وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے ازراہِ کرم مجھے ایک نوکر "عطا" کیا۔ گرمی کا مہینہ تھا۔ میں باہر سے آیا اور پانی پینے کو مانگا۔ پانی پی کر گلاس میں نے چارپائی کے پاس رکھ دیا۔ اور لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک صاحب ملنے آئے۔ میں پہنچے ہی جانے والا تھا۔ انھوں نے بھی پانی مانگا۔ نوکر مہاراج نے وہی گلاس اٹھایا اور پانی لے کر پہنچے چلے۔ میری نظر پڑ گئی۔ میں نے کہا "اس گلاس میں میں نے ابھی پانی پیا تھا۔ یہ جھوٹا ہے۔" اس نے بے جھجک جواب دیا "وہ تو باہر کے آدمی ہیں کوئی گھر کے تھوڑے ہیں۔" میں نے گلاس بدلوا دیا۔ اگرچہ کہ اس میں یہ خوبی تھی کہ اپنے پرائے کا بھید سمجھ سکتا تھا۔ اس سے مستقبل میں کارہ ہونے کا امکان تھا۔ لیکن میں دوسرے ہی دن اسے خدا حافظ کہہ دیا۔ میرے پاس واٹرمین کی ایک فونٹن پن تھی جس میں سونے کے دو چھلے لگے تھے۔ اس نے اسے میری بلا اجازت اپنے لئے تحفہ سمجھا اور لے کر چلتا بنا۔

اگر کوئی نوکر جاتے وقت آپ کی سب چیزیں صحیح و سلامت چھوڑ جائے تو ضرور اس کے دماغ میں فتور ہے۔ کسی ڈاکٹر سے جانچ کرانی چاہیئے۔ جب نوکر گھر سے جاتا ہے اور لوٹ کر گھر آجاتا ہے یا تین آنے سیر بکنے والی بھنڈی کا حساب گھر پر تین آنے ہی بتاتا ہے تو مجھے اخلاقیات کی تعریف میں تبدیلی کرنا ضروری ہوگا۔

مجھ سے جب کوئی نوکر بیس روپے اور کھانا کام کرنے کے لئے مانگتا ہے تو میں بجٹ میں تیس روپے اور کھانا سمجھتا ہوں۔ اگر ترکاری اور روزانہ کے بازار میں اس نے دس روپے لئے تو بہت زیادہ نہیں لیا۔ چلتے وقت وہ اس کمی کو پورا کرے گا۔ اگر آپ نے کہیں سونے کے بٹن یا کرتے میں تنخواہ کی رقم یا بیگم صاحبہ نے کان کا ٹاپ ادھر ادھر رکھ دیا ہو اس لئے میں تو نوکر کو چندن اور خود کو پانی سمجھتا ہوں۔ میرا وجود ضرور ہے لیکن ساری قیمت انھیں کی ہے۔ وصف خوشبو سب انھیں کا ہے۔ مالک تو صرف ان کی کامیابی کا وسیلہ ہیں۔

دیہی آبرسانی

محفوظ پانی کی سربراہی آج ہمارے سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اسی لیے آندھرا پردیش میں جاری موجودہ منصوبہ بند ترقیاتی سرگرمیوں کے ضمن میں دیہی آبرسانی کے پروگراموں کی اہمیت پر زیادہ زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس سلسلے کی سرگرمیوں میں شدت پیدا کرنے کی خاطر ۱۹۷۸ء - ۷۹ کے موازنے میں ۷ء۲۵ کروڑ روپیوں کی تاثر کن رقمی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

بوروَیلز کی کھدائی کے کام کو تیز تر کرنے کے لئے آندھرا پردیش اریگیشن ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو ایک کروڑ روپیے فراہم کرنے کی تجویز ہے۔ موجودہ باؤلیوں میں پانی کی مقدار میں اضافہ کی خاطر منتخبہ مقامات پر ایسے تالاب تعمیر کیے جائیں گے جن سے پانی رِس کر باولیوں میں جمع ہوگا۔

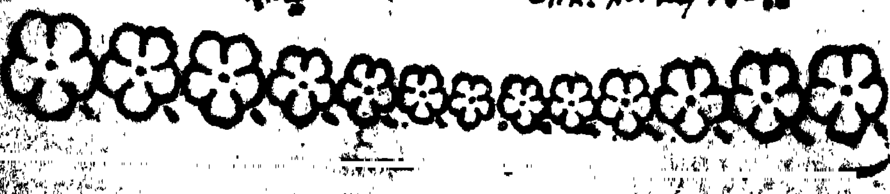
بلاشبہ ان اقدامات سے آندھرا پردیش کے مواضعات میں رہنے والے ہمارے لاکھوں عوام کی ایک شدید اور دیرینہ ضرورت کی تکمیل میں زبردست مدد ملے گی۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش

حیدرآباد

DIPR: No. RO/78-10



[illegible]ات

...راسلے

...ب

...تازہ شگوفہ ملا۔ ڈاکٹر سید...
...مضمون "ڈاڑھی کی یادیں"
...کی جا سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے
...آپ کو قبلہ چہ خوب۔ کا تکیہ کلام
...ان پر مسز چہ خوب کی اچانک
...ہو گیا تھا کہ وہ اپنی جو کڑی
...ہوں شاعر یہ معرکہ نے
...زادے اور پیمانے کو یاد کیا
...چہ خوب نے اپنے تکیہ کلام کو
...شگوفہ کا ڈرامہ نمبر ڈراموں
...ایک مجموعہ ہوگا جس پر آپ کو
...مزید پیش کرنا بے حسی ہوگی۔

اقبال شیدائی، ورنگل

...کے تازہ شمارہ میں ایک
...افسانہ ملا۔ آپ نے طرحی مزاحیہ
...ت کا جو سلسلہ جاری کیا ہے
...کرام کے لئے حوصلہ افزا قدم
...باب کے اضافے کے لئے آپ
...دی کے مستحق ہیں۔
...شگوفہ" میں دو مصرعوں
...کے کلام نظر سے گزرے
...نے اپنے ذوق...

...[illegible]...

مذکورہ رسالہ اپنی خاص خصوصیات کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی جاندار رسالہ میں جو نشتریے، غزلیں اور چٹکلے ہوتے ہیں وہ دوسرے رسالوں میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئیں گے جبکہ وہ اشتہارات کا پلندہ بنا کر ادب کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ ماہنامہ شگوفہ کا وادی میں ایک خاص طبقہ جس دلچسپی اور لگن سے مطالعہ کرتا ہے اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ہمارے کئی قلم کاروں کی بہت سی کہانیاں (مزاحیہ) شائع ہو چکی ہیں جبکہ اس دور میں نئی نسل فیشن پرستی۔ ہیجان، بے شرمی اور جنسی و فلمی رسالوں و کتابوں کی بدولت اپنے بیہودہ خیالات کی نشو و نما اور قیمتی وقت کو ضائع کرنے میں دریغ نہیں کرتے ہیں۔

شیخ بشیر احمد سری نگر

● میں نے آپ کا رسالہ دیکھا، بہت خوب ہے۔ دراصل آپ کی سلیقہ مندی کا مظہر ہے۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو ختم کرنے تک نہیں اٹھا۔ یہ رسالہ دوسرے رسائل سے قطعاً مختلف ہے جس کا ہر صفحہ دلچسپ اور قیمتی ہوتا ہے مجھے امید ہے کہ کامیابی اس رسالے کے قدم چومے گی۔ میری دعا ہے کہ شگوفہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

شکور صدیقی، ...

اداریہ

بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے

شگوفہ پچھلے دو ماہ سے کچھ تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے لیکن اب نومبر کا شمارہ اپنی مقررہ تاریخ پر یعنی نومبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی ملتویہ سالانہ تقاریب ۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۹۷۸ء کو بمقام نمائش میدان منعقد ہوں گی۔ اس موقع پر حسب معمول شگوفہ کا سوونیر شائع ہوگا، یہ دسمبر کا شمارہ ہوگا۔

"ڈرامہ نمبر" اب نومبر کے وسط میں شائع ہوگا اس خصوصی شمارہ کو قطعیت دینے کے لئے مہمان مدیر جناب ساگر سرحدی، پروفیسر ابراہیم ورنگل کے ہمراہ یکم اکتوبر کو حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ ان کے چار روزہ قیام کے دوران میں ڈرامہ نمبر کی قطعی صورت گری ہو چکی ہے۔ یہ خصوصی نمبر شگوفہ کے عام شماروں کے علاوہ ہوگا جو حسب معمول شائع ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے پرچہ کی پابندی اشاعت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ڈرامہ نمبر خریدنے کے خواہشمند سالانہ خریداروں کو رعایتی قیمت پر یہ نمبر فراہم کیا جائے گا۔

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر : سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت : منظور احمد ; حمایت اللہ ؛ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت : راجندر سنگھ بیدی ۔ خواجہ عبدالغفور ۔ نریندر لوتھر ۔ بھارت چند کھنہ ۔ مجتبیٰ حسین

مہمانانِ خصوصی

قیمت : فی شمارہ : دو روپے

سالانہ : (۲۰) روپے

غیر ممالک سے : (۳۵) شلنگ

مطبوعہ :
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد

بائینڈنگ :
محمدیہ بک بائینڈنگ ورکس
روبرو عبادت خانہ حسینی، پرانی حویلی حیدرآباد

★ ترسیلِ زر اور
خط و کتابت کا پتہ :

شگوفہ
۳۱ ۔ مُجرد گاہ ، معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

★
نومبر ۱۹۶۸

جلد (۱) ★ شمارہ (۱۱)

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

شگوفہ کا آئندہ شمارہ سوونیر ہوگا، جو زندہ دلان کی گیارہویں سالانہ تقاریب کے موقع پر ۲۹ نومبر ۱۹۷۸ء کو شائع ہوگا۔

خوبصورت ٹائٹل ، صفحات ۸۰ ، قیمت صرف تین روپے

شگوفہ کی یادگار خصوصی اشاعت

ڈرامہ

اشاعت کے آخری مراحل میں

مہمان مُدیر :

ساگر سرحدی مشہور ڈرامہ نگار و فلم اسکرین پلے رائٹر و مکالمہ نویس

---

۳۰۰ سے زائد صفحات

خوبصورت رنگارنگ ڈسٹ کور

قیمت : =/RS.12 مجلّد : =/RS.15

- سالانہ خریداروں کو یہ یہ خصوصی نمبر ریکارڈڈ ڈیلوری کے ذریعہ =/RS.10 میں اِرسال کیا جائے گا ۔
- مشتہرین حضرات اور سالانہ خریداروں سے خواہش کیجاتی ہے کہ قبل از وقت اپنے آرڈر بک کرالیں ۔

چند اہم ڈرامہ نگار

نکولائی گوگول (روسی)
برتولت بریخت (جرمن)
وسنت آباجی ڈھاکے (مراٹھی)
ساگر سرحدی (اردو)
رتناکر متکری (مراٹھی)
چیایا داتار (مراٹھی)
ستیش آلیکر (مراٹھی)
زاہد حیدر (بنگلہ)
راجہ بندر وکرم (سنسکرت)
دارا روچی (سنسکرت)
پربودھ جوشی (گجراتی)
بلونت گارگی (پنجابی)
نتن سیٹھی (اردو)
قادر خاں (اردو)
بھدراکانت زویری (گجراتی)
گوپال (اڑیا)

ان حضرات کے علاوہ
فضل الرحمٰن ، فکر تونسوی
بلراج ساہنی ، احمد جمال پاشا
اظہر افسر ، وجاہت علی سندیلوی
بھارت چند کھنہ ، شفیقہ فرحت
مقصود علی خاں ، برق آشیانوی
غلام یزدانی ، خواجہ عبدالغفور
غلام جیلانی ، پرویز یداللہ مہدی
سمیع الحق ، خالد عابدی

اور دوسرے
اُردو ڈرامہ کا جائزہ ۔ تصاویر
ڈرامہ سے وابستہ اہم شخصیتوں کے
تجربات اور کئی دوسری دلچسپیاں

راشدہ ثریا
خطیب کاٹیج . سیڈم روڈ ، محبوب نگر

شاعرِ اعظم

ہاں ! میں اسی نام سے اُنھیں مخاطب کیا کرتی تھی۔ اور اسی نام سے مضمون بھی لکھ رہی ہوں۔ محبوب نگر کے ایک مشاعرہ میں میرے والد اسمٰعیل شریف صاحب ازلؔ سے ان کی ملاقات ہوئی تو اس طرح سے تعارف ہوا کہ شاعرِ اعظم کے بھائی میرے والد کے شاگرد تھے۔ اس طرح یہ بھی میرے والد کی شاگردی میں داخل ہو گئے۔ اور جامعہ نظامیہ کا امتحان منشی فاضل کامیاب کیا۔

سو مارچ ۱۹۴۶ء کی ایک شام جب کہ شورؔ عابدی مرحوم نے یہ شعر پڑھا: ؎

ہے عقدِ ثریا کہ عقدِ سلیمان ستاروں کی دنیا میں ایک کھلبلی ہے

تب سے اُنھیں میں جاننے لگی دراصل خطیب خاندان میں کہیں اُن کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ انہوں نے اُس رشتہ کو توڑ کر مجھے اپنایا تھا۔ اور اس طرح اپنے خاندان کی ناراضگی مول لی تھی۔ برسوں بعد اُن کے حسنِ اخلاق اور خلوص سے یہ ناراضگی جاتی رہی۔ اس بارے میں کبھی میں پوچھتی تو کسی کا یہ شعر پڑھتے ؎

کچھ علاجِ دل کریں تو سامنے بیٹھا ہوں میں سب عزیز و اقربا ناحق بُرا کہنے کو ہیں

ہاں ! تو اُس زمانے میں اُن کی شاعری عروج پر نہ تھی۔ اُس وقت کی ایک نظم "پڑوسن" مجھے یاد ہے۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے "پہلی تاریخ" لکھی جو بڑی حد تک خود اپنے گھریلو حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ یہ نظم مشہور ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد "ساس بہو" "چھوراچھوری" "پگڈنڈی" "دکھی عورت کا انتظار" جیسی متعدد نظمیں لکھیں۔ جس کی وجہ وہ حیدرآباد سے باہر بھی مشہور ہو گئے۔ ۱۹۶۶ء میں پہلی بار وہ بمبئی گئے۔ اس کے بعد تو یہ حال تھا کہ جنوبی ہند میں ہی نہیں بلکہ شمالی ہند جیسے دہلی کشمیر وغیرہ سے بھی اُنھیں مدعو کیا جانے لگا۔ مشاعروں کی دعوت قبول کرنے سے پہلے وہ مجھ سے مشورہ لیتے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ ایسا مقام جہاں کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو وہاں کی دعوت قبول کر لیتے۔

اور مجھ سے کہتے کہ آپ جواب لکھ دیجئے نا۔ جب بستر پر نہ ہوں تو میں ہی اکثر خطوط کے جوابات بہت بائیست میں لکھ دیتی۔

جب نظم لکھنا شروع کرتے تو گھر میں اور باہر کئی کئی بار سب کو سناتے۔ اور پوچھتے کیسی ہے؟ — جب مکمل ہو جاتی تو مجھ سے کہتے کہ خوشخط لکھ دو۔

اُن کی نظموں میں یہ فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل ہے کہ کونسی بہتر ہے۔ "پہلی تاریخ" تو تمام متوسط خاندانوں کی پہلی تاریخ ہے۔ اس لئے اگر مجھ سے کوئی میری پسند پوچھے تو میں کہوں گی کہ مخدوم کی پیروڈی "بیچارگی" جو چیز مخدوم کو لکھنا چاہیئے تھا وہ انہوں نے لکھی۔

ابتداء میں مشاعروں میں بڑے شوق سے شرکت کرتے تھے۔ ادھر چار، پانچ سال سے مسلسل خطوط آتے اور اصرار بڑھ جاتا تب ہی دعوت قبول کرتے۔ ورنہ کہتے تھے اب میری صحت ایسی نہیں کہ لمبے لمبے سفر کروں۔ ہائی بلڈ پریشر ہے۔ اگر کبھی دیل میں کچھ ہو گیا تو ـــ؟

جب ناسک کے مشاعرہ میں عامر عثمانی کی موت ہوئی تو وہ بہت گھبرا گئے۔ کہنے لگے میری موت بھی ایسی ہی ہوگی۔ تب سے میں انھیں مشاعروں میں جانے سے روکتی۔ اس پر بھی میری اور اپنی مرضی کے خلاف چلے جاتے تھے۔ کیونکہ لوگوں کا کہنا تھا آپ کے بغیر ہمارا مشاعرہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ آپ ہی ہماری بزم کی رونق ہیں۔ یہ بات بھی یہی تھی۔ ہر مقام پہ مشاعرہ کی کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر رہتا۔ اس کے علاوہ گھریلو حالات بھی مشاعرہ پڑھنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ مشاعرہ سے واپسی پہ افرادِ خاندان کو تمام روئداد سناتے۔ ہر بچے سے گھر کی تفصیلات لیتے، ڈاک دیکھتے۔ فلٹر ہیڈس جاتے۔ اور اپنے غیاب میں پانی کا انتظام کیسا رہا پوچھتے؟ تب کہیں کھانا کھاتے لاکھ میں کہوں پہلے آپ منہ ہاتھ دھوکر کچھ آرام کیجئے مگر نہیں مانتے۔ اُن کی ملازمت کے بارے میں اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مشاعروں سے فرصت نہیں تو ملازمت کیا کرتے ہوں گے؟ مگر یہ خیال بالکل غلط تھا۔ مشاعرے پہ جاتے وقت تمام ملازمین کو ہدایت دیتے اور آنے کے بعد سب سے پہلے فلٹر جاکر اپنی غیر موجودگی میں کیا ہوا اُس کی رپورٹ لیتے۔ اچانک رات کے ۱۲ بجے، دو بجے اور کبھی چار بجے اُٹھ کر چیکنگ کرتے اگر کوئی ڈیوٹی پہ ملازم سوتا ہوا پایا جاتا تو گالیاں دے کر اُٹھاتے اور اتنا خفا ہوتے کہ بعض وقت غصّہ سے طبیعت خراب ہو جاتی۔ میں کہا کرتی آپ کو جو کرنا ہے قلم سے کیجئے۔ تاکہ اُن لوگوں پہ اثر ہو۔ گالیوں کا اُن پر کچھ اثر ہوتا نہیں۔ دوسرے آپ کی طبیعت بھی خراب ہو جاتے گی۔ اس کے جواب میں کہتے نہیں بیگم! غریب لوگ ہیں۔ اگر جرمانہ ہو جائے یا معطل ہو جائیں تو کیسے جیئں؟ اپنے سے بڑے آفیسر کے ساتھ وہ ماتحت کی طرح نہیں بلکہ ایک دوست کی طرح رہے۔ ان کا خلوص ہی کچھ ایسا تھا جو ہر ایک کا دل جیت لیتا۔ کبھی بھی کسی کو رنج یا تکلیف نہیں پہنچائی۔ اگر کوئی ان کے خلاف کچھ کہتا تو بڑی ہی خندہ پیشانی سے نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان کے نزدیک غریب اور امیر مساوی تھے۔ اگر کسی غریب کے گھر سے دعوت آجاتی تو کہتے ضرور جانا چاہیئے۔ تاکہ اُس کا دل خوش ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ انجانے لوگ شادی کے

دعوت ناموں میں المنتظرین میں اُن کا نام لکھ دیتے۔ جب دعوت نامہ ملتا تو ہنس کر یہ کہتے: "کیا کرے گا جہاں کم از کم میرے نام سے چار لوگ شرکت کر لیں گے۔ ایسی شادی میں جانے کے بعد وہاں لوگ جو سوالات کرتے کہ آپ کا لڑکی سے یا لڑکے سے کیا رشتہ ہے؟ ایسے سوالات کے جوابات کا مجھ سے مزہ لے لے کر، تذکرہ کرتے تھے۔ اور کبھی کہتے آپ میرے بعد مجھ پر مضمون لکھئے۔ میں سمجھتا ہوں آپ ہی بہتر مضمون لکھ سکیں گی۔

اچھا کھانے اور اچھا کھلانے پر کاربند تھے۔ گلبرگہ میں ان کی دعوتیں مشہور تھیں۔ دعوتوں میں ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین کا خاص اہتمام ملحوظ رکھتے۔ جہاں تک ہو سکے۔ لوازمات زیادہ سے زیادہ پیش کرنے کی کوشش ہوتی۔ دعوت کے دن باورچی خانے کے کئی چکر لگاتے اور ہر چکر میں ایک پکوان بڑھا دیتے۔ میں اُس وقت کافی چڑھ جاتی۔ وہ رات میں آٹھ مدعوین کا ذکر کرتے۔ صبح بارہ کا، اور شام ہوتے ہوتے یہ تعداد بیس ہو جاتی۔ میں اُن کی اس عادت سے بخوبی واقف تھی۔ اور آخری تعداد کا شروع ہی سے انتظام کر دیتی۔

وہ اپنے دوستوں کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ یوں تو سب ہی دوستوں کو اتنا چاہتے کہ ہمیں فرق کرنا مشکل ہوتا۔ وہ کس کو زیادہ چاہتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محمد علی صاحب اور وہاب عندلیب کو بہت چاہتے تھے۔ محمد علی صاحب سے اُن کی دوستی اُس وقت سے ہے جبکہ ابھی انہوں نے سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔ جن دنوں محمد علی صاحب کے قلب پر حملہ ہوا۔ وہ بہت روتے رہے۔ وہاب عندلیب صاحب کے بارے میں کہا کرتے: "وہاب میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میرے لئے جو خلوص و محبت وہاب کے دل میں ہے وہ کسی میں نہیں۔"

اُن کی یہ کوشش رہتی کہ اُن کی طرف سے لوگوں کو کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ لیکن اُن کے اثر و رسوخ کی بناء پر لوگوں سے انہیں بڑی تکلیف پہنچی۔ مثلاً طبیعت خراب ہے اور کوئی کہہ رہا ہے ذرا میری ملازمت کے لئے سفارش کر دیجئے۔ یا میرے لڑکے کو کالج میں داخلہ دلوا دیجئے۔ یا میرا تبادلہ ہو گیا ہے منسوخ کروا دیجئے۔ لاکھ کہتے بھئی میری کون سنتا ہے، مگر لوگ پیچھے پڑ جاتے۔ مجھ سے کہتے لوگ بہت ستاتے ہیں بیگم۔ ناسازیٔ مزاج اور عدیم الفرصتی کے باوجود لوگوں کے کام کروا دیتے۔

وہ اپنی بیوی اور بچوں کو ہمیشہ سے ہی بہت زیادہ چاہتے تھے۔ اپنی صحت سے زیادہ میری صحت کا خیال رکھتے۔ میں نے کبھی اپنے لئے دوا نہیں خریدی وہ خود ہی بہت ساری دوائیں اُٹھا لاتے اور کہتے آپ کمزور ہو گئی ہیں یہ استعمال کیجئے۔ آپ ہیں تو یہ گھر ہے۔ یہ بچے ہیں۔ آپ ہی کو یہ گھر چلانا ہے۔ میرا کیا ہے؟ جب تک میں امریکہ میں رہی ہر امریکہ جانے والے کے ساتھ میرے لئے دوائیں بھیجتے رہے۔ بچوں کو بارش سے زیادہ وقت کھلاتے تھے۔ جب کبھی عید آتی تو بچوں کو دوکان لیجا کر اُن کے حسب مرضی کپڑے دلاتے۔ میں اس کے خلاف تھی یہ عادت بہت خراب ہے بچوں کو ماں باپ کی مرضی پر چلنا چاہیئے۔ آپ اُن کی عادت بگاڑ رہے ہیں تو کہتے "جانے دو بھئی! اب ہم ہی تو اُن کی خواہشات پوری کرنے والے ہیں۔ ہمارے بعد ہمارے بچے

کی خواہشات کون پوری کرے گا۔ دوسرے کہیں اُن کو اپنے باپ کی جز معاشی کا احساس نہ ہو" چونکہ وہ چھ ماہ ہی میں یسیر و یتیم ہو گئے تھے۔ اس لئے اُن کے بچپن کی کہانی بڑی دکھ بھری تھی۔ جسے کبھی کبھی اپنے بچوں سے بڑے دکھ بھرے انداز میں بیان کرتے۔ ہمیشہ اُن کے دل میں یہ خوف رہتا کہ میرے بعد کہیں میرے بچوں کا انجام بھی اسی طرح نہ ہو۔ اس لئے وہ اپنے بچوں کو حتی الامکان خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ میرا ایک بچہ تحسین خلیب پولیو کا شکار ہے۔ وہ تو اُن کا سب سے زیادہ لاڈلا تھا۔ کیونکہ اُس کو بھی اپنے والد کی طرح علمی اور ادبی ذوق ہے جب مشاعرے سے لوٹتے تو اُس کا کام یہ ہوتا کہ ساری ڈاک ایک جگہ جمع کر کے اُن کے سامنے پیش کرے اُس سے اس طرح رائے لیتے جیسے کسی بڑے آدمی سے رائے لے رہے ہوں۔

شاعر ہونے کے ناطے وہ بہت حساس طبیعت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب فلٹر بیڈس کے سرکاری گھر سے تخلیہ کرنے لگے تو میں نے اُنھیں ہرگز اس بات کا پتہ لگنے نہیں دیا کہ کس دن ہم اپنے ذاتی گھر منتقل ہو رہے ہیں۔ کیونکہ فلٹر بیڈس کے ماحول سے، اپنے محلہ سے اور اُس گھر سے اُنھیں اُنس ہو گیا تھا۔ کہتے: "بڑا مبارک گھر ہے بچیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ عزت ملی۔ شہرت ملی، سب کچھ ملا۔ چنانچہ ایک دن ٹرک کا انتظام کر کے تمام سامان ٹرک میں رکھا گیا۔ ٹرک چلنے کو ہی تھا کہ آپ آ گئے۔ باہر ورانڈے میں گم صم کوئی آدھا گھنٹہ بیٹھے رہے۔ میں بولی چلئے دوپہر کا کھانا کھا لیجئے۔ مجھے بہت سارا کام ہے۔ اندر آئے اُس وقت چہرے کا یہ عالم تھا کہ اب رو ہی پڑیں گے۔ کہنے لگے: "آخر آپ جا رہی ہیں؟" میں نے کہا: کیا آفس سے احکام آنے تک رہیں گے؟ خدا کا شکر ادا کیجئے اپنا گھر بن گیا ہے اس گھر میں ہم بیس سال رہے مگر اپنا نہ ہو سکا۔ اور وہ ہنستے ہی اپنا ہو گیا۔ بولے: "ٹھیک ہے" مجھے ہمیشہ سے ہی اپنے ذاتی گھر کی خواہش رہی ہے۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا۔ خدا نے چیونٹی کے لئے گھر بنایا ہے اور چڑیا کے لئے بھی —— مگر ہمارے لئے نہیں۔ جب گھر بن گیا تو مجھے ہر وقت چھیڑتے "چیونٹی کا گھر تو بن گیا۔"

۱۹۷۰ء میں انھیں اسٹیٹ ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۵ء میں گلبرگہ میں "جشنِ خلیب" منایا گیا اور مجموعہ کلام "کبوڑے کا بن" شائع ہوا۔ ان تمام باتوں سے وہ خوش تھے مگر، ساتھ ہی یہ کہتے کہ اب تمام خواہشیں پوری ہو گئیں —— ۱۹۷۷ء میں انھیں وظیفہ ہو گیا۔ وظیفہ کے بعد وہ بہت خاموش رہنے لگے تھے۔ گھریلو حالات بھی ناگفتہ بہ تھے۔ بڑے لڑکے کو بی، کام کئے دو سال ہونے پر بھی ملازمت نہ مل سکی۔ دوسرے لڑکے ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ اور وظیفہ کی کارروائی بھی زیرِ تکمیل ہے۔ ان ہی فکروں کی وجہ سے اُن کی صحت زیادہ متاثر ہو گئی۔

اسی سال جون میں، میں اپنے بھائیوں سے ملنے امریکہ چلی گئی۔ انھیں میری اس کارروائی سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے ویزا ملتے ہی چپ ہو گئے۔ باہر بہت کم نکلتے۔ اور دن بھر لیٹے رہتے۔ اگر میں طبیعت کے بارے میں پوچھتی تو کہتے: "ٹھیک ہوں۔" ان کے اس طرح سے بدلنے پر میں بھی کافی پریشان تھی۔ پھر یہ سوچتی کہ جلد ہی تو لوٹ آؤں گی —— اور انھیں بھی اس کا یقین دلائی۔ امریکہ جانے کے بعد ستمبر میں نے

مجھا کہ میں آنا چاہتی ہوں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟ جواب ملا: "برسوں بعد بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بار بار جانا تو نہیں ہو سکتا۔ مزید چند ماہ رہ کر آئیے۔ میری فکر مت کیجئے۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس قسم کے خطوط مجھے ملتے رہے۔ ابتدا ہی سے انھیں گردوں کی شکایت تھی۔ پھر تقریباً دس سال سے ہائی بلڈ پریشر ہو گیا تھا۔ ذیابطیس بھی تھا گولیاں تو استعمال کرتے تھے مگر ساتھ ہی مرض کو بڑھانے والی چیزیں بھی استعمال ہوتی رہتی تھیں۔ مثلاً سفر کرنا، مسلسل جاگنا، آرام کی کمی اور بد پرہیزی ــــ ۱۵ راکتوبر ۱۹۷۸ء کو اُن پر یرقان کا حملہ ہوا۔ اور گردے بھی اپنا کام بند کر دیتے۔ گلبرگہ کے ڈاکٹر کی رائے کے مطابق انھیں ایمبولنس کے ذریعے گورنمنٹ جنرل ہاسپٹل گلبرگہ سے عثمانیہ ہاسپٹل حیدرآباد لے جایا گیا ایمبولنس میں اُن کے ساتھ میری لڑکی فہیم ثریا۔ لڑکا یامین خطیب اور بھانجا سراج اظہر تھے۔ بچی کہہ رہی تھی کہ ابا بار بار دعا کر رہے تھے: "اے خدا مجھے تھوڑی سی مہلت دے۔" میں سمجھ نہ سکا کہ کیا کہہ رہے تھے۔ میں شکاگو میں تھی کہ شاعر کی علالت کا ٹرنک کال آیا اور میں فوری ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئی۔ روانہ ہوتے وقت ٹرنک کال کی کہ میں آ رہی ہوں فلاں دن پہنچ جاؤں گی۔ کہتے ہیں کہ وہ بہت خوش ہو گئے۔ اور حالت بھی سدھرنے لگی۔ ۱۹ راکتوبر کی شام میں حیدرآباد پہنچ گئی۔ فوری دواخانہ گئی۔ انھیں تکیوں کے سہارے بٹھایا گیا تھا۔ زبان میں لکنت تھی۔ بڑی مشکل سے بات کرتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے: "آپ ہی کے لئے جی رہا ہوں۔" پھر انہوں نے وہ شعر پڑھا جو مجھے ایک بار خط میں بھی لکھا گیا تھا: ؎

آؤ کہ گھر کی فضائیں سلام کہتی ہیں　　　تمام دل کی دعائیں سلام کہتی ہیں

پھر کہنے لگے: "لوگ سمجھتے ہیں اس میں فیض احمد فیض کا خیال ہے مگر لوگوں کو کیا معلوم کہ میں نے یہ کس کے لئے لکھا ہے؟" غرض معلوم ہو گیا اس کے بعد پھر کسی قسم کی بات نہیں کی۔ میں نے مزاج کے بارے میں دریافت کیا تو خاموش رہے۔ صرف مجھے دیکھتے رہے اس انداز سے کہ آنکھوں سے بڑی مایوسی ٹپکتی تھی۔ عیادت کو آئے لوگوں کو کم از کم خدا حافظ تو کہتے مگر میرے لئے انھیں الفاظ نہ ملتے ــــ سب کا خیال تھا کہ میرے آنے سے وہ جلد اچھے ہو جائیں گے۔ مگر ۲۰ راکتوبر سے ان کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ خدا سے انہوں نے جو تھوڑی مہلت مانگی تھی بعد میں سب کی سمجھ میں آ گئی۔

۲۱ راکتوبر شام کے آٹھ بجے جب کہ میں اور میرا لڑکا اُن کے قریب تھے اُن کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی۔ پسینہ جاری ہو گیا۔ اور تنفس بے حد تیز ہو گیا۔ میں بہت پریشان ہو گئی۔ اور اپنے بھائی رفعت اللہ شریف کا جو ہاؤس سرجن تھے انتظار کرنے لگی۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے آیا۔ اُن کی حالت دیکھتے ہی ڈیوٹی میڈیکل افسر کو اطلاع کی گئی۔ نرس نے انجکشن دیا مگر تنفس برابر نہ ہو سکا۔ نو بجے شب آکسیجن دی جانے لگی۔ میں یہ دیکھ نہ سکی۔ اور فوری گھر آ گئی۔ جناب عابد علی خاں صاحب مدیر روزنامہ سیاست کو صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔ صاحب موصوف فوراً ڈاکٹر کے ساتھ پہنچ گئے۔ اور ہر ممکنہ کوشش کی گئی مگر سب لا حاصل ثابت ہوا۔ رات کے ایک بجے وہ مجھے اور میرے بچوں کو اس دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تنہا چھوڑ گئے۔ انھیں اتنا بھی خیال نہ رہا کہ اُن کے بچے اور بیوی جن کی ذرا سی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتے تھے یہ صدمۂ عظیم کیسے برداشت کر پائیں گے؟

یہ کس نے مجھ کو یارب زخم جگر دیئے ہیں　　　آنکھوں کے دو کٹورے اشکوں سے بھر دیئے ہیں

(باقی)

قاضی سراج اظہر بی ایس سی
ایم بی بی ایس (فاضل)

شاعرِ دکن کے آخری لمحات

سلیمان خطیب یعنی میرے عزیز ترین خالو جنہیں میں "خالو ابا" کہا کرتا تھا مجھ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ ویسے بھی یہ ایک عجیب بات تھی کہ ہر کوئی جو اُن سے قربت رکھتا تھا وہ یہی تصور کرتا کہ وہ اُن سے بہت قریب ہے — میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو اُن سے عداوت رہی ہوگی اور اگر ہوگی بھی تو کسی ذاتی بناء پر —

خالو ابا جب فلٹر بیڈس سے وابستہ تھے تو بلاناغہ گلبرگہ والوں کو "موتی مریکا" صاف پانی پلاتے رہے۔ وہ ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس کے مریض تھے۔ ڈاکٹرز انھیں آرام کا مشورہ دیتے مگر شاید ہی انھیں کبھی آرام ملا ہو۔ اُن کی ملازمت کے آخری دِنوں میں جب بھوسنگہ تالاب سوکھ رہا تھا تو رات رات بھر جاگ کر کیچڑ سے پانی چھان کر اہلِ گلبرگہ کی پیاس بجھاتے رہے۔ اُن کی عدیم الفرصتی نے اُنھیں کبھی ایک جگہ بیٹھ کر نظمیں لکھنے کا موقع نہیں دیا۔ راہ چلتے چلتے یا پھر Filteration plant میں یا کسی دورانِ سفر اُن سے شعر ہو جاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا مشاعرہ تھا اور وہ بنگلور جا رہے تھے۔ ساتھ میں، میں بھی تھا۔ دورانِ سفر انھوں نے ایک نظم "ٹیڑھی دوست" کی جگہ اپنی

نے دوسرے دن مشاعرہ میں سُنایا۔ اور خوب چھایا۔ وہ اپنی شاعری کے بارے میں کہا کرتے تھے "یوں تو دہقان اور دیہاتی زندگی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن خود دہقان کی زبان میں نہیں لکھا گیا۔ میں نے کسان کی زبان میں کسان کے گیت لکھے تاکہ بیچارہ اُسے سمجھ سکے"۔

عمر کے ساتھ ساتھ خالو ابّا کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ لڑکیوں کی ذمہ داری پوری کی تو وظیفہ قریب آگیا۔ وظیفہ کے بعد سر چھپانے کو تک جگہ نہ تھی۔ وہ تو اچھا ہوا جشنِ خلیب منایا گیا۔ ایک قطعہ زمین ہاتھ لگی۔ قرض لے کر گھر مکمل کیا گیا لیکن آج بھی یہ گھر نامکمل ہے۔ بس سر چھپانے کو چند کمرے ہیں۔ وہ شخص جس نے زندگی بھر دوسروں کی مدد کی، اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے لوگوں کو ملازمتیں دلوائیں خود اپنے لڑکے کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ آج اُن کا لڑکا بی۔ کام ہو کر بھی بے کام ہے۔ وظیفہ کے بعد مالی پریشانیوں اور خرابیٔ صحت نے آ گھیرا۔ وہ زیادہ مشاعرے پڑھنے سے قاصر تھے۔ بس اِکّا دُکّا مشاعرہ پڑھتے وہ بھی اس لئے کہ وظیفہ کی رقم سے گھر کا خرچ چلنا مشکل تھا۔ ادھر چند دنوں سے انھیں احساسِ مرگ بھی ستانے لگا تھا۔ ہر وقت ناامیدی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی دوران خالہ امی بعض ناگزیر حالات کی بناء امریکہ روانہ ہو گئیں۔ شریکِ حیات کی جدائی نے اُن کے ذہن پر کافی اثر کیا۔ دوسری فکر انہیں اپنے تیسرے لڑکے تحسین خلیب کی تھی جو پیروں سے معذور ہیں۔ مگر کافی ذہین اور ادبی ذوق رکھتے ہیں انہیں سکوٹر پر کالج چھوڑنے جایا کرتے، اور کہتے: "میرے بعد اس لڑکے کا کیا ہوگا؟"

۷ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو حیدرآباد میں کوئی سمپوزیم تھا۔ خالو ابّا جانا تو نہیں چاہتے تھے لیکن چونکہ جناب سری رام شرما اُن کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ اس لئے باوجود خرابیٔ صحت کے انہوں نے مشاعرے کی دعوت قبول کر لی۔ یہی مشاعرہ اُن کی زندگی کا آخری مشاعرہ تھا۔ حیدرآباد میں اُن کا قیام کوئی چار، پانچ دن رہا۔ دورانِ قیام اُن کو ہلکا سا بخار شروع ہو گیا۔ میرے ڈاکٹر رفعت اللہ شریف صاحب نے کچھ دوائیں تجویز کیں۔ اچانک انہیں گلبرگہ آنے کی فکر ہونے لگی۔ لاکھ روکنے پر بھی وہ نہ رُکے۔ شاید اس لئے کہ عرس شریف حضرت خواجہ بندہ نوازؒ قریب تھا۔ گلبرگہ آنے کے بعد انہوں نے مجھ سے بخار کی شکایت کی۔ میں نے میرے ماموں کی تجویز کردہ دواؤں کو ہی جاری رکھنے کہا۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ کہنے لگے کہ بخار جاڑے کے ساتھ آ رہا ہے۔ میں نے دوائیں بدل کر دیں۔ مجھ سے رات میں رُک جانے کو کہا۔ میں راضی ہو گیا اُن کے لڑکے شاہین خلیب بنگلور گئے ہوئے تھے۔ میں رات بھر اُن کے سرہانے بیٹھا کبھی سر دباتا تو کبھی ہاتھ۔ شدت بخار کے عالم میں کہنے لگے: "کیا بات ہے میری بیماری بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے؟" میں نے کہا کچھ نہیں آپ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے، صرف جاڑا بخار تو ہے۔ رات بھر وہ تمام افرادِ خاندان کو یاد کرتے اور اُن کے مسائل پر فکر کا اظہار کرتے رہے۔ رات میں کوئی دو یا تین بجے ایک قئے ہوئی اور تمام دوائیں واپس آگئیں۔

۱۵ر اکتوبر کی صبح جب دو تین بار قئے ہو گئی تو میں نے ڈاکٹر ناصر بن علی کو مشورہ کے لئے بلایا۔ آنکھوں کی تشخیص سے معلوم ہوا کہ خالو ابّا کو یرقان ہو گیا ہے۔ اُن کا بلڈ پریشر نارمل تھا۔ مگر احتیاطاً دواخانہ میں شریک کرنا مناسب سمجھا گیا۔ کیونکہ قئے رُکنے کے نہ رُک رہی تھی۔ جس سے کمزوری بڑھ رہی تھی۔ دن کے کوئی تین بجے دواخانہ گلبرگہ کے ایمرجنسی وارڈ میں انہیں شریک کر دیا گیا۔ شام کے ۵ بجے ڈاکٹر دیسائی آئے اور اُن کا معائنہ کیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ صبح سے انھیں

پیشاب نہیں آیا۔ جس کے لئے انھیں دوائیں دی گئیں رات کے تین بجے صرف تھوڑا سا پیشاب ہوا جو نہ ہونے کے برابر تھا۔

۱۶ اکتوبر کی صبح جب ڈاکٹر ڈیسائی راؤنڈ پر آئے تو انہوں نے مجھے خطرہ سے واقف کرایا۔ اب ان کی حالت پیشاب خارج نہ ہونے سے تشویشناک ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی پوری کوشش کا یقین دلایا اور ساتھ ہی اس بات کی بھی اجازت دی کہ ہم دوسرے ڈاکٹروں سے بھی رائے مشورہ کریں لیکن کوئی دوا ان کی اجازت کے بغیر نہ دی جائے۔ کیونکہ آئندہ اس کے ذمہ دار وہ ٹھہرتے ہیں۔ میں نے خالو ابا کو حیدرآباد لے چلنے کا ارادہ کیا احتیاطاً ڈاکٹر ناصر بن علی سے بھی مشورہ کیا۔ ان کی بھی یہی رائے ٹھہری۔ شام کے کوئی چھ بجے میں ایمبولنس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جناب وہاب عندلیب صاحب، ڈاکٹر ناصر بن علی، فلٹر بیڈز کا عملہ، کچھ عزیز و اقارب اس وقت موجود تھے۔ شام کے سات بجے ہماری ایمبولنس حیدرآباد جانے والی شاہراہ پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ سامنے خالو ابا کو لٹائے میں، میرے والد قاضی احمد صاحب، خالو ابا کی لڑکی شمیم ثریا اور لڑکا یامین خطیب دعاگو تھے۔ خالو ابا تھوڑی تھوڑی دیر سے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے جاتے، اللہ، اللہ کہتے اور پھر منہ پر ہاتھ پھیر لیتے۔ جب کبھی دھچکا لگتا تو خالو ابا کی بے چینی پر ہم تمام تڑپ جاتے اور صحیح سلامت حیدرآباد پہنچنے کی دعائیں کرنے لگتے۔ کبھی میں بے چین ہوکر ایمبولنس سے باہر دیکھتا تو ہر طرف بکھری خاموشی، خالی خالی کھیت، دور دور تک پھیلی پونم کی اداس چاندنی ایسے لگتے، جیسے اپنے عاشق کی صحت یابی کے لئے دعاگو ہیں۔ مجھے خالو ابا کا وہ شعر یاد آنے لگتا ہے

چاند تارے میرے ساتھ آنے لگے
رستے اٹھ اٹھ کو رستہ دکھانے لگے

جب کوئی کار تیز روشنی پھینکتی، فرانٹے بھرتی ہمارے قریب سے گزرتی تو میرے خیالات منتشر ہو جاتے اور میں گھڑی دیکھنے لگتا۔ مصیبت میں کمبخت وقت بھی تو جلدی نہیں کٹتا۔ ہم پر ایک ایک سکنڈ بھاری تھا۔ خدا خدا کرکے ہم دواخانہ عثمانیہ پہنچے۔ وہاں پہلے ہی ڈاکٹر رفعت اللہ شریف اور میرے خالہ زاد بھائی جناب شمس خاں موجود تھے۔ جن کو وہاں عندلیب صاحب نے ہمارے پہنچنے سے قبل ہی ٹرنک کال سے مطلع کر دیا تھا۔

ایڈیٹر سیاست جناب عابد علیخاں صاحب کو سلیمان خطیب کے شریک دواخانہ کرنے کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر بشانی نارائن ماتھر صاحب کو فون کیا۔ جنہوں نے سارے دواخانہ کو متحرک کر دیا۔ خالو ابا کو Acute Medical care unit میں داخل کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اتنے قلیل عرصہ میں بیماری کی اتنی شدت اختیار کرنے پر تعجب کا اظہار کیا۔ ایک ڈاکٹر میرے قریب آیا۔ اور بڑے ہی رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ Alcoholic (میخوار) ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے زندگی میں کبھی انھیں شراب پیتے نہیں دیکھا اور نہ کسی سے سنا۔ اس پر ڈاکٹر نے کہا "مگر یہ شاعر جو ہیں" جواباً میں نے کہا: "انہیں آپ اس چیز سے مستثنیٰ سمجھیں۔

جناب عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب صبح کی اولین ساعتوں میں اپنے عزیز دوست سے ملنے آئے۔ لیکن اُس وقت خالو ابّا نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ یہ دیکھ کر دونوں کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ خالو ابّا کو نہ صرف یرقان ہوگیا تھا بلکہ Acute Renal Failure بھی ہوگیا تھا۔ ان کے علاج میں مشکل اس بات کی تھی کہ گردوں کا اگر علاج کیا جاتا تو کلیجہ پر دواؤں کا بُرا اثر پڑ سکتا تھا۔ پھر بھی علاج شروع ہوا۔ خدا کے فضل سے دوسرے دن ان کی حالت سدھرنے لگی۔ اس روز عابد علیخاں صاحب اور جگر صاحب آئے تو انہیں پہچان لیا۔ رات میں اُن کے بڑے فرزند شاہین خطیب بھی بنگلور سے آگئے۔ رات میں کوئی 300 ml پیشاب خارج ہوا۔ اس روز اوقات ملاقات میں یعنی شام چار بجے سے چھ بجے تک ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ خالو ابّا لوگوں کو پہچاننے لگے تھے اور سب سے ملنا چاہتے تھے اس روز دوپہر میں ایک صاحب جو اُن کی شاعری کے دلدادہ تھے دربانوں سے بچتے بچاتے خالو ابّا تک پہنچ گئے۔ کہنے لگے آج میں عرس شریف گلبرگہ میں شرکت کے لئے جارہا ہوں۔ جانے سے پہلے میں نے سوچا کہ آپ سے ملاقات کرتا جاؤں۔ خالو ابا نے انھیں بیٹھنے کو کہا۔ اور پھر اپنی نظم "دربار خواجہ اللہ اکبر" پڑھ کر سنائی۔ درمیان میں اشعار بھول جاتے تو کہنے لگے۔ میرا حافظہ کتنا کمزور ہوگیا ہے۔ میں کئی نظمیں ایک ساتھ پڑھنے والا اب مجھ میں وہ بات نہیں رہی۔

۹ اکتوبر، خالو ابّا کی حالت میں مزید بہتری ہوئی۔ ڈاکٹرز مطمئن ہوگئے اُس دن انھیں کافی پیشاب آیا۔ جو دوا پیشاب آنے کے لئے دی جارہی تھی وہ روک دی گئی۔ عابد علیخاں صاحب نے خالو ابّا سے کہا کہ یہاں سے صحت یاب ہونے پر انھیں مکمل آرام کے لئے دواخانہ اسریٰ میں رکھا جائے گا۔ جگر صاحب کہنے لگے تمہارا بُرا وقت ٹل گیا۔ بہرحال دونوں بہت مسرور تھے۔ آج ہی ڈاکٹر شانتی نارائن ماتھر صاحب خالو ابّا سے ملنے آئے خالو ابّا نے اُن سے باتیں کیں۔ اور باتوں کے دوران اپنی اہلیہ کے امریکہ سے آنے کی بھی خبر دی۔ جو شام کی فلائٹ سے حیدرآباد پہنچ رہی تھیں۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے اس بات کی شکایت بھی کی کہ لوگوں کو اُن سے نہ ملنے کا پابند کیا جارہا ہے۔ اس پر ماتھر صاحب نے کہا کہ پہلے وہ اچھے ہوجائیں بعد میں سب کو بلائیں۔ ڈاکٹر شانتی نارائن ماتھر صاحب کا ایک جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

" I am mad of his poetry "

میں اور شمس الدین خاں خالہ امی کو لئے دواخانہ پہنچے۔ خالو ابّا اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ خالہ امی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ شاید اُن کی آخری خواہش کا جو بوجھ تھا وہ اتر گیا تھا۔ ہم سب یہ سمجھ رہے تھے کہ خالہ امی کے آنے سے ان میں زندگی سے جو ناامیدی پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہوجائے گی۔ مگر وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے بعد موت کو لبیک کہہ رہے تھے۔ حالانکہ اُن کی صحت بظاہر کافی سدھر گئی تھی۔ یرقان بھی چھٹ گیا تھا۔ شام میں جو لوگ اُن کی مزاج پرسی کے لئے آئے۔ انھیں خالو ابّا نے خود سے سلام کیا۔ جانے والوں کو خدا حافظ بھی کہا۔

۱۰ر اکتوبر۔ آج بھی خالو ابّا کی طبیعت ٹھیک تھی۔ شاید دوپہر کا وقت ہوگا۔ میں اُن کے قریب بیٹھا ہاتھ دبا رہا تھا۔ دفعتاً میری نگاہ بازو کے ریلنگ سے ٹیبل پر پڑی۔ جہاں "بیسویں صدی" رکھا تھا۔ میں اجازت لے کر ورق گردانی کرنے لگا تو نظر جناب نریندر لوتھر صاحب کے مضمون "میاں بیوی" پر پڑی۔ میں نے اس کا تذکرہ خالو ابا سے کیا تو وہ کہنے لگے پڑھ کر سناؤ۔ میں پڑھنے لگا اور ساتھ ہی ان کے تاثرات بھی پڑھتا جاتا۔ دیکھا اُن کے حواس بالکل نارمل تھے۔ وہ اکثر جگہ مسکراتے اور جب مضمون ختم ہوا تو پوچھے خوب لکھا ہے نا! میں نے کہا، واقعی اچھا مضمون ہے۔ اور یہی وہ مضمون تھا جس پر خالو ابّا نے اپنی زندگی کی آخری مسکراہٹ نچھاور کی۔ یہ آخری ادبی تخلیق تھی جو اُن کے علم میں آئی۔ آج پیشاب کا اخراج نارمل رہا۔ رات انہوں نے سینے میں تکلیف کی شکایت کی۔

۱۹ر اکتوبر۔ خالو ابّا کی صحت آج کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ اور پیر اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ اُن کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ Urea level جو گھٹ گیا تھا۔ بڑھ رہا تھا۔ کوئی شام کے ۶½ تا ۷ بجے ہوں گے، میں دفتر سیاست شاہین خلیب کے ساتھ گیا اور عابد علیخاں صاحب کو صورتحال سے واقف کرایا۔ انہوں نے مختلف ڈاکٹروں کو فون کیا۔ جنہوں نے حالت کو تشویشناک قرار نہیں دیا۔ رات کے کوئی ۸ بجے میرے ماموں ڈاکٹر رفعت اللہ شریف اور بھائی شمس الدین خاں (میڈیکل اسٹوڈنٹ) دواخانہ پہنچے، انہوں نے مجھے فون کیا کہ خالو ابّا کو Lost Ventriculun Failure ہوگیا ہے۔ اور آکسیجن دی جارہی ہے۔ انہوں نے احتیاطاً خالہ امی اور یاسمین خلیب کو گھر واپس بھیج دیا۔ میں، میرے والد صاحب اور میرے ایک اور خالو فوری دواخانہ پہنچے۔ دواخانہ پہنچنے سے قبل میں نے عابد علیخاں کو فون کیا۔ جس وقت ہم دواخانہ پہنچے اُس وقت تک Gaspings شروع ہو گئے تھے۔ اس دوران R.M.O صاحب بھی آکر دیکھ چکے تھے۔ اب وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں تھے۔ ہمیں یقین ہوگیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں موت کے بے رحم پنجوں سے نہیں بچا سکتی۔ میں اور میرے بھائی آبِ زمزم پلاتے رہے۔ وہ بڑی مشکل سے پانی پی رہے تھے۔ پھر ہم دوائی کے پلانے سے منہ تر کرنے لگے۔

۲۰ر اکتوبر۔ رات کے ایک بجے کے قریب ان کی سانس آہستہ ہو گئی۔ ماموں صاحب دوڑ کر D.M.O کو بلا لائے۔ ساتھ ہی وہ Air bulb بھی اُٹھا لائے۔ D.M.O دل کا Massage کرنے لگا۔ ماموں صاحب مصنوعی تنفس دینے لگے پھر میں ایر بلب لے کر تنفس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ماموں صاحب Cardiac Massage کرنے لگے۔ D.M.O آنکھ دیکھتا رہا۔ پھر ایک آواز ہم پر بجلی بن کر گری۔ یہ آواز D.M.O کی تھی: "Leave him doctors" ہم دونوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ میرے بھائی شمس الدین خاں میڈیسن کے طالب علم ہوتے ہوئے بھی ضبط نہ کر سکے۔ اور دور جا کر رونے لگے۔ دنیا سائنس اتنی ترقی کے باوجود قدرت کے آگے بے بس ہے۔ ہمارے خاندان کا سرپرست ہمیں اس عالم میں تنہا چھوڑ چلا گیا تھا۔ ہمارا ناخدا کشتی کو کنارے سے لگانے سے پہلے خود ہی

دب گیا سے وہ بھی دیوار گر گئی آخر جس کے سایہ میں سانس لیتے تھے!

ہم نے تمام روزناموں کو اطلاع کر دی اور صبح کی نماز کے ساتھ ہی گلبرگہ کے لئے روانہ ہو گئے کیونکہ خالو ابّا کی وصیت تھی کہ ان کی تدفین بارگاہِ بندہ نوازؒ میں نانا حضرت (حافظ اسمٰعیل شریف صاحب آزل جو خالو ابّا کے استاد اور خسر تھے) کے پہلو میں ہو۔ میں نے خالو ابّا کے ساتھ کئی بار سفر کیا تھا۔ دورانِ سفر وہ بہت ہی دلچسپ ہو جاتے۔ خوب ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتے۔ پتہ نہیں چلتا سفر کیسے کٹ جاتا۔ آج بھی وہ زندگی کے آخری سفر پر ہمارے ساتھ تھے۔ مگر بہت خاموش، سفید چادر میں لپٹے، گہری نیند سو رہے تھے۔ بہت تھک تو گئے تھے نا ___

میں خالو ابّا کو ایسی حالت میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے باہر دیکھنے لگا۔ مجھے ہر چیز افسردہ نظر آ رہی تھی۔ ہماری موٹر چیختی چلاتی سڑک کے کنارے کھڑے درختوں کے پاس سے گزرتی تو ٹہنیوں کو جنبش ہوتی ان کے آنسو شبنم بن کر موٹر پر گرتے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دھنڈیوں کی ہوائیں آہیں بھر رہی تھیں۔ سڑک دور جاتی ہوئی پگڈنڈیاں اٹھ اٹھ کر آخری دیدار کر رہی تھیں۔ پائل جیسے چھم چھم ناچنے والا پانی ندی اد گم سم کھڑا تھا۔

دن کے کوئی دو بجے ہم گلبرگہ پہنچے۔ گھر پر راہیؔ قریشی صاحب تھے، ڈاکٹر ناصر بن علی صاحب تھے، وہاب صاحب تھے۔ یہ بھی کیسا استقبال تھا۔ کہ سب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے موٹر کا پچھلا دروازہ کھولا تو سسکیاں بندھ گئیں۔ وہاب عندلیب صاحب مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ راہیؔ قریشی صاحب، کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ خالو ابّا کو ڈرائنگ روم میں لٹا دیا گیا۔ میں سرہانے بیٹھ کر قرآن خوانی کرنے لگا۔ کھڑکی سے گھر پر آئی ہوئی عورتیں دیدار کر رہی تھیں۔ شاید وہ کہہ رہی تھیں۔

دیکھو پھولاں میں پھول سویا ہے کتنا بانکا سجیلا ہے ہمدم
ایسے سونے پر آنکھ روتی ہے جیسے گرتی ہے پھول پر شبنم

تدفین کے لئے جلدی کی گئی۔ پھر بھی نمازِ عصر کا وقت ہو گیا۔ اس دوران سارے شہر میں اعلان کروایا گیا، تاکہ کوئی بھی شخص اپنے محبوب شاعر کو کاندھا دینے سے محروم نہ رہ جائے۔ عصر کے بعد کوئی ساڑھے پانچ بجے جلوسِ جنازہ درگاہِ بندہ نوازؒ کی طرف گامزن تھا۔ جس میں ہزاروں لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت شامل تھے۔ ایک بیل گاڑی والے نے بیل گاڑی روک کر کاندھا دیا۔ ایک بس ڈرائیور نے بس سے اتر کر کافی دور تک کاندھا دیا۔ نمازِ جنازہ مسجدِ درگاہ شریف کے پیش امام نے پڑھائی۔ جس میں سجادہ نشین روضہ بزرگ بھی شریک تھے۔ خالو ابّا کی کرناٹک اور آندھرا پردیش سے یہ عقیدت اور محبت ہی کہیے کہ اُن کی روح حیدرآباد میں پرواز ہوئی۔ اور جسدِ خاکی کو بارگاہِ بندہ نواز گلبرگہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

آصف آبا رنگولوی

دکھن کا ہیرا

(ایک تاثر)

میں رستے کی چھنی ہوں دیپک ہوں من کا یہ سارا اُجالا ہے مرے سخن کا
مجھے، تسیح پہچانے لوگا یخ مرے میں انمول ہیرا ہوں دکھن کے کھن کا

. . . .

نہ جانے شہر گلبرگہ آج اتنا خاموش کیوں ہے۔ اس شہر کو اتنا خاموش اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اتنی خاموشی اس پر رونق پُر فضاء پُر ضیا شہر میں میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ آج مطلع ابر آلود کیوں ہے؟ یہ "رستے" یہ سڑکیں سنسان کیوں ہیں۔ یہ گلیاں بے رونق کیوں ہیں؟ سارے دکھن نے آج سیاہ لبادہ کیوں اوڑھ رکھا ہے۔ ہر شخص کا چہرہ افسردہ، مرجھایا ہوا کیوں ہے؟ آج ادب کی محفلوں میں صفِ ماتم کیوں کھڑی ہے !!

رام، رحیم، زھرہ، سیتا کی دھرتی آج کیوں لرز رہی ہے؟ آج چمکتا ہوا سورج بھی بادلوں کی اوٹ میں آگیا ہے۔ نہ جانے یہ سب کیوں ہے؟ ...... کیوں ہے؟ ......!

ہاں مجھے یاد آیا.... یاد آیا۔ میرا حافظہ بھی کتنا کمزور ہوتا جارہا ہے۔ آج ہی میں نے اپنے ہی ظالم ہاتھوں سے دکھن کے اس انمول ہیرے کو سپردِ خاک ـــــ نہیں نہیں ـــــ "تازہ پھولان" کی سیج پر درِ خواجہؒ کے پائین میں اُسے ابدی نیند سونے کے لئے لٹا کر آیا ہوں۔ شگفتہ چہرے سے پھوٹتی ہوئی "آخری کرن" کا یہ میرا ـــــ "آخری دیدار" تھا ـــــ ذرا خاموش ہو جائیے ـــــ اُسے سونے دیجئے ـــــ آرام سے سونے دیجئے ـــــ سامعہ ہند کے سفر سے تھک کر چور چور ہو گیا ہے۔

لوگ دکھنی ہیرے کو خواجہؒ کا پجاری کہتے تھے ـــــ اور ـــــ یہ حقیقت راز میں تھی۔ لیکن خواجہؒ نے اپنے ہی عرس کے زمانے میں اپنے پجاری کو اپنے پاس بلا کر راز کھول دیا۔ ہر کوئی جو ادب کا پرستار ہے، جس کے دل میں دکھنی زبان کی محبت ہے دکھن کے ہیرے کو ضرور یاد کرے گا۔ ھر برس جب بھی

دکھنی ہیرے کو یاد کیا جاتے گا۔ تو یقیناً وہ مہینہ بندہ نوازؒ کا مہینہ ہوگا۔ خواجہؒ نے اپنے عرس کے دنوں میں ان ہی کے ساتھ دکھنی ہیرے کو یاد کئے جانے کا ایک لازوال عطیہ دیا۔ کوہ نور ہیرے کی روایت رہی ہے کہ وہ جہاں جہاں بھی گیا زوال لایا۔ لیکن دکھن کے ہیرے نے جہاں جہاں بھی قدم رکھے وہاں کشت زار، لالہ زار بن گئے۔ روتی محفلوں کو قہقہہ زار بنا یا۔ "میٹھا میٹھا موٹ کا پانی" پلاکر پیاسوں کی پیاس بجھاتی ہے۔ دکھن کے اس انمول ہیرے حضرت سلیمان خطیب کی پیدائش ۱۹۲۲ء ضلع بیدر کے قصبہ چٹگوپہ (معین آباد) میں ہوئی۔ جو ایک زمانے میں علاقہ پائیگاہ کا ضلع تھا۔ زمانہ بچپن ہی سے آپ بے سہارا تھے۔ یتیم و یسیر تھے۔ بچپن کے اُن سالوں میں آپ کئی سال تک بغیر ٹوپی، بغیر جوتے کے پھرتے رہے۔ جب چند لوگوں کا سہارا ملا تو آپ کی تعلیم اور فن کو جلا ملی۔ تعلیمی دور سے ہی آپ کو شعر گوئی ڈرامہ نگاری اور مضمون نگاری کا شغف تھا۔ آپ نے گاؤں گاؤں پھر کر ہر شخص کی بولی کو سنا، سمجھا اور اُسی بولی کو اپنا ذریعہ کلام بنایا اور سوتی ہوئی دکھنی زبان کو پھر سے جگایا اور اُسے نئی جوانی بخشی۔ میٹرک کے بعد آپ نے منشی فاضل کیا۔ اور اُس کے بعد سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں سے آپ کی زندگی کا اصل دور شروع ہوتا ہے۔ سانحہ ارتحال سے ایک سال قبل تک آپ گلبرگہ کے "پانی محل" میں رہ کر ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ گلبرگہ والوں کی بھی پیاس بجھاتے رہے۔ آپ نے یتیموں اور یسیروں کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ ایک یتیم و یسیر کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپ کو بے سہارا اور یتیم بچوں سے والہانہ محبت تھی۔ اور اُن پہ ترس کھاتے تھے۔ اور اُن کی مدد ہی نہیں بلکہ بے انتہا مدد کرتے تھے۔ دوران زندگی میں آپ نے ہر ایک کو ہنسایا۔ قہقہہ لگانے پر مجبور کیا۔ لیکن خود حقیقی معنی میں کبھی قہقہہ نہیں لگا سکے۔ دوسروں کو پیٹ بھر کھلاتے اور خود کم کھاتے۔ پریشان رہتے لیکن دوسروں کی دلجوئی کرتے۔

یہ دکھن کے ہیرے کی زندگی کا الم انگیز پہلو ہے۔ یہ زندگی بھی کتنی بے رحم ہے۔ اُس نے اُسے قہقہہ لگانے بھی کب دیا۔ جب کہ زندگی نے اُسے ہمیشہ معاشی بحران سے دوچار رکھا اور خود اُس پہ قہقہہ لگاتی رہی۔ آج "شمع شاعر" گل ہو چکی ہے۔ آج دکھن کے ہیرے نے اپنی چمک کو سینۂ گل میں چھپا لیا ہے۔ لیکن اُس کے دئیے ہوئے "کیوڑے کے بن" کی ایک ایک پتی ہمارے لئے ہیرے سے کم نہیں جو رہتی دنیا تک ہماری نسلوں کو ضیا بخشتی رہے گی ؎

کبھی ماٹی ماٹی تلے مل جاتی ہے پھر اُسی ماٹی سے کبھی پھول بنکر اُبھر آتی ہے (خطیب)

آج "دکھنی عورت کا انتظار" اپنی آنکھوں میں "ندی" کی لوٹ لے کر کھڑا ہے۔ "بچے پامال مرجھا کر ہیں"۔ "ہمالیہ کی چاندنی" پگھل پگھل کر دکھنی ہیرے کے پرستاروں کی "انکھیاں" سے ڈھل رہی ہے۔ "یتیم پوتوں نے درسگاہوں سے نہ بھاگنے کی قسم کھالی ہے۔ "ساس، بہو" کا جھگڑا کچھ دیر کے لئے رک گیا ہے —— "دکھنی چلم" کا چولھا بجھا ہوا ہے۔ "چھچھے" بھی خاموش خاموش ہیں —— "پاؤ حکیم" کی گولی ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر چکی ہے۔ "پڑوسی" نے آج سے مرغیاں نہ چرانے کا اعلان کر دیا ہے ——
"چینی گڑیا" نے اپنا ناچ بند کر دیا ہے۔ "پگڈنڈی سونی ہے"۔ گاؤں کی گوریاں شرمیلے گارہی ہیں ——
آج کنواری لڑکیوں کی آس ٹوٹ چکی ہے —— لیکن آج نوجوانوں نے جوڑے میں رقم نہ لینے کا حلف لے

یا ہے۔ ایک گھڑ" جو کئی دن سے مجبور تھا۔ آج بھی نہ کھا سکا۔ لگتا ہے اُس کی قسمت میں "روٹی" ہی نہیں ـــــ اور ـــــ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۸ء کے بعد دکھنی ہیرے کی زندگی میں نومبر کی "پہلی تاریخ" کبھی نہ آئے گی۔

اے دکھن کے ہیرے تیری جدائی سے ادبی دنیا کا ایک پُر قہقہہ باب ختم ہوگیا۔ اے دکھن کے ہیرے تیری جدائی ادبی دنیا کے لئے ایک رِستا ہوا ناسور بن گئی ہے۔ جس کا زخم کبھی نہ بھر سکے گا ـــــ اے خوش نظرافت آج سے مزاحیوں کی دنیا تیرے بغیر نامکمل ہوگی ـــــ آج دکھنی زبان تیرے بغیر بیوہ ہوگئی ـــــ آج تیری یاد میں دکھنی زبان خون کے آنسو رو رہی ہے ـــــ کیا تجھے اِس لاوارث زبان پر اتنا بھی ترس نہ آیا؟ ذرّہ برابر بھی رحم نہ آیا ـــــ اور تجھے یہ بھی خیال نہ آیا کہ وہ تیرے بغیر اکیلی رہ جائے گی ـــــ اور ـــــ اور ـــــ تو ـــــ خواجہؒ کی گود میں اُسے چھوڑ کر ہمیشہ ـــــ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سوگیا۔

مظفر مجاز

آہ سلیمان خطیب

کنعاں سے روٹھ کر مہِ کنعاں چلا گیا
شہرِ سبا سے شاہِ سلیماں چلا گیا
زندہ دلوں کو چھوڑ کے افسردہ و حزیں
وہ مست و شادمان و غزلخواں چلا گیا
آزاد روح اور قفسِ عنصری کی قید
مٹی کا توڑ تاڑ کے زنداں چلا گیا
ہم مثلِ خار و خس لبِ ساحل پہ رہ گئے
اور وہ مثالِ موجِ خراماں چلا گیا
بیٹھا تو جیسے نبضِ دو عالم رکی ہوئی
اٹھا تو مثلِ شورشِ طوفاں چلا گیا
طالب[1] فسردہ ہیں تو ہیں افسردہ مصطفےٰ[2]
روحِ روانِ محفلِ یاراں چلا گیا

اہلِ زمانہ پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا
کیونکر کہیں کہ گوشت سے ناخن جدا ہوا

★★

[1] طالب خوندمیری
[2] مصطفےٰ کمال

وقار خلیل

سانحہ

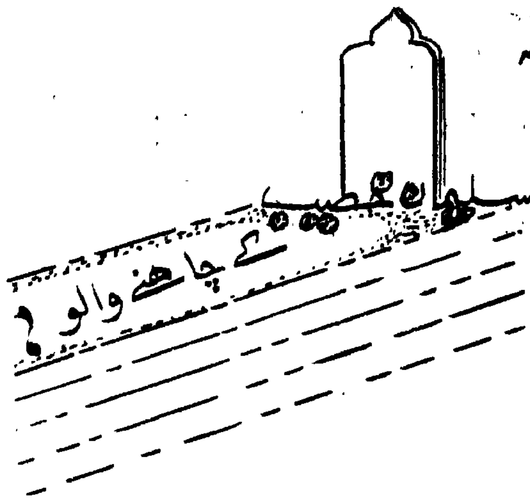
سلیمان خطیب کی یاد میں

دکھن منے عزیز و ! یو سانحہ ہوا ہے
کیوڑے کے بن کا شاعر ماٹی منے ملا ہے
تج بیت کی طراوٹ جی کو لبھانے ہاری
تج طنز کی لگاوٹ جی چھید کرنے ہاری
مجلس منے سجاوٹ دُلھا بنا ہوا تھا
کتنے کی شاعراں تھے سب میں سجن دیا تھا
تج شاعری میں کیا کیا روپ تھے سجیلے
گیتاں کی چاندنی تھی، خوباں کے رنگ میلے
تج شعر کا بنیپہ، دل دھنڈی سے یکا
تج لب میں تھی حلاوت، ہر حرف میں تو سہایا
تج بیت میں نمایاں گوّن کے غریب لوگاں
اُن کے نئے نویلے ارماناں اور شوقاں
تج شعر کا آوازہ چوندھیر چار سو تھا
تج روپ میں غواصی جادو جگا رہا تھا
انجواں کے سارموتی پلکاں منے ڈھلے ہیں
تج نام پہ خطیبا کیتے کی دل دکھے ہیں

دکھنی زباں سخن کا شاعر گزر گیا ہے!
ہیہات کیسا بانکا ساجن بچھڑ گیا ہے!

★★

بھارت چند کھنہ



طنز و مزاح کے مقبول ترین، شیریں دہن، دکنی زبان کے شاعر سلیمان خطیب کا سانحہ ارتحال ایسی نوبت پر جب کہ اُن کا فن اپنے پورے شباب پر تھا۔ جنوبی ہند والوں کے لئے خاص طور پر اور دُنیائے اردو ادب میں عام طور پر ایک المیہ سے کم نہیں۔ خطیب صاحب صرف دکنی زبان پر ہی نہیں بلکہ ٹکسالی زبان پر بھی کمال قدرت رکھتے تھے۔ اُن کے فن کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے جس موضوع کو بھی اپنا نشانہ بنایا اُس میں طنز و مزاح کے پہلو ایسی خوبی اور خوبصورتی سے سمو دیتے کہ مبالغہ آرائی کا شائبہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے منظوم مکالموں کا ڈرامائی انداز اُن کی انوکھی اور دل آویز تشبیہیں زبان کا چٹخارہ اور موزوں ترین الفاظ کا استعمال انکی نظموں کو شاہکار بنا دیتا ہے۔

پیروڈی کے فن میں بھی وہ یکتا تھے۔ چارہ گر کی پیروڈی میں راشن کی دوکان کے سامنے، بقول اُن کے "چلچلاتی ہوئی چیل سی دھوپ میں" بھوکوں کا ایک کیو لگا ہے، جس کے بارے میں خطیب کی یہ تخلیق ہے:

پھر سنو دوستو

اِک تماشہ ہوا
اِک لطیفہ ہوا
اِک شگوفہ کھلا
ایک مائی کو کیو میں ہی بچہ ہوا

اور اس طرح جب بھوکوں کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہوا تو ہمارے امام، مخدوم کے چارہ گر کو آواز دیتے ہیں اور اُس سے علاج و مداوائے اُلفت نہیں مانگتے، بلکہ یہ پوچھتے ہیں،

یہ فضاؤں میں اُڑتا ہوا آدمی جس کی مٹھی میں شمس و قمر بند ہیں
ایک مٹھی جواری کا محتاج ہے

یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں ۔۔۔ کچھ علاج و مداوائے فاقہ بھی ہے!

تصویر کا یہ موڑ کس قدر کیلنٹ اور اچانک ہے۔ کس قدر پُر اثر ہے یہ سوال! اور یہی شاعر کا کمال ہے۔ خلیب صاحب نے "پہلی تاریخ" اور "ساس بہو" کی گفتگو سے طنز و مزاح کے میدان میں جو قدم رکھا تو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہر موضوع پر اپنے منفرد، شگفتہ، دلآویز انداز میں انہوں نے ظرافت کے خزانے لٹائے اور طنز کے تیر و نشتر چھوڑے۔ "ایک اسم نویسی" میں "چھورا جرا اینچی کھاتا ہے" کے مصرعہ میں کتنا بھرپور اور تیکھا طنز ہے۔ "پاؤ حکیم" کے عنوان ہی میں ظرافت کی عجیب و غریب دل موہ لینے والی لطافت ہے۔ اور اسی عنوان کے تحت جب حکیم صاحب ایک فقیر کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ:

تندرستی کی فکر کر نادان ۔۔۔ تندرستی ہزار نعمت ہے

تو فقیر کے اس جواب میں کہ: ۔۔۔ تنگدستی اگر مسلسل ہو ۔۔۔ تندرستی کو کیا کرے کوئی

کس قدر سوز و گداز ہے کہ واہ واہ کے ساتھ دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور آہ نکل آتی ہے۔ خلیب صاحب کی جدید تخلیقات میں "پیش کولا" موضوع کے اعتبار سے دل کا کنول کھلا دینے والا ہے۔ افسوس کہ ان کو اس موضوع پر کماحقہٗ داد حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں اسے بھی اُن کا شاہکار سمجھتا ہوں اس ۔۔۔ احساس کے ساتھ کہ اسی پیش کولا کے مرض نے خلیب صاحب کو بستر علالت سے اُٹھنے نہیں دیا۔ خلیب صاحب نے ایک حالیہ ملاقات میں، جس کا اعزاز مجھے حاصل ہے، مجھ کو بتلایا تھا کہ جہیز کی لعنت کے بارے میں انہوں نے ایک نظم لکھی ہے جس میں لڑکے کے والدین نے لڑکی والوں سے سکوٹر، موٹر، یا مکان نہیں، بلکہ ریل گاڑی کا مطالبہ کیا۔ صد افسوس کہ ہم اُن کی اس تخلیق کو سننے سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر توجہ طلب بات یہ ہے کہ ریل گاڑی کے مطالبہ کا اچھوتا خیال صرف خلیب صاحب ہی کو سوجھ سکتا تھا ۔۔۔ خلیب صاحب کی شاعری میں جو ایک چیز بدرجہ اتم پائی جاتی ہے وہ اُنکی دکنی اور ٹکسالی زبان میں Alliteration کے وصف کی موجودگی ہے جس کی مثال اُن کا یہ مصرعہ ہے: "میٹھا میٹھا موٹھ کا پانی" ۔۔۔ اُردو ادب میں خلیب صاحب کا جو Contribution ہے یقیناً اس کو موت کا سفاک ہاتھ بھی مٹا نہیں سکتا۔ اپنے منفرد فن اور اُردو ادب کو اپنی دین کی وجہ سے وہ امر ہو گئے مگر جس بات کا مجھے آج یہاں اعتراف کرنا ہے وہ یہ ہے کہ زندہ دلان حیدرآباد کی بقا کے لئے اُنکی موجودگی تریاق تھی۔ وہ ہمارے ادارے کی عزت و آبرو تھے۔ اُنکی باغ و بہار شخصیت سے اس ادارے کو ملک بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زندہ دلان کے پہلے کل ہند مشاعرہ میں دلاور فگار کی ٹکر کے اگر اور کوئی شاعر تھے تو وہ خلیب ہی تھے۔ اور اس کے بعد جتنے بھی ہمارے سالانہ مشاعرے ہوئے اُن میں بھی وہ مقبول ترین شاعر ثابت ہوتے۔ اُن کی مقبولیت جنوبی ہند کی تمام ریاستوں کے علاوہ مہاراشٹرا، اتر پردیش، بہار اور دلی میں یکساں رہی ۔۔۔ وہ ہماری آن و شان تھے، ہم آنکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ جانے پر جس قدر ماتم کریں کم ہے، خدا اُن کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمارے پسماندہ شعرا کو ایسی قابلیت اور ایسا ذہن رسا عطا فرمائے کہ اردو ادب میں طنز و مزاح اور زندہ دلان کا نام و نشان باقی رہے۔

بالآخر میں خلیب ہی کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

ہم ہی بڑے سے تھے رہ گئے رونے کے واسطے ۔۔۔ ہنستا ہوا وہ پھول تھا ہنستا چلا گیا

●●

ڈاکٹر سیدہ جعفر
ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

سلیمان خطیب کی شاعری

سلیمان خطیب دکن کے ایک ایسے ہردلعزیز شاعر تھے جن کا کلام مقامی رنگ کے باوصف اپنے اندر اسلئے ایک عام اپیل رکھتا ہے، کہ انہوں نے انسانی مسائل کو جغرافیائی حدود میں محصور کر کے نہیں دیکھا بلکہ ان کی نظریں ان دھندلکوں کے پیچھے خود انسان پر بھی رہیں۔ انہوں نے عام رواج سے ہٹ کر داخلی تجربے اور انفرادی واردات کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ روزمرہ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات سے اپنے فن کی آبیاری کی ہے۔ اور یہی گریاں و خنداں زندگی ان کے لئے سرچشمۂ وجدان بن گئی ہے۔ انہوں نے ایک غیر متوازن سماج کے فرد کی حیثیت سے اپنے معاشرے کی کج روی اس کے تصنع اور کھوکھلے پن کو اپنے مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ خطیب کی زبان اور شاعری کو غیرمعیاری اور محدود تصوّر کرنے والے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں جن مسائل کی نشاندہی کی ہے وہ ملک کے کسی مخصوص خطّے سے متعلق نہیں بلکہ سارے ہندوستان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ادب میں انسانی تجربے کی کسک حلقۂ شام و سحر سے نکل کر ایک سدا بہار نقش بن جاتی ہے۔ خطیب کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے سیاسی واقعات اور معرکہ آرائیوں پر نظمیں کہنے کے بجائے ان کے ردّ عمل کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا ہے۔ سماج کی روز افزوں بے روزگاری، اقتصادی خلفشار اور عام انسان کی تشنگی اور ناآسودگی کو انہوں نے شعر کے پیکروں میں ڈھال دیا ہے۔ خطیب نے اپنی بیشتر نظموں میں متوسط طبقے کے مسائل اور اس کے طرزِ فکر کی ترجمانی کی ہے۔ گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی گتھیاں، افرادِ خاندان کے معمولی معمولی جھگڑے، نجی زندگی کے نشیب و فراز، خلوص و محبت کی نوک جھونک، معمولی معمولی باہمی اختلافات اور روٹھنے اور منانے کا ڈرامائی انداز خطیب کی نظم نگاری کو ایک نئی حقیقت پسندی اور صداقت شعاری سے آشنا کرتا ہے۔

خطیب کی اکثر نظموں میں لوک گیتوں کی مٹھاس، نغمگی اور روانی موجود ہے۔ گیتوں سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی نے

ان کے اکثر اشعار کو گیتوں کی دھیمی آنچ میں تپا دیا ہے۔ ان کی نظمیں "موٹ کا میٹھا میٹھا پانی" "سن ری گوری" اور "کانورسے کھیتاں کا ٹھرسے" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے، یہاں کی روایات اور رسم ورواج سے واقفیت نے خطیب کی ان نظموں کو واقعیت اور تازگی عطا کی ہے۔ لوک گیتوں میں عوام کے دل کی دھڑکنیں سموئی ہوتی ہیں۔ وہ عوام کی محبت ونفرت کی دھوپ چھاؤں، ان کی چھوٹی چھوٹی کامرانیوں کے نغمے، اور ان کی امنگوں سے سرشار ہوتے ہیں۔ گیت لکھنے والا شاعر اسی وقت کامیاب فنکار ثابت ہوسکتا ہے جب اُسے اپنے موضوع سے جذباتی انہماک ہو۔ اور وہ اجتماعی تجربہ کو ذاتی تجربے کی زبان عطا کرسکے خطیب کا تخیل وتفکر گاؤں کی فضاء اور دیہاتی ماحول میں پوری طرح رچ بس گیا ہے۔ پگڈنڈی کی بل کھاتی ہوئی چال برسات کی پھوار، کھیتوں کی مہک اور مکئی کے آبدار موتیوں کا حسن ان کے کلام کو عوامی مقبولیت بخشتا ہے۔ خطیب نے ان قدرتی مناظر کی متحرک اور گویا تصویریں پیش کردی ہیں۔ ہمارے ادب میں دیہاتی نظموں Pastoral Poems کی کمی کے پیش نظر خطیب کی یہ نظمیں بہت غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ اس طرز سے ملتی جلتی شاعری کے عناصر ابتداء ہی سے دکنی ادب میں اپنی جھلک دکھاتے رہے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی اس میں طبع آزمائی کا سہرا دکنی شعراء ہی کے سر رہا ہے۔ شمالی ہند میں اس کی ابتداء بہت بعد یعنی ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ ہوئی جب میرٹھ کے ایک بزرگ منور خاں دلگیر بہادر شاہ ظفر کے سامنے اس قسم کا کلام پیش کر کے خلعت وانعام سے سرفراز ہوئے تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب اور شائستگی میں شہری زندگی کے مصنوعی معیاروں اور پر تکلف طرز اظہار نے شاعری کی اس سادگی اور معصومیت کو مقبول نہیں ہونے دیا۔ دیہاتی شاعری ادب کا کوئی ایسا روپ نہیں جسے کمتر درجہ کی چیز تصور کیا جائے بقول پروفیسر اعجاز حسین "اپنا پیام عوام تک پہنچانے کے لئے زبان میں تھوڑی سی تبدیلی گوارہ کرنا قومی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ تاکہ ادب کو عوام سے اور عوام کو ادب سے قریب تر ہونے میں آسانیاں پیدا ہوجائیں"

خطیب ایک فطرت آشنا شاعر ہیں۔ اُنھوں نے مناظر قدرت کی عکاسی کے لئے حسیاتی تشبیہات اور پُر لُطف خیال انگیز امیجری سے کام لیا ہے۔ وہ ایران و توران کی طرف نہیں دیکھتے دکن کے خوبصورت سطح مرتفع کا حسن انہیں جلوہ گاہ فطرت نظر آتا ہے۔ دکن دلیس کی بہار وخزاں یہاں کے موسم اور اس سرزمین کی تاریخ، دیومالا اور روایات سے ان کے فن کی نشوونما ہوئی ہے۔ خطیب نے ایک طرح سے ہماری قدیم ادبی روایات کا احیاء کرنے کی کوشش کی ہے۔ دبستانِ گولکنڈہ اور بیجاپور کے شعراء نے ایرانی تہذیب اور وہاں کی ادبی روایات کی کورانہ تقلید کرنے کے بجائے اپنے دکن کے ثقافتی رجحانات کی عکاسی کی تھی۔ اُن کی شاعری کی ساری فضاء ہندوستانی ہے۔ جس میں ہند ملائی روح جاری وساری نظر آتی ہے۔ اس جغرافیائی اور تہذیبی وحدت کی عکاسی خطیب نے بھی کی ہے۔ جو ایک طرح سے ادب میں دکن کے اسی طرز ماضی کی بازیافت محسوس ہوتی ہے۔ مشہور ماہر لسانیات گریرسن نے اُردو زبان کی

نشوونما سے بحث کرتے ہوئے دکنی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی تھی اس سلسلہ میں اس نے ایک بڑے پتے کی بات یہ کہی تھی کہ دکنی شمالی ہند کی موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکل نہیں بلکہ جدید اردو دکنی کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ آج بھی دکن کے دیہاتوں میں عوام جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ اپنی بعض بنیادی لسانی خصوصیات اور اظہار کے مخصوص سانچوں کے اعتبار سے کم و بیش اسی زبان کا ایک تسلسل معلوم ہوتی ہے جو گولکنڈہ اور بیجاپور کے لسانی سرچشموں سے سیراب ہوئی تھی۔ اس زبان کے فطری خدوخال دکن کے دیہاتوں میں اب بھی اپنی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شاعر اپنے جذبات و تصورات کو اسی زبان کا جامہ پہناتا ہے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ اس لحاظ سے قابلِ توجہ بن جاتا ہے کہ وہ سماج کے ایک خاص گروہ کے تہذیبی اور ادبی اقدار کی نمائندگی کر رہا ہے۔ خطیب کے علائم اور ان کی پیکر تراشی عہد بعد جمالیاتی شعور کی پیداوار نہ سہی لیکن ان شعری اشاروں میں نئی زندگی کا دل ضرور دھڑکتا ہے۔

توضیحی شاعری کے علاوہ خطیب کے یہاں انسانی جذبات کی عکاسی بھی موجود ہے۔ شاعر کے وسیع مشاہدے اور انسانی فطرت کے تہہ در تہہ گوشوں سے واقفیت نے ان کی نظم نگاری کو پُر اثر اور بامعنی بنا دیا ہے۔

دکنی عورت کا انتظار' یاد' شمع اور شاعر' شاعر کی عزت' اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں۔

انسان دوستی' عوامی مسائل سے دوستی اور دردمندی کے جذبہ نے خطیب کی شاعری کے طنزیہ رنگ کو نکھار دیا ہے۔ نئی نسل اور پرانی نسل کا ذہنی فاصلہ' تعلیمی نظام کا خلفشار' اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت اور تہذیبی زندگی کی ناآسودگی ان کی طنزیہ نظموں کی محرک معلوم ہوتی ہے۔ چھورا چھوری' پاو حکیم' ہمارے بچے' ساس بہو' روٹی' سانپ' شاعر کا گھر' اور پہلی تاریخ میں طنز کی چبھن بھی ہے اور مزاح کی دلنوازی بھی۔ خطیب محض ہنسی ٹھٹول کے شاعر نہیں ان کے قہقہوں کی تان سنجیدگی پر ٹوٹتی ہے۔ اور قاری اپنے اندر ایک نئی آگہی محسوس کرنے لگتا ہے۔ خطیب کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی کہ وہ مختلف سطحوں' لہجوں' اور مختلف معیاروں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شعر کہنے پر قادر تھے۔ ان کی شاعری کثیر الجہت ہے۔ جس سے فن پر ان کی گرفت اور ان کی قادرالکلامی کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے موضوعاتی شاعری بھی کی ہے۔ کیوڑے کے بن' بن' ہمالا کی چاندی' کے زیرِ عنوان خطیب نے جو نظمیں پیش کی ہیں وہ ان کی وطن دوستی حریت پسندی اور جذبہ سرفروشی کی غماز ہیں۔ عصری اردو میں لکھے ہوئے خطیب کے یہ اشعار اپنے بلیغ اشاروں اور معنی آفرینی کی وجہ سے دل موہ لیتے ہیں۔ طرزِ ادا کا ڈرامائی انداز اور دیہاتی زندگی سے ماخوذ اچھوتی تشبیہات جن میں ہندوستانی تہذیب کی مانوس بوباس رچ بس گئی ہے، خطیب کو خوش گو شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں ★★

ناقابلِ اشاعت مضامین کسی صورت واپس نہیں کئے جائیں گے۔

(ادارہ)

ہمارا شاعر

حسن سرور

ساز خاموش ہوا

ساز خاموش ہوا، ہو گیا گیتوں کا فسوں
شمع گل ہو گئی اک پل میں لٹی بزم طرب
شام سے پہلے ہی خورشید سخن ڈوب گیا
ابھی کچھ دیر کے پہلے تھا جہاں جشن بپا
اب وہیں غم کے اندھیروں سے ہے نوحہ چھیڑا
تخت کہتا ہے کہ اب میرا سلیماں نہ رہا
درد کہتا ہے کہ اب کوئی بھی درماں نہ رہا
سوئے افلاک کوئی دیکھو چلا جاتا ہے
زخم سینے میں ہنسی لب پہ لئے جاتا ہے!
چاہنے والوں کو غم اپنا دیئے جاتا ہے!
شور ماتم بھی ہے اشکوں کی روانی بھی ہے
کھیت کھلیانوں سے ماتم کی صدا آتی ہے
اور جھرنوں سے بھی رونے کی صدا آتی ہے
وحشت احساس میں ہے دور تلک سناٹا
اک خموشی بھی ہے تنہائی بھی اب محفل میں
رونقیں لے کے گئے جا کے نہ آنے والے
پیکر مہر و مروت، اے مجسم اخلاق
ڈھونڈتی رہتی ہیں نظریں تجھے جانے والے
"دکن" محو فغاں ہے کہ چلا خضر مرا
گم کہاں ہو گئے وہ مشعل کے اٹھانے والے
کھیت، ندیاں یہ مچلتے ہوئے جھرنوں کے گیت
سبزہ زاروں کے یہ آنچل اور یہ نیلے پربت
گاؤں کی گوریاں، پنگھٹ کے سہانے منظر
یاد کر کے تجھے دھرتی پہ مگن روئیں گے
اے نوا سنج چمن! اہل دکن روئیں گے

ساری دنیا کا لئے درد، سدا روتا تھا
چین سے آج وہی زیر زمیں سوتا ہے

یہ گیتوں کا رسیا یہ متوالا شاعر
کسانوں کی دھرتی کا دل والا شاعر
ہری جھونپڑی کا یہ رکھوالا شاعر
یہ پنگھٹ پہ جھرنوں کا ہریالا شاعر
کبھی گوریوں کے حسیں آنچلوں میں
کھنکتی تھرکتی ہوئی دھڑکنوں میں
حسینوں کی وہ انجمن دیکھتا ہے
جو ان دھڑکنوں کا چمن دیکھتا ہے
دلوں میں اتر کر چبھن دیکھتا ہے
کبھی حسرتوں کا کفن دیکھتا ہے
سخن جس میں جھرنوں کا سنگیت بھی ہے
وفا، پیار اور درد کا گیت بھی ہے

* * *

تری شاعری ہے کہ کیوڑے کی باس
کہ برکھا میں ساجن سے ملنے کی آس
کہ اک سانولی کی نگاہوں کی پیاس
کہ ممتا بھری پیار کی ہے مٹھاس
ہرے سبز کھیتوں میں دھانوں کی راس
ہمالہ کی چاندنی ہو اور سانس

* * *

مبارک تجھے عظمتوں کا یہ تاج
مبارک تجھے دکنیوں کا خراج
(دسمبر ۱۹۷۵ء)

عاتق شاہ

خطیب مرحوم کی شخصیت اور فن

سلیمان خطیب کی
موت کا کسی کو یقین نہیں
آتا. اور وہ لوگ جنہوں نے
خطیب کو قریب سے دیکھا ہے،
سوچ ہی نہیں سکتے کہ خطیب جیسے بڑے
دل گردے کا شخص جس نے زندگی میں مفلسی اور
غربت کے خلاف کئی لڑائیاں لڑی تھیں اور کئی
طوفانوں کا مقابلہ کیا تھا اتنی آسانی سے خود کو موت
کے حوالے کر دے گا!

لیکن اب خطیب کی موت ایک حقیقت ہے. پتہ نہیں خطیب نے
دنیا سے اُٹھ جانے کے لئے یہ وقت کیوں منتخب کیا' جب کہ اس کی زندگی
میں خوش حالی اور آسودگی آگئی تھی اور وہ بڑا مطمئن نظر آتا تھا. کہیں ایسا تو نہیں
کہ وہ اُن خوشیوں کو سہہ نہ سکا!

ابھی حال حال کی بات ہے کہ سلیمان خطیب سے "شگوفہ" کے دفتر پر ملاقات ہوئی. شاعر اپنے شعری مجموعہ کی کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح کے سلسلہ میں مصطفےٰ کمال سے ملنے آیا تھا. اور میں بھی اپنے کام سے وہاں گیا تھا. کوئی چار پانچ گھنٹے کا ساتھ رہا. کام بھی ہوتا رہا. باتیں بھی ہوتی رہیں دنیا جہاں کی باتیں. لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ خطیب کی سانس پھول رہی ہے اور وہ مسودہ پڑھتے ہوئے تھکتا جارہا ہے. کمال بڑے خاموش انداز میں اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے. مسکراہٹ جو خطیب سے کہہ

رہی تھی، اُستاد! ہاں بھاؤ! اب تم بوڑھے ہو چکے!

یہ ایک چھیڑ تھی۔ لیکن خطیب کسی طرح اپنا کام ختم کر کے گلبرگہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ایک بار وہ پڑھتے پڑھتے چپ ہو گیا اور وہ پھر اُٹھ کر کمرے کے اُس حصہ کی طرف گیا جہاں صراحی رکھی تھی۔ پانی پیا اور میرے قریب آکر بڑے راز دارانہ انداز میں اُس نے پوچھا:

"اُستانی کہاں ہیں؟ ـــــ (میری بیوی کو وہ اُستانی کہتا تھا۔)

میں نے کہا: "وہیں ورنگل میں ـــــ "

ساتھ ہی اُس کے چہرے پر ایک ناخوشگواری کی کیفیت پیدا ہوئی۔ جیسے یہ تکلیف میری نہیں تھی۔ اس کی تھی۔ اور یہ اُس کا اپنا درد تھا! اُس کے بعد جب اُس نے پھر گلبرگہ جانے کی بات کی تو میں نے کہا: "اتنا تڑپ کیوں رہے ہو؟ کیا بھابی کے بغیر رہ نہیں سکتے؟"

تو اُس نے بڑے لا پرواہانہ انداز میں جواب دیا: "نہیں! تیری بھابی یہاں کہاں ہے؟ وہ تو امریکہ چلی گئی۔"

میں نے کہا: "کیوں جانے دیا تم نے؟"

اُس نے بڑی بد دلی سے جواب دیا: "اسے چھوڑ، جانے دے اُسے!"

خطیب نے کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کیں۔ اکثر وہ اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا تھا۔ لیکن اس بار میں نے محسوس کیا کہ خطیب کو کسی شئے کی خواہش، کسی چیز کی تمنا نہیں رہی۔ اور وہ اندر سے کچھ ٹوٹ پھوٹ سا گیا ہے!

اگر زندگی میں تڑپ نہیں تو آدمی زندہ کیسے رہے؟

زندگی کے لئے اور زندگی گزارنے کے لئے کچھ تو سامانِ سفر چاہئے۔ اور جب آدمی ہر طرح سے مطمئن ہو جاتے تو پھر ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ اور یہی بات میں نے خطیب کے تعلق سے محسوس کی۔ اس لئے خطیب کی موت پر مجھے اتنا زیادہ اچنبھا نہیں ہوا!

خطیب اس دنیا میں آیا اور اپنے ایک بڑے مشن کو پورا کر کے ہنستا، کھیلتا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

لیکن اس مسکراہٹ کے پیچھے کتنے آنسو تھے یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ خطیب کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خطیب کو سمجھا جائے۔ ایک خطیب ہی کیا، کسی بھی فنکار کی شخصیت کو اُس وقت تک سمجھا نہیں جاسکتا جب تک کہ اُس کی اناء کو نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ شخصیت اناء سے ہٹ کر نشو و نما نہیں پاتی۔ ادب کے میدان میں کبھی یہ اناء براہ راست اپنے اظہار کا راستہ ڈھونڈتی ہے۔ اور کبھی یہ ڈھکے چھپے انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک میڈیم کے لبادے میں خود کو چھپا لیتی ہے کہ اُس کا پتہ ہی نہیں چلتا لیکن اناء ہر تخلیق میں ہوتی ہے۔ اور اناء کے بغیر کسی اچھی تخلیق کی امید کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی فنکار اس کے بغیر ایک قدم اُٹھا سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فن کار کی یہ اناء خود اُس کی ذات کا پروپگنڈہ کرتی ہے یا پھر آپ کی ہماری سب کی بات کرتی ہے؟ اور اس کا جواب یہی ہے کہ اس میں دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ اور یہ فنکار کے ظرف پر منحصر ہے۔ کہ کس طور بھی قاری کو اپنی گرفت میں لے لے۔ شاید اسی لئے شاعروں میں غالب اور نثر نگاروں

میں مولانا آزاد کی اناء سے جب ہماری ملاقات ہوتی ہے تو ہم صرف قائل ہی نہیں ہوتے بلکہ متاثر بھی ہوتے ہیں اس کے برخلاف یگانہ چنگیزی کی بھونڈی اناء ہمارے چہروں پر ناگواری کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اناء کے بھی دو روپ ہیں۔ دو کردار ہیں۔ اور اس کا کوئی تیسرا کردار اور چہرہ نہیں ہوتا اگر ہوتا ہے بھی تو پھر وہ دوغلی اناء ہے۔ جس کوئی نام نہیں ہوتا۔ جہاں تک خطیب کی اناء کا تعلق ہے اُس نے خود کو انفرادی اناء کی سطح سے اُٹھا کر اجتماعی اناء کے حوالے کیا۔ اور یہی اُس کی مقبولیت کا راز ہے!

اس کی بجائے خطیب کی شخصی زندگی میں یہی اناء بڑے بھونڈے اور بھدے انداز میں ہاتھ میں ہاتھ ملا ہوئی نظر آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خطیب اُس خطیب سے قطعی مختلف ہے جو شاعری میں نظر آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اُس گوشت پوست کے خطیب سے ملنے کے بعد کوئی یہی سمجھ سکتا تھا کہ وہ مرحوم حیدرآباد کا کوئی دیوالیہ نواب ہے جو سٹّہ میں اپنا سب کچھ ہار چکا۔ یا کسی دفتر' شادی خانہ آبادی کا منتظم ہے جو دو دلوں' دو جسموں اور دو خاندانوں میں رشتہ پیدا کرنے کا کاروبار کر رہا ہے۔ ابھی آپ سے بات کر رہا ہے اور اب آپ کو چھوڑ کر دوسرے سے بات کرنے لگے گا اور پھر دوسرے کو چھوڑ کر تیسرے سے بات کرنے چلا جائے گا۔ ایسے میں کوئی عہدہ دار یا منسٹر آجائے تو سب کو چھوڑ کر ادھر کا رُخ کرے گا۔ اور آپ یہ سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ یہ خطیب ہے یا سری نواس لاہوٹی!

اگر اس محفل میں خواتین بھی شریک ہیں تو خطیب کا حال کچھ مت پوچھئے۔ بار بار اپنی چمکتی ہوئی تالو پر ہاتھ پھیر کر اُنھیں ترچھی میڑھی ترچھی نگاہوں سے دیکھے گا۔ اور اگر کالج کی کوئی لڑکی آٹوگراف بک لئے اُس کے قریب آئے تو پھر وہ سب کو بھلا کر اُس کی طرف جھک جائے گا۔ اور بعد میں آہ بھر کر اپنے کسی قریبی دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے گا: "کیا بولوں پاشا! کتّی عورتاں اور کتّی بچیاں مجھ سے محبت کرتی ہیں!"

عمر کی اس منزل میں چاہے جانے کی یہ آرزو خطیب کی وہ محرومی ہے جو اُس کا مقدر بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ خطیب کو شخصی حیثیت میں کسی نے نہیں چاہا۔ اور اُسے محبت نام کی کوئی جنس زندگی کے اس بازار میں نہیں ملی۔ ملنا تو بڑی بات ہے۔ وہ جہاں جہاں بھی گیا یہ جنس اُس کے راستوں سے دور ہوتی گئی۔ حد یہ کہ بچپن میں ہی وہ، زندگی کی ریس میں اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔ بچپن کی بات چھوڑیئے۔ پیدائش کے ساتھ ہی تقدیر اُس سے روٹھ گئی۔ ۱۹۱۹ء میں بیدر کی سرخ زمین کے ایک موضوع چنگوپا (معین آباد) میں وہ پیدا ہوا۔ اور چھ مہینے کی عمر میں یتیم و یسیر ہو گیا۔ اور پھر اپنے چچا عبدالقادر خطیب کے زیرِ پرورش آیا۔ لیکن چچا کا ساتھ چھوٹ گیا اور قسمت نے بڑی بے رحمی سے اُسے گھسیٹ کر زندگی کی کھردری سڑک پر چھوڑ دیا اور وہ در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگا۔ اُس کے رشتہ دار اور اس کے خطیب خاندان کے افراد جن کے علم و فضل کا ذکر خطیب کے کم و بیش تمام نقادوں نے کیا ہے' انجان ہو گئے اور خطیب کے نقادوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ اس کم عمر لڑکے کو کن کن راستوں سے گزرنا پڑا اور پھر اُس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جو ایک یتیم کے ساتھ ہوتا ہے!

میں خطیب کا نقاد نہیں ہوں۔ خطیب کا دوست رہوں۔ اور اسی لئے میں اُس کی زندگی کے اُس راز سے واقف ہوں جس پر پڑے ہوئے پردے کو خطیب نے خود اپنے ہاتھ سے اُٹھایا تھا۔

یہ کوئی بائیس سال پہلے کی بات ہے' ملک کی لسانی تقسیم ہوئی۔ اور میں ایک جنس کی طرح آندھرا پردیش سے کرناٹک میں اکسپورٹ کیا گیا۔ ویسے بطور میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔ لیکن چند مہینوں کے بعد مجھے ملبرگہ میں متعین کیا گیا۔ جو ایک طرح سے خلیب کا وطن تھا۔ خلیب نے مجھ سے ملاقات کی' دوستی کی' اور میرے آمد کے فوری بعد اُس نے ایک شاندار دعوت دی' جو خلیب اپنے ہر دوست کو دیتا تھا۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ خاص بات تو اُس وقت ہوئی' جب خلیب نے اپنی مشہور نظم "پگڈنڈی" سنائی۔

میں کنواری چھوریوں کی ایک لمبی سانس ہوں
دو دلوں میں چبھنے والی ایک بنگی پھانس ہوں
ہاتھ میں جنگل کے ہوں تقدیر کی ٹیڑھی لکیر
کہ پکا وعدہ ہوں مشتی ٹوٹی آس ہوں
موں اندھیارے کو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں میں جی نور بن جاتی ہوں میں

آگے بڑھ کر نظم کے کلائمکس پر پگڈنڈی یوں اظہار خیال کرتی ہے:

شام کے وہ پاپی پاداں مجھ پہ آ سکتے نہیں
میں تو اپنی گرد کو بھی وہ پا سکتے نہیں!
ان کے سنڈکاں لمبے دھوکے کالے پتھر کے دلال
میری ترمی شرماتی مرکو لا سکتے ہیں!
نیک ہو کو بد کی ساتھی کیسے ہو سکتی ہوں میں
پاپ کے بھرپور مٹکے کیسے ڈھو سکتی ہوں میں

خلیب کی اس نظم کو سن کر میں حیران رہ گیا!

اور پھر اس کے ساتھ ہی مجھے خلیب کی ایسی نظمیں سننے کو ملیں جن میں اس دیس کی مٹی کی خوشبو تھی۔ اور عوام کے دلوں کی دھڑکن اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ خلیب نے یہ ذہن' یہ دل اور یہ شعور کہاں سے پایا جو صرف عوامی زندگی کی بھٹی میں تپ کر نکلتا ہے۔

یہ سوال میرے ذہن میں بار بار آرہا تھا اور میں خلیب کو کرید رہا تھا۔ خلیب سہہ نہ سکا۔ بے چین ہو گیا گویا بھرا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی زندگی کی بھٹی میں تپ کر نکلا ہے یہ عوامی شعور اور ذہن اُس نے ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو سے حاصل کیا اور نہ کسی یونیورسٹی کے سیمینار سے بلکہ براہ راست اُس نے زندگی سے اور اُس گھر سے حاصل کیا جہاں وہ خادم تھا۔ اور جہاں وہ چار سال تک ایک ادنیٰ ملازم کی طرح کام کرتا رہا۔ اُس کے اہم بنیادی فرائض میں گھر کی جھاڑو دینا' پانی بھرنا اور جنگل سے لکڑیاں چُن کر لانا تھے۔ یہی نہیں' ہانڈیاں اور برتن مانجھ کر چمکانے کا مقدس فرض بھی اُس کے ذمہ تھا۔ حالانکہ اُس وقت

خطیب کی عمر اتنی ہی تھی جتنی عمر میں متوسط طبقے کے بچے بغدادی قاعدہ ختم کر کے نصاب کی پہلی کتاب پڑھنے لگتے ہیں۔ یعنی یہ کوئی چھ سال کی عمر تھی۔ دوران چھ برسوں میں گو سب کچھ ہو گیا۔ زندگی کی اور عمر کی کئی صدیاں اُس پر بیت گئیں۔ اور دنیا اُن کے لئے ایک کھلی کتاب بن گئی۔ اس طرح خطیب کا پہلا معلم وہ مدرس صاحب تھے جنہوں نے ایک یتیم لیسر لڑکے سے اپنے گھر کی ہانڈیاں منجوا کر خطیب کو عملی زندگی اور انسانی رشتوں کا پہلا درس دیا!

یہی نہیں بلکہ چھ سال کا یہ معصوم بچہ خونی رشتوں کے اُس مفہوم کو بھی سمجھنے لگا جن کا بڑے زور و شور سے... پروپگنڈہ کیا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے اس چھوٹی سی عمر میں ایک جہاں دیدہ بوڑھے کی طرح سب کو دیکھ لیا۔ پرکھ لیا۔ اور انسانی سماج کی طبقاتی تقسیم اپنے پورے خط و خال کے ساتھ اُس کے سامنے آگئی اور شاید چھ سال کی عمر کا یہ وہ زمانہ ہے جب خطیب نے لاشعوری طور پر ایک غیر طبقاتی سماج کی آرزو کی تھی اور جس کا اظہار وہ بعد میں ایک شاعر کی حیثیت سے کرنے لگا۔

لیکن ان واقعات کو سمجھے بغیر ہم کسی فنکار کی صحیح قدر سے واقف نہیں ہو سکتے۔ بچپن کا زمانہ اب بھی اُسے یاد تھا۔ دیکھئے اب بھی وہ اپنی محرومیوں کا کس طرح ذکر کرتا ہے ــــ

"میں نے دس سال کی عمر تک جوتا نہیں پہنا، ٹوپی نہیں پہنی۔ البتہ ہر بچے کے خوبصورت جوتے بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔ ایک دن ایک امیر زادے کی ترکی ٹوپی سر پر رکھ کر بڑا خوش ہو گیا۔ نرم نرم ٹوپی۔ پھندنے والی۔ اُف کتنی عظیم ہوتی ہے۔ میرا سر اونچا ہو گیا!"

اُس وقت واقعی خطیب کا سر اونچا ہوا یا نہیں یہ ایک دوسری بحث ہے۔ لیکن بعد میں خطیب کا سر اونچا ہو گیا۔ اُس قیمتی ٹوپی کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کی شاعری کی وجہ سے ـــــ

نئے کپڑوں اور اچھی ٹوپی کی خواہش کس بچے کو نہیں ہوتی۔ ملاحظہ کیجئے ایک یتیم لیسر بچہ کس طرح ماں کی قبر پر عید کا سلام پیش کرنے گیا ہے۔

تیری تربت پہ موتیاں برسو
چار آنسو چڑھانے لایا ہوں!
ننگے پاواں سے پھٹے کپڑاں سے
عید کا سلام کرنے آیا ہوں
کون پوچھے گا ہم یتیماں کو
کون آتا ہے، غم اُٹھانے کو

سارے لوگاں ہیں سب کتاباں ہیں ابن مریم نہیں زمانے میں

یہی نہیں خطیب کو لڑکپن میں بھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جو ایک نارمل نفسیات رکھنے والے بچے کو بڑی آسانی سے ذہنی طور پر تہس نہس کر سکتے تھے۔ لیکن خطیب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا آشنا ہو چکا تھا کہ اُس پر بڑا زہر بھی اثر نہ کر سکا۔ غور کیجئے کہ دس سال گزر جانے کے بعد

ی اُس کی زندگی میں نہ ایک ٹوپی آئی اور نہ اُس کے ننگے پاؤں کو جوتا نصیب ہو سکا۔ برہنہ سر اور برہنہ پا
ڑ کا ایک روٹی کے لیے گھر گھر ہانڈیاں مانجھتے ہوئے گھومتا پھرتا رہا۔ جہاں روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہوں
تے اور ٹوپی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن خطیب کی اُس حِس کو کیا کہیئے جو اُس وقت بھی ایک رگ کی طرح
ھڑکتی تھی۔ اور ایک اُجلے نئے جوڑے کے خواب دیکھتی تھی۔

ایک دن پڑوس کی مہربانی سے اُسے ایک اُجلا نیا جوڑا نصیب ہوا۔ لیکن کیسے؟ اور کیوں؟ اِس کا جواب
د خطیب کی زبانی سُنیئے : کہتا ہے —— :

"ایک دفعہ پڑوس والوں نے اپنے لڑکے کے لئے لایا ہوا کفن جو بچ گیا تھا، میرے
حوالے کیا —— میں ایک عید کو اُس کا قمیص اور پائجامہ بنوا کر پہن لیا —— اور عید
کا میرا یہ پہلا نیا جوڑا تھا۔"

کسی کا کفن کسی کے لئے عید کا لباس بن سکتا ہے۔ افسانوی مبالغے سے کم نہیں۔ لیکن یہ مبالغہ نہیں بلکہ زندگی
ی ایک اَن مٹ سچائی ہے۔ تصوّر کیجیے کہ اُس گیارہ بارہ سال کے لڑکے نے کتنے ہی چاؤ سے عید میں جوڑا سلوانے
ی خاطر کفن کو محفوظ کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ بات بھی عین ممکن تھی کہ وہ اُسی وقت سلوا کر پہن لیتا۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔
لکہ عید کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اور پھر اُس پر طرفہ تماشہ یہ کہ وہ اُس کا پہلا نیا جوڑا تھا!

مدرسہ جانے کی سہولتیں تو اُسے اُس وقت ملیں جب کہ ایک مولوی صاحب نے اُس پر رحم کھا کر "ترکاری
انے والے چھوکرے" کی خدمت پر اُس کا تقرر کیا۔ لیکن مولوی صاحب کی یہ نوازش زیادہ دن تک اُس کے حصّے میں
: آسکی کیونکہ مولوی صاحب کی بیگم صاحبہ ذرا کیا خاصی سخت گیر واقع ہوئی تھیں۔ لہٰذا نئی روٹی کی تلاش میں خطیب کو دوسرے
ھروں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑے۔ پھر وہ ایک کتب فروش کے ہمراہ سر پر کتابیں ڈھوتا ہوا گلبرگہ پہنچا۔
پھر ان کے ساتھ وہ اپنے وطن چینگٹہ پا پہنچا۔ اپنی بڑی بہن اور بھائی سے ملا۔ خطیب کے بھائی ضلع میدک میں
انسپکٹر تھے۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی کے زیر سایہ اُس نے پانچویں جماعت سے لے کر میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔
اور اس کے بعد حیدرآباد میں نامپلی ہائی اسکول میں شریک ہو گیا۔ میٹرک اُس نے یہیں سے پاس کیا۔
پھر کیا ہوا؟ پھر وہی ہوا جو دنیا کے ہر ستائے ہوئے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی حالات نے پھر پلٹا کھایا۔
خوشی اور بہتر زندگی کی ایک ہلکی سی کرن جو چمکی تھی، ماحول کے گھنے اندھیرے میں کھو گئی۔ بھائی اور بہن کا
انتقال ہو گیا۔ لیکن بڑی بہن نے اپنے چھوٹے بھائی خطیب پر ایک احسان یہ کیا کہ مرتے مرتے اپنے دونوں بچوں
کو اُس کے حوالے کر دیا۔ بھائی نے اپنی مرحومہ بہن کی نشانیوں کی دل و جان سے پرورش کی۔ لکھایا، پڑھایا،
شادیاں کیں اور اُس کی محنتوں کا اُسے پھل یہ ملا کہ وہ دونوں بھائی بہن یعنے خطیب کی بھانجی اور بھانجہ اپنے
ماموں کے سامنے ہنستے کھیلتے مر گئے۔ اور خطیب نے انہیں بھی اپنے ہاتھ سے دفن کیا۔ اور اس کے بعد خطیب
پھر دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ کہتا ہے:

"ایک تنہا بے برگ و بار درخت کی طرح میں دنیا میں تنہا رہا۔ پھر وہ سب کچھ مجھ پر ہوا، جو ایک

جو ایک دوزخی کے لئے جہنم میں ہوتا ہے۔ یہ دنیا میرے لئے ایک جہنم بن گئی ــــــ"

خلیب کا یہ شعوری سفر اس کی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ تھا اور اس کے لئے خلیب کو بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اب تک جو خلیب گلبرگہ کی ٹیڑھی میڑھی سڑکوں پر موٹر سیکل پر گھومتا نظر آتا تھا وہ ایک خوشحال خلیب تھا۔ آج وہ ہم میں نہیں ہے لیکن اس کی خوش حالی کی کہانی خود اُس کی زبانی سنئیے :

"مجھے کافی شہرت ملی۔ اس سے میں مطمئن ہوں۔ مجھ سے یار لوگوں نے صرف حسد کیا دشمنی نہیں کی۔ مجھے بعض خواتین نے بے پناہ چاہا۔ وہ میرے فن کی میری شاعری کی مداح ہیں ــــ پروفیسر مبارز الدین رفعت نے مجھ پر مضامین لکھے۔ پروفیسر ہاشم علی تو میرے حافظ ہیں ــــ عاتق شاہ ایک ملکوتی انسان ہے ایک بڑی بارگاہ کی ٹھنڈی دعا۔"

یہ بات خلیب نے دسمبر ۱۹۶۸ء میں کہی جب میں پروفیسر مبارز الدین رفعت مرحوم کی فرمائش پر مضمون لکھ رہا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی اور ابھی تک خلیب کی خوشحالی کو دیکھ کر کوئی اُس تڑپ کا اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔ جو اُس کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ محض اس لئے کہ فن کار کا ظاہر ایک نہیں ہوتا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خود کو چھپاتا بھی ہے۔ لیکن سچا فن کار اپنے فن میں خود کو چھپا نہیں سکتا۔ اس لئے خلیب کو دیکھنا ہے تو اُس کے اپنے آرٹ میں دیکھئے۔ اس حیثیت میں خلیب مجھے روس کے مقبول ادیب میکسم گورکی سے صرف اس حد تک مشابہ نظر آتا ہے کہ وہ بھی بچپن میں لوگوں کے گھروں کی ہانڈیاں اور برتن مانجھتا تھا۔ معاوضے میں اُسے قلیل رقم کے علاوہ جھڑکیاں اور طعنے ملتے تھے اور کھانے کو وہ کھرچن جو چولہے کی فضا میں کسی ہانڈی یا برتن میں پڑی ملتی۔ دونوں کے تجربے ایک ہیں۔ زندگی اور دنیا نے دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا سلوک کیا اور وہ یہ کہ کسی کو سلنے کپڑے سلوانے کے لئے کفن سے نوازا گیا۔ اور کسی کو کتابوں کے مطالعے کے لئے لائبریری کی فیس دی گئی۔ لیکن روس اپنی جگہ روس ہے اور ہندوستان ماشاء اللہ سے ہندوستان ہے۔ مگر اس کے باوجود زندگی کی بے رحم حقیقتیں کسی جغرافیائی حد بندی کو ملحوظ نہیں رکھتیں اور اس کا نفسیاتی ردِّ عمل دنیا کے کسی بھی انسان پر وہی ہوگا جو خلیب اور گورکی پر ہوا۔ فرق اتنا ہے کہ گورکی نے بڑے فخر کے ساتھ اپنی سوانح حیات میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور خلیب نے اپنے ماضی پر ایک چمکیلا پردہ ڈال لیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس کے کسی دوست عاتق شاہ نے خود اُس کی زندگی میں اُس سے تفصیلی گفتگو کے بعد اُس پردے کو اُٹھانے کی کوشش کی لیکن خلیب کے پڑھنے والوں کو اس پر چونکنا چاہیئے اور نہ افسوس کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہر سچے فن کار کو وہ زہر مسکراتے ہوئے پینا پڑا، جسے دنیا نے اُس کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس اعتبار سے میں خلیب کی عزت کرتا تھا کہ اُسے اپنا ماضی یاد تھا۔ یہی نہیں بلکہ کھلے دل کے ساتھ اُس نے اُن حقیقتوں کا اعتراف کیا اور دنیا نے جتنا خلیب کو دیا اُس سے کہیں زیادہ خلیب نے اپنی طرف سے اضافہ کر کے دنیا کو لوٹا دیا۔ پہلے خلیب مقروض تھا اور اب دنیا مقروض ہے!

آخر میں، میں اُس کی دو تین نظموں کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔ جو اُس کے ذہن کی نمائندگی بھی کرتے ہیں ...

کاٹو کھیتاں، کاٹو رے　　گھر گھر دولی باٹو رے
کھیت میں پکی پولے رے　　سونا چاندی ڈولے رے
پاک پون کے پلو میں　　منگے، موتی رولے رے
کاٹو کھیتاں، کاٹو رے

لیکن شاعر کی خوشیاں ختم ہو جاتی ہیں — خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور کوئی اس پہ اس تلخ حقیقت کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

دھان کی بالی جھک کے بولی　　کن کا کھا کو، کن کا گاتے
کالے کوتے آئیں گے　　دانہ دانہ کھائیں گے
بھارت ماتا روے گی　　چپکے جاناں جائیں گے

لیکن دیکھئے کسان مایوس نہیں ہوتا۔ یا یوں سمجھئے کہ خطیب مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک بھرپور یقین کے ساتھ ایک نئی آواز دیتا ہے:

اُٹھو بھیکی ٹھائیں گے　　نوتے رستے کائیں گے
آنکھ سے آنسو پوچھیں گے　　جگ میں خوشیاں پائیں گے
کاٹو کھیتاں، کاٹو رے

میٹھا میٹھا موٹ کا پانی، پہلی تاریخ، محبوب صاحب یور محبوب بی، میاں کے دوست اور ساس بہو، وہ نظمیں ہیں جو خطیب کے ذہنی شعر کی نشاندھی کرتی ہیں۔ ان کے موضوعات بھی وہی ہیں جن سے ہماری زندگی عبارت ہے۔ ان نظموں میں شاعر کا نقطہ نظر بہت ہی واضح ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک تماشائی کی نہیں بلکہ ایک ڈھکے چھپے کردار کی ہے جو محبوب صاحب کا لبادہ اوڑھ کر اپنی بیوی محبوب بی سے زندگی کے تلخ حقائق پر بات کر رہا ہے۔ پہلی تاریخ صرف خطیب کی نہیں بلکہ ہر گھر کی کہانی ہے۔ پہلی تاریخ تو آتی ہے لیکن تنخواہ ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ اور دوسرا ہاتھ سیٹھ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

کیوں کا جواب یہاں ملتا ہے۔ اور نہ شادی بیاہ کے اُس خالص کمرشیل انداز میں جو سماجی زندگی کے لئے ایک دوسرے سے کم نہیں۔ چنانچہ یہی لوٹ کھسوٹ کی ذہنیت جب چھوٹا چھوڑی کے کینوس پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے تو بات بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے آتی ہے۔ "ساس بہو" تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ مگر یہاں بھی روایتی ساس کا وہی رول ہے۔ جو طرح طرح سے اپنی بہو کو جلاتی ہے۔ مقابل میں ایک تعلیم یافتہ بہو کا کردار ہے جو اپنی ساس کی ہر جلی کٹی بات سنتی ہے مگر اف نہیں کرتی۔ اس تضاد سے خطیب نے نہ صرف ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے بلکہ ظالم و مظلوم کو اُن کے صحیح خط و خال میں پیش کیا ہے۔ اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ اب قاری کو یا سامع کو خود سے پوچھنا چاہیئے کہ وہ کس کی طرف ہے؟ ظالم کی طرف یا مظلوم کی طرف؟

خطیب کے شاعرانہ کردار اور اس کے موڈ کو سمجھنا کچھ اتنا مشکل نہیں۔ شروع سے آخر تک اگر اُس کے لب و لہجے پر غور کیا جائے تو یہی محسوس ہوگا کہ کہیں بھی اُس نے اپنی بات منوانے کے لئے اصرار نہیں کیا۔ اور نہ سستی جذباتیت کا سہارا لے کر سامع کو دھلانے کی کوشش کی۔ بلکہ ہر جگہ اور ہر سطح پر اپنے تیکھے طنز سے اُس نے تصویر کے

وہ رُخ پیش کئے ہیں۔ اور اُس کے تضاد کو پوری طرح اُبھارا ہے۔

عشق و محبت جیسے نازک جذبوں پر بھی اُس نے نظمیں کہی ہیں۔ لیکن کانچ اور بلور کے اس کاروبار میں وہ خود زخمی ہوا، اور دکسی کو زخمی کیا۔ پڑوسن' یاد' اور دکنی عورت کا انتظار اس کی وہ نظمیں ہیں جن میں ایک چاہنے والے یا چاہنے والی کا بے چین دل دھڑک رہا ہے!

خطیب صرف دکن کا نہیں بلکہ سارے ملک کا شاعر تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس نے جس میڈیا کو اپنایا وہ دکنی تھی۔ اب اِسے شاعر کی بدقسمتی سمجھئے یا زبان کی دونوں کے ساتھ پست اقوام کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ اب خطیب تو ہے نہیں جو اس توہین کو محسوس کرے یا اس کا جواب دے۔ لیکن زبانوں میں اعلیٰ زبان، کمتر زبان اور معمولی زبان کا تصوّر بھی ذات پات کے تصوّر سے کم نہیں۔ یہ وبا تو انسانوں میں ہوتی ہے۔ زبان اعلیٰ، معمولی، اونچی اور نیچی نہیں ہوتی۔ اور نہ اس کا کوئی مذہب ہوتا ہے۔ زبان، زبان ہوتی ہے۔ البتہ یہ ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ خطیب اگر چاہتا تو وہ اپنے لئے اردو کی ترقی یافتہ شکل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ جن لوگوں نے "شاعر" اور "رقاصہ" سُنی ہے انھیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ وہ اس میدان میں کتنا آگے بڑھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی آخری سانس تک دکنی زبان کو گلے لگائے ہوئے تھا۔ اور اس کو یہی کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ دکنی زبان ہی سے اُس کی شاعری کا خمیر اُٹھا ہے۔ اور لوک گیتوں نے اُس میں روح پھونکی ہے۔ ہنسی ہنسی میں اُس نے سینکڑوں کو رُلایا ہے۔ اس لئے میں اُسے بنیادی طور پر مزاحیہ شاعر ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ خطیب دراصل غموں کا، آنسوؤں کا، دکھوں کا اور انسان کے نازک جذبوں کا شاعر ہے۔ لوگ ہنسی ہنسی میں یہ بھول جاتے ہیں کہ زخم جگر کے کتنے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ ہنسی کے ختم پر ہی انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کا دل کسی تکلیف سے پھٹ رہا ہے۔

یہ تاثر خطیب نے قریب قریب اپنی ہر تخلیق میں دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خطیب کے نقاد اُسے عظیم شاعر ماننے لگتے ہیں۔ لیکن میں خطیب کو عظیم شاعر نہیں کہوں گا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ کوئی شاعر یا فن کار صحیح معنوں میں عظیم اور غیر عظیم نہیں ہوتا۔ عظیم صرف عوام ہوتے ہیں۔ اور فن کار اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ بُرا فن کار عوام کی عظمت کو جھٹلاتا ہے۔ اور اپنی دوغلی انا کے گنبد میں بند رہتا ہے۔ اور اچھا فن کار عظمت کے اس بہتے ہوئے سرچشمے سے اپنی پیاس بجھا لیتا ہے۔ خطیب بھی ان میں سے ایک تھا۔ اب آپ کو پورا اختیار ہے کہ اُسے کسی بھی نام سے پکاریں۔

ڈاکٹر غیاث صدیقی

سلیمان خطیبؔ
ایک عوامی شاعر

دکنی
کلاسیکل شاعری
یا تو نذیر دہقانی نے کی یا موجودہ
شعراء میں سنجیدگی کے ساتھ اشرف خوندمیری
نے اُس کو اپنایا ہے۔ اس طرح دکنی شاعری کو پیش نظر رکھ کر دونوں
شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اور دکنی شاعری کی حدود میں تنقید بھی کی جا سکتی
ہے — سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیبؔ کا سارا کلام دکنی شاعری پر مبنی نہیں ہے۔ اور نہ ہی دکنی شاعری
کو پیش نظر رکھ کر ان دونوں کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ڈنڈا اور خطیبؔ عوامی شاعر تھے۔ ایک سیاسی
نقطۂ نظر بھی رکھتے تھے۔ زیادہ تر بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور سیاسی رجحانوں سے وابستگی رکھتے تھے۔
کیونکہ ان میں مظلوموں اور مجبوروں کی نمائندگی کا جذبہ کارفرما تھا۔ ہئیت، موضوع —،
روزمرہ محاورہ اور زبان کے اعتبار سے ڈنڈا اور خطیبؔ نے
دکنی کے محدود حصار سے نکلنے کی شعوری کوشش کی
ہے — عوامی خیالات، احساسات
اور جذبات کو پیش
کرنے

میں ڈنڈا اور خطیب دونوں کامیاب ہیں۔ دونوں نے غریب انسانوں کی آواز کو دھار کر بھی بنایا اور نشتر بھی۔ لیکن جہاں تک معنی آفرینی، نازک خیالی، تشبیہوں اور استعاروں کے برمحل استعمال کا تعلق ہے، خطیب، ڈنڈا سے بہت آگے ہیں۔ اس کے علاوہ خطیب کی نظموں میں مختصر کہانیوں جیسا کلائمکس بھی پایا جاتا ہے۔ ہنساتے ہنساتے، وہ کلائمکس پر پہنچ کر ذہن پر ایک ضرب لگاتے ہیں۔ یہ ضرب کبھی توپ کا گولہ بن کر ذہنوں پر گرتی ہے یا نشتر بن کر دل میں اُتر جاتی ہے۔ ویسے سرور ڈنڈا کے عہد کی شاعری آج کے ناگزیر ادبی تجربوں سے نا آشنا تھی۔ اس لئے اگر ڈنڈا نے یہ ہتھیار استعمال نہیں کئے تو اُن کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مثال کے طور پر نظم "ہراج کا پلنگ" پڑھیئے۔ قہقہے بلند ہوتے ہیں اور جب نظم کلائمکس پر پہنچتی ہے تو یہ غیر مرئی قہقہے خون کے قطرے بن کر آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں۔

پٹی میں جس کی لرزہ، پاتے ہیں جس کے رعشہ　　کروٹ بدل کے دیکھو، بجتا ہے جیسے تاشا
ہر چیز کانپتی ہے، کس کا پلنگ باشا　　مُردوں کے حال پر ہے، زندوں کا یہ تماشا
کس کا پلنگ باشا

یہاں کلائمکس دیکھئے:

اک باپ تھا بچارا، اُس نے اِسے سنوارا　　آنسو کی ہر لڑی میں 'سلمہ' کرن، ستارا
بیٹی چلی ہے گھر سے گھر میں ہوا اندھیارا　　جاتا ہے خود اُسی پر قرضوں نے اُس کو مارا
یہ ہے پلنگ اُسکا پر　　ہرّاج ہوگیا ہے

نظم کا یہ موڑ آج کے ادبی شعور کا مظہر ہے، نظم "لکھنوی شاعر اور دکنی بیوی" پڑھیئے۔

شاعر: جشنِ غالب میں غزل آج سنانی ہے مجھے　　وہ غزل میں نے کہی ہے کہ غزل جھوم اُٹھے
بیوی: چپکے بیٹھو جی، تمے خالی فقط تل منڈی　　اچھا آتا ہے تمے کرکو کمر نا معلوم ا
شاعر: یہ بھی اندازِ بیاں کتنا ہے پیارا بیگم　　اسی اندازِ بیاں نے ہمیں مارا بیگم
بیوی: تمے اُسپیچ مرسے بات کو شعراں جوڑے　　کیا نزاکت سے ابی ڈل کو پاپڑ توڑے
شاعر: کیا کڑی ٹھنڈ ہے، دروازہ تو کھولو بیگم　　کچھ ستانے کی بھی حد ہوتی ہے بولو بیگم
بیوی: پڑتے پانی میں مرو، کنڈی لگاکو بیٹھیوں　　کتے ناسور کیسے میں چھپ کو بیٹھیوں
شاعر: جیسے دیوانہ پھرا کرتا ہے کوچہ کوچہ　　کس پری رُو کے ہوئے ہم بھی اسیرِ گیسو
بیوی: پیاسے شاعر کو تو پانی نہیں دیتی دنیا۔　　منہ میں گلی، دودھ کی تربت پہ بہا دیتی ہے

اس شعر سے اُن حضرات کے ادبی ذوق پر آنچ آتی ہے جو سماج اور حکومت میں رسوخ تو رکھتے ہیں۔ لیکن شاعر و ادیب کی عزت اور اُس کی زندگی کی بنیادی ضروریات کی ترجمانی حکومت میں صرف اس لئے نہیں کرتے کہ اپنے آقاؤں کی خوشی صرف اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

یہ لوگ اہلِ زر تو ہوتے ہیں لیکن:

توانگری بہ دل است نہ بہ مال	بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال

متقی اورنگ آبادی مرحوم نے بھی کہا تھا:

متقی بھی کس قدر نادان ہے شاعر ہوا تو کیا	اُسے لوگوں سے جیتے جی اُمید قدردانی ہے
پیاسے شاعر کو تو پانی نہیں دیتی دنیا	نہریں گھی دودھ کی تربت پہ بہا دیتی ہے

نظم "مجبوری" میں دو سمدھنوں کی گفتگو ہے۔ خطیب نے شادی کی تجارت و لعنت کی طرف اشارہ کیا ہے:

دولھے کی ماں:	جوڑے لانا بھی راس نئیں ہمنا	تھو چڑھانا بھی راس نئیں ہمنا
	ہم ولیمہ تو کب بی دیتے نئیں	کھانا دانا بھی راس نئیں ہمنا

لڑکی کا باپ:	جی میں آتا ہے اپنی بچّی کو	اپنے ہاتھوں سے خود ہی دفنا دیں
	لال جوڑے تو دے نہیں سکتے	لال چادر میں کیوں نہ کفنا دیں
	اس کی تربت پہ یہ بھی لکھ دینا	زر پرستوں نے مار ڈالا ہے

ساری نظم میں اُڑنے والے قہقہے آنسو بن کر ٹپک گئے ہیں۔

نظم "اٹھائیسویں تاریخ" (ایک کلرک کی بیوہ، میاں کے مزار پر) یہ بھی ارباب حکومت پر طنز ہے۔ کہ آج بھی چپراسی، کلرک، اور سکریٹری کی تنخواہوں میں کتنا تفاوت ہے اور یہ طنز سوشلزم کے گیت گانے والی حکومت کے لئے لمحۂ فکر ہے۔ محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کر دینے والا دور کب آئے گا؟ بیوہ کہتی ہے:

روز لڑ لڑ کو جان کھا کھا کو	اچھا جنگل میں سو گئے آکو
منڈی کاٹے کو پہلے مرنا تھا	لے کو مٹھی میں جان بیٹھی ہوں
ایسا مرنا بھی کینگا مرنا جی؟	گھر میں بیٹھی جوان بیٹی ہے
کتّے لوگاں کے پاواں پڑ پڑ کو	گھر سے میت اٹھا کے لائی ہوں
کتّا احسان ہم پو کرنا تھا	تنخوا لینے کے بعد مرنا تھا

یہ نظم اختصار و اجمال کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں تبسّم، طنز اور آنسو کی کاک ٹیل پڑھنے بولنے اور پڑھنے سننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ خطیب کی کامیاب ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس میں اُس کا فن اپنے عہد کے کرب اور عصری حسیت سے مالا مال ہے۔

نظم "چمچے" میں یوں حقائق سے پردہ اٹھایا ہے کہ غرض مند ریاکار ابن الوقت دوست جھوٹی محبت کے سہارے ممدوح کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ کسی کو ذرا سی سماجی پوزیشن حاصل ہوتی ہے تو اُس کے اطراف چمچے جمع ہو جاتے ہیں۔ سارے شہر کی جھوٹی رپورٹیں اور داستانیں اپنے ممدوح کو سنا کر خوش کر دیتے ہیں۔ انعام پاتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ سرایت کرنے والا یہ خوشامد کا زہر ممدوح کو پہلے تو بدنام کر دیتا ہے اور آخر کو ممدوح سولی پر چڑھ جاتا ہے۔ بعد کو یہ خوشامد کرنے والے پیراساٹس (طفیلیے) کسی اور ممدوح کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ نظم "چمچے" یہی کہتی ہے۔

کلگیر تو کر دیتی ہے دیگوں کا صفایا مشتاق، کٹوروں میں پھرا کرتے ہیں چمچے
یاران کی عنایت ہے، نوازش ہے، کرم ہے ٹیپیں شریفوں کو لڑا دیتے ہیں چمچے
کچھ اتنی محبت سے اٹھا دیتے ہیں اوپر سرکار کو سولی پہ چڑھا دیتے ہیں چمچے

یہ سیاسی اور سماجی شعور خطیب کو اُس کے عہد نے دست بدست دیا تھا۔ خطیب نے اُس کو اپنے تجربے اور مشاہدے کی آگ میں تپا کر جواہر پاروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اب میں خطیب کی شاعری کے دوسرے رُخ کی طرف آتا ہوں۔ باریک بینی، نازک خیالی، معنی آفرینی، تشبیہوں، اور استعاروں کے برمحل استعمال نے خطیب کو منفرد شاعر بنا دیا ہے۔ نظم "پگڈنڈی" کی جھلک ملاحظہ فرمائیے:

پان پہ چھپتی، دال نکلتی، کھیلتی آتی ہوں میں دھان کے کھیتاں میں جا کر مانگ بن جاتی ہوں میں
میں کنواری چھوریاں کی ایک لمبی سانس ہوں
ایک چندری ہوں کسی کی، کھیت میں کھوئی ہوئی ایک ناگن ہوں اکیلی گھاس میں سوئی ہوئی

نظم "ندی" بھی بے مثال ہے:

گھٹتے گھٹتے گھٹ گئی تو چاند پچھلی رات کا بڑھ دُونی ہو گئی تو، بھید عورت ذات کا
سُوکھ گئی تو جیب خالی جیسے اک کنگال کا پیٹھ سے جا کو لگیا ہے پیٹ جیسے کال کا
کتنی نازک بھول سر کی جل پری کے روپ میں کچی چاندی، چاندنی میں پکا سونا دھوپ میں

خطیب اپنی مشہور نظم "یاد" میں لطیف احساسات و جذبات کو کس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں:

یاد بولے تو تکیے میں گجرے کی باس جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس
یاد بولے تو بچپن میں چھوڑے سو گاؤں جیسے پنگھٹ کے پانی میں رادھا کی چھاؤں
یاد بولے تو خالی پڑو آسنے کا خواب ایک بچے کا جیسے ادھورا جواب
یاد بولے تو جوہی کی کھلتی کلی! سوتے بالک کے ہونٹاں پو جیسے ہنسی
یاد بولے تو انکھیاں جھکانے کا نام ایک نقشہ بنا کو مٹانے کا نام!
یاد بولے تو دل میں چھپانے کی بات چپ ذرا سوچ کو مسکرانے کی بات

ایک اور نظم ہے عنوان ہے "مقتل کی شام" لیکن غزل کی آنچ صاف محسوس ہوتی ہے،

میں ظلمتوں کا دشمن ماہِ تمام جیسے لڑتا ہوں ہر بدی سے ان میں امام جیسے
کس سے کہوں میں دل کی اب کون یاں سنے گا جلوتوں میں یوں کھڑا ہوں لنکا میں رام جیسے
ہر تیغ پر، تبر پر، زنداں پہ نام میرا قاتل کو یاد ہے بس میرا ہی نام جیسے

۱۹۶۰ء میں ضلع بیدر کے تعلقہ بسوا کلیان میں حضرت تاج الدین باگسوارؒ کا سالانہ عرس شریف ہوتا ہے۔ عرس کا اختتام ایک عظیم الشان مشاعرہ پر ہوتا ہے۔ وہاں میری ڈسپنسری پر خطیب، واحی قریشی، سرور مرزائی اور صابر شاہ آبادی آتے تھے۔ خطیب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ہماری یہ اتفاقیہ سا

دوستی کئی موڑوں سے گزری، کئی نشیب و فراز آئے لیکن خلیب کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں تین [illegible] تک گلبرگہ میں تھا۔ میری ڈسپنسری پہ میرے گھر پہ وہ ہفتہ میں ایک بار ضرور آتے۔ خلیب نے اردو [illegible] گلبرگہ کی بنیاد ڈالی تو مجھے بڑی محبت وشفقت سے صدر بنایا۔ ادھر میں حیدرآباد چلا آیا تو خلیب [illegible] اُردو اکیڈیمی کے صدر تھے۔ لیکن جب بھی حیدرآباد آتے مجھ سے ضرور ملتے۔ گلبرگہ کے روزنامہ "سلامتی" کے [illegible] مجھ سے نظم یا غزل ضرور طلب کرتے۔

یہ ہنساتے ہنساتے رُلانے والا اور رُلاتے رلاتے ہنسانے والا فن کار "ریکوڑے کے بن" میں [illegible] چھپ گیا ہے۔ جیسے نظمیں سُناتے سُناتے تھک گیا ہو۔

بادِ صبا کا ایسا جھونکا
کس گلشن میں جاکر
شبنم کی چادر کو تانے
کلیوں کے بھیگے بستر پہ
مُسکانوں کی ملبسی لمبی نم پلکوں میں
تھک کر آخر لیٹ گیا ہے۔

آپ کا واجب الادا انکم ٹیکس!

کیسے تخمینہ لگایا جائے؟

اگر آپ منفرد شخص یا غیر منقسم ہندو خاندان ہیں تو درج ذیل گوشوارہ و شرح آپ کے لئے مددگار ہو سکتا ہے

۱۹۷۸-۷۹ کے تخمینے کے لئے انکم ٹیکس کی ۱۹۷۸-۷۹ء کے دوران قابل ادا پیشگی ٹیکس کی شرحیں:

کل آمدنی (سلیب) حدیں		ہر منفرد شخص یا غیر منقسم ہندو خاندان کے لئے قابل ادا ٹیکس (تیسرے کالم میں درج کو چھوڑ کر)		ہر اس غیر منقسم ہندو خاندان کیلئے قابل ادا ٹیکس جس کے کم سے کم ایک ممبر کی کل آمدنی دس ہزار روپے سے متجاوز ہے۔	
1		2		3	
سے	تک	مقررہ حد کیلئے طے شدہ رقم	تبدیل پذیر برح رقم بہ مطابق درج ذیل	مقررہ حد (سلیب) کے لئے طے شدہ رقم	تبدیل پذیر برح رقم بمطابق درج ذیل
	10,000 تک	کوئی نہیں		کوئی نہیں	
10,001	سے 15000 تک	کوئی نہیں	برح 15 فیصد 8 ہزار روپے سے متجاوز پر *	کوئی نہیں	برح 18 فیصد 8 ہزار روپے سے متجاوز پر **
15,001	سے 20,000 تک	1,050	برح 18 فیصد 15 ہزار روپے سے متجاوز پر	1,260	برح 25 فیصد 15 ہزار روپے سے متجاوز پر
20,001	سے 25,000 تک	1,950	برح 25 فیصد 20 ہزار روپے سے متجاوز پر	2,510	برح 30 فیصد 20 ہزار روپے سے متجاوز پر
25,001	سے 30,000 تک	3,200	برح 30 فیصد 25 ہزار روپے سے متجاوز پر	4,010	برح 40 فیصد 25 ہزار روپے سے متجاوز پر
30,001	سے 50,000 تک	4,700	برح 40 فیصد 30 ہزار روپے سے متجاوز پر	6,010	برح 50 فیصد 30 ہزار روپے سے متجاوز پر
50,001	سے 70,000 تک	12,700	برح 50 فیصد 50 ہزار روپے سے متجاوز پر	16,010	برح 55 فیصد 50 ہزار روپے سے متجاوز پر
70,001	سے ایک لاکھ تک	22,700	برح 55 فیصد 70 ہزار روپے سے متجاوز پر	27,010	برح 60 فیصد 70 ہزار روپے سے متجاوز پر
1,00,001	اور زیادہ	39,200	برح 60 فیصد ایک لاکھ روپے سے متجاوز پر		

سرچارج: درج بالا شرحوں کے مطابق قابل ادا انکم ٹیکس کے علاوہ ۱۰ فیصد کے برابر سرچارج بھی قابل ادا ہے۔

* اگر کل آمدنی 10,540 روپے سے متجاوز نہیں تو قابل ادا انکم ٹیکس کی رقم 10,000 روپے سے متجاوز کل آمدنی کے 70 فیصد سے زیادہ نہ ہوگی۔

** اگر کل آمدنی 10,600 روپے سے متجاوز نہیں تو قابل ادا انکم ٹیکس کی رقم 10,000 روپے سے متجاوز کل آمدنی کے 70 فیصد سے زیادہ نہ ہوگی۔

ٹیکسوں کا صحیح تخمینہ لگائیے اور بروقت ادا کیجئے

جاری کردہ: ڈائریکٹر آف انسپکشن (ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن) محکمۂ انکم ٹیکس، نئی دہلی

DAVP 78/282

پریم کشور بیگم
اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمۂ زراعت

ہمارا دکنی شاعر سلیمان خطیب

آج سلیمان خطیب ہم میں نہیں ہیں یہ سوچ کر بھی خیال کانپ اُٹھتا ہے۔ قلم تھر تھرانے لگتا ہے۔ دکن کا یہ عظیم شاعر جس نے دکن کی دھرتی میں جنم لیا تھا۔ دکن کی ہی سرزمین پر اپنے جسد خاکی کو خیرباد کہا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کی رات عثمانیہ دواخانہ حیدرآباد میں سلیمان خطیب کا انتقال ہوا۔ سلیمان خطیب کی دکنی زبان میں شاعری نہ صرف دکن بلکہ کشمیر کی وادیوں میں، ہمالیہ کی ترائیوں میں، یو۔ پی کے مرغزاروں میں اور بمبی و مدراس کی سمندری ہواؤں میں آج تک گونج رہی ہے۔ سلیمان خطیب مر سکتا ہے لیکن اس کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

سلیمان خطیب کی پہلی تخلیق شاید " دھنڑیوں کے سبز آنچل " تھی۔ ۳۵، ۳۶ سال تک دکنی زبان میں شاعری کرتے رہے۔ ان کی شاعری میں طنز و مزاح کا بہت پیارا سنگم ملتا ہے۔ دیکھا جائے تو طنز کی چاشنی ہی زیادہ رہتی ہے۔ ہنسی ہنسی میں بڑے کام کی اور بڑے پتے کی بات بتا جاتے ہیں ــــــ یوں تو انہوں نے سینکڑوں نظمیں لکھی ہیں۔ پر ساس بہو " یتیم خانے کے چھوکرے " " پہلی تاریخ "، لک ڈوانہ مخدوم، پگڈنڈی، موٹ کا پانی، شاعر کی بیوی، پڑوسی، لکھنوی شاعرن کی دکنی بیوی وغیرہ کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

جب ڈاکٹر برناڈ نے آپریشن کے ذریعہ دل بدلنے کی کامیاب کوشش کی تو خطیب خاموش نہ رہ سکا۔ وہ کہہ اُٹھا،

سائنٹیکو دل کو مرے بدل ڈالے   اُن کے جیسا ان بجے ستاتے ہیں
اُن کے عاشق تھے جتنے دنیا میں!   میرے خوابوں میں آ ستاتے ہیں

خطیب اپنے سامعین کو ہنساتے ہنساتے رُلا دیتے تھے۔ ابھی تو لوگ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہے تھے اور

ابھی دنیا کی تلخ حقیقتوں کا ذکر ہوتے ہی سارا منظر بدل جاتا ہے اور سامعین کی آنکھوں میں نمی آجاتی ہے ــــ انہوں نے شاعر کی بیوی میں ایسا ہی ایک خوبصورت منظر کھینچا ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے؛

یہ بھی انداز ہیاں کتنا ہے پیارا بیگم ۔۔۔ اسی انداز بیاں نے ہمیں مارا بیگم
تم پہ قربان سمرقند و بخارا بیگم ۔۔۔ واہ کیا خوب، مکرر ہو، دوبارا بیگم

اور پھر وہ آگے کہتے ہیں؛

مرگِ شاعر ہے کوئی کھیل نہیں ہے نادان ۔۔۔ ہم جو مر جائیں گے اک شورِ فغاں اٹھے گا
غزلیں روتی ہوئی سر پیٹ کے ڈھونڈے گی ہمیں ۔۔۔ شعلہ بجھ جائے گا شمع سے دھواں اٹھے گا

سلیمان خطیب نے اس بند میں اپنی موت کی کتنی صحیح ترجمانی کی تھی۔ آج درحقیقت غزلیں روتی ہوئی اپنے خالق کو ڈھونڈ رہی ہیں ــــ ان کی اس شگفتہ جمی شاعری میں طنز و مزاح کا کتنا نچوڑ رہتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال ان کی 'پڑوسی' کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیے؛

کیا خوب پڑوسی ہے پڑوسی بھی ہمارا ۔۔۔ صورت سے نظر آتا ہے منحوس بے چارا
دیوار کے اس پار ہے صدقے کا اتارا ۔۔۔ ہر روز چمکتا ہے یہ دم دار ستارا
دنیا کے شریفو ادھر آؤ ادھر آؤ ۔۔۔ انجیل بتاؤ اسے قرآن بتاؤ
محبوب خدا کا اسے فرمان بتاؤ ۔۔۔ انسان ہے کیا چیز کہ انسان بتاؤ

ٹھیٹ دکنی زبان اور انتہائی سلیس اردو کا اچھوتا سنگم ہیں ان کی ایک اور تخلیق 'لکھنوی شاعر کی دکنی بیوی' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ بھی دیکھئے؛

دکنی بیوی؛

ابی سو تیچ پڑیں یونچ اٹھانے کو چلو ۔۔۔ چھوکرا رونے لگیا کاندھے پہ بٹھانے کو چلو
چھوکرے اسکول کو جانے لگیں چھلکے مر ہیں ۔۔۔ تیلی ترکاری کی کاندھے سے لگانے کو چلو

لکھنوی شوہر؛ ۔۔۔ آماں چلتا ہوں ابھی اتنی بھی جلدی کیا ہے ۔۔۔ نو نے مصرعوں کو ذرا ٹھوک بجالوں تو چلوں

اور شاعر پھر آگے کہتا ہے؛

جشنِ غالب میں غزل آج سنانی ہے مجھے ۔۔۔ وہ غزل میں نے لکھی ہے کہ غزل جھوم اٹھے
شعر سنتے ہی اتر آتے ہیں پلکوں پہ نجوم ۔۔۔ کہکشاں ٹوٹ پڑے دل کا کنول جھوم اٹھے
دیدنی ہے مرے افکار کا یہ عکسِ جمیل ۔۔۔ جیسے جمنا میں حسیں تاج محل جھوم اٹھے

کوئی ہے جو اس انداز میں دونوں زبانوں کا ایسا حسین امتزاج پیش کر سکے۔ ان کی اس انفرادیت کو آج تک کوئی چھو نہ سکا۔ خطیب کو ڈھولک کے گیت بھی بہت پسند تھے وہ ۲۵ سال تک دکنی لوک گیت جمع کرتے رہے۔
ان کی شاعری میں ایک اور خاص بات تھی اور وہ تھی بہترین تمثیلیں۔ ان کا یہ انداز جتنا نرالا تھا اتنا ہی انوکھا بھی تھا۔ معمولی سی بات کو بھی دل موہ لینے والے الفاظ میں پیش کرنا ان کا ہی طرۂ امتیاز تھا۔ دیکھئے وہ یتیم بچے کے رونے

اور دوسری صفات بتانے میں کیسی تمثیلیں پیش کرتے ہیں؛

اُس کی انکھیاں سے پانی بہتا ہے ۔۔۔ کپا مٹکا پجھرتے رہتا ہے
اُس کی عادت ہے جھاڑ کی عادت ۔۔۔ چھاؤں دیتا ہے دھوپ سہتا ہے

اور پھر یہ ملاحظہ فرمائیے:

پوٹا تر پٹ ہے ہاف بیگن ہے ۔۔۔ منہ پہ چیچک سڑا سیتاپھل ہے

راستوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ کتنے رستوں سے آپ واقف ہیں؟ اگر آپ لاعلم ہیں تو سلیمان خطیب کی زبان سے اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے وہ کہتے ہیں:

یہ ہے گیتا کے پاٹ کا رستہ ۔۔۔ یہ ہے گوتم کی لاٹ کا رستہ
یہ ہے بائبل کے تھاٹ کا رستہ ۔۔۔ یہ ہے چوروں کے ہاٹ کا رستہ
رستے مقتل سے ہو کے جاتے ہیں ۔۔۔ رستے خوناں میں نہا کو آتے ہیں

اور آگے کہتے ہیں:

یہ ہے پیاسے امام کا رستہ ۔۔۔ یہ ہے شمرِ غلام کا رستہ
یہ ہے سیتا کا رام کا رستہ ۔۔۔ یہ ہے راون کے نام کا رستہ

ان کا شعری مجموعہ "کیوڑے کا بن" اردو اور ہندی زبانوں میں شائع ہوا۔ حکومت کرناٹک نے ۱۹۷۴ء میں خطیب کی قومی و شعری خدمات کے اعتراف میں اسٹیٹ ایوارڈ دیا تھا۔ کئی ادبی اور تہذیبی انجمنوں نے انھیں سپاسنامے پیش کئے۔ ۱۹۷۵ء میں کئی انجمنوں کے تعاون سے جشنِ خطیب منایا گیا اور انھیں کیسہ زر پیش کیا گیا۔

ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے ان کا کلام ہی کافی ہے۔ ویسے احمد نگر کی یونیورسٹی میں ایک طالب علم، خطیب کی شاعری پر ایک مقالہ مرتب کر رہا ہے جو اُن کی شخصیت اور شاعری کو رہتی دنیا تک یاد دلاتا رہے گا ▲▲

موضع کی مرکزی حیثیت و اہمیت

آج کے ہندوستان میں موضع اب بھی اپنی مرکزی حیثیت و اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اور اس کی معیشت پوری قومی معیشت کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اس لئے آندھراپردیش میں زیادہ تاخیر کے بغیر بہتر مواصلاتی ذرائع کی مدد سے مواضعات کو مربوط کردیا جانا چاہیئے۔

ریاست میں مواضعات کو سڑکوں کے ایک جال کے ذریعے ملادینے کی غرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۷۹-۱۹۷۸ء کے موازنے میں ۱۱ کروڑ روپیوں کی معقول گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

آندھراپردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی اپنی مساعی کے علاوہ نجی آپریٹروں کو بھی زائد راستوں کے ذریعہ آندھراپردیش کے دور افتادہ مواضعات تک حمل و نقل کے انتظامات کے لئے ترغیبات پیش کی جارہی ہیں۔ تاکہ ایسے مواضعات کے باشندے زیادہ سے زیادہ طور پر تہذیب و تمدن کی نعمتوں سے فیضیاب ہوسکیں۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھراپردیش، حیدرآباد

DIPR NO.23/78-79

فیض الرحمان فیض

سلیمان خطیب

ملّا وجہی، نصرتی، قلی قطب شاہ، سراج، اور ولی کی زبان جو اب بھی جنوبی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس زبان کو زندہ رکھنے میں رحیم صاحب میاں، نذیر دہقانی، سرور ڈنڈا، اعجاز حسین کھٹا اور علی صاحب میاں نے جہاں اہم رول ادا کیا ہے۔ وہاں سلیمان خطیب بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ان کا کلام سامع کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ سلیمان خطیب نے اپنے کلام میں ڈرامائی انداز اپنایا ہے۔ ہر نظم کے آغاز پر وہ طنز کے تیر پھینکتے ہوئے سامع کو ہنساتے ہوئے آخر میں سبق آموز نصیحت کر جاتے ہیں۔ دوسرے شعراء کے کلام میں یہ بات نہیں ہے۔

سلیمان خطیب بیدر کے ایک تعلقہ چٹگوپہ میں خطیب خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ماں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ وہ اپنے چچا کے زیرِ پرورش رہے۔ انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول بیدر سے میٹرک پاس کیا وہ میرے اسکول میٹ رہے ہیں۔ جس زمانہ میں وہ میٹرک میں تھے، میں بھی بیدر ہائی اسکول میں آٹھویں کلاس کا طالبعلم تھا۔ مجھ میں بھی شاعری کے جراثیم حلول کر گئے تھے۔ اُس زمانہ میں میں اور سلیمان خطیب سنجیدہ اُردو میں شعر کہتے تھے اور کلام پر اصلاح جناب عبدالرحیم صاحب حیرت سے لیتے تھے۔ طالب علمی کے اس دَور میں قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ؟ بیدر کے دورہ پر تشریف لاتے تھے مجلس اتحاد المسلمین کا ایک زبردست جلسہ بیدر کے سرکاری دواخانے کے روبرو وسیع و عریض میدان میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں جناب نذیر دہقانی بھی تشریف لائے تھے۔ نذیر دہقانی کو ہم دونوں نے مذکورہ جلسہ میں کلام سناتے ہوئے دیکھا۔ دہقانی صاحب کے کلام نے ہم دونوں کو بے حد متاثر کیا۔ اُس کے بعد ہی سلیمان خطیب نے دکنی زبان کو مستقل اپنا لیا۔ اور میں نے ٹکسالی اردو کے ذریعہ مزاح کو قبول کیا۔

شاگردوں کی اس تبدیلی سے جناب عبدالرحیم صاحب حیرت بھی حیرت میں تھے کہ آخر ان بچوں کو کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن ہمارے سر میں سمائے ہوئے سودے کو وہ بھی دُور نہ کر سکے۔ انہوں نے بھی ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں سدی پیٹ ہائی اسکول کا رُخ کیا۔ سلیمان خطیب میٹرک پاس کر کے واٹر ورکس کی ٹریننگ کے لئے کلکتہ روانہ ہوئے ٹریننگ کے اختتام

ے بعد خطیب گلبرگہ میں واٹر ورکس سے وابستہ ہوئے اور وہیں سے ۱۹۷۷ء میں حسن خدمت پرسبکدوش دئے ــــ عرصہ دراز تک سلیمان خطیب کی شاعری گلبرگہ تک ہی محدود رہی آگے نہ بڑھ سکی۔ خطیب کی شعری مدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے جناب مبارز الدین رفعت سابق لکچرار گلبرگہ کالج کی مساعی سے الج کے میگزین کو خطیب نمبر کی صورت میں شائع کیا گیا۔ مختلف اخبارات نے خطیب نمبر پر تبصرے ایع کئے۔ خطیب کے کلام کی شہرت کا آغاز یہاں سے شروع ہوا۔ چند سال پیشتر سلیمان خطیب کو کڑپہ آندھرا) کے ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس مشاعرہ میں حیدرآباد سے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد ے جناب عیاذ انصاری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ وہ خطیب کے کلام سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس کے بعد یدرآباد میں زندہ دلان حیدرآباد وجود میں آئی۔ اس کا پہلا مزاحیہ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے سبزہ زار پر منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں سلیمان خطیب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ میں خطیب نے حیدرآباد ے عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔ اس کے بعد حیدرآباد کے ہر مشاعرہ میں سلیمان خطیب مدعو کئے جانے لگے۔ ن کی شہرت اب دور دور تک پہنچنے لگی۔ دیار بندہ نوازؒ کا یہ شاعر آندھرا پردیش اور ریاست کرناٹک کے پے چپے میں پڑھا جانے لگا۔ بعد میں یہ ذرہ آفتاب بن کر ملک کے گوشہ گوشہ میں منور ہوا۔ کشمیر سے لے کر ۔نیاکماری، بہار سے لے کر مہاراشٹرا تک خطیب کو سنا جانے لگا۔ خطیب کو بام عروج پر پہنچانے میں آل ڈیا ریڈیو حیدرآباد نے اپنا اچھا کردار ادا کیا۔ خطیب کی نظمیں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے مسلسل نشر رنے لگیں۔ خطیب کی ہے نظم "پہلی تاریخ" جو مرد و زن کے مکالمہ پر مشتمل ہے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ر بار پیش ہوتی رہی ہے۔ اس میں سلیمان خطیب حیدرآباد کی ایک خاتون آرٹسٹ کے ساتھ پروگرام میں حصہ یا کرتے تھے۔ اس کے بعد دو خاتون آرٹسٹوں نے خطیب کی نظم "ساس بہو" کو پیش کیا۔ جسے بے حد سراہا ی۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو دلّی کے "ہوا محل" میں بھی مذکورہ پروگرام بارہا پیش کئے گئے۔

اھلیان گلبرگہ کی مساعی سے ڈسمبر ۱۹۷۵ء میں "جشنِ خطیب" منایا گیا۔ اس موقع پر سلیمان خطیب مجموعہ کلام "کیوڑے کا بن" دکنی اور ہندی دونوں زبانوں میں شایع کیا گیا۔ جشن کے موقع پر سلیمان خطیب ی سماجی و ادبی خدمات کے عوض اسٹیٹ ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔ دکنی ادبیات کے تحت سلیمان خطیب کا کلام ، علیگڈھ یونیورسٹی نے شامل نصاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ مہاراشٹرا کے ایک اسکالر سلیمان خطیب پر ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔

طالب خوندمیری

تیس تاریخ

(جناب سلیمان خطیب مرحوم کی مشہور نظم "اٹھائیس تاریخ" کے کلائمکس کو ملحوظ رکھتے ہوئے دکنی زبان میں پہلی کوشش)

کاں کو جاکو تو سو گئے باشا
کس ہندھارے میں کھو گیا باشا
کس سندوری کے موڑ پو جاکو
کیتا صدقہ کھندل دیا باشا
تجکو رستے شیپچ تھے مالوم
کیسے رستے پو چیل دیا باشا!

★

تو دلی کے چمن کا طائر تھا
تو ولی کے دکھن کا شاعر تھا
تو مشیروں کی جان تھا پیارے
سارے دکھن کی شان تھا پیارے
جو مشیرے میں تو سناتا تھا
شار پورا سمٹ کو آتا تھا
تیرے شعراں میں لاجونتی تھی
تیرے شعراں کی رت بسنتی تھی
تیری باتاں میں پھلجھڑی بھو تیچ
تیرے لہجے میں گدگدی بھو تیچ
آج کتیکو کی تیرے جانے سے!
ہونٹاں ڈرتے ہیں مسکرانے سے
اب تو حلق میں دم ہمارا ہے
تیس تاریخ کو مشیرا ہے
یتا احسان ہم پو کرنا تھا
یہ مشیرے کے بعد مرنا تھا

●●

بانو طاہرہ سعید

خطیبؒ کی یاد میں

بزمِ اردو سجا گیا ہے خطیب
کیسا جادو جگا گیا ہے خطیب
کر گیا ہے ادب میں نام امر
موت پہ فتح پا گیا ہے خطیب

★

گلشن سے آہ! جانِ بہاراں چلا گیا
اک گلِ شگفتہ خاطر و خنداں چلا گیا
جس کے جلو میں موجِ تبسم تھی نغمہ زن
سب کو رلا کے خود وہ خراماں چلا گیا
اک مختصر سی عمر میں کیا کیا نہ کہہ دیا
دکنی زباں پہ کر کے وہ احساں چلا گیا
اہلِ مذاق، اہلِ نظر، اہلِ دردِ دل
اک رند ایک چاک گریباں چلا گیا
باغ و بہار شخص یکایک نہ جانے کیوں
خاموش سوئے شہرِ خموشاں چلا گیا
مرگِ خطیب، موت ہے طنز و مزاح کی
دکنی ادب کا شاعرِ دوراں چلا گیا
اس پیکرِ خلوص پہ رحمت ہو طاہرہ
دنیا سے ایک مردِ سخنداں چلا گیا

●●

اشرف خوندمیری

چپ کیکو ہے بول رے باشا

دکھی اب سبے دکی ہو گئی   دنیا ابکی پکی ہو گئی
تیرے رُسنے پو یاروں کی   مَیفل پھیکی پھیکی ہو گئی
ذرّا تو رس گھول رے باشا
چپ کیکو ہے بول رے باشا

کانچ کے مافق پھوڑ کو ہم کو   موں موڑیا یوں توڑ کو ہم کو
دیں گے دھوکا نیں سمجھے تھے   بیچ بَدَڑ میں چھوڑ کو ہم کو
ہوّں گا تو بھی گول رے باشا
چپ کیکو ہے بول رے باشا

تھک کو رہ گئیں دل کے نیٹے   ٹھنڈے پڑ گئیں پیار کے منٹے
توچپ ہے تو کیسا چُپکتیں   ساس ہور بھَنو کے سارے تنٹے
موں بھی لیا کیوں کھول رے باشا
چپ کیکو ہے بول رے باشا

اُجڑیا میرے بی دل کا گوں   اُٹ گئی سَر پو سے تیری چھؤں
میں بی اب بے دِکّا ہو کو   گلّی گلّی میں الڑا رؤں
بن کو پھٹّا ڈھول رے باشا
چپ کیکو ہے بول رے باشا

کاٹا کیوں رے کا تو چپّا کو   موٹ کا مِٹھا پانی پلا کو
تن کو ترس گئیں سو مرٹیوں میں   چاندی سری کے فصلاں پکا کو
ہو گیا تو کال گول رے باشا
چپ کیکو ہے بول رے باشا

واں بی خُشیاں پورا ہوّ لگا   سب کے غماں تو دھوراہوّ نکا
تیرے گیتاں واں سُن سُن کو   اَلّا بی خُش ہو را ہوّ نکا
بڑ گیا تیرا مول رے باشا
چپ کیکو ہے بول رے باشا

●●

سید تبسم

★

سلیمان خطیب ۔ ایک تاثر ۔ ؟

سلیمان خطیب ہمارے عہد کے مقبول عوامی شاعر تھے ۔ آج جب سلیمان خطیب ہم میں موجود نہیں ہیں ۔ میں سوچتا ہوں کہ ان کی مقبولیت کا راز کیا تھا ۔ خطیب کی زبان ۔ خطیب کا طنز خطیب کا مزاح ۔ ان میں سے کوئی بھی چیز انہیں مقبول بنانے میں تنہا شامل نہیں تھی ۔ میرے خیال میں سلیمان خطیب کی شخصیت میں ان کی مقبولیت کا راز پنہاں تھا ۔ ایک دلنواز دل گیر اور دردمند شخصیت ' سلیمان خطیب نے اپنے عصر کے موضوعات میں سے چند ایسے موضوعات کو اپنے لئے چنا تھا جو ان کی شخصیت کے تخلیقی گوشوں سے مناسبت رکھتے تھے ۔ اُنہیں سماج کے مشاہدہ کا جو بھی موقعہ ملا ۔ اس لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ضائع نہیں کیا ۔ حساس دل اور دوربین نظر ان کے موضوعات کے پس پردہ اس ماحول کو تلاش کرتے ہیں ۔ جو عام انسانوں کے تجربات ہونے کے باوجود گہری معنویت سے عبارت ہیں ۔ بظاہر خطیب کی شخصیت شاعرانہ انداز میں فنکارانہ اظہار کی تشکیل کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ لیکن اس کی سطح حقیقت کی بلندیوں کو چھوتی ہے ۔ اُن کا موضوع اُن کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے ۔ ہر موضوع خطیب کی شخصیت کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے ۔ یہی وہ مقام ہے ۔ جہاں جگ بیتی آپ بیتی بن جاتی ہے ۔ آپ کی ہماری سب کی باتیں خطیب کی باتیں بن جاتی ہیں ۔ وہ ناصح و نقاد بن کر جراحت پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ ایک دردمند غمگسار اور واقف حال دیدہ ور کی طرح ہمیں اپنے تجربات میں شریک کرتے ہیں ۔

یاد اس شاعر کی ۔ اس طنز نگار کی' اس مزاح کے دلدادہ کی' اس نباض کی جس کی انگلیاں معاشرہ کی نبضوں پر تھیں ۔ جو اس کا مرض منٹوں میں پہچان جاتا تھا نہ صرف جان جاتا تھا بلکہ اُس کے لئے ایسا نسخہ تجویز کرتا کہ سننے اور پڑھنے والے حیران رہ جاتے ۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے اور ساتھ ہی اس انداز میں نشتر چلاتا کہ عرصہ تک دلوں میں کانٹوں کی ایسی چبھن محسوس ہوتی جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس اور آج جب اس کی یاد آتی ہے تو کبھی ہم خود بخود تنہائی میں ایسے مسکرا پڑتے ہیں جیسے کوئی "دوانہ" اور کبھی ملول ہو جاتے ہیں کہ ایسی پیاری شخصیت ہم میں نہیں ۔ ہنسنا ہنسانا بظاہر اس کا پیشہ معلوم ہوتا تھا ۔ لیکن اصل یہ ایک پردہ تھا ۔ ایک جادوگر جیسے اوڑھے ہوئے خطیب آپ کو ان سماجی مسائل سے روشناس کراتا تھا ۔ جن کی اہمیت اس کی نظر میں بہت زیادہ تھی ۔ انداز بیان

ایسا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مسائل وہ بُرائیاں سماج کی نہیں بلکہ خود اس کی بھی ہوں ۔ خلیب صاحب نے مختلف سماجی مسائل کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے ۔ مثلاً جہیز کا مسئلہ جو ایک قومی لعنت کے طور پر سوار ہے ۔ اِس کے تعلق سے فرماتے ہیں ۔

جس کی بچی جوان ہوتی ہے
اس کی آفت میں جان ہوتی ہے
کون اجڑتا ہے باغ مفلس کا !
کس نے دیکھا ہے داغ مفلس کا !

سلیمان خلیب نے اپنی تمام شاعری میں قدیم اور عصری اردو کے امتزاج سے کام لیا کہیں قدیم اُردو کا حصّہ زیادہ ہے کہیں کم لیکن حد تک ایسے اشعار بھی کہتے ہیں ۔ جس میں صرف عصری اردو کی جلوہ فرمائی ہے ۔ خلیب صاحب نے اپنی شعری زندگی کا آغاز روایتی غزل گوئی سے کیا تھا ۔ لیکن جب ان کے سر میں دکنی لوک گیت جمع کرنے کا سودا سمایا تو اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اردو کے ساتھ دکنی میں بھی طبع آزمائی شروع کی لیکن وہ اکثر عصری اردو میں بھی شعر کہا کرتے تھے ۔

ان کی شاعری میں جو طنز و مزاح تھا وہ بنیادی طور پر معاشرہ کے مزدور پیشہ محنت کش اور مظلوم طبقات کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے ۔ جب وہ اظہار خیال کرتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ خود بھی اسی سماج کا ایک حصہ ہیں ۔ وہ ہنستے ہنساتے معاشرہ کی ایسی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرجاتے ہیں جو سب کی آپ بیتی ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے زبان ہیں ۔ گویا انہوں نے عوامی مسائل دیگر طبقہ مسائل کو ایک زبان گویائی عطا کردی ۔ ان کی نظمیں ساس بہو' پہلی تاریخ' روٹی پاؤ حکیم ۲۸ تاریخ 'ہمارے بچے اور تلاش گمشدہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں جس میں انہوں نے ان سماجی مسائل کی طرف نہ صرف ایک بھرپور طنز کیا بلکہ اکثر مقامات پر ان کی اپنی تمناؤں کا مثبت اظہار بھی ملتا ہے ۔ جیسے نظم ہمارے بچے میں رقمطراز ہیں ۔

ہم نے کبھی نہ سوچا اپنے وطن میں یارو
ایسے چلے گی آندھی ویران باغ ہوگا
اولاد ہی کے ہاتھوں منہ پر لگے گی کالک
آنکھوں میں اشک ہوں گے سینہ پہ داغ ہوگا

اور آگے چل کر کہتے ہیں کہ

بچوں کو میرے یا رب جینے کا تو ہنر دے ✤ آنکھیں تو دی ہیں تونے آنکھوں میں بھی نظر دے

خلیب کی نظموں میں طنز و مزاح کا پہلو جاندار ہے ۔ خلیب صاحب نے اس مزاح سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور اپنی بات میں محنت کشوں کے مسائل اور ان کے موقف کی ترجمانی بڑی روانی اور دلجوئی کے ساتھ کرتے ہیں ۔ اپنی نظم پہلی تاریخ میں مزدوروں کے اقتصادی اور سماجی احوال کی عمدہ عکاسی کی ہے ۔

وہ عوام آشنا مزاج رکھتے تھے اور اپنی بات کو ٹھونک دوٹوک اور سیدھے سادے انداز میں کہنے کے عادی تھے ۔ اندازِ بیان بھی اتنا سیدھا اور برملا کہ بات سامع کے دل نشین ہوجاتی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بات دل کو لگتی اور احساس کو جھنجھوڑ دیتی ہے انہوں نے اپنے کلام میں جا بجا تشبیہات ' استعارات ' تلمیحات و محاوروں کا استعمال بھی بہت خوبی سے کیا اور وہ استعارے و محاورے اتنے عام فہم کہ ہمارے اطراف کے ہمارے اپنے دیکھے بھالے ان کی نظمیں پگڈنڈی اور تندی اس کی اچھی مثال ہیں ۔

اپنی نظم ندی میں یوں لکھتے ہیں کہ ۔

گھٹتے گھٹتے گھٹ گئی تو چاند آخری رات سا ہور ڈوبگی ہوگئی تو بھید عورت ذات سا

پگڈنڈی میں یوں لکھتے ہیں کہ :۔

میں کنواری چھوریاں کی ایک لمبی سانس ہوں دو دلاں میں چبھنے والی ایک بہنگی پھانس ہوں

تجریدی آرٹ اور جدیدیت کی خامیوں پر بھی ان کی نظر تھی ۔

بے وزن شعر صرف ترنم سے پڑھ دیئے بے معنی نظمیں لکھی جدت کے نام سے ۔

ہر شکل بد کو کہنا ہے تجریدی آرٹ ہے بیلن بنا کے رکھد یا عورت کے نام سے

سلیمان خطیب دکنی اُردو کے ہی نہیں معاشرہ کے شاعر تھے اِس سماج کے شاعر تھے ۔ حیدرآبادی عوام کے دلوں میں ہمیشہ اپنی انفرادیت کے ساتھ زندہ جاوید رہیں گے ۔ اور ان کی دل نشین آواز برسہا برس تک حیدرآبادیوں کے کانوں میں گونجتی رہے گی ۔

اٹھائیس تاریخ

(ایک کلرک کی بیوہ، میاں کی مزار پر)

(سلیمان خطیب)

روز لڑ لڑ کو جان کھا کھا کو
اچھا جنگل میں سو گئے آ کو
منڈی کاٹی کو پہلے مرنا تھا
لے کو مٹھی میں جان بیٹھی ہوں
ایسا مرنا بھی کیسا مرنا جی؟
گھر میں بیٹی، جوان بیٹھی ہے!
کتے لوگاں کے پاواں پڑ پڑ کو
گھر سے میت کو میں اُٹھائی ہوں
جینا مرنا تمہارا قرضے کا
آج پھولاں اُدھار لائی ہوں
بیتا احسان ہم پو کرنا تھا
تنخواہ لینے کے بعد مرنا تھا

••

ان پڑھ بھولگیری

آہ خطیب!!

کیا پتہ تھا کہ ۷/ اکتوبر کی صبح کی ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ اس مرتبہ آپ نے مجھے طنز و مزاح کی شاعری کے تعلق سے چند خاص باریکیوں سے واقف کروایا تھا۔ جس میں پند و نصائح بھی تھے آپ کی وہ پرخلوص محبت بھری باتیں میرے دل و دماغ پر ایسی مرتسم ہوئیں جو مٹائے مٹ نہیں سکتیں۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ ہم طبعالی و ہم کلامی کا شرف میرے لئے زندگی میں پہلا اور آخری ثابت ہوگا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی طویل بات چیت، میری شاعری میں نکھار اور ترقی کی راہیں وا کرے گی۔ میرے کمترین اندازِ شاعری کو سراہتے ہوئے جو مشورے دیتے تھے۔ میں اسے کبھی نہ بھول سکوں گا۔ آپ کے دیئے ہوئے مشورے میری شاعری میں جان ڈال دیں گے۔ اب مجھے ایسا نصیحت کرنے والا کہاں ملے گا۔ آپ نے اپنی تازہ نظم "اسٹرائیک" بھی سنائی تھی۔ جس میں حالاتِ حاضرہ کی بڑی خوبی سے عکاسی کی گئی تھی۔ ایسا کلام سننے کے لئے مجھ جیسے ہزاروں چاہنے والوں کے کان ترستے رہیں گے۔ اس مرتبہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز پر ایک قوالی اپنے دستِ مبارک سے جو رقم کی ہے۔ وہ میرے لئے آپ کے خلوص کا عطیہ تصور کی جاتی رہے گی۔ شاید یہ آپ کی آخری تحفہ یہ ہے جو میرے پاس محفوظ ہے اور رہے گی۔

چلتی سانسوں کا سفر چاہے کتنا طویل کیوں نہ ہو، اس کی ایک منزل ہے۔ جہاں ہر کسی کو پہنچنا برحق ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی اتنی اہمیت ہوتی ہے کہ "زمانہ ان کا محتاج رہتا ہے۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک سلیمان خطیب بھی تھا۔ جو عمر کے لحاظ سے بزرگ لیکن میدانِ شاعری میں وہ ایسا نوجوان تھا، جس کی شاعری دورِ شباب میں تھی۔ جس کی ہر سانس، ہر لمحہ، ملک، قوم کے لئے اہم تھا۔ سلیمان خطیب نے اپنی جد و جہد اپنی بے انتہا کوششوں سے نئے نئے انداز، نئی نئی تشبیہات اور استعاروں کے استعمال سے اردو ادب بطورِ خاص دکنی زبان کے کھیت کی آبیاری کی اور اس کھیت کو لہلہاتا ہوا خوبصورت، سرسبز و شاداب بنایا۔ جس کی بے انتہا خوبصورتی سے ہر ایک متاثر ہوتا۔ جس کی مہکتی ہوئی خوشبو سے ہر کسی کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اس کھیت میں موجود سوکھا ہوا حصہ بھی اپنے اندر ایک درد ایک کرب اور ایک سبق آموز چبھتی ہوئی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ان کے اپنے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جانے والا دکھا دیتکھ اور بڑا پیارا انداز تھا۔ ہنسی ہنسی میں پتے کی بات کہہ جانا ان کا ایک ایسا منفرد انداز تھا، جس سے ایک موٹے دماغ والا جو نرا ان پڑھ بھی، سماجی، اصلاحی، سیاسی و معاشرتی اور دوسرے پیچیدہ کٹھن مسائل آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ اسی لئے وہ شہنشاہِ طنز و مزاح، دکنی زبان کی آبرو زندہ دلانِ حیدرآباد کی جان کہے جاتے رہے۔ جب وہ کسی بھی محفل میں پہنچ جاتے تو مرکزِ نگاہ بن جاتے اور اس محفل کی کامیابی کا ضامن سمجھے جاتے۔

حسنی شاداب بے دھڑک

سلیمان خطیب

"ساری محفل کو خون رُلا کو
اچھا جنگل میں سو گئے اُکو"

سارے لوگاں سے پوچھا رو رو کے
بزم کی جان مر گئے، سچی
کرکے بلقیسِ اُردو کو بیوہ!
کیا سلیمان مر گئے، سچی

ہم کو برسا برس رُلانے کو
سب کو اِتّا ہنسا گئے واہ جی
ہم ہزل گو کو مرثیہ دے کو
ایسا مرنا بھی کئی کا مرنا جی!

پڑھیں کس دل سے اِنّا للّٰہ
خود زباں اپنی کپکپاتی ہے
موت کو موت کیوں نہیں آئی
کیسے کیسوں کو لے کے جاتی ہے

ہم کو رتّی سی بھی خبر ہوتی
اِتّی ہمت ضرور کر جاتے
آپ سے پہلے ہم عقیدت مند
موت کو ساتھ لے کے مر جاتے

رشید عبدالسمیع جلیل

سلیمان خطیب

عجیب شخص تھا کیوڑے کے بن میں رہتا تھا
ہنسی بکھیرتا، کانٹے کا زخم سہتا تھا
تمام رنگِ ظرافت، تمام لطفِ بیاں
وہ دل کی بات بھی یوں دل لگی سے کہتا تھا
وہ خوش نوائی تھی اُس کی کہ درد کی بوچھاڑ
ہنسی ہنسی میں اک آنسو تڑپ کے بہتا تھا

چلی یہ کیسی ہوا، بجھ گیا دکن کا چراغ
نہ جانے اب وہ کہاں روشنی دکھاتا ہے
قلی کے شہر میں کیوڑے کی بس گئی ہے مہک
بکھر چکا ہے تو خوشبو بہت اُڑاتا ہے
اِسی مقام پہ کل سب سے مسکرا کے ملا
وہ اس طرح تھا، کہ برسوں میں کوئی آتا ہے

خطیب وقت تھا، اعزاز لے گیا اپنا
وہ اپنے ساتھ ہر انداز لے گیا اپنا

"نبی خانہ"

انتخابِ کلام

★

سلیمان خطیب

بڑے شدّاد و قاروں تھے زمانے کے بڑے لوگاں
کرتک طرّے لگالے کو چلے آئے بڑے لوگاں
بڑا بڑپن دِکھالے کو چلے آئے بڑے لوگاں
نوی جنّت سجالے کو چلے آئے بڑے لوگاں
تسبیح دولت اُٹھالے کو چلے آئے بڑے لوگاں
غریباں کا دَرَد لے کو محمد مصطفیٰؐ آئے
سبھی بے آسرا تھے جی ہمارا آسرا آئے

چلے آؤ مرے مالک میں انکھیاں پو بٹھالیوں گا
یہ جلوہ کس کا جلوہ ہے زمانے کو بتالیوں گا
کلیجہ چیرلے کو میں کلیجے میں چھپالیوں گا
نبیؐ صاحب مرے دل کو "نبی خانہ" بنالیوں گا
اَندھارے گھُپ اَندھارے میں مرے بدرالدجیٰ آئے
نوے رستے ہوئے روشن، چلو نورالہدیٰ آئے

تمہارا ناؤں میٹھا ہے، میں میٹھے سب پکا دیوں گا
غریباں تمنا پیارے تھے، غریباں کو کِھلا دیوں گا
تمہاری بھوک پو بچے مرے بھُکے سُلا دیوں گا
نواساں کے تمارے نام پو گلے کٹا دیوں گا
تمہاری ایسی صورت ہے کہ دشمن کو مَیا آئے
تمارا ایسا نقشہ ہے کہ بس یادِ خدا آئے

ے محبت

تمہے مکے مدینے کے، تمارے ثنا کرکے صدقے
تمہے اُمّت بڑی پیاری، تمارے پیار کے صدقے
بڑے ہم بے سہارا جی، غریباں جی، یتیماں جی
تمارا اک سہارا جی، مرے سرکار کے صدقے

یاد

یاد بولے تو تکیئے میں گجرے کی باس
جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس

یاد بولے تو بچپن میں چھوڑے سو گاؤں　　　جیسے پنگھٹ کے پانی میں رادھا کی چھاؤں
یاد بولے تو خالی دِوانے کا خواب　　　ایک بچے کا جیسے ادھورا جواب
یاد بولے تو پلکاں پو آنسو کی لُوٹ　　　کالے بادل پو چاندی کی چمکیلی گوٹ
یاد روتے سو انکھیاں میں گوری کا روپ　　　جیسے پڑتے سو پانی میں، ہلکی سی دھوپ
یاد بولے تو آنسو کی ٹوٹی لڑی　　　گھپ اندھارے میں چھوٹی ہوئی پھلجھڑی
یاد بولے تو جوہی کی کھلتی کلی　　　سوتے بالک کے ہونٹاں پو جیسے ہنسی
یاد بولے تو ریتی پو تدھم لکیر　　　جیسے بارے میں اُڑتی ہے ہلکی عبیر
(ہوا)
یاد بولے تو چلمن کے پیچھے ہنسی　　　دُور جنگل میں جیسے کوئی روشنی
یاد بولے تو بچپن کی بھولی نراس　　　لال اُودی دھنک کو پکڑنے کی آس
یاد بولے تو انکھیاں جھکانے کا نام　　　ایک نقش بنا کو مٹانے کا نام

یاد بولے تو دل میں چھپانے کی بات
چپ ذرا سوچ کو مسکرانے کی بات

پہلی جھگی

کردار: ڈھولک کے گیت گانے والی سہیلیاں
* بڑھی خالہ * خالہ کی بڑھی سہیلی * ایک میڈیکل کالج کی طالبہ
* بڑھے حاجی صاحب

گیت: کیا دلربا بنا ہے پھولوں کا ہار تیرا
دل میں اُتر گیا ہے پھولوں کا ہار تیرا
گجرے مہک رہے ہیں خوشبو بلا رہی ہے
کس گھر کو لے چلا ہے پھولوں کا ہار تیرا
الفت میں تیری نوشہ دیوانہ ہو گیا ہے
قدموں پہ لوٹتا ہے پھولوں کا ہار تیرا
پہلی ہے یہ جھگی پہلا ہے پیار تیرا
پہلی بنا ہوا ہے پھولوں کا ہار تیرا

ایک بڑھی: یہ تو شادی ہے ڈھول بجتی ہے
"بہو بیگم" تمہاری کیسی ہے؟

ساس: چھوری گھونی ہے چلیا چنتر ہے
جتی اندر ہے اُتی باہر ہے
جھک کو بیٹھی تو چاند پہلی کا
تن کو بیٹھی تو تیز خنجر ہے

• اِنے چھپن چھری کی بیٹی جی!
اماں جیسی ہے بیٹی ویسی ہے
کچے تنکے پو چپیل جھپٹی ہے
پوں کو پانی میں بیل چھٹی ہے
چھورا گھلتا ہے بھر جوانی میں
چھری گھلتی ہے جیسے پانی میں
مکڑی جالاں میں پھنستا جاتا ہے
کچی لکڑی کو کیڑا کھاتا ہے
چھورا پہلے کے سُر کا آتا نئیں
میرے سنگات کھانا کھاتا نئیں
اُس کی صورت کی میں تو بھوکی ہوں
مجھے صورت اُنے دکھاتا نئیں
کورے برتن کو پھوڑ ڈالی نا
ماں سے بیٹے کو توڑ ڈالی نا
صبر کرو، بہان بہاورجـــــ!

دوسری بوڑھی:
چھوری ہوتی ہے موز کا چھلکا
چھورا دیوانہ ہے پھسل جائیں گا

گورے ہاتھاں میں آنچ ہوتی ہے
ہاتھ لگتیچ مُرکا جَل جائیں گا
ڈھیل چھوڑ دنکو جی لاڑوں میں
پتنگ اٹکیں گا جا کو جھاڑاں میں
یاں کے چھوریاں سرو کے جھاڑاں ہیں
چلتے پھرتے سو یہ پہاڑاں ہیں

دولھے کی ماں :

چھورا کیسے بدل گیا دیکھو
جھٹ سے گھوڑا نکل گیا دیکھو

دوسری بوڑھی :

یہ تو دُنیا ہے ایسا ہوتا ہے
بولو سمدھی تمہارا کیسا ہے

دولھے کی ماں

بڈھا! پورا وضو کا لوٹا ہے !!
پھوٹا ڈونگہ ہے، چکنا مٹکا ہے
ٹھا دیکھا تو منہ پسا ریں گا
چلتے ترے میں چھینٹا ماریں گا

باتاں دیکھو بڑے حماقت کے
گز نہ پھاڑیں گا، تھان واریں گا
بڈھا، بڈھی کے ہے کھروچے میں
اک سپاری ہے بس سروتے میں

میڈیکل کالج کی طالبہ :

بات جب بھی سلائیٹ ہوتی ہے
دل میں تھوڑی سی لائیٹ ہوتی ہے

دوسری بوڑھی

نیچے لنگی ہے منہ پو عینک ہے
انے کاں کی اُجاڑ ریپلک ہے

دُولھے کی ماں

اُس کی سالی کلب کی دیوانی
اس کے دیدے کا مرگیا پانی
سر پہ گھڑسی ہے لمبے بالاں کی
نیچے لنگی ہے بات مردانی
ہم تو پپا کے ساتھ آیا تھا
ہنچ ممّا کے ساتھ کھایا تھا

اللہ اُس کا بھی دِل دکھانا جی
اُنے روتا جی اور رُلاتا جی
دھوبی کپڑے گنوا کو آنا جی
اس کی تنگی کا رنگ جانا جی
بھری محفل میں چونڈ اگر جانا
اُنے شرما کو دہائیج مرجانا
کھانا ڈالوں گی سو فقیراں کو
دھتی باندھوں گی جا کو پیراں کو

پھول لڑکیاں

رنگ اُس کا شفق سے مِلتا ہے
سُرخ جیسے گُلاب کھِلتا ہے

ایک لڑکا

گھر میں جیسے اُجالا اُترا ہے
کس کے گھر کا چراغ ہے خالا
خوشبُو آتی ہے عُود لوباں کی
کس کلیجہ کا داغ ہے خالا

ایک لڑکی

لال گھونگھٹ ہے گورا مکھڑا ہے
کیا شفق میں سے چاند نکلا ہے

دو لھے کی ماں

اُجلی چمڑی کو لے کو جائیں گے
شکھیا بھی سفید ہوتی ہے
ہونے والے کی عید ہوتی ہے
اپنی مِٹی پلید ہوتی ہے
ہمنا غم ہے تو بیٹیا یہ غم ہے
بارہ دیگاں میں دیگچی کم ہے
یہیچ پُورا جہیز ہے دیکھو
پاواں ہلتا سو میز ہے دیکھو
ہنتا سمجھا کر بولی بیچاری
بَرف جمنے کی دینا الماری

مجھے خواہش تھی ٹھنڈے پانی کی
یاد آتی تھی نوجوانی کی

باتاں کرتے سو کیا کی ڈبّہ
وہ بھی دیتے تو بہوت اچھا تھا

ایک پھٹکا بھی لا کو دینا تھا
میری گھرسی میں کیا سماتا تھا
پھکنی نیں ہے سو کیسا پھونکیں گے
جا کو سمدھن کے منہ میں تھوکیں گے
چمٹا نیں ہے سو کیسے اَڑیں گے
جا کو سمدھی کی ناک پکڑیں گے
گورے پاشا کو کار پوچھی تھی
خالی پچیس ہزار پوچھی تھی
دل کی میری دعائیں لینا تھا
ایک بنگلہ ضرور دینا تھا
ایسی چھوری کو چھوڑ ڈالیں گے
ایسے رشتے کو توڑ ڈالیں گے
شادی ہونے کو چار ہوتی ہے
یوں میں جوتی ھزار ہوتی ہے

ایک بزرگ حاجی صاحب:

ہیرا ہوتا ہے دھول میں خالہ
کیسے چھوٹے گا دھول سے رشتہ

کیا خبر تھی حسین پھولوں کو
اُن کا ہوگا ببول سے رشتہ
شاخِ گل میں ہزار کانٹے ہوں
پھر بھی ہوتا ہے پھول سے رشتہ

(بھرآئی ہوئی آواز میں)

کیا دیا تھا نبیؐ نے بیٹی کو
کچھ تو ہوگا بتولؓ سے رشتہ
ایک چکی تھی اور مشکیزہ
صرف لفظِ قبول سے رشتہ
گھر نبیؐ کا، نبیؐ کی بیٹی ہے
اور علیؓ کے اصول سے رشتہ
ایک چادر ہے باپ کا تحفہ
جیسے ہوتا ہے پھول سے رشتہ
اسی نقشِ قدم پہ چلنا ہے
تا ابد ہے رسولؐ سے رشتہ

(آخر میں صرف اذان باقی رہتی ہے)

پگڈنڈی

بھوت دیکھے ہُنگے یوں تو چاندنی راتاں تے
یہوپچ خالی سُن کو ہُنگے طور کے باتاں تے
(یونہی)
مُنہ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں جی میں نور بن جاتی ہوں میں

اک نوی عارس کے سرکا چرُ مرُا کو شرم سے
گوں کے بازو سے نکل کو گھاٹ کو جاتی ہوں میں
جن کے انگے چاند، سورج بھیک کے صحنک ہیں دو
ایسے ایسے آفتاباں کو اُٹھا لاتی ہوں میں
مُنہ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں جی میں نور بن جاتی ہوں میں

یاں پہ چھُپتی، واں نکلتی، کھیلتے آتی ہوں میں
دھان کے کھیتاں میں جاکو مانگ بن جاتی ہوں میں
میں ہوں پھولاں کی ڈغالی ہور بو جھل ہیں گھڑے
ایک لچکیلی کمر ہوں، بَل پو بَل کھاتی ہوں میں
مُنہ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں جی میں نُور بن جاتی ہوں میں

میں کنواری چھوریاں کی ایک لمبی سانس ہوں
دو دلاں میں چبھنے والی ایک بنگی پھانس ہوں
ہاتھ میں جنگل کے ہوں تقدیر کی ٹیڑھی لکیر
کچا پکا وعدہ ہوں میں مٹھی مٹھی آس ہوں
منہ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں جی میں نور بن جاتی ہوں میں

یہ اُتاراں پہ چڑھاواں بانسری کا راگ ہوں
منچلے گبرو جواناں کے دلاں کی آگ ہوں
گوری گوری گوپیاں ہیں رنگارنگی ساڑیاں
وہ دھنک بھی کیا دھنک جی میں دھنک کا بھاگ ہوں
منہ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں جی میں نور بن جاتی ہوں میں

ایک چُندری ہوں کسی کی، کھیت میں کھوئی ہوئی
ایک ناگن ہوں اکیلی گھانس میں سوئی ہوئی
کاں کے پاواں جل کنول پڑتے ہیں چھاتی پو مری
میں تو گنگا کی لہر ہوں، نُور میں ڈوبی ہوئی
منہ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں جی میں نُور بن جاتی ہوں میں

دشہرا شار کے وہ پاپی پاواں مجھ پو آسکتیج نئیں
میں تو میں میری گرد کو بھی وہ پا سکتیج نئیں
ان کے سڑکاں بلبے دھوکے اکالے پتھر کے دلاں
میری نرمی، شرماشرمی، مرکولا سکتیج نئیں
منھ اندھارے آکو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں جی میں نور بن جاتی ہوں میں
نیک ہو کو بد کی ساتھی کیسے ہوسکتی ہوں میں
پاپ کے بھرپور مٹکے کیسے ڈھو سکتی ہوں میں

ہمالہ کی چاندی

ہمالہ کی چاندی پگھلتی رہے
مرے گھر میں گنگا اُبلتی رہے
یہ گاندھی، یہ گوتم کی پیاری زمیں
ہمیشہ جواہر اُگلتی رہے
اہمسا کا اب بول بالا رہے
ترنگے کا جگ میں اُجالا رہے
حسیں آج کتنی ہے میری زمیں
کہو تم نے دیکھی ہے ایسی کہیں
یہ صورت پہ تنویر جمہوریت
نظر آج رُخ پر ٹھہرتی نہیں
قسم کھا کے کہتا ہوں اے میری ماں
میں اونچا رکھوں گا ترا یہ نشاں

مری زندگی ہوگی تیرے لئے
مری بندگی ہوگی تیرے لئے
یہی فخر کیا کم ہے میرے لئے
مرے خوں کی سُرخی ہے تیرے لئے
مری ماں تو مجھ سے بھی کچھ کام لے
ضرورت ہو میری تو آواز دے
سلامت رہیں میرے گنگ و جمن
یہ اجمیر و کاشی کی بانکی پھبن
ایلورا، اجنتا کا رنگیں سہاگ
سلامت رہے میرا پیارا وطن
سدا تیری رنگینی قائم رہے
بہاروں کی دُنیا یہ دائم رہے

(مراسلے)

خرافات

● سلیمان خطیب کے اس طرح چلے جانے سے بے حد صدمہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوا بیٹھے بیٹھے ہاتھ سے کوئی چیز اچانک نکل کر اندھیرے میں گم ہوگئی۔ مجھے تو اطلاع بھی کئی دن بعد ملی۔ ایک اچھے دوست ـــ اور ایک غیر معمولی مقبول شاعر سے ہم محروم ہوگئے اللہ مغفرت کرے۔

یوسف ناظم، بمبئی

● سلیمان خطیب صاحب کے انتقال کی خبر سنی بہت افسوس ہوا۔ میں اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہوں۔ خدا مغفرت کرے۔ اور ان کے اعزہ کو صبر دے

دکن کی ایک انوکھی ادبی شخصیت چلی گئی ہے
جب سے سنا یہ ہے کہ سلیمان نہیں رہے
محسوس ہو رہا ہے دکن سے گیا بہار
افسوس اس کا مدِ مقابل کوئی نہیں
ایسا کہاں سے لائینگے طنز و مزاح نگار

مقرب حسین مقرب

● خبر ملی کہ "کیوڑے کے بن" کا خالق ہر گُن دعا کر اداس چھوڑ کر جہانِ عالم سے ہمیشہ کے لئے پرواز کر گیا ـ آج انقلاب میں یہ خبر آئی ہے۔ ایسا لگا جیسے کوئی اپنا اس جہاں سے اٹھ گیا۔ کانوں میں مرحوم کے الفاظ گونج رہے ہیں۔ "یاشا! میں بمبئی مشاعرے میں آیا تھا تو ملا نئیں اِتا ئیچ

حیدرآباد میں مزے کر رہا تھا ـــ" اور اب خود مزے کرنے کے لئے ہم سب کو خطیب بھائی سوگوار کر گئے ـ دکنی شاعری جیسے یتیم ہوگئی ـــ یہاں بمبئی کے ادبی حلقوں میں اس خبر نے اداسی کی لہر سی دوڑا دی ہے ـ اتفاق سے دو دن قبل ہی شگوفہ کے پرانے رسائل الٹ رہا تھا کہ "سلیمان خطیب نمبر" میں اس تصویر پہ نظر پڑی جس میں، میں، خطیب بھائی اور اسماعیل ظریف صاحب بلند بانگ قہقہے میں مصروف ہیں ـــ اور اس ہنستے ہوئے پوز نے آج آنکھوں میں آنسو لا دیئے ہیں ـ سچ ہے ہر ہنسی کا انجام آنسو ہوتے ہیں۔

بہرحال خطیب بھائی کی جدائی کا غم نہ صرف ان کے اہل و عیال کو ہوگا بلکہ زندہ دلوں کے سارے قافلے کو ہے۔ ایک سوگوار دوسرے سوگوار سے اظہار ہمدردی کس طرح کرتا ہے میں نہیں جانتا بس یہ دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

پرویز ید اللہ مہدی، بمبئی

● دکنی زبان کے نامور اور منفرد لب و لہجہ کے شاعر حضرت سلیمان خطیب صاحب کے انتقال کی اطلاع پڑھ کر بے حد دُکھ پہنچا ـ واقعی ہم زندہ دلانِ حیدرآباد کا ایک انمول ہیرہ ہم سے دائمی طور پہ جُدا ہوگیا ـ اللہ خطیب صاحب کو ـــ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

ڈھکن، رائچوری

● میرے خسر بزرگوار حضرت خطیب کی بے وقت کی موت سے ہمارے دلوں پر جو گہرے زخم آئے ہیں، لگتا ہے وہ ایک عرصہ دراز تک مندمل نہ ہوسکیں گے۔ میں نے شمیم صاحبہ اور تحسین خطیب کو بھی کچھ لکھ کر روانہ کرنے کیلئے کہا ـ لیکن ان کے کے قلم رک گئے ہیں۔ آنسوؤں کی لڑیاں روکے نہیں رک رہی ہیں ـ میں نے بھی جو کچھ لکھا ہے ـ دل پہ پتھر رکھ کر لکھا ہے ہم ان لوگوں کے مشکور ہیں ـ جنہوں نے ہمیں تعزیتی خطوط لکھ کر پرسہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اور شریک غم رہنے کا اظہار کیا ہے۔

غم کا مارا

آصف بابا ـ رنجول (بیدر)

● سلیمان خطیب کا مورخہ ۲۱/ اکتوبر ۷۸ء کو انتقال ہوگیا ـ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن دنیائے ادب ایک عظیم شخصیت سے محروم ہوگئی جناب خطیب صاحب ایک مکمل انسان تھے ـ سادہ لوحی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی ـ ایسی شخصیت ہم لوگوں کے درمیان اب نہیں رہی ـــ فضائے ادب میں ایک خلاء سا محسوس ہو رہا ہے میرے پاس مرحوم کے لئے دعائے مغفرت اور لواحقین کیلئے تلقینِ صبر کے سوا کچھ نہیں

نیاز مند

جوہر سیوانی

سیوان، دبہار

اداریہ

دکن کے نامور شاعر سلیمان خطیب ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی شب انتقال کر گئے۔

یوں تو ان کی صحت اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ پھر بھی چاق وچوبند، ہنستے کھیلتے سارے ملک میں مشاعرے پڑھتے تھے۔ انتقال سے پہلے دن قبل حیدرآباد آئے، مضمحل، مضطرب، اداس، زندگی سے بیزار ــــ روایتی خوش مزاجی پر اوس پڑ چکی تھی ــ اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلہ میں مسلسل تین دن میرے ہاں آتے رہے۔ کام کے دوران میں ہمہ اقسام کی گولیاں استعمال کرتے، کبھی کھو جاتے، کبھی لیٹ جاتے اور کبھی زندگی سے مایوسی کا اظہار کرتے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز کے بڑے عاشق تھے۔ عرس شریف میں شرکت کے بعد چار پانچ دن میں واپسی کا وعدہ کر کے گلبرگہ گئے۔ دو تین دن بعد ہی پتہ چلا کہ سخت بیمار ہیں اور گلبرگہ سے حیدرآباد لایا گیا اور دواخانہ عثمانیہ میں شریک کیا گیا ہے۔ علاج کی تمام سہولتیں بہم پہنچائی گئیں ــــ موت کے آگے کس کا بس چلتا ہے ــــ! رشتہ داروں اور ہزاروں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ گئے ــــ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔

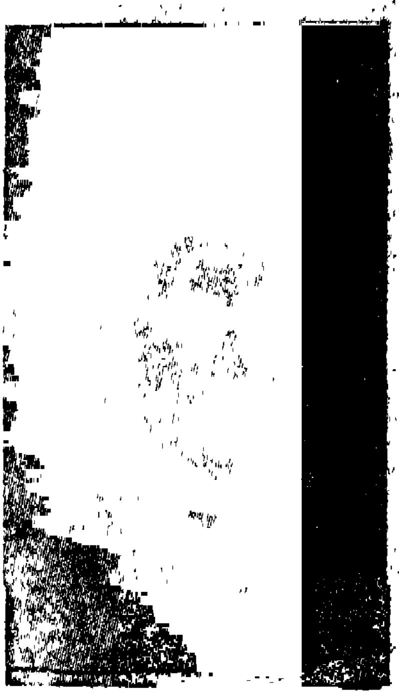
سلیمان خطیب کے انتقال سے جدید دکنی شاعری کا ایک باب ختم ہوا ــــ! تقریباً بیس برس تک وہ اپنے خاص انداز میں ہنستے ہنساتے ہوئے سماج کی کمزوریوں و لعنتوں کا پردہ چاک کرتے رہے۔ ان کی شاعری کا خاص وصف ڈرامائی انداز ہے۔ جس کے ذریعہ وہ سامع و قاری کی تمام تر توجہات حاصل کرنے میں کامیاب تھے۔ اسی خصوصیت کے باوصف وہ مشاعروں میں بے حد پسند کئے جاتے تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد سے انکا قدیمی اور قریبی تعلق تھا۔ زندہ دلانِ کے مشاعروں کی مقبولیت میں خطیب نے اہم حصہ ادا کیا تھا۔ اس بے مثال مقبول عام دکنی شاعر کے انتقال پر ہم اپنے گہرے رنج کا اظہار کرتے ہیں۔

خطیب کا انتقال، ادارۂ شگوفہ، زندہ دلانِ حیدرآباد اور اردو طنز و مزاح کا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

● یہ شمارہ حضرت سلیمان خطیب کیلئے بطور خراجِ عقیدت وقف کیا جا رہا ہے، اسی کے نتیجہ میں عام شمارہ روک لیا گیا ہے اور ڈرامہ نمبر کا کام بھی سرعت کے ساتھ انجام نہ پا سکا ــــ

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب کے موقع پر ۲۹ نومبر کو شائع ہونے والا سووینیر، شگوفہ کا دسمبر کا شمارہ ہوگا۔ "ڈرامہ نمبر" دسمبر میں شائع ہو سکے گا۔

زیرِ نظر شمارہ کے لئے بعجلت ممکنہ سلیمان خطیب پر مضامین حاصل کئے گئے۔ ابتدائی تین مضامین خطیب مرحوم کی اہلیہ محترمہ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے ہیں ــــ اس افسوسناک سانحہ اور رنج و غم کے حالات میں بھی خطیب کے اہلِ خاندان نے جو تعاون کیا اس کے لئے سراپا سپاس ہوں ــــ دعا ہے کہ خدا انھیں صبر جمیل عطا فرمائے ــــ



In Memory of the great Daccani Poet

JANAB SULEMAN KHATIB

from

FILMI TASVEE

URDU MONTHLY, HIMAYATNAGAR, HYDERABAD

2/68 Postal Regd. No. H.HD 6

SHUGOOFA

1 31, Bachelor Quarters, M. J. Market, Hyderabad-1 November 1978 Phone 57716

